خدا بخش لائبریری

جرنل

پٹنہ

۵۱-۵۲

خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ

تماہی

خدابخش لائبریری

جرنل

پـــٹـــنـــہ

۵۱ - ۵۲

خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ

رجسٹریشن نمبر : ٣٣٤٢٤/٧٧

شمارہ : اکاونواں، باونواں

قیمت : پچاس روپے

١٩٨٩ء

قیمت فی شمارہ : پچیس روپے

سالانہ : ١٠٠ روپے (ہند)

٢٠ ڈالر (ایشیا)، ٣٠ ڈالر دیگر ممالک

مصطفیٰ کمال ہاشمی نے لبرٹی آرٹ پریس (پروپرائٹرز مکتبہ جامعہ لمیٹڈ) دہلی میں چھپوا کر خدا بخش لائبریری کے لیے شائع کیا

خدابخش لائبریری

جرنل

پٹنہ

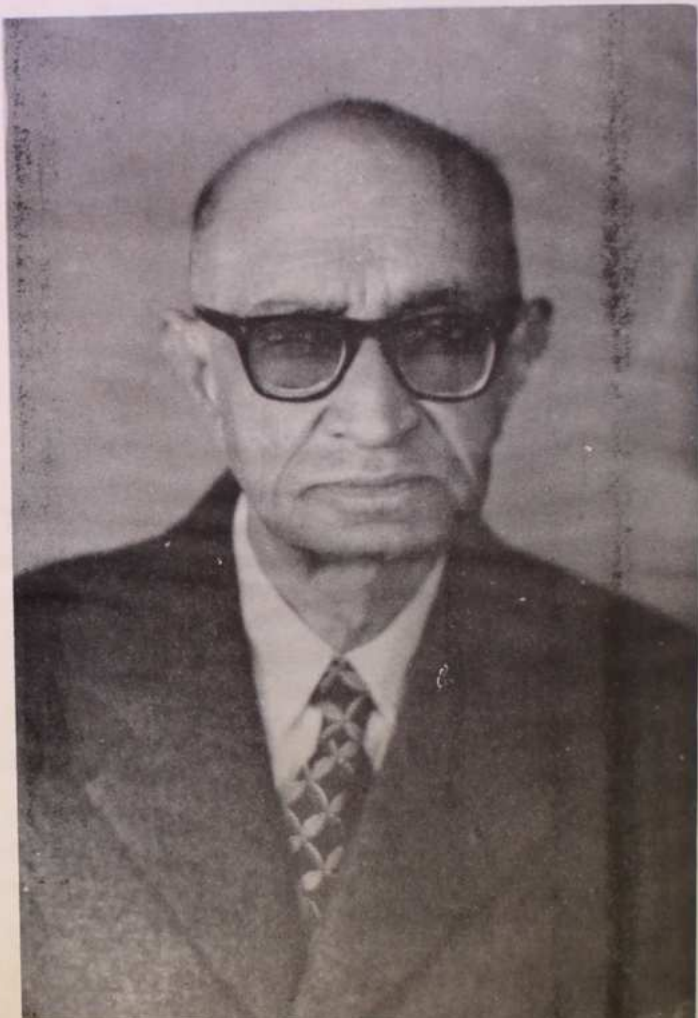
۵۱ — ۵۲

فہرست

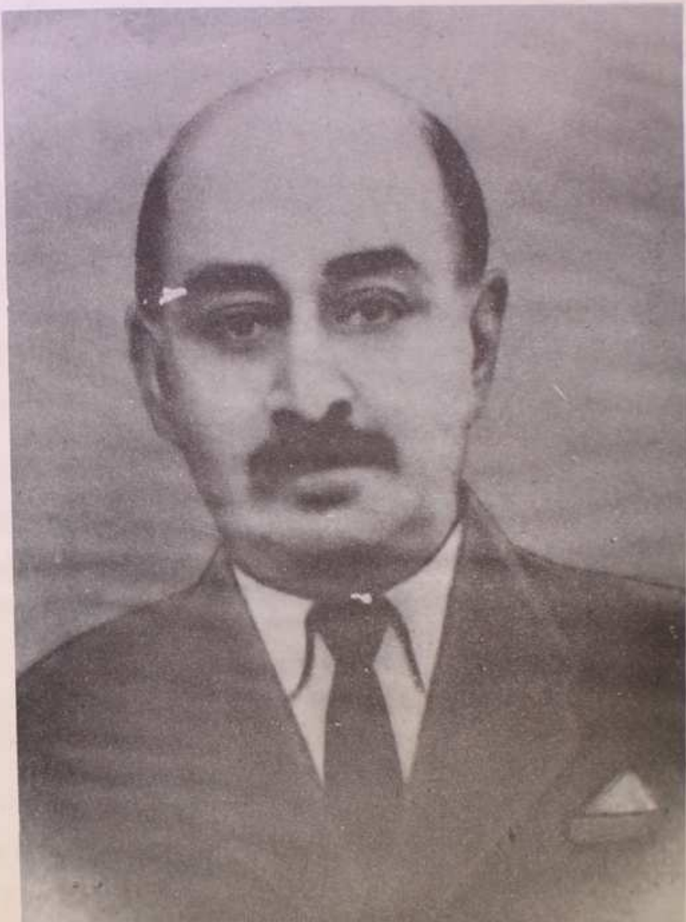
داستاں میری

خود نوشت سوانح حیات

از
ڈاکٹر اقبال حسین
پٹنہ

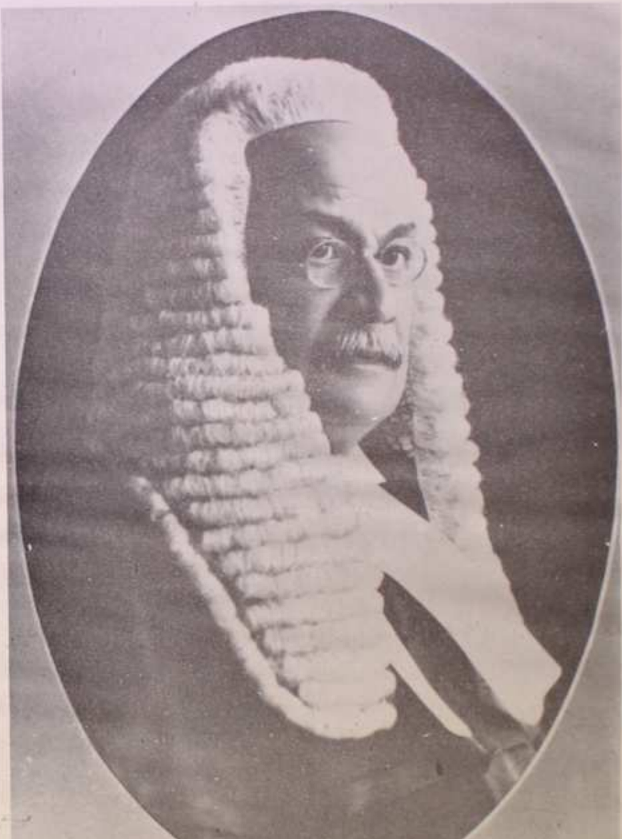


مصنف
ڈاکٹر اقبال حسین



والد مرحوم

خاں صاحب الحاج احمد حسین' بی۔ اے (علیگ) سابق ضلع مجسٹریٹ و کلکٹر، پٹنہ



منجھلے خالو مرحوم

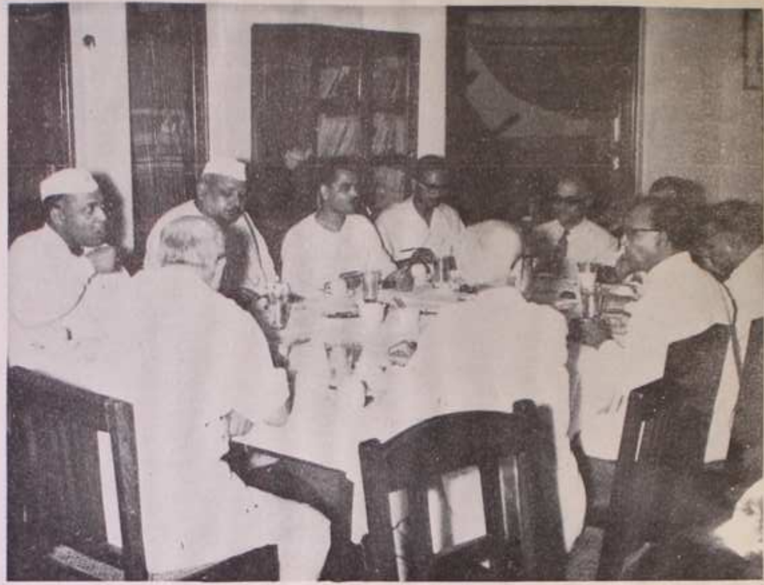
سر عبدالرحیم، کے۔ سی۔ ایس۔ آئی



مصنف کی مولانا ابوالکلام آزاد کے مزار پر حاضری



رسل لکچر کے موقع پر تصویر میں ڈاکٹر ذاکر حسین، پروفیسر ہمایوں کبیر اور مصنف نظر آ رہے ہیں



بہار پبلک سروس کمیشن کے دفتر میں مسٹر بی۔ ام۔ کے سنہا کے الوداعی عصرانہ کے موقع پر تصویر میں داہنے جانب سے (۱) مصنف (۲) پرنسپل ڈی۔ ان۔ سنگھ (۳) نائب وزیر مسٹر سہدیو مہتوں (۴) وزیر اعلیٰ پنڈت بنود انند جھا اور (۵) وزیر صحت مسٹر بیر چند پٹیل نظر آرہے ہیں۔



آچاریہ بدری ناتھ ورما وزیر تعلیم بہار مصنف کے ہمراہ مدرسہ شمس الہدیٰ، پٹنہ میں تشریف لا رہے ہیں۔ پرنسپل مولانا سید ریاست علی ندوی ان حضرات کا استقبال کر رہے ہیں۔



صدر جمہوریہ ہند، مصنف کو فارسی کی قابلیت اور علمی شغف کے لیے سند عطا کر رہے ہیں۔

ڈاکٹر اقبال حسین: پیدائش ۲۲ر نومبر ۱۹۰۵ء پٹنہ، ۱۹۲۲ء میں میٹرک، ۱۹۲۶ء میں گریجویشن فارسی میں آنرز کے ساتھ، ۱۹۲۸ء میں ایم۔ اے۔ فارسی؛ یونیورسٹی پرائز مین اور گولڈ میڈلسٹ، ۱۹۳۵ء میں پی۔ ایچ۔ ڈی۔ یہ پٹنہ یونیورسٹی کے پہلے پی۔ ایچ۔ ڈی ہیں۔

۱۹۳۵ء میں راونشو کالج کٹک میں فارسی کے لکچرر مقرر ہوئے پھر ۱۹۳۶ء میں پٹنہ کالج چلے آئے اور یہاں ۱۹۵۹ء تک خدمات انجام دیں — ۱۹۵۸ء تا ۱۹۶۰ء شعبہ فارسی پٹنہ یونیورسٹی کے صدر شعبہ اور پٹنہ یونیورسٹی فیکلٹی آف آرٹس کے ڈین رہے۔ پٹنہ یونیورسٹی سنیٹ (۱۹۴۲-۴۸ء) اور سنڈیکیٹ (۱۹۵۳-۵۴ء) اکیڈمک کاؤنسل (۱۹۵۲-۶۱ء) اور پٹنہ یونیورسٹی جرنل کے بورڈ آف ایڈیٹرس کے ممبر (۱۹۴۴-۶۱ء) رہے۔ ۱۹۶۰-۱۹۶۱ء پٹنہ کالج کے پرنسپل رہے، ۱۹۶۷-۷۲ء ریٹائرڈ ٹیچرس اسکیم کے تحت کام کیا اور ۱۹۷۸-۱۹۷۹ء یو۔ جی۔ سی کے وزیٹنگ پروفیسر رہے۔

انھوں نے ممبر بہار پبلک سروس کمیشن (۱۹۶۱-۶۵ء)، ڈائریکٹر خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ (۱۹۶۵-۶۷ء) اور اعزازی چیرمین بہار مدرسہ اکزامینیشن بورڈ (۱۹۶۵-۷۴ء) کے عہدوں پر بھی کام کیا۔

ہندستان کی فارسی شاعری پر مقالہ لکھا اور ہند ایرانی شاعروں پر ایک معروف مصنف ہیں۔

انتساب

اپنے عزیز دوست

پروفیسر ہمایوں کبیر مرحوم

کے نام

جن کے دل میں دوستوں کے لیے بے پایاں محبت تھی

جس توقع پر تھی اپنی زندگی وہ مٹ گئی

جو بھروسا تھا ہمیں وہ آسرا جاتا رہا

فہرست عنوانات

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

دیباچہ

میری اہلیہ کا ۱۹۷۳ء میں پندرہ برس کی طویل علالت کے بعد انتقال ہوا۔ ان کی موت کے بعد ایک ایسا خلا پیدا ہو گیا جس کا پُر کرنا میرے لیے بہت مشکل تھا۔ میں اس زمانے میں اپنے تمام کاموں سے فراغت پا چکا تھا اور وقت کی کوئی کمی نہ تھی۔ تنہائی اور پریشانی کو دور کرنے کے لیے خیال گذرا کہ خاندان نیورہ اور ددیہال و ننہیال کے بزرگوں کا تذکرہ لکھنے کی سعادت حاصل کروں۔ خاندان نیورہ کے بزرگوں کے متعلق بہت پہلے سے میرے پاس کافی مستند معلومات موجود تھیں جن کو مَیں نے خان بہادر سید ظہیر الدین ساکن نیورہ ضلع پٹنہ سے حاصل کیا تھا۔ خان بہادر سید ظہیر الدین کو خاندان نیورہ کے متعلق تحقیقی کاموں سے بڑی دلچسپی تھی اور آپ ان بزرگوں کے متعلق جو کچھ بھی کہا کرتے وہ سب حقائق پر مبنی ہوتے تھے۔ موصوف برابر مجھے بڑے شوق سے ان بزرگوں کے احوال سنایا کرتے اور میں بھی کافی دلچسپی سے سنتا اور ذہن نشیں کر لیتا تھا، آپ کی بڑی خواہش تھی کہ میں ان بزرگوں کا تذکرہ ایک کتابی شکل میں مرتب کروں۔ میں نے موصوف کی زندگی ہی میں تمام واقعات کو قلم بند کر لیا تھا اور مجھے ان حضرات کے احوال کو لکھنے میں کوئی بھی دشواری نہ ہوئی۔ میرے پردادا خان بہادر منشی حیدر بخش انگریزوں کے ایک وفادار ملازم تھے۔ ۱۸۵۷ء کے غدر کے موقع پر انگریزوں کی بہت مدد کی اور مظفر پور میں سرکاری خزانے کو لوٹے جانے سے بچا لیا تھا۔ انگریز ان کی بڑی قدر کرتے تھے۔ موصوف کا تذکرہ اس زمانے کے سرکاری

دستاویزوں میں موجود ہے۔ میرے چھوٹے دادا خان بہادر حشمت حسین اپنے والدِ محترم منشی حیدر بخش اور اپنے دو بھائیوں مولوی محمد حسین اور مولوی امیر حسین کا تذکرہ نہایت تفصیل سے کیا کرتے تھے۔ ان کی یہ سب تفصیلات خاندانی دستاویزات میں موجود ہیں جن کی بنا پر مجھے ان لوگوں کے متعلق احوال مرتب کرنے میں کوئی مشکل پیش نہ آئی۔ میرے دادا مولوی امجد حسین ایک ممتاز شخصیت کے مالک تھے اور انگریز ان کی بڑی عزت کرتے تھے۔ موصوف کے متعلق نامور انگریزوں کے تقریباً سو سال پرانے اسناد اپنی اصلی شکل میں میرے پاس اب تک موجود ہیں اور والدِ محترم خان صاحب احمد حسین سے بھی ان کے متعلق بہت کچھ سننے کا موقع ملا۔ خان بہادر سید ظہیر الدین میری دادی مرحومہ کے بھائی تھے۔ رشتے کے علاوہ موصوف میرے دادا مرحوم کے ایک عزیز دوست بھی تھے۔ مدت دراز تک یہ دونوں حضرات شہر آرہ ضلع شاہ آباد کے ایک ہی مکان میں مقیم رہے۔ آرہ کی تعزیتی مجلسوں میں خان بہادر سید ظہیر الدین بذاتِ خود شریک رہا کرتے تھے۔ میں نے ان مجلسوں کے متعلق جو کچھ لکھا ہے وہ موصوف ہی کے بیانات پر مبنی ہیں۔ خان بہادر سید ظہیر الدین کو تاریخ سے بڑا لگاؤ تھا۔ انھوں نے تاریخِ بہار سے متعلق کئی دلچسپ کتابچے بھی تحریر فرمائے تھے۔ خاندان کے متعلق موصوف جو باتیں بھی کہتے اسے اس انداز سے کہا کرتے کہ سبھوں کے ذہن نشین ہو جاتی تھیں۔

ننہیال کے بزرگوں کے متعلق تمام احوال و واقعات میں نے اپنی نانی مرحومہ بی بی رشید النسا سے تفصیل کے ساتھ سنے تھے۔ بی بی رشید النسا ایک تعلیم یافتہ خاتون تھیں۔ موصوفہ خان بہادر شمس العلماء سید وحید الدین کی صاحبزادی اور شمس العلماء نواب امداد امام اثر کی بہن تھیں۔ موصوفہ نے اپنی کتاب "اصلاح النساء" میں اس زمانے کے احوال کو نہایت خوبی اور احتیاط سے بیان کیا ہے۔ میں نے ننہیال کے بزرگوں کے احوال کو خود ان سے سن کر قلم بند کر لیا تھا۔ نانی مرحومہ کے علاوہ میرے ماموں مرحوم غلام وارث ایڈوکیٹ کو بھی خاندان کے حالات خوب یاد تھے اور انھوں نے بھی مجھ سے خاندان کے متعلق تمام چیزوں کو نہایت ہی سچائی اور خوبی سے بیان کیا تھا۔ میرے خالہ زاد بھائی سید محمد ایڈوکیٹ تاریخ اور آثارِ قدیمہ کے ماہر تھے۔ انھوں نے بھی مجھ سے خاندانی واقعات کو نہایت ہی خوش اسلوبی سے بیان کیا تھا۔ میں نے ان سب لوگوں کی اطلاعات کو بزرگوں کی یاد قائم رکھنے کے لیے محفوظ کر لیا تھا۔ اور یہ سب یادداشتیں میرے پاس موجود ہیں۔

لہذا ننہیال کے بزرگوں کے متعلق بھی تذکرہ مرتب کرنے میں مجھے کوئی دشواری محسوس نہ ہوئی۔

جب میں نے اپنے اس تذکرے کو مرتب کرنا شروع کیا تو مجھے خاندانی دستاویزات اور اپنی یادداشتوں کی ضرورت محسوس ہوئی۔ یہ سب چیزیں میرے آبائی مکان نیورہ میں رکھی ہوئی تھیں۔ بہار کی سوشلسٹ حکومت نے زمین داری کا خاتمہ کر کے ہم لوگوں کو بے گھر کر دیا۔ بدلے ہوئے حالات میں ہمیں اپنا آبائی مکان فروخت کرنا پڑا اور میں نے تمام چیزوں کو نیورہ سے لا کر اپنے اگزیبیشن روڈ کے مکان میں منتشر حالت میں رکھ دیا۔ مجھے ہمت نہ ہوتی تھی کہ کاغذات اور کتابوں کے اس انبار میں خاندانی دستاویزات اور اپنی یادداشتوں کو تلاش کروں۔ ایک عرصہ کے بعد میرے محترم دوست مسٹر عبدالجلیل ایڈوکیٹ نے بڑی محنت سے ان کاغذات کو مختلف بکسوں سے برآمد کیا اور میں نے کتاب لکھنے کا کام شروع کر دیا۔ لیکن یہ دلچسپ کام مختلف تردداتِ اور زمینداری کے مقدمہ میں مصروفیت کی وجہ سے نہایت سستی سے ہوتا رہا اور خاندانی تذکرہ کی تکمیل میں تقریباً دس ماہ لگ گئے۔ جب خاندان کے متعلق تذکرہ مرتب ہو گیا تو میرے عزیزوں اور دوستوں نے اسے دیکھ کر بہت پسند کیا اور اصرار کیا کہ میں اپنی سوانح حیات بھی لکھوں تاکہ ایک دلچسپ اور اہم دور جس سے میں گذرا ہوں اور جو سماجی، معاشی اور سیاسی تغیرات سے بھرا ہوا ہے، اس کی ایک جھلک لوگوں کے سامنے آجائے۔ ۱۹۸۶ء میں جب میں نے اپنی خود نوشت سوانح عمری لکھنا شروع کیا تو خاندانی تذکرے کے تیار شدہ مسودہ میں کافی ردوبدل کر کے اختصار کے ساتھ اسے اپنی سوانح عمری کا پہلا حصہ بنا دیا۔ یہ حصہ میرے خاندانی تسلسل کی بنا پر میری سوانح عمری کا ایک نہایت ضروری اور دلچسپ حصہ ہے۔ اپنی زندگی کے متعلق میں نے تمام دستاویزات کو حفاظت سے رکھا ہے اور میرے بچپن کے حالات جو میں نے اپنی دادی مرحومہ اور والدہ مرحومہ سے سنا ہے میرے ذہن میں اب تک محفوظ ہیں۔ اللہ کا فضل ہے کہ اس نے حافظہ ایسا عطا کیا ہے کہ مجھے اپنے اسکول کے زمانے سے لے کر آج تک کے تمام واقعات تفصیل کے ساتھ یاد ہیں اور میں ان تمام واقعات کو نہایت آسانی کے ساتھ بیان کر سکتا ہوں۔ مختلف الجھنوں کی وجہ سے مجھے یہ امید نہ تھی کہ میں اسّی برس کی عمر میں اپنی سوانح حیات لکھ بھی سکوں گا۔ چنانچہ میں نے اسے ایک ناممکن امر سمجھ کر اپنے ذہن سے نکال دیا تھا۔ اکتوبر ۱۹۸۵ء میں مجھے چند تحقیقی کاموں کے سلسلے میں اکثر خدا بخش لائبریری جانا ہوتا تھا۔ ایک روز واپس ہوتے ہوئے میں جناب ڈاکٹر

عابد رضا بیدار، ڈائرکٹر خدابخش لائبریری کے پاس بیٹھ گیا اور جب باتوں باتوں میں میری سوانح عمری کا ذکر آیا تو بیدار صاحب نے اصرار کیا کہ میں اپنی سوانح عمری ضرور لکھوں اور موصوف اس سلسلے میں میری ہر ممکن مدد کرنے کو تیار ہو گئے۔ چند ہی دنوں بعد مجھے موصوف کا گرامی نامہ موصول ہوا جس میں آپ نے فرمایا تھا کہ "آپ کی سہولت کے لیے ایک محرر لائبریری کی جانب سے متعین کیا جائے گا جو آپ کے سوانح حیات کا املا کرے گا اور اس کا معاوضہ لائبریری ادا کرے گی۔" ڈاکٹر عابد رضا بیدار جب سے خدابخش لائبریری کے ڈائرکٹر ہوئے ہیں انھوں نے لائبریری کے تمام کاموں کو نہایت ہی عمدگی اور تیزی سے آگے بڑھایا ہے خصوصاً کتابوں کی تصنیف و طباعت کے سلسلے میں اپنی سخت محنت اور گہری دلچسپی کا ثبوت دیا ہے اور اسے لائبریری کا ایک اہم کام بنا دیا ہے۔ میری سوانح عمری کی تصنیف کے لیے میری یہ مدد آپ کی ایسی ہی کوششوں کا ایک حصہ ہے جس کے لیے موصوف شکریہ کے مستحق ہیں۔ اس سلسلہ میں آپ کا جتنا بھی شکریہ ادا کروں وہ کم ہے۔ اگر میں یہ کہوں تو بے جا نہ ہوگا کہ میری سوانح عمری لکھی رہ جاتی اگر بیدار صاحب میرے سن کا خیال کرتے ہوئے میری مدد کے لیے کوئی محرر متعین نہ کرتے کیونکہ اکیاسی برس کی عمر میں اپنے ہاتھوں کی کمزوری کے باعث میں کسی لمبی تحریر پر قادر نہیں تھا۔ اس مہربانی کے علاوہ صاحب موصوف نے مختلف اخراجات کو مدنظر رکھتے ہوئے مجھے سات ہزار روپے کا چک ارسال فرمایا لیکن میں نے اس رقم کی کوئی ضرورت محسوس نہ کی اور اسے شکریہ کے ساتھ واپس کر دیا۔ بیدار صاحب نے میری سوانح عمری کے مسودے کی تیاری، کتابت اور طباعت کی کل ذمہ داریوں کو خود قبول فرما کر میرا کام بہت آسان کر دیا اور میری یہ سوانح حیات تقریباً سوا دو برس میں مکمل ہو کر طباعت کے لیے تیار ہو گئی۔

سوانح حیات میں حقیقت نگاری بڑی مشکل چیز ہے مگر میں نے واقعات کو ان کی اصلی صورت میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے اور کسی قسم کی رنگ آمیزی اور مبالغہ آرائی سے کام نہیں لیا ہے۔ اپنے دور کے تمام رسم و رواج اور طرز معاشرت کو جیسا میں نے پایا بلاکم و بیش بیان کر دیا ہے۔ معاصرین کے متعلق جو کچھ بھی میں نے لکھا ہے انصاف سے کام لیتے ہوئے ان کی سچی تصویریں پیش کی ہیں۔ ان کے تذکروں میں نہ تو کسی کی بے جا تعریف کی گئی ہے اور نہ بے بنیاد شکایت۔ ان تمام باتوں کا فیصلہ قارئین خود کر سکتے ہیں۔

میں سب سے پہلے بیدار صاحب کا بے حد شکر گزار ہوں جن کی وجہ سے میری سوانح عمری مکمل ہو کر طبع ہو سکی اور اس کام کے سلسلے میں خدا بخش لائبریری کے دو اسسٹنٹ لائبریرین جناب سلیم الدین احمد صاحب اور جناب محمود عالم صاحب کا بھی شکر گزار ہوں جنھوں نے اس کتاب کی کتابت و طباعت کا کام بڑی توجہ اور تندہی سے انجام دلایا۔ میں سب سے زیادہ جناب ابوالحسن اختر، جناب محمد ارشد، جناب منہاج عالم خاں اور جناب محمد شاہ جہاں قاسمی کا شکر گزار ہوں جنھوں نے میری سوانح حیات کے املا کرنے میں بڑی جاں فشانی سے میری مدد کی اور اپنے مشوروں سے میری کتاب کو بہتر بنانے میں میرا تعاون کیا۔ اللہ ان سب حضرات کو اس کا بہترین صلہ عطا فرمائے۔ آمین۔

اقبال حسین

اکزبیشن روڈ، پٹنہ ۸۰۰۰۰۱
(بہار)

پہلا حصّہ

میرا خاندان

سُناؤں کس کو جو کچھ عُمر بھر آنکھوں نے دیکھا ہے
کہ طولانی بہت اے داغؔ ہے یہ داستاں میری

(داغؔ)

پہلا باب

مظفر پور کے حالات، غدر کے بعد

شہر و شہری

میرے دادا مولوی امجد حسین مرحوم جن کا لڑکپن اور جوانی مظفر پور میں گذری، ان کا بیان ہے کہ ۱۸۵۷ء کے غدر کے بعد مظفر پور ایک چھوٹا سا شہر تھا، مگر بہت صاف اور ستھرا، سڑکیں ۵ یا ۶ سے زیادہ نہ تھیں، مکانات زیادہ تر ایک منزلہ تھے اور کھپرہ پوش، مکان کے پائیں میں اکثر ایک باغیچہ ہوا کرتا تھا جس میں آم، لیچی اور کٹھل کے درخت ہوتے تھے، علاوہ ازیں شہر کے باہر بھی زمینداروں کے بڑے بڑے باغات تھے جو ان کی آمدنی کا ذریعہ بھی ہوا کرتے تھے۔ جابجا دو منزلہ پختہ مکانات نظر آتے تھے جو خوش حال لوگوں کے تھے۔ شہر میں کوئی بڑی یا شاندار عمارت نہ تھی، عیدگاہ، ایک مسجد اور شیعوں کا ایک امام باڑہ شہر کو زینت بخشتا تھا، شہر میں مساجد کی کمی تھی، ایک مدرسہ تھا جس میں عام لوگوں کو ابتدائی اور علم دین کی تعلیم دی جاتی تھی۔ اہل ثروت خواہ وہ ہندو ہوں یا مسلمان اپنے لڑکوں کو اچھے استادوں کو ملازم رکھ کر فارسی، ہندی اور اردو کی تعلیم دلاتے تھے۔ شیخ سعدی کی گلستاں اور بوستاں کو پڑھنا ہندو اور مسلمان نصاب تعلیم کا ایک ضروری جزو سمجھتے تھے، تعلیم کا عام رواج نہ تھا، زیادہ لوگ ان پڑھ تھے۔ شہر کی آبادی ہندو اور مسلمانوں پر مشتمل تھی جس میں مسلمانوں کا تناسب بہت کم تھا۔ ایک دو خاندان عیسائیوں کا بھی بستا تھا جو عموماً سرکاری ملازم تھے۔ مشتمل آبادی میں کفتری اور بھومیہار عام طور سے فارغ البال اور صاحب ثروت تھے۔ باوجود دولت ہونے کے ان میں کوئی ظاہری شان و شوکت نہ تھی۔ ہندو اور مسلمان دونوں آپس میں میل ملاپ اور خیرسگالی کے ماحول میں زندگی گزارتے تھے۔ لیکن حقیقت یہ تھی کہ ہندو حضرات مسلمانوں کا احترام اس وجہ سے کرتے تھے کہ ان کے آباء و اجداد نے مسلمانوں کی شان و شوکت اور انسانی ہمدردی کا مظاہرہ خود اپنی آنکھوں سے دیکھا

اور تجربہ کیا تھا۔

شرفا کی طرز رہائش اور عوام الناس :

ہندو اور مسلمان شرفا کا شعار تھا کہ اپنے گھروں سے بہت کم آیا جایا کرتے تھے، بازاروں اور گلی کوچوں میں آنا جانا کسر شان سمجھتے تھے، اگر بالفرض کسی وجہ سے نکل پڑے تو عام لوگوں سے گفتگو کرنے کا کیا ذکر اپنے دوستوں سے بھی بہت کم ہم کلام ہوتے تھے اور ضروری کاموں سے فراغت کے بعد فوراً گھر لوٹ جاتے، کیونکہ شرفا کا عام ذہن بن چکا تھا کہ اس سے زبان اور طرز معاشرت میں خرابیاں پیدا ہوجاتی ہیں۔ عام اور بازاری لوگوں کے ساتھ میل جول سے پرہیز کرتے کہ ان کا اثر شعوری یا غیر شعوری طور سے شرفا پر نہ پڑ جائے۔ شرفا پیدل چلنا کسر شان سمجھتے تھے۔ اندرون شہر یا شہر کی قریب ترین جگہوں پر جانے کے لیے عام طور سے پالکیوں کا استعمال کرتے تھے۔

عوام الناس محنتی، سادہ لوح اور قوانین و ضوابط کے پابند تھے۔ ان کی تفریح طبع کا کوئی ذریعہ نہ تھا جہاں وہ محنت و مشقت کرنے کے بعد اپنے وقت کو صرف کریں۔ ان کی تفریح طبع کا واحد ذریعہ ہندو زمینداروں کی شادی کی تقریبات تھیں جو نہایت دھوم دھام سے منائی جاتی تھیں۔ ان تقریبات میں بھانڈ اور رقاصائیں اپنے فن کا مظاہرہ کرتے اور عام لوگ اس میں شریک ہوکر اپنا وقت خوشی سے گذارتے اور لطف اندوز ہوتے۔ ہندوؤں کے مقابلہ میں مسلمانوں کے یہاں اس قسم کی تقریبات عموماً سادگی سے انجام پذیر ہوتی تھیں۔ کیونکہ اتنی دولت نہ تھی کہ ان کے اخراجات کے متحمل ہوسکیں۔ مسلمانوں کی شان و شوکت اور مال و دولت انگریزوں کی بے ایمانی اور دست درازی کی نذر ہوچکی تھی۔

ہندو مسلم اتحاد :

دیوالی اور محرم ہندو اور مسلمان دونوں مل کر مناتے تھے۔ راقم نے مندرجہ بالا منظر کی ایک ہلکی اور دھندلی سی جھلک جنوری ۱۹۱۹ء میں دیکھی تھی، لیکن دسمبر ۱۹۸۱ء میں جب راقم کو آخری بار مظفر پور جانے کا اتفاق ہوا تو دیکھا کہ ان قدیم روایات سے مظفر پور کو کوئی واسطہ نہیں رہا، وہ تمام چیزیں ختم ہوچکی ہیں، اس کے برعکس اب یہ شہر بنیوں، بقالوں اور سیاستدانوں کا اڈہ بن گیا ہے۔ اسی کے ساتھ ہی وہ صفائی اور ستھرائی جو قدیم زمانے میں تھی بالکل ختم ہوگئی ہے۔

دُوسرا باب

مُنشی حیدر بخش

مظفر پور کے محلہ کمی سرائے میں ہمارے پردادا منشی حیدر بخش صاحب آباد تھے جو متوسط طبقے کے زمیندار تھے۔ ان کے تین قطعہ پکے مکانات تھے اور دو تین باغات آم، لیچی اور کٹھل کے علاوہ خود کاشتہ زمین بھی تھی جس کی آمدنی سے زندگی کی ضروریات کی تکمیل ہوتی اور فارغ البالی سے زندگی بسر ہوتی۔

ملازمت، مظفر پور میں ۱۸۵۷ کا غدر اور منشی حیدر بخش کی خدمات :

انگریزوں کے اصرار پر سرکاری ملازمت اختیار کی اور ان کے ذمہ مہتمم و ناظر فوجداری کورٹ ترہت مظفر پور کی خدمات سپرد ہوئیں۔ ان کی ماتحتی میں پانچ نائب ناظر بھی مقرر تھے، نہایت خوش اسلوبی سے تقریباً آٹھ سال تک دیانت داری اور وفاداری سے اپنی خدمات کو انجام دیتے رہے۔ اعلیٰ حکام ہمیشہ ان کی تعریف کرتے اور خوش رہتے تھے۔ اسی دوران میں ۱۸۵۷ء کا غدر ہوا مظفر پور بھی اس شورش سے متاثر ہوا۔ بلوائی اس پر تلے ہوئے تھے کہ سرکاری خزانہ لوٹ لیا جائے اور شہر تباہ و برباد کر دیا جائے۔ انگریز حکام اس قسم کی باتوں سے باخبر رہتے تھے۔ لیکن وہ مطمئن تھے کہ منشی حیدر بخش حکومت برطانیہ کے نہایت وفادار ملازم ہیں، وہ اس ہنگامہ کو فرو کرنے میں اپنی جان کی بازی لگا کر شہر کو بچا لیں گے اور ہوا بھی ایسا ہی۔ گھوڑ سوار اور غیر فوجی رسالے شہر پر حملہ آور ہوا مگر منشی حیدر بخش نے اپنی حکمت عملی سے شہر کو لوٹے جانے سے بچا لیا، اور سرکاری خزانہ بھی محفوظ رہا۔ جیسا کہ انگریزوں کو ان کی ایمان داری اور وفاداری پر بھروسہ تھا منشی حیدر بخش نے عملاً ثابت کر دیا اور اس خدمت کی انجام دہی سے انگریز بہت خوش ہوئے اور انگریزی حکومت نے ایک سند اعزازی اور پانچ ہزار روپیے کی تھیلی بطور انعام عنایت کی نیز

ایک تلوار مرصع دی ۔ اس کی تصدیق ایک سرکاری پروانہ سے ہوتی ہے جس انگریزی پروانے کا اردو ترجمہ درج ذیل ہے :

" لفٹیننٹ گورنر کو مسٹر سیموئلس کمشنر پٹنہ کی ایک رپورٹ سے جو انھوں نے بھیجی ہے یہ جان کر بہت خوشی ہوئی کہ اس موقع پر جب مظفرپور کے غیر فوجی گھوڑسوار رسالے کے دستے نے بغاوت کی تو آپ نے شہری پولس کو اکٹھا کیا سواروں کا مقابلہ کیا اور اپنی جدوجہد کے ذریعہ باغیوں سے شہر کو لوٹے جانے سے بچا لیا آپ کا اس موقع پر یہ وفادارانہ عمل بہت زیادہ لائق تحسین ہے اور انعام کا مستحق بھی ، چنانچہ کمشنر کو حکم صادر کیا گیا ہے کہ اس خط کے ساتھ ایک خوب صورت تلوار اور پانچ ہزار روپیے کی تھیلی بطور انعام پیش کرے ۔"

غدر کے اختتام کے بعد جب لفٹیننٹ گورنر نے اپنا دربار کیا تو انھیں Certificate of Honour (اعزازی سند) سے سرفراز کیا ۔ انگریزی پروانہ کی اصلی عبارت درج ذیل ہے :

" The Secretary to Government of Bengal:

The Lieutenant-Governor has learnt with much pleasure from a Report made by Mr. Samuels, the commissioner of Patna, that on the occasion of the mutiny of the detachment of irregular cavalry at Muzaffarpur you rallied the town Police, opposed the savars and exerted yourself in preventing the latter from plundering the town. Your faithful conduct on the above occasion deserves much praise as well as reward and the Commissioner has accordingly been

authorised to present to you alongwith this letter a handsome sword and a purse of Rs. 5000/=

Later on he was presented with a Certificate of Honor."

ان کی خدمات سے خوش ہوکر پٹنہ کے کمشنر نے شہر کے گردونواح میں زمین دینا چاہا جس پر آبادی قائم تھی، تھوڑی سی زمین جو اس وقت لودی پور نیر ندن پور کھدونیا پرگنہ عظیم آباد کہلاتی تھی جس کا کچھ حصہ اب قدم کنواں اور کچھ حصہ بورنگ روڈ کے نام سے مشہور ہے اور جس کی سالانہ آمدنی بہت کم تھی لینا قبول کیا۔ زمینداری کے ختم ہونے سے پہلے تک اس زمین پر راقم کے والدِ مرحوم کا قبضہ تھا۔ راقم کے دادا امجد حسین صاحب مرحوم نے ان زمینوں کو اپنے راجپوت رعیتوں کو خوش کرنے کے لیے پرانے دس انگریزی پیسہ فی کٹھہ پر بندوبست کر دیا۔ زمینداری کے اختتام سے بہت دنوں پہلے ان زمینوں کی قیمت پچھتر روپیے فی کٹھہ تھی جو فی زمانہ پچاس ہزار روپیے فی کٹھہ فروخت ہو رہی ہے۔ والدِ مرحوم نے رعیت کو راضی رکھنے کے لیے زیادہ لگان پر بندوبست کرنے کو خودداری کے خلاف جانا۔ جب زمینداری کا خاتمہ ہوا تو راقم نے کل کاغذات کو لینڈ ریفارم آفیسر، پٹنہ کے حوالہ کر دیا۔ زمینداری کے خاتمے کے ساتھ ایک اگلی یادبھی ختم ہو گئی۔

"دعا دیتا ہوں رہزن کو ....."

صحت، وضع قطع اور محاسن :

منشی حیدر بخش اپنی جوانی میں صحت مند اور خوش رو انسان تھے۔ رنگ گورا، چھریرا بدن، قد موزوں، چہرہ گول، پیشانی چوڑی تھی۔ داڑھی اپنے قول کے مطابق شرعی رکھتے تھے یعنی داڑھی کی لمبائی ایک مشت و ایک انگشت اور مونچھیں تراشی ہوئی۔ زلف پٹے دار رکھتے تھے۔ لباس خوش وضع ہوتا تھا، جسم کی بناوٹ کی وجہ سے جو کچھ زیب تن کرتے بھلا معلوم ہوتا تھا۔ تقریبات میں جس وضع قطع سے شرکت کرتے تھے ہر کس و ناکس کی نگاہ کا مرکز بن جاتے۔ خاص سرکاری تقریبات میں شرکت کے وقت ایسے کپڑوں میں ملبوس ہوتے کہ ان کی نمایاں حیثیت ہوتی تھی۔ ہندوستانی ہو یا انگریز سب میں یہ تاثر پیدا ہوتا کہ ایک مغل درباری اپنی تمام آن بان کے ساتھ

رونق مجلس ہے۔ موصوف کی آواز نہایت بلند تھی، غصہ کی حالت میں دشمن پر ان کی آواز کا ایسا اثر ہوتا کہ اس کے پاؤں اکھڑ جاتے۔ مظفر پور میں غدر کے فرو کرنے میں ان کی گرجدار آواز بلوائیوں کی ہمت شکنی اور سپاہیوں کی ہمت افزائی میں بھی بہت موثر رہی۔

موصوف کی صحت کا راز خورد و نوش کے علاوہ وہ ورزش تھی جو معمولاً بلاناغہ کیا کرتے تھے۔ راقم نے ان کی تصویر دیکھی ہے۔ کاش وہ تصویر ہمارے گماشتہ نجابت حسین کے بیٹے وراثت حسین نے غائب نہ کی ہوتی تو آج راقم ناظرین کی خدمت میں پیش کرتا تاکہ ان کی شخصیت کا کچھ اور نمایاں و بہتر خاکہ ناظرین کے دل و دماغ پر مرتسم ہو سکتا۔ افسوس کہ اس تصویر کے ساتھ تقریباً پچاس اور تصویریں میرے خاندان کے افراد کی تھیں۔ ان کے علاوہ شہنشاہ جارج پنجم کی قد آدم تصویر بھی تھی۔ اس شخص نے ان تصویروں کو کیا کیا، گمان ہوتا ہے کہ تصویریں تو اس کی نگاہ میں کچھ اہمیت نہیں رکھتی ہوں گی، ہاں خوب صورت فریم اور شیشوں کو اس نے ضرور بیچ کھایا ہوگا۔ جب اس سے پوچھ تاچھ شروع ہوئی تو اس نے ان مسلم ستم زدہ ریفیوجیوں کو جو دسمبر ۱۹۴۶ء میں ہندوؤں کے ظلم و ستم کا شکار ہو کر میرے گھر نیورہ ضلع پٹنہ میں پناہ گزیں تھے، مورد الزام ٹھہرایا۔

موصوف ظاہری محاسن کے ساتھ معنوی خوبیوں سے بھی مزین تھے۔ خدا نے انھیں فطانت اور ذہانت سے خوب نوازا تھا۔ ایمانداری اور دیانت داری ان کا شعار تھا۔ انسانی ہمدردی اور اقربا پروری تو گویا ان کی گھٹی میں ملی تھی۔ وفاداری اور ثابت قدمی کو کبھی ہاتھ سے نہ جانے دیا۔ عقائد کے لحاظ سے حنفی المذہب تھے مگر اہل بیت سے بے پایاں محبت کرتے تھے۔ کہا کرتے تھے کہ اہل بیت مثل کشتی نوح کے ہیں، جس نے ان کو پکڑا اس کو ہر طوفان سے نجات مل گئی۔ خیر و برکت کے لیے اپنے ہر لڑکے کے نام کے ساتھ لفظ حسین لگایا۔ راقم کا پانچ پشت سے حسین خاندانی نام ہو گیا ہے۔ اللہ اس خاندانی نام کو عرصۂ دراز تک قائم رکھے۔ ہم لوگوں کو اس نام پر بڑا فخر ہے۔

موصوف ہمیشہ پابند نماز رہے حتیٰ کہ تہجد کی نماز بھی قضا نہ کرتے۔ ان کا انداز فکر ہمیشہ صوفیانہ رہا، یہی وجہ ہے کہ تا قید حیات سب سے اس بات کی تلقین کرتے رہے کہ "ہر چہ گیرید مختصر گیرید" اور خود زندگی بھر اس قول پر عمل کرتے رہے۔ یہ استغنا اب تک راقم اور اس کی اولاد میں باقی ہے اور یہ مقام شکر خدا ہے۔

مولوی سراج الدین پیشکار کنٹونمنٹ مجسٹریٹ دانا پور جن کی تعلیم و تربیت میں راقم کے

داداجان مرحوم کا بہت ہاتھ تھا اور جن کی وفات کو چالیس سال سے زیادہ ہوئے۔ اپنے والد مرحوم کے حوالہ سے ساٹھ برس پہلے راقم سے کہا کرتے تھے کہ لوگ حیدر بخش صاحب کی زندگی کے واقعات کو کبھی فراموش نہ کریں گے جو انھوں نے صفت فیاضی اور دریادلی کی بنا پر بے شمار یتیم و نادار لڑکیوں کی شادیاں اپنے اخراجات سے کرائی تھیں۔ اللہ کرے ایسے لوگ آج کے دور میں بھی پیدا ہوں اور اس روایت پر عمل کریں۔

معاصرین :

موصوف کے دو معاصر جو اُن کے دوستوں میں سے تھے ان کا ذکر کرنا بے محل نہ ہوگا کیونکہ بغیر ان لوگوں کے تذکرے کے منشی حیدر بخش کی سوانح حیات میں ایک خلا رہ جائے گا۔ ان میں سے ایک منشی سید نجم الدین صاحب تھے جو مہاراجہ بتیا کے دیوان تھے۔ وہ خود فرماتے تھے کہ ان کی تقرری مسٹر ڈبلو ٹیلر آئی سی ایس کی ایما پر ہوئی تھی۔ غدر کے زمانے میں انھیں کے مشورہ واثر سے مہاراجہ بتیا نے انگریزوں کے خلاف کوئی قدم نہ اٹھایا بلکہ انگریزوں کے موافق رہا۔ اول الذکر منشی صاحب کے بارے میں ٹیلر صاحب نے اپنی کتاب "تھرٹی ایٹ ایرس ان انڈیا" جلد دوم ص ۲۸۲ و ۲۸۳ میں نہایت تفصیل و تعریف کے ساتھ لکھا ہے

منشی نجمُ الدین :

نجم الدین صاحب ایک خدا ترس، مذہبی اور ایماندار آدمی تھے۔ کلام اللہ نہایت خوش الحانی سے پڑھا کرتے تھے۔ مہارانی بتیا نے جب کسی موقع پر ان کا قرآن پڑھنا سنا تو انھوں نے منشی نجم الدین صاحب کو حکم دیا کہ ایک خوش آواز حافظ قرآن کی تقرری کرو جو مجھے قرآن پاک سنایا کرے۔ لہذا حکم کی تعمیل ہوئی اور مہارانی بتیا روزانہ پوجا کے بعد [illegible] تک کلام پاک کی تلاوت سنتی رہی۔

منشی نجم الدین صاحب عالم ہونے کے علاوہ علم دوست بھی تھے۔ بتیا میں انھوں نے ایک لائبریری قائم کی جو اب تک موجود ہے۔ علاوہ ازیں اسی شہر میں ایک مسجد بھی بنوائی جو آج بھی نجم الدین صاحب کی یاد دلاتی ہے۔ ملازمت کے بعد اپنے وطن مالوف نیورہ ضلع پٹنہ چلے گئے۔ اپنے بنگلے کے بغل میں ایک چھوٹی سی مسجد بنوائی اور ہمیشہ اسی میں عبادت و ریاضت مرتے دم تک کرتے رہے۔

نجم الدین صاحب کے ایک پوتے جن کا نام سید علی حسین شاہ تھا عین جوانی میں گھر چھوڑ کر دیوا شریف ضلع بارہ بنکی چلے گئے۔ تاقیدِ حیات حضرت حاجی وارث علی شاہ صاحب کی خدمت گزاری کرتے رہے۔ شاہ صاحب ان کو عزیز رکھتے تھے۔ راقم کو ایک مرتبہ آج سے پچاس برس پہلے تین چار دوستوں کے ساتھ دیوا شریف جانے کا اتفاق ہوا، واپسی میں سید علی حسین شاہ لکھنؤ آنے کے لیے ساتھ ہوئے۔ جب ہم لوگ بارہ بنکی اسٹیشن پر پہنچے تو ریل کا ٹکٹ لینے کے لیے بکنگ ونڈو پر گئے۔ جہاں انھوں نے ایک نہایت بدشکل آدمی کو ٹکٹ فروخت کرتے ہوئے دیکھا، بغیر ٹکٹ خریدے ہم لوگوں کے پاس واپس پلٹ آئے۔ فرمایا کہ اللہ جمیل ہے اور جمیل کو دوست رکھتا ہے۔ معاذ اللہ میں ایسے بدشکل انسان سے ٹکٹ کیسے خرید سکتا تھا۔ ان کی اس بات پر ہم لوگ خوب ہنسے اور کہا کہ حضور خوش شکل بابو کب آئے گا؟ جواب دیا کہ جب اللہ چاہے گا۔ کچھ ایسا ہی ہوا ایک گھنٹے کے اندر ہی ایک خوش شکل بابو ٹکٹ بیچنے آیا جس کو بہت دعائیں دے کر علی حسین نانا نے ٹکٹ خریدا اور بہت آرام اور خوشی سے سفر تمام ہوا۔

دیوان سید مولیٰ بخش :

منشی حیدر بخش کے دوسرے ہم عصر دیوان سید مولا بخش صاحب تھے۔ بہت حیرت ہے کہ باوجود اختلافِ مزاج و ذہن کیوں دونوں میں مرتے دم تک تعلق برقرار رہا۔ مسٹر ولیم ٹیلر آئی سی ایس نے اپنی مذکورہ بالا کتاب میں ان کا تذکرہ کیا ہے۔

دیوان صاحب موصوف نہایت ہوشیار تھے۔ معاملہ فہمی اور وقت شناسی کا ملکہ خدا نے بہت دیا تھا۔ غدر کے زمانے میں انگریزوں کے طرفدار رہے اور وفادارانہ خدمت کے صلے میں بہت سے انعامات و اکرامات حاصل کیے۔ ٹیلر صاحب رقم طراز ہیں کہ جب وہ لفٹیننٹ گورنر سر جان لورنس کے دربار میں سند لینے کے لیے آگے بڑھے تو نہایت بلند آواز سے کہا "بالکل ٹیلر صاحب، بالکل ٹیلر صاحب"۔ ٹیلر صاحب نے اس کا مفہوم یہ نکالا کہ وہ آج بھی ان کے احسانات کے ممنون ہیں اور اس کا کھلے دربار میں اظہار کر رہے ہیں۔ (ایضاً ص ۲۸۴، ٹیلر)

دیوان مولا بخش کے خاندان کے لوگ آج کل موضع رسول پور ضلع مظفر پور میں آباد ہیں۔ ان کے دو پوتے سید اعجاز حسن خاں صاحب مرحوم اور دوسرے سید ریاض حسین خاں صاحب ہم نہایت ہی باوقار زندگی گزارتے تھے۔ سید اعجاز حسن خاں اور سید ریاض حسین خاں صاحب

اعلیٰ تعلیم یافتہ انسان اور صوبہ بہار کی نامور ہستیوں میں تھے ۔ الحاج سید ریاض حسین خاں صاحب کا شمار اچھے شاعروں میں تھا ۔ اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے ۔ خیال تخلص تھا ۔ دونوں بزرگ راقم کے والدِ مرحوم کے نہایت عزیز دوست تھے اور آخر وقت تک مخلصانہ اور برادرانہ تعلقات قائم رہے ۔ ہر خوشی اور غم میں برابر کے شریک رہے ۔ بڑے شریف النفس لوگ تھے ۔ تجرد کی زندگی بسر کی ۔ راقم آج تک ان دونوں بزرگوں کو یاد کرتا ہے ۔ ان کے تیسرے بھائی کی شادی ہوئی جن کے لڑکے الحاج سید احمد حسن خاں کچھ مہینوں تک پٹنہ کالج میں اردو کے لکچرر رہے تھے ، بعد ازاں تاحیات مظفر پور کے رام دیالو کالج میں اردو فارسی کے پروفیسر رہے ۔ میرے عزیزترین شاگردوں میں سے تھے ۔ موت سے ایک دن قبل ملاقات کو آئے ، نہایت صحت مند تھے اور بیماری کی کوئی نشانی بھی نہ تھی ۔ یہاں سے مظفر پور گئے ، اسی دن رات کو قلب کی حرکت بند ہو جانے سے قضا کیا ۔

ازدواجی زندگی، اولاد اور موت :

منشی حیدر بخش صاحب کی ازدواجی زندگی بہت خوش گوار تھی ۔ اپنے اہل و عیال سے بہت محبت کرتے اور ایک امانت دار کی حیثیت سے نہایت ایمانداری سے پرورش و پرداخت اور دیکھ بھال کرتے تھے ۔ کسی کو شکوہ کا موقع نہ دیتے ۔ بیوی بچے سب ان کی عزت و احترام کرتے ۔ موصوف بہت وفا شعار انسان تھے ۔ اہلیہ کا انتقال منشی حیدر بخش کی وفات سے پانچ چھ سال قبل ہوا جس کے بعد وہ مغموم رہنے لگے اور تاحیات مرحومہ کو بھلا نہ سکے ۔ اچانک ۷۵ سال کی عمر میں حرکتِ قلب بند ہو جانے سے راہیِ عدم ہوئے ۔ منشی صاحب کوئی دولت مند آدمی نہ تھے ۔ زر اندوزی کا کبھی دل میں خیال نہ آیا ۔ فارغ البالی، سخاوت اور وضعداری کے ساتھ زندگی گزارتے تھے ۔ اللہ کا شکر ہے اور ان کی دعاؤں کا اثر ہے کہ آج تک راقم، اس کے بیٹے اور پوتے اپنی چھٹی پشت میں بھی اس طرح کی استغنائی کا مظاہرہ کرتے ہیں ۔

منشی حیدر بخش صاحب کی اولاد میں چار لڑکے اور ایک لڑکی تھی ۔ لڑکی کی شادی اپنی زندگی میں الحاج مولوی فضلِ رب صاحب جو کر پٹنہ ضلع کے اچھے زمینداروں میں سے تھے سے کی ۔ شادی کے چند سال بعد لڑکی کا انتقال ہو گیا ۔ ان کے بطن سے کوئی اولاد نہ ہوئی ۔ مولوی صاحب موصوف کا زیادہ تر قیام مظفر پور میں رہتا تھا جہاں انھوں نے خود اپنا ذاتی مکان محلہ

پکی سرائے میں بنوایا تھا۔ ان کا ایک بنگلہ اکزیبیشن روڈ پٹنہ میں بھی تھا جو اپنے زمانے میں ایک اچھا مکان سمجھا جاتا تھا۔ اس مکان میں گاہے گاہے ان کا قیام ہوتا تھا۔ ویسے زیادہ تر کرایہ دار رہا کرتے تھے۔ ان کے مرنے کے بعد ان کی دوسری بیوی کے متبنیٰ محمد نصیر الدین احمد نے اس مکان کو ہمارے والد مرحوم کے ہاتھ فروخت کیا۔ بنگلے کے کمپاؤنڈ کا ایک حصہ ڈپٹی خواجہ محمد ابراہیم ساکن شہر پٹنہ کو فروخت کر دیا۔ ڈپٹی خواجہ محمد ابراہیم کی موت کے بعد ان کی بیوی کے رشتہ داروں نے اس زمین کو جگناتھ سنگھ ساکن ضلع چھپرہ کے ہاتھ فروخت کر دیا۔ آج کل اس زمین پر چہار منزلہ عمارت کھڑی ہے۔ یہ پہلا اتفاق ہے کہ راقم کے خاندان کی جائداد کسی ہندو کے ہاتھ فروخت کی گئی ہو۔

———— ❖ ————

تیسرا باب

مولوی امجد حسین

پیدائش، تعلیم، انگریزی میں مہارت :

منشی حیدر بخش کے سب سے بڑے صاحبزادے میرے دادا جناب مولوی امجد حسین صاحب تھے۔ ان کی ولادت ۱۸۳۰ء میں مظفر پور میں ہوئی۔ گھر کا ماحول مذہبی تھا، تعلیم و تربیت بھی اسی طرح کی ہوئی۔ اس زمانے میں علوم شرقیہ کی تعلیم کا عام رواج تھا، گرچہ جدید علوم کی درس و تدریس بھی شروع ہو چکی تھی لیکن موصوف کی تعلیم و تربیت مشرقی تہذیب و تمدن کے مطابق ہوئی۔ ابتدائی تعلیم خود اپنے والد محترم سے ہوئی۔ مظفر پور ہی میں اردو و فارسی و عربی کی تعلیم حاصل کی۔ اور اس کے بعد تکمیل کے خیال سے لکھنؤ گئے۔ اور وہاں دو تین سال تک خود کو اکتساب علم میں مشغول رکھا۔ اسی جگہ کسی انگریز پادری سے انگریزی پڑھنا، لکھنا اور بولنا بھی سیکھا، جو ان کے دوران ملازمت بہت معاون اور کارآمد ثابت ہوئی۔ اردو اور انگریزی میں پختہ خوشخط تھے۔ بیشمار انگریز افسروں نے ان کی انگریزی دانی کی تعریف کی ہے اور اس پر حیرت کا اظہار بھی کیا ہے کہ اس زمانے میں مسلمان اتنی انگریزی کیسے سیکھ سکا۔ اس بارے میں راقم کے پاس انگریزوں کے بے شمار خطوط اور اسناد موجود ہیں۔

عقیدہ، تجارت، ملازمت، شادی اور اولاد :

عقیدہ کے لحاظ سے اہل حدیث تھے۔ نماز اور روزہ کے سخت پابند تھے۔ اس زمانے کے اکثر رسالوں میں مذہبی مضامین لکھا کرتے تھے۔ چنانچہ جب مرزا حیرت نے واقعات کربلا کے بہت سے واقعات سے انکار کیا تو دادا مرحوم نے تاریخی حوالوں کی روشنی میں اس کی زبردست تردید کی۔ پنڈت رتن ناتھ سرشار سے بھی ان کے تعلقات اچھے تھے۔

فراغت علم کے بعد غلہ کی تجارت شروع کی اور کامیاب بھی رہے مگر باپ کے اصرار سے اگرچہ ملازمت سرکاری پسند نہ تھی، اختیار کی۔ اول ان کی تقرری مظفرپور میں بحیثیت نائب ناظر ہوئی۔ ملازمت کے فوراً بعد اپنی ہی رشتہ داری میں شادی ہوئی جن کے بطن سے صرف ایک لڑکی پیدا ہوئی اور پھر ان کی اہلیہ کا انتقال ہو گیا۔ ان صاحبزادی کے بطن سے بھی صرف ایک لڑکا پیدا ہوا جن کا نام سید محمد ابراہیم تھا، ان کا پیشہ معلمی تھا، آج سے تقریباً بیس سال پہلے انتقال کیا۔

مولوی امجد حسین صاحب کی پہلی بیوی کے انتقال کے بعد ان کا تبادلہ ناظر کے عہدہ پر شہر آرہ، ضلع شاہ آباد میں ہوا جہاں عرصہ دراز تک سرکاری ملازمت میں رہے۔ ان کی خدمات سے خوش ہو کر انگریزی حکومت نے آخری وقت میں انھیں مالیات کا افسر مقرر کیا۔

دوسری شادی اور اولاد :

دادا مرحوم کی دوسری شادی سید عبدالوہاب صاحب متوطن نیورہ ضلع پٹنہ کی صاحبزادی سے ہوئی۔ شادی کے بعد سسرال میں ایک اچھا خاصہ مکان بنوایا جس کے پائیں میں ایک باغیچہ بھی لگایا۔ مستقلاً وہیں قیام پذیر ہو گئے۔ چونکہ آرہ میں ناظر تھے اور نیورہ دارہ میں بہت زیادہ دوری نہ تھی اس لیے برابر نیورہ آتے جاتے رہے۔ ان کی صرف ایک اولاد تھی، جن کا نام احمد حسین تھا اور جو راقم کے والد بزرگوار تھے۔ باپ بیٹے ایک دوسرے سے بے انتہا محبت کرتے تھے۔ والد بزرگوار کے نانا مولوی سید عبدالوہاب صاحب بہت مذہبی مزاج کے انسان تھے۔ انھوں نے ہی نیورہ میں ایک مسجد بنوائی۔ آج سے پچپن برس پہلے سر سید علی امام صاحب کی والدہ محترمہ نے اس مسجد کی عمارت کی ازسرنو نہایت ہی شاندار طریقے سے تعمیر کرائی جو اس گاؤں کی بڑی زینت ہے۔

خان بہادر سید ظہیر الدین :

عبدالوہاب صاحب مرحوم کی دعاؤں کی بدولت ان کے بیٹے خان بہادر سید ظہیر الدین تیس سال تک اعزازی مجسٹریٹ رہے، بیس سال تک پٹنہ ڈسٹرکٹ بورڈ کے وائس چیرمین رہے، پانچ سال تک اسی بورڈ کے چیرمین بھی رہے۔ ان کی انفرادیت یہ ہے کہ یہ پہلے ہندستانی چیرمین ہوئے۔ اس سے پہلے انگریز کلکٹر ہی چیرمین ہوا کرتا تھا اور پانچ سال ممبر آف کاؤنسل

آف اسٹیٹ دہلی رہے ۔ مرحوم خان بہادر کے دو لڑکے تھے جن میں ایک مولوی سید نذیر الدین مرحوم بہار میں ایک نامی ڈپٹی کلکٹر گذرے ہیں جن کے لڑکے الحاج سید سلیم الدین جو راقم کے ہم سن ہیں، اپنے مکان جنیک روڈ پٹنہ میں آج بھی زمیندارانہ زندگی گزار رہے ہیں۔ دوسرے صاحبزادے خان بہادر سید بشیر الدین مرحوم پٹنہ ہائی کورٹ میں بیرسٹری کرتے تھے۔ ان کی صلاحیت اور ایمان داری کی شہرت کے باعث حکومت انگلشیہ نے انھیں ضلع جج مقرر کیا۔ پنشن پاکر جوائنٹ پبلک سروس کمیشن کے ممبر مقرر ہوئے۔ ان کے صاحبزادے الحاج مسٹر سید وصی الدین پٹنہ اور کشمیر ہائی کورٹ کے جج رہے ہیں۔ آج کل جنیک روڈ پٹنہ میں ایک اچھا خاصہ مکان بناکر اسی میں قیام پذیر ہیں۔

قد و قامت اور وضع قطع :

میرے دادا رنگ کے صاف، قد کے لمبے، چہرہ کتابی جس پر خشخشی داڑھی تھی، لباس لکھنوی یعنی اچکن اور چوڑی مُہری کا پائجامہ، سر پر سیاہ مخمل کی ٹوپی پہنتے تھے، جوتا سلیم شاہی ہوتا تھا۔ ایک بار لوگوں نے ان سے پوچھا کہ آخر آپ نے اپنے والد کا لباس اور وضع قطع کیوں نہ اختیار کیا؟ جواباً عرض کیا کہ انھوں نے مغلوں کی حکومت کو دیکھا تھا جس کو اُس دور کا ہر مسلمان خود اپنی حکومت تصور کرتا تھا۔ اب تو میں کیا، تمام ہندوستان انگریزوں کا غلام ہے اب وہ وضع قطع اور پوشش غلامی میں زیب نہیں دیتی ہے۔ دادا صاحب مرحوم کے پاس انگریزی قسم کی ایک ٹم ٹم تھی جس کو اس زمانے میں ہبو کارٹ کہتے تھے اسی پر چڑھ کر کچہری جایا کرتے تھے۔

موصوف نے زندگی بھر سفید کپڑوں کے علاوہ رنگین کپڑے شاید ہی کبھی پہنے ہوں۔ ہر روز یعنی چوبیس گھنٹہ کے بعد لباس تبدیل کر دیا کرتے تھے کیونکہ مزاج میں صفائی بے انتہا تھی۔ ہر چیز میں صفائی دیکھنا چاہتے تھے۔

مولوی امجد حسین کے احباب :

دادا مرحوم کے احباب کا حلقہ بہت وسیع تھا، مہمانوں کی خاطر تواضع اور دوستوں کی خوب دعوتیں کرتے تھے، آم کے بہت شوقین تھے۔ آم کھانے اور کھلانے میں بہت فراخ دلی سے کام لیتے تھے۔ آم کے دنوں میں پکے آموں کا اماوٹ شہد کی تہ لگا کر بناتے۔ خود کھاتے کھلاتے اور دوستوں کو تحفتاً بھیجتے تھے۔

آرہ کی تفریحی مجلسیں :

اس زمانے میں سرکاری ملازمین کا معمول تھا کہ ہفتہ بھر کام کرنے کے بعد تفریح طبع کے لیے کسی دوست کے یہاں سنیچر کی شام کو اکٹھا ہوتے اور تفریحی مجلس کا انعقاد کرتے اور دل بہلاتے اس دن جس کے یہاں مجلس کا انعقاد ہوتا اسی کے یہاں رات کا کھانا سب دوست مل کر کھایا کرتے تھے۔ ہمارے دادا اور ان کے دوست زیادہ تر سنت پرشاد کے مکان پر جمع ہوتے تھے۔ ۱۹۳۴ء میں انھیں کے لڑکے مسٹر جسٹس سکھ دیو پرشاد ورما پٹنہ ہائی کورٹ کے جج ہوئے۔ مسٹر جسٹس ورما کے صاحبزادے پروفیسر ایس پی ورما (بہار انجنیئرنگ کالج) راقم کے عزیز دوست تھے۔ ان محفلوں میں میرے دادا کے علاوہ مونرہ کے سید ظہیر الدین (بعد میں خان بہادر) سید نصیر الدین (بعد میں خان بہادر اور سی آئی ای) اور سید امداد امام اثر (بعد میں شمس العلماء و نواب) کے علاوہ حکیم یعقوب، ڈپٹی شیر علی اور ڈپٹی سنت پرشاد شریک تفریح رہا کرتے تھے۔ سید نصیر الدین صاحب کم تشریف لاتے تھے۔ اس نشست کے واقعات کو ڈپٹی سنت پرشاد صاحب نے راقم کی موجودگی میں والد بزرگوار کے سامنے بہت ہنس ہنس کر نہایت تفصیل سے بیان کیا۔ اس سلسلے کا سب سے دلچسپ واقعہ یہ ہے کہ ایک دن سنت پرشاد صاحب سرخوشی کے عالم میں ڈپٹی شیر علی کے کاندھے پر سوار ہو گئے۔ ان کا بیان ہے کہ لوگوں نے مجھے کاندھے سے اتارنے کی کوشش کی مگر میں نہ اترا۔ اس پر سید امداد امام اثر صاحب نے سعدی کا یہ شعر پڑھا: ؎

یکی دیدم از عرصۂ رودبار
کہ پیش آمدم بر پلنگے سوار

اس شعر کے سنتے ہی مجھے ہوش آیا کہ میں شیر علی کے کاندھے پر سوار ہوں اور فوراً اتر گیا۔ ڈپٹی سنت پرشاد کا بیان ہے کہ ان نشستوں کی جان وہ اور رقاصہ گلاب جان تھی۔ سید امداد امام اثر نے انھیں نشستوں میں ایک مرتبہ حسب ذیل نظم پڑھی تھی جس کا تعلق حکیم یعقوب لکھنوی سے تھا

الّو کے جو لونڈی کا بنا یار حکموا ۔۔۔ کھپڑے کی سدا کھاتا رہا مار حکموا
جردا سے کیا کرتا تھا تکرار حکموا ۔۔۔ بھڑوؤں سے بھی جھٹ سر بازار حکموا
دھنونتی کے لڑکے نے جو ماموں کہا اسکو ۔۔۔ آرہ سے خفا ہو کے چلا یار حکموا
سب رنڈیاں کہتی ہیں اسے جان برادر ۔۔۔ اس کہنے سے پھر کیوں ہو بیزار حکموا

گلرودَوں کو لاتا تھا بلا اپنے وطن سے — آرہ کو سدا رکھتا تھا گلزار حکموا
گل جان جو گاتی تھی بجاتا تھا مجیرا — سازندوں کے ہم ساز لگاتار حکموا
محفل میں طوائف کو قرینے سے بٹھاتا — کس درجہ تھا اس کام میں ہشیار حکموا
رنڈی جو کوئی کہتی تھی یہ کام مرا کر — اس سے کبھی کرتا نہ تھا انکار حکموا
آنکھوں میں لگا کر بڑے انداز کا کاجل — کیا ہی نظر آتا تھا دھواں دھار حکموا
کمخواب پہنتا تھا کبھی اور کبھی ساٹن — اور باندھتا تھا پوت کے دستار حکموا
رومال گلابی تو کمربند بسنتی — اور کُرتے کو رنگواتا تھا گلنار حکموا
پھولوں سے جو تھا شوق تو رغبت سے گلے میں — ڈلواتا تھا مالی سے سدا ہار حکموا
رکھتا تھا چڑھی داڑھی کٹی مونچھ پھٹی مانگ — اور دوش تلے گیسوئے خمدار حکموا
کس ناز سے چلتا تھا ہلاتا ہوا چونڑا — پاجامہ پہن کر کے کلیدار حکموا
چلغوزہ و پستہ سے بھرا رہتا تھا کلا — منطے کا بنا رہتا تھا دلدار حکموا
لاکھا لب پاں خوردہ پہ رکھتا تھا جمائے — اور ناز سے ہنستا دم گفتار حکموا

کیا منصب عالی پہ سرافراز ہے دیکھو
سالوں کے رسالے کا ہے سالار حکموا

علاوہ ازیں ایک قطعہ بند نظم بعنوان "بیان پُرحسرت ملال درمفارقت حکموائے بأکمال" بطور ضمیمہ اوّل (ص ۸۲) ملاحظہ ہو۔

عادات و اطوار اور مہاراجہ ڈمراؤں کا واقعہ :

راقم کے دادا مرحوم ہندو مسلمان دوستوں میں کوئی امتیاز نہ کرتے، دونوں کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آتے۔ حسب ضرورت بلا امتیاز سب کی اعانت کرتے۔ ضلع شاہ آباد کا کوئی زمیندار ایسا نہ تھا جو اُن سے متعارف نہ ہو اور اپنے کارسازی کے لیے ان کی طرف رجوع نہ ہوا ہو اور انھوں نے اس کی خاطر خواہ مدد نہ کی ہو۔ زمینداروں میں مہاراجہ ڈمراؤں سے بڑے اچھے تعلقات تھے۔ دونوں ایک دوسرے کا بہت احترام کرتے۔ دادا مرحوم دسہرہ کے موقع پر کبھی کبھی دو تین دن کے لیے مہاراجہ کی دعوت پر ڈمراؤں جایا کرتے تھے۔ مہاراجہ بھی ان کی پذیرائی اور مہمان نوازی میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھتے۔ ایک مرتبہ کا واقعہ ہے کہ لفٹننٹ گورنر بنگال کے لیوی (LEVEE) کا

دعوت نامہ مہاراجہ کو وقت پر نہ پہنچا۔ مہاراجہ متردد ہوئے کیونکہ اس مجلس کی شرکت امرار کے لیے باعث فخر و امتیاز تصور کی جاتی تھی۔ دعوت نامہ کا نہ اجرا ہونا اس بات پر بھی دلالت کرتا تھا کہ حکومت وقت کچھ کبیدہ خاطر ہے۔ اس لیے مہاراجہ موصوف دادا مرحوم سے ملے اور واقعہ بیان کیا۔ دادا جان نے فوراً اپنے نائب ناظر کو کلکتہ بھیج کر دعوت نامہ منگوایا جو غلطی سے لفٹننٹ گورنر کے دفتر میں پڑا رہ گیا تھا۔ اس خدمت پر مہاراجہ دادا مرحوم سے بہت خوش ہوئے اور شکریہ ادا کیا۔

میرے دادا جان میں وفاداری کا جذبہ بدرجہ اتم موجود تھا مگر کبھی کبھی تنک مزاجی کا اظہار کرتے۔ دوستوں کی ہر بات بدرجہ احسن قبول کر لیتے تھے چنانچہ ان کے ایک دوست پنڈت شیتل پانڈے جو ضلع گورکھ پور کے رہنے والے تھے، ان کے عزیز دوستوں میں سے تھے۔ پنڈت جی سال میں ایک بار دادا صاحب مرحوم سے ملنے نیورہ ضرور آتے اور دس پندرہ دن قیام کرتے۔

پنڈت شیتل پانڈے :

پنڈت جی نہایت کٹر برہمن اور چھوت چھات کے بہت پابند تھے۔ مسلمان کیا غیر برہمنوں سے بھی وہی انداز برتا کرتے تھے۔ سفر میں ہوں یا حضر میں اپنا کھانا خود پکاتے۔ بیمار ہونے کی حالت میں کسی صاف ستھرے برہمن سے کھانا پکواتے تھے۔ دادا جان ان کے قیام کے زمانے میں انھیں ہر روز صبح ایک نئی ٹوکری میں کئی طرح کے پھل کھانے کو دیا کرتے تھے۔ پرہیز اور چھوت چھات کا یہ حال تھا کہ ان پھلوں کو بھی دھو کر ہی کھایا کرتے تھے۔ دادا مرحوم ان کے اس طرح کے عمل کا خوب مذاق اڑاتے تھے۔ چونکہ دادا مرحوم کی باتوں میں کوئی کدورت اور تعصب کی جھلک نہ ہوتی تھی اس لیے پنڈت جی اس مذاق کا برا نہ مانتے بلکہ ہنسی میں وہ خود بھی شریک ہو جاتے اور خوب ہنستے

گائے کی قربانی :

دادا صاحب مرحوم کو اپنے ہندو دوستوں کے جذبات کا اتنا خیال تھا کہ زندگی بھر کبھی گائے کی قربانی نہ کی۔ راقم کے یہاں تین پشت تک یہ دستور قائم رہا اور کبھی اس دستور کی خلاف ورزی نہیں کی گئی۔ آزادی کے بعد گاؤکشی جرم قرار دیدی گئی اور اب کسی مسلمان کی مجال ہے کہ گائے کی قربانی کرے۔

رام دھنی ساؤ : دادا جان مرحوم کے حاضر باشوں میں ایک شخص رام دھنی ساؤ تھے

جونپورہ کے متصل گاؤں کے رہنے والے اور ایک معمولی حیثیت کے آدمی تھے اور کہیں ملازمت بھی کرتے تھے، روزانہ دادا مرحوم سے ملنے آتے اور آپس میں خوش گپیاں ہوتیں۔ چونکہ دادا مرحوم کی شادی نیورہ میں ہوئی تھی اس لیے انھیں سالا بنا کر خوب مذاق کرتے۔

تعریف بزبان انگریز افسران :

مولوی امجد حسین صاحب نے اپنی ملازمت کے زمانے میں نہایت ایمان داری، جفاکشی فرض شناسی اور استادانہ مہارت کے ساتھ خدمت انجام دیا جیسا کہ انگریزوں کی اسناد سے ثابت ہوتا ہے۔ مسٹر اے فوربس، سی ایس آئی، آئی سی ایس۔ داداجان مرحوم کے بہت مداح تھے اور ان کی قدر کرتے تھے جیسا کہ مندرجہ ذیل سند مورخہ ۲ مئی ۱۸۹۱ء سے ظاہر ہے :

(ترجمہ) "ناظر امجد حسین بہار کے ایک مشہور ناظر خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ پہلے زمانے میں ان کے والد مظفر پور میں ناظر تھے۔ میری دانست میں امجد حسین کے ایک بھائی وہاں ان کے جانشین ہوئے۔ ان کے دوسرے بھائی گزشتہ چند سالوں سے چھپرہ میں ناظر ہیں۔ ان کا پورا خاندان اپنی وفاداری کے لیے مشہور ہے اور ان کے خاندان کا ہر فرد اپنی کارکردگی، صلاحیت اور مکمل ایمانداری کے لیے مشہور ہے جس پر کوئی بھی افسر اپنے لیے نہایت فخر کر سکتا ہے۔ میں امجد حسین کو گزشتہ بارہ برسوں سے اچھی طرح (ذاتی طور پر) جانتا ہوں گرچہ مجھے ایک آدھ بار ان کی تھوڑی تیز مزاجی کی اصلاح کرنا پڑی مگر ان کی ایمانداری اور ادائے فرض کی سرگرمی کے متعلق میرے خیالات بے انتہا بلند ہیں۔"

مسٹر فاربس (Mr. Forbes) کی مندرجہ بالا سند میں دادا مرحوم کی تنک مزاجی کا ذکر آیا ہے۔ بے جا نہ ہوگا کہ ایک واقعہ جو بہت دل چسپ ہے بیان کر دیا جائے۔

امجد حسین کی تنک مزاجی فولی صاحب کی زبانی :

مسٹر بی فولی، آئی سی ایس، ممبر بورڈ آف ریونیو، بہار، جو خود بھی تنک مزاجی کے لیے مشہور تھے، نے آج سے ساٹھ سال پہلے راقم کے سامنے والد مرحوم سے داداجناب مولوی امجد حسین کی تنک مزاجی کا ذکر خوب ہنس ہنس کر تفصیل سے بیان کیا۔ حتی الامکان اس واقعہ کی تفصیل انھی

کی زبانی پیش خدمت ہے:

الہ آباد کے رہنے والے ایک نوجوان لالہ جی جن کی تعلیم انگلستان میں ہوئی تھی، اور فارسی ادب بھی یہیں ایرانیوں سے پڑھا تھا جس پر انھیں بڑا فخر تھا اور اکثر اپنے احباب اور دوسرے حضرات سے اس کا ذکر کیا کرتے تھے۔ یہ حضرت انگلستان سے واپس آتے ہی حکومت ہند کے قدیم دستاویزات کے دفتر میں عارضی طور سے ملازم ہو گئے۔ حکومت ہند نے انھیں کلکتہ سے آرہ بھیجا کہ اہم فارسی دستاویزات ضلع شاہ آباد کی نقل کر کے حکومت ہند کے حوالے کریں تاکہ بطور ریکارڈ محفوظ رکھا جائے۔ یہ صاحب دادا مرحوم کی خدمت میں پہنچے اور اپنا تعارف کرایا نیز اسی تعارف میں اپنی فارسی دانی اور انگلینڈ سے بی۔اے کی ڈگری کا بھی ذکر کیا۔ بعد ازاں اپنا مقصد بیان کیا۔ دادا مرحوم فارسی ریکارڈ خوب پڑھتے تھے۔ انھوں نے فوراً شاہ آباد کی ایک بہت ہی نادر فارسی دستاویز لا کر ان کے سامنے رکھ دی کہ اس کی نقل کر لیں۔ یہ دستاویز نہایت ہی شکستہ تحریر میں تھی جس کا پڑھنا لالہ جی کی اہلیت اور لیاقت سے بہت بالا تھا۔ کوشش تو بہت کی مگر ان سے کچھ بن نہ پڑا آخر کار سپر ڈال دیا۔

لالہ جی کی تعلیم و تربیت چونکہ مغربی تہذیب کے سایے میں ہوئی تھی اس لیے مشرقیت کی نزاکت اور حد ادب سے کورے ہو گئے تھے اور اگر کچھ اثر بچپن میں پڑا بھی تھا تو وہ انگلستان کی طرز معاشرت کی نذر ہو گیا تھا۔ خاکساری کی جگہ تحکمانہ انداز نے دماغ میں گھر کر لیا تھا۔ دادا مرحوم سے مخاطب ہو کر کہا "اس دستاویز کی نقل کر دو"۔ موصوف مرحوم نے نہایت ہی سنجیدگی اور بغیر اظہار کبیدگی دستاویز لے کر الماری میں رکھ دی لیکن دل میں میل بیٹھ گئی تھی۔ بدتمیزی نے آخر کار تحمل کی قوت سلب کر دی اور ایکا ایک بول اٹھے "اب آپ میرے کمرے سے باہر جا سکتے ہیں"۔ لالہ جی کو یہ بات ناگوار خاطر ہوئی۔ غصہ کی حالت میں سیدھے کلکٹر شاہ آباد کی خدمت میں جا کر دادا مرحوم کی بدسلوکی کی شکایت کی۔ کلکٹر موصوف نے ہنس کر انگریزی میں کہا:

(ترجمہ) "میں اس بوڑھے آدمی کی زبان پر لگام نہیں لگا سکتا۔ تم پھر ان سے ملاقات کرو"۔

لالہ جی بادل ناخواستہ دادا مرحوم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اپنی بے رُخی کی معذرت کی۔ موصوف نہایت فراخدلی اور شفقت سے بولے: "بیٹے کل دس بجے میرے پاس آجاؤ"۔

چنانچہ لالہ جی کے جانے کے بعد ایک منشی کو جو شکستہ پڑھنے میں مہارت رکھتا تھا ، بلوایا اور اجرت مقرر کر کے اس اہم دستاویز کی نقل صاف صاف نستعلیق میں کرائی ۔ دوسرے دن جب لالہ جی وقت مقررہ پر آئے تو دستاویز کی تیار شدہ نقل ان کے حوالے کی گئی اور ان سے منشی کی اجرت بھی دلوا دی گئی ۔ لالہ جی نے بہت شکریہ ادا کیا ۔ بعد ازاں دادا مرحوم نے اظہار تاسف کیا اور کہا کہ آپ نے اپنے صوبہ آگرہ و اودھ کی تہذیب کو کھو دیا ہے ۔ آیندہ آپ اپنی عملی زندگی میں اس کو اپنانے کی کوشش کریں اور ہر انسان کے مرتبہ کا خیال رکھیں ۔ لالہ جی کو دعا کے ساتھ روانہ کیا ۔

آرہ اسٹامپ جعل سازی کی تفصیل :

۱۸۷۹ء کے اسٹامپ جعل سازی کیس میں گورنمنٹ بنگال نے ملوث لوگوں پر مقدمہ قائم کیا ۔ اس جعل سازی کے مقدمہ میں دیوانی اور فوجداری کے عملوں کے علاوہ کچھ افسران بھی ملوث تھے ۔ اس سلسلے میں گورنمنٹ مذکور نے ایک تحقیقاتی کمیٹی مسٹر فاربس کی سربراہی میں مقرر کی ۔ تکمیل تحقیق کے بعد گورنمنٹ بنگال نے ایک رپورٹ شائع کی جس کا مختصہ ساحصہ جو دادا مرحوم سے متعلق تھا ان کے پاس روانہ کیا جو رپورٹ کے صفحہ ۶۸ پر مندرج ہے اس میں موصوف کی یوں تعریف کی گئی ہے ، انگریزی عبارت کا ترجمہ حسب ذیل ہے :

"مجھے جعل سازی کے مقدمہ میں کلکٹری کے صدر دفتر کے کاغذات میں کسی طرح کی جعل سازی کا کوئی واقعہ نظر نہیں آیا ۔ میں اس کو اس بات پر محمول کرتا ہوں کہ انھوں نے (امجد حسین نے) اپنے کام میں توجہ دی ہے ۔ غیر معمولی توجہ اور باقاعدگی کے ساتھ اسٹامپ کو رد کیا ، تاریخ لکھی اور اس کا رجسٹر میں اندراج کیا ۔"

انتظامی صلاحیت کا مظاہرہ :

دادا جان مرحوم انتظامی امور میں اچھی صلاحیت رکھتے تھے ۔ اوّلاً یہ عطیہ خداداد تھا دوسرے وقت اور ملازمت سرکاری نے ایسے مواقع فراہم کیے کہ اسے اجاگر کر دکھایا اور بہت سارے کارہائے نمایاں انجام دینے کا سبب بنا ۔ اس صلاحیت کے مظاہرہ سے حکومت وقت کی نگاہ میں ان کی شخصیت پُر وقار نظر آنے لگی ۔

اس زمانے میں لفٹننٹ گورنر بنگال کا یہ معمول تھا کہ موسم سرما میں بہار کے اضلاع کا دورہ کرتا۔ اس دورہ میں وہ اضلاع کے انتظامات کو دیکھتا اور مختلف اداروں کا معائنہ کرتا۔ علاوہ ازیں سیر و شکار میں بھی وقت گزارتا تھا۔ چنانچہ دسمبر ۱۸۸۱ء میں جب لفٹننٹ گورنر بنگال روہتاس اور سہسرام کے دورہ پر آیا تو دادا مرحوم نے اس کے دورہ کا انتظام نہایت خوش اسلوبی سے انجام دیا۔ اس سے لفٹننٹ گورنر بہت محظوظ ہوا جس کا اظہار پی۔ پوٹر صاحب کلکٹر شاہ آباد نے اپنی ایک سند مورخہ ۷ دسمبر ۱۸۸۱ء میں کیا ہے۔

۱۷۰۵ء میں رائل سکنڈ فیلڈ بیٹری آرٹیلری قائم کی گئی تھی اور جس کے مونوگرام سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس فوج نے جنگوں میں نمایاں کار انجام دیا جس میں جنگ کریمیا بھی شامل تھی۔ یہ پہلی اور آخری جنگ تھی جس میں برطانیہ اور فرانس نے ترکوں کا ساتھ روس کے خلاف دیا تھا۔ ۱۸۹۵ء میں یہ فوج ہندوستان کے دورہ پر آئی ہوئی تھی۔ اس کا قیام آرہ اور کوئلور میں ہوا تھا۔ اس فوج کے لیے ضروریات کی چیزوں کا مہیا کرنا اور کل دیگر انتظامات کرنا جناب دادا صاحب مرحوم کے حوالہ کیا گیا تھا۔

کیپٹین اسمتھ جو اس بیٹری کے کمانڈ میں تھے انھوں نے جناب دادا مرحوم کی تعریف کی ہے کہ وہ اپنے فرائض کو بحسن وخوبی انجام دیتے ہیں اور دیا بھی ہے۔ واضح رہے کہ ایک بٹالین کے گورے سپاہیوں کے لیے ان کے حسب منشا انتظام کرنا کوئی معمولی بات نہ تھی۔ اس کا تذکرہ کیپٹین اسمتھ نے اپنی سند مورخہ ۱۲ فروری ۱۸۹۵ء میں کیا ہے۔ ایک دوسرا توپ خانہ ۱۲ نومبر ۱۸۹۷ء میں کوئلور میں وارد ہوا جس کا نام سکسٹھ بیٹری آرملری تھا اس کے کمانڈنگ کرنل اے۔ ایم۔ کراؤنگ آر۔ اے نے دادا صاحب کی کارگزاریوں اور فرائض کی تکمیل کی بہت تعریف کی ہے۔

اس زمانے میں انگریزی فوجوں کی آمد و رفت اور ان کا کوئلور میں قیام اور ہندوستان کے دوسرے مقامات پر بھی ان کا ٹھہراؤ صرف اس مقصد سے ہوتا تھا کہ ہندوستانیوں کو اپنی طاقت و قوت سے مرعوب کریں اور دوسرا مقصد یہ بھی تھا کہ فوجیوں کو ہندوستان کی مختلف جگہوں اور راستوں سے آگاہ کر دیا جائے تاکہ بوقت جنگ انھیں کوئی دشواری نہ ہو۔ کوئلور کے بارے میں راقم کا خیال ہے کہ یہ اُن دنوں فوجی مشق کا مرکز رہا ہوگا۔ وجہ یہ ہے کہ یہاں وسیع

میدان تھا اور دریا کا کنارہ بھی جہاں عام لوگوں کی آمد و رفت بہت کم ہوتی تھی نیز دریائی راستوں سے آنے جانے میں کافی سہولت رہی ہوگی۔

بحیثیت افسر اوران کا برتاؤ :

دادا جان نہایت ہی خلیق، مہمان نواز، انسان دوست بلا امتیاز مذہب و ملت اور قوم سب کے ساتھ یکساں خلوص سے ملتے جلتے اور حسب حیثیت سب کے ساتھ تعاون کرتے۔ افسر سول یا ملیٹری، زمیندار یا کاشت کار، عملہ یا چپراسی سب ان کی عزت کرتے اور ان سے محبت سے ملتے تھے۔

دادا مرحوم اکثر و بیشتر سنیئر ناظر کے علاوہ مالیات کے افسر بھی رہا کرتے تھے اس لیے حکومت نے ان کو آفیسر کا مرتبہ عطا کیا اور وہ برابر آفیسر کہلاتے رہے اور ان سے آفیسرانہ سلوک کیا جاتا رہا جیسا کہ مختلف اسناد سے ظاہر ہوتا ہے۔ ملازمت سے سبکدوشی کے دو سال قبل دادا مرحوم کو مستقل طور سے مالیات کا آفیسر مقرر کر دیا گیا تھا۔

طبیعت کی بے باکی :

دادا مرحوم کی یہ امتیازی صلاحیت اور خصوصیت تھی جس نے ہر کس و ناکس اور ہر خاص و عام کی نگاہ میں ان کو مقبول و پسندیدہ بنا دیا تھا۔ ہندو، مسلمان اور عیسائی سب ان کے ہمدرد اور ہم نوا تھے۔ باوجود اس ہمدردی اور ارتباط کے چاپلوسی کی گندگی سے ان کا دامن کبھی داغدار نہ ہو سکا۔ حکومت وقت کے وفادار ملازم ہوتے ہوئے اپنی بے باک طبیعت کی بنا پر انگریزوں سے مسلمانوں پر ان کے ظلم و ستم کا شکوہ کر دیا کرتے تھے۔ وہ ان سے کہتے تھے کہ آپ کی یہ مسلم دشمنی اور ہندو پروری آیندہ زمانوں میں ضرور رنگ لائے گی اور اس کا خمیازہ بھی انگریزی کو بھگتنا پڑے گا۔ راقم نے دادا جان مرحوم کی اس پیشین گوئی کو ۱۹۴۷ء میں عمل پذیر ہوتے ہوئے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ انگریز ۱۹۴۷ میں ہندوستان کی عظیم الشان سلطنت کو چھوڑ کر اس عجلت میں بھاگے کہ : " نہ خر ماند نہ پالانش "

پرورش :

دادا مرحوم کی پرورش و پرداخت مشرقی تہذیب و تمدن کے زیر سایہ ہوئی تھی۔ عام تصور ہوتا ہے کہ اس تہذیب و تمدن کے تربیت یافتہ قدامت پسندی کا شکار ہوتے ہیں لیکن میرے دادا مرحوم

کو اس قدامت پسندی اور پرانے خیالات سے کوئی لگاؤ نہ تھا۔ وہ ایک ترقی پسند انسان تھے۔ علوم مشرقیہ کے علاوہ علوم جدیدہ کے نوشت و خواند کے زبردست حامی تھے۔ وہ خود بھی اس کے قائل تھے اور دوسروں کو بھی اس کی تلقین کرتے۔

سرسید احمد کی تحریک کی حمایت :

راقم نے خان بہادر ظہیر الدین اور والد صاحب کی زبانی سنا ہے کہ وہ سرسید احمد خاں کی تحریک کے بڑے حامی تھے اور ان کے کارناموں کو سراہتے تھے، یہی وجہ تھی کہ انھوں نے اپنے اکلوتے بیٹے جن کی جدائی انھیں گوارا نہ تھی مگر ان کی ترقی پسند ذہنیت نے مجبوراً اس فرقت و جدائی کو برداشت کیا اور انھیں تعلیم کے لیے علی گڑھ محمڈن اینگلو اورینٹل کالج بھیجا اور وہیں تعلیم مکمل کی۔ اس زمانے میں خود پٹنہ میں بھی علی گڑھ کے ہم پلہ کالج تھے اور ان کی تعلیم پٹنہ میں بھی ہو سکتی تھی مگر موصوف نے ان کے علی گڑھ جانے کو ترجیح دیا کیونکہ وہاں مسلم معاشرہ تھا دوسرے سرسید کی تحریک کو تقویت بھی پہنچانا تھی۔

چالیس سالہ ملازمت اور دادا و دادی محترمہ کا انتقال :

دادا مرحوم چالیس سال سرکاری ملازمت نہایت خوش اسلوبی، دیانت داری اور احساس ذمہ داری کے ساتھ انجام دے کر ۱۸۔ اگست ۱۹۰۰ء سے کچھ دنوں پہلے خدمت سرکاری سے سبکدوش ہوئے جس کا ذکر مسٹر لیونج صاحب آئی سی ایس نے اپنے خط بنام مسٹر کمنگ آئی سی ایس میں کیا ہے جو ۱۸ اگست ۱۹۰۰ء کو لکھا گیا ہے۔

ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد آپ کا مستقل قیام نیورہ ضلع پٹنہ میں ہوا۔ اپنے اوقات کو زیادہ تر عبادت و ریاضت میں صرف کرتے اور قرآن و حدیث و تفسیر کا مطالعہ کرتے رہتے۔ اگر کسی کی موت کی خبر سنتے تو اس کے جنازے میں ضرور شریک ہوتے۔ بفضل خدا آنکھ کی بینائی آخر وقت تک قائم رہی اور عینک کبھی استعمال نہیں کی۔ باغبانی جوانی کا محبوب مشغلہ تھا وہ بھی آخر وقت تک جاری رہا۔

اگست ۱۹۰۵ء میں اپنے ایک رشتہ دار مرحوم فصیح احمد صاحب (والد مرحوم جسٹس خلیل احمد مرحوم) زمیندار رسیل پور۔ گیا یہاں ملاقات کی غرض سے گئے۔ وہاں ایک ہفتہ قیام کیا اور یک بیک ہیضہ کے مرض میں مبتلا ہو کر ۷۶ سال کی عمر میں انتقال کیا اور رسیل پور کے قبرستان

میں آرام فرما ہیں۔

دادا جان کا ایک وفادار راجپوت ملازم جس کا نام جیتی سنگھ تھا ان کے قضا کرنے کے بعد بھی اپنے گھر نہ گیا اور تا حیات میرے والد صاحب کے ساتھ رہا اور والد مرحوم بھی اس کی بڑی عزت کرتے تھے۔ اس نے راقم کو بھی اپنی گود میں کھلایا تھا۔ ایسے وفادار ملازم اب کہاں ملتے ہیں۔

والد مرحوم کو دادا جان کی موت کا انتہائی غم رہا۔ تا حیات ان کی جدائی کو فراموش نہ کر سکے کیونکہ موت سے ایک ہفتہ قبل ان کا دیدار کر سکے تھے اور موت کے وقت نہ تو ہم کلام ہونے کا موقع ملا اور نہ ان کا دیدار ہی نصیب ہوا۔ باوجود مسافت کم ہونے کے ان حضرات کو کیا کہا جائے کہ بعد تجہیز و تکفین والد مرحوم کو اس دردناک واقعہ کی اطلاع دی۔ کیا مصلحت تھی کچھ کہا نہیں جا سکتا ہے۔

دادا جان کی وفات کے بیس سال بعد دادی صاحبہ کا انتقال ۱۹۲۶ء میں حاجی پور میں ہوا جہاں ان دنوں والد مرحوم سب ڈویزنل مجسٹریٹ تھے۔ قبر حاجی پور کی شاہی مسجد کے احاطے میں ہے۔

چوتھا باب

مولوی محمد حسین

تعلیم عادات و اطوار ملازمت اور قدامت پسندی :

منشی حیدر بخش کے دوسرے صاحبزادے کا نام محمد حسین تھا۔ ان کی تعلیم و تربیت مظفر پور میں ہوئی۔ یہیں انھوں نے عربی، فارسی، اردو اور ہندی پڑھی اور اس میں مہارت حاصل کی۔ یہ ایک نہایت نیک مزاج اور ملنسار انسان تھے۔ اپنے دوستوں کی خوب خاطر مدارات کیا کرتے تھے۔ غریب امیر سب سے یکساں طور سے ملتے تھے اور اپنے ضرورت مند ہمسایوں کی بھی وقتاً فوقتاً مالی مدد کیا کرتے، ان کے رہن سہن، بات چیت اور طور طریقے سب سے قدامت پسندی کی جھلک نظر آتی تھی۔ جدیدیت کے دلدادہ نہ تھے یہی سبب ہے کہ مکان جو تعمیر کرایا وہ بھی قدیم طرز کا تھا۔ موصوف کو انگریزی سرکار نے ضلع مظفر پور کے شہر حاجی پور میں فوجداری کچہری کا ناظر مقرر کیا۔ دوران ملازمت اپنے فرائض کو نہایت ہی ایمانداری اور خوش اسلوبی سے انجام دیا اور اپنے افسران کو بھی خوش رکھا۔ ان کے کام سے متعلق کسی کو شکایت کا کبھی موقع نہ ملا۔ ملازمت کی پوری مدت شہر حاجی پور میں گزاری اور سبکدوشی کے بعد بھی تا حیات یہیں قیام پذیر رہے۔ نہایت منظم آدمی تھے۔ دوران ملازمت کچھ پیسے جمع کر کے باغات اور زمینیں خریدیں اور ان کا شمار متوسط طبقے کے زمینداروں میں ہونے لگا

اولاد، فضل کریم کی فضول خرچی :

جہاں تک میری یادداشت ساتھ دے رہی ہے اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ محمد حسین صاحب مرحوم کی صرف ایک ہی اولاد نرینہ زندہ رہی جن کا نام فضل کریم تھا۔ فضل کریم کا مزاج زمیندارانہ تھا۔ خاندانی وقار کا بہت لحاظ رکھتے تھے اگرچہ خود کچھ صلاحیت نہ رکھتے تھے، دل و دماغ میں خاندانی عظمت کا خیال ایسا بیٹھ گیا تھا کہ اس کے پاس دلحاظ میں وراثت سے جو کچھ ملا تھا،

فضول خرچی، تقریبات اور ظاہری نمائش کی نذر کردی۔ موصوف کی تین اولاد ہیں جن میں سب سے بڑے خلافت کریم ہیں اور ان سے چھوٹی دو بہنیں ہیں۔

خلافت کریم اور ان کی بہنیں:

مولوی فضل کریم کے بعد جو کچھ جائداد بچ گئی تھی اسے خلافت کریم صاحب نے فروخت کردیا۔ اپنی ماں اور بہنوں کے ساتھ لکھنؤ چلے گئے اور وہیں کے ہو رہے۔ اپنی دونوں بہنوں کی شادی بھی لکھنؤ ہی میں کی۔ اگرچہ عمر میں خود بڑے تھے مگر مصلحتاً پہلے اپنی شادی نہ کی۔ بہنوں کی شادی سے فراغت کے بعد اپنی شادی قدوائی خاندان میں، موضع بڑاگاؤں ضلع بارہ بنکی میں کی۔ یہ تینوں بھائی بہن صاحب اولاد ہیں اور لکھنؤ میں آباد ہیں۔ ماشاءاللہ تینوں بھائی بہنوں کی اولاد صالح، شریف مزاج اور پڑھنے لکھنے کے بھی بڑے شوقین ہیں۔ کچھ دنوں پہلے خلافت کریم صاحب کی ایک لڑکی نے لکھنؤ یونیورسٹی سے بی۔اے کا امتحان پاس کیا ہے۔ راقم سے خلافت کریم بہت محبت کرتے ہیں اور راقم بھی ان کی قدر کرتا ہے۔ صاحبِ موصوف بہت خوب آدمی ہیں، انتہائی منکسر مزاج اور نماز روزے کے پابند بھی۔ رشتہ داری کو قائم رکھنے کا برابر خیال کرتے ہیں یہی سبب ہے کہ جب بھی موقع ملتا ہے پٹنہ آکر راقم سے ملاقات کرجاتے ہیں۔ راقم کو جب کبھی لکھنؤ جانے کا اتفاق ہوتا ہے تو دورانِ قیام صاحب موصوف راقم سے کبھی جدا نہیں ہوتے۔ تیس سال سے زیادہ تک لکھنؤ میں اصغر علی محمد علی تاجر عطر کے کارخانے میں نہایت ایمانداری اور جانفشانی سے کام کیا ہے اور کارخانہ اصغر علی محمد علی سے الگ ہوجانے کے بعد ابھی تک اپنے مختلف قسم کے تجارتی کاموں میں مشغول رہتے ہیں۔

فضل کریم کی اہلیہ کا انتقال:

عرصہ ہوا کہ خلافت کریم کی والدہ کا انتقال ہوگیا ہے اور لکھنؤ میں مدفون ہیں۔ مرحومہ سے راقم کی ملاقات تھی۔ سنجیدہ اور بہت نیک مزاج تھیں، اس کے علاوہ بہت سی خوبیوں سے متصف تھیں۔ راقم نے انھیں ہر کام میں نہایت محنتی اور جفاکش پایا اور ان کے ہاتھ کا پکا ہوا کھانا مظفرپور میں الحاج فضل رب صاحب کے یہاں کھانے کا بارہا اتفاق ہوا جو نہایت لذیذ ہوا کرتا تھا۔ انھوں نے اولاد کی پرورش و پرداخت و تربیت نہایت دلسوزی اور ایمانداری سے کی۔ اللہ غریق رحمت کرے۔

پانچواں باب

الحاج مولوی امیر حسین

صورت وسیرت :

منشی حیدر بخش کے تیسرے لڑکے امیر حسین تھے۔ صاحب موصوف میانہ قد، گندمی رنگ، ذہین محنتی، خوش مزاج اور نہایت خوددار انسان تھے۔ فارسی اور اردو خوب جانتے اور تھوڑی بہت انگریزی بھی پڑھ لکھ لیتے تھے۔ نماز کے پابند تھے اور اکثر راتوں کو جاگ کر عبادت کیا کرتے تھے۔ قدامت پسندی سے ان کا دور کا بھی لگاؤ نہ تھا۔ ابتدا میں چھپرہ کی فوجداری کچہری میں ناظر مقرر کیے گئے۔ ملازمت کے دوران اپنی خدمات کو نہایت ایمان داری اور احساسِ ذمہ داری کے ساتھ انجام دیں جس کی وجہ سے انگریز اور دیگر افسران بہت خوش رہتے تھے۔ پنشن پانے تک اسی عہدے پر چھپرہ ہی میں فائز رہے۔

پولو کے گھوڑوں کی تجارت :

موصوف فطرتاً فیاض و سخی واقع ہوئے تھے اور مزاج بھی زمیندارانہ رکھتے تھے اس لیے سرکاری ملازمت سے جو آمدنی ہوتی تھی وہ ان کے اخراجات کے لیے ناکافی تھی۔ انھیں اپنے اخراجات کی کمی کو پورا کرنے کی فکر لاحق ہوئی تو دل میں تجارت کا خیال پیدا ہوا۔ ضلع کلکٹر سے مل کر اپنی پریشانیوں کا ذکر کیا اور تجارت کرنے کی اجازت چاہی۔ کلکٹر نے جواباً کہا کہ قواعد وضوابط کے مطابق تو سرکاری ملازم کو تجارت کرنے کی اجازت نہیں مل سکتی، ہاں اگر تم پولو کے گھوڑوں کی تجارت کرنا چاہو تو حکومت سے تمھیں اس کی اجازت مل سکتی ہے کیونکہ اس وقت ہمارے انگریز نوجوانوں کو پولو کے گھوڑوں کی کمی ہے اور اس کے خریدنے میں انھیں دقت پیش آتی ہے۔ لہٰذا تم اگر اس کی تجارت کرو تو تمھاری پریشانی دور ہو اور ہمارے انگریز نوجوانوں کو دقت کا سامنا بھی نہ کرنا پڑے۔ کلکٹر کی سفارش پر حکومت بنگال نے صاحب موصوف کو پولو کے گھوڑوں کی تجارت کی اجازت

دے دی۔ اجازت پانے کے بعد اپنی کچھ زمین فروخت کر کے گھوڑوں کی تجارت شروع کی۔ سب سے پہلے کلکتہ کے ایک ایسے آدمی کو جو گھوڑوں کو تربیت دینے میں ماہر تھا ملازم رکھا۔ گھوڑوں کے مختلف میلوں میں اس ماہر کو بھیجا اور کچھ اچھے گھوڑوں کی خرید کرائی۔ قریب ایک سال کی تربیت کے بعد گھوڑے پولو میں استعمال کے لائق ہوتے تھے اور اچھے داموں میں فروخت ہوتے تھے۔ اس تجارت میں موصوف بہت کامیاب رہے۔ ان کے تربیت کردہ گھوڑوں کی بڑی مانگ رہتی اور خاص کر انگریز افسران ان گھوڑوں کے بڑے دلدادہ ہوتے تھے۔ مسٹر جسٹس میکفرسن نے جو پٹنہ ہائی کورٹ کے جج تھے، پچاس سال قبل راقم کو بتایا کہ انھوں نے اپنی جوانی میں پولو کھیلنے والا ایک گھوڑا موصوف سے خریدا تھا۔ اس گھوڑے کی بہت تعریف کی اور یہ بھی کہا کہ وہ گھوڑا ان کے ساتھ تین سال تک رہا اور اس گھوڑے کی بدولت پولو کے مقابلوں میں وہ اکثر کامیاب ہوا کرتے تھے۔ جج صاحب نے امیر حسین صاحب مرحوم کی تعریف کرتے ہوئے کہا کہ میں نے گھوڑے کی خرید کے وقت صرف آدھی قیمت ہی ادا کی تھی، اس کو انھوں نے نہایت خندہ پیشانی سے قبول کر لیا اور باقی قیمت میں نے چھ مہینے کے بعد ادا کی۔ گھوڑوں کی شناخت میں امیر حسین صاحب بڑے ماہر تھے۔

مسلمان لڑکیوں کی تعلیم کے لیے جدوجہد :

ان کے دور میں مسلمان گھروں میں علم کا چرچا طبقۂ نسواں میں نام نہاد کا رہ گیا تھا۔ اس زمانہ میں پردہ کا رواج بہت سخت تھا۔ جن لڑکیوں کو پڑھنے لکھنے کا شوق ہوتا وہ اپنے باپ اور بھائیوں سے کچھ پڑھنا لکھنا سیکھ لیتی تھیں ورنہ شریف گھرانوں میں بھی لڑکیاں زیادہ تر ناخواندہ رہ جاتی تھیں۔ مسلمان لڑکیوں میں علم کی اس کمی سے صاحب موصوف متردد رہتے اور ان کی درس و تدریس کے لیے ہمیشہ کوشاں رہتے تھے۔ کسی بڑے آدمی کے اصرار پر سررشتۂ تعلیم کی طرف سے ایک استانی دس روپیے ماہانہ تنخواہ پر مقرر کی گئی تھی جو مسلمان گھروں میں ڈولی پر سوار ہو کر جاتی اور لڑکیوں کو پڑھنا لکھنا سکھاتی۔ ایک استانی پورے شہر کے لیے بالکل ناکافی تھی۔ موصوف نے کلکٹر سے اس کی شکایت کی اور مزید تین استانیوں کی تقرری کرائی۔ یہ استانیاں خود بھی کچھ زیادہ پڑھی لکھی نہ ہوتی تھیں مگر لڑکیوں کو کچھ نہ کچھ لکھنا پڑھنا سکھا ہی دیتی تھیں

مسلمان لڑکوں کو انگریزی تعلیم کی تشویق :

اپنے مسلمان دوستوں سے کہا کرتے تھے کہ دور جدید نہایت تیزی سے آرہا ہے۔ انگریزی پڑھنا کفر نہیں بلکہ نہایت ضروری ہے۔ آج بھی ہندو انگریزی تعلیم کی بدولت ترقی کے ہر میدان میں مسلمانوں سے بہت آگے بڑھ گئے ہیں اور اگر مسلمان بیدار نہیں ہوئے اور انگریزی و جدید علوم کی طرف جلد رجوع نہ ہوئے تو بہت پیچھے رہ جائیں گے۔ انگریزی علوم و فنون کی طرف سے مسلمانوں کی بے اعتنائی کا انجام ان کے حق میں نہایت مہلک ثابت ہوگا۔ مسلمانوں کو چاہیے کہ اپنے تمام دقیانوسی خیالات اپنے دماغوں سے نکال پھینکیں اور انگریزی و جدید علوم کی طرف خاص توجہ دیں۔ ساتھ ہی ساتھ اپنے مذہبی و تہذیبی اقدار اور دینی تعلیم کو بھی فراموش نہ کریں۔ ان کی ان باتوں کا اچھا اثر مسلمانوں پر پڑا۔ ان کے کہنے سننے سے چھپرہ کے اکثر مسلمانوں نے اپنے لڑکوں کو انگریزی اسکولوں میں بھیج کر جدید تعلیم دلوانی شروع کی۔ انگریزی تعلیم حاصل کرنے والے ان بچوں میں سے اکثر نے اپنی زندگی میں کامیابی حاصل کی۔

اچانک موت :

غالباً ۱۹۰۸ء کی بات ہے کہ ان کی طبیعت ناساز ہوئی۔ بیماری کوئی شدید یا خطرناک نہ تھی، مگر موت کو کیا کہیے کہ کوئی نہ کوئی بہانہ ڈھونڈھ ہی لیتی ہے۔ موصوف جہاں بستر پر بحالت مرض آرام کر رہے تھے وہاں سے دو چار قدم کی دوری پر دوائیں میز پر رکھی ہوئی تھیں۔ بدقسمتی سے اسی میز پر گھوڑوں کے زخم کی دوائیں بھی رکھی تھیں، دو گھڑی رات گزر چکی تھی کہ دوا کے لیے نواسی کو پکارا۔ معصوم نواسی دس گیارہ سال کی تھی اسے دواؤں کے بارے میں کیا علم تھا دیکھا دواؤں کی شیشیاں ہیں، ان میں سے دوا ڈھالی اور اپنے ناناجان کو دے دی۔ جونہی دوا حلق میں اتری چلا اٹھے کہ کون سی دوا دے دی یہ تو گھوڑوں کے زخم کی دوا ہے۔ دوا زہر آلود تھی، بے چینی کی حالت میں حلق سے باہر اگلنے کی کوشش کی مگر بے سود رہی۔ تھوڑی دیر بعد ہی زہر اپنا کام کر گیا اور وہ قضا کر گئے۔ ان کی موت سے سب کو رنج پہنچا۔

ملازمت سے سبکدوشی کے بعد چھپرہ میں جدید طرز کا ایک بنگلہ تعمیر کرایا جو ان کی وفات کے بعد بھی بہت دنوں تک قائم رہا۔ ۱۹۲۶ء کے سیلاب سے اس بنگلے کو بہت نقصان پہنچا، مکان کا اکثر حصہ منہدم ہو گیا۔ صاحب موصوف کے ایک رشتہ دار جو واحد حق دار تھے انہوں نے اس پرانے بنگلے اور اس کے احاطے کو چند سال بعد فروخت کر دیا۔ اس طرح ان کی آخری یادگار

کا بھی خاتمہ ہو گیا۔ ۱۹۱۲ء میں راقم اپنے والد مرحوم کے ساتھ چھپرہ گیا تھا اور اسی بنگلے میں دو روز قیام کیا تھا۔ اس وقت صاحب موصوف باحیات نہ تھے مگر ان کی بیٹی اور نواسی بنگلے میں زندگی گزار رہی تھیں۔ کبھی کبھی اسی بنگلے میں چھپرہ کے چند قومی ہمدردی رکھنے والے متوسط طبقے کے لوگ یکجا ہوتے اور مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے متعلق تدبیریں سوچا کرتے تھے۔

ہر شخص ان کی خوش خلقی و سادگی کی وجہ سے گرویدہ تھا اور ان کا احترام کرتا تھا۔ جہاں تک راقم کو علم ہے اب ان کی کوئی اولاد باقی نہیں۔ ان کی موت سے شہر ایک مخلص، سچے ہمدرد اور ایک اچھے سماجی کارکن سے خالی ہو گیا۔

سفرِ حج اور فارسی قصیدہ :

مولوی فضلِ رب صاحب مرحوم نے ۱۸۹۳ء میں حج کیا اور واپسی پر ایک سفر نامہ بنام "قبلہ نما" تصنیف کیا جو صادق پور پریس پٹنہ سے ۱۸۹۶ء میں چھپا۔ یہ سفر نامہ بہت تفصیلی ہے اور اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ امیر حسین صاحب نے ۱۸۹۳ء سے قبل حج کیا تھا۔ اس سفر نامے سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ امیر حسین صاحب کو شعر و شاعری کا شوق تھا۔ فضل رب صاحب مرحوم نے اپنی مذکورہ کتاب کے صفحہ ۹۲ اور ۹۳ پر موصوف کا ایک فارسی قصیدہ جو غالباً مکہ مکرمہ میں لکھا گیا تھا نقل کیا ہے جس کے چند اشعار حسبِ ذیل ہیں :

گاہ در صدف معدن مرج البحرین
شکل حسنین درخشاں بہ فضائے عالم
گاہ در ذات شہاں مظہر عدل و انصاف
گاہ یم کرم حاتمِ از خلق۔ اتم
ایں ہمہ علم و ادب عقل و خرد دانش و ہوش
ہمہ در خدمت او بستہ کمر عجز بہم
گرچہ ممدوح زہر مدح و ثنا مستغنی است
ز منم انیست کہ آغاز بنامش کردم

زیارت مدینہ منورہ اور اردو کا قصیدہ :

"قبلہ نما" کے مصنف نے صفحہ ۲۷۸ و ۲۷۹ پر امیر حسین صاحب کا ایک اردو قصیدہ

بھی نقل کیا ہے جس میں درِ رسولؐ پر حاضری کی سعادت حاصل کرنے پر حاجیوں کو مبارک باد دی گئی ہے ۔ اس کے چند اشعار ناظرین کے پیش خدمت ہیں :

ہزاروں حمد ذاتِ کبریا کو
قبول اس نے کیا میری دعا کو
زہے قسمت ہوئے حاضر یہاں ہم
مبارک باد ہو بختِ رسا کو
دلِ ناشاد کو مژدہ مبارک
مبارک نور ہو چشمانِ دا کو
تمنا دل کی بر آنا مبارک
تشفی ہو گئی خوف و رجا کو
در والا ہے مخزن رحمتِ عام
مبارک باد ہو رنج و عنا کو
گنہگاروں کو آمرزش مبارک
مبارک عفو ہو جرم و خطا کو

چھٹا باب

خان بہادر حشمت حسین

شکل و صورت، عادات اور عقیدہ :

راقم کے چھوٹے دادا خان بہادر حشمت حسین مرحوم منشی حیدر بخش مرحوم کے چوتھے صاحبزادے تھے۔ صاحب موصوف تنومند اور میانہ قد کے تھے۔ رنگ گندمی، چہرہ گول اور پیشانی چوڑی انھیں خاندانی وراثت میں ملی تھی۔ چہرہ پر گھنی داڑھی اور مونچھیں ان کی وجاہت میں اضافہ کرتی تھیں۔ ان کی ایک تصویر راقم کے پاس موجود ہے۔ ان کے زمانے میں اچکن وغیرہ کا رواج بہت کم ہو گیا تھا۔ صرف سن رسیدہ لوگ ہی اس کا استعمال کرتے تھے۔ نوجوان اچکن کے بدلے زیادہ تر شیروانی پہنتے تھے۔ چھوٹے دادا مرحوم بھی اسی طرح کے لباس کے شائق تھے۔ عام طور سے شیروانی اور چوڑی مہری کا پائجامہ اور ترکی ٹوپی پہنتے تھے مگر جاڑے کے دنوں میں شیروانی کے ساتھ گرم پتلون بھی زیب تن کرتے تھے۔

خدا نے انھیں بہت سی خوبیوں سے نوازا تھا۔ مذہبی ذہنیت، خدا ترسی اور پاکیزگی جو ایمان کی دلیل ہے، ان کا طرۂ امتیاز تھا۔ علی الصباح اٹھ جایا کرتے اور بعد نماز فجر کلام اللہ کی دعائیں اور سورۂ رحمٰن بہ آواز بلند روزانہ پڑھا کرتے اور کبھی معمول میں فرق نہ آنے دیتے۔ اپنی پاکیزگی اور صفائی کا بہت خیال رکھتے۔ صابن کا کبھی استعمال نہ کیا۔ ہمیشہ بیسن سے ہاتھ منہ دھوتے کیونکہ ان کی نگاہ میں صابن کبھی آلودگی سے پاک نہ ہوتا تھا اور اس لیے بھی کہ یہ مختلف جانوروں کی چربی سے تیار کیا جاتا ہے۔ بیسن کی ترجیح کی توجیہہ یہ کرتے تھے کہ اس میں انسانی تصرف کی کم گنجائش ہے۔ یہ اپنی فطرت سے بہت قریب ہے اور جس میں جتنا کم تصرف کیا گیا ہو وہ چیز اتنی ہی لطیف ہوگی۔ پاکیزگی کا اس درجہ خیال رکھتے تھے کہ دھوبی کا دُھلا ہوا کپڑا بغیر غوطہ دیئے نہ پہنتے

علاوہ ازیں بشکل اول کراہیت بھی محسوس کرتے تھے۔

حنفی المذہب تھے مگر اپنے والد مرحوم کی طرح اہل بیت سے محبت رکھتے تھے۔ اٹھتے بیٹھتے "یا علی یا علی" پکارا کرتے تھے۔ سید محمد ابراہیم مرحوم رئیس موضع کم تولیہ ضلع مظفر پور نے ان سے پوچھا کہ آپ "یا اللہ" نہ پکار کے "یا علی" کیوں پکارا کرتے ہیں؟ مرحوم نے ہنس کر کہا کہ "بغیر علیؑ اللہ نہیں ملتا"۔ کچہری میں کثرت مشاغل کی وجہ سے ظہر اور عصر کی نماز اجتماع کر کے پڑھا کرتے تھے۔ شیعہ سنی اختلافات سے انھیں کچھ سروکار نہ تھا۔ وہ ارتباط کے ذریعہ متنازعہ مسائل کو اعتدال پر لانے کے قائل تھے کیونکہ اختلافات سے دنیائے اسلام کو سخت نقصان پہنچا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ انھوں نے اپنے بڑے لڑکے مسٹر ریاست حسین مرحوم بیرسٹر کی شادی شہر چھپرہ کے ایک شیعہ خاندان میں سید صالح حسین صاحب کی بہن سے کی جو کانگریس کے نامی کارکنوں میں سے تھے۔

تعلیم وتربیت، سرکاری ملازمت تقرری ضلع مجسٹریٹ وکلکٹری :

خان بہادر حشمت حسین صاحب ابھی کم سن ہی تھے کہ ان کے والد کا انتقال ہو گیا۔ باپ کے انتقال کے بعد امجد حسین صاحب مرحوم بھائیوں میں سب سے بڑے تھے اس لیے خاندان کی تمام ذمہ داریاں ان کے سر آگئیں۔ حشمت حسین صاحب مرحوم کی تعلیم وتربیت انھیں کے زیر سایہ ہوئی۔ موصوف سے پہلے خاندان کے ہر فرد نے علوم شرقیہ کی تعلیم حاصل کی تھی۔ مگر امجد حسین صاحب مرحوم نے اپنے سب سے چھوٹے بھائی پر بقدر ضرورت وتقاضائے وقت اردو اور فارسی کی تعلیم کے بعد انگریزی وجدید علوم کی تعلیم کے لیے خصوصی توجہ دی جس کے نتیجے میں حشمت حسین صاحب خان بہادر کلکتہ یونیورسٹی سے انٹرنس کے امتحان میں درجہ اوّل سے کامیاب ہوئے جو اُس دَور میں بڑی بات تھی۔ اس زمانے میں لفٹننٹ گورنر بنگال راقم کے دادا جان کے قدر دانوں میں سے تھا۔ ان کا بڑا خیال کرتا تھا۔ دادا جان بھی انھیں بہت عزت واحترام کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ یہ ارتباط حشمت حسین صاحب مرحوم کے لیے بہت کارآمد ثابت ہوا۔ دادا جان مرحوم نے گورنر موصوف سے کلکتہ جاکر سفارش کی کہ میرے چھوٹے بھائی کو سب ڈپٹی کلکٹر مقرر کر دیا جائے۔ گورنر نے تقرری کا حکم صادر کر دیا اور اس خدمت پر مامور ہو گئے۔ اپنی محنت اور دیانت داری سے تھوڑے ہی عرصہ میں ڈپٹی کلکٹر ہو گئے۔ بہار کے مختلف اضلاع میں خدمت انجام دی اور اتنی ترقی

کی رٹیائرمنٹ پانے سے چند سال قبل حکومتِ ہند نے انھیں ضلع مجسٹریٹ اور کلکٹر کے عہدہ پر فائز کیا۔ ان دنوں ایک ہندوستانی کا اس عہدہ پر فائز ہونا جوئے شیر لانا تھا۔ موصوف نے تین سال تک ضلع سارن اور دربھنگہ میں کلکٹر و ضلع مجسٹریٹ کی خدمات انجام دیں۔

خان بہادری کا خطاب، پنشن و موت :

ان کی کارگزاریوں کے اعتراف و اعزاز میں حکومتِ ہند نے انھیں "خان بہادر" کے خطاب سے نوازا۔ ۱۹۱۴ء کے اواخر میں پنشن لے کر سوچا کہ اب سکون و آرام کی زندگی گزاریں۔ مگر حکومتِ بہار کے اصرار پر مہاراجہ ہتھوا کے یہاں منیجری کی خدمت پر مقرر ہوئے۔ دورانِ ملازمت جب کہ وہ گوپال گنج ضلع سارن کے دورے پر تھے، ۱۹۱۷ء کی گرمیوں میں وہیں انتقال کیا۔ اور گوپال گنج ہی میں مدفون ہوئے۔

احباب کا حلقہ :

چھوٹے دادا مرحوم کے احباب کا حلقہ بہت محدود تھا۔ لوگوں سے زیادہ میل جول کو اچھا نہ سمجھتے تھے مگر مخصوص احباب کے حلقے میں بڑے بے تکلف رہتے اور دل کھول کر خوب باتیں کیا کرتے تھے۔ جہاں تک راقم کو یاد ہے خان بہادر نواب سرفراز حسین خاں، مسٹر جسٹس سید شرف الدین، جج ہائی کورٹ، سر سید علی امام اور ان کے چھوٹے بھائی مسٹر سید حسن امام اور ڈاکٹر سچیدانند سنہا بیرسٹر ان کے خاص دوستوں میں تھے اور خان بہادر سے بڑی محبت کرتے تھے۔

چھوٹے دادا کی پہلی شادی نیوڑہ میں سر علی امام صاحب مرحوم کے رشتہ کی بہن سے ہوئی تھی اس لیے ان دونوں حضرات میں ہنسی مذاق خوب ہوتا۔ تفریحِ طبع کے لیے رشتہ کی بنیاد پر دونوں آپس میں خوب گالی گلوج کرتے۔ اس ہنسی مذاق میں ڈاکٹر سچیدانند سنہا بھی برابر کے شریک رہتے کیونکہ یہ خود کو سر علی امام کا بھائی کہتے تھے۔ چھوٹے دادا تو ان سے سر علی امام سے بھی زیادہ مذاق کرتے اور انھیں خوب گالیاں دیتے۔ باوجود اختلافِ مذہب ان میں کسی قسم کی تلخی نہ آتی بلکہ آپس میں مثلِ شیر و شکر رہتے۔ یہ گالی گلوج اور مذاق آپسی رشتہ، میل ملاپ، خلوص اور دوستی کو استوار تر کرتا تھا۔ کیا زمانہ تھا اور کیسے مخلص لوگ تھے! افسوس وہ سب چیزیں اب مذہبی اختلافات اور سیاست کی شکار ہو گئی ہیں۔

بے موقع نہ ہوگا کہ ایک مذاق کا تذکرہ جسے راقم نے سنہا صاحب سے بار بار سنا اور

جو قدرے خطرناک بھی تھا، کر دیا جائے تاکہ تعلقات کی استواری اور خلوص نیت پر مزید روشنی پڑ سکے۔ ایک دن شام کو ہنسی مذاق کی مجلس گرم تھی۔ سر علی امام مرحوم، مسٹر سچیتانند مرحوم اور چھوٹے دادا مرحوم تینوں ایک دوسرے سے خوب ہنسی مذاق کر رہے تھے۔ چھوٹے دادا مرحوم کسی ضرورت سے اپنی کرسی سے اٹھے۔ سر علی امام کو موقع ہاتھ آ گیا۔ سر علی امام کے اشارے پر مسٹر سچیتانند سنہا نے خاموشی سے کرسی کھینچ لی۔ چھوٹے دادا مرحوم جسم کے بھاری بھر کم انسان تھے، جب اپنی نشست پر بیٹھنے لگے تو کرسی اپنی جگہ سے کھسکائی جا چکی تھی وہ اپنے کو سنبھال نہ سکے اور زمین پر گر پڑے۔ اٹھ کر مسٹر سچیتانند کو خوب گالیاں دینا شروع کیا۔ سر علی امام اور سنہا صاحب نے بھی جواب میں گالیاں دیں اور پھر خوش گپیاں شروع ہو گئیں۔

پہلی شادی اور داماد بشیر حسین :

چھوٹے دادا مرحوم کی پہلی شادی جو ڈاکٹر اظہار الدین صاحب ساکن نیورہ ضلع پٹنہ کی سگی بہن سے ہوئی تھی۔ ان کے بطن سے دو اولاد ہوئی ایک لڑکی اور ایک لڑکا۔ لڑکی بڑی تھی جن کی شادی بشیر حسین صاحب سے ہوئی۔ بشیر حسین صاحب مرحوم خوش رُو، دولت مند، خوش اخلاق اور ملنسار آدمی تھے۔ انگریزی یا ہندوستانی جو بھی لباس پہنتے خوب بھلا معلوم ہوتا۔ مظفرپور کا نہایت مشہور انگریزی خیاط "ور بی اینڈ کمپنی" جس کی دُکان کو ختم ہوئے تقریباً ساٹھ برس ہوتے بہت زیادہ اجرت پر کپڑے سیتا تھا، اسی کے یہاں برابر اپنے کپڑے سلوایا کرتے تھے۔ راقم ان سے بڑا مانوس تھا اور وہ راقم کو کیک اور مٹھائیوں سے خوش رکھا کرتے تھے۔

بشیر حسین صاحب کو کوئی اولاد نہ ہوئی۔ بڑے وفا شعار تھے اہلیہ کے انتقال کے بعد پھر شادی نہ کی۔ باپ کے اکلوتے بیٹے تھے، زمیندارانہ زندگی گزارتے تھے۔ مظفرپور اور لکھنؤ میں رہ کر تمام جائداد شریک حیات کی جدائی کے غم کو غلط کرنے کے ذرائع کی تلاش میں ختم کر دی۔ اور عین جوانی میں تپ دق کا شکار ہو کر قضا کر گئے۔

پہلی بیوی سے اولاد ریاست حسین :

خان بہادر حشمت حسین کی دوسری اولاد مسٹر ریاست حسین تھے جنھوں نے آکسفورڈ یونیورسٹی سے بی۔اے اور لندن میں میڈل ٹمپل سے بیرسٹری کا امتحان پاس کیا تھا۔ پٹنہ ہائی کورٹ میں بیرسٹری کرتے تھے۔ ۴۴ سال کی عمر میں ۱۹۳۱ء میں قضا کیا۔ ایک لڑکی اور لڑکا چھوڑا اور

اب ان دونوں کا بھی انتقال ہو چکا ہے۔

خان بہادر حشمت حسین مرحوم صاحب جائداد تھے۔ اکزبیشن روڈ پٹنہ میں دو بہت اچھے مکانات تھے اور کچھ زمینداری علاول پور ضلع پٹنہ میں تھی۔ ان کی وفات کے بہت دنوں بعد ان کے بیٹے فضل حسین مرحوم اور ان کی دو بہنوں نے کل جائداد فروخت کر کے لکھنؤ میں مستقل طور سے سکونت اختیار کر لی اور پٹنہ سے اپنا رابطہ بالکل ختم کر دیا۔

چھوٹے دادا خان بہادر حشمت حسین صاحب مرحوم راقم کے والد مرحوم اور راقم سے بہت محبت کرتے تھے۔ جب بھی ان کے یہاں ہم لوگوں کے قیام کا اتفاق ہوتا تو بڑی خاطر اور تواضع سے پیش آتے۔ اپنے بڑے بھائی مولوی امجد حسین صاحب مرحوم کے احسانات کا ذکر بہت ممنونیت کے ساتھ کرتے۔ کہتے کہ جو عزت اور قدر و منزلت مجھے ملی ہے وہ میرے بھائی ہی کی بدولت ہے۔ اگرچہ میں نے دنیا میں بہت کچھ حاصل کیا مگر جو عزت و شہرت اور زمینداری انھیں نصیب ہوئی اس کا عشر عشیر بھی میرے حصے میں نہ آیا۔ جب بھائی کو یاد کرتے تو آنکھوں سے آنسو نکل جاتے۔ ہر سال دسہرے کی چھٹیوں میں دادی صاحبہ مرحومہ سے ملنے کے لیے ہم لوگوں کے یہاں مع بال بچوں کے نیورہ تشریف لاتے تھے اور پوری چھٹی یہیں گزارتے تھے۔ ان کا یہ سلسلہ تاحیات جاری رہا۔ دوران قیام ان کے دوست خان بہادر نواب سرفراز حسین خاں اپنی گلابی رنگ کی 'فورڈ' موٹر کار پر نیورہ آتے تھے۔ ہر سال چھٹیوں میں چھوٹے دادا کی آمد اور قیام ان کی اخلاق مندی خلوص ربط اپنے بڑے بھائی سے بے انتہا محبت کی دلیل تھی۔ ہم لوگوں کو ان کی سالانہ آمد کا شدید انتظار رہتا تھا۔ جب وہ تشریف لاتے تو ہم سب لوگوں کی مسرت کی انتہا نہ ہوتی۔ واپسی کے وقت والد مرحوم ان کو پہنچانے کے لیے پٹنہ جاتے تھے۔

دوسری شادی اور اولاد :

چھوٹے دادا مرحوم کی اپنی پہلی بیوی کے انتقال کے بعد دوسری شادی مولوی لطیف عالم مرحوم ڈپٹی کلکٹر ساکن آرہ و محلہ سبزی باغ پٹنہ کی بھانجی سے ہوئی تھی جن کے بطن سے ایک لڑکا سید فضل حسین اور دو لڑکیاں پیدا ہوئیں۔ سید فضل حسین مرحوم کی شادی اصطفیٰ خاں صاحب مرحوم، مالک کارخانہ اصغر علی محمد علی لکھنؤ کی بڑی بیٹی سے ہوئی۔

ولی الدین خدابخش، داماد :

بڑی بیٹی کی شادی خان بہادر خدابخش خاں سی۔ آئی۔ ای بانی خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری

پٹنہ کے چھوٹے بیٹے جناب ولی الدین خدا بخش مرحوم وکیل سے ہوئی۔ ولی الدین خدا بخش لاولد مرے اور ان کی اہلیہ بھی آج سے تین سال قبل انتقال کر گئیں۔ افسوس ہے کہ خان بہادر خدا بخش خاں کی اب کوئی اولاد باقی نہیں رہی۔ چھوٹی بیٹی کی شادی اعظم علی خاں صاحب مرحوم تاجر عطر لکھنؤ سے ہوئی۔ انھوں نے کئی بار حج کیا۔ تقریباً پچاس سال کی عمر میں حج کرنے گئے جب مدینہ منورہ میں زیارت کے لیے حاضر ہوئے تو حرکتِ قلب بند ہو جانے سے ۱۹۶۴ء میں وہیں انتقال کیا اور جنت البقیع میں دفن ہونے کی سعادت حاصل کی۔ اعظم علی خاں صاحب مرحوم کی سب اولاد اللہ کے فضل سے بر سرِ روزگار ہیں اور لکھنؤ کے مختلف محلّوں میں آباد ہیں۔

خان بہادر حشمت حسین انگریزوں کی نگاہ میں :

خان بہادر حشمت حسین نہایت محنتی اور ایماندار افسر تھے۔ انگریز افسران ان کا بڑا احترام کرتے تھے۔ بحیثیت مجسٹریٹ ان کے رعب و دبدبے کی سارے بہار میں بڑی شہرت تھی۔ اصول کے بہت پابند تھے۔ کسی آدمی کی خاطر اپنے اصولوں کی خلاف ورزی کو پسند نہ کرتے تھے۔ اپنے فرائض منصبی کو بحسن وخوبی انجام دیا اور کبھی کسی کو شکایت کا موقع نہ ملا۔ گھریلو زندگی میں بھی اپنے بال بچوں سے بڑی محبت کرتے تھے خصوصاً مسٹر ریاست حسین سے۔ پنشن پانے کے بعد خان بہادر حشمت حسین مرحوم اپنے مکان "حشمت منزل" واقع اگزیبشن روڈ پٹنہ میں رہتے تھے۔ اس زمانے میں ان کے بڑے لڑکے مسٹر ریاست حسین مرحوم بیرسٹر اپنے اس بنگلے میں رہتے تھے جس میں آج بی این کالج کا تین منزلہ ہوسٹل ہے۔ خان بہادر کا معمول تھا کہ ہر روز شام کے وقت اپنی گاڑی پر سوار ہو کر اپنے بیٹے سے ملنے جایا کرتے تھے، اور ایک دو گھنٹہ وہاں قیام کرتے۔ اپنے بڑے بیٹے سے ملاقات کے بغیر انھیں اطمینان نہیں ہوتا تھا۔ کبھی کبھی راقم کو بھی بڑی شفقت سے اپنے ساتھ گاڑی میں بٹھا کر وہاں لے جاتے۔ ان کے اس معمول میں کبھی فرق نہ آتا تھا۔ مسٹر ریاست حسین مرحوم بڑے فیاض آدمی تھے اور دولت کی کبھی لالچ نہ کی۔ ان کے اندر ایثار و قربانی کا جذبہ بھی بدرجہ اتم موجود تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اپنے سوتیلے بھائی بہنوں کا خیال کر کے اپنے والد کی جائداد میں سے ایک پیسے کا بھی حصہ نہ لیا۔

چھوٹے دادا مرحوم راقم سے اپنے والد بزرگوار اور نام ور رشتہ داروں کے حالات اور واقعات بیان کرتے اور کہا کرتے تھے کہ لڑکوں کو چاہیے کہ اپنے بزرگوں کے حالات اور کارناموں سے واقفیت رکھیں کہ یہ ان کے لیے بڑا مفید اور سود مند ہوتا ہے۔ اپنے خاندان کے بزرگوں کے

حالات جاننے سے دل میں ان کا احترام پیدا ہوتا ہے اور ان کے کارناموں کی واقفیت سے لاشعوری طور پران کارناموں کو کرنے اور ان کے کردار کو اپنانے کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ آج کل کے بہت سے نوجوان اپنے دادا کے نام سے بھی واقفیت نہیں رکھتے۔ میرے چھوٹے دادا حشمت حسین صاحب مرحوم کو شہر مظفر پور سے والہانہ محبت تھی۔ وہ کہا کرتے تھے کہ یہ میرے باپ کا شہر ہے جہاں میرے باپ نے عزت و شہرت حاصل کی اور اپنی ساری زندگی بسر کی، اس لیے مجھے یہ شہر بے حد محبوب ہے۔ یہی وجہ تھی کہ انھوں نے پکّی سرائے میں ایک اچھا پختہ مکان تعمیر کرایا۔ پنشن پانے سے تقریباً پانچ سال قبل ایگزبیشن روڈ میں دو مکان تعمیر کرایا۔ مکان کی تعمیر میں جب پیسے کی کمی ہوئی تو نہایت افسوس کے ساتھ مظفر پور کا اپنا مکان ایک وکیل کے ہاتھ فروخت کر دیا اور مستقل طور سے پٹنہ میں سکونت اختیار کر لی۔ چھوٹے دادا مرحوم شہر مظفر پور سے متعلق جو باتیں بتاتے اور اس شہر کی تعریفیں جو میرے والد مرحوم سے کیا کرتے اس سے راقم کی ان باتوں کی تصدیق ہو جاتی ہے جس کا تذکرہ مظفر پور کے ذیل میں گزشتہ صفحات میں راقم کے دادا امجد حسین صاحب کے حوالے سے کیا جا چکا ہے۔

آخر عمر کی درویشانہ زندگی :

چھوٹے دادا مرحوم کی دنیاوی زندگی بہت کامیاب رہی۔ آخر عمر میں درویشانہ زندگی بسر کی۔ تمام خرافات سے کنارہ کش ہو گئے۔ خصوصاً سالا بہنوئی میں مذاق اور گالی گلوج جو بہار کی مخصوص رسم ہے اس سے بھی نفرت کرنے لگے۔

فضل حسین :

خان بہادر حشمت حسین صاحب مرحوم کے چھوٹے صاحبزادے فضل حسین صاحب مرحوم نے اپنی شادی کے بعد لکھنؤ میں مستقل طور سے سکونت اختیار کر لی تھی۔ عمر میں راقم سے محض پانچ چھ سال بڑے تھے اگرچہ وہ رشتہ میں چچا تھے مگر ہم دونوں میں دوستانہ تعلقات تھے۔ جب بھی راقم لکھنؤ بذریعہ ریل یا ہوائی جہاز جاتا تو وہ استقبال کے لیے اسٹیشن یا ہوائی اڈے پر موجود رہتے اور اپنی کار پر اپنے گھر واقع محلہ چوک لے جاتے تھے۔ گرچہ وہاں راقم کے اور رشتہ دار بھی تھے مگر ان کے یہاں قیام کی اجازت نہ دیتے تھے۔ بحیثیت چچا اور دوست ان کی مرضیوں کا احترام بھی کرنا پڑتا تھا۔ راقم جب واپسی کی تیاریاں کرتا تو اصرار کر کے روک لیتے۔ کئی بار ٹکٹ کے پیسے

بھی ضائع ہو گئے۔

فضلو چچا لکھنؤ میں نہایت ہر دل عزیز تھے، ہر کس و ناکس ان کے نام سے واقف تھا۔ کون تھا جو فضلو بابو کو نہ جانتا تھا۔ آج بھی "فضلو بابو" کے کارنامے لکھنؤ میں مشہور ہیں۔ خدا مغفرت کرے، فضلو چچا بڑے آزاد منش آدمی تھے کبھی کل کی فکر نہ کرتے۔ اسی طرز فکر نے انھیں فضول خرچی کی طرف مائل کر دیا۔ گھوڑ دوڑ کا انھیں بہت شوق تھا اور اس میں انھوں نے بہت سارے روپیے بھی برباد کیے۔ ہادی صاحب، ساکن کلکتہ کی دوستی نے ان کے اس شوق میں اور اضافہ کر دیا۔ ہادی صاحب کے مشورہ پر انھوں نے گھوڑ دوڑ کا گھوڑا خریدا۔ اس گھوڑے نے ایک آدھ بار ریس کی بازی جیتا بھی مگر زیادہ تر ناکام ہی رہا اور آخر کار مر بھی گیا۔ اس کی وجہ سے انھیں تقریباً پچاس ہزار روپیے کا نقصان اٹھانا پڑا۔ مختصر یہ کہ اس شوق اور فضول خرچی نے انھیں کہیں کا نہ رکھا۔ ان کے خسر حاجی مصطفیٰ خاں بھی ان سے ناراض ہو گئے۔

فضلو چچا کی اولاد میں دو لڑکے اور ایک لڑکی تھی۔ بڑا لڑکا پاکستان جا کر کراچی میں انتقال کر گیا۔ لڑکی بھی چند سال قبل قضا کر گئی، صرف چھوٹا لڑکا لکھنؤ میں اب بھی بقید حیات ہے۔

ساتواں باب

نیورہ اور مشاہیرِ نیورہ

نیورہ گاؤں کے حالات :

نیورہ گاؤں نہ صرف بہار بلکہ بہار سے باہر کے صوبوں میں بھی کافی مشہور ہے۔ یہ گاؤں پٹنہ سے ۱۵ کیلومیٹر پچھم کی جانب واقع ہے۔ تقریباً ۱۵ تعلیم یافتہ مسلمانوں کے گھروں پر مشتمل یہ بستی تھی۔ جس کا قریب قریب ہر فرد سرکار انگلشیہ کی ملازمت کا شرف رکھتا تھا۔ انگریزوں کے عروج کے ساتھ اس بستی کا عروج ہوا اور ان کے زوال کے ساتھ ہی اس بستی کا بھی زوال ہوگیا۔ کانگریس سرکار نے سماج وادی نظام حکومت کی بنیاد ڈالی۔ زمینداری کا خاتمہ کر دیا جس سے زمینداروں کا متوسط طبقہ بری طرح متاثر ہوا۔ نیورہ والے بھی اس اثر سے محفوظ نہ رہ سکے اور ان کا دیہات میں رہنا دشوار ہوگیا۔ تقریباً سب لوگوں کو دیہات کا آبائی مکان مجبوراً فروخت کر دینا پڑا۔ یہ سب لوگ اپنے آبائی مسکن نیورہ کو چھوڑ کر پٹنہ چلے آئے اور اچھے اچھے مکانوں کی تعمیر کی جس میں آرام سے رہ رہے ہیں۔ باوجود اس کے ہر فرد کے دل میں نیورہ کے اجڑ جانے کا اب تک صدمہ باقی ہے۔ راقم کی دعا ہے : ع

مکیں کی خیر ہو یارب مکاں رہے نہ رہے

یہ وہ مردم خیز بستی ہے جس نے ایسے سپوتوں کو جنم دیا جو نہ صرف علم و خرد میں یکتائے زمانہ تھے بلکہ حکومت انگلشیہ میں صاحب اختیار ہونے کی حیثیت سے بھی اپنی مثال نہ رکھتے تھے۔ علم کے ہر میدان میں اس بستی کے باشندوں نے قدم رکھا۔ بیرسٹری ہو یا وکالت، پروفیسری ہو یا ڈاکٹری، سیاست دانی ہو یا افیسری، غرض ہر شعبے میں اپنا ایک مقام پیدا کیا۔ اپنی سخت محنت، انتہائی ایمانداری اور وفاشعاری، ذہانت و ذکاوت، اخلاق و محبت اور خدمت کے بے لوث جذبے کے سبب محض حکومتِ وقت میں ہی محترم نہ تھے بلکہ عوام میں بھی محبوب ہوئے اور اپنی کارگزاریوں

کے سبب ہندوستان کے اعلیٰ سے اعلیٰ اعزازات وخطابات حاصل کیے۔ زندگی کے جس شعبے میں بھی نگاہ اٹھتی تھی یہاں کے لوگ چھائے ہوئے نظر آتے۔ یہ سب کچھ ان کی دعاؤں کا اثر تھا جو اس بستی کے بانی جدید اور مورث اعلیٰ تھے اور جن کا نام سید حسن خنگ سوار تھا۔ آپ اس صوبہ میں بشکل مجاہد تشریف فرما ہوئے اور بعد فتح یابی کے موضع نیورہ میں متوطن پذیر ہوئے۔ اسی گاؤں میں ان کا مزار واقع ہے اور یہ بزرگ موصوف سید حسین خنگ سوار کے چھوٹے بھائی تھے جن کا ذکر کتاب مفتاح التواریخ میں مسٹر بیلیا کرتے ہیں۔ ان بزرگ کا مزار اجمیر میں تارا گڑھ کی پہاڑی پر واقع ہے۔

مشاہیر نیورہ کا پہلا دور :

یہاں تمام مشاہیر نیورہ اور اس بستی کی تواریخ بیان کرنا مقصود نہیں کیونکہ اس کام کے لیے کئی دفتر درکار ہیں۔ طوالت سے بچنے کی خاطر راقم یہاں صرف چند مشاہیر کے تذکرے پر اکتفا کرتا ہے ان مشاہیر کا ذکر تین ادوار میں تقسیم کر کے انتہائی اختصار سے بیان کیا جاتا ہے :

پہلا دور : اس دور کے تمام لوگ اس دار فانی سے رخصت ہو چکے ہیں۔ اس دور کے مشاہیر میں شاہ محمد دائم اور میر سلامت علی کا نام نامی سرفہرست آتا ہے۔ یہ دونوں متقی اور دین دار آدمی تھے۔

خان بہادر راحت علی : ۱۸۲۵ء میں دولت انگلشیہ میں اعلیٰ منصب پر فائز تھے۔ حکومت وقت ان کی قدر کرتی تھی۔ سید فریدالدین صاحب حاکم عدالت تھے۔ شمس العلماء خان بہادر وحیدالدین، سید نجم الدین، سید کرامت علی و سید فرزند علی جلیل القدر بزرگ گزرے ہیں۔ سید محمد اسمٰعیل اور سید عبدالحیٔ کو فراموش نہیں کیا جا سکتا ہے۔ سید فرزند علی کے تین صاحبزادے سید فخرالدین (مصنف کشف التلبیس)، خان بہادر سید نصیرالدین سی آئی ای (وزیر مالیات بھوپال اسٹیٹ) اور مسٹر جسٹس سید شرف الدین، ممدوح عوام وخاص تھے۔ خان بہادر سید ظہیرالدین صاحب بہت سے اعزازی مناصب پر پٹنہ اور دہلی میں رہے۔ شمس العلماء نواب امداد امام اثر صاحب نے علمی تبحر اور شاعری کے ذریعہ نیورہ کا نام بلند کیا اور ان کی تصانیف اردو ادب میں گراں قدر اضافہ ہیں۔

نیورہ کے قدیم مشاہیر کی فہرست اس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتی جب تک کہ جناب

سید عبدالوہاب صاحب کا تذکرہ نہ کیا جائے۔ صاحب موصوف ایک بڑے نامی گرامی بزرگ تھے اور کمالاتِ صوری و معنوی سے مملو۔ شجاعت، سخاوت اور خدا ترسی میں اپنا نظیر کمتر رکھتے تھے، وہ بڑے ممدوح خلائق تھے۔ صاحب موصوف خان بہادر سید ظہیر الدین صاحب مرحوم درویش صفت انسان اور میری دادی مرحومہ کے والد بزرگوار تھے۔

سید ظہیر الدین، خانقاہ پھلواری شریف اور تحریک ترک موالات:

خان بہادر ظہیر الدین صاحب خانقاہ مجیبیہ پھلواری شریف کے عقیدت مندوں میں سے تھے اور وہاں کے عالموں و بزرگوں کی بڑی قدر کرتے تھے۔ حضرت سید شاہ بدر الدین صاحب مرحوم، سجادہ نشین خانقاہ مجیبیہ پھلواری شریف کو شمس العلماء کا خطاب دلانے میں خان بہادر سید ظہیر الدین مرحوم نے بہت کوشش کی تھی۔ خان بہادر موصوف کی سفارشوں کی بدولت مسٹر اولڈھم کمشنر پٹنہ ڈویژن نے حکومت ہند کو اس امر کی طرف توجہ دلائی اور سجادہ نشین موصوف کو اس اعلیٰ خطاب سے نوازا گیا۔ چونکہ صاحب سجادہ خلوت نشین تھے اس لیے خان بہادر ظہیر الدین نے اس بات پر مسٹر اولڈھم صاحب کو راضی کیا کہ خود چل کر سند اور خلعت پیش کریں۔ چنانچہ اس تقریب کے موقع پر ظہیر الدین صاحب مسٹر اولڈھم کے ہمراہ اپنے چند احباب کو لے کر پھلواری شریف گئے اور تقریب میں شرکت کی جب ترک موالات کی تحریک شروع ہوئی تو سجادہ نشین نے بطور احتجاج حکومت ہند کو شمس العلماء کا خطاب اور خلعت واپس کر دیا۔ اس سے ظہیر الدین صاحب اور مسٹر اولڈھم دونوں کو بہت صدمہ ہوا۔

خان بہادر سید ظہیر الدین صاحب مرحوم تحریک ترک موالات سے متفق نہ تھے۔ انھوں نے انگریزی میں ایک رسالہ بنام "کوآپریشن" (تعاون) لکھا جو پٹنہ ڈسٹرکٹ بورڈ کے پریس سے ۲۴۔ اکتوبر ۱۹۲۱ء میں شائع ہوا۔ اس رسالہ میں انھوں نے اپنے نظریہ کی توجیہ و تشریح نہایت ہی ناقدانہ انداز میں کی ہے۔ انھوں نے مختلف علوم سے مثالیں دیتے ہوئے یہ بتایا ہے کہ کائنات کی بقا و دار و مدار صرف تعاون اور موالات میں ہے۔ عدم تعاون اور ترک موالات میں نہیں، بلکہ عدم تعاون اور ترک موالات ایک لحاظ سے غیر فطری چیز ہے۔ راقم کے پاس اس رسالہ کا ایک نسخہ آج تک محفوظ ہے۔ جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے خان بہادر سید ظہیر الدین صاحب مرحوم تحریک ترک موالات کے سخت مخالف تھے مگر ان کے داماد مسٹر سید زکریا ہاشمی جو چھپرہ میں بیرسٹری کرتے تھے، تحریک

میں شامل ہوگئے اور بیرسٹری چھوڑ کر پٹنہ چلے آئے۔ روزانہ کانگریس کے دفتر واقع محلہ گلاب باغ میں جاتے اور کانگریس کے کاموں میں بابو راجندر پرشاد کی مدد کرتے۔ خان بہادر کو اس کا بڑا رنج تھا مگر رشتہ نازک ہونے کی وجہ سے منع نہیں کر سکتے تھے۔ اکثر یہ کہتے تھے کہ ایک دن انھیں ترک موالات کی حقیقت معلوم ہو جائے گی اور پھر اپنے پیشہ میں لوٹ کر آجائیں گے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ انھوں نے دھنباد میں پھر بیرسٹری شروع کر دی، جہاں کے حکام نے خوش ہو کر ۱۹۲۸ء میں انھیں خان بہادر کے خطاب سے سرفراز کیا۔ موصوف ایک شریف النفس انسان تھے۔ جب تک کانگریس میں رہے نہایت سرگرمی سے کام کرتے رہے۔ تحریک خلافت کی حمایت میں ایک کتابچہ لکھا اور اس کے فروخت کرنے سے جو پیسے ملے اسے خلافت فنڈ میں دے دیا۔ ۱۹۴۷ء میں بیرسٹری کے پیشے سے الگ ہو گئے، اور دھنباد سے نیورہ چلے آئے اور یہیں مستقل طور سے رہنے لگے۔ آخر وقت میں اپنے بیٹے کے ساتھ چھپرہ چلے گئے، اور وہیں قضا کیا۔

مشاہیر نیورہ کا دوسرا دور :

اس دور کے افراد ہندوستان میں اپنی انفرادی حیثیت رکھتے تھے، خصوصاً بہار میں ان کے کارنامے نہایت عظیم رہے۔ اگرچہ سب سپرد خاک ہو چکے ہیں مگر ان کے کارناموں نے انھیں اب تک زندہ رکھا ہے۔

سر سید علی امام (لا ممبر حکومت ہند، جج ہائی کورٹ، ممبر بہار گورنرس ایکزیکیوٹیو کانسل، صدر اعظم حیدر آباد گورنمنٹ)۔ مسٹر سید حسن امام (ملاحظہ ہو ضمیمہ نمبر ۱، مسٹر سید حسن امام مرحوم کے ذکر میں) (ہندوستان کے نہایت قابل اور مشہور بیرسٹر، جج ہائی کورٹ اور پریسیڈنٹ اسپیشل سشن انڈین نیشنل کانگریس)۔ مسٹر سید عبدالعزیز (وزیر حکومت بہار و حیدر آباد دکن) سید زین الدین (پرنسپل لا کالج پٹنہ)، سید نذیر الدین (ڈپٹی کلکٹر حکومت بہار)۔ خان بہادر سید بشیر الدین (ضلع جج حکومت بہار و ممبر جوائنٹ پبلک سروس کمیشن) سید عزیز الدین (سپرنٹنڈنٹ پوسٹ آفیسز، صوبہ متوسط) سید رضی الدین (بیرسٹر و سب جج بہار) سید علی حمید (ڈویزنل سپرنٹنڈنٹ ریلوے) خان صاحب احمد حسین (ضلع مجسٹریٹ و کلکٹر پٹنہ) سید حفیظ امام (بیرسٹر) ریاست حسین (بیرسٹر) ڈاکٹر اظہار الدین (سرجن و ماہر امراض چشم) منیر الدین (سپرنٹنڈنٹ اکسائز، بہار)

مشاہیر نیورہ کا تیسرا دور :

یہ سب حضرات راہی ملک عدم ہو چکے ہیں مگر اپنی چھاپ بہار کے معاشرے پر چھوڑ گئے ہیں ــــ مسٹر سید حیدر امام (بیرسٹر) مسٹر سید صفدر امام (بیرسٹر) مسٹر سید جعفر امام (جج اور چیف جسٹس پٹنہ ہائی کورٹ، جج سپریم کورٹ دہلی) مسٹر سید رضا امام (بیرسٹر) مسٹر سید نقی امام (بیرسٹر، جج پٹنہ ہائی کورٹ) مسٹر سید اکبر امام (بیرسٹر) سید نور الدین وکیل، محمد وصی (وکیل)، سید رفیع الدین بلخی (وکیل)، انور حسین (چیئرمین کمرشیل ٹیکسز ٹریبونل)، حفاظت حسین (اسسٹنٹ رجسٹرار کوآپریٹو سوسائٹیز بہار)، کرنل ملی حفیظ امام (انڈین آرمی)

مشاہیر نیورہ کا دورِ حاضر :

مسٹر سید مہدی امام (بیرسٹر اور مصنف کتب بزبان انگریزی)، سید سلیم الدین (انشورنس ایکسپرٹ) سید وصی الدین (جج پٹنہ وکشمیر ہائی کورٹ) ڈاکٹر اقبال حسین (پرنسپل پٹنہ کالج وممبر بہار پبلک سروس کمیشن)، مسٹر سید محمد کریم (ضلع جج بہار) ڈاکٹر سید اشرف کریم (انگلستان) سید عبدالرحمٰن (ایڈیشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ، صوبہ بہار)، مسٹر شہاب الدین رحمت اللہ (سابق آئی سی ایس)، سید منظور عالم (ضلع جج حکومت بہار)، مسٹر نہال امان اللہ (انجنیئر ان چیف حکومت بہار) مسٹر افضل امان اللہ (آئی اے ایس، بہار)، ڈاکٹر سید احسان احمد (سنیئر سرجن حکومت بہار)، ڈاکٹر سید احسن احمد (سیول سرجن وسپرنٹنڈنٹ نالندہ میڈیکل کالج اسپتال، پٹنہ)، سید حسن احمد (سنیئر سرجن لندن) مقبول حسین (اسسٹنٹ ڈائرکٹر اعداد وشمار حکومت بہار)، اکبر حسین (منیجر انڈین آئیل کارپوریشن) ڈاکٹر اشرف حسین (پروفیسر میڈیکل کالج ریاض) ڈاکٹر اصغر حسین (سرجن۔ لندن)، ڈاکٹر خالد حسین (اسسٹنٹ سرجن سعودی عرب) انور ہاشمی (افیسر ٹاٹا کمپنی جمشید پور)، سید منور ہاشمی (انجنیئر امریکا)، ڈاکٹر نزہت رحمٰن (یہ نیورہ خاندان میں پہلی لیڈی ڈاکٹر ہیں)، سید قیصر کریم (سپریم کورٹ دہلی)

باشندگانِ نیورہ کی خدمات :

نیورہ اگرچہ ایک چھوٹا سا گاؤں ہے مگر اس نے پہلا مسلمان لاممبر حکومت ہند، ایک نہایت نامی انڈین نیشنل کانگریس کا صدر، چھ ہائی کورٹ کے جج، دو وزراء اور بے شمار نامی

افسران کو ملک کی خدمت کے لیے دے کر عزت و شرف حاصل کیا۔

کون ہے جو نیورہ کے خاندان سے واقف نہیں۔ میں اس سلسلے میں خود کچھ لکھنا پسند نہیں کرتا بلکہ مسٹر جسٹس میکفرسن جج پٹنہ ہائی کورٹ کی انگریزی سند مورخہ ۱۸ نومبر ۱۹۳۴ کے اردو ترجمہ پر اکتفا کرتا ہوں جو حسب ذیل ہے :

" اقبال حسین کا تعلق اس صوبہ کے ایک نہایت ہی مشہور خاندان سے ہے جو نہ صرف غدر کے زمانے میں وفادار رہا بلکہ جس نے حکومت کے لیے اعلیٰ حکام، ہائی کورٹ کے ججوں اور بہت سے اچھے افسروں کو مہیا کیا۔ "

راقم جو اپنی عمر کے ۸۲ ویں سال میں داخل ہے اور جس کے دل میں دنیا کی کسی چیز کی تمنا اب باقی نہیں، اللہ بزرگ و برتر سے یہ دعا کرتا ہے کہ نیورہ خاندان کا ہر فرد جو دنیا کے جس حصے میں ہے اس کی خاندانی امتیازی شان قائم رہے۔ ہر روز اور ہر سال ترقیاں کرتا رہے اور اپنے اسلاف کے نام کو روشن رکھے۔ سے

دے دُعا کو میرے وہ مرتبۂ حسن قبول
کہ اجابت کہے ہر حرف پہ سو بار آمین

ضمیمہ

(مسٹر سید حسن امام مرحوم کے ذکر میں)

مسٹر گاندھی نے جب ترک موالات کی تحریک ہندوستان میں بڑے پیمانہ پر شروع کی تو پہلے چند نامی حضرات کا انتخاب کیا جس میں مسٹر سید حسن امام بھی تھے۔ مسٹر گاندھی نے خواہش ظاہر کی کہ وہ بیرسٹری چھوڑ دیں اور تحریک مذکور میں شامل ہو جائیں۔ مسٹر سید حسن امام نے تحریک سے اتفاق کا اظہار کیا مگر بیرسٹری چھوڑنے پر راضی نہ ہوئے اور مالی امداد میں کثیر رقم دیتے رہے۔ تحریک میں شامل نہ ہونے پر کچھ مولویوں کو مخالفت کرنے کا موقع ہاتھ آگیا اس لیے ان پر ایک ہجویہ نظم لکھ کر "زمیندار" مورخہ ۲۰ فروری ۱۹۲۲ میں شائع کیا۔ پٹنہ کے لوگوں نے جب یہ نظم پڑھی تو مزید تضحیک کے خیال سے اس شہر کے کسی نامعلوم شخص نے اس نظم کو اشتہار کی شکل میں حسب ذیل بدنما عنوان کے ساتھ شائع کیا۔

(بڑے سے مراد سر سید علی امام اور چھوٹے سے مراد مسٹر سید حسن امام ہیں)

"وہ بڑے تو بڑے چھوٹے سبحان اللہ

مسٹر سید حسن امام توبہ کرو اور بیرسٹری چھوڑ دو"

نظم حسب ذیل ہے:

وہ صبح صبح نہیں ہے وہ شام شام نہیں
بلائے تازہ کا جو لا رہی پیام نہیں

کسی کو دار پہ کھینچا کسی کو ذبح کیا
یہ انتظام حکومت ہے انتقام نہیں

وہ کون ہے جو نہیں آج کل اسیر فرنگ
سی آر داس نہیں یا ابو الکلام نہیں

بہ حیرت اس پہ کہا ایک دوست نے مجھ سے
کہ اس گروہ میں شامل حسن امام نہیں

کسی سے جبکہ وہ رندی میں کم نہیں ہیں تو کیوں
شکست توبہ میں سرگرم اہتمام نہیں

اگر حرام موالات مجھ غریب پہ ہے
تو ایسے چوٹی کے لیڈر پہ کیوں حرام نہیں

کہا یہ دوست سے میں نے وہ مرغ دانا ہیں
حریص دانہ ہیں لیکن حریص دام نہیں

نہیں یہ قائد قوم اپنی قید کا قائل
شمار دانۂ تسبیح میں امام نہیں

جب یہ نظم اس بدنما سرخی کے ساتھ شائع ہوئی اور مسٹر سید حسن امام کی چھوٹی صاحبزادی آسما امام کو ملی تو اس نظم کو پڑھ کر بہت رنجیدہ ہوئیں اور اسے چاک کر دیا۔ موصوفہ نے جو ان دنوں تحریک کی سرگرم کارکن تھیں، اس نظم کے پڑھنے کے بعد یہ عہد کیا کہ وہ اب اس تحریک سے ہمیشہ کے لیے قطع تعلق کر لیں گی۔ اور تا حیات کانگریس سے الگ رہیں۔ لیکن مسٹر حسن امام پر اس نظم کا کچھ اثر نہ ہوا اور وہ حسب معمول کانگریس کی مدد کرتے رہے۔

آٹھواں باب

دادیہال

مولوی عبدالوہاب کی دوسری بیوی کا حج اور موت :

مولوی سید عبدالوہاب صاحب مرحوم کی دو بیویاں تھیں ایک بیوی سے ایک لڑکا اور ایک لڑکی اور دوسری بیوی سے صرف تین لڑکیاں ہوئیں جن میں سب سے چھوٹی میری دادی مرحومہ تھیں۔ میری دادی کی والدہ محترمہ ایک نہایت دین دار، پرہیزگار، خداترس، اخلاق مند اور منکسر مزاج خاتون تھیں۔ آج سے تقریباً سو سال قبل ۱۸۹۲ء میں اپنے شوہر کے انتقال کے بعد مولوی فضل رب صاحب مرحوم کے ہمراہ، جو میرے دادا کے بہنوئی تھے، حج کو گئیں۔ ("قبلہ نما" از فضل رب صاحب ص ۲ و ۳، مطبوع صادق پور پریس پٹنہ، ۱۸۹۶ء) حج سے واپسی کے بعد میری دادی مرحومہ نے اپنے گھر میں ان کے لیے ایک کمرہ اور ایک غسل خانہ مخصوص کر دیا۔ یہاں وہ عبادت و ریاضت میں ہمہ تن مشغول ہو گئیں اور دنیا سے بالکل بے تعلق ہو گئیں۔ ہر روز ورد کرا اپنے شوہر کی مغفرت کے لیے اللہ سے دعائیں کرتی تھیں اور اسی طرح پچاس سال کا زمانہ یادِ خدا میں خوبی اور استقلال کے ساتھ گزار دیا۔ گرچہ خان بہادر سید ظہیرالدین سوتیلے بیٹے تھے لیکن مرحومہ اپنی تمام اولادوں میں سب سے زیادہ خان بہادر سے محبت کرتی تھیں۔ خان بہادر بھی ان سے بے انتہا محبت کرتے، اور ان کے احترام و تعظیم میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھتے۔ نیورہ میں جب خان بہادر کا قیام ہوتا تو تقریباً روزانہ ان کی خدمت میں جا حاضر ہوتے اور ان سے دعائیں لے کر واپس جاتے۔ ۱۹۲۶ء میں جب کہ ان کی عمر قریب سو سال تھی قضا کیا۔

یہ اتفاق کی بات ہے کہ جس روز ان کا انتقال ہوا، خان بہادر سید ظہیرالدین کے پوتے سید نورالدین مرحوم کی برات نیورہ سے پٹنہ آنے والی تھی۔ خان بہادر نے اپنی سوتیلی ماں کی

شدید علالت کا خیال کرکے برات میں اپنی شرکت کو ملتوی کر دیا اور انتہائی دل سوزی کے ساتھ ان کی تیمارداری میں لگے رہے۔ اضطراب کی وجہ سے کبھی ان کے کمرے میں جاتے اور کبھی باہر آتے لیکن جانے والے کو کون روک سکتا ہے۔ ان کے انتقال کے بعد جب وہ قبر میں دفن کر دی گیئں تو فاتحہ پڑھنے کے بعد خان بہادر بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر روئے اور جب تک زندہ رہے اکثر ان کو یاد کیا کرتے تھے۔ ان کے انتقال کے وقت راقم بیس سال کا تھا۔ ان کی موجودگی خاندان کے لیے باعث برکت تھی۔ ان کی دینداری و پرہیزگاری سے راقم بھی بڑا متاثر رہتا تھا۔

دادی مرحومہ کی بڑی بہن اور ان کی اولاد :

پچھلے صفحات میں بیان کیا جا چکا ہے کہ راقم کی دادی مرحومہ تین بہنیں تھیں۔ بڑی بہن کے بطن سے ایک لڑکی اور چار لڑکے ہوئے۔ لڑکی کی شادی خان بہادر حشمت حسین صاحب سے ہوئی تھی۔ تقریباً ۲۰-۲۲ سال کی عمر میں قضا کر گیئں۔ ایک لڑکا اور ایک لڑکی یادگار چھوڑیں۔ بڑی دادی مرحومہ کے چار لڑکوں میں سب سے بڑے لڑکے کا نام ڈاکٹر اظہار الدین تھا۔ یہ اپنے وقت میں اچھے ڈاکٹر تھے۔ گوپال گنج اور سیوان ضلع سارن میں پریکٹس کرتے تھے۔ گورے رنگ کے قدآور انسان تھے۔ ادھیڑ عمر میں داڑھی بڑھائی، وضع قطع۔ ڈاکٹر کے بجائے ایک مولوی معلوم ہوتے تھے۔ شادی کے چند برسوں بعد بیوی سے بے تعلق ہو گئے اور ساری عمر تجرد میں گزار دی۔ ان کی کوئی اولاد نہ ہوئی اور اب ان کا کوئی نام لیوا باقی نہ رہا۔ دوسرے لڑکے کا نام نذیر الدین تھا جو پٹنہ کی فوجداری کچہری کے نامور مختار تھے۔ ان کی دوسری شادی راقم کی خالہ زاد بہن سے ہوئی تھی۔ تقریباً ۵۵ سال کی عمر میں قضا کیا۔ نذیر الدین صاحب مرحوم کے تین لڑکے تھے ان میں سب سے بڑے لڑکے سرکاری ملازم تھے اور تقریباً ۶۰ سال کی عمر میں قضا کیا۔ ان کے دو لڑکوں کے متعلق نہیں معلوم باحیات ہیں یا نہیں اور اگر باحیات ہیں تو کہاں ہیں۔ تیسرے لڑکے کا نام عزیز الدین تھا۔ یہ سب انسپکٹر پولس سے ترقی کرکے انسپکٹر ہوئے تھے اور چھپرہ ضلع سارن میں مامور تھے۔ تقریباً ۴۵ سال کی عمر میں اچانک انتقال کیا۔ ان کی کوئی اولاد نہ ہوئی۔ چوتھے اور سب سے چھوٹے لڑکے کا نام قمر الدین تھا۔ ریلوے پولیس (سون پور) میں سب انسپکٹر تھے۔ سیر و شکار کے بے حد شوقین تھے۔ چڑیوں سے لے کر شیر تک کا شکار کرتے تھے۔ موصوف نہایت دل چسپ آدمی تھے۔ ناظرین کی دل چسپی کے لیے شکار سے متعلق ان کا ایک واقعہ درج کیا جاتا ہے۔

قمرالدین، انگریز ڈی، ٹی، ایس سے لڑائی اور دیگر واقعات:

ایک روز کا واقعہ ہے کہ چڑیوں کے شکار کے لیے سون پور کے دیہات میں گئے ہوئے تھے۔ اسی جانب ان سے آگے کچھ دوری پر ایک انگریز ریلوے ڈسٹرکٹ ٹرافک سپرنٹنڈنٹ (DTS) بھی شکار میں مصروف تھا۔ اس کا خانساماں کھانا پانی لیے ہوئے قمرالدین صاحب کے قریب سے گذرا جس کی وجہ سے جن چڑیوں پر انھوں نے نشانہ باندھ رکھا تھا، اڑ گئیں۔ اس پر وہ بہت غصہ ہوئے اور خانساماں کو نہ صرف برا بھلا کہا بلکہ دو چار تھپڑ بھی رسید کیا۔ وہ وہاں سے سیدھا اپنے انگریز افیسر کے پاس گیا اور شکایت کی۔ خانساماں کی باتیں سن کر وہ انگریز بڑا غصہ ہوا اور طیش کے عالم میں قمرالدین صاحب کے پاس آیا۔ تحکمانہ انداز میں پوچھا کہ تم نے میرے نوکر کو کیوں مارا؟ قمرالدین صاحب بھلا اس کے آمرانہ لہجے کو کب برداشت کر سکتے تھے، کہا کہ ابھی تو تیرے نوکر کو مارا ہے اب تجھے بھی ماروں گا۔ اور اسے بھی دو چار تھپڑ لگا دیا۔ شکار سے واپس آئے تو ریلوے تھانہ میں جاکر اپنا استعفا نامہ میز پر رکھ دیا اور اس کے بعد خان بہادر حشمت حسین صاحب کے پاس گئے جو ان دنوں چھپرہ میں ایڈیشنل کلکٹر تھے۔ ان سے تمام واقعات بیان کیے۔ خان بہادر نے رائے دی کہ فوراً واپس جاؤ اور استعفا نامہ واپس لے لو، تمھارا استعفا دینا سراسر بیوقوفی ہے کیونکہ میرا یہ تجربہ ہے کہ کوئی انگریز ہندوستانی سے مار کھانے کے بعد نہ تو پولس میں سانحہ درج کراتا ہے اور نہ دوسری کوئی کارروائی کرتا ہے۔ اگر کوئی اس سے دریافت بھی کرتا ہے تو وہ یہ کہہ کر ٹال دیتا ہے کہ یہ سب دوستانہ باتیں تھیں۔ مگر قمرالدین صاحب مرحوم نے استعفا واپس نہ لیا اور نوکری چھوڑ کر نیورہ واپس چلے آئے اور بے روزگاری میں زندگی گزار دی

۱۹۴۶ء میں جب کہ وہ نیورہ میں قیام پذیر تھے فرقہ وارانہ فساد ہوا۔ باوجود پیرانہ سالی کے بلوائیوں سے مقابلہ کے لیے دو بندوقیں ہر وقت اپنے ساتھ رکھتے تھے اور بستی کی نگہبانی کی غرض سے رات بھر جاگتے تھے جس کا بلوائیوں پر بڑا اثر ہوا۔ امن وامان کو برقرار رکھنے کے بہانے پولس نے ان کی دونوں بندوقیں ضبط کر لیں، مگر والد مرحوم کے کہنے سے کلکٹر پٹنہ نے ان کی دونوں بندوقوں کو دوسرے ہی روز واپس کر دیا۔ قمرالدین صاحب نے قریب ستر سال کی عمر میں انتقال کیا۔

قمرالدین صاحب مرحوم نے اپنے بعد ایک لڑکا اور ایک لڑکی یادگار چھوڑی۔ لڑکے

کا نام منظور الدین تھا۔ ان کی شادی موضع گرجی پٹنہ میں ہوئی تھی۔ مگر عین جوانی ہی میں قضا کر گئے۔ لڑکی کی شادی ریلوے کے ایک اسٹیشن ماسٹر سے ہوئی تھی جو تقسیم ہند کے بعد پاکستان چلی گئیں۔

دادی مرحومہ کی منجھلی بہن اور ان کی اولاد :

دادی مرحومہ کی منجھلی بہن کی اولاد میں دو لڑکے اور دو لڑکیاں تھیں۔ دو لڑکوں میں بڑے کا نام منیر الدین اور چھوٹے کا کبیر الدین تھا۔ منیر الدین صاحب مرحوم سب انسپکٹر ایکسائز سے ترقی کر کے سپرنٹنڈنٹ آف ایکسائز ہوئے۔ بہت خوب آدمی تھے مگر پنشن پانے سے پہلے تقریباً پچاس سال کی عمر میں قضا کر گئے۔ منیر الدین صاحب مرحوم کے دو لڑکے ہوئے، بڑے لڑکے کا نام نظام الدین تھا جو ریلوے میں ملازم تھے اور پنشن پا کر قضا کیا۔ چھوٹے لڑکے کا نام ولی احمد ہے۔ عدالت پٹنہ میں پیشکار کے عہدے پر فائز تھے اور اب پنشن پا کر اہل و عیال کے ساتھ خواجہ پورہ، پٹنہ میں قیام پذیر ہیں۔ ان کی سب اولاد ماشاء اللہ صالح ہیں اور عروج پر ہیں۔ ولی احمد صاحب کی اہلیہ مولوی بدر الحسن ظہوری مرحوم، زمیندار لودی کٹرہ پٹنہ سیٹی کی پوتی ہیں۔ چھوٹے لڑکے کا نام کبیر الدین تھا۔ یہ نہ صرف ایک نہایت ہونہار طالب علم تھے بلکہ ہندوستان کے نامور فٹ بالر تھے۔ بی۔ این کالج میں بی۔ اے کے طالب علم تھے۔ فٹ بال کھیلنے میں ایک مرتبہ فوجی ٹیم سے مقابلہ ہوا جس میں ان کے سینے پر سخت چوٹ آئی اور منہ سے خون پھینک دیا۔ ڈاکٹروں نے علاج کے بعد تبدیل آب و ہوا کے لیے والئیر بھیجا۔ وہاں سے اچھے ہو کر واپس آئے مگر سال بھر کے اندر اپنا دماغی توازن کھو بیٹھے اور اسی حال میں پوری زندگی ختم ہوئی۔

ڈاکٹر محمد بخش اور ان کا خاندان :

دادی مرحومہ کی منجھلی بہن کی دو لڑکیوں میں بڑی کی شادی ڈاکٹر محمد بخش سے ہوئی جو اپنے وقت میں اچھے ڈاکٹر تھے اور ایک میڈیکل ہال بنام "ڈائمنڈ میڈیکل ہال" پٹنہ میں چلاتے تھے۔ ڈاکٹر محمد بخش کے دو لڑکے اور تین لڑکیاں تھیں۔ بڑی لڑکی کی سب اولاد بجز ایک لڑکی کے کراچی، پاکستان و انگلستان میں آباد ہیں اور اچھے اچھے عہدوں پر ہیں۔ تقسیم ہند کے بعد یہ لوگ پاکستان چلے گئے تھے۔ منجھلی لڑکی کے تین لڑکے ہوئے جن میں دو لڑکے قضا کر گئے اور صرف ایک ڈاکٹر منظر احسن زندہ ہیں۔ قریب تیس سال سے انگلستان میں آباد ہیں اور ڈاکٹری کر رہے ہیں۔ ان کی کل اولاد لڑکے اور لڑکیاں انگلستان و امریکا میں اچھے عہدوں پر فائز ہیں۔ ڈاکٹر منظر احسن صاحب خود بھی نہایت

ملنسار اور خوش مزاج آدمی ہیں، راقم سے بڑی محبت کرتے ہیں۔ دوسری جنگ عظیم میں برطانیہ کی فوج میں رہ کر محاذ جنگ پر ڈاکٹری کی خدمات انجام دی تھی اور بعد میں چند سال تک جدہ اور سعودی عرب میں حکومت ہند کی طرف سے وائس کونسل رہے۔ غرض جہاں بھی رہے ہر دل عزیز رہے۔ سب سے چھوٹی لڑکی کی شادی ہونے کے کئی سال بعد تک زندہ رہیں مگر جوانی میں ہی فوت کر گئیں۔ ان کی کوئی اولاد نہ ہوئی۔ ڈاکٹر محمد بخش کے لڑکوں میں ایک محمد تقی مرحوم تھے جو کچھ دنوں تک سرکاری تحصیل دار کے منصب پر تھے۔ اور دس سال ہوئے کہ ستر سال کی عمر میں قضا کیا۔ محمد تقی مرحوم کا چھوٹا لڑکا ایک برہمن لڑکی سے شادی کرکے لاپتہ ہو گیا اور اب تک اس کا کوئی سراغ نہ مل سکا۔ ڈاکٹر محمد بخش کے دوسرے لڑکے محمد وصی پٹنہ ہائی کورٹ میں ایڈوکیٹ تھے مگر عین جوانی میں قضا کر گئے۔ ایک لڑکی چھوڑی جس کی شادی ڈاکٹر منظر احسن سے ہوئی۔

دادی مرحومہ اور ان کے اکلوتے لڑکے احمد حسین :

میری دادی مرحومہ اپنی بہنوں میں سب سے چھوٹی تھیں۔ ان کے اکلوتے لڑکے میرے والد مرحوم احمد حسین صاحب مرحوم تھے۔ جن کی پیدائش ۱۸۸۶ء میں نیورہ ضلع پٹنہ میں ہوئی۔ شروع ہی سے والد صاحب مرحوم ذکی و ذہین طالب علم تھے۔ عربی و فارسی کی ابتدائی تعلیم اپنے والد ماجد مولوی امجد حسین صاحب مرحوم سے حاصل کی۔ امجد حسین صاحب ایک مذہبی متشرع اور ذی علم شخص تھے۔ علم و ادب سے بہت شوق و شغف رکھتے تھے۔ گھر کا ماحول مذہبی تھا۔ انسانیت، اخوت اور مروت کی عملی تعلیم ہوتی تھی۔ اس ماحول سے والد مکرم کی زندگی پر پسندیدہ نقوش ابھرے۔ ابتدائی تعلیم و تربیت کے بعد والد ماجد کا داخلہ پٹنہ کالجیئٹ اسکول میں کرا دیا گیا جہاں سے انھوں نے فرسٹ ڈویژن میں انٹرنس کے امتحان میں کامیابی حاصل کی۔ جوانی میں والد محترم کا رنگ صاف، قد میانہ، بدن بھرا اور چہرہ گول تھا۔ ان کی چوڑی پیشانی خاندانی ورثے کی نشانی تھی۔

والد مرحوم اور علی گڑھ کی تعلیم :

انٹرنس کے امتحان میں کامیابی کے بعد اعلیٰ تعلیم کے لیے والد مرحوم کو محمڈن اینگلو اورینٹل کالج علی گڑھ بھیج دیا گیا۔ اس زمانے میں علی گڑھ کالج بہت عروج پر تھا اور مسلمانوں کے مذہب، معاشرت، تہذیب و شائستگی اور روایات کا گہوارہ تھا۔ والد مرحوم کا داخلہ کالج میں سالِ اول میں ہوا اور رہنے کے لیے پکی بارک میں جگہ ملی۔ والد مرحوم فرماتے تھے کہ ان کے ہم جماعت اور

کمرے کے ساتھی عبدالاحد صاحب تھے جو نقاشی و مصوری میں ماہر فن تھے۔ پورے کمرے کو مناظر قدرت کی خوب صورت تصویروں سے مزین کر دیا تھا۔ یہ تصاویر ایسی دل کش تھیں کہ طلباء کے علاوہ کالج کے پرنسپل بھی انھیں دیکھنے آتے تھے۔ موصوف نہایت ہی بذلہ سنج آدمی تھے، اور ہمارے والد سے ان کی بڑی دوستی تھی۔ وہ پہلے ڈپٹی کلکٹر ہوئے اور کلکٹر ہو کر پنشن پائی۔ عبدالاحد صاحب کے علاوہ والد کے مخلص ہم جماعت دوستوں میں سید محمد منصور صاحب اور سید علی حمید صاحب تھے۔ سید محمد منصور صاحب سپرنٹنڈنٹ پوسٹ آفس مقرر ہوئے اور پوسٹ ماسٹر جنرل ہو کر پنشن پائی اور سید علی حمید صاحب ایسٹرن بنگال ریلوے میں A.T.S مقرر ہوئے۔ اور ایسٹ انڈین ریلوے میں ڈویزنل سپرنٹنڈنٹ ہو کر پنشن پائی۔ الحسن صاحب پھلی شہری والد صاحب سے ایک سال آگے تھے اور پوسٹ ماسٹر جنرل ہو کر ۱۹۳۷ء میں پٹنہ بھی آئے تھے۔ ایک دوسرے صاحب عبدالقادر والد محترم سے ایک جماعت پیچھے تھے۔ پٹنہ کالج اور اسلامیہ کالج کلکتہ میں فارسی کے پروفیسر رہے اور پنشن پانے کے بعد قادیانی فرقہ کے پرجوش مبلغ ہو گئے۔ اور تقسیم ہند کے بعد پاکستان چلے گئے جہاں مرتے دم تک تحریک قادیانی کے سرگرم کارکن رہے۔

والد صاحب کا کہنا تھا کہ اس وقت تک علی گڑھ کالج میں سال اول کے طلباء کو "وحشی" کہا جاتا تھا۔ یہ طلباء ملک کے مختلف حصوں سے آتے تھے اور بول چال اور طور طریقوں میں بھی مختلف ہوا کرتے تھے۔ آپسی ارتباط، دوستی اور بے تکلفی بڑھانے کی غرض سے ایک دوسرے سے مختلف قسم کے مذاق کیا کرتے تھے، مثلاً کسی کو روم میں بند کر دیا، کسی کو ایک چپت لگا دیا یا کسی کو کوئی خطاب دے دیا وغیرہ۔ حکومت بنگال کا یہ قاعدہ تھا کہ جو خط کسی مسلمان کے نام بھیجا جاتا تو نام کے پہلے 'مولوی' لگایا جاتا تھا اور ہندو کے نام کے پہلے 'بابو'۔ پٹنہ کالجیئٹ اسکول کے ہیڈ ماسٹر آفس کے کچھ کاغذات میں والد صاحب کے نام کے پہلے 'مولوی' کے بجائے 'منشی' لکھا ہوا تھا۔ اتفاقاً یہ خط عبدالاحد صاحب کے ہاتھ لگ گیا۔ والد صاحب کے نام کے ساتھ منشی لکھا ہوا دیکھنا تھا کہ خطاب دینے کا انھیں اچھا خاصہ موقع مل گیا۔ انھوں نے اس خطاب کو پورے ہم جماعت طلباء میں مشہور کر دیا۔ علی گڑھ کالج میں ہم جماعت ایک دوسرے کو خطاب اور مختلف طرح کے ناموں سے پکارا کرتے تھے۔ یہ نام محبت و خلوص کا مظہر ہوا کرتا تھا۔ نام یا خطاب جیسا بھی ہو، لوگ اسے عزیز رکھتے تھے اور طالب علمی کے بعد بھی ایک دوسرے کو انہی خطابوں اور ناموں سے

مخاطب کیا کرتے تھے۔ چنانچہ ۱۹۷۱ء میں راقم کے والدِ محترم کی کتاب "کچھ مقالے" طباعت کے بعد جب مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی کی خدمت میں تبصرہ کے لیے بھیجی گئی تو "صدقِ جدید" کے رسید کتب میں مولانا نے والدِ مرحوم کو اس طور سے یاد فرمایا۔

"منشی احمد حسین ایک مرحوم صدق نواز علیگ اور پہلے ڈپٹی کلکٹر پھر کلکٹر اور ضلع مجسٹریٹ کے قلم سے اسلام اور قرآن مجید کی دعوت و ترجمانی"

تعجب ہے کہ والدِ محترم کی وفات کے ۲۳ سال بعد تک مولانا کو ان کا خطاب یاد رہا۔

ایف۔اے پاس کرنے کے بعد بی۔اے میں آئے تو انھوں نے انگریزی ادب کے علاوہ عربی، فارسی اور اقتصادیات کے مضامین کا انتخاب کیا۔ عربی، فارسی اور انگریزی ادب کے علاوہ انھیں علم اقتصادیات سے خصوصی لگاؤ اور دلچسپی تھی۔ پروفیسر ٹول (Prof. Towle) جو علی گڑھ کے ایک نہایت نامی پروفیسر تھے، ان کی اس دلچسپی اور توجہ سے بہت خوش رہتے اور کلاس میں ان کا بہت خیال رکھتے تھے۔ اپنی ایک سند میں انھوں نے والدِ مرحوم کی بہت تعریف کی ہے۔ موصوف تحریر کرتے ہیں کہ: "یہ ایک اچھے خاندان کے فرد ہیں۔ بلاشبہ ان کی تعلیم و تربیت نہایت اچھے ماحول اور اچھے ڈھنگ سے ہوئی ہے۔ چال چلن بھی نہایت اعلیٰ درجہ کا ہے۔ کلاس میں خاموش رہتے ہیں اور پڑھنے لکھنے کے کاموں میں توجہ اور استقلال کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔"

پرنسپل آرچ بولڈ نے بھی والدِ محترم کی تعریف کی ہے۔ اپنی سند میں ان کی تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے کہ: "ان کے طور طریقے بہت اچھے ہیں، محنتی طالب علم ہیں ان کا تعلق ایک با عزت خاندان سے ہے۔" مندرجہ بالا اسناد کو والدِ مرحوم نے تاحیات حفاظت سے رکھا ہے۔ یہ دونوں سندیں راقم کے پاس اب تک موجود ہیں۔

والدِ محترم ایک محنتی اور ذہین طالب علم تھے۔ ان کی ذہانت اور محنت کی وجہ سے ان کا شمار گنے چنے طالب علموں میں ہوتا تھا۔ تمام اساتذہ کو یہ امید تھی کہ یہ طالب علم فرسٹ ڈویژن سے پاس ہوگا۔ پرنسپل آرچ بولڈ کا بھی یہی خیال تھا بلکہ انھیں امید کامل تھی کہ یہ اول درجہ میں کامیاب ہوں گے۔ اسی خیال سے بی۔اے کا نتیجہ شائع ہونے سے پہلے چند طلبار کے بارے میں الٰہ آباد یونیورسٹی سے نتیجہ معلوم کیا تو پتہ چلا کہ احمد حسین صاحب چھ نمبر کی کمی کے سبب اول درجہ میں کامیاب نہ ہوسکے۔ پرنسپل موصوف کو بہت افسوس ہوا اور خود والد صاحب کو بھی بہت دنوں تک اس کا ملال رہا۔

والد مرحوم کی ملازمت بحیثیت اسسٹنٹ ہیڈ ماسٹر :

پرنسپل آر ج بولڈ والد محترم کے ساتھ بہت شفقت سے پیش آتے اور ان کو زندگی میں کامیاب اور خوش حال دیکھنا چاہتے تھے۔ جب والد محترم نے بی۔اے پاس کیا تو صاحب موصوف نے ایسٹ انڈین ریلوے کے انگریز جنرل منیجر سے جو اس زمانہ میں ایجنٹ کہلاتا تھا، ملاقات کرائی جس نے ڈیڑھ سو روپیے ماہانہ مشاہرہ پر کھگول' داناپور کے ریلوے اسکول میں انھیں اسسٹنٹ ہیڈ ماسٹر کے عہدہ پر مامور کر دیا۔ والد مرحوم اس اسکول کے اوپر کے درجوں میں انگریزی اور تاریخ کا درس دیتے تھے۔ یہ پیشہ انھیں پسند تھا۔ ارادہ تھا کہ اقتصادیات میں ایم۔اے کر کے علی گڑھ میں معلمی کریں۔ یہاں اس کام کے لیے مناسب سہولتیں اور کافی وقت بھی مل جاتا تھا۔ ان کے عزیز شاگردوں میں ایک صاحب مسٹر لاہیری تھے جو بعد میں ایک اچھے اور نامور ڈاکٹر ہوئے۔ چند سال ہوئے قضا کر گئے۔ اگرچہ والد مرحوم کو معلمی سے دلچسپی تھی مگر ان کی والدہ محترمہ کو یہ نوکری پسند نہ آئی۔ وہ چاہتی تھیں کہ ان کا بیٹا کلکٹر بنے۔ اللہ نے ماں کی اس خواہش کو پورا کیا اور والد صاحب نے کلکٹر ہو کر پنشن پائی۔ ماں کے اصرار پر ڈپٹی کلکٹری کے عہدہ کے لیے درخواست دینے پر راضی ہوئے۔ اس زمانے میں بنگال گورنمنٹ کا قانون تھا کہ ڈپٹی کلکٹری کے انتخاب کے لیے درخواست دہندہ اسی ضلع کا باشندہ ہو جہاں سے وہ درخواست دے رہا ہے۔ جب والد مرحوم پٹنہ سے درخواست دینے لگے تو پیرٹ صاحب (Mr. Parrot I.C.S) سے مشورہ کیا۔ انھوں نے بتایا کہ "آپ پٹنہ سے درخواست نہ دیں ورنہ واپس کر دی جائے گی۔ آپ اپنی درخواست کلکٹر مظفر پور کے یہاں داخل کریں کیونکہ مظفر پور آپ کا آبائی وطن ہے۔"

والد مرحوم کی ڈپٹی کلکٹری کے لیے نامزدگی اور تقرری :

موصوف کے مشورہ پر والد مرحوم نے اپنی درخواست مظفر پور کے کلکٹر کو دی۔ ان دنوں ترہت کمشنری میں چار اضلاع مظفر پور، چمپارن، سارن اور دربھنگا تھے۔ ہر ضلع کا کلکٹر امیدواروں سے انٹرویو لے کر تین کا نام منتخب کر کے کمشنر ترہت کے یہاں بھیجتا تھا۔ کمشنر ڈویژن ان تمام امیدواروں سے انٹرویو لے کر تین نام چن کر حکومت بنگال کو بھیجتا تھا۔ لفٹیننٹ گورنر ان منتخب امیدواروں کی درخواست کی جانچ کر کے صرف ایک امیدوار کی تقرری کا حکم صادر کر دیا کرتا تھا۔ اسی طرح جس کمشنری میں جتنے لوگوں کی ضرورت ہوتی ان کی تقرری عمل میں آتی۔ ۱۹۱۰ء میں جب

مسٹر سید علی امام مرحوم نے (جو اس وقت 'سر' کے خطاب سے سرفراز نہ ہوئے تھے اور بیرسٹری کرتے تھے) والد مرحوم کے نتیجۂ انتخاب کی بابت کمشنر ترہٹ، مسٹر گریر سے بذریعہ خط دریافت کیا۔ گریر صاحب نے اپنے مراسلہ مورخہ ۲۳ جولائی ۱۹۱۰ء کے ذریعہ اطلاع دی کہ مسٹر احمد حسین کا نام منتخب کر کے بنگال کے گورنمنٹ کو بھیج دیا گیا ہے اور ان کے متعلق یہ بھی لکھ دیا گیا ہے کہ وہ ترہٹ ڈویزن کے بہترین امیدوار ہیں۔ بعد ازاں ان کی تقرری کا حکم بھی صادر ہو گیا۔ والد مرحوم کے ڈپٹی کلکٹر ہونے کی خبر جب دشمنوں کو ہوئی تو ان کے خلاف لفٹیننٹ گورنر کے یہاں ایک درخواست دی اور اس میں لکھا کہ احمد حسین مظفر پور کے باشندے نہیں بلکہ پٹنہ کے رہنے والے ہیں اس لیے ان کی تقرری خلاف قاعدہ ہے اور اسے رد کر دیا جائے۔ والد مرحوم اس اعتراض کو غلط ثابت کرنے کی غرض سے لفٹیننٹ گورنر بنگال سے ملنے گئے، جو اُن دنوں دارجلنگ میں تھے۔ لفٹیننٹ گورنر سے ملاقات کے وقت انھوں نے علی گڑھ کالج کے پرنسپل اور ضلع مجسٹریٹ مظفر پور کی سرٹیفکیٹ کو پیش کیا جس سے یہ ثابت ہو گیا کہ والد مرحوم مظفر پور کے باشندے ہیں۔ حکومت بنگال کے چیف سکریٹری سے بھی مل کر تمام باتوں کی وضاحت کی اور اس طرح ایک سو روپیے ماہانہ مشاہرہ پر تقرری کا حکم بحال رہا۔ اور والد صاحب ۱۹۱۱ء سے ڈپٹی کلکٹری کے عہدے پر خدمت انجام دینے لگے۔ دستور کے مطابق ان کی تعیناتی ایک سال کے لیے مظفر پور اپنے آبائی ضلع میں ہوئی بعد ازاں اسی عہدے پر ان کا تبادلہ بالترتیب چھپرہ، دُمکا، آرہ، سہسرام اور مظفر پور ہوا جہاں انھوں نے نہایت حسن وخوبی سے اپنی خدمات انجام دیں۔

آرہ رائٹ کیس :

۱۹۱۷ء میں والد محترم جب کہ سہسرام میں ڈپٹی کلکٹر تھے اسی سال شاہ آباد کے ایک گاؤں پیرو میں جو سہسرام اور آرہ کے بیچ میں واقع ہے، گاؤ کشی کے بہانے سے ہندوؤں نے ایک خونریز فساد کیا۔ اس فساد میں مسلمانوں کا جانی و مالی دونوں حیثیت سے زبردست نقصان ہوا۔ ہندوؤں نے بلا امتیاز عورت، مرد، بوڑھے، جوان اور معصوم بچوں کو تہ تیغ کیا اور مال واسباب لوٹا۔ مسلمانوں کو اب وہاں سے فرار ہونے کے علاوہ کوئی چارہ نہ تھا۔ مسلمان آرہ، سہسرام اور دیگر مقامات پر پناہ گزیں ہوئے۔ صدر مقام آرہ سے پیرو صرف تیس میل کی دوری پر ہے مگر پولس کی مدد وقت پر نہ پہنچ سکی اور بلوائیوں نے خوب آزادانہ خوں ریزی برپا کی۔ دیگر مجسٹریٹوں کے ساتھ والد صاحب

کو بھی وہاں بھیجا گیا جہاں انھوں نے پانچ دن قیام کیا اور امن و امان بحال کرنے میں مدد پہنچائی۔ بلوائیوں کی گرفتاری ہوئی اور ان پر ایک فوجداری مقدمہ بنام "آرہ رائٹ کیس" قائم ہوا۔ مسلمانوں نے بلوائیوں سے خائف ہو کر ان کے خلاف گواہی دینے سے گریز کیا جس کی وجہ سے محض چند مجرموں کو سزا ہوئی اور باقی بری کر دیئے گئے۔ والد صاحب مرحوم کا کہنا تھا کہ اتنا بڑا منظم طور پر کشت و خون اس سے پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔ خود راقم نے بھی جو اس وقت تقریباً ۱۳ سال کا تھا اور سہسرام میں اسکول کا طالب علم تھا، بہت سے مسلمانوں کی زبوں حالی دیکھی تھی جو ہندوؤں کے ظلم و ستم کا شکار ہوئے تھے۔ بعد ازاں اسی عہدہ پر والد محترم کا تبادلہ سہسرام سے مظفر پور ہوا۔ جہاں انھوں نے نہایت حسن و خوبی سے اپنی خدمات انجام دیں۔

ہندوستان کی مردم شماری ۱۹۲۱ء میں :

۱۹۲۱ء کی مردم شماری میں حکومت بہار نے انھیں Superintendent Census, Patna Division مقرر کیا۔ Indian Census report (1921) میں ان کے کاموں کی بڑی تعریف کی گئی ہے۔ ۱۹۲۵ء میں بہار سرکار نے ان کی خدمات سے خوش ہو کر انھیں حاجی پور کے سب ڈویژنل مجسٹریٹ کی خدمات سپرد کیں۔

قیام حاجی پور :

اس زمانے میں حاجی پور سب ڈویژن نہایت ہی اہم سب ڈویژن خیال کیا جاتا تھا۔ یہاں کا سب ڈویژنل آفیسر صرف آئی سی ایس ہی ہوتا تھا۔ والد صاحب مرحوم کو ان کی قابلیت اور اہلیت کی بنا پر، اگرچہ وہ آئی سی ایس نہ تھے، یہ عہدہ حوالہ کیا گیا۔ اور انھوں نے مسٹر شمشاد علی خاں آئی سی ایس سے حاجی پور سب ڈویژن کا چارج لیا۔ تین سال تک اس عہدے کی خدمت انجام دی۔ اپنی خدمات کو اس حسن و خوبی اور تندہی سے انجام دیا کہ دستور کے خلاف انھیں مزید ایک سال تک یہیں اسی خدمت پر رکھا گیا۔ ۱۹۲۶ء میں حکومت برطانیہ نے حاجی پور کے قیام کے دوران والد مرحوم کو "خان صاحب" کے خطاب سے سرفراز کیا۔ حاجی پور میں خدمات کی کثرت سے والد مرحوم تھک گئے تھے۔ آرام کی غرض سے چار ماہ کی رخصت لی اور اپنے عہدہ کا چارج Mr. V. A. Davies I.C.S کے حوالہ کر دیا۔ حاجی پور میں قیام کے دوران Co-operative Movement، جو خان بہادر محی الدین کے پنشن پانے کے بعد کمزور

بڑھ گیا تھا، والد مرحوم نے سرکاری حکم سے اس کو بہت فروغ دیا۔ حکومت بہار نے اپنی سالانہ رپورٹ میں جا بجا ان کی خدمات کی تعریف کی ہے۔ ۱۹۲۹ء میں چھٹیوں کے اختتام کے بعد والد مرحوم کی تقرری اورنگ آباد، ضلع گیا میں بحیثیت سب ڈویزنل مجسٹریٹ ہوئی۔

قیام اورنگ آباد تحریک قانون شکنی :

انہی دنوں کانگریس نے حکومت برطانیہ کے خلاف قانون شکنی کی تحریک چلائی جس میں نمک سازی کی تحریک بھی شامل تھی۔ قانون شکنی کی اس تحریک کو کانگریس نے پورے ہندوستان میں پھیلایا۔ اورنگ آباد اس تحریک سے بری طرح متاثر ہوا۔ یہاں اس تحریک کے روح رواں سری انوگرہ نراین سنگھ تھے جو بعد میں حکومت بہار کے وزیر خزانہ ہوئے۔ والد محترم کا خیال تھا کہ قانون شکنی کی تحریک کو روکنا، جو پورے ہندوستان میں پھیل چکی تھی، انگریزوں کے بس سے باہر کی بات ہے مگر بحیثیت مجسٹریٹ میرا یہ قانونی اور اخلاقی فریضہ ہے کہ جہاں تک ممکن ہو اپنے علاقے میں امن وامان کو برقرار رکھیں، اور جو شخص قانون شکنی کا مرتکب ہو اُسے مناسب سزا دی جائے۔ اس تحریک کے زمانے میں والد مرحوم نے بڑی حکمت عملی سے کام لیا۔ ایک طرف تو انھوں نے انگریزوں کو خوش رکھا اور دوسری طرف اپنے ہم وطنوں کو بھی انگریزوں کے ظلم وستم سے بچایا۔ مسٹر ڈبلو جونسٹن نے جو ضلع مجسٹریٹ اور کلکٹر تھے اور جنھیں لوگ "Wicked Johnston" کہتے تھے، اس تحریک کو دبانے کے لیے حکم دیا کہ جو شخص قانون شکنی کر کے کچہری کے احاطہ میں داخل ہو اُسے قید کر کے سخت سزا دی جائے۔ والد محترم نے کچہری کے احاطہ میں کمی کرنے کی اجازت لے لی جو بہت وسیع تھا۔ اس کی حد بندی کرنے کے بعد چاروں طرف موٹے موٹے بانسوں سے گھیر دیا گیا اور کلکٹر موصوف کے حکم سے ہر طرف یہ نوٹس لگا دی گئی کہ جو قانون شکن اس نئے احاطہ کے اندر داخل ہوگا اسے مجرم قرار دیا جائے گا اور سخت سزا بھی دی جائے گی۔ بابو انوگرہ نراین سنگھ والد کے دوستوں میں سے تھے اور والد محترم اس حقیقت سے واقف تھے کہ انوگرہ بابو کی گرفتاری سے عام لوگوں میں غم وغصہ کی لہر تیز تر ہو جائے گی اس لیے انھیں کہلا بھیجا کہ بھائی آپ کچہری کے اس حلقے میں جو اب قائم کیا گیا ہے، ہرگز داخل نہ ہوں ورنہ ہم لوگوں کے تعلقات میں خلل پڑ جانے کا امکان ہے کیونکہ اس وقت جب آپ نئے احاطہ میں داخل ہوں گے تو ہمارا داروغہ آپ کی گرفتاری پر مجبور ہوگا۔ انوگرہ بابو نے والد محترم کے مشورہ پر عمل کیا اور نئے حلقہ کے اندر داخل نہ ہوئے

جب کلکٹر موصوف ان کی گرفتاری پر مصر ہوا تو والد محترم نے نہایت بے باکانہ انداز میں کہلا بھیجا کہ وہ قانون کی زد میں نہیں آتے ہم مجبور ہیں ۔ غرض ع

باغباں بھی خوش رہے راضی رہے صیاد بھی

کی حکمت عملی پر گامزن رہے ۔ اس زمانہ میں راقم اورنگ آباد میں موجود تھا اور اس نے ان ہنگاموں کو خوب دیکھا ہے ۔

تحریک قانون شکنی کے خلاف کمیٹی کا انعقاد :

۱۹۲۰ء میں والد محترم کے مشورہ پر سول نافرمانی اور قانون شکنی کی تحریک کے خلاف ایک کمیٹی قائم کی گئی جس کا مقصد تھا کہ ایک ایسی تحریک چلائی جائے جو امن و قانون کی بحالی اور تحفظ میں معاون ہو چنانچہ ۳۰ جون ۱۹۳۰ء کو ایک کمیٹی Peace and Order Committee کے نام سے وجود میں آئی جس کے روح رواں سردار محمد اسلام تھے اور جنھیں بعد میں "خان صاحب" کے خطاب سے سرفراز کیا گیا ۔ اس کمیٹی نے ۳ جون ۱۹۳۰ء سے اپنی مہم شروع کی ۔ چھ ہفتوں تک اورنگ آباد کے ہر علاقہ میں اپنے مقصد کو عوام کے سامنے پیش کیا اور دونوں تحریکوں کے فوائد و نقصانات سے لوگوں کو آگاہ کیا ۔ اگرچہ اس متوازی تحریک سے قانون شکنی کی تحریک رک نہ سکی مگر اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ جس شدت سے اس تحریک نے سر اٹھایا تھا بہت حد تک سرد پڑ گئی ۔ سردار محمد اسلام نے اپنی کتاب "Six weeks' propaganda in Aurangabad" کے دیباچہ میں صفحہ نمبر ۶ پر والد محترم کی تعریف ان جملوں میں کی ہے :

(ترجمہ) "بہت سے نازک موقعوں پر ان کے ٹھنڈے دماغ سے لیے گئے فیصلوں نے بہت سے ناموافق صورتوں سے بچالیا اور ان کی دل چسپی اور مدد نے ہم لوگوں کے جماعتی کاموں کی راہ بہت حد تک ہموار کر دی ۔"

قیام کھبھوا، پٹنہ، ہزاری باغ، رانچی اور ضلع مجسٹریٹ پٹنہ :

۱۹۳۱ء کے اواخر میں والد محترم کا تبادلہ بحیثیت سب ڈویزنل آفیسر کھبھوا ضلع شاہ آباد ہوا اور ضیاء اللہ خاں صاحب آئی سی ایس سے چارج لیا ۔ یہ سب ڈویزن بھی اہم سب ڈویزن تھا ۔ انگریز یہاں کے لوگوں کو شر پسند خیال کرتے تھے ۔ یہ علاقہ صوبہ متحدہ اور بہار کی سرحد پر واقع ہے ۔

ان دنوں یہ مقام جھگڑا ، فساد اور غنڈہ گردی کا اڈہ بنا ہوا تھا۔ یہاں کے میلوں میں خصوصاً موھنیا کے میلے میں جو بدتمیزی اور غنڈہ گردی ہوتی تھی اس کو روکنے کے لیے والدمحترم نے ایسا انتظام کیا کہ یہ سب حرکتیں بند ہوگئیں۔ یہاں کی آب وہوا بہت خشک ہے اور گرمی بھی خوب پڑتی ہے۔ والدمحترم کو سب ڈویژن کے دورے میں، جس کا کرنا ناگزیر تھا، اتفاقاً لوگ گئی اور سخت بیمار پڑ گئے۔ چھ ماہ کی چھٹی لی اور گھر چلے آئے۔ صحت یابی کے بعد گورنمنٹ بہار کے چیف سکریٹری سے مل کر کہا کہ میری تعیناتی اب مفصل سب ڈویژن میں نہ کی جائے۔ کام کی کثرت سے تھک گیا ہوں۔ مجھے کسی صدر سب ڈویژن میں بھیجا جائے یا سنیئر ڈپٹی کلکٹر بنا دیا جائے۔ چنانچہ ان کو ۱۹۳۳ء میں پٹنہ صدر کا سب ڈویژن افسر بنا دیا گیا۔ بعد ازاں انھیں ۱۹۳۵ء میں اسپیشل مجسٹریٹ بنا کر ہزاری باغ بھیجا گیا۔ ان دنوں ضلع ہزاری باغ میں اسپیشل مجسٹریٹ Section30 کے مطابق سیشن کے مقدمات کا فیصلہ کرتا تھا۔ یہاں دو برس قیام کے دوران والدمحترم نے اسپشل مجسٹریٹ کی خدمات کو نہایت حسن وخوبی انجام دیا جس کا اعتراف پٹنہ ہائی کورٹ نے بھی کیا ہے۔ یہاں دو برس کے قیام کے بعد ۱۹۳۷ء میں حج وزیارت کے لیے چلے گئے۔ حج سے واپسی کے بعد سنیئر ڈپٹی کلکٹر رانچی مقرر ہوئے جہاں انھوں نے دو سال تک اس عہدے کی خدمات انجام دیں۔ اس کے بعد سنیئر ڈپٹی کلکٹر ہو کر پٹنہ آئے اور ۱۹۴۱ء میں پٹنہ ضلع کے کلکٹر ہوئے۔ خان بہادر سید احمد علی خاں جو قطعہ تاریخ لکھنے میں خاص مہارت رکھتے تھے، ایک محبت آمیز خط میں مبارک باد کے بعد یہ قطعہ تاریخ درج کیا ہے۔ ؎

مسعود باد تازہ ترقی عزیز من (!)
از نصرت محمدؐ و افضال داوری
احمد حسین ! از لب احمد شنو دعا
"باشد ترا زبکہ مبارک کلکٹری"
۱۹۴۱ء

بہار شریف میں ہندو مسلم فسادات :

اسی زمانے میں بہار شریف میں ہندو مسلم فسادات ہوئے جس کو والدمحترم نے اپنی حکمت عملی وخوش اسلوبی سے ختم کر دیا۔ والد صاحب مسلمانوں کو اس فساد میں مظلوم سمجھتے تھے۔ فساد کے بعد

گورنمنٹ میں سفارش کی کہ مسلمانوں کو اپنی حفاظت کے لیے بندوق کا لائسنس دیا جائے جس کو سرکار نے منظور بھی کر لیا اور کافی تعداد میں مسلمانوں کو لائسنس مل گئے۔ والدمحترم نے جب ۱۹۴۱ء میں اپنی علالت صحت کی بنا پر تین سال قبل از وقت پنشن لے لی اور ضلع کا چارج مسٹر آر چر آئی سی ایس کے حوالے کیا تو مسٹر آر چر نے نہ جانے کس وجہ سے اور کن لوگوں کے مشورے پر بہت سے مسلمانوں کے لائسنسوں کو رد کر دیا جس کی وجہ سے مسلمانوں کے ہاتھوں سے اپنی محافظت کا سامان نکل گیا اور نہتے ہو کر رہ گئے۔

والدمرحوم کی خوبیاں اور سرکاری خدمات :

والدمرحوم نے دوران ملازمت نہایت تندہی، ایمان داری اور سلیقہ مندی کے ساتھ اپنی خدمات انجام دیں۔ یہی وجہ تھی کہ انگریز اعلیٰ افسران خصوصاً گورنروں کی نگاہ میں بڑے عزیز تھے اور قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ بہار کے تین گورنر سر ہنری ڈھیلر، سر جیمس سفٹن اور سر جون ڈھی ٹی توان کی شخصیت اور خدمات کی تعریفیں برملا کرتے تھے۔ والدمحترم سر جیمس سفٹن اور سر جون ڈھی ٹی کی ماتحتی میں کام کر چکے تھے اور یہ لوگ ان کی خوبیوں سے خوب واقف تھے۔ راقم بھی والدمحترم کے ساتھ ان لوگوں کے یہاں جایا کرتا تھا اور کئی مرتبہ گورنمنٹ ہاؤس میں گورنروں کے ساتھ کھانا کھانے کا شرف حاصل ہوا۔

والدمحترم کو کتب بینی کا شوق :

طالب علمی کے زمانے سے لے کر بڑھاپے تک موصوف کو پڑھنے لکھنے کا ذوق و شوق رہا۔ دفتری مصروفیتوں کے باوجود کتب بینی اور مضمون نویسی کے لیے وقت ضرور نکال لیا کرتے تھے۔ عہدہ کے اعتبار سے ان کی ذمہ داریاں بھی کافی بڑھی ہوئی تھیں۔ حیرت ہے کہ ان ذمہ داریوں کی تکمیل کے ساتھ کس طرح وہ اپنے علمی ذوق و شوق کو پورا کیا کرتے تھے۔ ان کی مصروفیات کے پیش نظر یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ موصوف ایک سخت محنت کش انسان تھے۔ ان کے مضامین اردو اور انگریزی دونوں زبانوں کے رسالوں میں شائع ہوا کرتے تھے چنانچہ ان کا ایک مضمون انگریزی زبان میں بعنوان "اسلام اور جدید مسائل" کلکتہ کے جریدہ "نوا دیدھن" میں ۳۰ جون ۱۹۴۳ کی اشاعت میں شائع ہوا تھا جو بہت پسند کیا گیا۔

والدمرحوم کی خدا ترسی :

والدمحترم ایک رحم دل اور خدا ترس انسان تھے۔ ایک منزا آنیر ہونے کے باوجود

منکسر المزاجی، غربا پروری، اقربا نوازی، خلق و مروت، شفقت و محبت، حسن سلوک، اپنی خوش گفتاری اور بذلہ سنجی کے سبب اپنے ہم عصروں میں ممتاز رہے۔ والد محترم ایک دین دار اور مذہبی انسان تھے، صوم و صلوٰۃ کی سخت پابندی کرتے تھے۔ آج سے تقریباً ۶۰ سال پہلے ایک مرتبہ بہار گورنمنٹ ہاؤس کی گارڈن پارٹی کے موقع پر مغرب کی نماز کا وقت آگیا تو والد مرحوم اٹھے اور کھلے میدان میں جاکر اذان پکار دی۔ مسلمان جو شریک جلسہ تھے والد صاحب کے اس دلیرانہ جرأت پر نماز کے لیے نکل آئے۔ ان آنے والوں میں آنریبل سر سید فخرالدین پہلے شخص تھے۔ اس زمانے میں سر فخرالدین مرحوم بہار کے پہلے وزیر تعلیم تھے۔ ان کا شمار بہار کی ممتاز شخصیتوں میں تھا۔ انہی کی امامت میں نماز ادا ہوئی اس لیے کہ موصوف مرحوم کی ہستی، ان کی مذہبیت، علمی صلاحیت، انسانیت، مروت و محبت کی وجہ سے قابل رشک شخصیت تھی۔

والد مرحوم کی بیعت، حج و زیارت مدینہ:

والد ماجد مرحوم نے بنفس نفیس حضرت حاجی وارث علی شاہؒ، دیوا شریف ضلع بارہ بنکی کے دست مبارک پر بیعت کی سعادت حاصل کی اور ۱۹۲۷ء میں فریضہ حج ادا کیا اور زیارت مدینہ منورہ سے مشرف ہوئے۔ ۱۹۴۰ء میں ایگزیبیشن روڈ پر ایک پختہ عمارت بنام "دارالسلام" تعمیر کرائی۔

والد صاحب کی موت:

اس مکان میں سات آٹھ سال قیام کرنے کے بعد ۸ جنوری ۱۹۴۸ء کو قضا کیا اور اب پھلواری شریف کے خانقاہی قبرستان میں آرام فرما ہیں۔ اپنی حیات ہی میں پھلواری شریف میں اپنے دفن ہونے کی اجازت حضرت سید شاہ امان اللہ سے لے رکھی تھی۔

والد صاحب کی اولاد:

والد محترم کی اولاد میں راقم کے علاوہ دو بھائی اور ایک بہن ہوئیں۔ منجھلا بھائی جس کا نام افضل حسین تھا ۱۹۲۶ء میں طالب علمی کے زمانے میں بعمر ۱۷ سال تپ دق کے مرض میں انتقال کیا۔ چھوٹے بھائی انور حسین سرکاری ملازمت میں تھے، ترقی کر کے چیرمین کمرشیل ٹیکس ٹریبونل ہوئے اور اس خدمت کے بعد ۵۸ برس کی عمر میں اپنے عہدہ سے پنشن پائی اور وکالت کا پیشہ اختیار کیا۔ ۱۹۸۴ء میں الیکٹریکل انجنیئر کے آفس سے جو ریزرو بینک کے پیچھے

واقع ہے ، ایگزیبیشن روڈ پر واپس آرہے تھے کہ مین شاہ راہ پر ایک گائے نے سینگ ماری ، موصوف گر پڑے اور کولھے کی ہڈی ٹوٹ گئی فوراً پٹنہ میڈیکل کالج اسپتال لے جائے گئے ، لیکن موت کا کیا علاج پانچ دن کے بعد اسپتال ہی میں ۲۲ جولائی ۱۹۸۴ء کو قضا کر گئے ، راقم نے حکومت کو اس حادثے کی اطلاع دی اور استدعا کی کہ جو گائیں سڑکوں پر آوارہ پھرتی ہیں انھیں روکا جائے لیکن انتظامیہ نے کوئی توجہ نہ دی اور آج بھی گائیں اور جانوروں کا آوارہ پھرنا حسب معمول جاری ہے ۔

مرحوم کے پس ماندگان میں دو لڑکے اور دو لڑکیاں ہیں ۔ دونوں لڑکے اصغر حسین اور خالد حسین ڈاکٹر ہیں ، آج کل اصغر حسین اسکاٹ لینڈ میں شہر ایڈنبرہ کے اپنے مکان میں مقیم ہیں اور ڈاکٹری کے عہدہ پر مامور ہیں ۔ دوسرے لڑکے پٹنہ کے جنرل اسپتال میں ڈاکٹری کی خدمت انجام دیتے ہیں ۔ بھائی مرحوم کی بڑی لڑکی میرے منجھلے لڑکے اکبر حسین سے بیاہی گئی ہے ۔ چھوٹی لڑکی ڈاکٹر آفتاب احمد سے بیاہی گئی ہے جنھوں نے اسکاٹ لینڈ میں بود و باش اختیار کر لی ہے اور وہیں ڈاکٹری کی خدمت پر فائز ہیں ۔ راقم کی بہن فاطمہ مسٹر سید امین احمد آئی سی ایس سے بیاہی گئیں ۔ ۱۹۶۱ء میں موصوف قضا کر گئے ۔ بہن موصوفہ کی بطن سے تین لڑکے اور تین لڑکیاں پیدا ہوئیں تینوں لڑکے سید احسان احمد ، سید احسن احمد اور سید حسن احمد ڈاکٹر ہیں ۔ سب سے چھوٹے لڑکے سید حسن احمد شہر کنٹ ، انگلستان میں بحیثیت شہری مستقل طور سے آباد ہو گئے ہیں ۔ سید احسن احمد اور سید احسان احمد پٹنہ میں سرکاری ڈاکٹر ہیں ۔ بہن موصوفہ کی بڑی لڑکی کی شادی ڈاکٹر کمال برکت اللہ مرحوم سے ہوئی تھی ، جن کے چار لڑکے ہوئے ۔ سب سے بڑے بیٹے اعظم برکت اللہ نے بنگلہ دیش سے بہت امتیاز کے ساتھ انجینیرنگ کا امتحان پاس کیا اور آج کل امریکہ میں انجینیرنگ کی اعلیٰ تعلیم حاصل کر رہے ہیں ۔ دوسرے لڑکے آصف برکت اللہ نے ڈاکٹری پڑھی اور بیرون ہندوستان ملازمت کے لیے جا رہے ہیں ۔ دو اور لڑکے انجینیرنگ کا امتحان دے رہے ہیں ۔ منجھلی لڑکی کی شادی گروپ کیپٹن ڈاکٹر سید محمد اسامہ سے ہوئی جو ہندوستانی ایر فورس میں ڈاکٹر ہیں اور ۱۹۸۶ء میں انھیں حکومت کی طرف سے A.V.S. Medal کا فوجی اعزاز ملا ہے ان کا ایک لڑکا مودت اور لڑکی ذکیہ دونوں ڈاکٹر ہیں ۔ تیسری لڑکی کی شادی مسٹر یحییٰ وارث سے ہوئی جو پاکستان میں انجینیر کے عہدے پر مامور ہیں ۔ ان کی اکلوتی لڑکی جن کا نام کوثر ہے لیڈی ڈاکٹر کا کام کرتی ہیں ۔

راقم کو اولاد میں تین لڑکے پیدا ہوئے ۔ بڑے لڑکے کا نام مقبول حسین ہے جو گورنمنٹ آف

بہار میں اسسٹنٹ ڈائرکٹر اعداد و شمار (Statistics) ہیں۔ منجھلے لڑکے اکبر حسین انڈین آیل کارپوریشن میں منیجر (انجنیئرنگ) ہیں اور تیسرے لڑکے ڈاکٹر اشرف حسین جو پہلے پٹنہ میڈیکل کالج اور نالندہ میڈیکل کالج میں پروفیسر تھے اور اب سعودی عرب میں ریاض میڈیکل کالج میں پروفیسر ہیں۔ مقبول حسین کی لڑکی شہناز حسین نے تواریخ میں بی۔اے (آنرس) پٹنہ یونیورسٹی سے پاس کیا ہے اور ان کے لڑکے طارق حسین نے ایم۔ایس سی کا امتحان طبقات الارض میں فرسٹ کلاس سے پاس کیا ہے۔

نواں باب

نانیہال

مولوی محمد یحییٰ اور مسجد و مدرسہ سیف خان :

راقم کی نانیہال "محلہ مدرسہ" شہر پٹنہ ہے۔ نانا مرحوم کا اسم گرامی مولوی محمد یحییٰ تھا۔ آپ کے والد خان بہادر نعمت علی خاں نبی نگر ضلع مونگیر کے رہنے والے تھے اور صدر اعلیٰ کے جلیل القدر عہدہ پر فائز تھے۔ نعمت علی خاں صاحب کی اہلیہ کا نسبی سلسلہ نواب ہیبت جنگ اور دُور جاکر نواب سیف خاں سے ملتا ہے جن کی شادی ملکہ ممتاز محل کی بہن سے ہوئی تھی وہ مغلوں کے دور میں بہار کے گورنر رہ چکے تھے۔ سیف خاں نے شہر پٹنہ میں دریائے گنگا کے کنارے ایک بڑی مسجد بنوائی تھی جو آج بھی مسجد سیف خاں کے نام سے مشہور ہے۔ سیف خاں نے یہ شاندار مسجد، جو پتھروں سے بنی ہوئی ہے، شاہجہاں کے عہد حکومت میں ۱۶۲۸ء میں تعمیر کرائی۔ اب تک یہ مسجد علاوہ پنج گانہ نماز کے شہر کی عیدگاہ بھی ہے۔ جناب مولوی یحییٰ مرحوم نے نمازیوں کی سہولت کے خیال سے مسجد سے متصل سامنے ایک وسیع سائبان، جو مسجد کی پوری لمبائی کے برابر ہے، بنوایا اور اس کے آگے ایک بہت بڑے صحن کا اضافہ کیا۔ موصوف کے انتقال کے بعد امتداد زمانہ اور معقول دیکھ بھال نہ ہونے کی وجہ سے مسجد کی عمارت روز بروز زبوں حالی کا شکار ہوتی جارہی ہے۔ اس کے ایک گنبد میں شگاف بھی پڑ گیا ہے۔ تقسیم ہند اور آزادی کے بعد کے فسادات کی وجہ سے اس علاقہ میں مسلمانوں کی آبادی بہت گھٹ گئی ہے جس کے سبب نمازیوں کی تعداد بھی بہت کم ہوگئی ہے۔ اسی کے ساتھ پٹنہ کے مسلمان اس مسجد کی تحفظ اور مرمت سے غافل ہیں۔ ڈر ہے کہ کہیں بے توجہی کا شکار ہوکر کچھ عرصہ کے بعد یہ مسجد اپنی اصلی حالت میں نہ رہے۔ سیف خاں نے اسی زمانے میں مسجد کے قرب میں ایک مدرسہ بھی تعمیر کرایا۔ اس مدرسہ کی عمارت اپنے زمانے میں بڑی شاندار رہی

ہو گی۔ اگرچہ اس کا کچھ حصّہ ٹوٹ گیا ہے مگر اس کی طرز تعمیر اس کی گزشتہ شان و عظمت کی طرف آج بھی نشاندہی کرتی ہے۔ ؎

از نقش و نگار درو دیوارِ شکستہ
آثار پدیدست صنادید عجم را

اس مدرسہ میں ۱۲۰ طلبا اور تین مدرسین کے قیام کا انتظام تھا۔ مورخین کا خیال ہے کہ اس کی تعمیر بخارا کے مدرسوں کے طرز پر کی گئی ہے۔ اسی مدرسہ کی رعایت سے اس محلّہ کا نام "مدرسہ محلّہ" پڑ گیا۔

ہندوستان کی آزادی کی تاریخ میں اس مسجد کو ایک خاص مقام حاصل ہے۔ یہ مسجد آزادی کے سلسلے کے اکثر عملی اقدامات کا مرکز رہی ہے۔ اس زمانے میں یہاں اہل فکر و نظر، عظیم رہنما اور سیاستداں جمع ہوتے تھے۔ جلسوں کا انعقاد ہوتا اور مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا شوکت علی، مولانا محمد علی، بابو راجندر پرشاد اور گاندھی جی جیسے سیاسی رہنما یہاں کے جلسوں میں شریک ہوتے تھے اور اپنی تقریروں سے تحریک آزادی کو تقویت بخشتے۔ تحریک ترک موالات کے زمانے میں موسم سرما میں ایک جلسہ ہوا جس میں فیصلہ کیا گیا کہ ولایتی کپڑوں کا پہننا ترک کیا جائے۔ تقریروں سے متاثر ہو کر تقریباً پانچ سو افراد نے اپنے ولایتی کپڑوں کو اتار کر مسجد کے سامنے کے بڑے حوض میں ڈال کر جلا دیا۔ راقم نے ان منظروں کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ تحریک آزادی کا عملی مرکز ہونے کی وجہ سے حکومت اس مسجد پر کڑی نگرانی رکھتی تھی۔ پولس افسران کے پاس دستخط شدہ وارنٹ ہر وقت رہتے تھے جس پر محض نام کا اندراج کر کے لوگوں کی گرفتاری عمل میں لاتے تھے۔ جو لوگ مسجد کے اندر ہوتے پولس افسران مسجد میں داخل ہو کر ان کو ہرگز گرفتار نہ کرتے۔ ایک مرتبہ کا واقعہ ہے کہ میرے ماموں زاد بھائی ڈاکٹر غلام امام نے جو علی گڑھ کے تعلیم یافتہ تھے، حکومت کے خلاف ایک جوشیلی تقریر کی۔ پولس باہر سے تقریر سنتی رہی، تقریر کے خاتمہ کے بعد دو دنوں تک باہر منتظر کھڑی رہی مگر داخل مسجد ہو کر انھیں گرفتار نہ کیا۔ آخر کار تیسرے دن ضلع مجسٹریٹ نے ان کے نام کا وارنٹ رد کر دیا۔ اس زمانہ میں پولس کو ہدایت تھی کہ عبادت گاہوں کے اندر داخل ہو کر لوگوں کو گرفتار نہ کریں۔

تعلیم، وکالت، فن موسیقی اور شاد عظیم آبادی :

مولوی محمد یحییٰ مرحوم کی تعلیم کلکتہ میں ہوئی وہاں انھوں نے انگریزی زبان پڑھی اور اس میں مہارت پیدا کی اور وکالت کی سند بھی حاصل کی۔ سر سید رضا علی مرحوم اپنی کتاب "اعمال نامہ"

من نمبر ۹۴-۹۳ پر تحریر فرماتے ہیں کہ "مولوی محمد یحییٰ صاحب پٹنہ کی دیوانی عدالت کے نامور وکیل تھے"
ان کی وکالت خوب چلتی تھی۔ بڑے بڑے مقدموں میں وکیل رہتے تھے، خوب کماتے کھاتے اور فیاضی
سے حاجت مندوں کی مدد کرتے۔ اپنی رہائش کے لیے مدرسہ کے احاطہ کے پیچھے جدید طرز کی پختہ عمارت
تعمیر کرائی جو اب تک قائم ہے۔ اس کے علاوہ مدرسہ کے تین کمرے جو اساتذہ کے لیے بنائے گئے تھے
اس سے متصل ایک رہائشی مکان بنایا جو ان کے خاندان کے لیے زنانہ حویلی کا کام دیتا تھا۔ یہ مکان
اب بالکل منہدم ہو گیا ہے اور اس کا نشان تک باقی نہیں ہے مگر مدرسہ کے وہ تین کمرے اپنی جگہ
پر قائم ہیں۔

مولوی محمد یحییٰ مرحوم بانکی پور میں وکالت کرتے تھے، موصوف نے عدالت کی آمد و رفت میں
سہولت کے خیال سے سبزی باغ میں ایک مکان خریدا جس میں کچھ تبدیلی کر کے ایک اچھا مکان بنا لیا اور
اس میں سکونت اختیار کیا۔ ہفتہ کے چھ دن اس مکان میں گزارتے، سنیچر کی شام کو محلہ مدرسہ والے
مکان میں مع اہل و عیال چلے جاتے تھے۔ سوموار کی صبح کو سب لوٹتے اور وہ کچہری چلے جاتے تھے۔
تعطیلات کے ایام میں بھی مدرسہ پر قیام کرتے تھے۔ یہاں ان کے قیام کے دوران کوٹھی پر بڑی چہل
پہل رہتی جیسے کسی تقریب کے موقع پر ہوا کرتی ہے۔ اس چہل پہل کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ وہ موسیقی
میں ماہر فن تھے۔ اس فن سے دلچسپی رکھنے والے پٹنہ کے علاوہ دور دور سے درس لینے آیا کرتے
تھے۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ موکل بھی مشورہ کے لیے آجایا کرتے تھے۔ تیسری وجہ یہ تھی کہ یہاں بزم سخن بھی
ہوا کرتی تھی جس میں شاد عظیم آبادی جن سے ان کے بڑے دوستانہ تعلقات تھے ضرور شریک ہوتے۔
یہ مشاعرہ عام طور سے اصلاحی ہوا کرتا تھا کیونکہ یحییٰ اور شاد انگریزی تعلیم کے اثر سے شادیوں میں فضول
رسومات۔ اور بے جا اسراف کو روکنا چاہتے تھے۔ اسی جگہ مدرسہ اور گنگا کی پرفضا ماحول میں بیٹھ کر
اردو شعر و شاعری پر تبادلۂ خیال کیا کرتے تھے، شاد مرحوم نے ان کی غزل کے مصرعہ پر خمسہ لکھا ہے۔

خوں رلاتا ہے کبھی دیدۂ پرنم اپنا   دل جلاتا ہے کبھی نالۂ پیہم اپنا
بیکسی حال کریں کس سے بیاں ہم اپنا   کوئی ایسا بھی نہیں ہے جو کرے غم اپنا
اس لیے کرتے ہیں ہم آپ ہی ماتم اپنا

انگریزوں سے تعلقات:

مولوی یحییٰ مرحوم کے انگریزوں سے بہت اچھے تعلقات تھے۔ ان کے ان خوش گوار

تعلقات نے ہی انھیں اعزازی مجسٹریٹ کے عہدہ پر مامور کیا۔ اگرچہ اس وقت یہ قانون تھا کہ وکیل کو اعزازی مجسٹریٹ نہ بنایا جائے مگر کمشنر پٹنہ ڈویژن نے انھیں یہ شرف بخشا اور توجیہ یہ کی کہ موصوف فوجداری کچہری کے وکیل نہیں ہیں بلکہ دیوانی عدالت کے ہیں اس لیے انھیں اعزازی مجسٹریٹ مقرر کرنے میں کوئی قباحت نہیں ہے۔ غرض اس اعزازی عہدہ پر انھوں نے ۳۰ برس تک خدمت انجام دی۔ ان کے زمانے میں ایک انگریز کلکٹر مسٹر منگلس پٹنہ آیا۔ کچھ دنوں کے بعد موصوف سے کہا کہ مجھے پٹنہ کے مشہور اور تاریخی مقامات دکھا دیجیے۔ تاریخی مقامات کے سر فہرست مقبرہ ہیبت جنگ کا نام تھا۔ وقت معینہ پر مولوی محمد یحییٰ مرحوم مسٹر منگلس کے یہاں گئے کہ اس کو تمام تاریخی مقامات دکھائیں۔ وہ تمام مقامات دیکھنے پر تو راضی ہوا مگر نواب ہیبت جنگ کے مقبرہ پر جانے سے انکار کر دیا کیونکہ نواب ہیبت جنگ نواب سراج الدولہ کے باپ تھے اور سراج الدولہ انگریزوں کے دشمن تھے۔ اگرچہ نواب ہیبت جنگ سے کوئی دشمنی نہ تھی مگر صرف دشمن کے باپ ہونے کی وجہ سے اس نے ان کا مقبرہ دیکھنے سے انکار کر دیا۔ اس سے یہ اندازہ لگانا بیجا نہ ہوگا کہ انگریز نہایت کینہ پرور اور تنگ نظر ہوا کرتے ہیں۔ وکالت کا پیشہ کچھ خوش نام پیشہ نہیں رہا ہے۔ جناب محمد یحییٰ مرحوم اگرچہ وکالت کرتے تھے مگر اس پیشہ کی خامیاں ان میں بالکل نہ تھیں۔ وہ طبعاً رئیس، فیاض اور صوفی مشرب انسان تھے۔ صوم وصلوٰۃ کے پابند تھے۔ محلہ مدرسہ کے قیام کے دنوں میں نماز پنج گانہ پابندی کے ساتھ اسی مسجد سیف خاں میں ادا کیا کرتے تھے۔ رمضان المبارک کے مہینے میں نماز جمعہ قصداً یہیں پڑھا کرتے کیونکہ اس ماہ کے ہر جمعہ کو کسی جید عالم کو نوید دے کر بلاتے اور وعظ بیان کراتے تھے۔ رمضان المبارک میں روزہ داروں کے لیے افطار کا انتظام کرتے اور ختم تراویح کے دن ہر مقتدی کو اپنے ہاتھ سے قریب آدھ سیر شیرینی تبرکاً دیا کرتے تھے۔ والد مرحوم اس جشن ختم تراویح کا حال راقم سے اکثر بیان کرتے اور موصوف کی صفات حمیدہ کی تعریف کیا کرتے۔

مولوی محمد یحییٰ اور حضرت وارث علی شاہ رح:

مولوی محمد یحییٰ مرحوم بزرگان دین کو بہت عزت واحترام کی نگاہ سے دیکھتے تھے حضرت حاجی سید وارث علی شاہ رحمۃ اللہ علیہ دیوہ شریف کے بہت معتقد تھے، انہی کے ہاتھ پر بیعت بھی کیا تھا، مرشد موصوف ان کو بہت عزیز رکھتے تھے۔ یہ ان کا تعلق خاطر اور محبت ہی کا نتیجہ تھا کہ اپنے پیر ومرشد کی سوانح حیات سب سے پہلی مرتبہ منشی خدا بخش صاحب وارثی متخلص برشاکی

دریابادی سے لکھوائی ۔ یہ کتاب فارسی زبان میں ہے اور اس کا نام "تحفۃ الاصفیا" ہے ۔ ۱۳۰۸ھ میں اس کتاب کو انڈین کرونیکل پریس بانکی پور سے چھپوا کر اپنے پیر و مرشد حضرت سید وارث علی شاہ قبلہ عالم کی خدمت میں پیش کیا اور اسے تحفتاً تقسیم کرایا ۔ مولوی محمد یحییٰ مرحوم جب بھی موقع پاتے بلا تکلف پیر کی خدمت میں حاضری دیا کرتے جس کا ذکر حیاتِ وارث میں مرزا محمد ابراہیم بیگ صاحب شیداؔ نے ص ۴۸ پر کیا ہے ۔ ملاحظہ ہو :

" مولوی محمد یحییٰ صاحب وارثی وکیل و رئیس عظیم آباد، جن کو حضور قبلہ عالم (حضرت سید شاہ وارث علیؒ) نے پابند وضع فرمایا تھا، اپنا ایک واقعہ بیان کرتے تھے کہ میں حسب معمول ایک اتوار کو مدرسہ والے مکان میں تھا کہ ناگاہ جناب انوار الدین شاہ صاحب مجذوب و سالک جن کو صوبہ بہار کامل اور صاحب حقائق جانتا تھا، تشریف لائے ۔ میں نے چائے اور حقہ پیش کیا ۔ اتفاق سے دونوں چیزیں قبول فرمائیں اور بکمال شفقت ارشاد ہوا کہ مولوی صاحب آپ کہاں گئے تھے ؟ میں نے عرض کیا کہ مُلّا کی دوڑ مسجد، آستانہ بوسی کے لیے دیوہ شریف گیا تھا ۔ فرمایا خوشا قسمت ۔ وہ شیر خدا کا پوتا ایک نظر عنایت سے قطرہ کو دریا بنا دیتا ہے ۔ مولوی صاحب میرے کاسۂ گدائی میں اسی کا دیا ہوا ٹکڑا ہے ۔"

موصوف کی خوش عقیدتی کا یہ عالم تھا کہ اپنے ایک بیٹے کا نام بھی غلام وارث رکھا تھا ۔

انتقال :

مولوی محمد یحییٰ صاحب کا انتقال ۱۹۰۹ء میں ہوا ۔ کچہری سے واپس آکر جب موکل سے بات کر رہے تھے کہ حرکتِ قلب بند ہو گئی اور قضا کر گئے ۔ اپنے آبائی قبرستان مقبرہ نواب ہیبت جنگ، محلہ بیگم پور، پٹنہ سیٹی میں دفن کیے گئے ۔

سید وحید الدین اور ان کی اولاد ۔ امداد امام اثر، فضل امام اور نانی مرحومہ :

سید وحید الدین صاحب مرحوم، مصنف "تحقیق حد مشرب سنیان" صدر اعلیٰ کے جلیل القدر منصب پر مامور تھے اور انھیں حکومت ہند نے شمس العلماء اور خان بہادر کا خطاب عطا کیا تھا ۔ محمد سعید حسرت عظیم آبادی نے ان کی شان میں ایک قطعہ تاریخ کہا ہے جو "قسطاس البلاغہ" ص ۲۴۴، مطبوعہ احسن المطابع ۱۳۰۰ھ میں درج ہے ۔ وہ قطعۂ تاریخ حسب ذیل ہے :

ای سید یگانۂ دوراں فرید عصر
کوہِ وقار بحرِ سخا معدنِ کرم
نامت زآسماں شدہ نازل وحید دیں
وصف کمال تو نتوانم کنم رقم
ازحضرت گورنر جنرل ترا خطاب
خان بہادر آمدہ ای صاحب ہمم
تاریخ ایں مجستہ خطاب مبارکت
بادا بتو خطابِ مبارک رقم زدم
۱۲۹۱ ہجری

میری نانی مرحومہ رشید النسار صاحبہ موصوف کی بیٹی اور شمس العلمار نواب امداد امام اثر مرحوم اور خان بہادر فضل امام صاحب کی بہن تھیں۔ جناب امداد امام آثر اپنی اعلیٰ تصانیف کی بدولت نہ صرف ہندوستان میں بلکہ ہندوستان سے باہر بھی اب تک مشہور ہیں۔ اردو ادب کا کون سا طالب علم ہے جو ان کے نام سے واقف نہیں۔ موصوف نے "کاشف الحقائق" جلد اول وجلد دوم کی تصنیف کرکے اردو ادب کے ذخیرہ میں ایک بے بہا اضافہ کیا ہے۔ یہ کتاب ان کی تنقیدی صلاحیت اور وسیع و گہرے مطالعہ کا بین ثبوت ہے۔ سر سید رضا علی اپنی کتاب "اعمال نامہ" (ص ۹۹ پر) نواب موصوف کے متعلق یوں رقم طراز ہیں :

"ان کی ذات میں بلا کی جامعیت موجود تھی۔ صاحب تصنیف تھے، شاعر تھے، فن زراعت میں ید طولی رکھتے تھے۔ باغ اور درخت لگانے کا شوق تھا، طبیب بھی تھے، شکاری بھی اور نشانہ بہت اچھا لگاتے تھے۔ اپنا یہ شعر فخریہ پڑھا کرتے تھے۔ ۔

امروز من نظامی و خاقانی ام بدہر
نیورہ زمن بہ گنجہ و شرواں برابرست

نواب امداد امام اثر مرحوم کے ایک لڑکے جناب عابد امام زیدی عرصہ سے خدا بخش لائبریری میں ریسرچ کے کاموں پر مامور ہیں۔ موصوف نہایت باصلاحیت اور بہت خوب آدمی ہیں اور

راقم ان کی بڑی قدر کرتا ہے۔ نانی مرحومہ کے دوسرے بھائی خان بہادر فضل امام کو بھی خدا نے عزت و شہرت سے نوازا تھا۔ موصوف عرصہ تک بنگال قانون ساز کونسل کے ممبر اور پٹنہ میونسپلٹی کے وائس چیئرمین رہے۔ سر سید رضا علی ان کے متعلق اپنی کتاب "اعمال نامہ" ص ۹۲ پر لکھتے ہیں:

" موصوف بڑی خوبیوں کے آدمی تھے، خوش مزاج، مہمان نواز، مغربی اور مشرقی دونوں تہذیبوں کے طریقوں سے واقف تھے، شہری زندگی سے دل چسپی، اخبار بینی کا شوق، انگریزی خوب بولتے تھے۔"

نانی مرحومہ کی سماجی اصلاحی خدمات اور اصلاح النساء:

نانی مرحومہ کے والد شمس العلماء خان بہادر وحید الدین ایک باوقار عالم و فاضل تھے اور مشرقی تہذیب و تمدن کے دلدادہ مگر روشن دماغ اور وسیع النظر انسان تھے۔ ان کے گھرانہ میں علم و ادب کا چرچا رہا کرتا تھا۔ اسی ماحول میں میری نانی مرحومہ نے آنکھ کھولی اور اسی ماحول میں تعلیم و تربیت پائی جس کے اثر سے آپ ایک باشعور حساس اور ذہین خاتون ہوئیں۔ اردو زبان و ادب سے بھی آپ کو گہری دل چسپی اور واقفیت تھی۔ موصوفہ کے زمانے میں مسلمانوں کا معاشرہ بہت بگڑا ہوا تھا۔ عورتوں کی جہالت، توہم پرستی، شادی بیاہ کی غلط رسوم کی سختی سے پابندی نے معاشرتی نظام کو درہم برہم اور اقتصادی حالت کو بد سے بدتر کر دیا تھا۔ عورتوں کو لکھنا پڑھنا عیب کی بات سمجھی جاتی تھی۔ نانی مرحومہ نے ان خرابیوں کو بہت شدت کے ساتھ محسوس کیا اور اس نتیجہ پر پہنچیں کہ ان تمام برائیوں کی واحد وجہ عورتوں کی جہالت اور ناخواندگی ہے۔ چنانچہ اس کے انسداد کے خیال سے سب سے پہلے عورتوں کی تعلیم کے لیے ایک مدرسہ قائم کیا جس کی نگرانی خود کیا کرتی تھیں۔ مزید برآں ایک کتاب بنام " اصلاح النساء" دو جلدوں میں تصنیف کی تاکہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو سکیں۔ کتاب کے دیباچہ میں وجہ تالیف ملاحظہ ہو:

" اگر یہ سب باتیں نصیحت کے طور پر لکھی جائیں تو بڑا فائدہ ہوگا۔ ان کے کہنے سے مجھ کو بھی خیال ہوا کہ ایک کتاب ایسی لکھیں جس میں ان رسموں کا بیان ہو جن کے باعث صدہا گھر تباہ ہو گئے، اور جو باعث فضول خرچ اور فساد کے ہیں، مگر مجھے یہ خیال بھی ہوا کہ ان باتوں کو نصیحت کے طور پر لکھنا میری حیثیت پر زیبا نہیں ہے بلکہ ان باتوں کو قصہ کے پیرایہ میں لکھنا ہر طرح سے

مناسب ہوگا، یہ سوچ کر میں نے ان ہی کاموں اور جھگڑوں کو جو روزانہ ہر شریف خاندان میں ہوتے ہیں، فرضی نام رکھ کر لکھنا شروع کیا۔''

"اصلاح النسار" کا پہلا ایڈیشن ۱۸۹۴ء میں پٹنہ سے اور جدید ایڈیشن فیروز سنس لاہور سے ۱۹۶۸ء میں شائع ہوا۔ یہ کتاب سماجی اصلاح کے علاوہ مسلمان معاشرہ کی جیتی جاگتی تصویر ہے۔ یہ تصنیف مولانا نذیر احمد کی "توبۃ النصوح" اور "مراۃ العروس" کی طرح معاشرتی اصلاح کے لیے بہت شہرت رکھتی ہے اور عظیم افادیت کی حامل ہے۔ نانی موصوفہ نیک طبیعت اور دیندار تھیں نانا مرحوم کے انتقال کے تقریباً دس سال کے بعد حج بیت اللہ کو گئیں اور حج کے بعد زیارت مدینہ منورہ سے مشرف ہوئیں۔

نانی مرحومہ اور خدا بخش لائبریری :

خان بہادر خدا بخش خاں، بانی خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری اور میرے نانا مرحوم میں دوستانہ تعلقات کے علاوہ سالے بہنوئی کا بھی منہ بولا رشتہ تھا۔ موصوف خان بہادر میری نانی مرحومہ کو بہن کہتے تھے اور ایک بہن کی حیثیت سے ان کا بہت ادب و احترام کرتے تھے۔ نانی مرحومہ بھی ان سے بھائی کی طرح حسن سلوک سے پیش آتیں۔ نانی مرحومہ بھی فرماتی تھیں کہ خدا بخش لائبریری میں جتنی نادر کتابیں ہیں اکثر وبیشتر چوری کر کے منگائی جاتی تھیں۔ خود خدا بخش خاں کا قول ہے کہ "کتابوں کے جمع کرنے کا ہنر تعزیرات ہند کے قانون سے بالاتر ہو جاتا ہے اور اس کو للکارتا ہے۔" اس قول کی روشنی میں انھوں نے اپنے کتابوں کی جمع آوری کے ذوق کی تکمیل کی۔ غرض جب بھی انھیں کسی نادر اور عمدہ کتاب کا سراغ ملتا تو پہلے اسے عاریتاً یا قیمتاً لینے کی کوشش کرتے، ناکامی کی صورت میں وہ کسی شخص سے اس کتاب کی چوری کرا کر منگا لیتے۔ جب ایسی کتابیں دستیاب ہوئیں تو اپنے گھر پٹنہ والے مکان (جہاں اب اندرا انسٹی ٹیوٹ آف کارڈیولوجی ہے) سے ان کتابوں کو ٹوکری میں رکھ کر اوپر سے کچھ کھانے پینے کی چیز رکھوا کر نانی مرحومہ کے گھر سبزی باغ نوکروں سے بھجوا دیتے اور تحفظ کے خیال سے خود پالکی پر آتے۔ نانی موصوفہ اپنے نوکر کو کہتیں کہ دیکھو جو تحفہ کی ٹوکری خدا بخش کے یہاں سے آئی ہے پلنگ پر رکھ دو۔ نوکر رکھ دیتا۔ فرصت اور تنہائی کے وقت نانی ان کتابوں کو چھپا کر رکھ دیا کرتی تھیں۔ خان بہادر خدا بخش کبھی کبھی تو ان کتابوں کو چار یا چھ ماہ کے بعد جب کہ گرفت کے امکانات ختم ہو جاتے، منگوا لیتے یا خود آ کر لے جاتے۔ نانی مرحومہ فرماتی تھیں کہ کبھی

کبھی تو ایسی چوری کی ہوئی کتابوں کو تین تین سال کے بعد لے جایا کرتے تھے۔

عبدالغفور کا خمسۂ چقندری :

چونکہ خان بہادر خدا بخش خان C.I.E. کا یہاں ذکر آگیا ہے، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ پروفیسر عبدالغفور شہباز کا ایک خمسہ بعنوان "خمسۂ چقندری" ناظرین کے لیے درج کروں۔ یہ ایک انوکھی نظم ہے اور خان بہادر موصوف کے حیدرآباد ہائی کورٹ کے چیف جسٹس مقرر ہونے پر لکھی گئی تھی۔

(ملاحظہ ہو ضمیمہ دوم ص ۸۴۴)۔

وفات نانی مرحومہ :

راقم کی شادی ۲۵ دسمبر ۱۹۳۰ء میں مسٹر ریاست حسین، بی اے (آکسفورڈ) بیرسٹر کی بیٹی فخر النساء سے ہوئی۔ نانی مرحومہ نے باوجود اپنی کمزوری اور ضعیفی کے نیورہ جاکر شادی میں شرکت کی اور یہ دیکھ کر بہت خوش تھیں کہ تقریب میں غلط رسومات اور بے جا باتوں کو بالکل موقع نہیں دیا گیا۔ اور یہ سب خرافات سے یکسر گریز کیا گیا ہے۔ نیورہ سے اپنے گھر واپس آئیں، طبیعت ناساز ہوئی اور کچھ دنوں علیل ہو کر مارچ ۱۹۳۱ء میں ۸۲ سال کی عمر میں انتقال کر گئیں۔ اپنے خاندانی قبرستان مقبرہ نواب ہیبت جنگ میں دفن کی گئیں۔

اولاد :

نانی مرحومہ کے بطن سے پانچ بیٹے اور پانچ بیٹیاں پیدا ہوئیں۔ سب سے چھوٹے بیٹے غلام مصطفیٰ اپنی کم سنی ہی میں تیراکی سیکھنے میں دریا میں ڈوب کر مر گئے۔ سب سے بڑے لڑکے مسٹر محمد سلیمان بیرسٹر ہوئے۔ بھوپال اور حیدرآباد میں جج کے عہدہ پر رہے اس کے بعد مہاراجہ سندھیا کے اصرار پر گوالیار چلے گئے۔ وہاں تقریباً بیس سال تک میونسپلٹی لشکر گوالیار کے تنخواہ دار چیئرمین رہے۔ ان کے بڑے صاحبزادے ڈاکٹر غلام امام مرحوم ہندوستانی سیاست میں تاحیات سرگرمی سے حصہ لیتے رہے۔ پچاس سال کی عمر میں انتقال کر گئے۔ سلیمان صاحب کے دو اور لڑکے صفدر امام مرحوم اور اظہر امام مرحوم تھے۔ صفدر امام مرحوم ریلوے میں گورنمنٹ کی طرف سے لیبر انسپکٹر تھے۔ اظہر امام مرحوم شاعر تھے اور لیبر ڈیپارٹمنٹ ہی سے ان کا تعلق تھا۔ دوسری جنگ عظیم میں فوج میں بھی کام کیا تھا۔ نانی مرحومہ کے دوسرے لڑکے غلام مولیٰ ایک پرجوش مسلمان تھے۔ ترکوں کے بڑے ہمدرد اور جنگ بلقان کے دوران

ترکوں کی تائید میں جلسہ کراتے جلوس نکالتے نیز مسجدوں میں ان کی فتح کے لیے دعائیں کراتے تھے ان کی شادی کلکتہ کے ایک امیر گھرانے میں ہوئی تھی اور زمینداراَنہ زندگی بسر کرتے تھے چونکہ کلکتہ میں قیام تھا اس لیے مولانا ابوالکلام آزاد سے بہت اچھے تعلقات تھے۔ سر سید رضا علی مرحوم "اعمال نامہ" ص ۱۰۰ پر ان کے متعلق یہ تحریر فرماتے ہیں :

"غلام مولیٰ ۱۹۰۲ء میں پڑھنے کے لیے علی گڑھ آئے تھے اور میرے بڑے دوست تھے۔ افسوس ہے کہ عین عالم شباب میں وہ اس دنیا سے چل بسے۔"

ان کی اولاد میں صرف ایک لڑکی زندہ ہے۔ مولوی غلام مرتضیٰ صاحب نانی مرحومہ کے تیسرے لڑکے تھے۔ انٹرنس پاس کرنے کے بعد ان کے پاؤں پر فالج آیا اور چلنے پھرنے سے مجبور ہو گئے۔ تعلیم ترک کر دی اور باپ سے ناراض ہو کر اپنے ایک دوست خلیل احمد عرف بندھو مختار ساکن محلہ سبزی باغ کے گھر چلے گئے۔ وہیں تجرد کی حالت میں تمام عمر گزار دی۔ آج سے ۳۰ سال پہلے جب سخت بیمار پڑے تو اپنے آبائی گھر محلہ مدرسہ جا کر انتقال کیا۔ مقبرہ بیبیت جنگ میں مدفون ہیں۔

مولوی غلام وارث صاحب نانی مرحومہ کے چھوٹے لڑکے تھے۔ اسکول کی تعلیم پٹنہ کالجیٹ اسکول میں ہوئی اس کے بعد اپنے بہنوئی سر عبدالرحیم کے یہاں گئے جو اس زمانے میں مدراس ہائی کورٹ کے جج تھے اور وہیں ۱۹۱۱ء میں پریسیڈنسی کالج مدراس سے بی اے کیا۔ اس موقع پر ان کی بہن نثار کبریٰ نے ایک نظم بعنوان "مبارک باد بی۔اے کی ڈگری" لکھی جس کا مطلع یہ ہے : (خیالات کبریٰ ص ۱۱۵) :

مبارک باد بی اے کی ڈگری، اور پھر جد وجہد لا کی
وکالت قوم کی کرنے لگو قانون داں ہو کر

بعد ازاں پٹنہ واپس آکر پٹنہ لا کالج سے B.L کا امتحان پاس کیا اور وکالت کرنے لگے جو ان کا آبائی پیشہ تھا۔ دیوانی عدالت کے اچھے وکیل تھے اور انگریزی اچھی بولتے اور لکھتے تھے۔ ان کا قیام سبزی باغ کے اسی مکان میں رہا جس میں ان کے والد رہا کرتے تھے اور وکالت کیا کرتے تھے محمد شفیع داؤدی جو مظفرپور کے نہایت اچھے وکیل تھے تحریک آزادی میں وکالت چھوڑ کر کانگریس میں شامل ہو گئے۔ انڈین لیجسلیٹو اسمبلی سنٹرل دہلی کے ممبر رہے اور ہندوستان کے نمائندہ ہو کر لندن کے راؤنڈ ٹیبل کانفرنس میں شریک ہوئے۔ آخر میں پنڈت موتی لال نہرو سے سخت

مخالفت کے باعث کانگریس سے الگ ہو گئے اور پھر وکالت شروع کر دی۔ انہی کی صاحبزادی رابعہ خاتون سے مولوی غلام وارث صاحب کی شادی ہوئی۔ ان کے بطن سے دو لڑکے جمال وارث اور یحییٰ وارث پیدا ہوئے۔ جمال وارث تھائی ایرویز میں منیجر ہیں اور یحییٰ وارث اسلام آباد میں حکومت پاکستان کے محکمہ انجینیرنگ میں ایک بڑے عہدہ پر مامور ہیں۔ ان دو بھائیوں کے علاوہ دو لڑکیاں پیدا ہوئیں۔ بڑی لڑکی طیبہ راقم کے چھوٹے بھائی انور حسین مرحوم سے بیاہی ہوئی تھیں اور ابھی باحیات ہیں۔ دوسری بیٹی سلطانہ مسٹر ولی احمد سے بیاہی ہوئی ہیں جو پاکستانی بحریہ میں ایک آفیسر ہیں اور کراچی میں آباد ہیں۔ سلطانہ ایم اے پاس ہیں اور کراچی میں آغا خاں میڈیکل فاؤنڈیشن کے ادارے میں لائبریرین ہیں۔ غلام وارث صاحب کا انتقال بمرض فالج ۱۹۵۴ء میں پٹنہ میں ہوا اور اپنے خاندانی قبرستان مقبرہ ہیبت جنگ میں مدفون ہیں۔ بہت خوب آدمی تھے، نہایت خوش مزاج تھے اور راقم سے بہت محبت کرتے تھے۔

نانی مرحومہ کی پانچ لڑکیاں، نسیم النساء، نثار فاطمہ، نثار کبریٰ، کلثوم اور سب سے چھوٹی بیٹی راقم کی والدہ مرحومہ ہاجرہ تھیں۔

بی بی نسیم النساء:

بی بی نسیم النساء کی شادی سید محمد ہاشم ساکن باڑھ ضلع پٹنہ سے ہوئی۔ آپ متوسط طبقہ کے زمیندار اور کمشنری آفس میں محافظ دفتر تھے۔ سید ہاشم صاحب مرحوم اور پروفیسر عبدالغفور شہباز میں سمدھی کا رشتہ تھا اسی وجہ سے ان دونوں حضرات میں خوب ہنسی مذاق ہوا کرتا تھا۔ سید ہاشم صاحب بہت بڑی بڑی مونچھیں رکھتے تھے۔ اس پر پروفیسر شہباز نے ایک نہایت پرمذاق نظم لکھی جس کا عنوان "مونچھیں" ہے۔ ضمیمہ سوم ص ۸۰ پر پوری نظم ناظرین کے لیے پیش کی جارہی ہے۔ نسیم النساء مرحومہ کی تعلیم عربی، فارسی اور اردو میں بہت اچھی ہوئی تھی اور انھوں نے انگریزی پڑھنا لکھنا اپنے شوہر سے سیکھا تھا۔ انھوں نے اپنے گھر میں اردو اور قرآن پڑھانے کے لیے ایک مدرسہ قائم کیا تھا جس میں مسلمان لڑکیوں کو وہ خود پڑھایا کرتی تھیں۔ ان کی دو لڑکیاں اصغری بیگم اور عائشہ بیگم بہت پڑھی لکھی تھیں، دونوں نے بتیا ہاؤس گرلس اسکول پٹنہ سیٹی میں جو ۱۹۰۹ء میں قائم ہوا تھا، عرصہ دراز تک معلمی کی خدمت انجام دی تھیں۔ اصغری بیگم کو مضمون نگاری میں اچھی مہارت تھی۔ ان کی انشار کا مجموعہ پٹنہ کے کسی پریس سے چھاپا گیا تھا۔ راقم نے آج سے پچاس سال پہلے اس کا مطالعہ بھی کیا تھا مگر اب یہ مجموعہ

نایاب ہے۔ موصوفہ کے صاحبزادے سید مہدی علی راقم کے رشتہ دار ہونے کے علاوہ نہایت عزیز دوست تھے، پہلے یہ ڈپٹی کلکٹر کے عہدہ پر مقرر ہوئے اور ترقی کر کے ڈائرکٹر آف انڈسٹریز ہوئے اس خدمت کے بعد حکومت ہند نے انھیں سعودی عرب کے سفارت خانہ میں فرسٹ سکریٹری بنا کر بھیجا۔ دو تین سال اس عہدہ پر کام کرنے کے بعد پٹنہ واپس آئے۔ وطن آکر بیمار پڑ گئے۔ دو سال بیماری کی حالت میں رہ کر آج سے آٹھ سال قبل انتقال کیا۔

نسیم النساء مرحومہ کی سب سے چھوٹی لڑکی جن کی شادی سید محمد حفیظ صاحب ساکن تلہاڑہ ضلع پٹنہ سے ہوئی تھی، شوہر کی زندگی ہی میں قضا کر گئیں۔ افسوس کہ ۱۹۴۶ء کے فساد میں ان کے شوہر محمد حفیظ اور ان کی دو بیٹیوں نے تلہاڑہ کے بلوائیوں کے ظلم کا شکار ہو کر جام شہادت نوش کیا۔ حفیظ صاحب کی شہادت کا تذکرہ ڈاکٹر کلیم عاجز نے اپنے دیوان کے دیباچہ میں کیا ہے۔ موصوفہ کے ایک اور داماد مسٹر سید سلطان احمد مرحوم تھے۔ راقم کے عزیز دوستوں میں تھے۔ انھوں نے انگلستان کی لیڈس یونیورسٹی سے معلمی کی اعلیٰ ڈگری (M. Ed.) حاصل کی تھی اور عرصہ تک رانچی انٹرمیڈیٹ کالج کے پرنسپل رہے۔ ان کی سب اولاد پاکستان میں آباد ہیں اور اچھے عہدوں پر ہیں۔

سید محمد:

نسیم النساء صاحبہ کے ایک لڑکے جناب سید محمد پٹنہ کے ایک اچھے وکیل تھے۔ انھیں آثار قدیمہ سے بڑی دلچسپی تھی۔ انھوں نے پٹنہ شہر اور مضافات کی مسجدوں کو جا کر دیکھا، ان کی پیمائش کی، ان کے کتبوں کو پڑھا اور تفصیلات کی تحقیق کر کے قلمبند کیا۔ ان کا یہ مضمون "جرنل آف بہار اینڈ اڑیسہ ریسرچ سوسائٹی" میں چھپا۔ بعد ازاں اسی ادارہ نے اس کو کتابی شکل میں ترتیب دے کر اس کی طباعت کی اور بازار میں فروخت کیا۔ ان کا یہ ایک بے بہا کارنامہ ہے اور ہمیشہ ان کی یاد دلاتا رہے گا۔ تقریباً تیس سال قبل پچاس سال کی عمر میں انتقال کیا۔ ان کے دوسرے لڑکے سید احمد نے، جن کی صحت برابر خراب رہا کرتی تھی، عین جوانی میں قضا کیا۔

نثار فاطمہ:

میری نانی مرحومہ کی دوسری لڑکی کا نام نثار فاطمہ تھا۔ یہ ایک اچھی پڑھی لکھی خاتون تھیں۔ اردو فارسی اور عربی کی تعلیم خود اپنی والدہ محترمہ سے حاصل کی اور انگریزی بھی جانتی تھیں۔ اگرچہ ان کے زمانے میں انگریزی پڑھنا لکھنا اچھا خیال نہ کیا جاتا تھا پھر بھی اپنے والد بزرگوار جناب یحییٰ صاحب

سے انگریزی لکھنا پڑھنا سیکھا۔ لیکن مغربیت سے انھیں لگاؤ نہ تھا۔ موصوفہ بہت نیک مزاج پردہ کی حامی اور اسلامی معاشرہ کی دلدادہ تھیں۔ فیاضی ان کی فطرت میں داخل تھی۔ اپنے عزیزواقارب کے علاوہ دوسرے لوگوں کا بھی بہت خیال رکھتیں اور بوقت ضرورت ہر طرح سے مدد کرتیں۔ حسب مراتب سب کی قدر کرتیں۔ موصوفہ کی شادی مسٹر عبدالرحیم بیرسٹر کلکتہ ہائی کورٹ سے ہوئی تھی جو مدراس ہائی کورٹ کے چیف جسٹس اور گورنر بنگال کے ایگزیکیوٹو کونسل کے ممبر ہوئے اور آخر میں بہت دنوں تک انڈین لیجس لیٹو اسمبلی سنٹرل کے پریسیڈنٹ رہے۔ سرکار برطانیہ نے ان کو K.C.S.I کے خطاب سے سرفراز کیا تھا۔ اپنے دور کے مسلمانوں میں نہایت قابل قانون داں گزرے ہیں۔ ان کی کتاب مسمیٰ:

"The four schools of Islamic Jurisprudence" کے

مقابلے کی کوئی کتاب اب تک نہیں لکھی گئی۔ سر سید رضا علی مرحوم نے اپنی کتاب اعمال نامہ کے ص ۹۶ پر ان کا ذکر کیا ہے۔ تقسیم ہند کے بعد کراچی چلے گئے اور وہیں انتقال کیا۔ خالہ مرحومہ، لیڈی رحیم، نے اپنے شوہر سے دس سال پہلے قضا کیا اور دہلی میں نظام الدین اولیاءؒ کے قبرستان میں مدفون ہیں۔ لیڈی رحیم کو تین لڑکے اور دو لڑکیاں پیدا ہوئیں۔ بڑی لڑکی مسٹر حسن شہید سہروردی، بیرسٹر کلکتہ ہائی کورٹ اور ہندوستان کے نہایت نامی مسلم لیڈر سے بیاہی گئی تھیں۔ چھوٹی لڑکی کی شادی کیپٹن انعام مجید سے ہوئی تھی جو برطانوی فوج میں کام کرتے تھے۔ اب دونوں داماد اور لڑکیاں زندہ نہیں ہیں۔ بڑے لڑکے مسٹر ضیاء الدین عبدالرحیم کلکتہ ہائی کورٹ میں بیرسٹری کرتے تھے اور عین جوانی میں قضا کر گئے۔ دوسرے لڑکے مسٹر جلال الدین عبدالرحیم آئی سی ایس تھے۔ تقسیم ہند کے بعد پاکستان چلے گئے۔ پنشن پانے کے بعد بھی پاکستان کی سیاست میں سرگرمی سے حصہ لیتے رہے۔ سب سے چھوٹے لڑکے فہیم رحیم پاکستان میں انجینئر ہیں اور آرام کی زندگی گزار رہے ہیں۔

نثار کبریٰ اور ان کی ادبی وسماجی خدمات:

نانی مرحومہ کی تیسری لڑکی نثار کبریٰ اپنی سب بہنوں میں زیادہ تعلیم یافتہ تھیں۔ ان کی شادی سید رضا کریم صاحب سے ہوئی جن کے والد سید عمر کریم صاحب مرحوم ساکن محلہ پتھر کی مسجد شہر پٹنہ کے ایک اچھے عالم گزرے ہیں۔ موصوف کے والد مولوی سید علی کریم مرحوم نے کنور سنگھ کے ساتھ مل کر ۱۸۵۷ء میں انگریزوں کے خلاف بغاوت کی۔ کنور سنگھ بیچارے تو لاپتہ ہو گئے اور سید عمر کریم

مرحوم کے قصور کو انگریزوں نے معاف کر دیا۔ موصوفہ محترمہ کے تین لڑکے اور دو لڑکیاں تھیں۔ بڑے لڑکے مسٹر سید محمد کریم نے ضلع جج ہو کر پنشن پائی ۱۹۸۸ء میں وفات پائی۔ دوسرے لڑکے سید انوار کریم ۷۰ سال کے ہو کر ۱۹۸۵ء میں انتقال کر گئے۔ سب سے چھوٹے لڑکے مسٹر سید شوکت کریم کناڈا جا کر آباد ہو گئے ہیں اور وہاں نہایت فارغ البالی سے زندگی بسر کر رہے ہیں۔ موصوفہ مرحومہ کی بڑی لڑکی کی شادی سر سید علی امام سے ہوئی۔ آپ بہت دنوں تک بہار لیجس لیٹو کانسل کی نامزد ممبر رہیں اور ہمیشہ اعزازی کاموں میں حصہ لیتی رہیں جس کی وجہ سے بہت شہرت حاصل کی۔ تقریباً ۵ سال پہلے قضا کیا اور پھلواری شریف کے قبرستان میں دفن ہوئیں۔ موصوفہ کی چھوٹی صاحبزادی خان بہادر ڈاکٹر ولی احمد سیول سرجن سے بیاہی تھیں اور چند سال قبل انتقال کیا۔ بیگم ولی احمد کی بڑی لڑکی عزیزہ بیگم مسز جسٹس سید نقی امام سے بیاہی گئی تھیں۔ کچھ عرصہ تک دلی میں راجیہ سبھا کی ممبر رہیں اور اب تک سیاست میں حصہ لیتی رہتی ہیں۔ بیگم عزیزہ کی چھوٹی بہن بیگم ثریا کی شادی مسٹر محمد ابصار حسن قرنی آئی سی ایس سے ہوئی تھی۔ دونوں میاں بیوی نہایت نیک اور منکسر مزاج ہیں۔ ان دنوں کراچی میں مع اپنے خاندان کے نہایت فارغ البالی سے زندگی بسر کر رہے ہیں۔ ان دنوں جدید طرز کی عورتیں مُردے کے قریب جانے اور جنازے کو غسل دینے سے بہت گھبراتی ہیں لیکن راقم نے ثریا بیگم کو اس قسم کی باتوں سے بہت دور پایا باوجود اس کے کہ وہ ایک آئی سی ایس کی بیوی ہیں اور جدید طرز سے زندگی گزارنے کی عادی ہیں۔ ۱۹۷۳ء میں جب راقم کی اہلیہ کا انتقال ہوا تو بغیر کسی تامل کے انھوں نے دیگر مستورات کے ساتھ اہلیہ مرحومہ کو غسل دیا۔ اس دور میں یہ ایک بڑی بات ہے اور راقم ان کے اس احسان کو فراموش نہ کر سکے گا۔

نثار کبریٰ مرحومہ نے اپنے میکے اور سسرال دونوں جگہ علمی ماحول پایا تھا۔ اس ماحول میں ان کی ذہنی پرورش ہوئی تھی۔ شعر وشاعری کا بچپن سے ذوق تھا۔ معاشرہ نے شعر وشاعری سے روکا لیکن جب کچھ زمانہ بدلا تو انھوں نے بھی شاعری شروع کر دی۔ ان کی شاعری کی اصل محرک "مسدس حالی" اور "بانگ درا" ہے۔ انھوں نے اپنے شعری مجموعہ "خیالات کبریٰ" کے دیباچہ میں ص ۹ پر اس کا ذکر اس طرح کیا ہے:

> "مسدس حالی میری راہبر ہوئی اور وسط عمر میں بانگ درا پہنچی۔ پھر تو میں ان دو کتابوں کی شیدا ہو گئی، اور اپنے وظیفہ کے جزدان میں ان کتابوں کو رکھنے لگی، ۱۹۳۴ء میں جب حج کے لیے گئی تو ان کتابوں کو ساتھ لے گئی، اور میدان

عرفات اور مدینہ منورہ میں اس کی دعاؤں کو پڑھ کر خدا سے دعائیں مانگنے لگی۔"

موصوفہ کے دل میں محبت رسول بے انتہا تھی۔ جب مدینہ منورہ میں روضۂ اقدس کا دیدار ہوا تو اس سے متاثر ہو کر ایک نظم لکھی جس کے کچھ اشعار درج کیے جاتے ہیں :

حضوری میں حاضر ہوئے اس طرح — تڑپ دل میں اور لب پہ آہ و فغاں
بہ گردِ مزارِ رسولِ خدا — تصدق لگے ہونے خورد و کلاں
درِ پاک پر جب رسائی ہوئی — درود مقدس تھا وردِ زباں

مرحومہ کو حالی سے بڑی عقیدت تھی، چنانچہ حالی کے صدسالہ جشنِ یادگار کے موقع پر انھوں نے ایک نظم بنام "حالی" لکھی جس کے کچھ اشعار پیش خدمت ہیں :

سلطنت کھو کے مٹ چلے تھے ہم — مردِ عاقل نے جان ڈالی ہے
درد سے جس کے ہیں بھرے اوراق — وہ مسدس وہ نظم حالی ہے
خفتۂ مسلم کو کر دیا بیدار — ڈوبتی ناؤ کو سنبھالی ہے

اسی طرح علامہ اقبال سے بھی اپنی عقیدت مندی کا اظہار کیا ہے۔ ان کی نظم "یوم اقبال" کے چند اشعار ملاحظہ ہوں :

قلم اس کا یا بانگ درا ہے — مجدد وقت ہے یا غوث ابدال
زباں شیریں ہے لہجہ پُر اثر ہے — مقابل میں نہیں مجلس کے امثال
قلم میں کب تیرے قدرت ہے کبریٰ — ادا ہو وصف پوری حضرت اقبال

علاوہ ازیں یہ شعر بھی خوب ہے جو بانگ درا سے دلی تعلق کا اظہار کرتا ہے، ملاحظہ ہو :

قلم میں سینکڑوں جنبش ہیں لیکن
پہنچ سکتے نہیں بانگِ درا تک

موصوفہ کے مزاج میں بڑا اعتدال پسندی تھی۔ وہ مغربی تہذیب کی کچھ قائل اور مقلد نہ تھیں اگرچہ وہ اس کی مخالف نہ تھیں تاہم اندھی تقلید کو ناپسند کرتی تھیں۔ وہ چاہتی تھیں کہ مشرقی و مغربی تہذیب میں ایسا امتزاج ہو جو اسلام اور اسلامی تہذیب کی منافی نہ ہو۔ پنجاب کے اردو زنانہ رسالہ میں ایک نظم دیکھی جس میں مشرقی تہذیب پر اعتراض کیا گیا تھا۔ اس کا ایک شعر ملاحظہ ہو :

زنِ ہندی تیری پست خیالی نہ گئی ؎ سرمہ مسی نہ گیا، پان کی لالی نہ گئی

اس کے جواب میں موصوفہ مرحومہ نے ایک نظم "نئی اور پرانی باتیں دونوں رہیں" لکھی۔ اس کے کچھ منتخب اشعار جو مجھے پسند آئے تحریر کرتا ہوں : (ص ۱۱۸)

سادگی طرزِ رہائش میں ارادوں میں بلندی
بوریا فرش ہو ہمت مگر عالی بھی رہے
شوق سے ملٹن و چوسر کی ثنا خوانی ہو
یادِ غالب بھی رہے شبلی و حالی بھی رہے
ترک اطوار سلف کلیتہً خوب نہیں
ڈھنگ اگلا بھی رہے چال نرالی بھی رہے

نانی مرحومہ کی چوتھی لڑکی کلثوم بیگم کی شادی سید نجم الحسن ولد سید بدرالحسن ظہوری سے ہوئی تھی۔ میاں بیوی میں ہمیشہ ناچاقی رہی کیونکہ دونوں کے مزاج میں بڑا تفاوت تھا۔ موصوفہ مرحومہ نے اپنی آخری بیس سال کی زندگی بھی بھانجی بیگم ولی احمد ساکن چوہٹہ شہر پٹنہ کے یہاں گزاری اور وہیں قضا کیا۔

والدہ مرحومہ بی بی ہاجرہ :

میری والدہ بی بی ہاجرہ نانی مرحومہ کی سب سے چھوٹی بیٹی تھیں۔ والدین نے انھیں بڑے پیار و محبت سے پالا تھا۔ خوش اخلاقی اور فرماں برداری کی بنا پر والدین کے علاوہ دوسرے لوگ بھی ان کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ سب سے پہلے نانی مرحومہ نے انھیں کلام پاک پڑھایا اسکے بعد انھوں نے موصوفہ سے اردو کی تعلیم حاصل کی اور اس زبان میں خوب اچھی مہارت پیدا کی۔ اس کے علاوہ کچھ فارسی زبان بھی پڑھی۔ والدہ محترمہ کو اردو ادب کے مطالعہ کا بڑا شوق تھا۔ جب تک زندہ رہیں اخباروں رسالوں اور کتابوں کا مطالعہ کرتی رہیں۔ ان کی دل چسپی زیادہ تر ایسی کتابوں سے تھی جس میں بزرگوں، عالموں اور درویشوں کا ذکر ہوتا۔ خواجہ حسن نظامی، مولانا شبلی، حالی اور اقبال کی تصانیف کو خوب ذوق و شوق سے پڑھا کرتی تھیں۔ خواجہ حسن نظامی کی شاید ہی کوئی ایسی کتاب ہو جو ان کی نگاہ سے نہ گذری ہو۔ مولانا شبلی کی کتاب "سیرت النبی" کی کل جلدیں باری باری راقم کے ذریعہ یونی ورسٹی لائبریری سے منگاتیں اور نہایت ذوق و شوق سے ان کا مطالعہ کرتیں۔ مولانا حالی اور اقبال کے اشعار کا خوب مطالعہ کیا تھا اور ان اساتذہ کے سیکڑوں اشعار ان کو برزبان یاد تھے۔ دینی کاموں میں بڑی دل چسپی لیتی

تھیں اور ان کا دل و دماغ مذہب سے بہت متاثر تھا۔ محبت رسولؐ دل میں گھر کر گئی تھی۔ رسول اکرمؐ کی صفاتِ حمیدہ کا ذکر مسلم و غیر مسلم خواتین سے نہایت ہی اچھے انداز میں اور خوب تفصیل کے ساتھ کیا کرتیں۔

بیعت و حج اور زیارت مدینہ :

۱۹۲۰ء میں حضرت سید شاہ بدرالدین قادری مجیبی، سجادہ نشیں خانقاہ مجیبیہ پھلواری شریف کے دستِ مبارک پر بیعت کا شرف حاصل کیا۔ حضرت سید شاہ بدرالدین صاحب کی حیات میں برابر پھلواری شریف جاتیں اور اپنے پیر و مرشد سے ملاقات کا شرف حاصل کرتیں۔ ان کے وصال کے بعد بھی اکثر پھلواری شریف جایا کرتی تھیں۔ تاحیات پھلواری شریف کی عقیدت مند رہیں۔ اسی عقیدت مندی کی بنا پر یہ وصیت کی تھی کہ مرنے کے بعد انھیں وہیں خانقاہ کے قبرستان میں دفن کیا جائے۔ چنانچہ ان کی وصیت کے مطابق عمل کیا گیا۔ ۱۹۳۷ء میں والد مرحوم کے ساتھ حج کیا اور مدینہ منورہ جاکر روضہ اقدس پر حاضری کا شرف حاصل کیا۔

مذہبی و سیاسی خیالات :

گرچہ والدہ مرحومہ کا دماغ مذہبی تھا مگر جب تحریک خلافت شروع ہوئی تو اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہیں۔ اس زمانہ میں سرکاری ملازمین اور ان کے خاندان کے افراد کو یہ جرأت نہ ہوتی تھی کہ کسی قسم کی انگریز مخالف تحریک اور جلسوں میں شریک ہوں، تاہم والدہ مرحومہ نے ایسی ہمت کی اور تحریک خلافت سے متعلق ایک جلسہ میں شریک ہوئیں۔ یہ جلسہ مولانا محمد شفیع داؤدی نے خود اپنے مکان واقع موتی جھیل مظفرپور میں مسلمان عورتوں کے لیے منعقد کیا تھا جس میں مسٹر گاندھی نے بہت تفصیل کے ساتھ تحریک ترک موالات کے مقاصد بیان کیا۔ جلسہ کے اختتام پر چندہ کی وصولی ہوئی جس میں مسلمان عورتوں نے دل کھول کر چندہ دیا۔ بعض عورتوں نے تو اپنے بدن سے زیور بھی اتار کر مسٹر گاندھی کے قدموں میں ڈال دیا۔ لیکن والدہ مرحومہ ان کی باتوں سے بالکل متاثر نہ ہوئیں ان کی تقریروں کو غور سے سنا مگر ان کے بیان میں مسلمانوں کی فلاح و بہبود کا کوئی پہلو والدہ محترمہ کو نظر نہ آیا۔ ۱۹۴۷ء تک والدہ محترمہ کا یہی خیال رہا کہ کانگریس نے مسلمانوں کے ساتھ وہ نہیں کیا جو اسے کرنا چاہیے تھا۔ باوجود اس کے والدہ محترمہ تقسیم ہند کی سخت مخالف تھیں۔ ان کا خیال تھا کہ اس سے مسلمانوں کا کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ ان کو اس بات کا ڈر تھا کہ جو مسلمان ہندوستان میں رہ جائیں گے ان پر ہندو طرز زندگی غالب آجائیگی

رفتہ رفتہ وہ احساس کمتری میں مبتلا ہو جائیں گے اور اسی طرح سے ایک قوم دوسری قوم میں ضم ہو جاتی ہے۔

والدہ محترمہ کی موت :

والدہ محترمہ کی زندگی میں دو سانحوں نے ان کے دل و دماغ اور صحت پر بہت خراب اثر ڈالا۔ پہلا دردناک سانحہ راقم کے منجھلے بھائی کی موت تھی۔ وہ بہت ہی ہونہار طالب علم اور سعادت مند لڑکے تھے۔ مرحوم نے میٹریکولیشن کا امتحان پٹنہ یونیورسٹی سے اول درجہ میں پاس کیا تھا اور منظفرپور جی۔بی۔بی کالج میں انٹر سال دوم کے طالب علم تھے کہ تپ دق کے مہلک مرض میں مبتلا ہوئے اور تین سال بیمار رہ کر ۱۹۲۷ء میں انتقال کیا اور نواب ہیبت جنگ کے مقبرہ میں مدفون ہوئے۔ دوسرا سانحہ والد محترم کی موت تھی جو ۱۹۴۸ء میں ہوئی۔ ان دونوں واقعوں سے ان کی صحت روز بروز گرتی گئی اور آخر کار سرطان جگر کے موذی مرض میں مبتلا ہو کر ۱۹۵۸ء میں قضا کیا (ملاحظہ ہو ضمیمہ نمبر چہارم ص۔۹۰ ایک منظوم تعزیتی خط)

ورق تمام ہوا اور مدح باقی ہے
سفینہ چاہیے اس بحر بیکراں کے لیے

ضمیمۂ اوّل

بیان حسرت پُر ملال در مفارقت حکیموائے باکمال

از نواب شمس العلماء امداد امام صاحب اثرؔ

قطعہ بند

رنڈی کوئی دلخواہ نہیں ملتی ہے جس دم — آتا ہے مجھے یاد تو ہر بار حکیموا
تو کھینچ منگاتا تھا بتا دینے تھے جس کو — تھا رنڈیوں کے گھر کا تو مختار حکیموا

عیاشوں کی تکلیف بیاں ہو نہیں سکتی   تجھ سا نہ ملے گا کوئی غم خوار حکموا
پر ان سے زیادہ ہے طوائف کا برا حال   ان کا نہ رہا کوئی طرفدار حکموا
تھا بس کہ نسیمن کو تری ذات پہ تکیہ   اب گھر میں پڑی رہتی ہے بیکار حکموا
بھڑووں کی بھی روزی کی کوئی شکل نہیں ہے   مصری کا بھی اب سرد ہے بازار حکموا
بن تیرے صبیرن کو ذرا صبر نہیں ہے   غم میں ہے شہیدن بھی گرفتار حکموا
غمناک رہا کرتی ہے دن رات بلاقن   جینے سے بزازن بھی ہے بیزار حکموا
بنا کو پر افشانی کی طاقت نہیں باقی   مگن کی بھی کھلتی نہیں منقار حکموا
درماندہ جو مندر ہے تو بدحال ہے حلقا   ازبسکہ مدارن بھی ہے نادار حکموا
شوال بھی عیدن کے لیے ہے مہ رمضاں   کچھ گھر میں ہو تب تو کرے افطار حکموا
امراؤ غریبن کی طرح کیوں نہ ہو مفلس   جب اہل دول ہوں نہ طلبگار حکموا
خورشید بھی مہتاب بھی زہرہ بھی شب در   ہیں رنج کش چرخ ستمگار حکموا
جو عاشق مردہ کو جلاتی تھی مسیحن   اب زیست اسے غم سے ہے دشوار حکموا
دیکھا جو کلوجن نے برا رنگ فلک کا   تکیہ کی دوکان کی سر بازار حکموا
ملاح کے گھر بیٹھ رہی جا کے ملیجن   مرجائی نے کنجڑے کو کیا یار حکموا
خیرن کی اب اوقات ہے خیرات کے اوپر   پیشہ سے نہیں اس کو سروکار حکموا
دانائی سے سبحان لیے ہاتھ میں تسبیح   گردش کا کیا کرتی ہے اظہار حکموا
شیرن میں نہیں نام کو باقی ہے حلاوت   پھیکے ہیں وہ لب جو تھے شکربار حکموا
جاتی رہی جانے سے ترے سب کی کمائی   اب ان کا نہیں کوئی مددگار حکموا
تھیں نوچیاں خوش حال جو اقبال سے تیرے   ہر نائکہ کرتی تھی تجھے پیار حکموا
یا تیرے زمانے میں وہ تھی کونسی رنڈی   جو تیرے سبب سے نہ تھی زردار حکموا
مسند پہ اڑی رہتی تھی تکیہ کی فقیرن   کیا فیض رساں تھی تری سرکار حکموا
نتھن کو جو مل جاتے تھے دس بیس ٹکے روز   مجگن بھی کما لیتی تھی دو چار حکموا
اب چرخ جفا کار کا انداز ذرا دیکھ   ہے درپئے ایذا یہ ستمگار حکموا
پڑتا بھی نہیں اب رہی رنڈی کے کمر پر   ساڑی جو پہنتی تھی طرحدار حکموا

وہ رنڈی کہ دو چار رکھا کرتی تھی پشواز اس کے بھی بدن پر نہیں اک تار حکموا
اب پیٹ بجاتے ہیں جو تھے نامی طبیلے فاقوں کی پڑی ان پہ ہے اب مار حکموا
سارنگیئے دکانوں پہ بجاتے ہیں چکارے ملنا انھیں دمڑی بھی ہے دشوار حکموا
بھانڈوں کی جماعت میں چلا کرتی ہے جوتی بانٹے میں کیا کرتے ہیں تکرار حکموا
ہیں دبلے کلاونت کے مثل سائے کلانرت سنتا نہیں ان کی کوئی زنہار حکموا
جو بین کے ماہر تھے دو تارہ لیے دن بھر دو پیسے کے گھر گھر ہیں طلب گار حکموا
قوال صدا پڑھتے ہیں دروازوں کے اوپر قوالی بھی گئی ساتھ ترے یار حکموا
پھرتے ہیں لیے جنس ہنر تیرے گنی سب پر ان کا نہیں کوئی خریدار حکموا
القصہ یہ ارباب طرب سب ہیں پریشاں ہے سب ہی کو افلاس کا آزار حکموا

لے جلد خبر اب تو برا حال ہے ان کا
دم توڑ رہے ہیں سب ترے بیمار حکموا

ضمیمہ دوم

خمسۂ چقندری

از: عبدالغفور شہباز

انسانی سرسبزی پر نباتاتی دنیا میں فطرتی شادمانی

نہ ہو حیدرآباد کیوں شادماں کہ سرسبزی عدل کا ہے زماں
ہے فالیز میں خوش دلی کا سماں ملی خربزے کو چھری سے اماں
ہوئے چیف جسٹس خدا بخش خاں

ہو تربوز کیوں تیر غم کا ہدف ہو گئے کی کیوں جانِ شیریں تلف
نہ کیں پھیرے کیوں فرطِ حسرت سے کف کہ "راجس" کا نادر ہوا برطرف
ہوئے چیف جسٹس خدا بخش خاں

ہوا بند جور و تعدی کا گیٹ تھی باغ میں ہے خوشی کی پریٹ
بھرے اس کے احشا سے کیوں اب پلیٹ کٹھل کا ہے محفوظ پھٹنے سے پیٹ
ہوئے چیف جسٹس خدا بخش خاں

وہ سفاک غم کی گئی خودسری کہ ہے سر پہ اب معدلت گستری
رہے کیوں نہ مغز خوشی سے بھری چپت سے بچی بیل کی کھوپڑی
ہوئے چیف جسٹس خدا بخش خاں

مگس کو نہیں تھامتیں مکڑیاں نہیں مار کو مارتیں لکڑیاں
کدو سے چھری سنتی ہے پھکڑیاں ہیں کھیتوں میں اکڑی ہوئی ککڑیاں
ہوئے چیف جسٹس خدا بخش خاں

خوشی سے چقندر کا ہے چہرہ لال ہے گاجر بھی چہرے پہ چھڑکے گلال
نہیں دل میں بیگن کے اصلا ملال بنیں کیوں نہ مقطع پہ سیمیں ہلال
ہوئے چیف جسٹس خدا بخش خاں

ہر اک گام میں راہ مقصود پر چھری بھی چلی خط بہبود پر
چلی تیغ جب ظلم مردود پر خوشی کا چڑھا رنگ امرود پر
ہوئے چیف جسٹس خدا بخش خاں

شگفتہ ہیں ہر سو خوشی کے ریاحین کھلی ہے مسرت کی گلگوں بیاض
بڑھل پر کرے کوئی کیوں اعتراض کہاں اس کی صورت پہ وہ انقباض
ہوئے چیف جسٹس خدا بخش خاں

کدو کے جو چہرے پہ ہے آب و تاب بھری اس نے تونبے میں شاید شراب
خوشی پاس ہے دور ہے اضطراب علی الرغم کذلک ہے وہ کامیاب
ہوئے چیف جسٹس خدا بخش خاں

نہ اب کیریاں دل میں رنجور ہوں   عبث غم کے ہاتھوں نہ مجبور ہوں
مصائب کے زخموں سے کیوں چور ہوں   بڑی بات ہے دل میں مسرور ہوں
ہوئے چیف جسٹس خدا بخش خاں

چڑھائے ہے ہر پھانک اپنی کماں   چھپائے ہے ہر بیج نوک سناں
اگرچہ ہے نظروں سے ترکش نہاں   نہیں دشمن خربزہ کو اماں
ہوئے چیف جسٹس خدا بخش خاں

وکالت کرے گی چقندر کی بیر   دکھائے گی مولی نظائر کا ڈھیر
ترازو پہ رکھ کر عدالت کا سیر   خود انصاف تولے گا بلّے کو پھیر
ہوئے چیف جسٹس خدا بخش خاں

ستم کا ہے حال اب بہت ہی بُرا   ہوا ظلم کا میان میں اب چھرا
کسیرو کا گھر ہے بھرا اور پُرا   نہیں سر پہ پھرتا وہ اب استرا
ہوئے چیف جسٹس خدا بخش خاں

ہے اس بات پر سب کا اب اتفاق   کہ اب پھوٹ میں بھی ہے رنگ وفاق
نہ شق ہے جگر اور نہ جینا ہے شاق   کہ ہے ناوکِ ظلم بالائے طاق
ہوئے چیف جسٹس خدا بخش خاں

جنوں نے جو تھی حق سے فریاد کی   کہ کچھ حد نہیں ہم پہ بیداد کی
تو دی حق نے اب داد یوں داد کی   ہے کیا بات عدل خدا داد کی
ہوئے چیف جسٹس خدا بخش خاں

مٹر اور چنے ہیں ہرے اور بھرے   خوشی ہے جلو میں ورے اور پرے
بلا ان کی اب بکریوں سے ڈرے   یہ بکری میں طاقت کہاں جو چرے
ہوئے چیف جسٹس خدا بخش خاں

نظر آتے ہیں باغ میں فالسے   خوشی کی حلاوت سے خوشحال سے
ہیں مامون یہ ظالم کے افعال سے   کہ اس عہد میں ان کے اقبال سے
ہوئے چیف جسٹس خدا بخش خاں

زرہ پہنے ہیں لیچیاں شاخ پر　　نہیں ان کو تیر حوادث سے ڈر
نہ ہو کس طرح ان کو حاصل ظفر　　کہ انصاف ہے آگے آگے سپر
ہوئے چیف جسٹس خدا بخش خاں

وہ شفتالوؤں کی گئیں تلخیاں　　بھریں رنگ عشرت نے شیرینیاں
خوش آیند سیبوں کی سرسبزیاں　　دکھاتی ہیں گالوں پہ اب سرخیاں
ہوئے چیف جسٹس خدا بخش خاں

خوشی سے ہیں پھولے ہوئے رنگترے　　مسرت کے رس میں ہیں نیبو بھرے
ہیں نارنج بھی رنج و غم سے پرے　　عجب کیا چھری بھی دم ان کا بھرے
ہوئے چیف جسٹس خدا بخش خاں

نہیں ان کو اصلا غم روزگار　　ہیں مارے خوشی کے یہ بے اختیار
ہیں دانتوں پہ یاقوت کی سی بہار　　پڑے شاخ پر ہنس رہے ہیں انار
ہوئے چیف جسٹس خدا بخش خاں

گئیں سر سے بیگن کے وہ خواریاں　　مسلّم ہیں کھیتے کی سرداریاں
کہاں شلجم آلو کی اب "کاریاں"　　کہ ہیں بے خطر ساری ترکاریاں
ہوئے چیف جسٹس خدا بخش خاں

کریلے کا بیجا نہیں کچھ سرور　　کہ ہے عیش اس کا تلخی سے دور
سمجھ کر کسی دن کمیت غرور　　چڑھے گا یہ اب نیم پر بھی ضرور
ہوئے چیف جسٹس خدا بخش خاں

جب ایما سے دہقانِ تقدیر کے　　چقندر نے چے دی، کریلے نے یے
دیا جیم گاجر نے خرفے نے فے　　دیئے سین کَرد نے، بھٹے نے ٹے
ہوئے چیف جسٹس خدا بخش خاں

رہے جب تلک یاں ترازو پہ سیر　　ہو جب تک کہ منڈی میں سبزی کا ڈھیر
مذاقوں میں جب تک کہ میخوش ہو بیر　　نہ ہوں کان اس لے کے سننے سے سیر
ہوئے چیف جسٹس خدا بخش خاں

([illegible]، ۲۴ مئی ۱۸۹۵ء)

ضمیمہ سوم

مولانا شہباز کے اُلجھے ہوئے خیالات

مونچھیں

(ان مونچھوں کا زیادہ تر بانکی پور پٹنہ سے تعلق ہے)

بڑھیں اس طرح جب مچھندر کی مونچھیں　　منڈیں کس لیے پھر قلندر کی مونچھیں
پڑی تاؤ کھاتی ہیں ہر خر کی مونچھیں　　عجب کیا اگر ریچھ بندر کی مونچھیں
نہیں بڑھتے بڑھتے سکندر کی مونچھیں

کسی روم میں ایک ریکارڈ کیپر[1]　　ہے بیٹھا ہوا اپنی کرسی کے اوپر
نہیں ڈر سے رکھتا چرٹ منہ کے اندر　　کہ پھیلا ہے کرسی پہ مونچھوں کا دفتر
محافظ ہیں خود اپنے دفتر کی مونچھیں

نکیلی کھنچی ناک کے زیر سایہ　　بڑھاتی ہوئی رعب و سطوت کا پایہ
سناتی ہوئی خوف و دھشت کا آیہ　　کبھی بالصراحہ کبھی بالکنایہ
ڈراتی ہیں ڈپٹی کلکٹر کی مونچھیں

کمر میں نہیں گرچہ تلوار رکھتیں　　مگر پھر بھی اعدا کو ہیں مار رکھتیں
ہیں احباب کو عاشق زار رکھتیں　　لبوں پر بھی اک زعفران زار رکھتیں
خوش اخلاقیوں سے کلکٹر[2] کی مونچھیں

سر شام کوٹھی سے اپنی نکل کر　　اٹھاتی ہوئی دم بدم لطف منظر
لگاتی ہوئی لان کے گرد چکر　　بڑھاپے کے ساتھ عمدہ فٹن پر
ہوا کھا رہی ہیں کمشنر[3] کی مونچھیں

جواہر کی لڑیاں کہیں جھڑ رہی ہیں　　حریفوں پہ چھڑیاں کہیں پڑ رہی ہیں
نظیروں پہ آنکھیں کہیں گڑ رہی ہیں　　کتابیں پٹک کر کہیں لڑ رہی ہیں

کھڑی کونسل سے پلیڈر کی مونچھیں

کہیں چھانٹی ہیں مے پرتگالی پروتی کہیں پرل کے ہیں لآلی
بنی ہیں کہیں حسن کے منہ پہ جالی سیاہی میں ہیں لب پہ ہاتھوں کی لالی
سٹیشن پہ ایجنٹ کلکٹر کی مونچھیں

کہیں ذکر ہے گر زباں دانیوں کا کہیں وقت ہے گر ثنا خوانیوں کا
غرض معرکہ گرم ہے لسانیوں کا پہنچ کر وہیں جلد ایرانیوں کا
پھریرا اڑاتی ہیں سنجر کی مونچھیں

ہوا قلب پر خوف عقبیٰ جو غالب چلا گھر سے عینو کی مسجد کی جانب
تھے عینو وہاں درزئ شاہ یثرب بڑھے لے کے مقراض قصوا الشوارب
جو دیکھیں میرے منہ پہ کافر کی مونچھیں

وہ مونچھوں پہ لپکے میں داڑھی سے لٹکا کترنے لگے وہ دیا میں نے جھٹکا
کلا منہ پہ کرنے لگی کام نشتر کا اٹھا پھر تو مونچھوں نے داڑھی کو پٹکا
چبھونے لگیں نوک خنجر کی مونچھیں

نکل آئے اِدھر کے ہم ٹھنڈے ٹھنڈے اڑاتے ہوئے فتح و نصرت کے جھنڈے
بندھے گو نہ مونچھوں میں عینو کے ڈنڈے وضو ہو گئے لیک تقدیں کے ٹھنڈے
نہ جائیں جو مسجد ہو عنبر کی مونچھیں

ہو جلسہ وہ پٹنے ہیں یا لکھنؤ میں وہ ہو عشق زردار یا عشق ٹیں ٹیں
کہیں ہاتھ ناچیں کہیں پاؤں تھرکیں لب لعل سے ہونٹ طوطی کے مل دیں
الاپیں جو شہباز، حیدر کی مونچھیں

(خیالات شہباز ص ۶۴ تا ۶۶)

نوٹ :

۱۔ ریکارڈ کیپر : مولوی سید محمد ہاشم۔
۲۔ خوش اخلاق کلکٹر : اس کی مونچھیں زعفرانی رنگ کی تھیں۔
۳۔ کمشنر، پٹنہ ڈویژن : بڑی بڑی مونچھیں رکھتا تھا۔

۴ - کھڑی کونسلی : Mr. Percy Manuk (Standing Counsel)

۵ - ایجنٹ کلز ہوٹل پٹنہ جنکشن کی مونچھیں سیاہ تھیں ۔

۶ - سنجر = ایک ایرانی تھا جو بہت دنوں تک پٹنہ میں رہا ۔

۷ - عینو کی مسجد : پٹنے کی ایک مسجد ہے ۔

۸ - حیدر : ایک طوائف کا نام جس کی مونچھیں تھیں ۔

ضمیمہ چہارم

میجر سید محمد آغا حسن عابدی سابق امراؤتی، جو عرصۂ دراز تک فارسی کے پروفیسر رہے تھے اور اپنے عزیزوں اور دوستوں کو منظوم خطوط لکھا کرتے تھے، میری والدہ محترمہ کی وفات کی خبر سن کر ایک منظوم تعزیتی خط لکھا جو حسب ذیل ہے :

ای عزیز محترم ! اقبال با حزن و ملال — آپ کا نامہ ملا پڑھ کر کلیجا پھٹ گیا
تین سطروں میں لکھی تھی داستان مرگ مام — صفحۂ قرطاسِ ابیض صدمے سے کالا ہوا
کیا علالت تھی جو آئی اور ان کو لے گئی — سختیاں جھیلیں اطبا سے نہ کچھ بھی بن پڑا
سنتے آئے ہیں قضا کے سامنے حاذق طبیب — کور ہو جاتے ہیں پھر ان کو نہیں کچھ سوجھتا
موت کی ساعت مقرر ہے کبھی ٹلتی نہیں — ٹال سکتا ہے بھلا کوئی کہیں حکم قضا
والدہ کا سر سے اٹھ جانا قیامت خیز ہے — ان کی الفت اور عنایت یاد آئیں گی سدا
اس محبت سے بلائے گا کوئی کیوں آپ کو — کس کے سینے میں سما سکتی ہے ماں کی مامتا
جنوری کی آٹھ کو اللہ کی پیاری ہوئیں — چھوڑ کر سب کو، کیا آباد گوشہ قبر کا
سیر عالم سے ہوئیں وہ سیر تو جنت گئیں — بھا گئی جب دل کو ان کے واں کی روحانی غذا
بھائی صاحب ! ہے یہی دلدوز دنیا کا چلن — جو یہاں آیا سویرے شام کو واپس ہوا
مستقل رہتا نہیں کوئی یہاں با زیب و زیں — ہے حقیقت میں یہ دنیا تو سپنجی اک سرا
حکم سے اس کے یہاں آئے، رہے، واپس گئے — اس کے فرماں میں نہیں گنجائشِ چون و چرا
کون کہتا ہے بشر مختار کل ہے بھائی جان — عقل کا یہ پھیر ہے ہے فہم کی سہو و خطا

موت کے آگے یہاں مختار بھی مجبور ہیں — جم سکندر اور دارا بھی یہاں ہیں بے نوا
آنے والے کے لیے جانا بھی ہوتا ہے ضرور — فیصلہ حق کا یہی ہے اور روشن ماجرا
کون سے گھر سے نہیں نکلا جنازہ بولیے — کون سی جا پر نہیں ہیں قدر دانانِ قضا
برمحل ایک بات یاد آئی تو لکھتا ہوں اسے — معذرت مقبول ہو پھر غور سے سنیے ذرا
پڑھ کے خط آنسو نکل آئے پرانے زخم دل — ایک دم تازہ ہوئے چرکوں پہ اک چرکا لگا
یک بیک مُردے نظر کے سامنے آنے لگے — باپ ماں بھائی بہن اولاد خویش و اقربا
عہدِ طفلی میں ہمارے باپ رخصت ہو گئے — ماں نے چھوڑا اس گھڑی جب میں کسی قابل نہ تھا
آنکھ کھلتے ہی پڑی کلے پہ سیلِ خزاں — باپ ماں کے ناز کو آغا ترستا ہی رہا
آپ نے تو ان کی خدمت سے اٹھایا خوب فیض — آپ پر لطف و کرم مادر کا تا ایں دم رہا
مر گئے مادر پدر بھائی مرے بہنیں مریں — پانچ اولادیں چھٹیں اب تین کو رکھے خدا
بچپنے میں اور جوانی میں سہے صدمے بہت — پھر بڑھاپے میں جواں موتوں سے بھی پالا پڑا
دل کے ٹکڑے اپنے ہاتھوں خاک میں پنہاں کیے — گود کے پالوں کو لادا دوش پر دفنا دیا
بچ گیا میں ہی اکیلا سب کو رونے کے لیے — موت نے صد حیف گھر بھر کا صفایا کر دیا
داغوں کی کثرت سے شکل دل مجدر ہو گئی — عمر تو بڑھتی رہی پر غم پہ غم کھاتا رہا
اب خوشی سے خوش نہیں رنج و الم کا غم نہیں — صدمے سہتے سہتے اب پتھر کلیجا ہو گیا
ہم نے جو چاہا نہ ممکن ہو سکا مجبور تھے — اپنی مرضی کچھ نہیں راضی ہیں جو اس کی رضا
ہے خدا خود قادرِ مطلق علیم و کارساز — ہے ہمارے حال سے ہم سے وہ بہتر آشنا
ذات اس کی ہے سراپا عدل سب عیبوں سے پاک — طینت آدم میں ہیں پوشیدہ نسیان و خطا
رحمت لطف و کرم اس کے ہیں بے حد و حساب — وہ وہی کرتا ہے جس میں ہوتا ہے اپنا بھلا
موت سے ڈرتے ہیں ہم اس کو مصیبت جان کر — ہے حقیقت میں مگر وہ رہبر ملکِ بقا
ہے بقا اللہ کو باقی فنا کے نذر ہیں — ہوں رسول و انبیا یا اوصیا یا اولیا
مرضیِ مولیٰ ہے اولیٰ ہے خدا رب رحیم — صبر کی تلقین ہے بیکار وہ خود آئے گا
اس جہاں میں دیکھ کر اوروں کو آجاتا ہے صبر — دل میں کہتا ہے بشر تنہا نہیں ہیں مبتلا
اس لیے انسان کو خود صبر کرنا چاہیے — آدمیت کا ازل سے ہے یہی تو مقتضا

ہوتی ہے جنت یقیناً ماں کے پیروں کے تلے — ان کے ہونے سے مکاں اقبال کا فردوس تھا
مندمل ہو جائے گا یہ زخم کچھ دن میں مگر — بھر نہیں سکتا خلا جو ان کے جانے سے ہوا
ساعت ادبار کے کٹنے میں کچھ دیری نہیں — جب کہ خود اقبال ہے دنیا کے اندر لابقا
اب دعا یہ ہے خدا ان کو کرے جنت نصیب — بہر سردار دو عالم اور فخر انبیاء
حق کی رحمت ان کے گرداگرد ہر اک دم رہے — نعمتیں ان کو ملیں جنت میں ہر صبح و مسا
دے خدا پس ماندوں کو صبر جمیل اجر جزیل — ایسا جب ابر کرم ان کے سروں سے چھٹ گیا
سورۂ الحمد پڑھ کر ان کے حق میں بخشیے — روح ان کی شاد ہوگی اور خوش ہوگا خدا
عالم بالا میں وہ پہنچیں نظر سے دور ہیں — کر نہیں سکتے کوئی خدمت ہم اب اس کے سوا
اس کو لکھتے لکھتے چکر کھا گیا میرا دماغ — ظلمت الفاظ کی ہیبت سے دل گھبرا گیا
بعد تھوڑی دیر کے تاریخ کا آیا خیال — مادہ کوئی نہ عبرت خیز مجھکو مل گیا
سر جھکائے سوچتا تھا لفظ ملتے ہی نہ تھے — آئی میرے کان میں جنت سے آوازِ بکا
دست بستہ دم بخود سا سامنے آیا نظر — نور کی پوشاک پہنے حور و غلماں کا پرا
میں نے پوچھا کون سی افتاد تم پر پڑ گئی — کیوں اداسی چھائی ہے مجھ کو بتاؤ تو ذرا

رو کے رضواں نے کہا اقبال بے مادر ہوئے
انتقال پُر ملال پاک طینت ہو گیا

۱۳۷۷ ہج

غم زدہ پُر ملال
شریک غم اقبال
دل خستہ
آغا

عابدی منزل
امراوتی کیمپ
(برار)

چہار شنبہ
۲۴-۶-۷۷ھ
۱۵-۱-۵۸ء

دوسرا حصّہ

میری زندگی اور معاصرین

نیورہ خاندان کے ہائی کورٹ کے چھ جج

میری زندگی

پہلا باب

پیدائش، بچپن، مکتب اور اسکول

(۱۹۰۵ء سے ۱۹۲۲ء)

میری پیدائش اور علالت:

۲۲ نومبر ۱۹۰۵ء مطابق ۱۳ رمضان المبارک ۱۳۲۲ ہجری بروز منگل قریب چار بجے صبح مدرسہ سیف خاں میں راقم پیدا ہوا۔ نانا مرحوم نے مدرسہ مذکور کے تین کمروں کو اپنی زنانہ حویلی سے ملحق کر لیا تھا ان تین کے بیچ والے کمرے میں راقم کی ولادت ہوئی۔ شاہجہانی دَور سے بہت دنوں بعد تک یہ جگہ نیک صفت بندوں، صوفیوں اور اہلِ علم اساتذہ کے قیام سے منور رہی تھی۔ راقم کو اس کا فخر ہے کہ اس کی پیدائش ایسی بابرکت جگہ اور ایسے مبارک مہینے میں ہوئی۔ خاندان کے افراد سے سنا ہے کہ راقم کا عقیقہ پیدائش کے ساتویں دن انجام پایا اور اسی دن سے اقبال حسین کے نام سے پکارا جانے لگا۔ دادی مرحوم نے اس تقریب پر چاندی کا پیالہ، کٹوری اور جھنجھنا دیا اور نانی مرحومہ نے چاندی کا گلاس، چمچہ اور طشتری دی۔ منجھلی خالہ لیڈی رحیم نے کلکتہ سے اون کے بنے ہوئے خوب صورت کپڑے اور دو چھوٹے کمبل ایک اوڑھنے اور بچھانے کے لیے بھیجا۔ دادی مرحومہ کی خوشی کی کوئی انتہا نہ تھی کیونکہ میں ان کے

اکلوتے بیٹے کا پہلا لڑکا تھا۔ نانی مرحومہ بھی اس خوشی میں برابر کی شریک تھیں۔ جب میں ڈیڑھ مہینے کا ہوا تو سردی لگ جانے سے دونوں پھیپھڑوں میں نمونیا ہو گیا۔ ننہالی اور ددھیالی دونوں خاندانوں کی خوشیاں رنج و تردد میں بدل گئیں۔ نانا مرحوم دولت مند آدمی تھے۔ علاج و معالجہ میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ ڈاکٹر رام کالی اور ڈاکٹر اصغر علی خاں جو پٹنہ کے مشہور ڈاکٹروں میں تھے ان سے علاج شروع کرایا۔ اسی دوران پٹنہ کے انگریز سول سرجن کو بلا کر دکھایا جس نے بلا تامل کہا کہ بچہ موت وحیات کی کشمکش میں ہے اور اس کے بچنے کی کوئی امید نہیں۔ سب لوگ بہت مغموم تھے کہ شام کو نانا مرحوم کے دوست حکیم عبدالحمید صاحب جو پٹنہ کے مشہور طبیب تھے معمول کے مطابق ملاقات کے لیے آئے انھیں مغموم دیکھ کر وجہ دریافت کی۔ جواب میں نانا مرحوم نے فرمایا کہ آج میری سب سے چھوٹی بیٹی کا پہلا بچہ نہایت مہلک مرض میں مبتلا ہے۔ انگریز سول سرجن نے کہا ہے کہ اس کے بچنے کی کوئی امید نہیں ہے۔ اسے مردہ سمجھو۔ ماں مایوس ہو کر الگ جا بیٹھی ہے۔ حکیم صاحب نے کہا کہ زندگی کا ور موت کسی کے قابو میں نہیں مگر علاج تو میرے بس میں ہے۔ یہ کہا اور اپنی پالکی میں سوار ہو کر اپنے گھر واقع محلہ خواجہ کلاں گئے، آدھ گھنٹہ کے اندر ہی اپنے عطار کے ساتھ کچھ دوائیں لے کر واپس آئے اور علاج شروع کر دیا۔ حکیم صاحب اور عطار نے رات بھر میری دیکھ بھال کی، دوا کے ساتھ ساتھ دعائیں بھی کیں۔ رات بھر کے علاج کے بعد انھوں نے صبح کو چہرے کی بدلتی رنگت اور سبزی کو دیکھ کر فرمایا کہ اللہ نے چاہا تو بچہ اچھا ہو جائے گا۔ تیسرے دن بڑے اعتماد کے ساتھ کہا کہ بچہ اب رو بہ صحت ہے، تشویش کی کوئی بات نہیں، انشاء اللہ آٹھ دس دن میں بالکل تندرست ہو جائے گا اور ایسا ہی ہوا۔ نانی مرحومہ سے جو کچھ ہو سکا کیا۔ انھوں نے اپنے نوکر کو "کوڑا شاہ" کے پاس جو شہر میں مجذوب مانے جاتے تھے بھیجا کہ بچے کی صحت کے لیے اللہ تعالیٰ سے دعا فرمائیں۔ نوکر کا بیان ہے کہ جوں ہی اس نے واقعہ بیان کیا، کوڑا شاہ نے ہاتھ اٹھا کر بآواز بلند فرمایا کہ انشاء اللہ وکیل کا ناتی بالکل اچھا ہو جائے گا اور اتنے دنوں تک زندہ رہے گا کہ اپنی زندگی سے گھبرا جائے گا۔ یہ پیشین گوئی حرف بہ حرف پوری ہوئی۔ آج راقم کی عمر تراسی[۸۳] برس کی ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ اب بھی تندرست ہے اور اپنے تمام کاموں کو خود انجام دیتا ہے۔ مگر اپنی طویل العمری سے بہت گھبرا گیا ہے۔

حکیم صاحب نے ایک ماہ بعد نانا مرحوم سے کہا کہ انگریز سول سرجن کو فیس دے کر بلائیے حکیم صاحب کی موجودگی میں سول سرجن کو بلایا گیا اور میرے پھیپھڑوں کا طبی معائنہ کرنے کے لیے

کہا گیا۔ معاینہ کے بعد اس نے بتایا کہ بچہ بالکل ٹھیک ہے۔ اس پر حکیم صاحب نے پوچھا کہ کیا اس بچے کو کبھی نمونیا ہوا تھا یا اس کا کچھ اثر ہے۔ سول سرجن نے کہا کہ نہ اس بچے کو نمونیا ہوا تھا اور نہ پھیپھڑوں پر اس کا کچھ اثر معلوم ہوتا ہے۔ حکیم صاحب نے ہنس کر فرمایا کہ یہ وہی بچہ ہے جس کے بارے میں آپ نے ڈیڑھ ماہ قبل کہا تھا کہ اس کو مُردہ سمجھو۔ کیا آپ کا پیشہ اور عقیدہ ایسی باتیں کہنے کی اجازت دیتا ہے؟ سول سرجن نے اپنی غلطی محسوس کی اور شرمندگی کے ساتھ معذرت کی۔

میری پرورش، بچپن کے احوال اور منجھلے بھائی کی پیدائش :

۱۹۰۷ء میں میرا منجھلا بھائی پیدا ہوا جس کا نام افضل حسین رکھا گیا۔ ۱۹۱۱ء تک ہم دونوں بھائیوں کا بچپن ایک ساتھ نہایت ہنسی خوشی سے نانیہال اور ددیہال میں گزرا۔ راقم کی نگہداشت بی بی مجیبن کے سپرد ہوئی۔ مرحومہ ایک اچھے خاندان سے تعلق رکھتی تھیں۔ ان کے بڑے بھائی مولوی سراج الدین صاحب مرحوم داناپور میں ٹھیکہ دار تھے۔ بی بی مجیبن کے لڑکے نصیر الدین مجھ سے سات سال بڑے تھے جو ایم۔ اے اور بی۔ ایل کے امتحانات پاس کر کے وکیل ہوئے۔ موصوفہ کو میں دادی کہا کرتا تھا کیونکہ وہ میری دادی مرحومہ کے ساتھ ہی اٹھتی بیٹھتی تھیں۔ میرے چھوٹے بھائی کی دیکھ بھال کے لیے بی بی کنیزن مقرر تھیں، یہ بھی ایک شریف خاندان کی فرد تھیں۔ ۱۹۶۷ء میں حج وزیارت سے بھی مشرف ہوئی تھیں۔ ان کی بڑی بہن کے پوتے آج کل دہلی میں ٹاؤن پلینر (Town Planner) ہیں۔ بی بی مجیبن مرحومہ راقم کے کھانے پینے اور جسم کو صاف رکھنے کا بہت خیال رکھتی تھیں۔ والد صاحب کی تاکید کے مطابق ہم دونوں بھائیوں کو الگ الگ پلنگ پر سلایا جاتا تھا اور دونوں خواتین ہماری پلنگ کی بغل میں اپنی اپنی چارپائیوں پر سویا کرتی تھیں۔ راقم کو بچپن سے مٹھائیاں کھانے کا شوق ہے۔ مجیبن دادی مجھے ناشتے میں کچھ میٹھی چیز اور دن کے کھانے کے بعد کوئی نہ کوئی مٹھائی ضرور دیا کرتی تھیں۔ خورہ گاؤں کا حلوائی کشور خشک گلاب جامن بہت اچھا بناتا تھا جس کو راقم بہت شوق سے کھاتا تھا۔ گرمیوں میں کرتے پاجامے کا استعمال ہوتا مگر جاڑوں میں والد مرحوم کلکتہ سے White - ways کے یہاں سے ہم لوگوں کے لیے اونی کپڑے ہر سال منگایا کرتے تھے۔ راقم کو نارفوک کوٹ (Norpolk coat) اور اس کے ساتھ پہننے کا پتلون بہت پسند تھا۔ اس لیے میرے شوق کے مطابق ایسا سوٹ ضرور منگایا جاتا۔ مجھے انگریزی لباس بچپن ہی سے پسند ہے اور آج کل بھی یہی لباس پہنتا ہوں۔ شادی بیاہ اور مذہبی تقریبات میں شروانی اور پاجامہ استعمال کرتا ہوں۔

نیورہ کا مکان اور میرے کھیل :

میرا نیورہ کا مکان بہت بڑا تھا - زنانہ اور مردانہ حصہ الگ الگ تھا - مردانہ حصہ کے ساتھ ساتھ ایک پائیں باغ تھا جس میں آم، لیچی، امرود اور شفتالو وغیرہ کے درخت تھے - ہمارے کھیلنے کے لیے باغ میں کافی جگہ تھی - اس کے علاوہ اسی حصہ میں ایک وسیع آنگن تھا جہاں ہم لوگ طرح طرح کے کھیل کھیلا کرتے تھے - آج کل ہر جگہ شہر ہو یا دیہات فٹ بال، کرکٹ اور والی بال کا عام رواج ہے لیکن راقم کے بچپن میں دیہات کیا شہر میں بھی لوگ ان کھیلوں کے نام سے واقف نہ تھے - کبڈی، آنکھ مچولی، گلی ڈنڈا، گولی اور پتنگ بازی یہی کھیل تھے جسے عام طور سے شہر اور دیہات میں بچے اور جوان کھیلا کرتے تھے - راقم بھی بچپن میں انھیں کھیلوں سے دل بہلایا کرتا تھا - ہمارے کھیل کے ساتھیوں میں نوکروں کے بچے اور ہمارے دو رشتہ دار نظام الدین اور منظور الدین تھے - ایک مرتبہ کا واقعہ ہے کہ سر علی امام صاحب یکایک راقم کی پردادی صاحبہ سے ملاقات کے لیے آ پہنچے - ہم لوگ گولی کھیلنے میں مصروف تھے - وہ دیکھ کر مسکرائے - جب میری نظر پڑی تو ہم سب لوگ فوراً کھیل بند کر کے مودبانہ کھڑے ہو گئے موصوف نے کہا کہ کھیل کیوں بند کر دیا یہ کھیل تو ہم بھی اپنے بچپن میں کھیلتے تھے، شرم کی کوئی بات نہیں۔ راقم کو پتنگ اڑانے کا ڈھنگ نہ تھا مگر شوق ضرور تھا - میں نوکر کو پتنگ اور ڈور دے دیتا - وہ پتنگ کو فضا میں خوب بلند کر دیتا اور جب وہ آب و تاب سے اڑنے لگتی تو میرے حوالے کر دیتا - میں لطف لیکر اڑاتا - جب دو چار بار ڈوریاں کھینچ تان کرتا تو پتنگ اپنے قابو سے باہر ہو جاتی اور زمین پر آنے لگتی نوکر پھر سنبھال کر فضا میں بلند کرتا اور مجھے دے دیتا - اس طرح یہ تماشہ کچھ دیر تک جاری رہتا - گنگا کے کنارے سیف خاں کی مسجد کے سامنے ایک بڑا میدان ہے جہاں میرے بچپن میں پتنگ بازی کا مقابلہ ہوا کرتا تھا - اس مقابلہ میں ماہرین فن اپنی پتنگ بازی کے فن کا مظاہرہ کرتے - راقم ان مظاہروں کو بڑی دلچسپی سے دیکھا کرتا تھا - کیونکہ اس مقابلے میں اکثر رؤسائے شہر خود بھی پتنگ اڑاتے اور فنکاروں کو انعام و اکرام بھی دیتے تھے۔

میرا پٹنہ آنا جانا اور وہاں کا قیام

انسانی فطرت ہے کہ وہ یکسانیت سے گھبرا جاتا ہے - خصوصاً بچے تو ہمیشہ خواہشمند رہتے ہیں کہ سیر و تماشہ کے لیے مختلف مقامات پر جائیں اور نئی نئی چیزوں کو دیکھیں - ہماری یہ خواہش والدہ مرحومہ کے پٹنہ آنے جانے سے پوری ہو جایا کرتی تھی - والدہ مرحومہ کا یہ معمول تھا کہ ایک دو ماہ پر اپنے والدین سے

ملنے کے لیے پٹنہ ضرور آتیں اور اپنے پہنچنے کی تاریخ سے اپنے رشتہ داروں کو پہلے سے مطلع کر دیا کرتی تھیں۔ وہ لوگ بھی خوشی سے ان کے آنے کے منتظر رہا کرتے تھے۔ ہم لوگ نیورہ سے پٹنہ بذریعہ پالکی گاڑی جایا کرتے تھے۔ سیتارام ساکن باقر گنج شہر پٹنہ کے پاس ایک فٹن اور ایک عمدہ پالکی گاڑی بھی تھی جن کے گھوڑے بڑے تیز رفتار تھے۔ اچھے اچھے لوگ اپنی آمد و رفت کے لیے اس کی گاڑیوں کا ہی استعمال کیا کرتے تھے۔ جب ہم لوگوں کو پٹنہ آنا ہوتا تو اس کو خبر کر دی جاتی اور وہ وقت مقررہ پر اپنی گاڑی لے کر نیورہ آجاتا تھا۔ ان دنوں نیورہ سے پٹنہ کی سڑک پھلواری شریف گاؤں کے اندر سے گزرتی تھی جب سواری پھلواری شریف پہنچتی تو والدہ محترمہ گاڑی رکوا کر کھانے کی کچھ چیزیں، خاص طور سے یہاں کی میٹھی اور نمکین باقر خوانی اور روٹیاں ضرور خریدا کرتیں اور اپنے رشتہ داروں میں تحفتاً تقسیم کیا کرتی تھیں۔ پھلواری شریف سے پٹنہ تک میں آدھی روٹی کھا جایا کرتا تھا۔ والدہ محترمہ کا یہ معمول تھا کہ پہلے اپنے والدین کے یہاں قیام کرتیں پھر وہاں سے اپنے دوسرے رشتہ داروں کے یہاں جاتیں اور ان کے یہاں بھی قیام کرتیں۔ نانی مرحومہ سے زیادہ نانا مرحوم ان کی آمد کے منتظر رہا کرتے تھے کیوں کہ وہ والدہ محترمہ سے بہت محبت کرتے تھے۔ ننھیال میں دس پندرہ روز قیام کے بعد ہم لوگ "اشرف منزل" واقع محلہ مراد پور جاتے اور وہاں کم از کم ایک ہفتہ ضرور قیام کرتے تھے۔ یہاں ہماری والدہ کے سگے ماموں زاد بھائی اشرف امام صاحب رہا کرتے تھے۔ موصوف ہم لوگوں سے بہت محبت کرتے تھے اور نہایت شفقت سے پیش آتے۔ سواری سے اترتے ہی ہم دونوں بھائیوں کو ایک ایک بوتل Parry کی ولایتی مٹھائیاں دیتے، ہمارے پہنچنے سے پہلے ہی ہماری ضیافت کا انتظام کر لیا کرتے تھے۔ جب ہم لوگ نیورہ واپس جانے کی تیاری کرتے تو موصوف اجازت نہ دیتے بلکہ دو چار روز اور ٹھہر جانے ادر ہمیں بھی ان کی بات ماننی پڑتی تھی۔ ان کے لڑکے بھائی حیدر امام صاحب مرحوم جو بعد میں بیرسٹر ہوئے تھے، راقم سے عمر میں آٹھ نو سال بڑے تھے، تاحیات مجھ سے بہت محبت کرتے تھے اور برابر خندہ پیشانی سے ملتے تھے۔

دوسرے رشتہ دار جن کے یہاں ہم لوگوں کا قیام ضرور ہوتا وہ ڈاکٹر محمد بخش صاحب تھے ان کی اہلیہ والد مرحوم کی خالہ زاد بہن تھیں اور نہایت خوش اخلاق اور نیک سیرت تھیں۔ انھوں نے بعد میں والد صاحب کے ساتھ حج و زیارت مدینہ کیا۔ وہ ہماری آمد سے جس قدر خوش ہوتیں وہ راقم کے بیان سے باہر ہے۔ خود اپنے ہاتھوں سے اچھے اچھے کھانے پکا کر کھلاتیں اور روانگی کے وقت مٹھائیاں ساتھ دے دیتی تھیں۔

تیسری جگہ جہاں ہم لوگ ٹھہرتے تھے وہ مسٹر ریاست حسین بیرسٹر کی کوٹھی تھی۔ موصوف والد محترم کے سگے چچازاد بھائی تھے اور محلہ نیا ٹولہ پٹنہ میں رہتے تھے۔ ان کی طرز رہایش انگریزی تھی۔ انگریزی کھانوں میں سوپ، کٹ لٹ، مچھلی اور روسٹ کے ساتھ بریانی بھی ہوا کرتی تھی۔ ان کا باورچی طرح طرح کی پوڈنگ خوب تیار کرتا تھا۔ ان کی اہلیہ اور دیگر مستورات کے لیے ہندوستانی کھانا پکایا جاتا اور حویلی میں بھیج دیا جاتا تھا۔ ان کی آمدنی کا کثیر حصہ کھانے کی مد میں خرچ ہوتا کیونکہ ان کا دستر خوان بڑا وسیع ہوتا تھا۔ مہمان نوازی میں بہت فضول خرچی کرتے تھے۔

راقم کو اپنی نانیہال مدرسہ پر اور اشرف منزل میں اپنے ہم عمر بچے ساتھ کھیلنے کے لیے مل جاتے تھے اس لیے یہ دونوں جگہیں بہت پسند تھیں اور ان دونوں جگہوں پر جانے کا میں ہمیشہ خواہش مند رہتا۔

پٹنہ کا شہر:

بہورہ سے پٹنہ آنے میں راہ میں کوئی دل چسپ چیز نظر نہ آتی تھی۔ بانکی پور جو ضلع پٹنہ کا صدر مقام ہے یہاں بھی کوئی جاذب نظر چیز نہ تھی۔ نہ اچھے مکانات تھے نہ اچھی دکانیں نہ اچھی سڑکیں اور نہ چہل پہل ہی تھی۔ برخلاف اس کے پٹنہ سیٹی میں زیادہ رونق تھی اور مکانات بھی اچھے اچھے نظر آتے تھے جو نوابوں اور تاجروں کے تھے۔ بانکی پور میں صرف ایک عمارت راقم کو اچھی لگتی تھی جو بابو رادھا کرسنو جھاجاریہ وکیل کا خوب صورت رہایشی مکان اگزبیشن روڈ پر تھا اور یہ اب بھی باقی ہے۔ اس کے سامنے صحن میں فوارے کے اردگرد سفید پتھر کے بنے دو شیر، دو گھوڑ سوار اور دو پریوں کے مجسمے نصب تھے۔ انھیں دیکھ کر راقم کو بڑی خوشی ہوتی تھی۔ اس کے علاوہ ایک اور جگہ میرے لیے جاذب نظر تھی جو گھوڑوں کے ریس کا میدان تھا۔ اس زمانہ میں "لان" کہلاتا تھا اور اب وہ گاندھی میدان کے نام سے مشہور ہے۔ اسی میدان میں اسکول اور کالج کے لڑکے فٹ بال کھیلا کرتے تھے۔ میدان کے پچھم جانب ایک بے ڈھنگی عمارت ہے جس کو گول گھر کہتے ہیں اسے بھی راقم پٹنہ آتے جاتے دیکھتا تھا۔

میرا ختنہ:

راقم اور اس کے بھائی افضل حسین کا ختنہ ایک ساتھ اکتوبر کے آخری ہفتے میں ۱۹۱۱ء میں ہوا۔ برسات کے موسم میں بہورہ کی آب وہوا خراب ہوجاتی تھی اور اکثر وبائیں پھیلا کرتی تھیں۔ گرمیوں اور جاڑوں میں مہمانوں کی پریشانی کے خیال سے مذکورہ مہینہ ختنہ کی تقریب کے لیے مناسب خیال کیا گیا یہ تقریب بڑی دھوم دھام سے منائی گئی اور ختنہ ہونے سے آٹھ دن پہلے ہی سے رشتہ داروں کی آمد

شروع ہوگئی اور واپسی کا سلسلہ تین دن بعد تک رہا۔ کھانے پینے کا نہایت معقول انتظام تھا۔ اس زمانے میں یہ تقریب شادی کے مقابلہ میں کچھ کم دھوم دھام سے نہیں منائی جاتی تھی۔ شادیانے بجتے اور مختلف ماہرین فن اس تقریب میں اپنے فن کا مظاہرہ کرتے تھے۔ ہمارے ختنہ میں پھلواری شریف سے دھمال بلائے گئے۔ انھوں نے اپنے کرتب دکھائے کہ لوگ دنگ رہ گئے۔ اول ان سبھوں نے خوب موٹی موٹی لکڑیاں جلائیں جب انگارے تیار ہو گئے تو اپنے پیر کا گانا گاتے ہوئے ننگے پاؤں ان انگاروں پر چہل قدمی کی اور انھیں ہموار کیا بعد ازاں ان انگاروں پر کباب تیار کیا۔ حاضرین کو خوب گرم گرم کباب کھلایا خود کھایا اور انعام و اکرام حاصل کیا۔ ختنہ سے پہلے ہم دونوں بھائیوں کو نہلا دھلا کر سبز رنگ کا کرتا اور سرخ رنگ کا تہبند پہنایا گیا۔ رمضانی میاں جو ایک ماہر جراح تھے۔ ختنہ کرنے کے لیے پٹنہ سے بلائے گئے۔ بعد نماز ظہر انھوں نے میرا ختنہ اس طرح کیا، پہلے مجھے سونے کی اڑتی ہوئی چڑیا آسمان پر دیکھنے کو کہا اور میں جونہی آسمان کی طرف متوجہ ہوا انھوں نے میرا ختنہ نہایت پھرتی سے کر دیا۔ اسی طرح میرے مجھلے بھائی کا ختنہ بھی کیا۔ بعد نماز مغرب میلاد شریف ہوئی۔ بعد ازاں پر تکلف دعوت پر تقریب کا خاتمہ ہوا۔

شاہ جارج پنجم کی تاج پوشی :

نومبر ۱۹۱۱ء کے آخری ہفتہ میں ہم دونوں بھائیوں کے ختنہ کے اثرات ختم ہو چکے اور چلنے پھرنے کے لائق ہو گئے تھے انھیں دنوں شاہ جارج پنجم کی تاج پوشی کی خبر سے پٹنہ میں بھی جشن کی تیاریاں شروع ہوگئی تھیں۔ ہم دونوں بھائی اپنی والدہ محترمہ کے ساتھ پٹنہ چلے آئے۔ ۱۱ دسمبر ۱۹۱۱ کو دہلی کی جشن تاج پوشی کے سلسلے میں یہاں بھی خوشیاں منائی گئیں۔ فوجی بینڈ کے ساتھ پریڈ ہوئی۔ اسکول کے بچوں میں مٹھائیاں تقسیم ہوئیں اور غریبوں میں کمبل بانٹا گیا۔ راقم کی زندگی میں یہ پہلی چہل پہل تھی جس کو دیکھنے کا موقع ملا۔ والد صاحب نے مجھے اس موقع پر شہنشاہ جارج پنجم اور ملکہ میری کی تصویریں لاکر دیں اسی کے ساتھ کانسے کا میڈل بھی عطا کیا جس پر شاہی جوڑے کی تصویریں منقش تھیں۔ یہ یادگاری میڈل نہایت خوبصورت تھا۔ راقم نے تقریباً پندرہ سال تک اس کو اپنے ساتھ رکھا اور اس کے غائب ہو جانے کا اب تک افسوس ہے۔ اسی دربار کے موقع پر صوبہ بہار واڑیسہ وجود میں آیا۔

نیورہ کے تہوار :

بچوں کی یہ عام فطرت ہے کہ کھیل تماشے اور ایسی تقریبات جس میں انھیں نئی نئی چیزوں کے

دیکھنے کا اتفاق ہوا ان میں شرکت کے منتظر رہا کرتے ہیں ۔ اس بنا پر راقم کو تہواروں سے دلچسپی تھی اور ان کا منتظر بھی رہا کرتا تھا ۔ نیورہ کی آبادی زیادہ تر شریف مسلمانوں پر مشتمل تھی ، اس لیے یہاں مسلمانوں کے ہر تہوار میں خوب رونق اور چہل پہل رہا کرتی تھی ۔ تمام تہوار اپنی روایتی شان سے منائے جاتے تھے ۔

شب برائت :

ابتدا شب برائت سے ہوتی ۔ صبح کے بعد نیورہ کا ہر گھرانہ حلوے کی تیاری میں لگ جاتا تھا ۔ مختلف قسم کے حلوے تیار کیے جاتے تھے ۔ ظہر کی نماز کے بعد نیاز کر کے حلوہ روٹی فقیروں میں تقسیم کرتے اور دوستوں اور رشتہ داروں کے یہاں بھیجتے ۔ اس تہوار میں ہم لوگوں کی دلچسپی حلوہ کھانے اور غروب آفتاب کے بعد پھلجھڑی ، پٹاخے ، مہتابی اور دیگر آتش بازیاں چھوڑنے میں تھیں جو خطرناک نہ ہوں ۔ بزرگوں میں چند حضرات ایسے تھے جو اس بابرکت رات کو قرآن پاک کی تلاوت کرنے ، نفل نمازیں پڑھنے ، خدا سے مغفرت ، کشادگی رزق اور صحت کی دعاؤں میں گذارتے ۔ عورتوں کی زیادہ تعداد شب برائت کو عین اسلامی طریقوں سے مناتی تھیں ۔

رمضان :

مسلمانوں میں رمضان المبارک کا مہینہ بہت مقدس خیال کیا جاتا ہے ۔ نیورہ کے لوگ اس کی آمد کے شوق سے منتظر رہا کرتے تھے ۔ اس لیے نہیں کہ روزہ رکھیں بلکہ ان کی دلچسپی صرف رمضان شریف کے اچھے کھانوں تک محدود تھی ۔ اس گاؤں کی تقریباً ۵۰ فی صد عورتیں روزہ رکھتی تھیں مگر مردوں میں ۲۰ فی صد سے زیادہ روزہ دار نہ ہوا کرتے تھے ۔ ہر گھر میں افطار کا اچھا انتظام رہتا تھا ۔ روزہ دار اور غیر روزہ دار سب پابندی سے افطار کرتے ۔ یہی حال سحری کا تھا والد صاحب فرماتے تھے کہ دادا مرحوم کے یہاں افطار و سحری کھانے کا اچھا اہتمام رہتا تھا ۔ افطار کے وقت والد صاحب ، نوکر اور دیگر حضرات دادا محترم کے ساتھ بیٹھ کر افطار کرتے تھے ۔ دادا مرحوم کے دو وفادار نوکر عبدل میاں اور جیتی سنگھ کہتے تھے کہ ہم لوگوں نے اپنی زندگی میں ایسا کہیں نہ دیکھا جیسا اہتمام اپنے میاں کے یہاں پایا ۔ میاں عصر کے بعد سے افطار اور رات کے کھانوں کے بارے میں خود پوچھتے کہ کیا کیا چیزیں تیار ہیں اور کیا کیا باقی ہیں ۔ اگر کوئی من پسند چیز باقی رہ جاتی تو فرماتے ابھی وقت بہت ہے تیار کر لو اور ضرور تیار کراتے جس طرح دادا مرحوم اس مہینہ میں کھانے وغیرہ کے اہتمام کے

قائل تھے ٹھیک اسی طرح روزہ رکھنے کے بھی قائل اور پابند تھے۔ موصوف کبھی روزہ قضا نہ کرتے، اگر کوئی روزہ طبیعت کی ناسازی سے قضا ہو جاتا تو بعد میں اسے ضرور پورا کر لیتے۔ ان کا معمول تھا کہ کچھ کھا کر نماز میں مشغول ہو جاتے مگر دیگر حضرات افطار کے بعد ہی نماز پڑھتے۔ آپ نماز کے بعد اسی دسترخوان پر سب لوگوں کے ساتھ رات کا کھانا کھاتے۔ سحری میں دادا محترم بہت ہلکی غذا کھایا کرتے تھے۔ مگر دوسروں کے لیے پر تکلف کھانے کا انتظام رہتا تھا۔ وہ خاص طور سے اس مہینے میں باورچی خانے کا انتظام اپنے ہاتھ میں لے لیا کرتے تھے تاکہ کھانے کا معقول اور اچھا انتظام رہے اور عورتوں کو بھی کچھ سہولت ہو۔ دادا مرحوم والد مرحوم اور اپنے دوستوں سے فرماتے تھے کہ ہر تہوار تو ایک دو دن کا ہوتا ہے مگر رمضان شریف تیس دن کا تہوار ہے اور ہر روز نئی خوشیاں اور برکت لاتا ہے۔

عید :

عید انتہائی خوشی کا تہوار ہوتا تھا۔ ہر چھوٹا بڑا انتہائی خوش و خرم رہتا۔ گاؤں کے تمام لوگ اپنی حیثیتوں کے مطابق اچھے کپڑوں میں ملبوس ہوتے۔ والد صاحب اس تہوار کے لیے ایک ماہ قبل ہی شروانی، پائجامہ، کرتا، ٹوپی، رومال، جوتا اور موزہ وغیرہ خرید کر اور سلوا کر بھیج دیا کرتے تھے۔ مختلف قسم کے عطر کا بھی اہتمام رہتا تھا۔ اپنی ملازمت کی وجہ سے والد صاحب تہواروں کے موقع پر گھر نہ آتے تھے۔ ہم دونوں بھائی صبح سویرے نہا کر کپڑے بدلتے اور عطر لگانے کے بعد اپنی زمینداری کے گماشتہ سید ضمیر الدین اور نوکروں کے ساتھ مسجد میں نماز پڑھنے جاتے جس کے امام حافظ محمد عباس ساکن سرائے میر ضلع اعظم گڑھ ہوتے تھے۔ نماز ادا کر کے سب سے گلے ملتے اور گھر آکر اپنے بڑے اور بزرگوں کو سلام کرتے اور عید کی مبارک باد دیتے۔ اس کے بعد اپنے ہم عمر دوستوں اور رشتہ داروں کے ساتھ طرح طرح کی سوئیاں کھاتے اور کھلاتے۔

بقرعید :

عید الفطر کے بعد بقرعید بڑے اہتمام سے منائی جاتی تھی۔ اس تہوار پر عام طور سے نئے کپڑے نہیں سلواتے بلکہ عید ہی کے کپڑوں کا استعمال ہوتا تھا۔ ہم لوگ وہی عید کے کپڑے پہن کر نماز پڑھنے جاتے تھے۔ واپسی کے بعد قربانی ہوتی تھی ہمارے یہاں چھ نہایت فربہ بکروں کی قربانی ہوتی تھی۔ ہمارے گھر میں پردادا کے زمانے سے گائے کی قربانی نہ ہوتی تھی اور آج تک وہی روایت قائم ہے۔ قربانی کا گوشت اسلامی حکم کے مطابق رشتہ داروں اور غربا میں تقسیم کر دیا جاتا تھا۔ باقی گوشت مختلف طرح

سے پکا کر کھایا کرتے تھے۔ قربانی کی تمام ذمہ داریاں سید ضمیر الدین صاحب کے سپرد ہوتی تھیں۔ دسی داناپور سے بکرے خرید کر لاتے اور بعد قربانی گوشت کو کاٹتے چھانٹتے اور شرعی طریقہ کے مطابق اس کی تقسیم کرتے۔ کلیجی انھیں بہت پسند تھی جسے اس موقع پر خوب سیر ہو کر کھاتے اور اللہ کا شکر بجالاتے۔

محرم:

نیورہ میں محرم اہتمام سے منایا جاتا تھا۔ شیعہ، سنی اور ہندو سبھی اس میں دلچسپی لیتے تھے۔ تعزیہ بھی بنایا جاتا اور اسے امام چوک پر رکھتے۔ اس کے بنانے میں باقر میاں اپنی مہارت اور کاریگری کا ثبوت دیتے ہوئے اچھا اور خوبصورت تعزیہ بناتے۔ اس کام میں باقر میاں کے بیٹے پیر شیر ان کے مددگار ہوتے۔ ایسا حسین و خوبصورت تعزیہ بناتے کہ پٹنہ میں بھی کم نظر آتا تھا۔ محرم کے دنوں میں اگر نواب امداد امام صاحب اثر کا نیورہ میں قیام ہوتا تو اس کی رونق دوبالا ہو جاتی۔ وہ خود نوحہ پڑھتے اور ماتم کراتے تھے جس میں باقر میاں پیش پیش رہا کرتے تھے۔ ۹ محرم کو تعزیہ امام چوک پر رکھا جاتا تھا اور جو لوگ "پیک" بنتے تھے وہ ۹، ۱۰ محرم کو تعزیہ کے گرد چکر لگاتے اور بہ آواز بلند "یا حسن" "یا حسین" پکارتے تھے۔ نویں کی شام کو امام چوک کے سامنے نیورہ گاؤں کے بچوں کا ختنہ بھی ہوا کرتا تھا۔ دسویں محرم کو لوگ تلوار بازی اور دیگر جنگی کرتب دکھاتے۔ بعد ازاں شام کو تعزیہ دفن کر دیتے

ہمارے یہاں پہلی محرم سے دسویں محرم کی شام تک دودھ کا شربت روزانہ نیاز کر کے تقسیم کیا جاتا تھا آٹھویں محرم کو حضرت عباسؓ کی "حاضری" ہوتی تھی جس میں روٹی، کباب، حلوہ اور پودینہ کی سبز چٹنیاں ہوتیں اور بعد فاتحہ پاک صاف لوگوں کو کھلائی جاتیں۔ اسی دن میں اپنی دادی جان کی منت کے مطابق امام کا سقہ "بھشتی" بنایا جاتا تھا۔ سبز رنگ کا کرتا پائجامہ پہنتا، کمر میں سرخ رنگ کا کپڑا باندھا جاتا اور چمڑے کی ایک چھوٹی مشک لٹکا دیتے جو شربت سے بھری ہوتی اور ایک چاندی کا پیالہ ہاتھ میں ہوتا جس سے لوگوں کو شربت پلاتا۔ گلے میں چاندی کا ایک طوق ڈال دیا جاتا جو حضرت امام حسینؓ کی غلامی کی نشاندہی کرتا تھا۔ راقم کو بھشتی بننا اچھا نہ معلوم ہوتا تھا مگر اپنی دادی محترمہ کے احترام کا خیال کر کے کچھ نہ کہتا اور دس سال کی عمر تک اس رسم کو جبراً قہراً نبھاتا رہا۔ دسویں محرم کو بہت لذیذ کھچڑہ تیار کیا جاتا۔ نیاز کے بعد لوگوں میں تقسیم کیا جاتا اور خود گھر والے بھی کھاتے۔

بہن کی پیدائش اور میری بسم اللہ:

۱۹۱۲ء کی ابتدا میں میری بہن کی پیدائش ہوئی۔ ہمیں بہت خوشی ہوئی کہ اب ہم لوگ

دو بھائی اور ایک بہن ہو گئے۔ ان کی پیدائش کے چند مہینوں بعد ہم دونوں بھائیوں کی بسم اللہ ہوئی۔ اس تقریب میں کوئی دھوم دھام نہ ہوئی، صرف کچھ رشتہ دار مدعو کیے گئے اور شام کو میلاد شریف کے بعد کھانا کھلایا گیا۔ بسم اللہ کے وقت میری عمر ۷ سال تھی اور بھائی کی عمر ۵ سال۔ ہم لوگوں کی بسم اللہ مولوی محمد حسین صاحب نے پڑھائی جن کے بڑے چچا نے میرے والد صاحب کو بسم اللہ پڑھائی تھی۔ موصوف بہاپورہ گاؤں کے قریب کے رہنے والے تھے۔ رنگ کے صاف تنومند، پنے دار اور داڑھی قریب قریب سفید ہو چکی تھی۔ شاعری کا ذوق بھی رکھتے تھے۔ حمد و نعت انھیں خوب یاد تھیں۔ موصوف ہمیں نہایت خوش الحانی سے ایسی نعت اور حمد جو بچوں کے لیے عام فہم ہوں اور وہ نعتیں جو لاہور سے چھوٹے چھوٹے بچوں کے لیے کتابچوں میں چھپی تھیں سناتے تھے۔ حمد و نعت کو سنتے سنتے اکثر میرا بھائی میرے زانو پر سو جایا کرتا تھا۔ مولوی صاحب کو والدین کی تاکید تھی کہ اللہ، رسول اور بزرگان دین کے احوال نہایت دل چسپ انداز سے بچوں کو سنائیں تاکہ وہ اس کو سمجھ کر اسلام کی طرف راغب ہوں اور انھیں اپنے مذہب سے واقفیت ہو۔ مولوی صاحب نے ہم لوگوں کو تقریباً ڈیڑھ سال تک پڑھایا۔ اس مدت میں انھوں نے قاعدہ بغدادی اور انجمن حمایت اسلام کا اردو کا قاعدہ ختم کرایا۔ اس کے بعد 'عم پارہ' کی کچھ سورتیں یاد کرائیں اور لاہور کی اردو کی پہلی کتاب کا کچھ حصہ پڑھایا تھا کہ گھر اور کھیتی باڑی کی مصروفیت کا عذر کر کے اپنے گھر چلے گئے۔

ریل اور جہاز کا میرا پہلا سفر

والد صاحب نے ۱۹۱۲ء کے آخر میں جب کہ وہ چھپرہ میں ڈپٹی کلکٹر تھے مولوی صاحب کو کہلا بھیجا کہ دونوں لڑکوں کو دو ہفتوں کے لیے چھپرا اپنے ساتھ لائیں تاکہ بچوں کی طبیعت بہل جائے اور شہر بھی دیکھ لیں۔ اس خبر کو سن کر ہم لوگوں کو بہت خوشی ہوئی کہ ریل اور جہاز سے سفر کرنے کا موقع مل جائے گا۔ نیورہ گاؤں میں ریلوے اسٹیشن ہے۔ راقم ریل گاڑیوں کو آتے جاتے دیکھا کرتا تھا لیکن اس پر سفر کرنے کی نوبت نہ آئی تھی۔ پٹنہ سے چھپرہ جانے میں راقم کو جہاز اور ریل دونوں سے سفر کرنے کا موقع ملا۔ ہم لوگ پٹنہ جنکشن سے بذریعہ ریل گاڑی دیگھا گھاٹ پہنچے وہاں سے دریائے گنگا کو بذریعہ جہاز پار کیا اور پہلیزہ گھاٹ گئے۔ چونکہ ہمارا ٹکٹ ریل کے دوسرے درجہ کا تھا اس لیے جہاز کے بالائی حصہ پر بیٹھے اور ساحل کی بستیوں کو دیکھ کر لطف اٹھایا۔ پہلیزہ سے ریل گاڑی کے دوسرے درجہ میں بیٹھ کر سون پور گئے اور وہاں گاڑی بدل کر چھپرہ جانے والی مسافر گاڑی سے

چھپرہ پہنچے۔ والد صاحب اپنے نوکروں کے ساتھ پلیٹ فارم پر منتظر تھے۔ ہم لوگوں کو لے کر قیام گاہ گئے۔ ان دنوں اتری بہار میں لوگ اکثر ان پڑھ ہوتے تھے اس لیے B.N.W.R نے درجہ کے اعتبار سے ڈبوں کا رنگ مختلف رکھا تھا تاکہ لوگ اپنے درجوں کی پہچان آسانی سے کرسکیں۔ پہلے اور دوسرے درجہ کا رنگ بسنتی زرد، ڈیوڑھے (انٹر) درجہ کے ڈبوں کا رنگ عنابی اور تیسرے درجہ کے ڈبوں کا زردی مائل بھورا ہوتا تھا۔

B.N.W.R. کی ریل گاڑیاں چھوٹی لائنوں پر چلتی تھیں، اس کے ڈبے بھی چھوٹے ہوا کرتے تھے اور بڑی لائن کی گاڑیوں کے مقابلہ میں اس کا کرایہ بھی کم ہوا کرتا تھا۔ ہم لوگ خوب گھومے پھرے اور شوق سے ایک نئے شہر کو دیکھا۔

چھپرہ کا قیام:

سب سے پہلے ہم سب منجھلے دادا حاجی امیر حسین مرحوم کے بنگلے پر گئے۔ دادی محترمہ نے ہم دونوں بھائیوں کو بڑے پیار محبت سے دو دن رکھا، اس کے بعد ہم لوگوں نے اپنے چھوٹے دادا خان بہادر حشمت حسین کے یہاں دو دن قیام کیا جو ان دنوں چھپرہ کے ایڈیشنل ضلع مجسٹریٹ و کلکٹر تھے ان کے علاوہ مسٹر رضا بیرسٹر جو ہمارے رشتہ کے چچا سید محمد صدیق کے سالے تھے ان سے بھی ملاقات ہوئی۔ موصوف انگریزی طرز سے زندگی گزارتے تھے، کیونکہ ان کی بیگم انگلینڈ کی میم تھیں جن سے انھوں نے لندن میں شادی کی تھی۔ ان کی ایک لڑکی کی شادی راجہ نانپارہ سے ہوئی تھی۔ میرے چچا مسٹر ریاست حسین بیرسٹر کے سالے سید صالح حسین شوق، رئیس و زمیندار جن کی تعلیم علی گڑھ میں ہوئی تھی اور اپنے آبائی مکان محلہ دہیاواں میں قیام پذیر تھے، ہم لوگ ان کے یہاں بھی گئے۔ اور وہاں سے واپسی پر خان بہادر عبد الصمد صاحب سرکاری وکیل سے ملاقات کے لیے ان کی کوٹھی پر گئے۔ ان کے داماد سید محمد وجیہ صاحب نے میرے والد صاحب کے ساتھ علی گڑھ میں تعلیم پائی تھی اور اپنے سسر کے ساتھ رہا کرتے تھے۔ مسٹر سید فضل علی جو اس وقت چھپرہ میں بیرسٹری کرتے تھے (بعد میں سر کا خطاب پایا، چیف جسٹس اور گورنر ہوئے اور بہت سے اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے) ان کے یہاں ہر دوسرے تیسرے روز ملاقات کے لیے ہم لوگ جایا کرتے تھے۔ وہ محبت سے ملتے اور فراخ دلی سے ہماری ضیافت کرتے تھے اور خود بھی ہمارے یہاں والد صاحب سے ملنے آیا کرتے تھے۔ چھپرہ میں پندرہ سولہ دن قیام کے بعد مولوی محمد حسین صاحب کے ساتھ نیورہ واپس آگئے۔ راقم کو ۱۹۱۲ء

سے آج تک چھپرہ جانے کا بارہا اتفاق ہوا اور تقریباً دو سال تک رہنے کا بھی موقع ملا۔ ڈمہت کمشنری میں ایک نامور شہر ہے۔ اس زمانے میں چھپرہ ایک چھوٹا سا بہت صاف ستھرا اور اچھا شہر تھا مگر اب ایسا نہیں رہا اور اب آبادی کی کثرت کے ساتھ ساتھ یہاں گندگی بھی بہت بڑھ گئی ہے۔

نئے ماسٹر کی تقرری، بھائی کا طاعون میں مبتلا ہونا :

مولوی محمد حسین صاحب کے چلے جانے کے بعد ہمارے پڑھانے کے لیے ایک اتالیق کی تلاش تھی۔ انھیں دنوں ماسٹر عنایت کریم خاں صاحب ساکن رفیع گنج ضلع گیا نوکری کی تلاش میں نیورہ آئے۔ کیونکہ اولڈھم صاحب جو شعبہ افیون کے ایجنٹ تھے ان سے اور ماسٹر صاحب جو اسی شعبہ میں منشی گیری کرتے تھے اختلاف پیدا ہو گیا تھا اور سرکاری نوکری چھوڑ دی تھی۔ اختلاف کی وجہ یہ تھی کہ ان کے پاس ایک بہت اچھا گھوڑا تھا جس کو ان کے کسی دوست نے بچھیڑا کی شکل میں دیا تھا۔ اولڈھم صاحب نے اس کے بارے میں کہا کہ یہ گھوڑا آپ نے رشوت کے پیسوں سے خریدا ہوگا۔ عنایت کریم خاں صاحب نے نہایت رنج و غم کا اظہار کرتے ہوئے فوراً استعفا نامہ لکھ کر ان کو دے دیا۔ اولڈھم صاحب نے کچھ لوگوں کو بلا کر حقیقت حال کی تحقیق کی۔ ان کا استعفا نامہ پھاڑ دیا اور انھیں نوکری سے دست بردار ہونے سے منع کیا لیکن ماسٹر صاحب کی خودداری نے گوارا نہ کیا اور نوکری چھوڑ دی، گھوڑا بھی فروخت کر دیا اور ہماری اتالیقی کی خدمت انجام دینے لگے۔ اسی زمانے میں میرے منجھلے بھائی افضل حسین کو طاعون ہو گیا۔ یہ بیماری ان دنوں وبا کی شکل میں ہوا کرتی تھی اور تقریباً لاعلاج تھی۔ ہم لوگ اس کی جانب سے ناامید ہو گئے۔ مگر ڈاکٹر امیر حسن صاحب نے جن کا مطلب دانا پور میں تھا باوجود ناامیدی کے بخار اور گلٹی کا علاج کیا۔ اللہ کا کرم دیکھیے کہ جان بھی بچ گئی اور کچھ ہی دنوں میں صحت بھی پلٹ آئی۔ فرطِ محبت میں میں اسے "بلبگی چوہا" کہہ کر پکارتا تھا۔ راقم نے دوران علالت بھائی کی صحت کے لیے منت مانی کہ اس کی صحت یابی کے بعد میرے پاس جتنے پیسے ہیں سب کو فقیروں اور ناداروں میں تقسیم کر دوں گا اور میں نے ایسا کیا۔ افضل حسین نہایت ذہین اور محنتی لڑکا تھا، اگر زندہ رہ جاتا تو یقیناً اپنی زندگی میں بہت کامیابی حاصل کرتا مگر افسوس کہ زندہ نہ رہا۔ اس کی جواں مرگی کا راقم کو اب تک صدمہ ہے۔

ڈمکا کا قیام اور پہلی جنگ عظیم

۱۹۱۴ء کی ابتدا میں والد صاحب کا تبادلہ چھپرہ سے ڈمکا ہوا جو سنتھال پرگنہ کا صدر

مقام ہے۔ پٹنہ سے دیوگھر اسٹیشن جانے میں کوئی پریشانی نہ تھی کیونکہ یہ مسافت ریل گاڑی کے ذریعہ طے ہوتی تھی لیکن دیوگھر سے ڈمکا کا سفر بہت تکلیف دہ تھا۔ ڈمکا پہنچنے کے لیے دو ہی قسم کی سواریاں بیل گاڑی اور پالکی گاڑی، دستیاب تھیں ہم لوگ پالکی گاڑی پر ڈمکا جایا کرتے تھے۔ پالکی گاڑیاں ٹھیکیداروں کی ملکیت ہوتی تھیں جن کو وہ کرایہ پر چلاتے تھے۔ دیوگھر سے ڈمکا کی دوری تقریباً ۸۰ کیلومیٹر تھی مگر راستہ بارہ گھنٹوں میں طے ہوتا اور کرایہ صرف دس پندرہ روپیے ہوتا تھا۔ دیوگھر سے ڈمکا تک دو جگہ گھوڑے بدلے جاتے تھے۔ گھوڑے اپنی راہ سے خوب واقف ہوتے تھے، رات ہو یا دن انھیں ہانکنے یا راہ پر لگانے کی کوئی خاص ضرورت نہ ہوتی تھی۔ وہ خود اپنی منزل کی طرف بڑھتے جاتے تھے۔ ہمارا یہ سفر گرمیوں میں رات کو اور جاڑوں میں دن کو ہوا کرتا تھا تاکہ موسم کی تکلیف سے پناہ رہے۔ ۱۹۱۲ء میں اس راہ پر ٹیکسی چلانے کے لیے ڈمکا کے ایک مارواڑی نے ایک کمپنی کھولی تو یہ دوری ٹیکسی سے جلد طے ہونے لگی اور لوگوں کو بہت سی تکلیفوں سے نجات مل گئی۔ ڈمکا جانے کا پہلا اتفاق ۱۹۱۴ء کے وسط میں ہوا اس خیال سے کہ ہم لوگ والد صاحب کے ساتھ رہیں۔ رہائش کے لیے ڈپٹی کلکٹر رابرٹ سن کا بنگلہ انھوں نے کرایہ پر لے لیا۔ ماسٹر صاحب اور ہم سب لوگ والد صاحب کے ہمراہ ڈمکا گئے اور اس بنگلے میں رہنے لگے۔ روزانہ کا معمول تھا کہ پڑھنے لکھنے کے بعد ماسٹر صاحب کے ساتھ سیر و تفریح کے لیے گھر سے باہر جایا کرتے تھے۔ اس زمانے میں یہ شہر خوب صورت اور بہت صاف ستھرا تھا۔ شہر میں بنگالیوں کی تعداد اچھی خاصی تھی ــــ سربرآوردہ لوگوں میں ان لوگوں کا شمار ہوتا تھا۔ سنتھالیوں کی آبادی شہر میں نہ تھی وہ شہر سے باہر اپنی خاص آبادی میں رہتے تھے۔ ان کے مکانات کی دیواریں مٹی کی اور چھپر پھوس کے ہوتے تھے۔ مکان بہت صاف ستھرا ہوتا تھا۔ یہ لوگ شہر میں صرف خرید و فروخت کے لیے آتے یہ لوگ ہفتے میں بازار کے دن شہر آتے، غلہ، بانس کی ٹوکریاں، خانہ ساز چیزیں اور اپنے ہاتھ کے بنائے ہوئے موٹے کپڑے بیچتے تھے۔ عورت مرد دونوں تقریباً برہنہ رہتے۔ عورتیں گھٹنوں تک اپنے بدن کو پوشیدہ رکھتیں اور مرد صرف لنگوٹ (بھٹی) کمر میں باندھ لیتے تھے۔ اس زمانہ میں یہ لوگ بہت ایمان دار اور راست گو ہوتے تھے۔ جرائم کے بہت کم مرتکب ہوتے اور اگر ان میں کوئی کسی جرم کا مرتکب ہوتا تو بازپرسی کے بعد اقرار کر لیتا تھا۔ یہ لوگ ان پڑھ تھے۔ عیسائی مشن کے لوگوں نے انھیں پڑھانے کی کوشش کی مگر یہ لوگ بہت کم راغب ہوتے تھے۔ فطرت کے مطابق

اپنی زندگی بسر کرتے تھے۔ ان کے میلوں میں سب سے مشہور میلہ "ہجلہ کا میلہ" ہے۔ راقم کو ماسٹر عنایت کریم خاں صاحب نے یہ میلہ دکھایا۔ اس وقت یہ میلہ ڈمکا سے دکھن کچھ فاصلہ پر ہجلہ میں لگا کرتا تھا۔ اس میلہ میں سنتھالی لوگ اپنے ہاتھوں سے بنائے ہوئے لوہے کے سامان مثلاً چھری توا اور کچھ باورچی خانے کے سامان لکڑی کے بنے ہوئے کھلونے اور موٹے کپڑے وغیرہ بیچتے تھے یہ میلہ کئی دنوں چلتا تھا جس میں یہ لوگ اپنی زبان میں گانا گاتے، ناچتے اور طرح طرح سے خوشیاں مناتے تھے۔ عورتیں اپنے جوڑوں کو پھولوں سے آراستہ کرتی تھیں۔

۱۹۱۴ء میں جب ہم ڈمکا میں رہتے تھے، پہلی جنگ عظیم کی ابتدا ہو چکی تھی۔ یہاں جنگ کی خبروں کی اطلاع کے لیے سوائے اخبار کے کوئی دوسرا ذریعہ نہ تھا۔ ہمارے والد صاحب کلکتہ سے "اسٹیٹس مین" انگلینڈ سے "لندن ٹائمس" اور بمبئی سے "اسٹریٹنڈ ویکلی" بذریعہ ڈاک منگاتے تھے۔ اس کے علاوہ حکومت ہند ایک نہایت عمدہ اخبار جس کا نام "حقیقت" تھا شائع کرتی تھی جس میں اتحادیوں کی کامیابی کی خبریں بذریعہ تصاویر نہایت آب و تاب کے ساتھ ہوتی تھیں۔ حکومت ہند اس اخبار کو سرکاری ملازمین اور خواص میں تقسیم کرتی تھی تاکہ برطانیہ کے ہمدردوں کی ہمت بڑھی رہے۔ ان دنوں ہمارے والد صاحب چوکیداری کے کلکٹر تھے۔ مہینہ میں کم از کم دس روز دورے پر رہا کرتے تھے۔ ان کے پڑوسی دوستوں میں پادری ملدار صاحب اور پولس انسپکٹر مولوی محمد مسلم صاحب تھے۔ والد صاحب گھر پر ہوں یا نہ ہوں یہ دونوں حضرات روزانہ ضرور آتے۔ چائے کے دوران ملدار صاحب مسلم صاحب کو نہایت وضاحت سے خبروں کا خلاصہ بتاتے اور پندرہ دن کی پرانی خبروں پر تبصرہ کرتے۔ والد صاحب نے یورپی محاذ جنگ کا ایک بڑا سا نقشہ لندن سے منگایا تھا جس کے ساتھ دو بڑی پنوں میں ایک برطانیہ اور ایک جرمنی کا جھنڈا لگا ہوا تھا۔ ملدار صاحب کو روزانہ کی خبریں جو انھیں اسٹیٹس مین میں ملتیں ان کے مطابق ان جھنڈیوں کو ہر روز آگے پیچھے گھٹا کر یا بڑھا کر نصب کرتے اور مسلم صاحب کو سمجھاتے کہ اتحادیوں کی فتح ہو رہی ہے اور جرمنی شکست کھا رہا ہے۔ ماسٹر عنایت کریم خاں صاحب ان سب باتوں کو سن کر خوب ہنستے اور جرمنی کی فتح کے لیے دعائیں کرتے اور فرماتے کہ خبروں میں جب اکثر "گلوریس ریٹریٹ" (Glorious Retreat) کا ذکر رہتا ہے تو اتحادیوں کی فتح کی کیا امید کی جا سکتی ہے یہ کہہ کر وہاں سے کھسک جاتے۔ محمد مسلم صاحب اپنی نوکری کا خیال کر کے بدحواس ہو جاتے کہ جرمن کی فتح کے بعد ہم سرکاری ملازموں کا کیا حشر ہوگا۔ ملدار صاحب بڑی سنجیدگی سے

سے انھیں ڈھارس دلانے کہ متردد نہ ہوں فتح ہماری ہوگی۔ ڈمکا کے لوگوں کو جنگ کی خبروں سے کوئی دل چسپی نہ تھی۔ انھی دنوں یہاں سپاہیوں کی بھرتی شروع ہوگئی اور لوگ بھرتی ہونے لگے۔

ڈمکا ضلع اسکول میں داخلہ اور تعلیم :

جنوری ۱۹۱۶ء میں ڈمکا کے ضلع اسکول میں راقم کا داخلہ چھٹی جماعت میں اور منجھلے بھائی کا داخلہ پانچویں جماعت میں ہوا۔ داخلہ سے پہلے ہی ماسٹر عنایت کریم خاں صاحب نے ہم لوگوں کو لے جاکر اسکول دکھایا اور ہیڈ ماسٹر صاحب سے ملاقات بھی کرائی۔ موصوف ذات کے کایستھ تھے۔ وضع قطع سے بالکل مسلمان نظر آتے تھے۔ داخلہ کے بعد ہیڈ ماسٹر صاحب نے ہمارے کلاس ٹیچر سے ہماری ملاقات کرائی اور جماعت میں بٹھا کر کتابوں کی فہرست ہمارے حوالہ کی۔ انگریزی ریڈر کے علاوہ ہماری سب کتابیں اردو زبان میں تھیں۔ طالب علموں کو اختیار تھا کہ امتحانوں میں جوابات اردو، ہندی، بنگلہ جس زبان میں چاہیں لکھیں۔ ساتویں جماعت تک تعلیم اردو ہندی میں ہوتی تھی اور آٹھویں جماعت سے میٹرکولیشن تک انگریزی زبان میں پڑھائی ہوتی تھی۔ ساتویں درجہ تک کی کتابیں ہندی اور اردو زبان میں میک ملن کی شائع کردہ ہوتی تھیں اور مضامین وطباعت کے لحاظ سے بھی مناسب تھیں۔ ہمارے کلاس کی انگریزی ریڈر لونگ مینس گرین کی چھپی ہوئی عمدہ تصویروں سے مزین تھی۔ جسے ہم لوگ شوق سے دیکھتے اور پڑھتے تھے۔ اس کا پہلا سبق انگلینڈ سے متعلق تھا۔ راقم کو اس سبق کا پہلا جملہ ——— "Imagine that you are in England" آج تک یاد ہے۔ سبق میں انگلستان کے لوگوں کے متعلق، ان کے باغات، تفریح گاہ اور مناظر قدرت کا ذکر تھا۔ اس کے دوسرے سبق میں ہندوستان کے شہروں، اس کے خوب صورت مقامات اور یہاں کی خوب صورت چیزوں کا بیان تھا۔ نثر کے علاوہ اس میں چھوٹی چھوٹی دل چسپ نظمیں بھی تھیں جنھیں زبانی یاد کرنے کی بہت تاکید کی جاتی تھی۔ ہمارے انگریزی کے استاد ان نظموں کو ہم لوگوں سے زبانی سنا کرتے تھے۔ انگریزی کے علاوہ اردو تاریخ ہند، جغرافیۂ ہند، اصول صحت، سائنس اور حساب کی تعلیم ہوتی تھی۔ اس زمانے میں اساتذہ نہایت محنت سے اپنے فرائض منصبی کو انجام دیتے۔ اپنے شاگردوں کو اپنی اولاد سمجھتے اور شفقت سے پیش آتے تھے۔ میرے درجہ کی اردو ریڈر بنام "حبیب اردو" مؤلفہ حبیب اللہ صاحب ڈپٹی کلکٹر نہایت عمدہ کتاب تھی۔ اس کی ایک نظم جس کا موضوع ایک یتیم بچے کا اپنی جنت رسیدہ ماں کی شکایت اور اس سے اپنے احوال کا بیان تھا۔ اس کی ابتدا "پیاری اماں لیجیے میرا سلام" سے تھی اور اس قدر

اثر انگیز بھی کہ راقم اسے اب تک نہ بھول سکا اور آج بھی اس کی غم ناکی کا نقش دل پر ہے۔ ڈرائنگ اور خوش نویسی بھی نصاب کا اہم جزو تھا۔ اساتذہ اس کے عملی کاموں کی طرف خصوصی توجہ دلاتے اور اپنی نگہداشت میں اس کی مشق کراتے۔

آرہ ضلع اسکول میں تعلیم :

۱۹۱۶ء میں والد صاحب کا تبادلہ ڈمکا سے آرہ ہوا تو ہم لوگوں نے آرہ ضلع اسکول میں داخلہ لے کر پڑھنا شروع کیا۔ آرہ ضلع اسکول میں میرے ہم جماعت ریاست حسین تھے جو بعد میں ڈاکٹر ہوئے، اور زندگی بھر راقم سے محبت اور خلوص سے ملتے رہے۔ ان کے بھائی مسٹر حفاظت حسین جو بعد میں انڈین سول سروس کے امتحان میں لندن جاکر کامیاب ہوئے، اس زمانہ میں اپنی تعلیم اسی اسکول میں ختم کر رہے تھے۔ پانچ مہینے یہاں پڑھ پائے تھے کہ پھر والد صاحب کا تبادلہ نومبر میں سہسرام ہو گیا۔ غرض ایک سال کا زمانہ دو اسکولوں میں گذرا۔ آخر کار سہسرام ہائی اسکول میں تیسری مرتبہ داخلہ لے کر چھٹی جماعت کا امتحان دیا اور اچھے نمبروں سے پاس ہو کر ساتویں جماعت میں داخل ہوئے۔ یہاں مسلسل تین سال رہنے کا اتفاق ہوا اور دلچسپی سے سہسرام میں پڑھنے کا موقع ملا۔

سہسرام ہائی اسکول میں تعلیم

اس زمانے میں سہسرام ہائی اسکول ایک اچھا اسکول تھا۔ یہاں درس و تدریس کا کام دوسرے اسکولوں کے مقابلہ میں منظم اور معیاری تھا۔ راقم کا تجربہ ہے کہ ڈمکا ضلع اسکول اور آرہ ضلع اسکول کی بہ نسبت یہاں کے اکثر اساتذہ بہت قابل تھے اور درس و تدریس کے کاموں میں صلاحیت اور باقاعدگی کا مظاہرہ کرتے۔ طلبا کی بہتری و بھلائی کا ہمیشہ خیال رکھتے۔ راقم کا داخلہ جب اسکول میں ہوا تو عبدالکریم صاحب ہیڈ ماسٹر تھے۔ ان کے بعد شاہ محمد حامد صاحب ہیڈ ماسٹر ہوئے۔ اسکول کے نظم و نسق اور درس و تدریس کی پابندی اور باقاعدگی میں ان دونوں شخصیتوں کا اہم رول تھا۔ ان کی نگہداشت کی وجہ سے اساتذہ اپنی خدمات بہت جاں فشانی اور دلچسپی سے انجام دیتے تھے۔ ہمارے اسکول کے استادوں میں ابو نصر خاں صاحب اور شاہ امجد حسین صاحب انگریزی کے اچھے استاد تھے۔ اکرام الحق، عبدالقیوم انصاری، وحید اور اظہر ہمارے ہم جماعت اور عزیز دوستوں میں تھے۔ عبدالقیوم انصاری تعلیم ختم کر کے سیاست میں داخل ہوئے۔ کئی بار بہار گورنمنٹ کے مختلف شعبوں کے وزیر رہے اور تا حیات دوستی کا حق ادا کرتے رہے۔ وحید اور اظہر انتقال کر گئے

ہیں۔ اکرام بقید حیات ہیں اور ایڈوکیٹ کی حیثیت سے فارغ البالی کی زندگی گزار رہے ہیں۔ انھیں بڑی عزت حاصل ہے۔ حج کیا ہے اور زیارت مدینہ منورہ سے بھی مشرف ہوئے ہیں۔ بہت پرخلوص اور نیک طبیعت انسان ہیں۔ خدا ان کی عمر دراز کرے۔ اکرام الحق کے خلوص و دوستی کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ جب میں بی۔ اے آنرس کے امتحان میں فرسٹ کلاس فرسٹ آیا تو انھوں نے سب سے پہلے مجھے اس کی اطلاع اور مبارک باد ۱۲/اپریل ۱۹۲۶ء کو بذریعہ تار بھیجا۔ یہ تار آج بھی میرے پاس اپنی اصل شکل میں محفوظ ہے۔

مظفر پور ضلع اسکول میں تعلیم :

دسمبر ۱۹۱۹ء میں والد صاحب کا تبادلہ سہسرام سے مظفر پور بحیثیت مجسٹریٹ ہوا۔ ان دنوں حکومت بہار ہر ڈویژن میں ایک معیاری ضلع اسکول چلاتی تھی۔ ایسے اسکولوں کی تعداد صوبہ بہار واڑیسہ میں صرف پانچ تھی۔ یہ اسکول پٹنہ، بھاگل پور، مظفر پور، رانچی اور کٹک میں قائم تھے۔ ان اسکولوں کے ہیڈ ماسٹر انگریز یا بہت تجربہ کار اور ہوشیار ہندوستانی ہوا کرتے تھے۔ جس زمانے میں راقم نے اس اسکول میں داخلہ لیا، اس کے ہیڈ ماسٹر بابو کسی پرشاد تھے جو بحیثیت استاد اور منتظم پورے بہار میں بڑی شہرت رکھتے تھے۔ دو ماہ بعد ان کی پنشن ہوگئی تو بابو بسنتو کمار متر ان کی جگہ ہیڈ ماسٹر ہوئے۔ وہ بلند قامت اور بلند آواز تھے۔ پورے اسکول پر ان کا رعب اور اثر غالب تھا۔ یہ ہمیں انگریزی نظمیں پڑھاتے تھے اور خوب پڑھاتے تھے۔ پنشن کے بعد پٹنہ میں قیام کیا اور تقریباً اسّی سال کی عمر میں یہیں ان کا انتقال بھی ہوا۔ پٹنہ بینک روڈ پر ان کے دو رہائشی مکانات ہیں۔ میں جب کبھی ملاقات کے لیے ان کے یہاں جاتا بہت خوش ہوتے اور شفقت سے پیش آتے۔ اگر راہ میں مل جاتے تو رک کر خیریت پوچھتے اور خوب باتیں کرتے۔ سید خورشید احسن صاحب ایم اے، تاریخ انگلستان، مولوی عبدالقدوس صاحب فارسی اور خورشید حسن صاحب جو جمیل مظہری کے والد بزرگوار تھے، اردو پڑھاتے تھے۔ یہ تینوں اساتذہ اپنے مضمون پر پورا عبور رکھتے تھے۔ جب مسٹر سید سلطان احمد صاحب ہائی کورٹ کے جج مقرر ہوئے تو خورشید حسن صاحب نے ایک عمدہ مثنوی لکھ کر مبارک باد پیش کی۔ یہ مثنوی فنی اعتبار سے خوب تھی اور طبع ہو کر دوست احباب میں تقسیم ہوئی تھی راقم کے پاس بھی یہ مثنوی تھی مگر اس وقت دستیاب نہیں، گم ہو جانے کا افسوس ہے۔ یہاں کے ہم جماعتوں میں عزیز ترین دوست عبدالصمد، کاظم علی (جمیل مظہری) اور ابو صالح تھے۔ تعلیم کے

بعد ایڈوکیٹ ہوئے، پھر سرکاری وکیل مقرر ہوئے۔ اللہ کے فضل سے باحیات ہیں۔ ان کی تمام اولاد عروج پر ہیں۔ بڑے لڑکے پاکستان میں ڈائرکٹر جنرل آف پولس کے جلیل القدر عہدہ پر فائز ہیں۔ ابو صالح مولوی عبدالقدوس صاحب کے لڑکے تھے۔ بی۔ اے پاس کر کے سکریٹریٹ میں ملازم ہوئے۔ پچاس ہی سال کی عمر میں قضا کر گئے۔ کاظم علی جو بعد میں جمیل مظہری کے نام سے مشہور ہوئے اردو ادب میں اپنا ایک مقام رکھتے ہیں۔ راقم کے ساتھ پٹنہ کالج میں اردو کے پروفیسر تھے۔ افسوس کہ ان کی کوئی اولاد نہ ہوئی۔

میٹرک کے امتحان میں میری کامیابی:

مئی ۱۹۲۱ء میں والد صاحب چھ مہینے کے لیے اسپیشل ڈیوٹی پر مظفر پور سے پٹنہ آئے اور اپنے ساتھ ہم لوگوں کو بھی لائے۔ راجہ بھوپ بہادر کے مکان واقع گلزار باغ میں قیام کیا۔ راقم یہیں اکتوبر ۱۹۲۱ء میں ملیریا بخار کا شکار ہوا۔ ڈاکٹر علی احمد صاحب کے علاج سے کچھ افاقہ تو ہوا مگر بالکل صحت یاب نہ ہوا۔ اس لیے علاج وطبی معائنہ کے لیے کلکتہ گیا۔ بیماری کی وجہ سے میٹرک کے امتحان میں شرکت ناممکن نظر آرہی تھی۔ حسن اتفاق سے جب اپنے خالو عبدالرحیم کے یہاں مقیم تھا ڈاکٹر حسان سہروردی جو اس وقت ریلوے کے بڑے ڈاکٹر (چیف میڈیکل افسر) تھے اور بعد میں سر کا خطاب پایا اور کلکتہ یونی ورسٹی کے وائس چانسلر ہوئے، سے ملاقات ہوگئی۔ میں نے ان سے پریشانی کا ذکر کیا۔ انھوں نے میری بڑی حوصلہ افزائی کی اور اپنے اثر ورسوخ سے ایک ہفتہ کے اندر ہی کلکتہ یونی ورسٹی سے میٹرک میں شرکت کا اجازت نامہ ایک اسکول کے حوالہ سے حاصل کر کے مجھے دیا۔ میں نے فیس داخل کی اور امتحان میں شریک ہوا۔ خدا کے فضل سے امتحان اول درجہ میں امتیازی نمبروں کے ساتھ پاس کیا۔ اس طرح راقم کے اسکول کی تعلیم کامیابی سے اختتام کو پہنچی۔

دُوسرا باب

کالج کا زمانہ

(۱) جی۔ بی۔ بی۔ کالج مظفر پُور
(۱۹۲۲ء سے ۱۹۲۴ء)

جی۔ بی۔ بی۔ کالج مظفر پور میں داخلہ :

راقم نے جولائی ۱۹۲۲ء کے پہلے ہفتہ میں گرمیوں کی تعطیل کے بعد گریر بجو میہار برہمن کالج جو آج کل لنگٹ سنگھ کالج کے نام سے مشہور ہے داخلہ کے لیے گیا۔ پرنسپل مسٹر ٹی۔ بی۔ آر گل سے ان کی آفس میں ملاقات کر کے انٹرمیڈیٹ کے سال اول میں داخلہ کے لیے اجازت نامہ حاصل کیا۔ دوسرے دن فیس داخل کر کے داخلہ کی کارروائی مکمل کر لی۔ اس زمانہ میں اردو اور انگریزی لازمی تھیں۔ ان کے علاوہ میں نے فارسی، تاریخ اور منطق کا انتخاب کیا۔ چار پانچ دن کے بعد باقاعدہ پڑھائی شروع ہوگئی اور میں کلاس میں حاضر ہونے لگا۔ انٹر سال اول کے کلاس روم کا ایک مخصوص کمرہ تھا جہاں ہمارے تین مضامین انگریزی، منطق اور تاریخ کا درس ہوتا تھا۔ اردو اور فارسی کا شعبہ کالج کی پرانی عمارت میں تھا جہاں ان کی پڑھائی ہوتی تھی۔

انگریزی کے اساتذہ :

راقم کو خوب یاد ہے کہ انگریزی کے پروفیسر بشویشور چٹرجی نے سب سے پہلے رسکن کا جو انگریزی کا مشہور نثر نگار تھا، تعارف کرایا۔ دوسرے دن سے اس کی کتاب "SESAME & LILIES" پڑھانا شروع کیا۔ موصوف انگریزی کے باصلاحیت استاد تھے اور اس انداز سے پڑھاتے کہ سبق خوب ذہن نشیں ہوجاتا۔ ان کی صحت کچھ اچھی نہ تھی اس لیے اپنے طالب علموں کو صحت کی طرف توجہ دینے کی سخت تاکید کیا کرتے تھے۔ درس و تدریس کے علاوہ ہومیوپیتھک علاج بھی کرتے تھے۔ سال

دوم میں انھوں نے ہمیں Dickens کا ناول "Cloister & the Hearth" پڑھایا۔ پروفیسر بندیشوری پرشاد انگریزی نظم Lady of the Lake پڑھاتے تھے۔ چونکہ وہ اسکاٹ لینڈ اور وہاں کے ماحول سے واقف نہ تھے اس لیے باوجود کوشش اس نظم کو عمدہ و خوبی نہیں پڑھاتے تھے۔ سال دوم میں انھوں نے Tennyson کی نظم Enoch Arden کسی طرح پڑھایا۔

منطق کے اساتذہ :

پروفیسر لگن گھوش اور پروفیسر جیون کرشن سرکار منطق پڑھاتے تھے۔ جیون بابو اس خوبی سے پڑھاتے تھے کہ پھر مطالعہ کی ضرورت بہت کم محسوس ہوتی تھی۔ لگن بابو جو کچھ پڑھاتے تھے میری سمجھ میں نہیں آتا تھا اس لیے جیون بابو سے دو ماہ Deductive logic ٹیوشن فیس دیکر پڑھا۔

تاریخ کے اساتذہ :

تاریخ کے تین پروفیسر تھے جن کے نام مسٹر رام پرشاد کھوسلا ناشاد، بابو شیب ناتھ بوس اور بابو اتول نند سین تھے۔ پروفیسر رام پرشاد کھوسلا نے ہمیں سال دوم میں انگلستان کی تاریخ پڑھائی۔ موصوف تاریخ کے مشہور و معروف اور ماہر استاد تھے۔ کلاس میں داخل ہونے کے بعد پڑھانے میں مصروف ہو جاتے۔ درس کے علاوہ کبھی کوئی دوسری گفتگو یا تضیع اوقات نہ کرتے۔ اپنی ملازمت کے فرائض تندہی اور حسن و خوبی سے انجام دیتے۔ موصوف تاریخ اس قدر دل چسپ انداز میں پڑھاتے کہ ہم لوگ ان کے لکچر کے دن کا انتظار اشتیاق سے کرتے تھے۔ بابو شیب ناتھ بوس کو ہندو عہد کی تاریخ پر بہت عبور تھا ایسا لگتا تھا کہ ہندو دور کی تواریخ ان کی نوک زبان پر ہے۔ موصوف کچھ اونچا سنتے تھے مگر درس و تدریس میں اس سے کچھ خلل نہ پڑتا تھا۔ بابو اتول نند سین کو اگرچہ تواریخ سے پوری واقفیت تھی مگر پڑھانے کی صلاحیت کم تھی، لڑکوں کو خوش کرنا خوب جانتے تھے۔ ان کا زیادہ وقت کالج کے انتظامی امور میں صرف ہوتا تھا۔

اردو اور فارسی کے اساتذہ :

اردو اور فارسی کے ہمارے تین پروفیسر رائے صاحب اودھ بہاری سنگھ، مولانا عبدالماجد اور حافظ شمس الدین احمد تھے۔ حافظ صاحب شاعر تھے اور ثاقب گوالیاری کے شاگرد تھے۔ آپ فارسی کم اور اردو زیادہ پڑھاتے تھے۔ دونوں زبانوں کے اچھے عالم تھے۔ اقبال کی نظمیں راقم کو

پہلے پہل انہی سے پڑھنے کا اتفاق ہوا۔ "شکوہ" "جواب شکوہ" "خضرراہ" وغیرہ نظمیں بہت جذبے سے پڑھاتے تھے۔ موصوف نے خضرراہ کا شعر ؎

کہہ رہا ہے مجھ سے اے جویائے اسرارِ ازل
چشم دل وا ہو تو ہے تقدیر عالم بے حجاب

کی تشریح اس خوبی سے بیان کی کہ مجھے آج تک یاد ہے۔ اردو نظموں کے علاوہ کچھ فارسی نظمیں جو داخل نصاب تھیں ان سے پڑھی گیئں جب ہم لوگ سال اول سے سال دوم میں گئے تو ان کا تبادلہ بحیثیت لکچرر قانون گنگ کالج میں ہوگیا۔ بہت دنوں بعد پٹنہ کالج کے اردو و فارسی کے پروفیسر کی حیثیت سے آئے اور صدر شعبہ اردو پٹنہ یونیورسٹی ہوکر پنشن پائی۔ بہت خوب آدمی تھے۔ سیر و شکار کے بہت شوقین تھے۔ مولانا سید عبدالماجد صاحب بوستان سعدی اور پند نامہ عطار بہت اچھے انداز سے پڑھاتے تھے۔ یہ دونوں کتابیں اخلاقیات کی بلند ترین کتابوں میں ہیں اور ان کا درس دیتے دیتے اس قدر اثر پذیر ہو گئے تھے کہ مولانا کی زندگی قناعت اور خوش اخلاقی کا نمونہ بن گئی تھی۔ ملازمت کی پوری مدت مظفرپور میں گذری۔

رائے صاحب اودھ بہاری سنگھ :

رائے صاحب پروفیسر اودھ بہاری سنگھ ہم لوگوں کو فارسی نثر میں انوار سہیلی اور اخلاق محسنی پڑھاتے تھے۔ موصوف اسلامیات کے بڑے ماہر تھے۔ پڑھانے کا انداز نہایت دل پذیر تھا۔ ان کتابوں کو پڑھاتے وقت قرآن و حدیث، مثنوی مولانا روم اور حافظ کے اشعار کا حوالہ دے کر اپنے لکچر کو دلچسپ بنا دیتے تھے جس سے ان کی علمی بصیرت کا اظہار بھی ہوتا تھا۔ ان کی زندگی اسلامی قدروں کا نمونہ تھی۔ ان کی زبان سے ہندو مسلم تفریق کا کبھی اظہار نہ ہوا۔ ایک دو گہرے دوستوں کے علاوہ کوئی نہ جان سکتا تھا کہ ان کا مذہب کیا ہے۔ وہ تمام مذاہب کا احترام کرتے اور اسلام سے بہت متاثر تھے۔ بیک وقت چہرہ پر داڑھی اور سر پر ٹوپی تھی۔ بت پرستی کبھی نہ کی اور نہ کبھی کوئی ہندو تہوار منایا۔ ایک بار جب میں اپنے بھائی کی موت کی خبر دینے گیا تو دیکھا کہ نماز مغرب میں مصروف ہیں۔ بعد نماز راقم سے کچھ باتیں ہوئیں اور پھر میں نے بھائی کی موت کی خبر سنائی تو یہ شعر پڑھا ؎

عنقائی مزیبیت درین دہر خرمی
خاص از برای محنت و رنج است آدمی

شاید ان میں اتنی اخلاقی جرات نہ تھی کہ اپنے مسلمان ہونے کا اعلان اپنی زبان سے کرسکیں۔ ان کی موت کے بعد ہندو مسلمان دونوں نے اپنے اپنے طور پر آخری رسومات ادا کرنا چاہی تو پروفیسر رام پرشاد کھوسلا ناشاد جو مرحوم کے ہمراز تھے انھوں نے یقین دلایا کہ اودھ بہاری بابو ہندو تھے اس لیے انھیں نذر آتش کیا گیا۔

جی۔بی۔بی کالج کی عمارت :

ہمارا مظفرپور کالج اس زمانے میں ایک مشہور کالج تھا۔ اس کے پرنسپل مسٹر آرگل کہا کرتے تھے کہ کالج کی عمارت کی ساخت میں مشرقی و مغربی دونوں طرز تعمیر کو دخل ہے۔ طلبا کی سہولت کے خیال سے ہوسٹل بھی کالج کی عمارت میں بنایا گیا ہے۔ شعبۂ سائنس، شعبۂ آرٹس سے بالکل الگ تھا۔ کالج کے اسی فی صد اساتذہ بنگالی تھے۔

بزم سخن اور پروفیسر کھوسلا :

کالج میں ایک اردو ادبی سوسائٹی تھی جس کا نام بزم سخن تھا، پروفیسر رام پرشاد کھوسلا ناشاد اس بزم کے صدر تھے اور حافظ شمس الدین احمد اس کے روح رواں تھے۔ ماہ دو ماہ پر اس بزم کی نشست ہوا کرتی تھی۔ طیب صدیقی جو بی اے آنرس سال چہارم میں تاریخ کے طالب علم تھے بزم کی ہر نشست میں اپنی ایک مزاحیہ نظم ضرور پیش کرتے۔ بزم کی شان پروفیسر رام پرشاد کھوسلا اور حافظ شمس الدین احمد سے تھی ان کی نظمیں سننے کے لیے لوگ بے صبری سے منتظر رہا کرتے اور سنتے وقت خوب داد دیتے تھے۔ پروفیسر رام پرشاد کھوسلا ناشاد کی ایک غزل جو مجھے یاد نہیں ہے بہت پسند کی گئی، مقطع کا ایک شعر ملاحظہ ہو ؎

پڑھے گا ناشاد سارا عالم ہماری روداد زندگی کو
یہ درد الفت کا ہے فسانہ یہ حسرت و غم کی داستاں ہے

برخلاف اپنے دوست بابو اودھ بہاری سنگھ کے، پروفیسر کھوسلا ناشاد ہندو مذہب، اس کی تعلیمات اور معاشرت کے زبردست قائل تھے جس کا اظہار ان کی بیشتر نظموں سے ہوتا ہے۔ مسٹر کرشن کمار کھوسلا جو پروفیسر رام پرشاد کھوسلا کے صاحبزادے تھے اور ٹاٹا کمپنی جمشید پور میں عرصے تک ملازم رہے ان کی ایما پر پروفیسر عبدالمنان بیدل، پروفیسر حافظ شمس الدین اور راقم نے دیوانِ ناشاد کی ترتیب و تصحیح کے بعد اسے طبع کرایا اور اس کی تمام جلدیں کرشن کمار صاحب کے یہاں

بھیج دی گئیں۔ دیوان بازار میں نہیں ہے۔

ہمارے پرنسپل مسٹر ارگل :

ہمارے پرنسپل Mr. T. C. Orgill نہایت شریف حلیم الطبع اور کم سخن انسان تھے حکومت ہند ان کی بڑی عزت کرتی تھی۔ باوجودیکہ جونیر تھے انھیں صوبہ سرحد کا ڈائرکٹر آف پبلک انسٹرکشنس بناکر پشاور بھیج دیا گیا جہاں اپنے کاموں کو حسن اسلوبی سے انجام دینے کی بدولت بڑی ناموری حاصل کی۔ پشاور جاتے وقت میں نے صوبہ سرحد کی تین تصویریں NEWMANS کے یہاں سے منگا کر جب ان کی خدمت میں پیش کیں تو وہ بہت خوش ہوئے۔ موصوف ہر انگریزی کی طرح اپنی زبان تہذیب اور تمدن کے بڑے دلدادہ تھے۔ چونکہ راقم انگریزی لباس معمولاً پہنتا تھا اور انگریزی بولتا بھی تھا اس لیے مجھ پر بہت مہربان رہا کرتے تھے۔ ان کے تبادلہ کے بعد مسٹر مور (Mr. W. T. Moore) ہمارے کالج کے پرنسپل مقرر ہوئے۔ آئرلینڈ کے رہنے والے نیک اور خوش مزاج انسان تھے۔ مور صاحب کے دور میں ہم لوگوں کی میٹرکولیشن سیرمنی ۵ اپریل ۱۹۲۴ء کو منعقد ہوئی جس میں مسٹر سید سلطان احمد نے جو اس وقت پٹنہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے ہم لوگوں سے خطاب کیا اور طلبا کو محنت سے پڑھنے لکھنے کی تاکید کی۔ آج سے پچاس سال پہلے یہ رسم لازمی تھی مگر اب یہ رسم بالکل ختم ہوگئی ہے۔ رفتہ رفتہ ہر اچھی چیز ختم ہوتی جارہی ہے اب تو University Convocation بھی نہیں ہوتا ہے۔

میرے احباب :

ابوصالح، عبدالصمد، زین العابدین اور بریج رکھن سین جماعت میں راقم کے مشفق دوست تھے۔ زین العابدین منصف ہوئے اور بریج رکھن سین سکریٹریٹ میں انڈر سکریٹری رہے جو اس زمانے میں زیادہ تر آئی سی ایس ہی ہوا کرتے تھے۔ یہ دونوں حضرات انتقال کر گئے ہیں۔ عبدالصمد بقید حیات ہیں پچاس سال کے عرصہ تک سے اب تک وکالت کا پیشہ کرتے ہیں۔ سرکاری وکیل بھی رہ چکے ہیں۔ بڑی عزت سے زندگی گزارتے ہیں۔ دوسرے دوست ابوصالح بہار کے سکریٹریٹ میں ملازم تھے۔ موت سے پہلے راقم اور جمیل مظہری کو ملاقات کے لیے بلایا مگر قبل اس کے کہ ہم لوگ ان کے یہاں جائیں وہ انتقال کر گئے۔

سید حسن عسکری :

سید حسن عسکری کالج میں مجھ سے دو تین سال سینیر تھے۔ ہمیشہ محنتی طالب علم رہے اور ابتدا ہی سے مطالعہ تاریخ میں بڑی دلچسپی تھی۔ پڑھنے لکھنے کے علاوہ انھیں کسی اور کام سے سروکار نہ تھا، عمر کے ساتھ تاریخ نویسی میں ایک مقام پیدا کیا۔ تاریخ نویسی کی خدمات کے صلے میں پٹنہ یونی ورسٹی اور مگدھ یونیورسٹی دونوں نے موصوف کو "ڈی لٹ" کی اعزازی ڈگری سے نوازا جس کے وہ مستحق تھے۔ حسن عسکری صاحب منکسر مزاج انسان ہیں۔ نام و نمود کی کبھی پروانہ کی۔ اور زندگی عزت و خاکساری سے گذار رہے ہیں۔ مرنجان مرنج کے اصول پر قائم رہے ہیں۔ راقم کو کٹک کالج سے پٹنہ کالج آنے کے بعد ان کے ساتھ ۲۵ سال تعلیمی خدمات انجام دینے کا موقع ملا مگر کبھی کسی بات پر اختلاف کی نوبت نہ آئی۔ دوران تعلیم ہی سے مزاج مذہبی ہے، اور ہمیشہ سے صوم وصلوٰۃ کے پابند ہیں۔ انگریزوں کے زمانے میں "خانصاحب" ہوئے اور ۱۹۸۵ء میں "پدم شری" کے خطاب سے سرفراز کیے گئے۔ اس کے علاوہ آپ کو فارسی زبان کی خدمت کے لیے پریسیڈنٹ ایوارڈ بھی عطا کیا گیا اور غالب ایوارڈ بھی دیا گیا۔

سر سی۔ پی۔ این سنگھ، سری نرائن مہتا اور مسٹر اوما شنکر پرشاد :

سر سی۔ پی۔ این سنگھ نے انگریزوں کے دور میں اور آزادی کے بعد بھی بے انتہا عزت حاصل کی۔ پنجاب اور یوپی کے گورنر ہوئے اور کئی ملکوں میں ہندوستان کے سفیر بھی رہے۔ صاحب موصوف راقم سے کالج میں تین سال آگے تھے۔ مسٹر شری نرائن مہتا ان کے ساتھی تھے۔ انھوں نے بھی بڑی شہرت حاصل کی۔ سر سید سلطان احمد جو پٹنہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر رہ چکے تھے۔ ان کے مقابلہ میں پٹنہ یونیورسٹی سنڈیکیٹ کے الکشن میں کامیاب ہوئے۔ مسٹر شری نرائن مہتا میرے پڑوس میں جیل روڈ پر اپنے رشتہ دار رائے بہادر کرشن دیو نرائن مہتا کے ساتھ رہتے تھے۔ رہائشی قربت کی وجہ سے میری ان سے کافی ملاقات تھی۔ ان کی شادی بڑی دھوم دھام سے ہوئی تھی۔ برات میں راقم بھی شریک تھا۔ مسٹر اوما شنکر پرشاد بابو مہیشر پرشاد رئیس، زمیندار اور اردو شاعر کے صاحبزادے تھے اور والدین نے انھیں بڑے ناز و نعم سے پالا تھا۔ راقم کے منجھلے بھائی افضل حسین اسکول اور کالج میں ان کے ہم جماعت تھے۔ اپنے بڑے بھائی کی طرح میری عزت کرتے تھے اور زندگی بھر اسی انداز سے ملتے رہے۔ موصوف بڑے ملنسار اور دوست نواز آدمی تھے۔ جوانی میں خورد تھے مگر آخری عمر میں کافی موٹے ہو گئے۔ سماجی، تعلیمی اور سیاسی کاموں میں پیش پیش رہا کرتے

تھے۔ موسیقی کے ماہر تھے۔ اس فن سے تاحیات دل چسپی قائم رہی۔ چند سال ہوئے کہ انتقال کر گئے۔ مظفر پور کے نہایت ہر دل عزیز شہری تھے۔ راقم کو آج بھی مظفر پور کالج سے دلی لگاؤ ہے۔ جب بھی مظفر پور یونیورسٹی کے کاموں سے جانے کا اتفاق ہوتا ہے یونیورسٹی کے مہمان خانہ کی بالائی منزل پر قیام کرتا ہوں جہاں سے ہمارا کالج اپنی پرانی شان و شوکت کے ساتھ نظر آتا ہے۔ اگلی صحبتیں اور پرانے احباب سب نظر کے سامنے آجاتے ہیں، اور آنکھ سے آنسو نکل آتا ہے۔ پروفیسر کشور جب تک بہار یونیورسٹی کے وائس چانسلر رہے راقم یونیورسٹی کے کاموں سے مظفر پور جایا کرتا تھا۔ راقم کو حکومت بہار نے جون ۱۹۵۸ء میں اس کالج کی پرنسپلی کی پیش کش کی تھی مگر میں اس خدمت کو اپنی بیوی کی سخت علالت کی بنا پر قبول نہ کر سکا جس کا مجھے برابر افسوس رہا۔

(۲) بی۔ این۔ کالج، پٹنہ
(۱۹۲۴ء)

پٹنہ کالج میں داخلہ نہ ہوا :

۱۹۲۴ء میں آئی۔ اے پاس کرنے کے بعد گرمیوں کی شدت سے بچنے کے لیے میں مسوری چلا گیا اور دو ماہ سے زیادہ وہاں قیام کیا۔ اس زمانے میں پٹنہ کالج کے بی۔ اے سال اول میں سو طلبا کا داخلہ ہوا کرتا تھا۔ میں مطمئن تھا کہ لوٹنے کے بعد میرا داخلہ اس کالج میں ہو جائے گا، لیکن خلاف توقع تمام جگہیں پُر ہو چکی تھیں۔ واپس آکر داخلہ کے لیے عارضی پرنسپل مسٹر ہورن سے ملاقات کی۔ انھوں نے کہا فی الحال اپنا داخلہ بی این کالج میں کرا لو، جگہ خالی ہوتے ہی تمھارا داخلہ کروں گا۔ میں نے بی۔ این کالج میں داخلہ کرا لیا۔ ڈاکٹر عظیم الدین احمد نے جو والد کے عزیز دوست اور پٹنہ کالج میں فارسی کے سینئر پروفیسر تھے۔ ان کے اصرار پر پٹنہ کالج کے بی۔ اے آنرس فارسی کلاس میں بھی داخلہ کرا لیا اور اسی توسط سے پٹنہ کالج کے محمڈن ہوسٹل میں رہنے کی اجازت مل گئی۔ اس زمانے میں اس ہوسٹل کے سپرنٹنڈنٹ ڈاکٹر علی حسن صاحب تھے۔

بی۔ این کالج میں تعلیم :

بی این کالج کے پرنسپل ڈاکٹر ڈی این سین تھے۔ موصوف ہندوستان میں فلسفہ کے نامی استاذ تھے اور والد صاحب سے واقف تھے۔ میرے داخلہ سے انھیں بڑی خوشی ہوئی اور فرمایا کہ پٹنہ کالج میں کون سی خصوصیت تھی جو تم وہاں داخلہ کے متمنی تھے۔ ہمارے کالج میں کیا کمی ہے۔

دل لگا کر پڑھو اور کامیابی حاصل کرو۔ یہی میری دعا ہے۔ میرا کالج بھی ایک نہایت نامور کالج ہے۔

پرنسپل ڈی۔این۔سین :

موصوف پرخلوص، ایمان دار اور غریب دوست انسان تھے۔ بلا امتیاز مذہب غریب طلبا کی سرپرستی کرتے اور ضرورت کے وقت ان کی مالی مدد کرتے تھے۔ بیوی کا انتقال ہو چکا تھا اور لاولد تھے اس لیے اپنی آمدنی کا بیشتر حصہ نادار اور غریب طلبا پر خرچ کیا کرتے تھے۔ گرچہ انگریزی لباس پہنتے تھے لیکن صورت سے بالکل "رشی" معلوم ہوتے تھے۔ انگریز پروفیسروں سے خوش نہ رہتے اور فرماتے کہ یہ لوگ اپنے کو استاد سے زیادہ حکمراں تصور کرتے ہیں۔ کالج اور یونیورسٹی میں ان کی بہت عزت تھی۔ باغبانی کے بہت شائق تھے۔ بی۔این کالج میں جو باغ آج ہے انہی کی یادگار ہے۔ پٹنہ یونیورسٹی نے انھیں پی ایچ ڈی کی اعزازی ڈگری عطا کی تھی۔ اور حکومت ہند نے ان کی قابلیت کو مدنظر رکھتے ہوئے۔ آئی۔ای۔ایس -Indian Educational Service) - میں ملازمت دی تھی۔

پروفیسر سید معین الحق :

سید معین الحق صاحب ہم لوگوں کے انگریزی کے پروفیسر تھے انگریزی ادب کا گہرا مطالعہ کیا تھا، موصوف TENNYSON کی نظمیں بہت اچھی طرح سے پڑھاتے تھے۔ اچھے پروفیسر ہونے کے ساتھ وہ ہاکی کے اچھے کھلاڑی بھی تھے۔ ان دونوں خوبیوں کی بدولت کالج کے لڑکوں میں بہت ہر دل عزیز تھے۔ بلاتکلف ہم لوگوں کے ساتھ کھیلوں میں شریک ہوا کرتے تھے ان کے زمانے میں اولمپک کھیل جو دنیا کے مختلف ملکوں میں منعقد ہوا کرتے ان میں ہندوستان کی طرف سے اعلیٰ نمایندہ بن کر شرکت کیا کرتے تھے۔ اسی بنا پر انگریزوں نے انھیں "او۔بی۔ای" (O.B.E) کے خطاب سے نوازا تھا۔ آزادی کے بعد حکومت ہند نے اسی سلسلے سے "پدم شری" کے خطاب سے سرفراز کیا۔ موصوف کی طرح بہت کم لوگوں میں یہ بات دیکھی گئی ہے کہ وہ بیک وقت پڑھنے پڑھانے اور کھیل کود میں یکساں اہمیت و شہرت کے حامل ہوتے ہیں۔ تقریباً پندرہ بیس سال تک B.N. College کے پرنسپل رہے اور بہت حسن و خوبی سے کالج کو چلایا۔ پٹنہ یونیورسٹی کے سینیٹ، سنڈیکیٹ اور مختلف کمیٹیوں کے ممبر رہے۔ نہایت دلیری اور دیانت داری سے اپنے کاموں کو انجام دیا۔ راقم سے بہت محبت کرتے جس کی دو وجہیں تھیں۔ ان کے بڑے بھائی

سید مبین الحق صاحب وکیل والد مرحوم کے اسکول کے دوستوں میں تھے۔ اور قربت کی دوسری وجہ یہ تھی کہ ان کے داماد سید نجیب اشرف ندوی جو اندھیری کالج بمبئی میں فارسی کے پروفیسر تھے، راقم کے بہت عزیز دوست تھے۔ پروفیسر مبین الحق صاحب تاحیات ہفتہ میں ایک بار میرے یہاں ضرور تشریف لاتے تھے۔ اپنے اساتذہ میں مجھے اتنا خوش اخلاق انسان نہ ملا۔

مولوی ابوسعید صاحب :

پروفیسر مولوی ابوسعید صاحب فارسی کے پروفیسر تھے اور قدیم اور جدید فارسی سے واقف تھے۔ ہم لوگوں کو فارسی خوب محنت سے پڑھاتے تھے، اور طلبا ان کی بڑی عزت کرتے تھے۔ بی۔ این کالج میں عرصہ دراز تک نہایت دیانت داری اور خوبی سے اپنی خدمات کو انجام دیتے رہے۔ ان کے صاحبزادے پروفیسر ابوالخیر اسی کالج میں فارسی کے سینئر پروفیسر ہیں۔

بی این کالج میں صرف ایک ماہ پڑھنے کا موقع ملا کہ مسٹر ہورن نے اپنے وعدہ کے مطابق پٹنہ کالج میں داخلہ کی اجازت دے دی، مگر ڈاکٹر ڈی این سین نے اپنے کالج سے T.C. دینے میں تامل کیا، آخر کار ڈاکٹر بنرجی شاستری کی سفارش سے جو پٹنہ کالج میں سنسکرت کے پروفیسر تھے T.C. مل گئی۔ اور راقم نے اپنا داخلہ پٹنہ کالج میں لے لیا۔ داخلہ کے فوراً بعد پٹنہ کالج کے مستقل پرنسپل مسٹر جیکسن اپنی رخصت سے واپس آ گئے۔ ان کا دستور تھا کہ دوران سیشن کسی کا داخلہ نہ لیتے تھے۔ ان کی موجودگی میں میرا داخلہ پٹنہ کالج میں ناممکن تھا۔

(۳) پٹنہ کالج، پٹنہ

۱۹۲۴ء سے ۱۹۲۸ء

پٹنہ کالج میں داخلہ اور تعلیم :

راقم نے جب مظفرپور کالج اور بی۔ این کالج پٹنہ میں داخلہ لیا تھا تو کوئی غیر معمولی چیز اور اجنبیت کا احساس نہ ہوا لیکن برخلاف اس کے پٹنہ کالج میں داخلہ پر قدیم ڈچ عمارت، اس کے سامنے کا بڑا سبزہ زار میدان، اس کے پشت پر خوب صورت ولسن گارڈن، دریائے گنگا کا کنارہ، تقریباً آدھ انگریز پروفیسروں کی موجودگی اور اسی قدر ہندوستانی بین الاقوامی شہرت کے مالک اساتذہ کا ہونا اور پرنسپل جیکسن کا طلبا کے ساتھ سخت برتاؤ نے میرے دل پر پٹنہ کالج کا رعب جما دیا۔

میرے انگریزی کے اساتذہ :

ہمارے انگریزی کے پروفیسر مسٹر آرمر، مسٹر آگسٹ لونی، اور مسٹر نیر بجن نیوگی تھے۔ پروفیسر نیوگی بہت اچھی انگریزی جانتے اور برہمو سماج کے سرگرم کارکن تھے۔ ہم لوگوں کو Palgrave's Golden Treasury سے منتخب نظمیں پڑھاتے تھے۔ انھوں نے "Ode to - Nightingale" اس خوبی سے پڑھایا کہ صاحب موصوف کی عظمت اب تک دل پر نقش ہے۔

آرمر صاحب ہم لوگوں کو شیکسپیئر کا ڈراما "جولیس سیزر" نہایت ہی ڈرامائی اور دلچسپ انداز میں پڑھاتے تھے۔ موصوف ہندوستانی طلباء کو انگریزی پڑھانے کا طریقہ جانتے تھے اور اس کے لیے ہندوستان میں بہت شہرت رکھتے تھے۔ چونکہ ہمارے ہوسٹل کے وارڈن بھی تھے اس لیے کلاس میں راقم کا خیال رکھتے تھے۔ پروفیسر آگسٹ لونی پست قد، منکسر مزاج اور فرض شناس تھے۔ علی گڈھ کالج میں انگریزی کے استاد رہ چکے تھے۔ پٹنہ آنے کے بعد بھی علی گڈھ کو نہ بھلا سکے۔ آپ Nineteenth Century English Prose پڑھاتے تھے۔ انھیں انگریزی نثر پر عبور حاصل تھا۔ تمام عمر تجرد میں بسر کی۔ اپنی ماں سے بہت محبت کرتے تھے۔ ان کی وفات کے بعد ایک ڈینر ویگن اپنے وطن سے لاکر ڈرائنگ روم میں رکھا تھا۔ راقم نے اسے ڈرائنگ روم میں دیکھ کر پوچھا کہ اسے یہاں رکھنے کی وجہ کیا ہے۔ انھوں نے فرمایا کہ اس سے میرا جذباتی تعلق ہے۔ میری ماں ہر سال کرسمس کے دن مجھے اس کے بغل میں کھڑا کرکے میرے قد کا اس پر نشان لگا کر سنہ بھی لکھ دیا کرتی تھیں۔ یہ ڈینر ویگن میری مرحومہ ماں کی یادگار ہے جو مجھے بہت عزیز ہے۔ ان کی موت بہت دردناک حالت میں ہوئی۔ ایک رات بجلی کے لیمپ میں خرابی کی وجہ سے دستہ میں بجلی آگئی تھی۔ اٹھاتے ہی کرنٹ لگ گیا اور فوت کر گئے۔ پٹنہ کے عیسائی قبرستان میں مدفون ہیں۔ بہت عرصہ بعد راقم کو اسی بنگلے میں تیرہ سال رہنے کا اتفاق رہا۔ اور استاد موصوف اکثر یاد آتے تھے۔ جب E.M. Foster کا ناول "A Passage to - India" شائع ہوا تو اس کی ایک کاپی انگلستان سے خرید کر لائے اور راقم کو پڑھنے کے لیے اس شرط پر دیا کہ اس کو چار دن میں پڑھ کر واپس کر دوں گا، میں نے ایسا ہی کیا۔

تاریخ کے اساتذہ :

ہم لوگوں کو تاریخ سر جادو ناتھ سرکار، پروفیسر بھاٹیے اور پروفیسر سماددار پڑھاتے تھے۔ یہ تینوں اساتذہ اپنے دور کے گنے چنے استادوں میں تھے۔ پروفیسر بھاٹیے کی موت جوانی میں ہوئی۔ گرمیوں کی تعطیل میں پٹنہ سے بذریعہ ریل فرسٹ کلاس میں اپنے وطن بمبئی جا رہے تھے کہ دل کا دورہ

پڑنے سے اچانک موت ہوگئی۔ بمبئی اسٹیشن پر لوگوں نے انھیں ڈبہ میں مُردہ پایا۔

پروفیسر تارک ناتھ تعلقہ دار :

پروفیسر جاھئے کی موت کے بعد مسٹر تارک ناتھ تعلقہ دار کی عارضی تقرری ہوئی۔ بنگال کے ایک بڑے شریف خاندان کے فرد تھے۔ پبلک اسکول اور کیمبرج یونی ورسٹی میں ان کی تعلیم ہوئی تھی۔ انگریزی طرز زندگی سے بہت متاثر تھے۔ اپنے تہواروں سے انھیں کوئی دل چسپی نہ تھی۔ ہولی کے موقع پر ہندو لڑکے انگریز و ہندوستانی پروفیسروں کو عبیر لگاتے تھے مگر کوئی معترض نہ ہوتا۔ طلبا نے پروفیسر تعلقہ دار کو بھی عبیر لگایا تو بہت ناراض ہوئے اور کہا یہ وحشی قوموں کی رسم ہے۔ لڑکے بہت برہم ہوئے۔ نوبت یہاں تک آئی کہ یہ معاملہ بہار لیجس لیٹو کانسل میں بھی زیر بحث آیا۔ تعلقہ دار صاحب نے نہ معافی مانگی اور نہ اظہار افسوس ہی کیا بلکہ استعفا داخل کردیا۔ وزیر تعلیم سرسید فخرالدین نے بہت سمجھایا کہ استعفا واپس لے لیں مگر اپنے فیصلہ سے نہ ہٹے اور پٹنہ سے چلے گئے۔ غالباً یہ واقعہ ۱۹۲۷ء کا ہے۔ صاحب موصوف بہت ملنسار انسان تھے۔ راقم کے ساتھ ان کا برتاؤ پر خلوص تھا اور میرے بڑے بہی خواہ تھے۔ اپنی ایک سند مورخہ ۲۳ جولائی ۱۹۲۶ء میں راقم کی باقاعدگی، خوش مزاجی اور ذہانت کی تعریف کی ہے۔ یہ سند میرے پاس اب تک محفوظ ہے۔

پروفیسر جادو ناتھ سرکار اور پروفیسر آسٹن اسمتھ :

سر جادو ناتھ سرکار اور پروفیسر آسٹن اسمتھ شعبۂ تاریخ میں ایک ساتھ کام کرتے تھے۔ مگر ان دونوں میں برابر چشمک رہا کرتی تھی۔ پروفیسر اسمتھ کو یورپ کی تواریخ پر بڑا عبور تھا اور اپنے مقابلے میں کسی کو اہمیت نہ دیتے تھے۔ ڈاکٹر ڈی۔ این۔ سین پرنسپل بی این کالج اور پروفیسر جادو ناتھ سرکار کی Indian Educational Service (آئی۔ای۔ایس) میں اعزازی طور سے تقرری کی گئی تھی۔ سر جادو ناتھ سرکار کے لیے یہ تقرری اگرچہ کوئی بڑی چیز نہ تھی مگر اس پر انھیں بڑا فخر تھا اور برابر اپنے نام کے ساتھ I.E.S. ضرور لکھا کرتے تھے۔ برعکس اس کے ڈاکٹر ڈی۔ این سین نے اس کو کبھی کوئی اہمیت نہ دی اور نہ اپنے نام کے ساتھ اس اعزاز کو لکھا کرتے تھے۔

فارسی کے اساتذہ :

شعبۂ فارسی کے صدر ڈاکٹر عظیم الدین احمد کے علاوہ دو اور اساتذہ پروفیسر عبدالقادر اور ڈاکٹر ابونصر محمد علی حسن صاحب ہم لوگوں کو بی۔ اے پاس اور آنرس کلاس میں فارسی پڑھاتے تھے۔

ڈاکٹر عظیم الدین احمد پنجاب یونیورسٹی کے اورینٹل کالج میں فارسی کے سینیر پروفیسر تھے۔ موصوف وہاں پانچ برس خدمت انجام دینے کے بعد پٹنہ کالج چلے آئے تھے۔ آپ ہندوستان میں فارسی کے مشہور اساتذہ میں تھے۔ علامہ ڈاکٹر محمد اقبال آپ کے عزیز دوست تھے۔ پروفیسر عظیم الدین احمد کے چلے آنے پر علامہ اقبال کو لاہور کی ادبی دنیا میں بہت کمی محسوس ہوئی جس کا ذکر انھوں نے عبداللہ عمادی کے نام ایک خط میں نہایت افسوس کے ساتھ کیا ہے۔ علامہ کی متعلقہ عبارت اس طرح ہے: "آپ کے چلے جانے سے لاہور کی علمی صحبت کا خاتمہ ہوگیا۔ ڈاکٹر عظیم الدین احمد بھی شاید چلے جائیں بس پھر بقول مولانا اکبر یہاں دھرا کیا ہے سوا اکبر کے اور امرود کے۔" موصوف نے علامہ محمد اقبال کے کہنے پر ایک نظم "تصویر درد" کی طرز پر "تاثیر درد" لکھی جو بہت پسند کی گئی۔ بی۔ اے آنرس کلاس میں استاذ محترم کا پہلا لکچر خاقانی پر تھا اور وہ قصیدہ جس کے مطلع کا پہلا مصرع: ع

دل من پیر تعلیم است و من طفل زباں دانش

ہے، پڑھایا۔ پانچ چھ اشعار میں گھنٹہ گذر گیا اور یہ معلوم ہوا کہ درحقیقت کلاس کے پچپن منٹ ختم ہو گئے۔ خاقانی کے ساتھ ہم لوگوں کو محمود شبستری کی گلشن راز بھی پڑھاتے تھے۔ علاوہ ازیں اردو کمپوزیشن کا بھی کلاس لیا کرتے تھے۔ استاذ محترم کے اردو لکچرس میں اس قدر جاذبیت اور دلکشی ہوتی تھی کہ طلبا کو ان کے لکچر کا انتظار رہتا تھا۔

پروفیسر عبدالقادر نے علی گڑھ کالج سے ایم۔ اے فارسی کی سند حاصل کی تھی انگریزی، فارسی اور عربی خوب جانتے تھے۔ انگریزی ایسی بامحاورہ اور سلیس لکھتے اور بولتے تھے کہ انگریز بھی ان کی صلاحیت کے معترف تھے۔ یہ ہم لوگوں کو دیوانِ حافظ اور مثنوی مولانا روم پڑھاتے تھے۔ ۱۹۲۶ء میں اسلامیہ کالج کلکتہ چلے گئے، وہاں سے پنشن کے بعد قادیان گئے اور تقسیم ہند کے بعد ہجرت کر کے پاکستان چلے گئے جہاں تاحیات قادیانی تحریک کے سرگرم مبلغ رہے۔ ڈاکٹر علی حسن کو باوجود علمیت کے قوت گویائی کم تھی۔ ڈاکٹر عظیم الدین احمد فرماتے تھے کہ ان کے خشک مزاج کو فارسی غزل اور مثنوی سے کوئی تعلق نہیں اس لیے موصوف نے انھیں ہم لوگوں کو اخلاق جلالی پڑھانے پر مامور کیا، جسے وہ بہت اچھے انداز سے پڑھایا کرتے تھے۔

فارسی بی۔اے آنرس کلاس:

بی۔ اے آنرس کلاس میں میرے علاوہ دو اور طالب علم سید مبین الدین احمد اور عبدالاحد

تھے۔ ۱۹۲۶ء کے بی۔اے آنرس کے امتحان میں راقم فرسٹ کلاس فرسٹ آیا اور عبدالاحد ایک نمبر سے فرسٹ کلاس سکنڈ آئے۔ سید مبین الدین احمد کو آنرس نہ مل سکا۔ عبدالاحد صاحب بھاگل پور کے T.N.B. College میں فارسی کے لکچرر اور پروفیسر رہے اور ملازمت کے آخر میں کچھ دنوں کے لیے پرنسپل بھی ہوئے۔ چند سال پہلے حرکت قلب بند ہو جانے سے ان کی موت واقع ہوئی۔ جب راقم ۱۹۲۶ء میں بی اے کے امتحان میں شریک ہوا تو اس سال پٹنہ کالج کے امیدواروں کی کل تعداد تقریباً ۹۰ تھی۔ ان میں سے ۲۷ طلبا نے "پاس" کے ساتھ کامیابی حاصل کی اور ۲۰ طلبا کو "آنرس" ملا۔ صرف دو مسلم طلبا کو آنرس اور آٹھ "پاس" کے ساتھ کامیاب ہوئے۔

پٹنہ کالج کے نامور اساتذہ :

راقم کے زمانے میں پٹنہ کالج ہندوستان کے قدیم ترین اور مشہور کالجوں میں تھا۔ اس پر جتنا بھی ناز کیا جائے کم ہے۔ اس کے اساتذہ ہندوستان اور انگلستان کی یونیورسٹیوں کی اعلیٰ ڈگریاں رکھتے تھے۔ تعلیمی تجربہ بھی کافی ہوا کرتا تھا۔ ان اساتذہ کے علاوہ جن کا ذکر اوپر ہو چکا ہے چند اور مشاہیر کا ذکر کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ ڈاکٹر کے ایس۔ کاڈول کیمسٹری کے نامور پروفیسر تھے۔ پروفیسر عبدالصمد خاں آئی ای ایس کے ممبر تھے جو بعد میں سی آئی۔ ای کے خطاب سے سربلند ہوئے۔ اور ڈی۔ پی۔ آئی بہار ہو کر پنشن پائی۔ کیمسٹری کے نامور پروفیسر رہے۔ پنشن پانے کے بعد آپ خدابخش لائبریری کے سکریٹری بھی ہوئے۔ ۱۹۸۵ء میں تقریباً سو سال کی عمر میں انتقال فرمایا۔ پروفیسر سی۔ جے۔ ہملٹن کیمبرج یونیورسٹی میں اقتصادیات کے لکچرر تھے۔ سر آسوتوش مکرجی نے انھیں منٹو پروفیسر آف اکونومکس مقرر کر کے کلکتہ یونیورسٹی بلایا مگر ان کو کلکتہ یونیورسٹی کا ماحول پسند نہ آیا اور پٹنہ کالج چلے آئے۔ سات آٹھ سال یہاں خدمت انجام دینے کے بعد امریکہ کسی یونیورسٹی میں پروفیسر ہو کر چلے گئے۔ پروفیسر ای۔ اے۔ ہورن بھی اقتصادیات کے اچھے پروفیسر تھے۔ پہلی جنگ عظیم میں لارڈ نورتھ کلف کے جنگی پروپگنڈہ کے کاموں میں کچھ دنوں تک ان کے رفیق کار رہے پھر پٹنہ کالج چلے آئے۔ پٹنہ کالج کے دوران خدمت ان کی تقرری بحیثیت پرو وائس چانسلر علی گڑھ یونیورسٹی ہوئی اور وہیں چیچک کے مرض میں انتقال کیا۔ میرے ایم۔ اے پاس کرنے کے بعد انھوں نے خط لکھا تھا کہ تمھیں علی گڑھ میں کالج میں لکچرر کی جگہ مل جائے گی چلے آؤ۔ مگر راقم کے دماغ میں ڈپٹی کلکٹری کا خبط سوار تھا اور علی گڑھ نہ گیا۔ اسی چکر میں جب راقم کو بی۔ این۔ ڈبلیو ریلوے میں ٹرافک انسپکٹر کی جگہ ملی تو اسے بھی قبول نہ کیا۔

پٹنہ کالج کے تین قدیم ترین پرنسپل :

مسٹر جے۔ کے۔ راجرس ۱۸۶۳ء میں پٹنہ کالج کے سب سے پہلے پرنسپل ہوئے۔ ان کے بعد دوسرے پرنسپل مسٹر ماکمرنڈل اور تیسرے مسٹر ٹوینبک ہوئے۔ مسٹر ٹوینبک اپنے زمانے میں ہند کے بے مثال ریاضی داں تھے اور پوری دنیا کے منتخب ریاضی دانوں کے شمار میں آتے تھے۔ اُنکے کاموں میں دو نامور بنگالی اساتذہ ان کا ہاتھ بٹاتے تھے۔ ایک چکرورتی اور دوسرے کا نام پی گھوش تھا۔ یہ دونوں پروفیسر مسٹر ٹوینبک کے ساتھ سایے کی طرح رہا کرتے تھے۔ اسی سبب سے کسی طالب علم نے یہ شعر موزوں کیا تھا، ملاحظہ ہو : ؎

یوینبک کے پاپوش میں روپوش ہوئی دھوپ
تب رشک چکرورتی و پی گھوش ہوئی دھوپ

مجھے فخر ہے کہ مسٹر راجرس پرنسپل پٹنہ کالج کے سو سال بعد راقم کو ۱۹۶۰ء میں اس کالج کا پرنسپل ہونے کی سعادت نصیب ہوئی۔

میری ایم۔ اے فارسی کی تعلیم :

راقم کے زمانے میں ایم۔ اے کی تعلیم بھی پٹنہ کالج میں ہوا کرتی تھی اور وہی اساتذہ جو بی۔ اے میں پڑھاتے ایم۔ اے میں بھی درس دیا کرتے تھے۔ جب میں ایم۔ اے کی پڑھائی ختم کر رہا تھا تو پروفیسر عبدالمنان صاحب بیدل فارسی کے اسسٹنٹ پروفیسر ہو کر پٹنہ کالج آئے اور ہم لوگوں کو دو تین ماہ تک فارسی کا درس دیا۔

راقم ۱۹۲۸ء میں فارسی ایم۔ اے کے امتحان میں شریک ہوا اور فرسٹ کلاس فرسٹ ہو کر کامیابی حاصل کی۔ انعام میں ایک تمغۂ طلائی عطا ہوا اور دو سو روپیے قیمت کی کتابیں بھی دی گئیں۔ میں نے اس طلائی تمغہ کو بطور یادگار اب تک محفوظ رکھا ہے۔

پٹنہ کالج مسلم ہوسٹل میں قیام

۱۹۲۴ء سے ۱۹۲۸ء

ہوسٹل کی رہائش :

میں کالج کے جس ہوسٹل میں رہتا تھا اس کا پہلا نام محمڈن ہوسٹل تھا جو بعد میں مسلم ممبروں

کے اصرار پر مسلم ہوسٹل کے نام سے مشہور ہوا۔ اس زمانے میں یہ ایک چھوٹا دو منزلہ ہوسٹل تھا۔ اسکی بالائی منزل کی چھت رانی گنج ٹائل سے چھائی ہوئی تھی۔ اس ہوسٹل میں ۲۴ منفرد کمرے ایسے تھے جس میں ایک ایک طالب علم کے رہنے کا انتظام تھا اور چھ کمرے ایسے تھے جن کے ہر کمرے میں چار طالب علم رہ سکتے تھے۔ اس زمانے میں مسلمان لڑکے عام طور سے ہوسٹل میں رہنا بہت کم پسند کرتے تھے اور وہ اپنے والدین یا اپنے رشتہ داروں کے ساتھ رہا کرتے تھے۔ میں جب ۱۹۲۴ء میں ہوسٹل میں داخل ہوا تو چار طلبا کی نشست والے کمرہ میں جگہ ملی۔ اس وقت ہوسٹل میں رہنے والے طلبار کی تعداد صرف ۲۷ تھی۔ گرچہ وہاں ۴۸ لڑکوں کے رہنے کا انتظام تھا۔ تین خالی کمروں کے ایک کمرہ میں ہوسٹل کا ڈاکٹر لڑکوں کی طبی سہولت کے لیے چند گھنٹے آکر بیٹھتا تھا۔ دوسرے خالی کمرہ میں پروفیسر پنڈت رام اوتار شرما ایم اے سنسکرت کا کلاس لیا کرتے تھے اور تیسرے کمرے میں ڈاکٹر عظیم الدین احمد ایم۔ اے فارسی کے طلبار کو درس دیا کرتے تھے۔

ہوسٹل کے سپرنٹنڈنٹ، قواعد وضوابط، ہوسٹل کی توسیع :

ہوسٹل کے سپرنٹنڈنٹ ڈاکٹر ابونصر محمد علی حسن صاحب تھے۔ نہایت مذہبی مزاج کے تھے۔ ہر سال میلاد شریف کیا کرتے اور رمضان میں کسی نہ کسی دن تمام ہوسٹل کے طلبا کو افطار پر ضرور مدعو کرتے تھے۔ ہوسٹل کے قواعد وضوابط بڑے سخت تھے۔ موصوف طلبار سے ان کی پابندی سختی سے کراتے تھے۔ مطالعہ کا وقت صبح وشام دو دو گھنٹہ مقرر تھا۔ ان اوقات میں پڑھنے لکھنے کے علاوہ کسی دوسرے کام کی اجازت نہ تھی۔ طلبا ایک دوسرے سے نہ مل سکتے تھے، نہ کہیں جا سکتے تھے۔ موصوف روزانہ اس بات کی جانچ کیا کرتے تھے کہ کوئی لاپرواہی تو نہیں کرتا یا دوسرے کے پڑھنے میں مخل تو نہیں ہوتا ہے۔ ہوسٹل کے ہر بلاک میں ایک سینیر طالب علم اپنے بلاک کا پریفیکٹ ہوتا تھا۔ ضرورت پڑنے پر وہ قاعدہ کے مطابق کسی کو آدھ گھنٹہ سے زیادہ ہوسٹل سے باہر جانے کی اجازت نہ دیتا تھا۔ سپرنٹنڈنٹ روزانہ صبح وشام ہوسٹل کا گشت لگاتے، کہ صفائی اور ہوسٹل کی ڈسپلین میں کوئی بدنظمی تو نہیں آئی ہے۔ ایسے طالب علم جو بدذوق اور قواعد وضوابط کی پابندی کے عادی نہ تھے سپرنٹنڈنٹ سے کچھ خوش نہ رہا کرتے تھے اور ہر جگہ ان کی شکایت کرتے رہتے تھے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ پابندیاں طلبار کے حق میں بہر حال مفید تھیں جس کے نتیجہ میں بدذوق طلبا بھی کچھ نہ کچھ ضرور پڑھ لیا کرتے اور کامیاب بھی ہوتے تھے۔ ڈاکٹر کاڈول اس

ہوسٹل کے مستقل وارڈن تھے۔ موصوف ہوسٹل میں بہت کم آتے بلکہ سپرنٹنڈنٹ آفس میں آتے اور ہوسٹل کے بارے میں تمام حالات اور معلومات حاصل کرلیا کرتے تھے۔ جب پروفیسر آرمر وارڈن ہوئے تو ان کا معمول تھا کہ روزانہ بلاقید موسم پانچ چھ بجے صبح کو آتے اور تمام لڑکوں کو پٹنہ کالج کے میدان میں لے جاتے خود دوڑتے اور لڑکوں کو اپنے ساتھ دوڑاتے تھے۔ اس طرح ہم لوگوں کی ایک اچھی ورزش ہوجاتی تھی۔ پڑھنے کے وقت روزانہ ہوسٹل آتے اور ہر کمرے میں جاکر لڑکوں سے باتیں کرتے۔ راقم کے دوران قیام کچھ دنوں کے لیے مسٹر آسٹن اسمتھ وارڈن ہوئے۔ یہ ایک سن رسیدہ پروفیسر تھے اور ان کا انداز تکلم اکثر تحکمانہ ہوتا تھا۔ ایک دن جب میں صبح سویرے اپنے معمول کے مطابق انگریزی لباس پہن کر لا کالج پڑھنے کے لیے جارہا تھا کہ زینے پر ان سے ملاقات ہوگئی۔ مجھ سے دریافت کیا کہ پڑھنے کے وقت کیوں باہر جارہے ہو۔ میں نے جواباً عرض کیا کہ لا کالج جارہا ہوں۔ برہم ہوکر بولے "You walk in a pompous manner as if you are a Tax Collector." (تم اس شان سے چل رہے ہو گویا تم ایک ٹیکس کلکٹر ہو) میرے جواب سے مطمئن نہ ہوئے اور لا کالج کے پرنسپل سے میری اس روز کی حاضری کے بارے میں دریافت کرنے کے بعد ہی سکوت اختیار کیا۔ ۱۹۲۵ء کے آخر میں ہوسٹل کی توسیع ہوئی اور ساٹھ لڑکوں کے رہنے کا انتظام کیا گیا مسلم لڑکوں کی تعداد ناکافی تھی اس لیے ہندو طلبا کو بھی رہنے کی جگہ دے دی گئی۔ اس کے بعد ہوسٹل کی نوعیت بدل گئی اور ہندو مسلمان طلبا اس میں رہنے لگے۔ ۱۹۲۸ء میں اس ہوسٹل کا نام جیکسن ہوسٹل رکھ دیا گیا اور جب سے اس میں صرف ہندو طلبا رہنے لگے۔ اسی سال ایک نیا ہوسٹل جو اب "اقبال ہوسٹل" کے نام سے مشہور رہے تعمیر ہوا جس میں آج کل ہندو اور مسلمان طلبا رہتے ہیں اور مسلم ہوسٹل کی خصوصیت ختم کردی گئی۔ راقم بہت آرام سے پرانے مسلم ہوسٹل میں چار برس ۱۹۲۴ء سے ۱۹۲۸ء تک رہا اور یہ زمانہ میری زندگی کا بہترین زمانہ تھا۔

میرے خاص احباب :

اس دور کے خاص دوستوں میں امیر علی خاں وارثی (ایڈوکیٹ)، سید رضا حیدر (ہیڈ ماسٹر)، خلیل احمد (جج ہائی کورٹ)، فضل الرحمٰن (ڈی۔پی۔آئی)، سید محمد احمد (اے۔ڈی۔پی۔آئی)، سید مہدی علی (ڈائرکٹر انڈسٹریز)، سید امین احمد (آئی۔سی۔ایس) نورالہدیٰ (آئی۔اے۔ایس) محمد ابوالمظفر (انڈین اکاؤنٹس سروس)، سید اختر احمد اورینوی (پروفیسر)، سید مقبول احمد

(ایڈوکیٹ اور وزیر حکومت بہار)، سید انور حسین (ڈاکٹر)، سید منور حسین (پروفیسر علی گڑھ) تھے۔

ان چند افراد میں امیر علی خاں وارثی، رضا حیدر، خلیل احمد اور راقم سے بہت قربت تھی۔ ہم لوگ روزانہ صبح کا ناشتہ ایک ساتھ کرتے تھے۔ جس میں کبھی کبھی فضل الرحمن اور سید مہدی علی بھی شریک ہو جایا کرتے تھے۔

ہوسٹل کے مس، کھانے کے اخراجات اور سالانہ جلسہ :

ہمارے ہوسٹل میں دو مس تھے۔ ایک کا نام رائل اور دوسرے مس کا نام امپریل تھا۔ دونوں مس کے افراد کوشاں رہتے کہ ہمارے مس کا کھانا بہتر ہو۔ اس وجہ سے دونوں میسوں کا انتظام عموماً اچھا ہوتا تھا اور طلبا کو اچھے کھانے مل جاتے تھے۔ ہر سنیچر کی رات کو اہتمام کے ساتھ دعوت ہوتی جس میں اچھے اچھے کھانے ملتے تھے۔ دونوں میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کا خیال رہتا تھا۔ اور ہم لوگ بے تکلف سیر ہو کر اچھے کھانے کھاتے۔ باوجود تکلفات کے ماہانہ خرچ صرف پندرہ روپیے لیے جاتے تھے۔ ہوسٹل کا سالانہ جلسہ عموماً جاڑے کے موسم میں ہوا کرتا تھا اور کبھی کبھی پیسوں کی کمی سے ملتوی بھی ہو جاتا۔ ۱۹۲۶ء میں ڈاکٹر ضیاء الدین وائس چانسلر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کسی سرکاری کام سے پٹنہ آئے تھے تو ہوسٹل کے سالانہ جلسہ میں انھیں مہمان خصوصی کی حیثیت سے مدعو کیا گیا۔ اس جلسہ میں کالج کے پروفیسران کے علاوہ مسٹر نوکس، ڈی پی آئی اور چند معزز انگریز افسران بھی شریک ہوئے۔ مَشکی باجے کی دھن بجائی گئی جس کو تمام لوگوں نے پسند کیا خصوصاً ہمارے وارڈن پروفیسر آرمر اس سے بہت محظوظ ہوئے کیونکہ یہ اسکاٹ لینڈ کے رہنے والے تھے اور اس باجے کی دھن سے بہت خوب واقف تھے۔ اس موقع پر ہوسٹل کے طلبا نے دل کھول کر چندہ دیا اور اپنی محنت اور کوشش سے اس جلسہ اور عصرانہ کو کامیاب بنایا۔

طلباء کی تفریح طبع کا سامان اور سرکاری ملازمتیں

۱۹۲۴ء سے ۱۹۲۸ء

بہار ینگ مینس انسٹی ٹیوٹ، سنیما اور تھیئٹر :

طلبا کی تفریح کے لیے خدا بخش لائبریری سے متصل بہار ینگ مینس انسٹی ٹیوٹ میں تفریح کے سامان مہیا تھے۔ یہاں بلیارڈ اور دوسرے اِن ڈور گیمس کا انتظام تھا۔ افسوس ہے کہ اس کی

وہ رونق جو پہلے تھی اب نہ رہی ۔ اس کا سالانہ چندہ صرف دو روپیہ تھا ۔ اس کے علاوہ الفنسٹن سنیما اور جہانگیر کا تھیٹر تھا ۔ الفنسٹن سنیما کا مالک کلکتہ سے اکتوبر کے مہینہ میں آتا اور مئی کے مہینہ میں واپس چلا جاتا تھا ۔ وہ لان (گاندھی میدان) کے اتر پوربی کونے پر ایک عالیشان خیمہ لگا کر باقاعدہ اسٹیج اور ہال تیار کر لیتا تھا ۔ اس سنیما میں انگریزی فلمیں دکھائی جاتی تھیں ۔ تصویریں چلتی پھرتی تو تھیں مگر بولتی نہ تھیں ۔ فلم کا قصہ اور مکالمہ بوقت ضرورت اسٹیج کے پردہ پر لکھا ہوا نظر آجاتا تھا ۔ اس زمانے میں چارلی چیپلین کی فلمیں بہت پسند کی جاتی تھیں ۔ راقم ہر سنیچر کو تفریح طبع کے لیے خصوصاً چارلی چیپلین کی فلمیں ضرور دیکھتا تھا ۔

جہانگیر کا تھیٹر :

خزانچی روڈ میں جہانگیر کا تھیٹر تھا جس میں ہر طبقہ کے لوگ ڈرامہ دیکھنے جاتے تھے ۔ یہاں بڑی بد نظمی رہتی تھی ۔ نہ روشنی کا معقول انتظام نہ کوئی باقاعدگی تھی ۔ شور وغل اتنا ہوتا کہ اداکاروں کی آواز ماند پڑ جاتی ۔ ایک دن اپنے ایک دوست و رشتہ دار سید مہدی علی کے اصرار پر ان کے ساتھ جہانگیر کے تھیٹر میں ڈرامہ "یہودی کی لڑکی" دیکھنے گیا ۔ تھیٹر کا ہنگامہ اور بد نظمی دیکھ کر میں نے مہدی علی سے کہا کہ مجھے کہاں لے آئے ۔ انھوں نے جواب دیا کہ ابھی اسٹیج پر اداکارہ کو آنے دیجیے تمام کلفتیں دور ہو جائیں گی اور پیسہ وصول ہو جائے گا ۔ میں تو صرف اسی اداکارہ کو دیکھنے آتا ہوں ۔ راقم اس کے بعد پھر وہاں کبھی نہ گیا ۔ تھیٹر والے اپنے تھیٹر کی رونق اور آمدنی بڑھانے کے لیے ایک دو خوب صورت اداکارہ لڑکیوں کو رکھتے تھے کہ تماشہ بینوں کی تعداد میں اضافہ ہو ۔ قریب پچاس سال سے تھیٹر کا رواج پٹنہ سے اٹھ گیا ہے ۔

کارنیول :

۱۹۲۶ء میں ایک سرکس "کنگ کارنیول" آیا جس کا مالک غالباً کوئی امریکن تھا ۔ اس میں کرتب دکھانے والے بھی زیادہ تر امریکن اور کچھ حبشی تھے ۔ اس سرکس نے تقریباً تین مہینے لان کے اتری پوربی کونے پر اپنا خیمہ لگا کر قیام کیا اور علاوہ انسانوں کے جانوروں کے بھی کرتب دکھا کر خوب پیسہ کمایا ۔ راقم نے اس زمانے میں اتنا اعلیٰ درجہ کا سرکس کلکتہ میں بھی نہیں دیکھا تھا ۔

مسلم طلبار کو سرکاری ملازمتیں :

برٹش دور حکومت میں بہار کے مسلمانوں کے لیے سرکاری ملازمت میں ۱۵ سے ۲۰ فی صد نشستیں مخصوص تھیں۔ اس لیے اچھے مسلم تعلیم یافتہ طلبار کو کچھ سرکاری ملازمتیں مل جاتی تھیں۔ راقم کے زمانے میں مسٹر سید امین احمد آئی۔سی۔ ایس کے مقابلہ کے امتحان میں کامیاب ہوئے اور میرے ہم جماعت محمد ابو منظفر انڈین آڈٹ سروس کے امتحان میں کامیاب ہوئے۔ مسٹر سید امین احمد نے تقریباً بیس سال کی ملازمت کے بعد سول سروس سے مستعفی ہو کر پٹنہ ہائی کورٹ میں وکالت شروع کی اور اسی کے ساتھ بہار لیجس لیٹو اسمبلی اور بعد ازاں بہار لیجس لیٹو کونسل میں آٹھ سال تک ممبر رہے اور اپنی خدمات کے لیے بڑی شہرت حاصل کی۔ محمد ابو مظفر بہار میں اکاونٹنٹ جنرل رہے۔ تقسیم ہند کے بعد پاکستان چلے گئے۔ وہاں عزت پائی اور پاکستان کے شعبہ مالیات میں مشیر رہے۔

ہم لوگوں کے زمانے میں بہار میں سرکاری ملازمتیں بہت کم ہوا کرتی تھیں مگر تعلیم یافتہ مسلم نوجوانوں کو ڈپٹی کلکٹری، منصفی، ڈاکٹری، انجنیری وغیرہ کی جگہیں مل جایا کرتی تھیں۔ بڑی نوکری ہو یا چھوٹی ہر ملازمت میں مسلمان نظر آتے تھے۔ آج کل اس کے بالکل برعکس ہے۔ اس دور میں سرکاری، نیم سرکاری اور غیر سرکاری ملازمتوں کی کوئی انتہا نہیں ہے مگر مسلمانوں کو اتنی بھی ملازمتیں نہیں دی جاتی ہیں جن کے وہ اپنی آبادی کے لحاظ سے حق دار ہیں۔ اور حکومت اس اہم مسئلہ کی طرف کوئی توجہ نہیں دے رہی ہے۔ یہ افسوس کی بات ہے۔ پڑھے لکھے مسلم نوجوان ملازمت کی تلاش میں مارے مارے پھرتے ہیں۔

———— ٭ ————

تیسرا باب

قانون کی تعلیم اور پیشۂ وکالت

۱۹۲۶ سے ۱۹۳۱

لا کالج کا ماحول اور اساتذہ :

بی اے پاس کرنے کے بعد راقم نے اپنا داخلہ Law College میں B.L. سال اول میں لیا۔ اس زمانے میں یہ سہولت تھی کہ ایم۔اے کے ساتھ بی۔ایل کی تعلیم بھی حاصل کر سکتے تھے۔ صرف دو سال کا کورس تھا۔ اس زمانے میں لا کالج کے کلاس مسٹر جسٹس شرف الدین کے رہائشی مکان میں ہوتے تھے، جہاں آج کل اس مکان کے ایک حصہ میں اردو لائبریری ہے۔ کچھ عرصہ بعد لا کالج کی عمارت رانی گھاٹ میں تعمیر ہوئی تو یہ کالج وہاں منتقل ہو گیا۔

لا کالج کے اساتذہ :

ہمارے زمانے میں مسٹر سید سعید عالم اس کالج کے پرنسپل تھے اور وائس پرنسپل مسٹر سید محمد شریف تھے۔ ان دونوں اساتذہ نے کیمبرج یونیورسٹی کی اعلیٰ ڈگریاں آرٹس اور لا (قانون) میں حاصل کی تھیں اور بیرسٹر بھی تھے۔ ان کے علاوہ ہمارے نامی پروفیسروں میں بابو شیوپیسر دیال اور مسٹر بھونیشور پرشاد سنہا تھے جو بعد میں چیف جسٹس آف انڈیا ہوئے۔ اور آج بقید حیات نہیں ہیں۔ ان کے علاوہ مسٹر بی۔پی جموار جو بعد میں وائس چانسلر ہوئے اور مسٹر سید یوسف حسین تھے۔ ان دونوں حضرات کو اکسفورڈ کی اعلیٰ ڈگریاں حاصل تھیں اور طلباء میں گھل مل کر رہتے تھے۔

لا کالج کا ماحول :

راقم جب لا کالج کے کمپاؤنڈ میں داخل ہوا تو یہاں کی دنیا عجیب سی نظر آئی۔ پٹنہ کالج میں اگر نظم وضبط تھا تو یہاں بدنظمی تھی۔ ہر وقت ایک ہنگامہ رہتا تھا۔ پڑھنے پڑھانے کا کوئی ماحول نہ تھا۔ کوئی طالب علم اگر پڑھنا لکھنا چاہتا تو اول کالج کا ماحول دوسرے سڑک پر آدمیوں اور

سواریوں کی آمد و رفت کا شور و غل مچا ہوتا۔ بجز پرنسپل اور وائس پرنسپل کے باقی دوسرے اساتذہ کو ڈھائی تین سو روپیہ ماہانہ معاہدہ کے مطابق مشاہرہ ملتا تھا۔ اساتذہ صبح و شام دو دو گھنٹے آ کر پڑھاتے اور دن بھر عدالتوں میں وکالت کرتے تھے۔ پرنسپل، نائب پرنسپل، مسٹر شیو لیشر دیال، مسٹر بھوبنیشور پرشاد سنہا اور پروفیسر جوار کے علاوہ کوئی دوسرا استاد پڑھانے میں دل چسپی نہ لیتا تھا۔ زیادہ تر طلبا صرف حاضری دینے کے خیال سے آیا کرتے تھے اور کچھ طلبا اپنی حاضری دینے کے بعد اپنے غیر حاضر دوستوں کی حاضری بھی بنوا دیتے تھے۔ بدمزاقی کا یہ عالم تھا کہ ہر استاد سے بدتمیزی کرتے۔ ایک سن رسیدہ وکیل بابو راگھو پرشاد جو شام کو پڑھانے آتے تھے، لڑکوں نے ان کا نام راگھو پرشاد سے بدل کر گھوڑا پرشاد کر دیا۔ کلاس میں آنے سے قبل ان کی میز پر گھاس اور چنا لا کر رکھ دیا کرتے تھے، جس کو موصوف پھینک کر پڑھانے میں لگ جاتے تھے۔

کالج کا ایک دل چسپ واقعہ:

لا کالج کا ایک واقعہ یاد آیا۔ میرے ایک دوست سید شاہ ظفر حسین جنھوں نے بعد میں اے۔ ڈی۔ ایم ہو کر پنشن پائی، ایک پر مذاق آدمی تھے۔ ایک دن شام کو جب وہ کلاس کے باہر کھڑے تھے تو ایک دیہاتی آیا اور ان سے پوچھا: "کیا یہی وہ جگہ ہے جہاں وکیل بنائے جاتے ہیں" جواباً کہا ہاں اور بتایا کہ وہ پروفیسر صاحب جو آ رہے ہیں جب وہ کمرہ میں چلے جائیں اور پڑھانے لگیں تو تم اندر جا کر ان کے پیچھے کھڑے ہو جانا پھر معلوم ہو جائے گا کہ وکیل کس طرح بنائے جاتے ہیں۔ جب پرنسپل سعید عالم لکچر میں مصروف ہو گئے تو یہ دیہاتی ان کے پیچھے کھڑا ہو گیا۔ پرنسپل سعید عالم کی نگاہ یکایک جب دیہاتی پر پڑی تو پوچھا یہاں کیسے آئے۔ اس نے کہا کہ ایک صاحب نے ہمیں بتایا ہے کہ پروفیسر صاحب کے پیچھے چپ چاپ کھڑے ہو جاؤ پھر تم دیکھ لو گے کہ وکیل کیسے بنایا جاتا ہے۔ یہ سن کر موصوف برہم ہو گئے اور چپراسی کو حکم دیا کہ اس آدمی کو کلاس سے باہر نکال دو۔

لا کالج کے احباب:

میرے لا کالج کے ساتھیوں میں مسٹر سرجو پرشاد سنگھ جو بقید حیات ہیں، پٹنہ ہائی کورٹ کے جج تھے اب تک راقم کے بہت اچھے دوستوں میں ہیں۔ مسٹر رام رتن سنگھ ہائی کورٹ کے جج ہوئے جو با حیات ہیں وہ بھی راقم کے ساتھی ہیں۔ ان کے علاوہ میرے نہایت عزیز دوست مسٹر امیر علی خاں وارثی تھے جو پٹنہ ہائی کورٹ کے اچھے ایڈوکیٹ تھے۔ موصوف جج و زیارت سے مشرف

تھے۔ آج سے بیس سال قبل قضا کر گئے۔ ایسا مخلص دوست بڑی مشکل سے ملتا ہے۔ سید رفیع الدین بلخی بھی راقم کے ساتھ پڑھتے تھے، موصوف تندرست، خوش مذاق اور خوبرو انسان تھے، شکار کے شوقین تھے۔ جب بھی شکار میں جاتے تو شکار میں سے کچھ حصہ راقم کو ضرور بھیجا کرتے اور کبھی کبھی تو خود پکا کر راقم اور دوسرے دوستوں کو کھلاتے تھے۔ ان کے انتقال کو تقریباً بیس سال ہو گئے۔ ان کی تمام اولاد پاکستان میں ہیں مگر موصوف نے اپنی عمر ہندوستان میں گذاری۔ بہت دلیر اور دیانت دار آدمی تھے۔

پیشہ وکالت :

راقم نے ۱۹۲۶ء میں بی۔ایل میں داخلہ لیا۔ سال اول پاس کرنے کے بعد ایم۔اے کرنے کی وجہ سے ایک سال کا وقفہ دے کر ۱۹۲۹ء میں سال دوم کا امتحان پاس کیا اور بی۔ایل ہو گیا۔ اکتوبر ۱۹۲۹ء میں چھپرہ کی ضلع عدالت میں وکالت شروع کیا۔ اس شہر میں وکالت شروع کرنے کی وجہ یہ تھی کہ اس زمانے میں میرے چچا مسٹر ریاست حسین وہاں بیرسٹر تھے اور میں ان کا جونیئر بن کر کام کرنے لگا۔ وہ ایک قابل اور تجربہ کار بیرسٹر تھے اور راقم کو ان کے ساتھ کام کرنے سے فائدہ ہوا۔ میں صرف دیوانی اور فوجداری کی عدالتوں میں ہی نہیں بلکہ اور عدالتوں میں بھی کام کرتا تھا۔ زیادہ تر منصفی کے مقدمات میں کام کرتا جس میں فیس کم ملتی اور محنت بہت زیادہ کرنی پڑتی تھی۔ ایک ہندو دلال سے ملاقات ہو گئی اور وہ مجھے انکم ٹیکس کے مقدموں میں لے جانے لگا۔ انکم ٹیکس کے مقدموں میں فیس زیادہ ملتی اور کام بہت دشوار نہ ہوتا تھا۔ دلال آدھی فیس خود لے لیتا اور آدھی فیس مجھے دے دیتا۔ جو کچھ وہ دیتا میں خوشی سے قبول کر لیتا تھا کیونکہ یہ رقم میری دیوانی یا فوجداری کی فیس سے زیادہ ہوتی تھی۔ روز کچھ نہ کچھ کما لیتا مگر یہ آمدنی ہرماہ سو روپیہ سے زیادہ نہ ہوتی تھی۔ والد صاحب مجھے ایک سو روپیہ ماہانہ بھیجا کرتے اور میں آرام سے رہتا تھا۔ وکالت کا زمانہ راقم کے لیے زندگی کا ایک نیا اور مشکل دور تھا۔ ہر قدم پر دشواری معلوم ہوتی۔ روزانہ مختلف مزاج کے لوگوں سے واسطہ پڑتا، جونیر وکیل کی حیثیت سے کچہری میں ایک اجلاس سے دوسرے اجلاس میں جا کر پیروی کرنی پڑتی یہ کام مجھے اچھا معلوم نہ ہوتا پیشہ وکالت میں محنت شاقہ کے ساتھ بے انتہا صبر کی ضرورت ہے۔ محنت کے لیے تو میں تیار تھا مگر میرا مزاج ہمیشہ صبر سے بہت دور رہا ہے۔ ہر روز دعا کرتا کہ ڈپٹی کلکٹری مل جائے اور اس پیشے سے جلد نجات ہو۔ وکالت سے گلو خلاصی تو ہو گئی مگر ڈپٹی کلکٹری نہ ملی۔

چھپرہ کے وکلاء :

چھپرہ میں ہندو وکلاء کی تعداد بہت کافی تھی۔ بابو گردھر گوپال اور بابو وشوناتھ پرشاد بہت کامیاب وکیل سمجھے جاتے تھے۔ بابو وشوناتھ پرشاد کی نظر عنایت مجھ پر اکثر رہا کرتی اور کئی مقدمات میں راقم ان کا جونیر رہا اور وہ میرے کاموں سے بہت خوش ہوتے تھے۔ مولوی عبدالماجد صاحب اور مولوی یادگار علی ممتاز مسلمان وکلاء میں تھے۔ اور یہ دونوں حضرات دیوانی عدالت میں کام کیا کرتے۔ مولوی عبدالماجد صاحب سنجیدہ مزاج اور خاموش آدمی تھے۔ نظایر پر بڑا عبور تھا۔ مولوی یادگار علی صاحب خوش مزاج بزرگ تھے اور نوجوان وکلا سے گھل مل کر باتیں کرتے، مولوی لیسین خاں فوجداری کے اچھے وکیل تھے۔ روپیہ کمانے کے ڈھنگ ان کو خوب آتے تھے۔ کام جی لگا کر کرتے اور حاکم کو خوش کرنا بھی جانتے تھے۔ مسٹر ہیورڈ سٹرکٹ وسشن جج تھے۔ مقدمات میں قانونی نکات خوب نکالتے اور بڑے زود فہم اور ذکی الطبع تھے۔ ترقی کر کے پٹنہ ہائی کورٹ کے جج ہوئے۔ انڈین سول سروس میں تقرری کے بعد ان کی تربیت والد صاحب کی نگرانی میں ہوئی تھی اس لیے مجھ پر مہربان رہتے۔ مسٹر احتشام علی خان سب جج تھے۔ لندن میں تعلیم پائی اور بیرسٹری کی ڈگری رکھتے تھے۔ اوقات کے بہت پابند تھے۔ ٹھیک ساڑھے دس بجے کام شروع کرتے اور چار بجے ختم کر دیتے تھے۔ قانونی باتوں کو خوب سمجھتے اور اپنی ایمانداری کے لیے مشہور تھے۔ سہسرام کے رہنے والے تھے اور ان سے ہم لوگوں کے خاندانی تعلقات تھے۔ ان کے بھائی اکرم علی خاں صاحب والد کے دوست تھے۔

جنوری ۱۹۳۱ء میں مسٹر ریاست حسین سخت بیمار ہوئے اور اپریل میں فوت کر گئے۔ ان کے مرنے کے بعد چھپرہ میں رہ کر وکالت کرنا میرے لیے دشوار ہو گیا اور میں پٹنہ چلا آیا۔ یہاں کے لوگوں کی رائے ہوئی کہ پٹنہ ہائی کورٹ میں وکالت کروں مگر میں اس پیشہ سے دل برداشتہ ہو چکا تھا اور حالات بھی ناسازگار تھے۔ مجبوراً وکالت سے ہمیشہ کے لیے جون ۱۹۳۱ء میں علیحدگی اختیار کر لی ہیورڈ صاحب کو میرے وکالت چھوڑنے کا بہت افسوس ہوا۔ جب ہیورڈ صاحب پٹنہ ہائی کورٹ میں جج ہو کر آئے تو میں ان کی ملاقات کے لیے گیا۔ وہ زمانہ انگریزوں کے عروج کا تھا اور ہائی کورٹ کے انگریز جج کی ہر جگہ بڑی عزت تھی۔ ہیورڈ صاحب نے راقم کو بہار کے بڑے بڑے انگریز حاکموں سے ملایا اور تعریفیں کیں۔

جب راقم چھپرہ میں وکالت کرتا تھا تو ڈاکٹر سید محمود وہاں بیرسٹر تھے۔ صاحب موصوف

اس زمانے میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے جنرل سکریٹری تھے اس لیے ان کا قیام چھپرہ میں بہت کم ہوا کرتا تھا۔ اس دور میں کانگریس کی طرف سے مسلم نیشنلسٹ کی تحریک چلائی جارہی تھی اور اس تحریک کی کامیابی کے لیے صاحب موصوف مجھ سے اکثر مدد لیا کرتے تھے۔ الحاج سید صالح حسین صاحب رئیس وزمیندار چھپرہ، اگرچہ کٹر کانگریسی تھے، مگر اس تحریک کے برابر مخالف رہے۔

چوتھا باب

پٹنہ یونیورسٹی میں تحقیقی کام

۱۹۳۲ء سے ۱۹۳۵ء

راقم کا انتخاب بحیثیت ڈپٹی کلکٹر اور تقرری میں ناکامیابی :

دسمبر ۱۹۲۹ء میں جب راقم چھپرہ میں وکالت کرتا تھا اس کا انتخاب بحیثیت ڈپٹی کلکٹر عمل میں آیا۔ اس سال صرف تین جگہیں تھیں ان جگہوں کے لیے راقم کا نام اول تھا، دوم منی بھوشن مکھرجی اور تیسرا نام رام بچیت مصرا کا تھا۔ تقرری سے قبل میڈیکل بورڈ ہوا جس میں تین ڈاکٹر تھے۔ انھوں نے میری طبی جانچ کے بعد حکومت کو مطلع کیا کہ پیشاب میں البومن ہے اس لیے تقرری نہ کی جائے۔ راقم کی عمر اکیاسی سال ہے، مگر ابھی تک پیشاب میں البومن کی کبھی شکایت نہ ہوئی۔ معلوم نہیں جانچ کس طرح سے ہوئی کہ صرف اسی دن پیشاب میں البومن نکلا۔ پیشاب کی جانچ کرنے والا ڈاکٹر مسمی ورما تھا جو چھپرہ کا باشندہ تھا۔ جب لوگوں میں یہ خبر پھیلی تو نتیجہ نکالا کہ تعصب کی بنا پر ایسا کیا گیا ہے۔ اس سال پورے صوبہ بہار میں کوئی مسلمان ڈپٹی کلکٹر مقرر نہیں کیا گیا۔ میں نے کچھ دنوں بعد کرنل جے بسی جان سے جو اس وقت پٹنہ میں سول سرجن تھے، ملاقات کی اور انھوں نے خود پیشاب کی جانچ کر کے ایک رپورٹ دی کہ پیشاب میں البومن کا کوئی نشان بھی نہیں ہے۔ یہ رپورٹ راقم کے پاس موجود ہے۔ ڈپٹی کلکٹر نہ ہونے کا مجھے افسوس تو ضرور ہوا مگر ہمت نہ ہاری اور وکالت کرتا رہا۔ ناسازگار حالات کی وجہ سے جن کا ذکر اوپر ہو چکا ہے ۱۹۳۱ء میں راقم کو وکالت ترک کر دینی پڑی۔

ریسرچ اور پی ایچ ڈی کی ڈگری :

ان دنوں مسٹر ہنری لیمبرٹ جو نہایت ہی شریف انگریز تھے، پٹنہ کالج کے پرنسپل تھے اور سر اسٹوارٹ میکفرسن پٹنہ یونی ورسٹی کے وائس چانسلر تھے۔ یہ دونوں حضرات راقم سے خوب واقف

تھے۔ جب میں نے اپنی پریشانیوں کا حال ان لوگوں سے بیان کیا تو مشورہ دیا کہ پی۔ ایچ۔ ڈی کر ڈالو لیکن دشواری کی بات یہ تھی کہ پٹنہ یونیورسٹی کے قیام سے اب تک کسی مضمون میں کسی نے پی۔ ایچ۔ ڈی نہ کی تھی۔ تجربہ نہ تھا کہ کس طرح سے ریسرچ کیا جائے اور بعد تکمیل مقالہ امتحان کا کیا انتظام ہو۔ میکفرسن صاحب نے نہایت خوشی سے مجھے یونیورسٹی سے سو روپیہ ماہانہ کا وظیفہ مقرر کرادیا۔ اسی کے ساتھ سر اڈورڈ ڈینی سن راس کو جو اس زمانہ میں لندن اسکول آف اورینٹل اسٹڈیز کے ڈائرکٹر تھے خط لکھا کہ میرے لیے فارسی ادب سے متعلق کوئی موضوع تلاش کرکے تحریر فرمائیں۔ انھوں نے جواب میں تحریر فرمایا کہ پی ایچ ڈی کے لیے ضروری ہے کہ پہلے میں کسی فارسی مخطوطہ کو ایڈٹ کروں اور اسی کے ساتھ "ہندوستان کے قدیم فارسی شعراء" پر تحقیقی مقالہ لکھوں اور یہ کام ڈاکٹر عظیم الدین احمد کی نگرانی میں ہونا چاہیے۔ سر ڈینی سن راس ڈاکٹر عظیم الدین احمد سے خوب واقف تھے اور سمجھتے تھے کہ وہ بڑی صلاحیت کے حامل ہیں اور اس سلسلے میں میری رہنمائی کرسکتے ہیں۔

تحفۂ سامی :

میں نے حسب ہدایت ڈاکٹر عظیم الدین احمد سے ملاقات کی تو انھوں نے کہا کہ سام میرزا کی "تحفۂ سامی" کے صحیفۂ پنجم کو ایڈٹ کر ڈالو کیونکہ خدا بخش لائبریری میں اس کتاب کے دو نہایت قدیم اور اچھے نسخے موجود ہیں۔ میں نے ڈیڑھ سال کی سخت محنت کے بعد "تحفۂ سامی" کے صحیفۂ پنجم کو ایڈٹ کرکے پریس کاپی تیار کی جس کو پٹنہ یونیورسٹی نے اپنے خرچ پر ۱۹۳۴ء میں پہلی بار طبع کرایا اور دنیا کے تمام فارسی کے استادوں کی خدمت میں بھیجا۔ اللہ کا کرم تھا کہ فارسی کے عالموں نے میری اس خدمت کو سراہا۔ ایرانیوں نے بھی راقم کے پاس تعریف کے خطوط لکھے جن میں میرزا محمد قزوینی، پور داؤد، محمد علی تربیت، اور رشید یاسمی تھے۔ ان کے علاوہ جرنل آف رائل ایشیاٹک سوسائٹی لندن میں پروفیسر اے آربری کے قلم سے ایک تبصرہ چھپا جس میں پروفیسر موصوف نے نہایت ہی پرزور الفاظ میں کام کی تعریف کی اور لکھا کہ راقم نے نہایت ہی صحیح طریقے سے ایڈٹ کرکے متن کو درست کیا ہے اور اس کام کو خوبی سے انجام دیا ہے۔ سید سلیمان ندوی رسالہ معارف (نومبر ۱۹۳۴ء صفحہ ۳۸۵) میں اس کتاب سے متعلق چھ صفحات پر مشتمل ایک تبصرہ کرنے کے بعد یوں رقمطراز ہیں: "مولوی اقبال حسین صاحب جنھوں نے اس حصہ کی تصحیح و اشاعت کی خدمت انجام دی ہے ہمارے شکریہ کے مستحق ہیں کہ انھوں نے فارسی ادب کے دلدادوں کے لیے یہ اچھا تحفہ پیش

کیا ہے۔ کتاب ٹائپ میں چھپی ہے اور جہاں تک ہماری نگاہ نے کام کیا ہے اس میں اغلاط گویا نظر نہیں آئے ہیں اور یقیناً یہ بڑی دیدہ ریزی کا کام ہے " شہزادہ احمد علی خاں نے مجلہ " کابل " میں جو افغانستان کے انجمن ادبی کا ماہانہ رسالہ ہے تبصرہ کرتے ہوئے راقم کے کام کی بہت تعریف کی ہے۔ اس کتاب کا دوسرا ایڈیشن ۱۹۷۲ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے شاہ ایران پبلی کیشن فنڈ کی مالی مدد سے شائع کرایا ہے۔

خدا بخش لائبریری میں ریسرچ کا کام :

۱۹۳۲ء سے ۱۹۳۴ء تک میں خدا بخش لائبریری جا کر روزانہ ۱۰ بجے سے ۴ بجے تک تصحیح اور حواشی کے تیار کرنے میں مصروف رہتا۔ بہت شکر گزار ہوں کہ ارکان لائبریری نے مجھے ایک کمرہ لائبریری کی بالائی منزل پر جو ۱۹۳۴ء کے زلزلہ میں منہدم ہو گیا اور جس میں خان بہادر عبد المقتدر بیٹھتے تھے میرے حوالہ کر دیا تھا جہاں میں اطمینان سے کام کرتا تھا۔ نواب میاں جو بانی لائبریری کے زمانے سے کسٹوڈین تھے مجھے ضرورت کی کتابیں مہیا کر دیتے تھے جس سے میرے کام میں بہت آسانی ہو جاتی تھی۔ مولانا تمنا عمادی مجیبی پھلواروی بہار کے ایک عالم، ادیب اور شاعر گزرے ہیں۔ ان کی فارسی نظم و نثر کی کتابیں ہندوستان میں کافی شہرت رکھتی ہیں۔ راقم نے مولانا کی خدمت میں ایک کاپی " تحفۂ سامی " کی روانہ کیا۔ اس کتاب کو پڑھنے کے بعد مجھے فارسی میں شکریہ کا خط لکھا اور اسی کے ساتھ ایک قطعہ اور ایک قصیدہ لکھ کر راقم کے پاس بھیجا۔ مولانا کا یہ مکتوب قطعہ و قصیدہ اُس زمانے کی فارسی نویسی کا نمونہ ہے جو پیش خدمت ہے :

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اللّٰھم صل علی سیدنا محمد عبدہ وآلہ و بارک وسلم

بصیرت افروز اہل نظر ! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

کتاب مستطاب " تحفۂ سامی " بانامہ گرامی طرح ورود ریخت، و نظر را نزہتے و دل را فرحتے بخشید ؎

ہزار شکر، کہ من خاطرت بدم ای دوست
دگر نہ کیست، کہ آرد بیاد نام مرا

مر کثرت مشاغل مانع از مشغولی تازہ بود، تاہم بکارہائے سابقہ توجہے نکردم

تا ایں تحفۂ نادرہ را بختم نرسانیدم سبحان اللہ، چہ کتابیست کہ از مطالعہ اش روح را
راحتے تازہ می رسد و نگاہ را بصیرتے بے اندازہ ۔

امروز کہ از مطالعہ آں بتوفیقہٖ تعالیٰ فراغت دست داد قلمے برداشتم، کہ حسب
ایما متعلق آں سطرے چند بنگارم کہ از تاثرات دلم و جذبات قلبم نیز خبرے دہد۔

سلاطین و امرائے دولت صفویۂ ایران (کہ مدت عمرش زیادہ از تعداد لفظ
۲۳۲ "صفویون" ۔ نیست) در مدت قلیل کارہائے نمایاں کردہ اند، و علم و ادب را آب
و رنگہا بخشیدہ کہ از ارباب تاریخ پوشیدہ نیست ۔

ازاں جملہ ایں نسخۂ نایاب از ساقی غفران مآب است ۔ کہ نسخۂ بے مثال ست
و تحفۂ یادگار ۔ افسوس کہ چندیں مدت در کنج خمول پوشیدہ ماند ۔ ہزاراں آفریں جناب
شمارا کہ بدستیاری ارکان یونیورسٹی (صوبہ بہار و اڑیسہ) ایں گوہر گراں مایہ را پیش نگاہ
ارباب نظر آوردید و ایں عروس حجلہ نشیں را از زیور طبع آراستہ جلوہ آرائے انجمن
گردید ۔ الحق ایں بہترین خدمت علم ادب است کہ از حضرت شما بانجام رسید لاسیما
مقدمۂ سنیہ و حواشی بہیہ کہ از رشحات خامۂ شماست، ازبس مفید تر است ۔

اما حواشی کہ در ذیل صفحات است بزبان انگلیسی ست، اگر آں ہم در زبان
پارسی بودے مناسب تر و مفید تر آمدے ۔

بہر گونہ مساعی جناب شما مشکور ست و سزاوار تحسین و آفریں ۔

کاش کہ توجہ ارکان یونیورسٹی، جناب شما بسوئے اشاعت حصّہائے دیگر ایں
تحفۂ نادرہ مبذول شود، کہ اہل ذوق را سیر وافی و حظّ کافی میسر آید ۔

قطعہ، و قصیدہ مختصرہ، کہ تاثرات دل در ذہن آمدہ پیش نظر است،
رجا، کہ در معرض قبول آید ۔

والسلام مع الاکرام

و منکم الضعیف عمادی مجیبی پھلواروی غفرلہٗ

دار الادب ۔ پھلواری شریف، ضلع پٹنہ

۲۶ جولائی ۱۹۳۴ء

قطعہ

بارک اللہ! سید اقبال! تحفۂ خوش بہا فرستادی
باغبانی، چمن عطا کردی شمع ہستی، ضیا فرستادی
روح را راحتے رسانیدی چشم را توتیا فرستادی
مغز سر را خوراک بخشیدی جان و دل را غذا فرستادی
صد گل آرزو ز گلبن خود بگریبان ما فرستادی
ہستی آئین جذب را ماہر کاہ را کہربا فرستادی
انچہ بفرستنی ست نزد خرد مرحبا، مرحبا فرستادی

لیکن این گوہر گراں مایہ ہیچ دانی، کجا فرستادی
تو چہ دانستیم، کہ سوئے منے این چنیں گنجہا فرستادی
من نہ دکتورم و نہ پی ایچ ڈی نزد من این چرا فرستادی
من نیم ام۔اے و نیم بی۔اے این بمن از کجا فرستادی
ہر کرا راہ بیں نیامد چشم مشعل رہنما فرستادی
بہ کسے، کو ز مدعاست تہی دولت مدعا فرستادی
این چنیں گنج شائگان ادب بمقام گدا فرستادی
این نواہائے راز اہل نیاز بمن بے نوا فرستادی

گر از حال بے نوائی من نیستت علم، تا فرستادی
یا پسیں جرعۂ ز کاس کرام
از پئے خاک دا فرستادی

تمنا عمادی مجیبی غفرلہٗ
دار الادب، پھلواری شریف، ضلع پٹنہ
۲۶ر جولائی ۱۹۳۴ء

قصیدہ

خامۂ اقبال چوں رایت املا کشید
پایۂ خود در سخن از ہمہ بالا کشید

"تحفۂ سامی" کہ بود تحفۂ نادر ترے
از پے ترتیب آں رنج و تعبہا کشید

از پے تدوین ایں نسخۂ بے مثال
زحمت ہر روزہ برد، کلفت شبہا کشید

وہ چہ کتابے، کہ ہست جاذب انظار خلق
سوئے خود از ہر کسے دامن دلہا کشید

تذکرہ شاعراں دیدہ نشد بہ ازاں
سامی روشن بیاں نقش چہ زیبا کشید

نسخۂ مجموعہ را طبلۂ عطار ساخت
گل ز چمنہا ربود، عطر ز گلہا کشید

ذوق دل و حسن ذوق ہست بروں از قیاس
از چہ فسوں ہر دو را در حد احصا کشید

طرفہ نہا دست خواں دادہ صلائے براں
از پئے اہل زباں سفرۂ یغما کشید

ہر سطرش در جہاں معجزۂ ہمچو میل
کحل بصیرت بہر دیدۂ عمیا کشید

سید اقبال من ستدہ رہ
بر رخش از نقش چاپ معجز زیبا کشید

اہل یونیورسٹی مستحق مدحت اند
عالمے از طبع ایں منت آنہا کشید

کار بسے سخت بود، لیک چو عزمش قویست
بر سر خود اینچنیں صخرۂ صما کشید

تار رباب سخن، ہیچ صدائے نداشت
تا خوش بردی از ناخن انشا کشید

جہل، کہ بنہادہ بود رخت خود اندر جہاں
بر سر خود چادرے از پر عنقا کشید

بود کنوں ہر کرا رفض ز شعر و سخن
دل بتولا نہاد، رخ ز تبرا کشید

دور می کہنہ و میکدۂ نو چو یافت
ہر کسے از اہل ذوق آمدہ غمہا کشید

از اثر سرخوشی با ہمہ بے دانشی
نقش قوی در سخن کلک تمنا کشید

قافیۂ شائگاں بہ نبود نزد آں
کوتہ دامان پاس پیش جہاں پا کشید

ﺵ

تمنا عمادی مجیبی غفرلہ
دارالادب، پھلواری شریف، پٹنہ
۲۶ر جولائی ۱۹۳۴ء

فارسی کے قدیم شعرا ہند پر مقالہ اور پی ایچ ڈی میں کامیابی :

۱۹۳۲ء کے آخر میں "تحفۂ سامی" کی تصحیح کے بعد اپنے تحقیقی مقالہ " قدیم شعرای فارسی ہند" کی طرف متوجہ ہوا۔ وقت کی قلت کی وجہ سے سخت محنت کرنا پڑتی۔ روزانہ نیورہ سے خدا بخش لائبریری ۱۰ بجے دن کو پہنچ جاتا اور چار بجے شام تک تحقیقی کاموں میں معروف رہتا پھر نیورہ واپس ہوتا۔ یہ راقم کے لیے نہایت مشکل کام تھا۔ اتوار کے دن استاد محترم ڈاکٹر عظیم الدین احمد کے رہایشی مکان واقع خواجہ کلاں پٹنہ سیٹی جاتا اور ہفتہ بھر کے مقالہ کے کاموں کو دکھاتا ان سے کاموں کی منظوری لیتا اور حسب مشورہ ردوبدل کرتا تھا۔ دسمبر ۱۹۳۴ء کو یہ کام نہایت حسن وخوبی سے انجام پایا۔ استاد محترم ڈاکٹر عظیم الدین احمد صاحب نے کہا کہ مقالہ کی تین کاپیاں ٹائپ کرا کے تین سو روپیہ فیس کے ساتھ پٹنہ یونی ورسٹی میں جمع کرا دو اور میں نے ایسا ہی کیا۔ وائس چانسلر سر ٹومس اسٹورٹ میکفرسن نے مقالہ کی ایک کاپی سر ڈینی سن راس کے پاس لندن بذریعہ ڈاک روانہ کیا اور استدعا کی کہ صاحب موصوف اپنے علاوہ دو اور ممتحن کے نام تجویز کر کے یونیورسٹی کو مطلع کریں۔ سر ڈینی سن راس نے ڈاکٹر ہادی حسن اور ڈاکٹر عظیم الدین احمد کا نام تجویز کیا مزید برآں لکھا کہ میں کچھ سوالات زبانی امتحان کے لیے بھیجوں گا جو امیدوار سے امتحان کے وقت پوچھا جائے۔ مارچ ۱۹۳۵ میں تینوں ممتحن کی رپورٹ آئی کہ یہ مقالہ پی۔ایچ۔ڈی کی ڈگری کے لیے بہت خوب ہے۔ اب زبانی امتحان لے لیا جائے۔ زبانی امتحان کے بعد کل رپورٹ یونیورسٹی سنڈیکیٹ کی میٹنگ میں پیش ہوئی تو فیصلہ ہوا کہ اقبال حسین کو پی۔ ایچ۔ڈی کے امتحان میں کامیاب ہونے کا اعلان کر دیا جائے۔ ۲۰ اپریل ۱۹۳۵ء کو راقم کو پٹنہ یونیورسٹی کا پہلا پی۔ایچ۔ڈی ہونے کا شرف حاصل ہوا۔ نتیجہ شائع ہونے کے فوراً بعد لیڈی میکفرسن اور سر ٹومس اسٹورٹ میکفرسن وائس چانسلر پٹنہ یونیورسٹی نے ذاتی خط میں راقم کو مبارک باد لکھا کہ یہ بڑے فخر کی بات ہے کہ تم پٹنہ یونیورسٹی کے سب سے پہلے پی ایچ ڈی ہوئے۔ دو سال بعد پٹنہ یونیورسٹی نے اپنے خرچ سے ۱۹۳۷ء میں اس مقالہ کو کتابی شکل میں شائع کرایا جس کو میں نے اپنے انگریزی کے استاد پروفیسر جے ایس۔ آرمر کے نام معنون کیا۔ اس کے بعد پٹنہ یونیورسٹی نے دوسرا ایڈیشن ۱۹۸۰ء میں چھپوایا۔ اس کتاب کا اردو ترجمہ بہار اردو اکادمی نے ۱۹۸۵ء میں شائع کیا اور فارسی ترجمہ بھی ایران میں ہوا ہے۔ راقم کو یہ کہنے میں کوئی جھجک محسوس نہیں ہوتی کہ یہ اپنی نوعیت کی واحد کتاب ہے اور جو حضرات فارسی زبان و ادب کا ذوق رکھتے ہیں اسے بڑی قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھتے اور استفادہ کرتے

ہیں۔ استاذ محترم حافظ محمود شیرانی نے اپنی کتاب "مقالات شیرانی" کی چھٹی جلد میں تقریباً چالیس صفحات پر مشتمل تبصرہ لکھا ہے کہ جس سے اس کتاب کی قدر و منزلت پر مفصل روشنی پڑتی ہے۔ میرے لیے نہایت فخر و عزت کی بات ہے۔

اخباروں میں راقم کی کامیابی کا تذکرہ :

ہندوستان کے اخباروں میں راقم کے پی۔ ایچ۔ ڈی ہونے کی خبر چھپی اور "السٹریٹڈ ویکلی" (Illustrated Weekly of India) نے راقم کی تصویر اپنی ایک اشاعت میں چھاپی۔ ماہنامہ "ندیم" کے اڈیٹر نے اپریل ۱۹۳۵ء کی اشاعت میں حسب ذیل نوٹ شائع کیا :

"اس وقت تک اگرچہ متعدد یونیورسٹیوں نے اپنے یہاں پی ایچ ڈی کی ڈگری قائم کر دی ہے اور متعدد مضامین پر طلبا یہ ڈگری حاصل کر رہے ہیں۔ لیکن یہ فخر صرف بہار کو حاصل ہوا ہے کہ فارسی سے متعلق سب سے پہلا مضمون (Thesis) ہماری یونی ورسٹی کے ایک ہونہار طالب علم مسٹر اقبال حسین ایم۔ اے نے لکھا ہے۔ اور نہ صرف یہ کہ وہ منظور ہو گیا ہے بلکہ جہاں تک ہم کو علم ہے مسٹر ڈینی سن راس جیسے مشہور نقاد نے بھی اس کی بڑی تعریف کی ہے۔ اس فخر کے حصول میں جہاں مسٹر اقبال کی کوششوں کو بہت کچھ دخل ہے وہاں ہمارے ڈاکٹر عظیم الدین احمد صاحب قبلہ کی ہدایت و رہنمائی کا بھی بڑا حصہ ہے۔ اور ہم لائق استاد و سعادت مند شاگرد دونوں کو اس کامیابی پر مبارک باد پیش کرتے ہوئے دعا کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ دونوں قسم کے افراد ہم میں پیدا کرے۔"

ممتاز لوگوں کی رائے : پٹنہ یونیورسٹی نے اس کتاب کی ایک ایک کاپی مختلف لوگوں کو بھیجا کہ کتاب کو دیکھ کر اپنی قیمتی رائے سے سرفراز کریں۔ حیدرآباد دکن سے سر اکبر حیدری نے اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے تحریر فرمایا کہ "ایسی کتابیں میرے لیے نہایت دلچسپ ہیں کیونکہ ان سے پتہ چلتا ہے کہ ایرانی تمدن کو ہندوستان نے کس قدر جلد اپنے میں جذب کر لیا تھا۔" دہلی سے سر تیج بہادر سپرو اور مسٹر جی۔ آر۔ نور زاد نے راقم کی خدمات کو سراہا۔ لاہور سے پروفیسر محمد شفیع اور پروفیسر محمد صدر الدین، بمبئی سے پروفیسر نجل الرحمن، کلکتہ سے ڈاکٹر محمد اسحق اور پروفیسر محفوظ الحق نے بھی اس کتاب کی خوبیوں کی تعریف کی۔ راقم کو اس کی خوشی ہے کہ اس کی یہ کتاب ہر جگہ مقبول ہوئی اور اب تک قدر کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہے۔

پانچواں باب

راونشا کالج کٹک اور وہاں کی ملازمت

۱۹۳۵ سے ۱۹۳۶

ملازمت کی تلاش اور تقرری :

۱۹۳۵ء میں پی۔ ایچ۔ ڈی پاس کرنے کے بعد نوکری کی تلاش ہوئی تو معلوم ہوا کہ صوبہ بہار و اڑیسہ میں سرکاری اور غیر سرکاری صرف چھ کالج ہیں جن میں فارسی اساتذہ کی کل جگہیں تقریباً گیارہ ہیں۔ راقم غیر سرکاری کالج سے دلچسپی نہ رکھتا تھا۔ اس طرح صرف چھ جگہیں باقی رہ گئیں۔ بہار میں نوکری کے امکانات کم نظر آتے تھے اس لیے میں نے وائس چانسلر لکھنؤ یونیورسٹی سے ملاقات کی۔ انھوں نے افسوس ظاہر کیا اور کہا کہ ابھی کوئی جگہ خالی نہیں، دسمبر میں خالی ہونے پر مطلع کروں گا۔ اسی زمانے میں خان بہادر عبد المقتدر نے جن کا تبادلہ خدا بخش لائبریری سے راونشا کالج (Ravenshaw College) کٹک بحیثیت پروفیسر ہوا تھا۔ اپنی ملازمت کی مدت پوری کر کے اپریل ۱۹۳۵ء میں پنشن پائی۔ اس جگہ کو پُر کرنے کے لیے گورنمنٹ نے اشتہار کیا تو میں نے درخواست دی۔ اسی کے ساتھ گورنمنٹ نے مولوی اصغر علی ایم اے کو جو مظفر پور کے کسی اسکول میں فارسی کے استاد تھے عارضی لکچرر مقرر کر دیا۔ صاحب موصوف ۱۰ر جولائی ۱۹۳۵ء سے راونشا کالج میں کام کرنے لگے اور مستقل لکچرر کی تقرری کی کارروائی شروع ہو گئی۔ اس زمانے میں لکچرر کے انتخاب کے لیے پٹنہ یونیورسٹی کی ایک کمیٹی تھی جس کا صدر پٹنہ یونیورسٹی کا وائس چانسلر ہوتا تھا، دو مستقل ممبر D.P.I اور پٹنہ یونیورسٹی سنڈیکیٹ کا ایک ممبر ہوتا تھا۔ علاوہ ان کے متعلقہ مضمون کے دو ماہرین بھی ممبر ہوا کرتے تھے۔ فارسی لکچرر کی اس تقرری کے لیے ڈاکٹر عظیم الدین احمد اور ڈاکٹر ہادی حسن ماہرین کی حیثیت سے مقرر کیے گئے۔ راقم کا نام اول اور مولوی اصغر علی کا نام دوم تجویز ہوا۔ مجوزہ ناموں کو وزیر تعلیم بہار و اڑیسہ کو بھیج دیا گیا۔

حکومت بہار نے انتخاب کر کے راقم کو بہار اینڈ اوڑیسہ ایجوکیشنل سروس کے جونیر برانچ میں لکچرر مقرر کر دیا اور میں نے ۲۶ اگست ۱۹۳۵ سے راونشا کالج کٹک میں فارسی کے لکچرر کی حیثیت سے خدمت انجام دینا شروع کر دیا۔ فارسی پڑھنے والے طلبا کی کل تعداد آئی۔ اے اور بی اے میں صرف چھ تھی۔

کالج کے تین پرنسپل :

جب میں کٹک پہونچا تو ڈاکٹر بابا کرتار سنگھ کالج کے پرنسپل تھے۔ ہندوستان میں کیمسٹری کے بہت نامور پروفیسر تھے۔ ان کے والد بابا جیون سنگھ لفٹننٹ کرنل تھے اور یہ لوگ بابا گرونانک کی اولادیں تھے۔ سکھوں میں بابا کرتار سنگھ کی بڑی عزت تھی۔ ان کے ساتھ دو ہی ماہ خدمات انجام دینے کا موقع ملا تھا کہ ان کا تبادلہ پٹنہ سائنس کالج میں ہو گیا۔ موصوف نہایت شریف انسان تھے۔ میرے قیام کے لیے ایک چھوٹا سا بنگلہ مخصوص کر دیا تھا جس کی اطلاع ایک خط کے ذریعہ مجھے پٹنہ میں دے دی تھی۔ اگرچہ میں جونیر لکچرر تھا انھوں نے میرے کٹک پہنچنے کے تیسرے دن رات کے کھانے پر مجھے مدعو کیا اور ایک ہفتہ کے بعد مجھے گرودوارہ داتن صاحب دکھایا۔ مجھے ان کے تبادلہ پر بہت افسوس ہوا۔ ان کے بعد مسٹر جھینجا جو راقم کے دوران تعلیم پٹنہ کالج کے نامور استاد تھے اور مجھ سے اچھی طرح واقف تھے پرنسپل ہو کر آئے۔ مجھے یہاں دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ موصوف جب تک رہے شفقت سے پیش آتے رہے۔ چونکہ میں بنگلہ میں اکیلا رہتا تھا اکثر خیریت معلوم کرنے کے لیے اپنے چپراسی کو بھیجا کرتے تھے۔ ان کے بعد مسٹر تریپاٹھی جو اڑیسہ کے باشندہ تھے پرنسپل ہو کر آئے۔ ان سے راقم کی کبھی کی ملاقات نہ تھی مگر مجھ پر بڑے مہربان رہا کرتے تھے۔

راونشا کالج کی عمارت، اساتذہ اور ڈائمنڈ جبلی :

صوبہ بہار و اڑیسہ میں تین سرکاری کالج تھے جن میں پٹنہ کالج ہر حیثیت سے بالاتر اور شہرت کا حامل تھا۔ اس کے بعد راونشا کالج پوری ہندوستان میں اپنی ایک اہم حیثیت رکھتا تھا۔ یہ کالج محلہ چولیا گنج میں اپنے احاطہ کے اندر واقع ہے۔ کالج کی عمارت سے ملحق ہوسٹل بھی ہے۔ میں جب یہاں پہنچا تو تقریباً دس سال پہلے کالج کی عمارت تعمیر ہو چکی تھی۔ عمارت بڑی شاندار تھی جس کو کلکتہ کی مارٹن کمپنی نے ٹھیکہ پر بنایا تھا۔ کالج میں اس کی شان و شوکت کے مطابق اساتذہ نہ تھے۔ اساتذہ میں سوائے میرے کوئی مسلمان نہ تھا۔ بین الاقوامی شہرت رکھنے والے پروفیسروں میں صرف دو پروفیسر ایک ڈاکٹر

بابا کرتار سنگھ کیمسٹری کے اور دوسرے پروفیسر پریجا بوٹنی کے تھے۔ ان کے علاوہ مشہور پروفیسروں میں صرف تین پروفیسر تھے۔ ڈاکٹر بلبدھر پرشاد (کیمسٹری کے) پروفیسر موسنی موہن سیناپتی (فلسفہ کے) اور رائے صاحب مہنتی (تاریخ کے) پروفیسر تھے۔ کالج میں کھیل کود کا کچھ معمولی سا انتظام تھا۔

جوبلی :

بھتیجا صاحب کی آمد کے کچھ دنوں بعد ۲۶ جنوری ۱۹۳۶ء میں راونشا کالج کٹک کی ڈائمنڈ جوبلی بہت شان وشوکت سے منائی گئی۔ سر کورٹنی ٹیرل چیف جسٹس پٹنہ ہائی کورٹ نے جلسہ کی صدارت کی۔ اس موقع پر پرنسپل بھتیجا نے اپنا ایک پیغام دیا اور اس میں اس کی خوش خبری دی کہ بہت جلد اڑیسہ میں ایک یونیورسٹی قائم ہو جائے گی جس سے صوبہ کو فائدہ پہنچے گا اور ہر طرف علم وخرد کی روشنی پھیلے گی اور اس سے عوام کو نہایت خوش حالی حاصل ہوگی۔ اپنے خطبہ میں صاحب موصوف نے فرمایا کہ خان بہادر عبدالمقتدر کے بعد ان کی جگہ پر ایک نوجوان مگر فارسی کے لائق استاذ کی تقرری ہوئی ہے جو کہ پٹنہ یونیورسٹی کے پہلے پی ایچ ڈی ہیں۔

میرا تبادلہ :

پہلی اپریل ۱۹۳۶ء کو اڑیسہ کا ایک نیا صوبہ قائم ہوا۔ چونکہ راقم کی تقرری خاص راونشا کالج کے لیے ہوئی تھی اس لیے یہاں سے تبادلہ کا امکان بہت کم تھا مگر فوکس صاحب نے جو اس وقت ڈی پی آئی تھے راقم اور دوسرے تین پروفیسروں کا تبادلہ پٹنہ کرا دیا۔ مسٹر کے پی سنہا، ڈاکٹر بل بھدر پرشاد اور مسٹر بھیرب ناتھ ردھنگی کٹک ہی میں رہ گئے۔ کئی برس کے بعد مسٹر کے پی سنہا کا تبادلہ مظفر پور کالج میں ہو گیا۔ پروفیسر ردھنگی عرصہ تک کٹک میں رہنے کے بعد آئی اے ایس مقرر ہوئے۔ ڈاکٹر بل بھدر پرشاد اڑیسہ میں رہ گئے۔ وہاں بڑی عزت پائی اور ڈی پی آئی ہو کر پنشن پائی۔ پنشن پانے کے بعد پٹنہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر ہوئے اور بعد ازاں الہ آباد یونیورسٹی کے وائس چانسلر رہے۔ موصوف اڑیسہ سے بہت مانوس ہو گئے تھے۔ ان کے لڑکے نے اڑیسہ میں ایک اعلیٰ خاندان کی لڑکی سے شادی کی اور آج کل محکمہ جنگلات کے بڑے افسر ہیں۔ ڈاکٹر بل بھدر پرشاد نہایت خوب آدمی تھے اور ہمیشہ اپنے ہر کام کو محنت اور ایمانداری سے انجام دیتے رہے۔ کئی سال ہوئے کہ پٹنہ چھوڑ کر بھوبنیشور چلے گئے اور اپنے لڑکے کے ساتھ وہیں قیام پذیر ہوئے۔ لندن یونیورسٹی نے صاحب موصوف کو ان کے شائع شدہ بلند پایہ مضامین پر ڈی ایس سی کی ڈگری عطا کی

کی تھی۔ ڈاکٹر صاحب میرے دوست تھے اور برابر خط و کتابت ہوتی رہتی تھی۔ ہمارے ہم سن تھے اور جوانی میں نہایت تندرست تھے، مگر اب صحت اچھی نہیں رہتی تھی اور ۱۹۸۷ء میں قضا کر گئے۔

کٹک کا قیام :

دوران قیام کٹک میں بالکل تنہا رہتا تھا مگر کوئی تکلیف نہ تھی، کیونکہ پیارو میاں جو پٹنہ میں کرنل ڈنڈس کے یہاں باورچی کا کام کر چکا تھا میرا کھانا پکاتا تھا۔ اچھا کھانا اور مٹھائیاں میرے ذوق کے مطابق تیار کر کے کھلاتا تھا۔ پیارو میاں کے علاوہ ایک اور نوکر تھا جو دوسرے مختلف کام انجام دیا کرتا۔ عمر درازی اور بال کے سفید ہونے کی وجہ سے پیارو میاں کو میں "حضرت خضر" کے نام سے پکارا کرتا تھا اور وہ اس سے خوش ہوتا۔ پیارو میاں کرنل ڈنڈس کا بہت وفادار خانساماں تھا۔ انھوں نے ہندوستان سے جاتے وقت اس کی خدمت سے خوش ہو کر اس کے اخراجات کے لیے پچیس روپیے ماہانہ کا وظیفہ مقرر کر دیا تھا۔ ہر تیسرے ماہ امپریل بنک جا کر اپنا وظیفہ وصول کر لیا کرتا تھا۔ بنگلہ اگرچہ چھوٹا تھا مگر پر فضا مقام پر واقع تھا۔ اس کی پشت پر تاڑبہ کینل کی نہر بہتی تھی۔ اس کے متصل ایک بڑے میدان میں سادھو سنت پوری آتے جاتے خیمہ ڈال کر قیام کرتے تھے جن کے درشن کے لیے شہر کے ہندو آیا جایا کرتے تھے۔ اس سے یہاں بہت چہل پہل اور رونق رہا کرتی تھی۔ بابو جگن ناتھ مصرا جو کٹک کالج کے بڑا بابو تھے ان کو ان لوگوں سے بڑی عقیدت تھی۔ راقم کو اپنے ساتھ لے کر جاتے اور مذہبی باتوں کو بغور سنتے، کبھی کبھی یہ باتیں میرے لیے بہت دل چسپ ہوتی تھیں۔ انھیں مہاتماؤں میں ایک نے میرے بائیں بازو پر لال مسّا دیکھ کر کہا کہ جس شخص کے بائیں بازو پر ایسا مسّا ہوتا ہے وہ لوگوں پر مہربان رہتا ہے مگر لوگ اس کے کبھی ممنون نہیں ہوتے۔ یہ بات بالکل صحیح ثابت ہوئی اور یہ میری زندگی کا تجربہ ہے۔

میرے احباب :

یہاں میرے دوستوں میں بھیرب ناتھ ردھنگی جو پٹنہ کالج میں مجھ سے ایک سال پیچھے تھے میرے یہاں آتے اور کبھی میں ان کے یہاں جاتا۔ ان کے علاوہ پروفیسر گھنشیام داس جو پٹنہ کالج میں مجھ سے دو سال آگے تھے ہفتہ میں دو بار ضرور آتے۔ اس طرح وقت گذر جاتا اور تنہائی محسوس نہ ہوتی۔ محسن صاحب پنشن یافتہ ڈپٹی کلکٹر کٹک کے رہنے والے تھے اور ان کی شادی لکھنؤ ہوئی تھی، شعر و شاعری سے دل چسپی رکھتے تھے، میرے یہاں اکثر شام کو آتے اور دوران گفتگو اردو اشعار سناتے۔ ان کے اکثر اشعار اچھے ہوتے تھے۔ پیارو میاں ان سے خوش نہ رہتے کیونکہ ہر ۱۵۔۲۰ منٹ پر چائے یا کافی

بنانا پڑتی تھی۔ ادر محسن صاحب پکار کر کہا کرتے کہ جلد چائے لاؤ ورنہ شعر کا لطف جاتا رہے گا۔

میرے ایک عزیز دوست اور ان کی اہلیہ :

ان دنوں میرے ایک دوست مسٹر سولیون اپنی اہلیہ سیلویا کے ساتھ کھڑک پور میں رہا کرتے تھے۔ دونوں مجھ سے بہت محبت کرتے تھے۔ جب کبھی میری طبیعت گھبراتی پرنسپل صاحب سے اجازت لے کر جمعہ کی شام کو کھڑک پور چلا جاتا کیونکہ سنیچر کو میرا کوئی کلاس نہ تھا اور سوموار کو سویرے واپس آجاتا۔ ان کے ساتھ بہت ہنسی خوشی سے وقت گذرتا تھا۔ سیلویا پیانو خوب اچھا بجاتیں اور اسی کے ساتھ انگریزی گانے بھی خوش الحانی سے گاتی تھیں۔ حافظ کی ایک غزل "مطرب خوش نوا بگو تازہ بتازہ نو بنو" یاد کرلی تھی۔ اور پر لطف انداز سے گاتیں اور خوب ہنستی تھیں۔ ہم تینوں کی بڑی تفریح رہتی۔ آزادی کے بعد ۱۹۴۸ء میں جو پہلی ہولی کلکتہ میں منائی گئی، اس میں ہندو عوام گوروں کے ساتھ نہایت بدتمیزی سے پیش آئے، اور خصوصاً گوروں کی عورتوں پر خوب رنگ ڈالا۔ ان بدعنوانیوں کا تذکرہ کلکتہ کے مشہور اخبار "اسٹیٹس مین" میں بھی کیا گیا۔ میرے دوست اور ان کی اہلیہ الغرض بھارت کی جدید تہذیب سے تنگ آکر کناڈا چلے گئے، اور وہاں کی شہریت اختیار کرلی۔ جب تک یہ لوگ زندہ رہے راقم کو نئے سال کا کارڈ برابر بھیجا کرتے تھے۔ چھ سال ہوئے کہ ان دونوں کا انتقال ہوگیا۔ یہاں پر یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ راقم نے اس سال کی ہولی کا بدنما منظر کلکتہ میں اپنی نظروں سے دیکھا ہے اور پولیس خاموش تماشائی بنی دیکھتی رہتی تھی۔

کبھی کبھی دوستوں کے ساتھ تفریحاً پوری چلا جاتا تھا۔ کچھ دوست تو سمندر میں خوب نہاتے اور لطف اندوز ہوتے اور میں ساحل پر بیٹھ کر موجوں کا اتار چڑھاؤ دیکھتا، اپنی زندگی کے چند گزشتہ سالوں کے اتار چڑھاؤ نظروں کے سامنے آجاتے، خدا کا شکر ادا کرتا کہ میرے وہ برے دن ٹل گئے۔

کٹک کے لوگ اور قدم رسول :

کٹک کے عوام الناس ان دنوں عام طور سے صلح پسند انسان تھے اور سادہ زندگی گزارتے مسلمانوں کی آبادی تین فی صد تھی۔ ہندو مسلم دونوں یکساں لباس، دھوتی کرتا، پہنتے اور شکل سے دونوں کا امتیاز ہوپاتا تھا۔ کچھ مخصوص تعلیم یافتہ مسلمان شیروانی، پائجامہ یا انگریزی لباس پہنا کرتے تھے۔ مسلمان عام طور پر سادہ لوح اور قدرے توہم کے شکار تھے۔ کٹک میں ایک چہار دیواری کے اندر ایک پتھر پر ایک مبہم گول سا نشان ہے، جو سنگی عمارت میں اونچے جگہ پر محفوظ رکھا ہوا ہے جس کا

لوگ بڑا احترام کرتے ہیں۔ اپنی مصیبت اور پریشانی سے چھٹکارا پانے کے لیے وہاں جاکر دعائیں مانگتے ہیں۔ یہ چہار دیواری اور عمارت شجاع الدین محمد خاں حاکم اڑیسہ کی تعمیر کردہ ہیں۔ ایک مرتبہ میرا خانسامہ پیارو میاں مجھے وہاں لے گیا اور قدم رسول کو دکھایا۔ عمارت کے اندر کی دیوار پر لکھے ہوئے اشعار پڑھنے کے لیے مجھے کہا۔ راقم کو اشعار یاد نہیں مگر مفہوم کچھ یاد ہے جو یہ ہے: "شجاع الدین محمد خاں حاکم اوڑیسہ کو اس بات کی خواہش ہوئی کہ قدم رسول کے بارے میں تحقیق کرے مگر احترام رسول کو مدنظر رکھتے ہوئے اس نشان کا احترام کیا کیونکہ اس کا انتساب حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے۔"

ایک پرلطف واقعہ :

ہرنلے صاحب اڑیسہ کے کمشنر تھے اور ریوونشا کالج کٹک کی مجلس عاملہ کے صدر بھی تھے۔ اسی توسط سے میری ان کی شناسائی ہوئی۔ ان کے خاندان کا تعلق فارسی زبان سے تھا۔ چونکہ میں بھی فارسی کا استاد تھا اس لیے میری بہت عزت کرتے تھے۔ موصوف کے دادا پادری ہرنلے ایران میں عیسائی مذہب کے مبلغ تھے۔ انھوں نے انجیل مقدس کا فارسی میں ترجمہ کیا ہے اور ان کے چچا ڈاکٹر ہرنلے کسی زمانہ میں کلکتہ مدرسہ میں پرنسپل رہ چکے تھے اور خود کمشنر صاحب بھی فارسی جانتے تھے۔ اس لیے تعلقات خوش گوار ہو گئے تھے۔ راقم کو کئی بار اپنے یہاں کھانے پر مدعو کیا۔ ان اوقات میں موصوف فارسی زبان وادب سے متعلق گفتگو کیا کرتے تھے۔ انھی دنوں ۱۹۳۶ء میں شاہ جارج پنجم کا انتقال ہوا۔ اظہار غم کے لیے بلا امتیاز مذہب وملت تمام ہندوستانیوں نے اپنے بازو پر دو انچ چوڑی سیاہ کالی پٹی باندھی اور گرجوں میں دعائے مغفرت ہوئی۔ اس کو دیکھ کر کٹک جامع مسجد کے امام کے دل میں خیال پیدا ہوا کہ جمعہ کے دن بعد نماز یہاں بھی شاہ جارج پنجم کے لیے دعائے مغفرت کی جائے۔ امام موصوف میرے اور ہرنلے صاحب کے تعلقات سے بخوبی واقف تھے۔ انھوں نے ہرنلے صاحب سے کہا کہ اقبال صاحب سے کہیے کہ آئندہ جمعہ کی نماز کے بعد جامع مسجد میں دعائے مغفرت کرائیں ہم سب ان کے ساتھ دعا کریں گے۔ ہرنلے صاحب نے فرمایا کہ اقبال صاحب سرکاری ملازم ہیں میں ان سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔ باوجود اس کہنے کے صاحب موصوف نے پرنسپل بھتیجا کو اس سلسلے میں کچھ ہدایت دی جو مجھے معلوم نہ ہو سکی۔ بھتیجا صاحب نے مجھ سے کہا کہ اگر ناگوار نہ گذرے تو شاہ جارج پنجم کی مغفرت کے لیے جامع مسجد میں دعا کرا دو۔ اس کے ساتھ ہی مجھ سے کہا کہ فوراً واپس چلے آنا کیونکہ انھیں اندیشہ

تھا کہ مخالفت ہوگی اور نوبت مار پیٹ تک کی آسکتی ہے۔ میں بادلِ ناخواستہ مسجد گیا اور جمعہ کی نماز میں شرکت کی۔ اس روز جمعہ کی نماز کے بعد تھوڑے سے مقتدی جو غالباً امام مسجد کے بہی خواہ تھے ٹھہرے ہوئے تھے۔ میں نے شاہ جارج پنجم مرحوم کی خوبیاں بیان کرکے کہا کہ حاضرین دعا کے لیے ہاتھ اٹھائیں اور دعا کریں کہ خدا مرحوم کے عذاب میں کمی فرمائے۔ سب نے دعا کی مگر امام موصوف اس سے خوش نہ ہوئے کیونکہ ان کا ارادہ تھا کہ اسلامی طریقہ سے مرحوم کی فاتحہ خوانی ہو۔ بعد نماز امام موصوف ہر ملے صاحب سے ملے اور کل باتوں سے انھیں آگاہ کیا۔ ہر ملے صاحب نے راقم کو بلا کر تمام باتیں دریافت کیں۔ جب مجھ سے کچھ مطمئن نہ ہوئے تو میں نے عرض کیا شاہ مرحوم کے لیے میری یہ دعا کہ "اے خداوند امرحوم کے عذاب میں کمی فرما۔" عین انجیل مقدس کے مطابق ہے۔ پتہ نہیں شاہ جارج پنجم کے عذاب میں کمی ہوئی یا نہیں لیکن اتنا تو ضرور ہے کہ اس دعا نے میرے عذاب میں کمی کرا دی۔ کیونکہ کمشنر صاحب نے کوئی ناراضگی کا اظہار نہ کیا۔ امام موصوف کو کیا سوجھی تھی کہ جو کام وہ خود کر سکتے تھے مجھ پر اس کام کا بوجھ کیوں ڈالا۔ میرے دوست اختر اورینوی مرحوم نے اس قصہ کو اپنی کتاب "سیمنٹ اور ڈائنا مائٹ" میں ایک نہایت دلچسپ افسانہ بنا کر چھاپا ہے۔ جس کا عنوان ہے "آکے سجادہ نشیں ہوا قیس ہوا میرے بعد۔"

اُڑیسہ کا نیا صوبہ :

پہلی اپریل ۱۹۳۶ء کو اڑیسہ کا نیا صوبہ قائم ہوا۔ اور جس کے گورنر سر جان ہبک ہوئے۔ صاحب موصوف گورنر بہار و اڑیسہ کے ایگزیکیٹو کونسل کے ممبر تھے اور ان کو ترقی دے کر گورنر اڑیسہ بنایا گیا۔ آئی۔ سی۔ ایس تھے اور کیمبرج میں تعلیم پائی تھی۔ نہایت صاف گو اور اعتدال پسند آدمی تھے اور رموز سلطنت سے خوب واقف تھے۔ اڑیسہ میں رہ کر اپنی خدمتوں کی بدولت بڑا نام پیدا کیا۔ صاحب موصوف راقم سے واقف تھے کیونکہ والد مرحوم نے ان کی ماتحتی میں کئی سال کام کیا تھا۔ ہبک صاحب نے حلف وفاداری بحیثیت گورنر راونشا کالج کٹک کے ہال میں اٹھائی تھی کیونکہ اس سے بڑا کوئی دوسرا ہال شہر میں نہ تھا۔ صاحب موصوف جب گورنر اڑیسہ ہو کر آئے تو ان کے قیام کا سامان پوری میں سمندر کے کنارے ایک بڑے مکان میں کیا گیا۔ میں نے ہبک صاحب سے پوری جا کر ملاقات کی۔ یہ سن کر ان کو بہت افسوس ہوا کہ راقم کا تبادلہ عنقریب اڑیسہ سے بہار کر دیا جائے گا۔ ہبک صاحب کے کٹک کے آنے کے دن ایک دلچسپ واقعہ پیش آیا۔ ان کے آنے کے چند گھنٹے پہلے ان کا بی۔ اے بذریعہ ریل

کٹک اسٹیشن پہنچا۔ ایک ڈپٹی کلکٹر، ضلع کا ناظر اور چند چپراسی سامان اٹھوانے کے لیے اسٹیشن پر موجود تھے۔ ناظر پان کھائے ہوئے تھا۔ جب پرسنل اسسٹنٹ سے باتیں کرنے لگا تو پان کی کچھ چھینٹیں پرسنل اسسٹنٹ کے کپڑے پر پڑ گیئں۔ برہم ہو کر پی۔اے نے ایک طمانچہ سن رسیدہ ناظر کو رسید کیا۔ وہ غریب فریاد کر کے رونے لگا اور بہت لوگ جمع ہو گئے۔ کچھ لوگ تو پی اے کو زدوکوب کرنے کے لیے تیار ہوئے مگر ڈپٹی کلکٹر نے بیچ بچاؤ کر کے معاملہ کو ختم کرا دیا۔ یہ خبر دوسرے دن اخباروں میں سرخی دے کر شائع کی گئی۔

۱۹۳۶ء میں جب کالج گرمیوں کی تعطیل میں بند ہوا تو راقم چارج دے کر کٹک سے پٹنہ کالج چلا آیا۔ جس روز راقم کٹک سے پٹنہ آرہا تھا کچھ طلبا نے ایک الوداعی پارٹی دی، جس میں پرنسپل ترپاٹھی اور قانون کے لکچرر عبدالسبحان خاں جو بعد میں حکومت اڑیسہ کے وزیر بھی ہوئے اس تقریب میں شریک تھے۔ اس موقع پر جو تصویر لی گئی تھی اس کی ایک کاپی میرے پاس اب تک موجود ہے اور پرانے شاگردوں کی اس سے یاد تازہ ہوتی ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ میرا کٹک کا قیام نہایت آرام اور سکون سے گذرا۔

پوری کا مندر :

پوری کا مندر اور رتھ یاترا دیکھنے کے قابل ہے۔ راقم نے اس بلند اور خوبصورت مندر کو سنگھ دروازے پر کھڑا ہو کر دیکھا ہے اور اس کی بناوٹ سے متاثر ہوا ہے۔ رتھ یاترا بھی دیکھا ہے جس میں لاکھوں آدمی شریک ہوتے ہیں۔

چھٹا باب

ملازمت بحیثیت لکچرر

۱۹۳۶ سے ۱۹۳۸

پٹنہ کالج میں واپسی، بدلا ہوا ماحول اور اساتذہ :

۱۹۲۸ء میں ایم۔ اے کرنے کے بعد آٹھ سال تک اپنے کالج سے جدا رہا۔ آٹھ سال بعد ۱۳ر جولائی ۱۹۳۶ء میں جب راونشا کالج سے راقم بدل کر پٹنہ کالج آیا تو ایسا محسوس ہوا کہ میں آٹھ سال کی جلا وطنی کے بعد اپنے گھر لوٹ آیا ہوں۔ ان چند گزشتہ سالوں میں پٹنہ کالج کی دنیا بدل چکی تھی۔ آئی ای ایس کے انگریز پروفیسر اپنی ملازمت کی مدت پوری کر کے جا چکے تھے اور انڈین ایجوکیشنل سروس ختم کر کے بہار و اڑیسہ ایجوکیشنل سروس درجہ اول قائم ہو گئی تھی جس میں بہار اور بہار سے باہر کے قابل ہندوستانی افراد کی تقرری ہونے لگی تھی۔ اس کالج کے پرانے آئی۔ ای۔ ایس کے پروفیسروں میں صرف مسٹر آرمر رہ گئے تھے جو میری آمد پر کالج کے پرنسپل تھے۔ انہی کے زمانہ میں راقم کی کتاب "ہندوستان کے قدیم فارسی شعراء" چھپی اور میں نے اس کتاب کو ان کے نام سے معنون کیا۔ پٹنہ یونیورسٹی نے ۱۹۳۷ء میں اسے پہلی بار شائع کیا۔ ان کے علاوہ ۱۹۳۶ء سے ۱۹۴۴ء تک مسٹر بھٹیجا، ڈاکٹر ہری چند اور گاہے گاہے ڈاکٹر ایس سی سرکار عارضی پرنسپل ہوئے۔ مسٹر لال انگریزی کے پروفیسر تھے۔ آپ علی گڑھ سے ملازمت چھوڑ کر پٹنہ کالج آئے تھے۔ ان دنوں انگریزی کے دو نوخیز استاد پروفیسر فضل الرحمن اور پروفیسر کلیم الدین احمد بڑی تیزی سے اپنے فن میں ابھر رہے تھے۔ شعبہ تاریخ میں ڈاکٹر ایس۔ سی سرکار تاریخ ہند اور پروفیسر دائی۔ جے تاراپور والا یوروپین تاریخ کے ماہر تھے۔ یہ دونوں تاریخ خوب اچھی پڑھاتے۔ انھیں کے ساتھ ڈاکٹر کے کے دت اور پروفیسر حسن عسکری شعبہ تاریخ میں اچھی شہرت حاصل کر رہے تھے۔ شعبۂ اقتصادیات میں ڈاکٹر گیان چند صاحب نے کافی شہرت حاصل کی تھی۔ موصوف "Indian

(انڈین اکنومک کانفرنس) Economic Conference - کے صدر بھی ہوئے جو بڑا اعزاز ہے۔ کچھ عرصہ بعد حکومت نے انھیں مختلف بڑے بڑے عہدوں پر فائز کیا۔ پروفیسر گورکھ ناتھ سنگھ نے بھی اس شعبہ میں اپنا ایک مقام پیدا کر لیا تھا اور بعد میں ڈی پی آئی ہو کر پنشن پائی۔ شعبۂ فلسفہ میں ڈاکٹر ڈی۔ ام۔ دت اور شعبۂ نفسیات میں پروفیسر جمنا پرشاد اچھی شہرت کے حامل تھے۔ پروفیسر جمنا پرشاد پٹنہ یونیورسٹی کے رجسٹرار ہوئے اور بعد میں رانچی کالج کے پروفیسر پرنسپل بھی ہوئے۔ پنشن پانے سے پہلے مرض سرطان میں انتقال کیا۔ بہت خوب آدمی تھے اور طلبا کے درمیان نہایت عزیز رہے اس زمانے میں حکومت بہار نے شعبہ جغرافیہ کی طرف جب خصوصی توجہ دی تو مسٹر قاضی ظہیر احسن اور مسٹر سید عبدالمجید کی تقرری بحیثیت لکچرر عمل میں آئی۔ ان دونوں حضرات نے اپنی محنت اور کوشش سے اس شعبہ کو بہت ترقی دی۔ مسٹر سید عبدالمجید نے بعد میں لندن سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی اور سرکاری خدمت سے پنشن پانے کے بعد کالج آف کامرس پٹنہ کے پرنسپل ہوئے۔ قاضی ظہیر احسن تقسیم ہند کے بعد رانچی سے کراچی چلے گئے۔ شعبہ سنسکرت میں پنڈت رام اوتار شرما کی جگہ ڈاکٹر اننتا پرشاد بنرجی شاستری جو سنسکرت زبان اور آثار قدیمہ کے ماہر تھے شعبہ کے صدر ہوئے۔ حکومت برطانیہ نے انھیں ایم۔ بی۔ ای کے خطاب سے سرفراز کیا تھا۔ شعبہ ہندی میں ڈاکٹر ایشوروت تھے شعبہ اردو، فارسی اور عربی کے صدر ڈاکٹر ابو نصر محمد علی حسن تھے۔ ان کے ماتحت پروفیسر عبدالمنان، پروفیسر عبدالمجید اور راقم شعبہ فارسی میں استاد تھے۔ شعبۂ اردو میں حافظ شمس الدین احمد اور سید نجم الہدیٰ تھے۔ کچھ دنوں بعد سید اختر احمد کی تقرری بحیثیت لکچرر ہوئی، جنھوں نے بعد میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی اور آخر میں صدر شعبہ اردو ہو کر پنشن پائی۔ کپتان محمد اسماعیل عربی کے اسسٹنٹ پروفیسر تھے۔

پرنسپل بھٹنجا اور کالج کا یادگار جلسہ :

راقم نے ۱۹۲۷ء سے ۱۹۵۲ء تک پٹنہ کالج میں کل پانچ مستقل پرنسپلوں کی ماتحتی میں کام کیا جن میں ایک انگریز اور چار ہندوستانی تھے۔ مگر مسٹر بھٹنجا میں جو دور بینی اور انتظامی صلاحیت نظر آئی وہ میں نے کسی اور میں نہ پائی۔ ۱۹۳۶ء میں راونشا کالج کٹک کی ڈائمنڈ جوبلی منائی گئی، انھوں نے اس کا انتظام اتنے اچھے ڈھنگ سے کیا کہ کل پروگرام اپنی تمام رونق کے ساتھ بڑی ہی خوش اسلوبی سے انجام پایا جس کو راقم نے خود اپنی نظروں سے دیکھا ہے۔ ۱۹۳۶ء میں جب بھٹنجا

صاحب پٹنہ کالج کے پرنسپل ہوکر آئے تو یہ کالج اپنی زندگی کے چھہترویں سال میں داخل ہو رہا تھا۔ پرنسپل جھینجا صاحب کے زیر انتظام ۱۲ دسمبر ۱۹۳۷ء کو کالج کا "Commemoration Day" یعنی یادگاری دن نہایت ہی شان و شوکت سے منایا گیا جس کی صدارت سر مورس ہیلیٹ گورنر بہار نے کی۔ پرنسپل موصوف نے نہایت خوبی سے پروگراموں کو ترتیب دیا اور نہایت حکمت عملی سے اپنے ماتحت پروفیسروں سے کام لے کر اس تقریب کو کامیاب بنایا جو انھیں کی عقل و شعور اور انتظامی صلاحیت کا کارنامہ ہو سکتا تھا۔ جہاں تک میرا خیال ہے ان کے علاوہ اور کوئی نہ تھا کہ اس کام کو اتنے حسن انتظام سے پایہ تکمیل کو پہنچا سکتا۔ پرنسپل موصوف نے اپنے خطبہ میں فرمایا کہ ۱۸۶۲ء سے کالج کی تاریخ جدید بہار کی تاریخ ہے۔ پٹنہ کالج کی اہمیت بتاتے ہوئے انھوں نے کہا کہ بہت کم بہاری ایسے ہیں جنھوں نے اپنی زندگی میں عروج حاصل کیا ہو اور پٹنہ کالج کے طالب علم نہ رہے ہوں۔ انھوں نے چند نامور بہاریوں کے نام بتاتے ہوئے فرمایا کہ سر سید علی امام اور ڈاکٹر سچیدانند سنہا کے نام نامی سے کون واقف نہیں ہے۔ ان کے علاوہ سر گنیش دت سنگھ، سر محمد فخرالدین، مسٹر محمد یونس، مسٹر سید عبدالعزیز، بابو انوگرہ نراین سنگھ اور بابو سری کرشن سنہا کا نام گناتے ہوئے فرمایا کہ ان لوگوں نے بہار میں اہم خدمات انجام دی ہیں اور بڑے بڑے عہدوں کے ساتھ منصب وزارت پر مامور رہے ہیں۔ مزید فرمایا کہ قانون کے میدان میں سر سید سلطان احمد، سر خواجہ محمد نور، مسٹر جسٹس ایس۔ پی۔ ورما اور مسٹر بلدیو سہائے اپنی مثال آپ ہیں اور جو شہرت ان حضرات نے حاصل کی ہے اب تک کم لوگوں کو نصیب ہوئی ہے۔

جلسہ عام و قدیم طلبار :

اس جلسہ عام میں پانچ ہزار سے کچھ زیادہ لوگوں نے شرکت کی جس میں بہار کی عظیم شخصیتوں کے علاوہ پٹنہ کالج کے "اولڈ بوائز" نے بھی شرکت کی جن میں سے چند نہایت قدیم طلبار کے نام یہ ہیں :
مسٹر رام لال سنہا (۱۸۸۲ء)، مسٹر نند کشور لال (۱۸۸۵ء) کرشن بلبھ سہائے (۱۸۸۶ء) رام اَنترے پرشاد (۱۸۸۷ء) اجودھیا پرشاد (۱۸۸۹ء) مسٹر ایس ای سین (۱۸۹۲ء) سد ھیشور گپتا (۱۸۹۲ء) رام بہادر (۱۸۹۵ء) مسٹر سید عبدالصمد (۱۸۹۵ء) مسٹر مہیش چندر دت (۱۸۹۸ء) محمد موسیٰ (۱۸۹۸ء) سر سلطان احمد (۱۸۹۸ء) الکھ کمار سنہا (۱۸۹۸ء) سید محمد حفیظ (۱۹۰۰ء)
پرنسپل بھتیجا نے ان قدیم ترین طلبا کی ملاقات گورنر صاحب سے کرائی۔ مزید برآں یہ بھی معلوم ہوا کہ قدیم ترین طلبا میں بابو جادو ناتھ بنرجی (۱۸۶۵ء) اور خان بہادر سید خیرات احمد دالدبزرگوار سر سید

سلطان احمد (۱۹۷۰ء) اس زمانہ میں بقید حیات تھے۔ جلسہ کے اختتام پر گورنر نے تمام حاضرین کا شکریہ ادا کیا اور دعا کی کہ پٹنہ کالج اپنی ترقی کی راہ پر گامزن رہے۔

طلباء کی دعوت اور آتش بازی :

جلسہ ختم ہونے کے بعد کالج کے موجودہ طلبا جن کی تعداد تقریباً پانچ سو تھی۔ سب کو شام کا عمدہ ناشتہ اس جگہ کرایا گیا جہاں آج کل "ملیم گارڈن" واقع ہے۔ ناشتہ کا انتظام کرنا اور ناشتہ کرانے کی تمام ذمہ داری، پروفیسر جمنا پرشاد اور راقم کے سپرد کی گئی تھی۔ ہم نے بابو کیدار ناتھ کھنہ، کالج کے بڑے بابو، کے ذریعہ پٹنہ سیٹی سے نہایت اچھی اچھی مٹھائیاں بنوا کر منگائی تھیں جسے لڑکوں نے بہت پسند کیا۔ حساب لگانے پر معلوم ہوا کہ فی کس آٹھ آنہ خرچ پڑا ہے۔ مسٹر بھتیجا ہم لوگوں کے انتظام سے بہت خوش ہوئے اور ناشتہ کے بعد لڑکوں، پروفیسر جمنا پرشاد اور راقم کا شکریہ ادا کیا۔ پرنسپل موصوف نے راقم اور طلبا کے اصرار پر ایک مٹھائی کھائی۔ اسی رات کو کالج میں چراغاں کیا گیا اور خوشی میں آتش بازیاں چھوڑی گئیں۔ آتش بازیاں بہت عمدہ قسم کی تھیں۔ اس موقع کی ایک تصویر راقم کے پاس ہے۔

مشاعرہ اور کوی سمیلن :

۱۲ دسمبر ۱۹۳۷ء ساڑھے سات بجے شام کو نیو جمنازیم میں مشاعرہ اور کوی سمیلن کا انعقاد ہوا۔ جس کی صدارت سر سید سلطان احمد نے کی مگر تھوڑی دیر بعد وہ چلے گئے اور ان کے جانے کے بعد پرنسپل بھتیجا نے صدارت کی۔ مشاعرہ تقریباً تین گھنٹے جاری رہا۔ شعراء، مہانوں اور طلبا کا اژدحام اتنا تھا کہ ہال میں بیٹھنے کی جگہ نہ تھی اور کچھ لوگوں کو کھڑا رہنا پڑا۔ اس موقع پر نظمیں "پٹنہ کالج" اور "بہار" پر پڑھی گئیں۔ اختر قادری، مظفر نقوی اور طفیل احمد خاں کی نظمیں بہت پسند کی گئیں۔ راقم کو اختر قادری کی نظم بہت پسند آئی۔ چند اشعار پیش ہیں :

اگر ہے تاج کی رعنائیوں پر ناز جمنا کو — اگر ہے پاسبانِ ہند کا طرہ ہمالا کو
تو بے شبہ پڑے گی ماننی یہ بات دنیا کو — کہ عزت کم نہیں ہے پٹنہ کالج سے گنگا کو

جبھی تو ہم نے ان آنکھوں سے دیکھا ہے کہ گنگا جل
رہا کرتا ہے پابوسی کو اس کی ہر گھڑی بے کل

ان دنوں اختر قادری فارسی ایم۔ اے کے متعلم تھے اور میرے شاگردوں میں تھے۔ ایم۔ اے

اور ڈاکٹریٹ کیا اور لنگٹ سنگھ کالج میں عرصہ دراز تک شعبہ فارسی اور اردو کے صدر رہے۔ پنشن پانے کے بعد بہار اردو اکادمی کے نائب صدر ہوئے۔ موصوف نے اردو کے ایک اچھے شاعر ہونے کی حیثیت سے کافی شہرت حاصل کی تھی۔

بوٹ ریس :

ہم سب جانتے ہیں کہ پٹنہ کالج دریائے گنگا کے کنارے واقع ہے۔ پرنسپل آرمر نے اس کے محل وقوع سے فائدہ اٹھایا اور ۱۹۳۶ء میں دو پٹنی بوٹ (Putney Boat) انگلستان سے منگوائیں۔ ایسی کشتیاں غالباً ہندوستان کے کسی کالج میں نہ تھیں۔ ان کے ذریعہ کشتی رانی کا مقابلہ اکثر ہوا کرتا تھا جس سے بڑی چہل پہل ہو جایا کرتی تھی۔ اس جشن کے موقع پر پٹنہ ہائی کورٹ کے جج مسٹر جسٹس جیمس نے جو بہت باذوق آدمی تھے کشتی رانی کا مقابلہ کرایا۔ آکسفورڈ اور کیمبرج کے فارغ التحصیل ہندوستانی اور انگریز نے دو ٹیم ایک "آکسفورڈ ٹیم" اور دوسری "کیمبرج ٹیم" کے نام دے کر کشتی رانی کے مقابلہ میں حصہ لیا۔ اس مقابلہ میں "کیمبرج ٹیم" کی جیت ہوئی۔ جو لوگ دریا کے کنارے موجود تھے انھوں نے ڈاکٹر برجی شاستری سے کہا کہ اگر آپ "آکسفورڈ ٹیم" میں نہ ہوتے تو ضرور اسی کی فتح ہوتی۔ اس پر خوب ہنسی ہوئی۔

دو قابل ذکر نمائشیں :

مسٹر سید محمد محسن نے جو اس وقت شعبۂ نفسیات میں ریسرچ اسکالر تھے اپنے شعبہ کے تجربہ گاہ Psychological Laboratory میں اس علم سے متعلق تمام آلات کی نمائش کی۔ اس کی ترتیب اور تنظیم میں موصوف نے بڑی محنت اور شعور کا مظاہرہ کیا تھا۔ یہ نمائش ایک اچھی نمائش تھی اور جس نے بھی دیکھا بہت تعریف کی۔ راقم کو بھی یہ نمائش بہت پسند آئی۔ پرنسپل بھٹیجا نے اس نمائش کی تعریف کی تھی۔ کچھ دنوں بعد محسن صاحب اس شعبہ میں لکچرر مقرر ہوئے۔ اڈنبرہ یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی اور پٹنہ یونیورسٹی کے شعبہ نفسیات کے صدر ہوئے۔ ابھی بھی اپنے کاموں کو حسن وخوبی سے انجام دینے کے لیے مشہور ہیں۔ اپنی تحقیقات و تصنیفات کی بنا پر بین الاقوامی شہرت رکھتے ہیں۔ اردو ادب میں بھی دلچسپی ہے ان کی دو کتابیں "انوکھی مسکراہٹ" اور "نفسیاتی زاویے" طبع ہو چکی ہیں۔ "شعری مجموعہ" اور "فرائڈ کی نفسیات" طبع ہونے والی ہیں۔ پروفیسر سید محمد محسن صاحب میرے عوفاتی بھائی بھی

ہیں۔ ۱۹۷۰ء میں جب راقم دوبارہ حج کے لیے گیا تو ہم لوگوں نے ایک ساتھ حج کی سعادت حاصل کی اور مدینہ منورہ میں ہم دونوں ساتھ تھے۔ آتے جاتے میں جہاز پر بھی ساتھ رہا۔

تواریخی کتابوں کی نمایش :

اس جشن کے دوران تواریخی کتابوں کی بھی نمایش ہوئی جس میں مخطوطات، فرمان شاہی، قدیم دستاویزات کے علاوہ تلوار اور دیگر قدیم چیزیں تھیں۔ اس نمایش کی ترتیب کے روح رواں پروفیسر سید حسن عسکری صاحب تھے۔ راقم کو خوب یاد ہے کہ دو بنگالی حضرات نے ان کی محنت کا صلہ حاصل کرنے کی کوشش کی مگر پرنسپل بھتیجا صاحب ان سب باتوں سے اچھی طرح واقف تھے اور نمایش کے ختم ہونے کے بعد راقم سے کہا کہ اگر حسن عسکری نہ ہوتے تو یہ کام اس حسن وخوبی سے انجام نہ پاتا۔ اس نمایش میں مدرسہ سلیمانیہ کے کتب خانہ سے ۷۴ مخطوطات، نواب زادہ سید محمد مہدی کے توسل سے نوابان گنڈری کے ذخیرہ سے ۳۲ مخطوطات، بابو رام بہادر پٹنہ سیٹی کے یہاں سے ۲۱ مخطوطات، رائے متھرا پرشاد پٹنہ سیٹی سے تیرہ قلمی کتابیں، سید نقی احمد نبیرہ شاد عظیم آبادی سے ۱۵ مخطوطات، سید قاسم حسین پٹنہ سیٹی سے قرآن مجید کے دو قلمی نسخے اور بابو جے منگل پرشاد سے چار کتابیں (قلمی) نمایش کے لیے عنایت ہوئیں۔ کھجوا ذخیرہ سے ۲۷ مخطوطات، الاصلاح لائبریری دسنہ سے کچھ مخطوطات اور مطبوعہ کتابیں جن کی کل تعداد دس تھی، منگوائی گئیں۔ سید محمود الحق پھلواری شریف نے سات مخطوطات ومطبوعات اور پروفیسر ظہیر احسن لکچرر جغرافیہ نے دس قلمی اور مطبوعہ کتابیں نمائش کے لیے مستعار دی تھیں۔ ان کتابوں میں لائبریری مدرسہ سلیمانیہ اور کھجوا ذخیرے کی کتابیں بڑی قدیم ونادر تھیں۔ کھجوا ذخیرہ میں دیوان ہمایوں بادشاہ کا نادر نسخہ موجود تھا۔ اس کو پروفیسر ڈاکٹر ہادی حسن مسلم یونیورسٹی علی گڑھ نے بعد میں ایڈٹ کر کے حیدر آباد (دکن) سے شائع کرایا۔ راقم نے اپنی پچیس سالہ پٹنہ کالج کی زندگی کے زمانہ میں ایسا کامیاب جلسہ اور ایسی شان دار نمایش نہ دیکھی۔ پرنسپل بھتیجا کا یہ کارنامہ قابل یادگار ہے جسے بھلایا نہیں جاسکتا۔

میری رہایش گاہ :

جولائی ۱۹۳۶ء میں جب راقم کٹک سے پٹنہ آیا تو پروفیسر قمرالدین کا مکان جو محلہ پیر بہوڑ کی ایک تنگ گلی میں واقع ہے کرایہ پر لے کر رہنے لگا۔ اس مکان کی اوپر والی منزل میں صرف دو کمرے ایسے تھے جن میں کسی طرح گذارہ کیا جاسکتا تھا۔ اس سے پہلے میں ایسے مکان میں کبھی نہ رہا

تھا۔ چونکہ تنہا رہتا تھا اس لیے تکلیف کا احساس زیادہ نہ ہوا۔ اور ڈیڑھ سال کا زمانہ اسی مکان میں گذارتا رہا مگر اچھے مکان کی تلاش جاری رکھی۔ جب میں اس مکان میں رہنے آیا تو اپنے ساتھ اپنے کتے جیری کو بھی لیتا آیا۔ جیری روزانہ میدان میں دوڑ لگانے کا عادی تھا۔ تنگ مکان اور تنگ گلی اس کے معمول میں حائل ہو گئیں۔ اس لیے وہ دوسری منزل سے بغل کے مکان کی چھت پر کود جاتا اور محلہ کے سارے مکانوں کے چھپروں پر خوب دوڑ لگاتا۔ لوگوں نے مجھ سے شکایت کی کہ چھپروں پر کتے کا دوڑنا بہت منحوس خیال کیا جاتا ہے۔ محلے والوں کی شکایت سے تنگ آکر میں نے جیری کو نیورہ بھیج دیا جہاں وہ راقم کے گماشتہ سید نجابت حسین کے ساتھ کھلے میدان میں رہنے لگا۔ میں جب بھی نیورہ جاتا وہ نہایت محبت کا اظہار کرتا، دم ہلاتا، پاؤں چاٹتا اور سامنے آکر بیٹھ جاتا۔ سید نجابت حسین کو کتوں سے سخت نفرت تھی۔ جب کبھی جیری ان کا ہاتھ پاؤں چاٹنا چاہتا تو اسے ڈنڈا دکھا کر دور بھگا دیتے تھے۔ پروفیسر قمر الدجیٰ کے مکان میں ڈیڑھ سال کے قیام کے بعد میں اپنی بیوی اور لڑکے کو بھی لے آیا تو رہائش کی تکلیف ہونے لگی۔ حسن اتفاق سے ۱۹۳۸ء میں مسٹر عبد الجبار اکزیکیوٹیو انجینیر کا مکان واقع محلہ لال باغ کرایہ پر مل گیا اور میں یہاں رہنے لگا۔ مکان کشادہ تھا اور اس کے سامنے صحن بھی تھا۔ جیری کو نیورہ سے لے آیا کیونکہ یہ جگہ اس کے روزانہ کے معمول کے لیے کافی تھی۔ افسوس کہ ایک سال بعد میرا وفادار کتا اسی مکان میں مر گیا۔ راقم کو کتا پالنے کا شوق جوانی سے ہے۔ ۱۹۶۵ء میں جب میں اپنے اکزبیشن روڈ کے مکان میں مستقل رہنے کے لیے آیا "رانی" بھی میرے ساتھ آئی جس کو میرے دوست سید مصطفیٰ حسین جو جانوروں کے محکمہ کے ڈائرکٹر رہ چکے تھے مجھے اس کو رانچی سے لاکر دیا تھا۔ افسوس کہ ایک دن میری گلی میں ٹرک سے دب کر مر گئی۔ اس کے بعد میں نے کتا پالنا ترک کر دیا۔ داتا پیر بہوڑ ایک صوفی بزرگ گذرے ہیں جن کا مقبرہ محلہ پیر بہوڑ میں ہے۔ اسی مناسبت سے یہ محلہ پیر بہوڑ کہلاتا ہے اس محلے میں مسلمانوں کی کافی آبادی ہے۔ اور اسلامی تہواروں کے موقع پر خوب چہل پہل رہتی ہے۔ خصوصاً ماہ رمضان میں۔ جب راقم اس محلہ میں رہتا تھا تو مسلمان لڑکے ٹولیاں بنا کر نکلتے۔ حمد و نعت کے علاوہ ایسی نظمیں جن میں ماہ رمضان کی فضیلت اور برکت کا تذکرہ ہوتا نہایت خوش الحانی سے پڑھ کر سحری کے لیے لوگوں کو بیدار کرتے۔ ان کے نغموں کو سن کر ایسا اثر ہوتا کہ غیر روزہ دار بھی روزہ دار بن جاتے۔ جب میں محلہ پیر بہوڑ میں رہتا تھا مسٹر محمد نعیم بیرسٹر اور ان کے چھوٹے بھائی مسٹر محمد ایوب وکیل کے یہاں ملنے جایا کرتا تھا۔ یہ حضرات اس محلے کے قدیم اور نامی باشندے تھے۔ مسٹر محمد نعیم مجھ سے عمر میں بڑے تھے مگر ایوب صاحب میرے ہم سن تھے۔ ایوب صاحب میرے رشتہ دار مسٹر سید رفیع الدین بلخی وکیل کے نہایت عزیز دوست تھے۔ اس

وسل سے میری دوستی ان سے بہت بڑھ گئی تقسیم ہند کے بعد مسٹر سید رفیع الدین بلخی کے خاندان کے کل افراد ہجرت کر کے پاکستان چلے گئے۔ وہ اکیلے اپنے سبزی باغ کے مکان میں زندگی گزارتے اور پٹنہ کی عدالت میں وکالت کرتے رہے۔ موصوف کو بلڈ پریشر کا عارضہ تھا اور اچانک سخت بیمار پڑ گئے۔ مرض طویل ہو گیا اور پٹنہ میں ان کو دیکھنے والا سوائے ایوب صاحب کے کوئی دوسرا نہ تھا۔ عرصہ تک بیمار رہے اور ایوب صاحب نے اپنے ضروری کاموں کو چھوڑ کر دن رات ان کا علاج اور تیمارداری کی۔ مسٹر سید جعفر امام وکیل بھی ان کی تیمارداری کے لیے آیا کرتے تھے۔ ایوب صاحب اپنے عزیز دوست کی اس طویل بیماری میں جس جانفشانی اور محبت کے ساتھ خدمت کرتے رہے کوئی دوسرا نہ کر سکتا تھا باوجود اتنے اچھے علاج اور تیمارداری کے بلخی صاحب جانبر نہ ہو سکے مگر ایوب صاحب نے دوستی کے حق کو بطرز احسن ادا کر دیا۔

ایوب اردو گرلس اسکول، پٹنہ :

ایوب صاحب خوش مزاج، ملنسار اور بااخلاق انسان تھے۔ ان کے یہاں ہر وقت شعرا، ادیب اور سماجی کارکنوں کا اجتماع رہتا تھا۔ ان کے دوستوں میں جمیل مظہری اور پروفیسر سید اجتبیٰ حسین رضوی تھے۔ جمیل مظہری کچھ عرصہ تک ان کے ساتھ ہی رہتے تھے۔ موصوف تعلیم نسواں کے بہت حامی تھے اور مسلمان لڑکیوں کے لیے پٹنہ میں ایک اردو گرلس ہائی اسکول قائم کرنا بہت ضروری سمجھتے تھے۔ لڑکیوں کے اسکول کو قائم کرنے کے لیے موصوف نے اپنا رہائشی مکان وقف کر دیا اور اس کے فروغ کے لیے ہمیشہ سرگرم عمل رہے اور اس کام میں کامیابی حاصل کی۔ جہاں ان کی رہائش گاہ تھی اس جگہ پر ایوب اردو گرلس اسکول کی عالی شان عمارت کھڑی ہے۔ اس اسکول میں تقریباً دو ہزار لڑکیاں تعلیم پا رہی ہیں۔ آج یہ اسکول ایوب صاحب کی بہترین اور شاندار یادگار ہے۔

تعلیم بالغان :

۳ر مارچ ۱۹۳۸ء کو وزیر تعلیم ڈاکٹر سید محمود نے اپنی قیام گاہ پر پٹنہ شہر کے دس حضرات کو بلایا ان میں صرف ہم تین مسلمان پروفیسر معین الحق، راقم اور سید نجم الہدیٰ تھے۔ وزیر موصوف نے ہم سب کو مخاطب کر کے فرمایا کہ سن رسیدہ لوگوں کی ناخواندگی دور کرنے کے لیے کوئی اسکیم چلانا چاہیے اور ایک نیم سرکاری تحریک "تعلیم بالغان" چلائی گئی جس کے روح رواں پروفیسر بی بی مکھرجی ہوئے اور اس سے متعلق ابتدائی کتابوں اور ایک رسالہ بنام "روشنی" کی ترتیب و طباعت کی ذمہ داری پروفیسر عبدالمنان کے سپرد ہوئی۔ اس تحریک کو کامیاب بنانے کے لیے مختلف جگہوں پر مراکز قائم کیے گئے۔ جب تک ڈاکٹر

سید محمود وزیر تعلیم رہے یہ تحریک بہت کامیاب رہی۔ اچاریہ بدری ناتھ کے وزیر تعلیم ہونے کے بعد یہ تحریک رفتہ رفتہ ختم ہوگئی۔ راقم "مرکز تعلیم بالغان" مصلح پور ہفتہ میں دو بار جاتا اور وہاں کے لوگوں کو اردو ہندی پڑھاتا تھا۔ ہفتہ کے باقی دنوں میں دوسرے لوگ وہاں جایا کرتے تھے۔ یہ خدمت بالکل اعزازی تھی حتیٰ کہ سواری کا کرایہ بھی اپنی جیب سے دینا پڑتا تھا۔ جیسا کہ مسلمانوں کا دستور ہے اس تحریک سے استفادہ کرنے والوں میں ان کی تعداد بہت کم ہوتی تھی۔

چیزوں کی ارزانی :

جب پٹنہ آیا تو راقم کی تنخواہ صرف ایک سو اسی[۱۸۰] روپیہ ماہانہ تھی مگر چیزوں کی بہت ارزانی تھی۔ اگر آج میں بتاؤں کہ بکرے کا گوشت ۵ آنہ سیر، انڈے دو آنے درجن، شکر تین آنہ سیر، گھی سوا روپیہ سیر، اور چاول، گیہوں، دودھ، ایک روپیہ میں دس سیر، کشمش، اخروٹ ۸ آنہ سیر، کاغذی بادام سوا روپیہ سیر مرغ پانچ آنہ اور چوزہ ڈھائی آنے میں ملتا تھا تو آپ کو سن کر بہت حیرت ہوگی۔ باوجود اس کم تنخواہ کے میرے یہاں دو نوکر تھے۔ ایک باورچی انیس میاں جو خورد و نوش کے ساتھ بارہ روپیہ ماہانہ کا تنخواہ دار تھا اور نورالحسن خدمت گار کو مع طعام و قیام چھ روپیہ ماہانہ دیا کرتا تھا۔ تقسیم ہند کے بعد انیس ڈھاکہ چلا گیا اور نورالحسن دوسری جنگ عظیم کے دوران فوج میں بھرتی ہوا، اور غالباً برما میں مارا گیا۔ ۱۹۳۸ء میں مسلم لیگ ایک قومی سیاسی جماعت ہو چکی تھی اور قیام پاکستان کے لیے کوشاں تھی۔ اس زمانہ میں ڈاکٹر سچیدانند سنہا پٹنہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے ۔ موصوف تقسیم ہند کے سخت مخالف تھے۔ جب ایک روز میں ان سے ملنے گیا تو خلاف دستور انھوں نے راقم سے اپنا تاثر بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ اب مسلمانوں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ پاکستان بنے لیکن انھیں یہ معلوم نہیں کہ اقلیت کی حیثیت سے انھیں ہندوستان میں زندگی گزارنا پڑے گی اور ان کے حالات افسوس ناک ہو سکتے ہیں۔ مجھے ڈر ہے کہ کہیں مسلم اقلیت صرف "لکڑی کاٹنے والا" اور "پانی بھرنے والا" ہی بن کر نہ رہ جائے۔ راقم تقسیم ہند کا طرفدار نہ تھا اور سنہا صاحب میرے اس نظریہ سے اچھی طرح واقف بھی تھے انھیں میرے سامنے یہ بات نہ کہنا چاہیے تھی۔ میں اس بات سے رنجیدہ ہوا اور عرض کیا کہ تقسیم ہند سے مسلمانوں کو بے شمار مصیبتوں کا اور دشواریوں کا ضرور سامنا کرنا پڑے گا مگر وہ صورت ہرگز پیدا نہ ہوگی جس کا آپ نے ذکر کیا ہے کیونکہ مسلمان ہمیشہ سے ایک خوددار قوم رہی ہے۔ ہر آفت و مصیبت کا مردانہ وار مقابلہ کیا ہے۔ صاحب موصوف یہ سن کر خاموش ہو گئے اور دوسری باتوں کی طرف متوجہ ہو گئے۔

اسسٹنٹ پروفیسر ہونا :

جس زمانہ میں راقم کی تقرری ہوئی تھی لکچرر کی ابتدائی تنخواہ ۱۴۴ روپیے ماہانہ تھی لیکن اگر کوئی لکچرر پی۔ ایچ۔ ڈی ہو اور گورنمنٹ چاہے تو تنخواہ دو سو روپیے ماہانہ ہوسکتی تھی۔ اس لیے راقم نے سرکار سے دوسو روپیے ماہانہ کا مطالبہ کیا جس کے نتیجہ میں ۱۵ر جولائی ۱۹۳۷ء کو میری تنخواہ ایک سو اناسی روپیے ہوگئی۔ چونکہ اس تنخواہ میں مندرجہ بالا قانون کے مطابق اضافہ نہ ہوا تھا اس لیے پھر احتجاج کیا اور پہلی مئی ۱۹۳۸ء کو سرکار نے مجھے لکچرر سے اسسٹنٹ پروفیسر بناکر دوسو روپیے ماہانہ تنخواہ مقرر کردی۔

خدابخش لائبریری میں چند یادگار چیزیں :

برطانیہ میں یہ قدیم دستور ہے کہ بادشاہوں کی تاج پوشی سے پہلے جاذب النظر اشیا تیار کرتے ہیں اور تاج پوشی کے وقت ان کو بازار میں لاکر فروخت کرتے ہیں۔ لوگ ان کو بہت شوق سے خرید کر اپنے گھروں میں بطور یادگار عرصہ دراز تک محفوظ رکھتے ہیں۔ عشق کا مارا شاہ ایڈورڈ ہشتم ۳۲۷ دن کی بادشاہی کرکے ۱۱ر دسمبر ۱۹۳۶ء کو تخت و تاج سے دست بردار ہوگیا اور اسکی تاج پوشی کی رسم ادا نہ ہوسکی مگر یہ کل چیزیں بازار میں آئیں اور فوراً فروخت ہوگئیں۔ مسٹر شہاب الدین خدابخش اس زمانے میں انگلستان میں تھے۔ انھوں نے چند ایسی چیزوں کو خریدا اور ہندوستان واپس آکر ان تاریخی چیزوں کو خدابخش لائبریری میں تحفتاً دے دیا جو اب بھی وہاں محفوظ ہیں۔ ان میں برطانیہ کا ایک چھوٹا سا جھنڈا بھی تھا جس کے بیچ میں شاہ ایڈورڈ ہشتم کی تصویر چھپی ہوئی تھی۔ اب یہ سب چیزیں بالکل نایاب ہوچکی ہیں۔

بحیثیت شاہزادہ ویلس ۱۹۲۱ء میں شاہ موصوف نے ہندوستان کا دورہ کیا اور پٹنہ بھی آئے۔ موصوف کے استقبال کیلئے پٹنہ لون میں جسے اب گاندھی میدان کہتے ہیں ایک دربار منعقد کیا گیا اور ہارڈنگ پارک میں ایک شاندار دعوت دی گئی۔ راقم ان دونوں تقریبوں میں والد صاحب مرحوم کے ساتھ شریک تھا۔

طلبائے فارسی کی تعداد آئی۔ اے اور بی۔ اے میں :

اس زمانے میں فارسی پڑھنے والے طلبا کی تعداد کافی ہوا کرتی تھی جس میں تھوڑے سے ہندو طلبا بھی ہوتے تھے۔ آئی۔ اے سال اول اور دوم کے کلاس میں کم از کم چالیس طالب علم ہوا کرتے تھے اور تقریباً تیس طلبا بی۔ اے۔ کے سال سوم اور چہارم میں ہوتے تھے۔ اس زمانے میں

سید مرتضیٰ فضل علی نے آئی ۔ اے سال اول میں فارسی لی اور بی ۔ اے تک ہم لوگوں سے فارسی پڑھی ۔ موصوف ایڈوکیٹ ہائی کورٹ ہوئے اور بعد ازاں ہائی کورٹ کے جج مقرر کیے گئے اور ترقی کرکے کشمیر ہائی کورٹ کے چیف جسٹس ہوئے ۔ دہلی میں عرصہ تک سپریم کورٹ کے جج بھی رہے چند سال ہوئے کہ ان کا انتقال ہوگیا ۔ موصوف نہایت ہی ملنسار اور نیک انسان تھے ۔ ان کے والد مرحوم سر سید فضل علی ہندوستان میں اعلیٰ سے اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے تھے ۔

ڈاکٹر مطیع الامام :

اس دور کے میرے دوسرے عزیز شاگرد مطیع الامام ہیں ۔ موصوف ۱۹۳۶ء میں پٹنہ کالج میں پڑھتے تھے جس سال میں کٹک کالج سے بدل کر پٹنہ کالج آیا تھا ۔ مطیع الامام اپنی طالب علمی کے زمانے میں ایک نہایت ہی محنتی اور مہذب شاگرد تھے ۔ تمام استادوں کی بڑی عزت کیا کرتے تھے ۔ موصوف نے پہلے اردو میں ایم ۔ اے کیا اور دوسرے سال اول درجے میں فارسی میں ایم ۔ اے پاس کیا ۔ ایم ۔ اے کرنے کے بعد ہی اپنی کالج میں کچھ دنوں کے لیے فارسی کے لکچرر مقرر ہوئے ۔ ۱۹۴۶ء میں بہار کی غارت گری سے متاثر ہوکر با دلِ ناخواستہ ہجرت کرکے پاکستان چلے گئے اور وہاں پی ۔ ایچ ۔ ڈی کیا ۔ کراچی یونی ورسٹی میں ریڈر ہوئے اور بعد ازاں ترقی کرکے یونیورسٹی پروفیسر اور صدر شعبہ فارسی ہوئے ۔ ہندوستان کے صوفیوں کے متعلق مقالے لکھتے رہتے ہیں اور انھوں نے کئی مضامین بھی شائع کرائے ہیں جن کا تعلق بہار کے صوفیوں سے ہے ۔

ساتواں باب

میری اسسٹنٹ پروفیسری

۱۹۳۸ء سے ۱۹۴۴ء

میری ترقی اور ڈاکٹر سرکار کی عارضی پرنسپلی :

جیسا کہ اوپر ذکر کیا جا چکا ہے کہ راقم پہلی مئی ۱۹۳۸ء کو لکچرر سے ترقی کر کے اسسٹنٹ پروفیسر ہوگیا، کام کی نوعیت وہی رہی، اساتذہ میں بھی کوئی تغیر و تبدل نہ ہوا۔ حکومت بہار نے پرنسپل جیمز کو ترقی دے کر سکریٹریٹ بھیج دیا اور ان کی جگہ ڈاکٹر ایس سی سرکار کو پٹنہ کالج کا عارضی پرنسپل بنا دیا۔ موصوف ہندوستان کے قدیم دور کی تاریخ میں بڑی مہارت رکھتے تھے۔ نہایت خوش گفتار تھے۔ اپنی دلچسپ باتوں سے لوگوں کو اپنا گرویدہ بنا لیا کرتے۔ انگریزی بولنا اور لکھنا خوب آتا تھا۔ راقم پر ہمیشہ نظر کرم رکھتے تھے اور حوصلہ افزائی بھی کیا کرتے تھے۔ کالج کے معاملات میں مجھ سے اکثر مشورہ لیتے تھے۔ انہی کے زمانے میں ۴ جنوری ۱۹۳۹ء کو وزیر تعلیم بہار نے پرنسپل کے نام ایک سرکولر بھیج کر اس میں یہ تاکید کی تھی کہ اساتذہ اپنے کو ہر معاملہ میں فرقہ پرستی اور تعصب سے دور رکھیں اس سرکولر کی ایک ایک کاپی جو ہر استاد کو دی گئی تھی اب بھی میرے پاس محفوظ ہے۔ پرنسپل موصوف سے میں نے پوچھا کہ آخر اس سرکولر کی کیا ضرورت تھی، تو انھوں نے ہنس کر جواب دیا کہ یہ کانگریسی حکومت کی ایک احتیاطی کارروائی ہے۔ میں نے تو حکومت کو لکھ کر دیا ہے کہ ہمارے کالج کا ہر استاد تعصب کی لعنت سے پاک ہے۔

ڈاکٹر ہری چند کی پرنسپلی :

۱۹۳۹ء کے سیشن کے آخر میں ڈاکٹر سرکار کی پرنسپلی ختم ہوگئی اور پٹنہ کالج میں اپنی مستقل جگہ پر واپس چلے گئے۔ گرمیوں کی چھٹی کے کچھ ہی دنوں بعد ڈاکٹر ہری چند مستقل پرنسپل ہو کر

آئے اور ۱۹۴۲ء کی ابتدا ایک اس خدمت کو انجام دیا۔ موصوف نے پیرس سے سنسکرت میں ڈاکریٹ کی ڈگری حاصل کی تھی۔ اعلیٰ تعلیمی سند کے باوجود پنڈت رام اوتار شرما اور ڈاکٹر امنتا پرشاد بنرجی شاستری کے مقابلے میں پڑھانے لکھانے کی صلاحیت کم تھی۔ اسی وجہ سے سنسکرت کے طلبا ان سے خوش نہ رہا کرتے تھے۔ کالج کے کاموں میں انھیں زیادہ دلچسپی نہ تھی۔ ان کے بیشتر اوقات اعلیٰ حکام کی خوشنودی حاصل کرنے میں صرف ہوا کرتے تھے، خودستائی کے عادی ہو گئے تھے۔ انگریزی میں تقریر کرنے سے بہت گھبراتے تھے۔ بات بات میں "You Know" کہا کرتے تھے۔ پنجاب کے رہنے والے تھے، مسلمانوں کے ساتھ ان کا رویہ کچھ اچھا نہ تھا۔ ایک مرتبہ کا واقعہ ہے کہ امتحان کے موقع پر جمعہ کے دن تمام اساتذہ کے ساتھ میری اور چند مسلم اساتذہ کی ڈیوٹی امتحان کی نگرانی پر لگا دی، حالانکہ حکومت نے جمعہ کو ایک بجے سے دو بجے تک کی چھٹی مسلمانوں کو دے رکھی تھی۔ میں ایک بجے آنے پر راضی نہ تھا۔ میرے احتجاج پر پرنسپل موصوف نے مجھ سے کہا کہ آپ اگر ایک بجے سے نہیں آسکتے تو ڈیڑھ بجے تک آکر اپنا کام سنبھال لیں۔ میں نے کہا کہ یہ ممکن نہیں، میں دو بجے آسکتا ہوں کیونکہ مجھے نماز میں دیر ہو جاتی ہے۔ قائل کرنے کے لیے مجھ سے کہا کہ دیگر مسلمان پروفیسر تو اس وقت آجانے کو تیار ہیں۔ میں نے جواباً عرض کیا کہ دوسرے مسلمانوں کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ میں دو بجے سے پہلے نہیں آسکتا۔ اور جب میں نے (casual leave) چھٹی کی درخواست لکھ کر دی تو انھوں نے کہا کہ آپ دو بجے ضرور چلے آئیے۔ ان کے یہاں سے جب میں اپنے شعبہ فارسی پہنچا تو پروفیسر عبدالمجید سے ملاقات ہو گئی۔ میں نے تمام باتیں بتائیں تو انھوں نے کہا کہ نہ میں درخواست دوں گا اور نہ ان سے اجازت لوں گا۔ بعد نماز دو بجے جاؤں گا۔ جمعہ کے دن نماز کے بعد ہم دونوں اپنے کام پر گئے مگر دوسرے مسلمان پروفیسر ڈیڑھ بجے پہنچ کر دو بجے سے امتحان کی نگرانی کے لیے حاضر تھے۔ معمولی حیثیت سے میرے اور ڈاکٹر ہری چند کے تعلقات اچھے تھے۔ ان کے زمانے میں جب مسلم ہوسٹل میں سپرنٹنڈنٹ کی جگہ خالی ہوئی تو مجھ سے کہا کہ درخواست دے دیجیے میں کالج کے انتظامیہ میں آپ کی مدد کروں گا۔ اور آپ کی تقرری ہو جائے گی۔ مجھے سپرنٹنڈنٹ کا کام پسند نہ تھا اس لیے درخواست نہ دی۔ ڈاکٹر ہری چند ۱۹۴۲ء میں پٹنہ کالج سے چلے گئے۔

پرنسپل بھٹنجا کی واپسی :

مسٹر بھٹنجا اسی سال گرمیوں کی چھٹی کے بعد پٹنہ کالج پرنسپل ہو کر پھر واپس آئے۔ ان کے

آتے ہی کالج میں رونق آگئی۔ اور ہر کام نہایت حسن ترتیب اور خوش اسلوبی سے ہونے لگا۔ اور چار سال تک نہایت خوبی سے کالج کی خدمات انجام دیتے رہے۔ صاحب موصوف اساتذہ کا خیال رکھتے اور اساتذہ بھی ان کا بہت احترام کرتے تھے۔ موصوف میں ایک بہت بڑی خصوصیت یہ تھی کہ نوجوان اساتذہ کی خوب حوصلہ افزائی اور ان کی مدد کرتے تھے۔ موصوف نے فارسی بی۔اے تک پڑھی تھی اور فارسی کا اچھا شوق رکھتے تھے۔ مجھے اکثر خسرو، اور حافظ کے اشعار سناتے تھے۔ فارسی زبان وادب سے آخر عمر تک ان کی دلچسپی قائم رہی جس کا ذکر انھوں نے راقم کے نام ایک خط مورخہ یکم اپریل ۱۹۵۰ میں کیا ہے کہ آج کل میں فارسی اور تاریخ ہند کا مطالعہ کر رہا ہوں۔ اسی خط میں آگے چل کر لکھتے ہیں کہ کاش تم اور عسکری میرے ساتھ ہوتے تو میں اپنے کام کو پایۂ تکمیل تک آسانی سے پہنچا سکتا۔ موصوف میں یہ بہت بڑی خوبی تھی کہ قلم برداشتہ دس دس صفحے انگریزی میں لکھ ڈالتے مگر کہیں تغیر و تبدل کی نوبت نہ آتی۔

پرنسپل بھیتجا کا پنشن پانا :

پرنسپل بھیتجا صاحب ۱۹۴۶ء میں پنشن پاکر اپنے وطن سندھ چلے گئے۔ اسی کے بعد ہندوستان اور پاکستان وجود میں آئے اور سندھ کی ہندو آبادی ترک وطن کر کے ہندوستان آنے لگی۔ نواب زادہ لیاقت علی خاں نے جو علی گڑھ میں مسٹر بھیتجا کے عزیز ترین شاگرد تھے، موصوف کو ہندوستان آنے سے روکا اور کراچی یونیورسٹی میں سنیٹ اور سنڈیکیٹ کا ممبر بنا دیا مگر ناسازگار حالات کا مقابلہ نہ کر سکے اور ترک وطن کر کے پونا چلے آئے اور وہیں قیام پذیر ہوئے اور وہ ہندوستان کے بدلتے ہوئے سیاسی حالات سے مطمئن نہ تھے۔ ان کا خیال تھا کہ جس طرح کانگریس حکومت ملک کا نظام چلا رہی ہے اس سے ہندوستان کی وحدت کو خطرہ ہے۔ ایک انگریزی کے رسالہ میں اپنا مضمون شائع کیا جس میں یہ خیال ظاہر کیا کہ ہندوستان کو دکھنی، اتری، پوربی اور پچھمی چار حلقوں میں تقسیم کر کے ہر حصّہ کو خود مختار حکومت تسلیم کر لیا جائے اور وحدت برقرار رکھنے کے خیال سے مالیات دفاع، اور خارجی تعلقات کا انتظام کلی طور سے مرکز یعنی دہلی کی حکومت کے ہاتھ میں رہے۔ حکومت ہند اس بات سے ناراض ہوگئی اور چاہا کہ صاحب موصوف کے خلاف تادیبی کارروائی کرے مگر کامیاب نہ ہو سکی۔

پٹنہ یونیورسٹی سنیٹ میں نامزدگی :

میرے لیے فخر و امتیاز کی بات ہے کہ ۳ نومبر ۱۹۴۳ء کو مجھے پٹنہ یونیورسٹی کے سنیٹ کا

ممبر نامزد کیا گیا۔ انگریزوں کے زمانے میں مجھ سے پہلے ایسا کوئی استاد نہ تھا جو صرف سات سال کی ملازمت میں پٹنہ یونی ورسٹی کے سنیٹ کا ممبر نامزد کیا گیا ہو۔ اس کے لیے مشہور اور تجربہ کار اساتذہ اور عمائدین صوبہ بہار ہی کا انتخاب عمل میں آتا تھا۔ اس اعزاز کی نامزدگی کے لیے میرے مقابلہ میں مولانا سید سلیمان ندوی کا نام بھی پیش ہوا تھا۔ مگر سر فرانسس موڈی گورنر بہار جو پٹنہ یونی ورسٹی کے چانسلر بھی تھے، انھوں نے مجھے نامزد کر کے اس عزت کا شرف بخشا۔ میری نامزدگی کے وقت مزید تین حضرات (۱) مسٹر چندیشر پرشاد نراین سنگھ، سی آئی ای، ایم ایل اے۔ (بعد میں سر ہوئے) (۲) بابو سونراین سنہا جو گورنر بہار کے ایگزیکیٹو کونسل کے سابق ممبر تھے اور (۳) پروفیسر جنا پرشاد کو بھی نامزد کیا گیا۔ میری اس نامزدگی سے لوگوں کو بہت حیرت ہوئی مگر استاد محترم ڈاکٹر عظیم الدین احمد کو بہت خوشی ہوئی اور راقم کو مبارکباد اس شعر سے دیا:

ترقیاں یہ کرے ہر روز اور ہر سال
خدا کرے مرے اقبال کو ملے اقبال

بہار مدرسہ اگزامنیشن بورڈ میں نامزدگی:

۱۱ نومبر ۱۹۴۱ء کو بہار گورنمنٹ نے مجھے تین برس کے لیے بہار مدرسہ اگزامی نیشن بورڈ کا ممبر نامزد کیا۔ میرے علاوہ بہار کے قابل مدرسین مولانا سید سلیمان ندوی دارالمصنفین اعظم گڈھ اور شرافت حسین ایم ایل اے ساکن آرہ کو بھی ممبر بنایا۔ اس بورڈ کی صدارت کا عہدہ استاد محترم جناب ڈاکٹر عظیم الدین احمد کو تفویض ہوا جو اپنے زمانے کے نہایت ممتاز پروفیسر تھے۔ انھوں نے بورڈ کے کاموں میں تبدیلی پیدا کر کے منظم طریقے سے کام چلانے کے لیے قواعد و ضوابط مرتب کیے جس پر خود عمل کیا اور سب کو اس کی پابندی کا عادی بنا دیا۔

۱۹۴۱ء سے پہلے بہار مدرسہ اگزامی نیشن بورڈ بیروی کی بدولت مدرسہ کے باصلاحیت مدرسین کو نظرانداز کر کے ان کے مقابلے میں اسکول کے ماسٹر اور کالج و یونیورسٹی کے لکچرر کو ممتحن مقرر کرتا تھا اس سلسلہ میں مختلف مدرسین نے مجھ سے ملاقات کی اور ناراضگی کا اظہار کیا کہ باوجود صلاحیت کے انھیں ممتحن ہونے سے محروم کر دیا جاتا ہے۔ بات معقول تھی اس لیے بورڈ کی ایک میٹنگ میں راقم نے تجویز پیش کی کہ متعلقہ مدرسین کو ممتحن مقرر کیا جائے۔ اور اسکول کے ماسٹر اور کالج و یونی ورسٹی کے لکچرر کو ممتحن ہونے سے روک دیا جائے۔ میری اس تحریک میں مولانا سید سلیمان ندوی اور شرافت حسین صاحب نے بڑی مدد کی۔ آخر کار متفقہ

طور پر یہ رزولیشن پاس ہو گیا کہ مدرسہ کے قابل مدرسین ہی کو ممتحن مقرر کیا جائے اور اسکول کے ماسٹر یا کالج اور یونیورسٹی کے لکچرر کو ممتحن نہ بنایا جائے۔ اس تجویز کی منظوری کے بعد تقریباً بیس سال تک عمل ہوتا رہا مگر اب ایسا نہیں ہے۔

پٹنہ کالج کی خصوصیت :

۱۹۳۶ء سے ۱۹۴۲ء تک جب میں لکچرر اور اسسٹنٹ پروفیسر کی حیثیت سے کام کرتا تھا وہ زمانہ پٹنہ کالج کا ہر لحاظ سے ایک زریں دور تھا۔ طلبار لکھنے پڑھنے، کھیل کود اور اپنی تہذیب کے لیے مشہور تھے، قواعد کے بڑے پابند تھے اور کالج میں بدتمیزی یا بدنظمی کے واقعات دیکھنے یا سننے میں نہیں آتے تھے۔ نہایت خاموشی اور سکون کے ماحول میں پڑھنے پڑھانے کا کام انجام پاتا۔ آج کل کی طرح شور وغل اور بدتمیزی کے ماحول کا نام ونشان تک نہ تھا۔ زیادہ تر طلبار کو سیاست سے کوئی خاص لگاؤ نہ تھا اور بیکار باتوں سے الگ رہتے تھے طلبار پڑھنے میں اور اساتذہ پڑھانے میں مصروف رہتے۔ کُل طلبا بلا امتیاز شعبہ ہر پروفیسر اور لکچرر کا احترام کرتے اور انھیں اپنا بزرگ تصور کرتے تھے۔ اساتذہ کا سلوک بھی طلبا کے ساتھ نہایت ہی اچھا ہوتا تھا، کسی کو کسی سے شکایت کا موقع نہ تھا۔

کالج کے تعلیمی اوقات میں جن طلبار کا کلاس نہ ہوتا تھا وہ کالج کے "کومن روم" یا لائبریری میں اپنا وقت گذارتے تھے۔ طلبار کو کالج کے اندر یا باہر سڑک پر گھومتے پھرتے نہیں دیکھا جاتا تھا وہ عام بازاری ماحول سے الگ رہتے تھے۔ ہوسٹل کی پابندیاں جو میری طالب علمی کے زمانے میں تھیں وہی قائم تھیں۔ طلبار کی ذہنی نشوونما اور علمی ترقی کے لیے کئی انجمنیں تھیں جن میں وہ بہت شوق سے حصہ لیتے۔ چند نامور انجمنیں یہ تھیں: (1) Debating Society, (2) Chanakya Society, (3) Historical Society (4) Bazm-e-Adab ان میں چانکیہ سوسائیٹی سب سے امتیازی حیثیت رکھتی تھی۔ اس کا تعلق اقتصادیات سے تھا۔ اس کے سالانہ جلسوں میں بہار اور بہار سے باہر کے سرکاری افسران آکر شرکت کرتے تھے۔ حکومت بہار ہر سال اس کی سالانہ رپورٹ کو کالج سے منگا کر اس سے استفادہ کرتی تھی۔ اس سوسائیٹی کو ۲۱ دسمبر ۱۹۰۹ء میں مسٹر چارلس رسل نے قائم کیا تھا جو ان دنوں پٹنہ کالج کے پرنسپل تھے۔

پیالمیہ سوسائٹی کے بعد "بزم ادب" پٹنہ کالج کو بڑی شہرت حاصل تھی۔ راقم کو اس بزم میں جگر مرادآبادی، حفیظ جالندھری، آنند نرائن ملا، روش صدیقی، ساغر نظامی، مجاز لکھنوی، مبارک عظیم آبادی اور دیگر نامور اردو شعراء کے کلام کو سننے کا موقع ملا۔ اس کے ایک جلسہ کی صدارت ابتدائی دور میں نواب سر ذوالفقار علی خاں نے کی تھی۔ اس زمانہ میں ڈاکٹر عظیم الدین احمد صاحب اس بزم کے صدر تھے۔

بزم ادب ۱۹۲۷ء میں قائم ہوئی۔ پروفیسر محمد مطیع الرحمن جشن سیمیں کے خطبہ استقبالیہ میں صفحہ ۵ اور ۶ پر لکھتے ہیں :

"ہماری بزم، اردو کی سب سے قدیم ادبی انجمن ہے۔ اس کے بانی علامہ ڈاکٹر عظیم الدین احمد مرحوم تھے، ہمارے دوسرے صدر الحاج پروفیسر عبد المنان صاحب بیدل ہوئے۔ آپ نے علامہ مرحوم کی تمام روایات برقرار رکھیں۔ آپ بزم کے قیام کے زمانہ ہی سے اس کے روح رواں تھے۔ ہمارے تیسرے صدر پروفیسر حافظ شمس الدین احمد صاحب تھے۔ آپ کے زمانہ صدارت میں بزم کو بڑا عروج حاصل ہوا۔ ہمارے چوتھے صدر استاذی ڈاکٹر اقبال حسین تھے، آپ کی نگرانی میں بزم دن بدن ترقی کرتی چلی گئی۔ ہمارے موجودہ صدر پروفیسر اختر اورینوی ہیں، آپ نے اپنی گراں قدر خدمات سے بزم کو فروغ دیا اور اب آپ کی صدارت کے پہلے سال میں یہ شاندار جبلی منائی جارہی ہے۔"

بزم ادب کا جشن سیمیں ۱۳، ۱۴ اور ۱۵ فروری ۱۹۵۳ء کو منایا گیا۔ ۱۳ فروری کو جشن کا افتتاح عالی جناب مہیش پرشاد سنہا ریاستی وزیر صنعت و اطلاعات نے کیا۔ جناب حیات اللہ انصاری ایم ایل سی اتر پردیش ایڈیٹر قومی آواز لکھنؤ نے اس کی صدارت کی۔ ڈاکٹر ہادی حسن صاحب صدر شعبۂ فارسی علی گڑھ یونیورسٹی اور پروفیسر آل احمد سرور صدر شعبہ اردو لکھنؤ یونیورسٹی نے تقریریں کیں۔ مقالہ پڑھنے والوں میں ڈاکٹر وشوناتھ پرشاد صدر شعبہ ہندی پٹنہ یونیورسٹی، پروفیسر رندیشور پرشاد صدر شعبہ عمرانیات، پٹنہ یونیورسٹی اور پروفیسر سید حسن عسکری صدر شعبہ تاریخ پٹنہ کالج وغیرہ تھے۔ ۱۴ فروری کو بین المدارس مباحثہ ہوا۔ اسی روز شام کو جناب جعفر پرویز نے نغمہ سنایا، کنہیا لال کپور کا ایک فیچر "غالب اور حالی ترقی پسند شعراء کی مجلس میں" پیش کیا گیا۔ ۱۵ فروری کو ایک مشاعرہ کا انعقاد

ہوا جو کہ کل ہند ریڈیو پٹنہ نے نشر کیا اور جناب جعفر علی خاں اثر لکھنوی نے صدارت کی۔ کم از کم پچیس شعراء نے اس مشاعرہ میں حصہ لیا۔

یادگاری ڈرامہ :

اختر احمد اور یوی صاحب نے ایک مختصر ڈرامہ بنام "طلوع اسلام" تیار کیا اور بزم ادب کی طرف سے اس کو مہمانوں اور طلبا کے سامنے خوبی سے نیو جمنازیم کے اسٹیج سے پیش کیا جو بہت پسند ہوا۔ پرنسپل بھتیجا صاحب نے اس ڈرامہ کو بہت شوق سے دیکھا اور بہت تعریف کی۔ ڈرامہ کے آغاز سے پہلے ایک نغمہ پیش کیا گیا جو علامہ اقبال کے اشعار پر مشتمل تھا۔ نغمہ نہایت خوش الحانی اور خوب صورتی کے ساتھ پردے کے پیچھے سے سنایا گیا۔ اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ غیب سے آواز آرہی ہے۔ ڈرامہ میں مسلمانوں کی زبوں حالی اور ان پر ملاؤں کے بیجا اثرات کو دکھایا گیا تھا وہ سب مبالغہ آمیز باتیں جو ملاؤں کے متعلق پیش کی گئی تھیں راقم کو پسند نہ آئیں۔ مجموعی حیثیت سے یہ ڈرامہ بہت کامیاب رہا اور راقم نے طلبا اور اختر صاحب کو اس کی کامیابی پر مبارک باد دی۔ یہ واقعہ تقریباً چالیس سال پہلے کا ہے۔ آج کل کے دور میں راقم کو بہار کے مسلم طلبا کے اندر کوئی بیداری اور ہمت نظر نہیں آتی ہے۔

ہسٹوریکل سوسائٹی :

اس سوسائٹی کو ۱۹۰۷ء میں قائم کیا گیا تھا۔ ابتدائی دور میں اس کو پنڈت رام اوتار شرما اور مسٹر وی۔ ایچ۔ جیکسن نے بہت جاں فشانی کے ساتھ فروغ دیا اور پرنسپل بھتیجا صاحب کے دور میں کچھ ایسے مقالے پڑھے گئے جو بہت دلچسپ تھے۔ مسٹر ورما جو سال ششم کے طالب علم تھے اس زمانے میں شیر شاہ پر ایک نہایت اچھا مقالہ پڑھا جو راقم کو پسند آیا۔ پروفیسر سید حسن عسکری ڈاکٹر کے کے دت اور ڈاکٹر جگدیش چندر سرکار نے اپنی خدمات سے اس سوسائٹی کو کامیاب بنایا۔

ڈی بیٹنگ سوسائٹی، پٹنہ کالج :

۱۹۰۹ء میں ڈی بیٹنگ سوسائٹی قائم ہوئی اور اسی وقت سے نہایت سرگرمی کے ساتھ کام کرنے میں مشہور رہی ہے۔ انجمن کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کا نائب صدر کالج کا طالب علم ہوتا ہے کسی دوسری انجمن میں ایسا انتظام نہیں ہے۔ پرنسپل بھتیجا کے وقت میں اس انجمن کی کافی ترقی ہوئی۔ وہ خود اکثر اس کے جلسوں میں شریک ہوتے اور طلبا کی ہمت افزائی کرتے تھے۔ پرنسپل بھتیجا کا یہ خیال تھا کہ انجمن کے کچھ مباحثے عام فہم ہندوستانی زبان میں ہوں اور جہاں تک ممکن ہو سکے فارسی، سنسکرت کے الفاظ

کا استعمال نہ کیا جائے مگر اس مقصد میں کامیابی نہ ہو سکی اور اس خیال کو ترک کرنا پڑا۔ پروفیسر فضل الرحمن، پروفیسر جمنا پرشاد، پروفیسر وائی جے تاراپورے والا، اور ڈاکٹر ایس سی سرکار اکثر جلسوں کی صدارت کرتے اور مباحثوں میں جج کے فرائض بھی انجام دیتے تھے۔ نہایت دلچسپ موضوعات پر بحثیں ہوا کرتی تھیں اور انگریزی تقریروں کا معیار بلند رہتا تھا۔ اس زمانے میں مسلمان طلبا اچھی تعداد میں انجمن کے مباحثے اور تقریروں میں شرکت کرتے تھے۔ چند مسلم طلباء کے نام یہ ہیں۔ (۱) ابوالعلی رضی الرحمن (۲) حسن مرتضیٰ (۳) سید شاہ اقبال حسین (۴) ایس۔ ایم۔ نقوی (۵) اے۔ منعم (۶) سید منظور عالم (۷) ایس جی وارث (۸) سید احمد وغیرہ۔ سید شاہ اقبال حسین اور حسن مرتضیٰ تقسیم ہند کے بعد پاکستان چلے گئے۔ حسن مرتضیٰ کراچی جاکر عین جوانی میں انتقال کر گئے۔ جانے سے پہلے غالباً بہار میں ڈپٹی کلکٹر تھے۔ ابوالعلی حکومت پاکستان میں اعلیٰ سے اعلیٰ عہدوں سے سرفراز ہوئے۔ اور سید شاہ اقبال حسین نے بھی پاکستان جاکر بہت ترقی کی اور اکثر ممالک میں پاکستان کے سفیر رہے۔ منعم حکومت بہار میں اے ڈی ام ہوئے اور سید منظور عالم نے بہار میں ضلع جج ہو کر پنشن پائی اور اس کے بعد بھی چند عہدوں پر فائز رہے۔ سید منظور عالم سکریٹری ہونے کے علاوہ نائب صدر بھی ہوئے۔ اور اپنے فرائض کو نہایت خوبی سے انجام دیا۔ افسوس کی بات ہے کہ آج کل مسلم طلباء اس انجمن کے کاموں میں کم حصہ لیتے ہیں۔

ابوالعلی رضی الرحمن جناب شمس العلماء عبدالحی صاحب مرحوم سابق پروفیسر فارسی پٹنہ کالج کے پوتے ہیں۔ سید شاہ اقبال حسین پٹنہ کے مشہور معالج ڈاکٹر ایس۔ ایس۔ محمود شاہ کے بھائی ہیں۔ اور سید منظور عالم راقم کے استاذ محترم پرنسپل سید سعید عالم مرحوم لا کالج کے صاحبزادے ہیں۔ یہ تینوں حضرات راقم کے عزیز شاگردوں میں ہیں۔

رسل لکچرس :

کیپٹین چارلس رسل جو پٹنہ کالج میں ۱۹۰۶ء سے ۱۹۱۴ء تک پروفیسر و پرنسپل رہے۔ دوران پہلی جنگ عظیم ۲۲ نومبر ۱۹۱۷ء کو فلسطین کے جنگی محاذ پر مارے گئے۔ ان کی یاد میں ان کے دوستوں نے ایک فنڈ قائم کیا، جس کی آمدنی سے معروف شخصیتوں کو مدعو کر کے کسی موضوع پر لکچر دلایا جاتا ہے اور یہ رسل لکچرس کے نام سے مشہور ہے۔ کئی سالوں سے یہ لکچر بند تھا۔ پرنسپل بھینجا نے ۲۳ اپریل ۱۹۴۳ء کو مسٹر شیہ ہوا جو ہندوستان میں چینی ری پبلک حکومت کے پہلے کمشنر تھے، انھیں مدعو کر کے چین کے اندرونی اتحاد پر لکچر دلوا دیا۔ چینی کمشنر نے اپنی اس تقریر میں بتایا کہ

چین میں مختلف بولیاں بولی جاتی ہیں، مگر پورے ملک کی تحریری زبان ایک ہے۔ اسی تحریری زبان نے ایک ایسی تہذیب اور معاشرت کو جنم دیا جس سے زندگی کے بیشتر شعبوں میں یکسانیت پیدا ہوگئی، اور اس طرح پورے ملک میں اسی زبان کی بدولت اتحاد قائم ہوگیا ہے۔ یہ لکچر چھپ کر شائع ہوا اور بڑا مقبول ہوا مسٹر شن شیہ ہا کو جب ان کے لکچر کا معاوضہ دیا جانے لگا تو اسے لینے سے انکار کیا۔ معاوضہ کی رقم اور بہت سی کتابیں جو وہ اپنے ساتھ لائے تھے پٹنہ کالج لائبریری کو عطا کر دیں۔ پرنسپل بھٹیجا نے اپنے زمانے کا دوسرا لکچر ۱۹۴۵ء میں لفٹننٹ جنرل سر آبون میکے جو آسٹریلیا کے ہائی کمشنر تھے ان کو مدعو کرکے دلوایا۔ صاحب موصوف نے لکچر میں آسٹریلیا کی ان دشواریوں کا تذکرہ کیا جو خشک سالی، سیلاب، اور قحط کے سبب سے اسے دوچار ہونا پڑا تھا۔ آسٹریلیا ان مشکلات پر قابو پاکر خود کفیل ملک بن گیا اور اپنی ضروریات کی چیزوں کو اپنے یہاں تیار کرنے لگا ہے۔ یہاں کے لوگ اب نہایت خوش حالی کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ آسٹریلیا کی خواہش ہے کہ ہر ملک اپنے طور پر آزادی حاصل کرکے، خوش رہے اور اپنا ممتاز مقام قوموں کے درمیان پیدا کرے۔

اساتذہ کی رہائش کا انتظام :

اس زمانے میں کالج کے پروفیسر اور لکچرر کے لیے سرکاری رہائشی مکانات بہت کم تھے جس سے ان حضرات کو بڑی پریشانی کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ پٹنہ کالج اور سائنس کالج ملا کر کالج کے احاطے میں صرف سات بنگلے تھے۔ جس کے دو بنگلوں میں پٹنہ کالج اور سائنس کالج کے پرنسپل رہا کرتے تھے۔ اور باقی پانچ بنگلوں میں آئی۔ای۔ایس کے پروفیسر رہتے تھے۔ رانی گھاٹ میں چار پروفیسر کوارٹرس، دو اسسٹنٹ پروفیسر کوارٹرس اور دو لکچرر کوارٹرس تھے۔ ان میں پٹنہ کالج کے دو پروفیسر اور ایک ایک اسسٹنٹ پروفیسر اور لکچرر کے لیے مخصوص تھے۔ میرے ابتدا کے دو سال رہائشی پریشانیوں میں گزرے اور کچھ دنوں بعد مجھے محلہ لال باغ میں ایک آرام دہ کرایہ کا بنگلہ مل جانے سے میں نے اس میں آٹھ سال تک اپنے بال بچوں کے ساتھ نہایت آرام سے گزارا۔ اس کے بعد راقم کی تقرری جب کلاس ون کے پروفیسر کے عہدہ پر ہوئی تو رانی گھاٹ میں ایک انگریزی طرز کا دو منزلہ بنگلہ رہنے کو ملا۔ اس بنگلہ میں تقریباً تین سال رہا۔ ۱۹۵۲ء میں پٹنہ یونیورسٹی ایک رہائشی یونیورسٹی میں تبدیل ہوگئی تو پروفیسروں کے لیے بہت سے رہائشی مکانات کی تعمیر ہوئی پھر بھی اساتذہ کی پریشانی باقی رہی اور اب تک وہی حالت قائم ہے۔

کالج کی عمارت اور طلبا کی شائستگی :

کالج کی عمارت نہایت ہی خوب صورت ڈچ طرز پر بنائی گئی ہے۔ حکومت بہار نے اس کی صفائی ستھرائی کا بڑا اچھا انتظام کر رکھا تھا۔ دیوار اور دروازے ہمیشہ صاف اور چکنے نظر آتے تھے۔ دیواروں پر آج کل کی طرح نعرہ بازی اور دیگر پروپگنڈہ کے کلمات لکھنے کی کسی کو جرأت نہ ہوتی۔ کالج کے متفرق میدان صاف اور سرسبز رہتے پھول اور پودوں سے ہرے بھرے نظر آتے اور پورا احاطہ بڑا خوب صورت نظر آتا۔ گھاس کی کٹائی بڑے اہتمام سے بذریعہ مشین ہوتی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سبز مخمل کا قالین بچھا ہے۔ جاڑوں میں رنگ برنگ کے پھول کھلے رہتے تھے۔ طلبا اتنے مہذب تھے کہ پھولوں کو ہرگز نہ توڑتے لیکن اب افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ وہ سب باتیں خواب و خیال ہو کر رہ گئی ہیں۔

مسلم لیگ کا اجلاس :

دسمبر ۱۹۳۸ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کا ۲۶واں اجلاس زیر صدارت مسٹر محمد علی جناح پٹنہ میں منعقد ہوا۔ اس اجلاس میں ہندوستان کے ہر صوبہ کے نامور مسلم رہنما شریک ہوئے۔ خصوصاً مسٹر اے۔ کے فضل الحق، مس فاطمہ جناح، سر سکندر حیات خاں، سر خواجہ ناظم الدین، نواب چھتاری، راجہ محمود آباد، نواب زادہ لیاقت علی خاں، سردار محمد اورنگ زیب خاں، قاضی محمد عیسیٰ اور بے شمار مسلم رہنماؤں نے نمایاں طور سے جلسہ کی کارروائی میں حصہ لیا۔ اس جلسہ کے لیے لان میں (جو اب گاندھی میدان کہلاتا ہے) ایک نہایت ہی وسیع اور شاندار پنڈال بنایا گیا جس میں تقریباً ڈیڑھ لاکھ آدمیوں کے بیٹھنے کی گنجائش تھی۔ پنڈال کی تیاری کا کام نہایت حسن و خوبی سے انجام پایا۔ مسٹر سید عبد العزیز بیرسٹر، مسٹر سید جعفر امام بہار کے نامور مسلم لیگی لیڈر، ڈاکٹر عبد الغفور مالک گرین میڈیکل ہال اور پٹنہ کے بے شمار مسلمانوں کی انتھک کوششوں سے تمام کام انجام پائے۔ راقم نے اس سے پہلے نہ اس کے بعد پٹنہ میں اتنا شاندار جلسہ اور نہ اتنے رہنماؤں کا اجتماع دیکھا ہے۔ آج سے بیس بائیس سال قبل پٹنہ میں آل انڈیا کانگریس کا جلسہ ہوا تھا مگر جوش، حسن انتظام، آدمیوں کی کثرت، مسلم لیگ کے جلسہ میں جو تھی وہ کانگریس کے جلسہ میں بالکل مفقود تھی۔ راقم نے ان دونوں جلسوں میں شرکت کی تھی۔ اس زمانے میں جب مسلم لیگ کا جلسہ پٹنہ میں ہوا تھا مسٹر سری کرشن سنہا بہار کے وزیر اعلیٰ تھے۔ انھیں ایسی کامیابی جو مسلم لیگ کے جلسہ کو نصیب ہوئی وہ ان کے وہم و گمان میں بھی نہ تھی اور اس کی کامیابی پر حیرت زدہ ہو کر رہ گئے۔ اس جلسہ

کے بعد بہار میں تحریک مسلم لیگ دن بدن زور پکڑتی گئی اور آخر کار پاکستان وجود میں آیا۔

دوسری جنگ عظیم :

دوسری جنگ عظیم ۳ ستمبر ۱۹۳۹ء کو شروع ہوئی اور دوسری ستمبر ۱۹۴۵ء کو ختم ہوئی۔ ہٹلر اور مسولینی کی ملک گیری کی ہوس نے ساری دنیا کو جنگ کی آگ میں جھونک دیا اور آخر کار اس دنیا میں ذلیل و خوار ہو کر ملک عدم کی راہ لی۔ آج بھی لوگ ان دونوں پر لعنت بھیجتے ہیں۔ اس جنگ میں صرف برٹش کومن ویلیتھ کے کم از کم تیئس لاکھ بہتر ہزار سپاہی مارے گئے۔ جرمنی اور روس کے کتنے سپاہی مارے گئے، اس کا کوئی اندازہ اب تک نہیں لگایا جاسکا ہے۔ یورپ کے بڑے بڑے شہر جنگ کی زد میں آکر تباہ و برباد ہو گئے۔ اس جنگ نے دنیا کے امن و امان کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا اور بین الاقوامی کشیدگی ہر جگہ بڑھ گئی۔ دوران جنگ چرچل کہا کرتا تھا کہ یہ جنگ دنیا کے تمام ملکوں کو آزادی دیئے جانے کیلیے لڑی جا رہی ہے، لیکن اسی چرچل نے ہندوستان کی آزادی کی مخالفت کی۔ غلام ہندوستان جنگ کی کامیابی کے لیے انگریزوں کی تن من دھن سے مدد کرتا رہا اور اس کے سوا اس کے پاس کوئی اور چارہ ہی کیا تھا۔ جنگ ہندوستان سے بہت دور یورپ اور افریقہ میں لڑی جا رہی تھی اس لیے ہندوستان کے عوام الناس جنگ کی ہولناکیوں سے بالکل بے خبر تھے۔ دریں اثنا جاپانیوں نے برما پر حملہ کیا، کوہیما اور امپھال تک بڑھ آئے جو ہندوستان کی سرحد پر ہے اور کلکتہ پر دو تین بم بھی گرائے۔ پوربی ہندوستان میں ہر جگہ تہلکہ مچ گیا اور لوگوں نے کلکتہ سے بھاگ کر دوسرے شہروں میں پناہ لی خیریت تھی کہ جنگ جلد ختم ہو گئی ورنہ ہندوستانیوں کو سخت ترین مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑتا۔ امریکیوں نے ایٹم بم یورپ پر تو نہ گرایا مگر ایشیا میں دو ایٹم بم جاپان میں ہیروشیما اور ناگاساکی پر گرایا جس میں بے شمار جاپانی لقمۂ اجل ہوئے اور اس کی خوشی میں امریکہ میں شادیانے بجائے گئے۔ دوسری جنگ عظیم اس ہولناکی پر ختم ہو گئی۔ قدرت کا حساب بڑا پکا ہے۔ دیکھیے تیسری جنگ عظیم میں امریکہ پر کیا گزرتی ہے۔

چیزوں کی قیمت :

دوران جنگ عظیم چیزوں کی قیمتیں بڑھ گئی تھیں مگر آج کل کے مقابلے میں ہر چیز کی قیمت دس گنا کم تھی۔ آخر دور میں ہندوستان کے کل کارخانے جنگی سامانوں کو بنانے میں مصروف تھے اس لیے سوتی اور اونی کپڑوں کی قیمتیں مقرر کر دی گئیں اور جا بہ جا ان کپڑوں کی فروخت کے لیے دکانیں

قائم کردی تھیں۔ جس کی وجہ سے عوام الناس کو بڑی سہولت تھی۔

۱۹۴۲ء کا ہنگامہ :

"ہندوستان چھوڑ دو" کی تحریک کے سلسلہ میں انگریزوں نے نامور کانگریسی لیڈروں کو گرفتار کرکے احمدنگر کے قلعہ میں قید کردیا جس کے نتیجے میں پٹنہ شہر میں بھی بڑا ہنگامہ بپا ہوا۔ ۱۱ اگست ۱۹۴۲ء کو طلباء کی ایک بڑی جماعت نے یہ فیصلہ کیا کہ کانگریسی جھنڈا پٹنہ سکریٹریٹ پر نصب کردیا جائے۔ اس خیال سے ہزاروں لوگ دو بجے دن کو سکریٹریٹ کے دروازے پر جمع ہوئے اور کانگریسی جھنڈے کو سکریٹریٹ کے پوربی دروازے پر لگا بھی دیا۔ یہ لوگ بے انتہا شور و غل مچا رہے تھے اور ہنگامہ کرنے پر تلے ہوئے تھے۔ ضلع مجسٹریٹ نے ہنگاموں سے عاجز آکر لوگوں کو منتشر ہوجانے کا حکم دیا مگر اس حکم کا مجمع پر کوئی اثر نہ ہوا۔ آخر کار مجبور ہوکر مجسٹریٹ نے گولی چلانے کا حکم دیا جس کے نتیجے میں سات طلباء مارے گئے۔ اسی روز پٹنہ کالج کے طلباء نے ہڑتال کی، کانگریسی جھنڈے کو کالج کی عمارت پر لگا دیا اور صدر دروازے کا گھیراؤ کرکے کسی کو اندر نہ جانے دیتے تھے۔ سخت بدتمیزی پر اتر آئے تھے۔ ۱۲ اگست کو پرنسپل بھٹیجا کو یہ فکر لاحق ہوئی کہ کانگریسی جھنڈے کو کالج کی عمارت سے کس طرح اتارا جائے۔ راقم نے مشورہ دیا کہ ۱۲ اگست کو جھنڈا اتارنے کی کوشش نہ کی جائے۔ کیونکہ طلباء کثیر تعداد میں موجود تھے اور ان کی موجودگی میں جھنڈا اتارنا مناسب نہ تھا۔ ۱۳ اگست کو کچھ برٹش فوج پٹنہ آگئی اور اس کی ہیبت سے لوگ پٹنہ چھوڑ چھوڑ کر بھاگنے لگے اور دیہاتوں میں جاکر مختلف قسم کی بدامنی اور ہنگامہ آرائی کرنے لگے۔ ۱۳ اگست کو بڑے بابو نے تین نہایت مضبوط چپراسیوں کی مدد سے کانگریسی جھنڈے کو اتروا کر راقم کے حوالے کیا۔ میں نے اس جھنڈے کو موڑ کر ایک چھوٹے تھیلے میں ڈالا اور اس کو پرنسپل کے بنگلہ پر بھیج دیا جسے دیکھ کر انھیں اطمینان ہوا اور اپنے بنگلہ سے کالج کے میدان میں آئے۔ ڈاکٹر سید عبدالمجید، پروفیسر سید حسن عسکری اور راقم میدان میں بیٹھے حالات حاضرہ پر باتیں کر رہے تھے۔ پرنسپل موصوف ہم لوگوں کے پاس آئے اور فرمایا کہ آپ تینوں حضرات آج کی رات کالج میں رہ جائیں تو مجھے بڑی تقویت ملے گی۔ ڈاکٹر سید عبدالمجید اور راقم نے خانگی وجوہات کی بناء پر معذرت چاہی مگر پروفیسر حسن عسکری رات کو قیام کرنے کے لیے آمادہ ہوگئے اور رات بھر نہایت جانفشانی سے کالج کی پہرہ داری کرائی۔ پرنسپل موصوف نے ان کی اس خدمت سے خوش ہوکر حکومت بہار کے اعلیٰ حکام کو ان کی کارکردگی کی خبر کی اور حکومت ہند نے پروفیسر سید حسن عسکری کو اس

کے صلہ میں "خان صاحب" کے خطاب سے سرفراز کیا۔

۱۷ اگست کو گورے سپاہیوں کا ایک بریگیڈ پٹنہ پہنچا اور پٹنہ کالج کی عمارت اور اس کے چند ہوسٹلوں کی عمارتوں میں سپاہیوں نے قیام کیا۔ راقم کو خوب یاد ہے کہ ان گورے سپاہیوں کی فوج میں ولٹ شائر ریجمنٹ کا ایک دستہ بھی شامل تھا۔ جب یہ ریجمنٹ کا دستہ پٹنہ کالج میں قیام کے لیے آیا تو اس دستہ کے ایک میانہ قد کپتان سے کالج کے احاطے میں راقم سے ملاقات ہوئی۔ یہ کپتان نہایت اچھا اور خوش مزاج انسان تھا اور اس نے مجھے اطمنان دلایا کہ یہ سب ہنگامے چند دنوں میں ختم کر دیئے جائیں گے۔ اس خبر سے مجھے بڑی خوشی ہوئی کیونکہ اس طرح کی بدامنی سے ہر شخص کو پریشانی تھی۔ مسلمان من حیث القوم مذکورہ بالا تحریک اور اس کے ہنگاموں سے بالکل الگ تھے۔ گورے سپاہی ان لوگوں سے جو پائجامہ پہنے رہتے تھے مسلمان سمجھ کر کسی طرح کی باز پرس نہ کرتے تھے۔ یہ دیکھ کر بے شمار ہندوؤں نے اپنی دھوتیاں اتار کر اور پائجاموں میں ملبوس ہو کر بہت سی مشکلات سے نجات پائی۔ فوج نے پٹنہ شہر کو کئی علاقوں میں تقسیم کر کے ناکہ بندی کر دی اور ایک محلہ سے دوسرے محلہ میں جانے کے لیے پروانۂ راہ داری (Military passport) درکار تھا جس پر سختی سے عمل ہوتا تھا۔ یہ پروانہ بحکم کمشنر پٹنہ ڈویژن ضلع مجسٹریٹ کے آفس اور تھانے سے حاصل کیا جا سکتا تھا۔ رات کو کرفیو لگا دیا جاتا اور کوئی شخص اپنے گھر سے باہر نہ نکل سکتا تھا۔ ضلع مجسٹریٹ خاص خاص لوگوں کو کرفیو پاسپورٹ دیا کرتا تھا۔ اکثر موقعوں پر شناختی کارڈ کی بھی ضرورت پڑتی تھی۔ راقم کے پاس اب تک ان تینوں قسم کے اجازت نامے بطور یادگار محفوظ ہیں۔ پٹنہ کالج ایک ماہ سے زیادہ کے لیے بند کر دیا گیا اور راقم اپنے گھر میں بیٹھ کر ریڈیو سے قوالی، گانے اور خبریں سنا کرتا تھا۔

گاندھی جی کا ۱۹۴۳ء کا برت :

فروری ۱۹۴۳ء میں گاندھی جی نے ۲۱ دن کا برت رکھنے کا فیصلہ کیا۔ جب یہ برت شروع ہوا تو گاندھی جی کے سن کو مدنظر رکھتے ہوئے لوگوں کو بڑی تشویش ہوئی اور یہ فیصلہ کیا گیا کہ بروز سنیچر تاریخ ۲۰ فروری ۱۹۴۳ء کو ۶ بجے شام کو مندروں، مسجدوں، گرجاؤں اور دیگر عبادت گاہوں میں گاندھی جی کی صحت اور درازیٔ عمر کے لیے دعا کی جائے اور یہ بھی ہدایت کی گئی کہ ہر شخص روزانہ اپنے گھر میں اسی طرح کی دعائیں کرے۔ اس کے متعلق ایک نوٹس چھاپ کر شائع کی گئی جس پر پٹنہ کے چودہ[۱۴] معزز شخصیتوں نے دستخط کیے تھے۔ ڈاکٹر سچیدانند سنہا نے اس نوٹس کی ڈرافٹ

کاپیاں راقم کے پاس میرے عزیز دوست مسٹر رفیع الدین بلخی کے معرفت بھیجا کہ طلبا میں تقسیم کر دی جائیں۔ اس نوٹس کی ایک کاپی راقم نے اپنے پاس رکھ لی جو اب تک میرے پاس محفوظ ہے۔ نوٹس کی باقی تمام کاپیاں طلبا میں تقسیم کر دی گئیں۔ راقم گاندھی جی کا احترام تو ضرور کرتا تھا مگر ان کی سیاست سے ہمیشہ الگ رہا۔ راقم نے نوٹس پا کر ڈاکٹر سچیدانند سنہا کو جو میرے سیاسی خیالات سے بخوبی واقف تھے دو سطر کا ایک خط لکھا جس میں حافظ کا حسب ذیل شعر تھا :

عمرتان باد و دراز اے ساقیان بزم جم
گرچہ جام ما نہ شد پر مے بہ دوراں شما

میرے کہنے کا مطلب واضح تھا اور ڈاکٹر سچیدانند سنہا، جو فارسی جانتے تھے میرے اشارے کو خوب سمجھ گئے کہ میری یہ دعا تھی کہ گاندھی جی زندہ رہیں

بارھویں اورینٹل کانفرنس میں شرکت :

کل ہند اورینٹل کانفرنس کا بارھواں اجلاس دسمبر ۱۹۴۳ء میں بنارس ہندو یونیورسٹی میں منعقد ہوا۔ راقم کو پٹنہ یونیورسٹی نے بحیثیت نمایندہ اس کانفرنس میں شرکت کے لیے بھیجا اور میں نے اس جلسہ میں شرکت کر کے اپنا مضمون "چندر بھان برہمن" پڑھا جو شاہ جہانی دور میں فارسی کا ایک اچھا شاعر تھا۔ حاضرین نے میرے اس مضمون کو بہت پسند کیا اور بعد میں بحکم اعلیٰ حضرت نظام حیدر آباد، یہ مضمون "اسلامک کلچر" (جلد نمبر ۱۹، شمارہ نمبر ۲) میں شائع ہوا۔ بنارس ہندو یونیورسٹی نے نمایندوں کے قیام و طعام کا کچھ اچھا انتظام نہ کیا تھا اس لیے راقم "سیسل ہوٹل" میں جا کر قیام پذیر ہوا جہاں ایک ہفتہ تک بہت آرام سے رہا۔ میرے کل اخراجات کو پٹنہ یونیورسٹی نے برداشت کیا۔ عام طور سے پٹنہ یونیورسٹی اپنے نمایندوں کے ساتھ اتنی فیاضی نہیں برتتی ہے۔ اس کانفرنس میں شرکت کے لیے تمام ہندوستان سے نامور اساتذہ آئے تھے اور اسی موقع پر مسٹر غلام یزدانی اور پروفیسر نظام الدین سے مجھے پہلی بار ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔ پروفیسر نظام الدین عثمانیہ یونیورسٹی میں فارسی کے پروفیسر تھے اور اکثر اپنی شائع شدہ کتابوں کو مجھے بطور تحفہ بھیجا کرتے تھے۔ موصوف نہایت ہی ملنسار اور خوش مزاج انسان تھے اور راقم سے تاحیات بہت خلوص سے ملتے رہے۔ ان کے انتقال پر مجھے بڑا افسوس ہوا۔ دوران قیام سارناتھ گیا۔ ایک بڑے کمرے میں گوتم بدھ کا مجسمہ رکھا ہوا ہے اور اس کمرے کی دیواروں پر چاروں طرف ایک جاپانی مصور نے تصویریں منقش کی ہیں اور گوتم بدھ کی پیدائش سے لے کر

وفات تک کی مختلف دور کی تصویریں ہیں۔ اس کے بعد میں نے سارناتھ کا عجائب خانہ بھی دیکھا، جہاں پرانے ہندو دور کی مختلف چیزیں محفوظ ہیں۔ ایک روز شام کو اپنے ایک ہندو دوست کے ساتھ وشوناتھ کا مندر دیکھنے گیا اور آرتی اتارنے کی رسم کو دیکھ کر بہت متاثر ہوا۔ بے شمار ہندو پجاری نہایت ہی عجز و انکساری کے ساتھ اس پوجا میں شریک تھے۔ بے ساختہ راقم کو اقبال کا یہ شعر یاد آگیا:

دیکھ لی تو نے شکست رشتۂ تسبیح شیخ

بتکدے میں برہمن کی پختہ زناری بھی دیکھ

فارسی پڑھنے والے طلبا کی تعداد میں کمی اور دو نامور شاگرد:

۱۹۴۴ء تک فارسی پڑھنے والے طلبا کی تعداد ویسے ہی رہی جیسے پہلے تھی، مگر اس کے بعد ہر سال آئی۔ اے اور بی۔ اے میں فارسی پڑھنے والے طلبا کی تعداد روز بروز کم ہوتی گئی۔ ہندوؤں نے فارسی پڑھنا بالکل ترک کر دیا۔ اس دور کے فارسی پڑھنے والے طلبا میں مسٹر سید سرور علی نے اپنی زندگی میں بہت شہرت حاصل کی، پٹنہ ہائی کورٹ کے جج ہوئے اور چیف جسٹس ہو کر پنشن پائی۔ ایک دوسرے شاگرد مسٹر محمد یونس ہیں جنھوں نے فارسی ایم۔ اے پاس کر کے سرکاری ملازمت اختیار کی اور ترقی کر کے آئی۔ اے۔ ایس ہوئے۔ آج کل بہار اردو اکادمی کے سکریٹری ہیں۔ بہت ہی منکسر مزاج انسان ہیں اور اپنے اساتذہ کا بڑا احترام کرتے ہیں۔ موصوف نے حج اور زیارت مدینہ کا شرف حاصل کیا ہے۔

ہندی ساہتیہ سمیلن لائبریری اور اردو لائبریری:

وصہ سے بہار میں ہندی ساہتیہ سمیلن ہندی زبان و ادب کے لیے تمام بہار میں سرگرمی سے کام کر رہی تھی۔ ۱۹۳۸ء میں بہار میں جب کانگریسی حکومت قائم ہوئی تو وزیر اعلیٰ بہار نے یہ فیصلہ کیا کہ سمیلن کے کاموں کو ترقی دینے کے لیے ہر طرح سے امداد کی جائے، چنانچہ قدم کنواں میں ہندی ساہتیہ سمیلن کے لیے ایک بڑی عمارت تعمیر کی گئی اور اس میں ہندی کتابوں کی ایک اچھی لائبریری قائم ہوئی۔ اس کو دیکھ کر ڈاکٹر سید محمود کو جو اس زمانے میں وزیر تعلیم تھے، خیال گذرا کہ ایک اردو لائبریری بھی قائم کی جائے۔ اس خیال کو مد نظر رکھتے ہوئے ڈاکٹر صاحب موصوف نے چار کمرے کی دو منزلہ عمارت جو پرانے لا کالج سے ملحق تھی اردو لائبریری قائم کرنے کے لیے گورنمنٹ سے حاصل کی۔ یہاں ایک چھوٹی سی اردو لائبریری قائم کی گئی۔ اس لائبریری کی صدر لیڈی انیس امام ہوئیں اور مسٹر سید حیدر امام بیرسٹر اس کے سکریٹری مقرر کیے گئے اور تاحیات تقریباً چالیس سال تک ان دونوں نے صدر اور سکریٹری کے فرائض

کو انجام دیا۔ پانچ سو روپیے سالانہ حکومت سے اردو کتابوں کی خریداری کیلیے ملتے تھے جو نہایت ناکافی تھے مگر حکومت بہار نے اس رقم میں کوئی اضافہ نہ کیا۔ اس لائبریری کے لیے ایک انتظامی کمیٹی بھی قائم کی گئی تھی جس کے آٹھ دس ممبر تھے۔ مسٹر قاضی عبدالودود، جمیل مظہری اور راقم تقریباً ۲۰ سال سے زیادہ اس کمیٹی کے ممبر رہے۔ سید سلطان احمد نہایت قلیل تنخواہ پر لائبریرین تھے مگر اپنے کاموں کو نہایت محنت اور خوبی سے انجام دیتے رہے۔ مسٹر قاضی عبدالودود گورنمنٹ کی اس بے اعتنائی سے عاجز آکر ممبری سے الگ ہو گئے اور راقم نے بھی لائبریری کے کاموں میں دل چسپی لینا چھوڑ دیا۔ مسٹر سید حیدر امام کی موت کے بعد مسٹر ہارون رشید سکریٹری مقرر ہوئے جن کی صلاحیت اور حسن انتظام سے سب لوگ واقف ہیں، انھوں نے حکومت کی توجہ لائبریری کے کاموں کی طرف مبذول کرائی اور اپنی محنت سے لائبریری کے امداد میں گراں قدر اضافہ کرایا۔ اپنی انتظامی صلاحیت کو کام میں لاکر اردو لائبریری میں ایک نئی جان ڈال دی۔ جب لائبریری کی تشکیل نو ہوئی تو حکومت بہار نے گیارہ ممبران کی انتظامی کمیٹی بنائی جس میں راقم، ڈاکٹر عبدالمغنی، شری محمد شکور، شری مرغوب احمد، شری شمائل نبی کے علاوہ اور بھی حضرات ممبر ہوئے۔ راقم اس کمیٹی کی ممبری سے الگ ہو گیا اور تقریباً ۳۵ سال کا تعلق اردو لائبریری سے ختم ہو گیا۔ تقریباً پچاس سال کے بعد جب حکومت بہار کی توجہ اردو کی طرف ہوئی تو اردو لائبریری کے احاطے میں "اردو بھون" کی بنیاد رکھی گئی ہے۔ حکومت بہار کا فرض ہے کہ اس کام کو جلد اختتام تک پہنچائے۔ اس عمارت میں اردو لائبریری کے علاوہ بہار اردو اکیڈمی کا دفتر بھی قائم کیا جائے گا۔

میرے عزیز شاگرد الحاج محمد یونس پنشن یافتہ آئی۔ اے۔ ایس سکریٹری بہار اردو اکیڈمی نے اپنی پانچ سال کی مسلسل کاوشوں سے "اردو بھون" کی اسکیم کو تکمیل تک پہنچایا اور یہ ان کا بڑا کارنامہ ہے۔ ڈاکٹر جگن ناتھ مشرا وزیر اعلیٰ حکومت بہار نے عربی، فارسی اور خصوصاً اردو کی جتنی خدمت کی ہے وہ کبھی فراموش نہیں کی جا سکتی ہے۔

آٹھواں باب

پروفیسری کے حالات

۱۹۴۴ء سے ۱۹۵۱ء تک

بہار ایجوکیشنل سروس کلاس I :

انڈین ایجوکیشنل سروس کے ختم ہوجانے کے بعد اس کے بدلے حکومت بہار نے بہار ایجوکیشنل سروس کلاس I قائم کیا جس میں ملازمین پروفیسروں کی تعداد تقریباً بیس بائیس ہوا کرتی تھی۔ تقرری کی شرط یہ تھی کہ امیدوار یورپ کا ڈگری یافتہ ہو۔ یہ شرط پہلی مرتبہ جب راقم اور ڈاکٹر کے۔ دت کی تقرری ۱۹۴۴ء میں ہوئی تو ختم کردی گئی، مگر اس کے بعد بھی ترجیح یورپی سند یافتہ کو ملتی رہی۔ تنخواہ تین سو روپیہ سے ایک ہزار روپیہ ماہانہ تھی جو آج کل کے لکچرر کی تنخواہ سے بھی کم ہے۔ مگر یہ ملازمت ان دنوں بڑی قدر و منزلت سے دیکھی جاتی تھی کیوں کہ انھیں کلاس وَن کے پروفیسروں میں سے پرنسپل اور ڈائرکٹر وغیرہ مقرر کیے جاتے تھے اور تقرری کے بعد تو کم از کم صدر شعبہ ضرور ہو جایا کرتے تھے۔ راقم کی تقرری سے پہلے اس سروس میں تین مسلم پروفیسروں کی تقرری ہوئی تھی جن کے نام یہ ہیں: (۱) مسٹر فضل الرحمٰن (۲) مسٹر کلیم الدین احمد (۳) مسٹر قمر الدجیٰ۔ کئی سال تک کوئی پانچواں مسلم پروفیسر اس سروس میں مقرر نہ ہوا۔

اشتہار اور تقرری :

۱؍ اکتوبر ۱۹۴۴ء کو ڈاکٹر ابو نصر محمد علی حسن فارسی و عربی کے پروفیسر پنشن پانے والے تھے، اس لیے جوائنٹ پبلک سروس کمیشن بہار، سی۔ پی اینڈ اڑیسہ نے بہار ایجوکیشنل سروس کلاس I میں فارسی کے پروفیسر کی جگہ پر کرنے کے لیے ۲۲؍ جون ۱۹۴۴ء کو اشتہار کیا۔ راقم نے یہ اشتہار دیکھ کر درخواست روانہ کردی۔ ۳۱؍ اگست ۱۹۴۴ء کو تمام امیدواروں کے ساتھ میرا انٹرویو رانچی سکریٹریٹ بلڈنگ میں ہوا۔ اس زمانے میں مسٹر راد ھن اس کمیشن کے صدر تھے اور خان بہادر سید بشیر الدین،

مسٹر جینتی، اور خان بہادر عبداللطیف کمیشن کے تین ممبر تھے اور ڈاکٹر علی حسن اکسپرٹ تھے۔ کمیشن کے صدر مسٹر راؤٹن صوبۂ متوسط کے سیولیین تھے، خان بہادر عبداللطیف بھی صوبہ متوسط کے پنشن یافتہ افسر تھے۔ ان دونوں حضرات سے میری کبھی کی ملاقات نہ تھی۔ خان بہادر سید بشیرالدین رشتے میں چچا ہوتے تھے مسٹر جینتی جو اوڑیسہ کے رہنے والے تھے میرے کٹک کے دوران قیام یہاں ان سے اکثر ملاقات رہتی تھی۔ موصوف مجھ سے کافی متاثر تھے۔ سب سے پہلے پروفیسر عندلیب شادانی پروفیسر فارسی ڈھاکہ یونیورسٹی کی طلبی ہوئی۔ اور آدھ گھنٹہ تک انٹرویو ہوتا رہا۔ دوسرے امیدواروں کے انٹرویو میں بھی تقریباً اتنا ہی وقت لگا ہوگا۔ سب سے آخر میں جب راقم کا انٹرویو شروع ہوا تو خان بہادر سید بشیرالدین اپنی جگہ سے اٹھ کر جاتے ہوئے فرمایا۔ یہ امیدوار میرا بھتیجا ہے اس لیے میں اس کے متعلق کوئی رائے دینا اچھا نہیں سمجھتا۔ موصوف کا یہ ہمیشہ کا دستور تھا کہ جب بھی کوئی امیدواران کا رشتہ دار ہوتا تو یہی جملہ کہہ کر کمرے سے باہر چلے جاتے تھے اور اس کے متعلق کوئی رائے نہ دیتے۔

انٹرویو کے کمرے میں کرسی پر بیٹھتے ہی سب سے پہلے مسٹر راؤٹن نے میری تعلیمی صلاحیت، تجربہ، تنخواہ اور مدت ملازمت کے بارے میں پوچھا۔ اس کے بعد انھوں نے خان بہادر عبداللطیف کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولے کہ آپ ان سے کچھ فارسی زبان وادب کے متعلق سوال کریں۔ موصوف نے خاقانی کے متعلق اس ڈھنگ سے سوال کیا جس سے میں سمجھ گیا کہ انھیں خاقانی کے متعلق بہت کم واقفیت ہے۔ میں نے خاقانی کے احوال زندگی کو بیان کر کے اس کے حبسیات کا ذکر کیا اور چند اشعار جو اس کے حالات قید وبند پر مشتمل تھے سنایا۔ اس میں تقریباً دس منٹ صرف ہوئے ہوں گے۔ اثنا اوقات میں خان بہادر صرف سر ہلاتے رہے۔ راؤٹن صاحب جو دو سال ایران میں رہ چکے تھے، تھوڑی بہت فارسی سمجھ لیتے تھے، بات کاٹ کر جینتی صاحب کی طرف متوجہ ہو کر بولے آپ بھی کچھ سوالات کریں۔ موصوف نے کہا کہ میں ان سے خوب واقف ہوں، انھوں نے ہمارے کٹک کالج میں فارسی کے استاد کی حیثیت سے نہایت حسن وخوبی کے ساتھ خدمات انجام دی ہیں، قریب آٹھ سال گذر گئے مگر آج بھی کٹک کے علمی حلقوں میں یاد کیے جاتے ہیں۔ راؤٹن صاحب نے آخر میں پروفیسر علی حسن صاحب سے مخاطب ہو کر کہا کہ آپ کچھ سوال کریں۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ یہ چار سال تک میرے شاگرد رہ چکے ہیں اور آٹھ سال سے میری ماتحتی میں کام کر رہے ہیں۔ میں ان سے کچھ پوچھنا نہیں چاہتا۔ راؤٹن صاحب پھر میری طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا کہ کلاس ون کے پروفیسر کو اپنے شعبہ کے ساتھ

اکثر دوسرا کام بھی کرنا پڑتا ہے اس لیے اس کی نظر وسیع ہونی چاہیے، اور اپنی خاص زبان کے علاوہ اس کو دوسری زبانوں سے بھی واقفیت ہو۔ مجھے بتائیں کہ فارسی زبان کے ساتھ آپ نے کون کون سی زبانیں پڑھی ہیں۔ میں نے عرض کیا کہ انگریزی اور اردو زبانوں کو نہایت شوق سے پڑھا ہے اور آپ مجھ سے ان زبانوں کے متعلق سوالات کر سکتے ہیں۔ راؤتن صاحب نے راقم سے دریافت کیا کہ انگریزی زبان کا کون سا نثار آپ کو پسند ہے؟ جب میں نے جی۔ کے چسٹرٹن کا نام لیا تو وہ خوش ہوئے اور کہنے لگے کہ میں بھی چسٹرٹن کی نثر کو پسند کرتا ہوں۔ انھوں نے مجھ سے چسٹرٹن کے متعلق چند سوالات کیے، جن کا جواب میں نے تشفی بخش طور پر دیا اور انھیں پسند بھی آیا۔ چسٹرٹن کی خوش مزاجی اور اس کی دو کتابوں: (۱) "The Nepoleon of Notting Hill" اور (۲) - "White Knight" کے متعلق خوب خوب باتیں ہوئیں۔ انٹرویو کا نتیجہ راقم کے حسب خواہ رہا اور صرف میرا نام پبلک سروس کمیشن نے حکومت بہار کو تقرری کے لیے اپنی سفارش کے ساتھ روانہ کر دیا۔ جب یہ خبر پٹنہ یونیورسٹی پہنچی تو چند لوگوں کو جو میرے مخالف تھے، تعجب ہوا کہ ڈاکٹر عندلیب شادانی کا نام کیوں چھانٹ دیا گیا۔ حکومت بہار نے تین ہفتوں کے اندر ہی ۲۰ ستمبر ۱۹۴۴ء کو راقم کی تقرری کا اعلان کر دیا۔ پرنسپل بھتیجا کے پاس جب تقرری کی سرکاری اطلاع آئی تو مجھے طلب کر کے خوب مبارک باد دیا اور نوٹیفکیشن کی ایک نقل مجھے اپنے ہاتھوں سے عطا فرمائی جسے میں نے بطور یادگار اپنے پاس محفوظ رکھا ہے۔

ا ر اکتوبر ۱۹۴۴ء کو راقم نے جب اپنے نئے عہدہ کی ذمہ داری سنبھالی تو سوال پیدا ہوا کہ فارسی شعبہ کا صدر کون رہے گا۔ مسٹر بھتیجا نے حسب دستور مجھے صدر شعبہ بنانا چاہا مگر میں نے عرض کیا کہ پروفیسر عبدالمنان بیدل میرے استاد ہیں میری طبیعت گوارہ نہیں کرتی کہ میں ان کی موجودگی میں شعبہ کا صدر ہوں اور اس بات کو لکھ کر میں نے پرنسپل بھتیجا کو دے دیا۔ موصوف خوش ہوئے اور فرمایا کہ منان صاحب صدر رہیں گے مگر کالج کے باہر پٹنہ یونیورسٹی، مدرسہ شمس الہدیٰ اور خدا بخش لائبریری کے کل کاموں کی ذمہ داری جو صدر کی ہوتی ہے آپ کو سنبھالنا پڑے گی۔ میں نے یہ شرط منظور کر لی اور جب تک پروفیسر عبدالمنان بیدل پنشن پر نہ گئے، میں نہایت وفاداری اور خوشی کے ساتھ ان کی ماتحتی میں خدمات انجام دیتا رہا۔

میری پریشانیاں۔

۱۹۴۶ء میں پرنسپل بھتیجا صاحب گرمیوں کی چھٹی میں پنشن پر چلے گئے اور ان کی جگہ پر مسٹر

گورکھ ناتھ سنہا پرنسپل مقرر ہوئے، صاحب موصوف نے اقتصادیات میں کیمبرج یونیورسٹی سے بی۔اے کی ڈگری فرسٹ کلاس ٹرائی پوس کے ساتھ حاصل کی تھی۔ انگریزی اچھی لکھتے تھے مگر بولنے میں اتنی مہارت نہ تھی۔ کالج کے نظم ونسق میں ان کو کوئی خاص دلچسپی نہ تھی۔ قریب ڈیڑھ سال تک پرنسپل رہے مگر ان کے پرنسپلی کے دور میں کوئی نمایاں کام انجام نہ پایا۔ کانگریسی لیڈروں سے ان کے بہت اچھے تعلقات تھے اور چند نامور لیڈروں سے ان کی رشتہ داری بھی تھی۔ اس وجہ سے انھیں اپنے کاموں میں سیاسی مدد حاصل رہتی تھی۔ ڈاکٹر گیان چند اور ان کے درمیان برابر تفرقہ رہتا تھا جب یہ پرنسپل تھے تو اس زمانہ میں بہار کے ہندو مسلم فسادات ہوئے اور موصوف گھبرائے گھبرائے رہتے تھے۔ اکثر راقم سے ان فسادات کے متعلق اپنی رائے کا اظہار کرتے اور مسلم لیگ کو ان فسادات کے لیے موردالزام قرار دیتے۔ میرے اور ان کے مزاج میں بہت فرق تھا اس لیے میں ان سے الگ رہتا تھا۔ ستمبر ۱۹۴۶ء میں جب ڈاکٹر گیان چند چھٹی پر گئے تو ان کا بنگلہ پروفیسر کلیم الدین احمد کو دے دیا گیا میں نے پرنسپل گورکھ ناتھ سے مل کر استدعا کی کہ مسٹر کلیم الدین احمد کا خالی بنگلہ مجھے دے دیا جائے کیونکہ قاعدہ کے مطابق یہ بنگلہ مجھے ملنا چاہیے۔ کئی روز غور اور فکر کے بعد اس بنگلہ کو میرے لیے نامزد کر دیا۔ اس بنگلہ کو وہ شاید کسی دوسرے پروفیسر کو دینا چاہتے تھے میں سب سے سنیر تھا اور تنخواہ بھی زیادہ تھی، اگر وہ اس بنگلہ کو کسی دوسرے پروفیسر کو دے دیتے تو قاعدہ کی خلاف ورزی ہوتی اور وہ یہ خوب جانتے تھے کہ اس بے قاعدگی پر میں چپ نہ رہوں گا۔ اس رانی گھاٹ والے بنگلہ میں راقم تین سال سے زیادہ آرام سے رہا۔

مبرا از دد :

مسٹر گورکھ ناتھ سنہا کی اس طرح کی چھوٹی چھوٹی باتوں سے جو اکثر ہوا کرتی تھیں میں کبیدہ خاطر ہو گیا اور پٹنہ کالج سے علیحدگی حاصل کرنے کی فکر ہوئی۔ اس زمانے میں حکومت ہند کی ماتحتی میں سپرنٹنڈنٹ آف ایجوکیشن بلوچستان کی جگہ خالی ہوئی۔ میں نے اس کے لیے درخواست دینا چاہا تو حکومت بہار نے اجازت دینے سے انکار کیا کیونکہ اس میں اپنا نقصان سمجھا اس کے بعد پھر جب میں نے اسلامیہ کالج پشاور کے لیے ایک درخواست دی تو حکومت بہار نے اجازت دینے سے انکار کیا اور وزیر تعلیم نے نہایت سخت الفاظ میں لکھا کہ اگر میں وہاں نوکری کے لیے جانا چاہتا ہوں تو بہار سے ہمیشہ کے لیے چلا جاؤں جو میرے لیے ممکن نہ تھا۔ اس لیے پٹنہ کالج ہی میں زندگی گزارتا رہا۔ وزیر تعلیم کا یہ ناروا آڈر میرے

پاس اب تک محفوظ ہے۔

مسٹر کشوری پرشاد کی آمد:

ستمبر ۱۹۴۷ء میں مسٹر گورکھ ناتھ سنہا کی ترقی ہوئی اور حکومت نے انھیں ڈی۔ پی۔ آئی بناکر سکریٹریٹ بھیج دیا۔ ان کے عوض میں مسٹر کشوری پرشاد سنہا کالج کے پرنسپل ہوکر آئے۔ مسٹر کشوری پرشاد سنہا پٹنہ کالج سے پہلے راونشا کالج کٹک اور لنگٹ سنگھ کالج میں اپنی خدمات انجام دے چکے تھے مگر اس سے پہلے ان کا پٹنہ کالج سے کوئی تعلق نہ تھا اور کالج کے بیشتر اساتذہ سے ناواقف تھے۔ طالب علمی کے زمانے سے ہی راقم اور کشوری پرشاد ایک دوسرے کو اچھی طرح جانتے تھے، اس کے علاوہ راونشا کالج کٹک میں استاد کی حیثیت سے بھی ہم لوگوں سے قریبی تعلقات تھے۔ ڈاکٹر سچید انند سنہا اور کشوری پرشاد سنہا کے درمیان بہت اچھے روابط تھے اور صاحب موصوف کے یہاں ان کی بہت آمد و رفت تھی۔ میرا بھی ان کے یہاں اکثر آنا جانا ہوتا تھا اس لیے مجھ میں اور کشوری پرشاد سنہا میں کافی قربت ہوگئی تھی۔ پٹنہ کالج کے بہت سے کاموں میں کشوری پرشاد سنہا مجھ سے مشورہ کیا کرتے تھے اور مجھ سے بہت خوش رہا کرتے تھے۔

صدر کامن روم:

ان دنوں پٹنہ کالج کے کامن روم کی حالت بڑی خراب تھی اس کی درستگی کی ذمہ داری مسٹر کشوری پرشاد سنہا نے میرے سپرد کی۔ مسٹر وشونا تھ گرہ نائی جو بعد میں پٹنہ کالج کے پرنسپل ہوئے اس زمانے میں کالج کے سینیر طالب علم تھے۔ انھوں نے کامن روم کی درستگی میں راقم کی بہت مدد کی۔ میں قریب تین سال تک اس کا صدر رہا۔ اپنی مصروفیت بڑھ جانے کی وجہ سے میں نے پرنسپل کو مشورہ دیا کہ ڈاکٹر وشوناتھ پرشاد کو جو اس زمانے میں ہندی کے پروفیسر تھے کامن روم کا صدر بنا دیا جائے۔ پرنسپل موصوف نے میرے اس مشورہ سے اتفاق کرتے ہوئے انھیں صدر بنا دیا۔ جس دن ڈاکٹر وشوناتھ پرشاد نے کامن روم کا کام سنبھالا اسی دن لڑکوں نے مجھے ایک الوداعی پارٹی دی جس میں پرنسپل موصوف نے میری کارکردگی کی تعریف کی۔ اس موقع پر طلبا اور کمیٹی کے ممبران کی تصویر لی گئی۔ یہ تصویر میرے کمرے میں آج بھی آویزاں ہے۔ اس تصویر کے بہت سے اساتذہ مر چکے ہیں۔ تصویر دیکھ کر پرانی یادیں تازہ ہو جاتی ہیں۔

پرنسپل کشوری پرشاد سنہا کی کارکردگی اور ان کی موت:

پرنسپل کشوری پرشاد سنہا فطرتاً کم آمیز تھے۔ شاید ہی کسی کے یہاں ان کا آنا جانا ہوتا تھا مگر پرانے روابط کی بنا پر میرے یہاں دو بار ملنے آئے تھے۔ میں بھی کبھی کبھی ان کے یہاں جایا کرتا تھا۔ مہمان

نوازی سے دور رہتے تھے، بڑی فیاضی کرتے تو راقم کو ایک پیالی چائے پلا دیتے۔ ان کے زمانے میں طلبا نے ہڑتال کی کہ بغیر ٹسٹ امتحان دیئے یونیورسٹی کے امتحان میں شرکت کی اجازت دی جائے۔ اس ہڑتال میں طلبا کامیاب رہے اور ٹسٹ امتحان ختم کر دیا گیا۔ اس موقع پر طلبا نے پرنسپل سے بدتمیزی کی۔ موصوف کو طلبا کی نازیبا حرکت کا پہلے سے احساس تھا اس لیے راقم اور دوسرے چند پروفیسروں کو اپنے آفس میں بلا کر رکھا تھا کہ بوقت ضرورت طلبا سے بات کرنے میں کوئی دشواری نہ ہو موصوف ۱۹۵۲ء تک پرنسپل رہے موصوف آخری پرنسپل تھے جن کی ماتحتی میں راقم نے کام کیا۔ ان کے بعد پٹنہ یونیورسٹی رہایشی یونیورسٹی ہو گئی اور میں صدر شعبہ فارسی ہو گیا اس طور سے کالج سے میرا تعلق ختم ہو گیا۔ اکتوبر ۱۹۵۲ء کے آخر میں پرنسپل کشوری پرشاد سنہا کو ڈی۔ پی۔ آئی بنا کر سکریٹریٹ بھیج دیا گیا جہاں کئی سال تک حسن و خوبی سے اپنے کام کو انجام دے کر پنشن پائی۔ اس کے بعد حکومت ہند کے محکمہ تعلیم میں انھیں ایک اچھی جگہ دہلی میں مل گئی مگر زندگی نے ساتھ نہ دیا اور کام سنبھالنے کے تھوڑے دنوں بعد ہی دہلی میں قضا کر گئے۔ اس دن میں دہلی میں موجود تھا جب راقم اور ڈاکٹر دلکش رام اسپتال پہنچے تو معلوم ہوا کہ ان کی لاش پٹنہ روانہ کی جا چکی ہے۔ ان کے مرنے کا مجھے افسوس ہوا۔ مسٹر کشوری پرشاد سنہا کی انتظامی صلاحیت اچھی تھی معلوم نہیں کیوں مسٹر کلیم الدین احمد ان سے برابر شاکی رہتے تھے۔

مدرسہ شمس الہدیٰ :

راقم بحیثیت سنیر پروفیسر فارسی پٹنہ کالج مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ کے گورننگ بوڈی کا ممبر رہا کرتا تھا، اور تقریباً دس سال تک اس خدمت کو انجام دیتا رہا۔ کمشنر پٹنہ ڈویزن گورننگ بوڈی کا پریسیڈنٹ ہوا کرتا تھا۔ اس کمیٹی کے کل ممبروں کی تعداد دس سے زیادہ نہ ہوا کرتی تھی اور اس تعداد میں کوئی اضافہ نہیں کیا جا سکتا تھا کیونکہ گورنمنٹ نے یہی تعداد دس تا نو مقرر کر رکھی تھی۔ ہمارے اس دس سال کے دور میں مسٹر سید محمد شریف بیرسٹر، مسٹر سید سعید عالم بیرسٹر، اور مسٹر سید عین الوارث بیرسٹر وقتاً فوقتاً مسٹر سید نور الہدیٰ مرحوم بانی مدرسہ شمس الہدیٰ کے خاندان کی نمایندگی کیا کرتے تھے۔ حکیم سید محمد صالح اور پروفیسر عبد المنان بھی ممبر رہا کرتے تھے، یہ سب حضرات مدرسہ کی فلاح و بہبود کے لیے کوئی کسر اٹھا نہ رکھتے تھے۔ اس دور میں مدرسہ نہایت عروج پر تھا اور مولانا سید ریاست علی ندوی جو مدرسہ کے پرنسپل مقرر کیے گئے تھے بہت اچھی انتظامی

صلاحیت کے حامل تھے۔ مدرسہ کی عمارت اور احاطہ کو صاف ستھرا رکھتے اور اساتذہ بھی درس و تدریس میں سرگرم عمل رہتے تھے۔ اس زمانے میں طلبا کو پڑھنے کا بہت شوق تھا۔ ایک ہندو کائستھ طالب علم مسمیٰ سچیتانند نے مدرسہ میں تعلیم حاصل کر کے عربی ادب میں فاضل کی ڈگری لی۔ اس زمانہ میں پٹنہ ڈویژن کا کمشنر انگریز ہوا کرتا تھا جس کو مدرسہ کے فلاح و بہبود کا بڑا خیال رہتا تھا۔ گورننگ بوڈی کی میٹنگ مدرسہ کی عمارت میں ہوا کرتی اور میٹنگ کے دن آدھ گھنٹہ قبل کمشنر مدرسہ پہنچ کر تمام عمارتوں کا معائنہ کرتا اور اگر مدرسہ کو کسی چیز کی کوئی ضرورت پڑتی تو اسے فوراً پورا کرتا۔ آزادی کے بعد ہندوستانی کمشنر مقرر ہونے لگے اور ان لوگوں کو کاموں میں کچھ زیادہ دلچسپی نہ تھی بجز مسٹر بخشی، جو ایک بنگالی ہندو تھے ان کو مدرسہ کے کاموں میں ایک حد تک دلچسپی تھی۔ آج کل گورننگ بوڈی کی میٹنگ غالباً کمشنر کے آفس میں ہوتی ہے اور شاید ہی کسی کالے کمشنر نے مدرسہ کے احاطہ میں قدم رکھا ہو۔ آج سے سات آٹھ سال قبل مدرسہ کی بالائی منزل مرمت کرنے کے لیے منہدم کر دی گئی تھی اور نہایت افسوس کی بات ہے کہ اب تک اس کی مرمت نہیں ہوئی ہے۔ مدرسہ کی عمارت اب تک نہایت ہی خستہ حالی میں پڑی ہے اور حکومت بہار مرمت کے کاموں سے بالکل غافل ہے۔

خدابخش لائبریری :

بحیثیت سینیر پروفیسر فارسی پٹنہ کالج راقم خدابخش لائبریری کے مینیجنگ بورڈ کا ممبر تھا۔ میرے زمانے میں اس لائبریری کا نظم و نسق چلانے کے لیے ایک مینیجنگ بورڈ قائم تھا جس کا صدر کمشنر پٹنہ ڈویژن ہوا کرتا تھا اور اس کمیٹی کے تقریباً پندرہ ممبران ہوتے تھے۔ ان دنوں مسٹر ایس۔ دی سومنی، آئی سی۔ ایس صدر مسٹر احسن شیر سکریٹری اور مسٹر قاسم حسن خاں لائبریرین تھے۔ مینیجنگ بورڈ کی میٹنگ اکثر ہوا کرتی تھی اور چند ممبران خصوصاً لیڈی انیس امام، پرنسپل سید معین الحق، مسٹر سید اکبر حسین وکیل، ڈاکٹر کے۔ کے۔ دت اور رائے برج راج کرشن لائبریری کے کاموں میں اپنا قیمتی وقت صرف کیا کرتے تھے۔ مسٹر ایس۔ دی سومنی لائبریری کی ترقی کے لیے ہمیشہ کوشاں رہتے تھے۔ مسٹر سومنی نے کوائف اور دستا گلشن کو حاصل کر کے لائبریری کو فروغ بخشا اور کچھ مخطوطات پٹنہ سیٹی سے لائبریری کے لیے تحفتاً حاصل کیا۔ خدابخش لائبریری کے مخطوطات کی کیٹلاگ کی دو جلدیں بھی تیار کرائیں۔ چونکہ بہار گورنمنٹ لائبریری کو بہت کم امداد دیا کرتی تھی اس لیے ہم سب لوگوں کا خیال ہوا کہ اگر خدابخش لائبریری کو ترقی کرنا ہے تو اسے مرکزی حکومت کے ہاتھ میں دیدیا جائے۔

ڈاکٹر ذاکر حسین جو اس زمانے میں گورنر بہار تھے ان کو بھی یہ رائے پسند آئی اور اس معاملہ میں لائبریری کی بہت مدد کی۔ اس زمانے میں ڈاکٹر وی۔کے۔آر۔وی راؤ وزیر تعلیم حکومت ہند تھے اور مسٹر سوہنی بمبئی میں ان کے شاگرد رہ چکے تھے۔ صاحب موصوف نے ڈاکٹر راؤ کی توجہ اس کام کی طرف مبذول کرائی۔ آخر کار پارلیامنٹ نے ایک قانون پاس کیا جس کی رو سے لائبریری مرکزی حکومت کی نگرانی میں دے دی گئی۔ اس اقدام سے لائبریری کو بے حد فائدہ پہنچا۔ ڈاکٹر ذاکر حسین کے اس احسان کو لائبریری کبھی فراموش نہیں کر سکتی ہے۔

جب میں بحیثیت پروفیسر لائبریری انتظامیہ کمیٹی کا ممبر تھا تو اس زمانے کے وزیر تعلیم کو یہ سوجھی کہ انگریزی کتابیں جو خدا بخش لائبریری میں موجود تھیں ان سب کو سنہا لائبریری میں منتقل کر دیا جائے۔ ڈی۔پی۔آئی بہار نے خط لکھ کر راقم سے اس کے متعلق رائے دریافت کی۔ میں نے اس کی سخت مخالفت کی اور ڈی۔پی۔آئی کو مطلع کیا کہ از روئے قانون ایک کتاب بھی خدا بخش لائبریری سے دوسری جگہ منتقل نہیں کی جا سکتی ہے، کیونکہ یہ اس معاہدہ نامہ کے خلاف ہوگا جو خان بہادر خدا بخش خاں نے گورنمنٹ آف بنگال سے کیا تھا۔ اس کے علاوہ بہت سی انگریزی کتابیں ایسی ہیں جو عربی فارسی اور علوم اسلامیہ کے متعلق ہیں اور ان کا مشرقی لائبریری میں رہنا بہت ضروری ہے۔ میں نے اس خط کو سید نظیر حیدر صاحب مرحوم کو دکھایا اور انھوں نے اس تحریک کے خلاف ایک اداریہ اپنے اخبار "صدائے عام" میں تحریر فرمایا۔ اس کے بعد راقم کا طلبی سکریٹری محکمہ تعلیم کے یہاں ہوئی اور میں نے انھیں تمام باتوں سے آگاہ کیا اور اس طرح انگریزی کتابوں کا نادر سرمایہ سنہا لائبریری کو منتقل نہ ہو سکا۔

خدا بخش لائبریری میں پنڈت نہرو کی آمد :

اسی زمانے میں پنڈت جواہر لال نہرو بحیثیت وزیر اعظم پٹنہ تشریف لائے اور انھوں نے خدا بخش لائبریری کو دیکھنے کی خواہش ظاہر کی۔ حکومت بہار نے مسٹر سوہنی آئی۔سی۔ایس، مسٹر اگروال آئی۔سی۔ایس، رائے برج راج کرشن اور راقم کو حکم دیا کہ ہم لوگ وزیر اعظم کا استقبال لائبریری میں کریں۔ وقت مقررہ پر وزیر اعظم تشریف لائے اور ہم لوگ ان کا استقبال کر کے انھیں لائبریری کے بیچ والے کمرے میں لے گئے، جہاں قاسم حسن خاں صاحب نے نادر کتابوں کو باہر نکال کر رکھا تھا۔ وزیر اعظم نے ان سب کتابوں کو نہایت شوق سے دیکھا اور قاسم

حسن خاں صاحب نے چند قدیم انگریزی کتابوں کو بھی پیش کیا۔ وزیراعظم نے ان سب کتابوں کو نہایت غور سے دیکھا اور قاسم حسن خاں صاحب نے بھی نہایت تشریح کے ساتھ کتابوں کو دکھایا۔ وزیراعظم نے خوش ہوکر کہا کہ آپ کتابوں کو بڑی دلچسپی سے دکھاتے ہیں۔ یہ ہنر آپ نے کس سے سیکھا ہے؟ اس پر بڑی ہنسی ہوئی اور خاں صاحب جھک جھک کر سلام کرتے رہے۔ گرچہ وزیراعظم کے ٹھہرنے کا پروگرام آدھ گھنٹہ کا تھا مگر وہ لائبریری میں سوا گھنٹے ٹھہر گئے۔ خدابخش لائبریری کے متعلق اپنے تاثرات کو لائبریری کے دونوں وزیٹرس بک میں درج کیا۔ اس موقع پر بہت سی تصویریں بھی لی گئی تھیں۔ ایک تصویر میں قاسم حسن خاں وزیراعظم کو کتابیں دکھاتے ہوئے نظر آرہے ہیں۔ عرصہ تک یہ تصویر لائبریری کے شوکیس میں نمایاں طور سے رکھی ہوئی تھی۔ روانگی سے قبل وزیراعظم نے بانی لائبریری کے قبر پر حاضری دی اور پھول چڑھایا۔

وزیراعظم نے دونوں وزیٹرس بک پر اس لیے دستخط کیا کہ ایک پر تو بڑے بڑے حکام کے دستخط تھے اور دوسری پر گاندھی جی کا دستخط تھا۔

ہندو مسلم فسادات :

مشرقی بنگال میں نواکھالی کے مقام پر ہندو مسلم فرقہ وارانہ فسادات ہوئے۔ بہار میں ہندوؤں نے اس فساد کے متعلق نہایت ہی بے بنیاد باتیں اور غلط افواہیں پھیلائیں جس کے سبب بہار میں نہایت خوں ریز فسادات ہوئے۔ خصوصاً سارن، گیا، مونگیر اور بھاگل پور کے اکثر علاقے بہت متاثر ہوئے۔ ۲۵ر اکتوبر ۱۹۴۶ء کو تمام بہار میں "یوم نواکھالی" منایا گیا اور پٹنہ میں ہندوؤں کا ایک جلسہ "یوم نواکھالی" منانے کے لیے پٹنہ میں بھی منعقد ہوا جس میں ہندوؤں کو تلقین کی گئی کہ مسلمانوں سے نواکھالی کا بدلہ جلد لیا جائے۔ ہنگامہ سب سے پہلے چھپرہ میں ہوا جہاں مسلمانوں پر حملہ کرکے انھیں کافی جانی اور مالی نقصان پہنچایا گیا۔ پٹنہ میں ۲۷ر اکتوبر کو کمہرار گاؤں پر حملہ کیا گیا اور اس گاؤں کے مسلمان باشندوں نے اپنے گھروں کو چھوڑ کر پٹنہ شہر میں اپنے دوستوں اور رشتہ داروں کے یہاں پناہ لی۔ ان لوگوں کے غائبانہ میں ان کے مال ومتاع لوٹ لیے گیے اور ایک کتب خانہ میں آگ لگا دی گئی جس میں اکثر نادر کتابیں تھیں۔ کمہرار کے علاوہ پٹنہ ضلع میں مسوڑھی، تلہاڑا، ہلسہ، اور نگر نوسہ کے گاؤں بہت زیادہ متاثر ہوئے۔ بے شمار مرد، عورت، بوڑھے، بچے بڑی بے دردی سے قتل کیے

گئے اور مسلمان عورتوں کو اغوا کیا گیا۔ بہت سی شریف عورتوں نے اپنی عزت بچانے کے لیے کنوئیں میں کود کر اپنی جانیں دے دیں۔ دوران ہنگامہ مسلم لیگ کے رہنما سردار عبدالرب نشتر، خواجہ ناظم الدین وغیرہ حالات کا جائزہ لینے کے لیے پٹنہ آئے اور ہوٹلوں میں بیٹھ کر مسلمانوں کو یہ رائے دیتے رہے کہ بہار چھوڑ کر ہندوستان کے ان مغربی اور مشرقی علاقوں میں چلے جاؤ جہاں پاکستان قائم ہونے والا ہے۔ مرتا کیا نہ کرتا، یہ بے چارے ستم زدہ لوگ مغرب میں سندھ اور کراچی کا رخ کیا اور پوربی بنگال کے مختلف اضلاع میں جا کر پناہ لی۔ گاندھی جی، خان عبدالغفار خاں، اور پنڈت جواہر لال نہرو نے پٹنہ آکر اپنی کوششوں سے ہنگاموں کو ختم کرایا۔ اس زمانے میں یہ مشہور تھا کہ کانگریس کے نامور رہنماؤں کے اشاروں پر یہ فرقہ وارانہ فساد برپا کیا گیا تھا۔ اس قتل اور غارت گری کا حال مختلف کتابوں میں مختلف انداز سے لکھا گیا ہے مگر یہ بات مسلّم ہے کہ اس ہنگامہ کے بعد بہار کے مسلمانوں کے لیے اتنے معاشی اور سماجی مسئلے پیدا ہو گئے ہیں جن کا حل ابھی تک نہ ہو سکا ہے۔

فسادات کے زمانے میں راقم رانی گھاٹ کے احاطے میں رہتا تھا۔ اس احاطے میں چار سینئر پروفیسر دو اسسٹنٹ پروفیسر اور دو لکچرر رہتے تھے۔ راقم کے علاوہ اس احاطے میں کوئی دوسرا مسلمان نہ رہتا تھا۔ میرے بنگلہ کے متصل ڈاکٹر کے کے دت رہتے تھے اور باقی سات بنگلوں میں اترپردیش، مدراس، بنگال کے رہنے والے اساتذہ قیام پذیر تھے۔ اس احاطے کے اردگرد ہندوؤں کی گھنی آبادی تھی۔ ایک ماہ قبل جب میں اس بنگلہ میں رہنے کے لیے جا رہا تھا تو میرے دوستوں نے مجھے منع کیا کہ اس علاقے میں مسلمان کا رہنا خطرہ سے خالی نہیں ہے۔ میں نے سوچا کہ اس احاطہ کے رہنے والے مہذب اور تعلیم یافتہ لوگ ہیں اس لیے میں وہاں بے خوف وخطر رہ سکتا ہوں اور راقم اپنے بال بچوں کے ساتھ جا کر اس بنگلہ میں رہنے لگا۔ یوم نواکھالی کی شام کو جب میں اگزیبیشن روڈ سے رانی گھاٹ جا رہا تھا تو سڑکوں پر جابجا ہندوؤں کا ہجوم نعرہ لگا رہا تھا کہ "نواکھالی کا بدلہ لے کر رہیں گے"۔ راقم جب گھر واپس آیا تو کل حالات کو بیوی سے بیان کیا، انھوں نے کہا کہ ہم لوگوں کا یہاں رہنا مناسب نہیں ہے، جہاں تک جلد ہو سکے والد صاحب کے یہاں سے موٹر کار منگوا کر ہم سب لوگ اگزیبیشن روڈ چلے جائیں۔ رات ہو چکی تھی اس لیے میں نے روانگی کو دوسرے روز پر ملتوی رکھا۔ قریب آدھی رات کو ڈاکٹر کے کے دت اور دوسرے ہندو پروفیسروں کے بنگلوں سے "بجرنگ بلی کی جے" کا نعرہ بلند ہوا مگر تھوڑی ہی دیر میں نعرہ لگنا بند ہو گیا۔ اردگرد سے یہ آواز

آدھ گھنٹہ تک آتی رہی۔ خائف ہو کر میرے نوکر نے بجلی کی روشنی بجھا دی۔ میں جس بنگلہ میں رہتا تھا، وہ انگریزی طرز کا تھا اور سونے کے کمرے بالائی منزل پر تھے جہاں ہم لوگ اس وقت آرام کر رہے تھے۔ راقم اپنی دو ر مار رائفل میں گولی بھر کر بالائی منزل کے برآمدے میں چلا گیا جہاں تیز روشنی جل رہی تھی۔ چند لوگ جو میرے گھر کے سامنے کھڑے ہوئے تھے میرے ہاتھوں میں رائفل کو دیکھ کر بھاگ گئے۔ یہ دیکھ کر میری ہمت بڑھی اور میں اپنے کمرے میں جا کر سو گیا۔ دوسرے روز ۲۶۔ اکتوبر کو جب میں والد صاحب سے ملنے اگزیبیشن روڈ گیا تو انھوں نے تاکید کی کہ بال بچوں کے ساتھ بہت جلد اگزیبیشن روڈ چلے آؤ اور شام کو تم لوگوں کو لانے کے لیے موٹر کار بھیج دی جائے گی۔ تقریباً ۸ بجے شام کو جب ہم لوگوں کو لے جانے کے لیے موٹر کار آئی تو بڑا ہنگامہ برپا تھا۔ ہر طرف سے بجرنگ بلی کی جے کی آواز آ رہی تھی اور محلہ گولک پور سے جہاں مسلمانوں کی آبادی تھی ہندؤں کے مقابلہ میں نعرہ تکبیر بلند کیا جا رہا تھا اور اس محلہ سے گولی چلنے کی بھی ایک آواز آئی۔ مگر نعرہ بازی جاری رہی اور ہنگامہ کسی طور سے کم نہ ہوا۔ ہم لوگ کل سامان کو کمروں میں بند کر کے باہر صدر دروازے پر تالا لگا کر اگزیبیشن روڈ چلے گئے اور اپنی رائفل کو بھی ساتھ لے لیا۔ اگزیبیشن روڈ پہنچے پر وہی ہنگامہ یہاں بھی نظر آیا اور ہر طرف بجرنگ بلی اور اللہ اکبر کی آواز بلند ہو رہی تھی۔ والد صاحب بیمار تھے اور ان ہنگاموں سے بہت پریشان ہو گئے تھے۔ ان کے ایک دوست امین الدین خاں ریٹائرڈ انجینیر جو باقر گنج میں رہتے تھے اپنی دونالی بندوق پچاس کارتوس کے ساتھ لے کر اگزیبیشن روڈ آئے اور والد صاحب کے کمرے میں سونے لگے تاکہ ان کی پریشانی کچھ کم ہو۔ دوسرے کمرے میں راقم بھی اپنی رائفل میں گولی بھر کے ساتھ رکھتا تھا کہ وقت پر کام آئے۔ ۲۷۔ ۲۸ اور ۲۹ اکتوبر کو پورے پٹنہ شہر میں تمام مسلمان حیران و پریشان تھے اور جہاں مسلمان قلیل تعداد میں تھے انھوں نے اپنے گھروں کو چھوڑ کر ایسی جگہوں پر پناہ لی جہاں مسلمانوں کی آبادی زیادہ تھی۔ پٹنہ ضلع کے زیادہ تر حکام اور پولس افسران ہندو تھے اور وہ مسلمانوں کے تحفظ کے لیے کوئی معقول انتظام نہ کرتے تھے۔ بلا وجہ پٹنہ شہر کے معزز مسلمانوں کے گھروں کی خانہ تلاشی کی گئی اور اکثر لوگوں کے اسلحے بھی ضبط کر لیے گئے۔ تلہاڑہ گاؤں میں ہندوؤں نے مسلمانوں پر ایسے دل سوز مظالم کیے جس کے بیان سے روح کانپ اٹھتی ہے۔ بلوائیوں نے ہر قسم کے ظلم و ستم مسلمانوں پر کیے۔ گھر جلایا، چیزیں لوٹیں، عورتوں کا اغوا کیا، بچے، بوڑھے، جوان سب کو تہ تیغ کیا اور مسجدوں کی بے حرمتی کی۔ اس ہنگامہ میں راقم کے ایک رشتہ دار

سید عبدالحفیظ بھی لہاڑہ میں شہید ہوئے اور ان کی دو لڑکیاں قتل کی گئیں۔ پولس نے مظلوم مسلمانوں کی کوئی مدد نہ کی بلکہ بلوائیوں کا ساتھ دیتی رہی۔ مسوڑھی گاؤں پٹنہ سے صرف بارہ میل کے فاصلے پر ہے، جہاں ایک پولس تھانہ بھی ہے مگر وہاں کی پولس نے مسلمانوں کی نہ کوئی حفاظت کی اور نہ کسی طرح کی مدد پہنچائی کہ ۳۰۔ اکتوبر کی رات کو بلوائیوں نے مسلمانوں کے گھروں کا محاصرہ کیا مگر ایسی نازک حالت میں بھی پولس خاموش تماشائی بنی رہی۔ حالات سے مجبور ہو کر ۳۱ اکتوبر کو مسلمان اپنے گھروں کو چھوڑ کر تر نگا ریلوے اسٹیشن پر پہنچے جو گاؤں سے صرف دو ڈھائی سو گز کی دوری پر تھا اور پٹنہ جانے کے لیے جمع ہوئے۔ قبل اس کے کہ ٹرین ترنگا اسٹیشن پر پہنچے، مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد کو ریلوے پلیٹ فارم پر اور اسٹیشن ماسٹر کے کمرے میں قتل کر ڈالا گیا اور یہ دونوں جگہیں خون سے آلودہ ہوگئیں۔ ایسی حالت میں بھی پولس نے مسلمانوں کے لیے کچھ نہ کیا۔ جو مسلمان ہندوؤں کے قتل و غارت گری سے بچ گئے تھے ان قابل رحم لوگوں نے پٹنہ آکر انجمن اسلامیہ ہال اور دوسرے مقامات پر پناہ لی۔

خان بہادر نواب سید شاہ واجد حسین رئیس و زمیندار خسرو پور پٹنہ دار السلام کے متصل ہم لوگوں کے بنگلہ میں بحیثیت کرایہ دار رہتے تھے۔ دوران فسادات نواب موصوف کے چند رشتہ دار جن میں کچھ عورتیں بھی تھیں نواب صاحب کے ساتھ بنگلہ میں مقیم تھیں۔ ۳۰ اکتوبر کی شام کو یہ افواہ پھیلی کہ پٹنہ شہر میں بھی ہنگامہ ہونے والا ہے اس خبر سے خائف ہو کر نواب صاحب کے یہاں کی عورتیں قیمتی زیورات کے ساتھ ہم لوگوں کے مکان دار السلام میں چلی آئیں اور یہاں رات بسر کی۔ محافظت کے لیے ہم لوگوں کے پاس ایک دونالی بندوق، ایک رائفل اور ایک ریوالور تھا۔ راقم اور امین الدین خاں صاحب رات بھر جاگتے رہے۔ اللہ کے فضل و کرم سے ہندوؤں کا کوئی حملہ نہ ہوا کیونکہ کچھ انگریزی فوج شہر میں آگئی تھی۔ نواب موصوف کے ساتھ مسٹر سید حسین امام ٹھہرے ہوئے تھے جو اس زمانے کے مشہور مسلم لیگی لیڈر تھے۔ ہم لوگوں کے ان سے کوئی مراسم نہ تھے اور نہ ہم لوگ ان سے فسادات کے متعلق کوئی بات کرتے تھے۔ موصوف نے بھی دوسرے نامی مسلم لیگی لیڈروں کی طرح تقسیم ہند کے بعد پاکستان کی راہ لی۔ ۳۱۔ اکتوبر کی رات جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے مسلمانان مسوڑھی کے لیے قیامت کی رات تھی۔ مگر ڈاکٹر سید محمود وزیر تعلیم بہار اور مسٹر سید حسین امام اسی مصیبت کی رات کو ایک دعوت میں شریک ہوئے جسے مسٹر بخشی کمشنر نے اپنی رہائش گاہ پر دی تھی۔ مسٹر بخشی ڈاکٹر سید محمود کو اپنی موٹر کار میں بٹھا کر مسٹر سید حسین امام کو ساتھ لے جانے کے لیے خان بہادر نواب سید شاہ واجد حسین کی رہائش گاہ پر

آئے۔ مسٹر سید حسین امام اس دعوت میں شریک ہونے کے لیے اچھے لباس میں ملبوس ہو کر کمشنر صاحب کی آمد کا انتظار کر رہے تھے۔ والد صاحب اور چند حضرات نواب موصوف کے بنگلہ پر موجود تھے۔ جیسے ہی موٹر کار رکی والد صاحب ڈاکٹر سید محمود کو جوان کے علی گڑھ کے ساتھی تھے، موٹر کار سے اتار کر لائے اور اپنے پاس بٹھا کر کہا کہ آپ مظلوم مسلمانان مسوڑھی کی جان تو بچا نہ سکے مگر اب ان کی بے گور بکفن لاشوں کو مدفون کرا دیں اور زخمیوں کے علاج کا جلد بندوبست کریں۔ کمشنر کے گھر جا کر دعوت کھانے کا یہ کون سا موقع ہے؟ محمود صاحب تھوڑی دیر چپ رہنے کے بعد بولے کہ میں ابھی ریلوے اسٹیشن جا کر کل چیزوں کا جائزہ لوں گا اور جو کچھ مجھ سے ممکن ہو سکے گا کروں گا۔ اس کے بعد سید حسین امام اور ڈاکٹر محمود موٹر کار میں بیٹھ کر ہندو کمشنر کے یہاں دعوت کھانے چلے گئے۔ والد صاحب ستم رسیدہ مسلمانوں کی حالت کو دیکھ کر بے حد مضطرب تھے اور اپنے جذبات سے متاثر ہو کر انہوں نے ہی یہ سب باتیں ڈاکٹر محمود کو کہی تھیں۔

ان فسادات کے زمانے میں بہار کے ستم زدہ مسلمانوں کی مدد کے لیے ہندوستان کے ہر صوبہ سے رضاکار آئے اور اپنی جانوں پر کھیل کر مظلوم پناہ گزینوں کی ہر طرح مدد کی۔ مسٹر ایم۔ کے۔ میر جو لاہور کے رہنے والے تھے اس سلسلہ میں ان کی خدمات کو کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا ہے۔ مسٹر سید جعفر امام نے اللہ ان کو غریق رحمت کرے، نہایت جانفشانی سے مظلومین کی خدمت کی۔ مسٹر سید امین احمد پنشن یافتہ آئی۔ سی۔ ایس نے بہار اسمبلی میں ان فسادات پر ایسی پر اثر تقریر کی کہ اس زمانے کے وزیر اعلیٰ مسٹر سری کرشن سنگھ رو پڑے۔

۱۹۴۶ء کے فسادات جس میں کم از کم پندرہ ہزار مسلمان مارے گئے، صوبہ بہار کے ماتھے پر کلنک کا ٹیکہ ہے اور یہ ہمیشہ رہے گا۔ ہم لوگ ان واقعات کو بھلا سکتے ہیں مگر تاریخ انھیں ہمیشہ یاد دلاتی رہے گی۔

ہیں جن کو حال ان کا آج رو رو کر سناتا ہوں
کسی صورت نہیں سنتے وہ غافل بدگماں میری

(عظیم)

پنڈت جواہر لال نہرو کو اعزازی ڈگری:

۱۷ جنوری ۱۹۴۷ء کو پٹنہ یونیورسٹی نے ایک خصوصی کونوکیشن منعقد کیا جس میں پنڈت جواہر لال نہرو کو ڈی۔ ایس۔ سی کی اعزازی ڈگری دی گئی۔ اس خصوصی کونوکیشن کے لیے پٹنہ یونیورسٹی لائبریری

کے سامنے والے میدان میں ایک شاندار پنڈال بنایا گیا۔ جب پنڈت جواہر لال نہرو کو اعزازی ڈگری عطا ہو چکی تو مسٹر سی راج گوپال اچاریہ جو اس موقع پر مہمان خصوصی ہو کر آئے تھے اپنا ایک طویل خطبہ پڑھا۔ راقم اس جلسہ میں بحیثیت ممبر سینٹ شریک تھا اور ہمارے استاذ محترم پروفیسر عبدالمنان بیدل بحیثیت ممبر سنڈیکیٹ وہاں موجود تھے۔ لوگوں کا اس قدر اژدحام تھا کہ جتنی کرسیاں ممبران سینٹ و سنڈیکیٹ کے لیے مخصوص تھیں ان پر وقت سے بہت پہلے ہی دوسرے لوگ آ کر بیٹھ گئے اور ممبران کو فرش پر بیٹھنا پڑا۔ پنڈال کے اندر اور باہر تل رکھنے کی جگہ نہ تھی۔ ڈاکٹر باس دیوزاین جو اس زمانے میں میڈیکل کالج کے پروفیسر تھے، ان کا یونیورسٹی گون اس بھیڑ میں پھٹ کر تار تار ہو گیا۔ جب راج گوپال اچاری اپنی انگریزی تقریر پڑھنے کے لیے اٹھے تو ایسے لوگ جو انگریزی سے ناواقف تھے پنڈال چھوڑ کر چلے گئے اور شور و غل میں کچھ کمی آئی۔ جلسہ تین بجے سہ پہر کو شروع ہوا اور تقریباً ایک گھنٹہ میں ختم ہوا۔ راقم کو پنڈال سے باہر نکلنے میں قریب آدھ گھنٹہ لگ گیا۔

دوسرے دن سہ پہر کو مہاراج دھیراج دربھنگہ نے اپنی رہائش گاہ دربھنگہ ہاؤس میں پنڈت جواہر لال نہرو کے اعزاز میں ایک نہایت شاندار پارٹی دی جس میں عمائدین شہر کافی تعداد میں موجود تھے۔ مہاراج دھیراج کے چھوٹے بھائی مہاراج کمار نے نہایت ہی مہذب طریقے سے تمام مہمانوں کا استقبال کیا۔ مہاراج کمار سے راقم کی ملاقات تھی۔ موصوف نے میرا اور پروفیسر عبدالمنان بیدل کا تعارف پنڈت جواہر لال نہرو سے کرایا۔ دعوت نہایت ہی اہتمام سے کی گئی تھی اور کھانے کی کل چیزیں کیک، مٹھائیاں وغیرہ کلکتہ سے منگوائی گئی تھیں۔ صفائی کا اس قدر انتظام تھا کہ ہر چیز کاغذ میں لپٹی ہوئی پلیٹ میں رکھ کر مہمانوں کو دی گئی۔

پروفیسر عبدالباری اور ان کا قتل :

پروفیسر عبدالباری بہار کے ایک نامی کانگریسی رہنما تھے۔ ترک موالات کے وقت سے کانگریس میں داخل ہوئے اور مرتے دم تک قوم و ملت کی خدمت کرتے رہے۔ وہ ایک دلیر، جاں نثار اور ایماندار قومی کارکن تھے اور ہمیشہ اپنی بہادری اور راست بازی کے لیے مشہور رہے۔ دولت اور رتبے کی کبھی پرواہ نہ کی اور فقیرانہ زندگی بسر کی۔ جمشید پور میں لیبر یونین کے رہنما تھے اور محنت کشوں کی فلاح و بہبود کے لیے برابر کوشاں رہے۔ یہ لوگ ان کی بڑی عزت کرتے اور ان کے حکموں کی تعمیل کیا کرتے تھے۔ حکومت بہار کے اکثر وزراء موصوف کے ان اوصاف حمیدہ کو پسند

نہ کرتے اور ان کی مخالفت کیا کرتے تھے۔ ۲۸ مارچ ۱۹۴۷ء کو جب پروفیسر عبدالباری اپنی موٹر کار سے پٹنہ آ رہے تھے تو پولس چوکی پر ایک سپاہی نے صاحب موصوف کی گاڑی کو روک کر تلاشی لینا چاہا۔ انھوں نے اپنا تعارف کرا کر سپاہی کی اس کارروائی پر احتجاج کیا مگر وہ نہ مانا اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ سپاہی نے گولی مار کر صاحب موصوف کو ہلاک کر دیا۔

۲۹ مارچ کو مسٹر گاندھی پروفیسر عبدالباری کے مکان پر تعزیت کے لیے گئے، اور ان کے گھر والوں سے مل کر موصوف نے اپنے گہرے رنج و غم کا اظہار کیا۔ اسی شام کو مسٹر گاندھی نے اپنی پرارتھنا سبھا میں پروفیسر عبدالباری کی خوبیوں کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا کہ پروفیسر عبدالباری کی تند مزاجی ان کی موت کا سبب ہوئی۔ راقم اس جلسہ میں شریک تھا اور مسٹر گاندھی کا یہ کہنا مجھے کچھ پسند نہ آیا۔

راقم پروفیسر عبدالباری کا بڑا احترام کرتا اور اکثر ان سے ملاقات کے لیے جایا کرتا تھا۔ جب لوگ ان کی میت کو پیر موہانی قبرستان میں سپرد خاک کرنے کو لے جا رہے تھے تو ایک کانگریسی جھنڈا ان کے کفن پر رکھ دیا گیا۔ راقم کو یہ بات پسند نہ آئی کیونکہ یہ ایک غیر اسلامی فعل تھا۔ برن پور کے محنت کشوں نے چندے کی ایک کثیر رقم جمع کی اور ان کا ایک مقبرہ پیر موہانی قبرستان کے ایک گوشہ میں تعمیر کرانا شروع کیا جو اب تک نامکمل ہے۔ راقم اور شری رام اوتار شاستری ممبر آف پارلیامنٹ نے کئی بار حکومت بہار کی توجہ اس قبرستان کی زبوں حالی کی طرف مبذول کرائی مگر وزیر اعلیٰ کے وعدوں کے باوجود نہ تو قبرستان کی درستگی ہو سکی اور نہ ہی پروفیسر عبدالباری کے مقبرہ کو مکمل کیا گیا۔ پیر موہانی قبرستان کی خصوصیت یہ ہے کہ آج تک اسی قبرستان میں ہندو اور مسلمان دونوں فرقے کے مُردے دفن کیے جاتے ہیں اور بہت سے ہندو فقراء کی پختہ قبریں یہاں موجود ہیں۔

بھارت کی آزادی - ۱۹۴۷ء :

۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو ۱۲ بج کر ۵ منٹ پر فرنگیوں نے بھارت کو آزادی بخشی۔ ہندوؤں نے ناقوس بجا کر اور بھجن گا کر اس آزادی کا خیر مقدم کیا۔ خوشی کی کوئی انتہا نہ تھی کیونکہ یہ آزادی ملک کو ایک ہزار برس کی غلامی کے بعد نصیب ہوئی تھی۔ اس مبارک موقع پر مسٹر گاندھی نہ خوشیوں میں شریک ہوئے، اور نہ اپنا کوئی پیغام دیا بلکہ دن بھر فاقہ کیا اور چرخہ کاتا۔ ڈاکٹر بابو راجندر پرشاد اور آچاریہ کرپلانی نے اپنے اپنے پیغامات دیے۔ مسٹر جواہر لال نہرو نے اپنے

پیغام میں فرمایا کہ مشرق کے افق پر آزادی کا ایک نیا ستارہ طلوع ہوا ہے اور یہ دعا کی کہ یہ آزادی کا ستارہ اب کبھی غروب نہ ہو۔ راقم نے بھی مسٹر نہرو کی اس دعا پر آمین کہا۔ ہندو مہاسبھا کے ممبران آزادی کی خوشیوں میں شریک نہ ہوئے۔ راقم کے پاس ایک ہندو نے آکر کہا کہ "ہندو ہندی ہندوستان" کا خواب آج حقیقت میں تبدیل ہو گیا اور ایک دوسرے ہندو نے کہا کہ آٹھ سو برس تک ہم لوگوں نے مسلمانوں سے جوتا کھایا ہے اور اب مسلمانوں کو ہم لوگوں سے جوتا کھانے کا وقت آگیا ہے۔ راقم ان فضول باتوں کا کیا جواب دیتا مگر ہندو قوم کے تعصب کا ایک اندازہ مل گیا۔

راقم آزادی کی خوشیوں میں شریک تھا مگر میرے دماغ کو تین چیزیں سخت پریشان کر رہی تھیں: (۱) تقسیم ہند (۲) کانگریسی جھنڈے کو قومی پرچم بنانا (۳) بندے ماترم کو قومی ترانہ کی شکل دینا مگر میں کر ہی کیا سکتا تھا۔ راقم نے بازار سے مٹھائیاں منگوا کر غریب بچوں میں تقسیم کرائی اور اپنے غم زدہ دل کو خوش کیا۔

اس زمانے میں بہار کے مسلمانوں کی حالت قابل رحم تھی کیونکہ چند ماہ پہلے ایسی قتل و غارت گری ہوئی تھی جس کی کوئی مثال ابھی تک نہیں ملتی ہے۔ نامور مسلم لیگی رہنماؤں نے مارے خوف کے اپنی جناح کیپ جلائی اور داڑھی مونچھیں منڈا کر پاکستان کی راہ لی۔ جو تھوڑے بہت مسلم لیگی رہنما بچ گئے تھے انھوں نے گاندھی ٹوپی پہنی اور کھادی کا لباس زیب تن کر کے بہار کے وزیر اعلیٰ اور دیگر وزراء کے یہاں حاضر ہو کر معافی مانگی اور کانگریس کی جماعت میں شریک ہو گئے۔ بہار کے مسلم عوام الناس جو بے یار و مددگار ہو گئے تھے مغربی اور مشرقی پاکستان چلے گئے اور ان لوگوں نے مشرقی پاکستان جا کر جو صعوبتیں اٹھائیں اس کی بھی کوئی مثال نہیں ہے۔ ان کی ایک بڑی تعداد جنگلہ دیش میں قتل کی گئی اور جو بچ گئے ہیں وہ اب تک وہاں اپنا سر پیٹ رہے ہیں۔ ع

بہر زمیں کہ رسیدیم آسماں پیدا

۱۴ اگست کی آدھی رات کو سری جے رام داس دولت رام نے بحیثیت گورنر بہار حلف وفاداری اٹھایا اور ۱۵ اگست کو ۱۲ بجے دن میں پٹنہ یونیورسٹی کے میدان میں صاحب موصوف نے بحیثیت گورنر چانسلر قومی جھنڈا لہرایا۔ جب یہ رسم ادا ہو چکی تو دو نہایت خوش گلو لڑکیاں جو ویمنس کالج کی طالبات تھیں بہت ذوق و شوق سے بندے ماترم کا ترانہ گایا۔ اس کے بعد یو ٹی سی کے کیڈٹس قومی پرچم کو سلامی دیتے ہوئے گورنر موصوف کے بالکل سامنے سے گذرے۔ مسٹر

گورکھ ناتھ سنہا جو اس زمانے میں پٹنہ کالج کے پرنسپل تھے انھوں نے راقم اور ڈاکٹر ایشور دت کو اس کام پر متعین کیا کہ اساتذہ اور طلبار کو ۱۱ بج کر ۴۵ منٹ پر یونیورسٹی کے میدان میں قطار باندھ کر قومی جھنڈے کے سامنے کھڑا کرائیں اور اس کا خیال رکھیں کہ کسی طرح کی کوئی بدنظمی نہ ہو، پٹنہ کالج کے چار سینیر طلبا ہم لوگوں کی مدد کے لیے دیئے گئے جن کے نام یہ ہیں: (۱) امبیکا سنگھ (جو بعد میں حکومت بہار کے وزیر خزانہ ہوئے)، (۲) وشنو انوگرہ نراین (جو بعد میں پٹنہ کالج کے پرنسپل ہوئے)، (۳) ڈی۔این۔شرما (جو بعد میں پٹنہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر ہوئے)، (۴) حیدر الحسن (پاکستانی فوج میں بریگیڈیر ہو کر پنشن پائی) یہ حکم نامہ مورخہ ۱۲۔اگست ۱۹۴۷ء راقم کے پاس اپنی اصلی شکل میں اب تک محفوظ ہے۔)

۱۵۔اگست کو راقم سائنس کالج کے کمپاؤنڈ میں رہا کرتا تھا جس کے ارد گرد کالج کے ہندو لڑکوں کے ہوسٹلس تھے۔ ان لڑکوں نے جشن آزادی نہایت ہی جوش و خروش کے ساتھ منائی اور ہر جگہ قومی جھنڈا لہراتا ہوا نظر آرہا تھا۔ راقم نے بھی ایک قومی جھنڈا اپنی رہایش گاہ پر لہرایا۔ شری جے رام داس دولت رام گورنر بہار نے ۱۵۔اگست کو سکریٹریٹ کے سامنے "شہیدوں کی یادگار" کا سنگ بنیاد رکھا اور راقم نے بھی اس رسم میں شرکت کی۔ شری مہامایا پرشاد سنہا جو بہار کانگریس کمیٹی کے صدر تھے اس روز اس قدر خوش تھے کہ بلا تفریق دوست و دشمن سب سے گلے مل رہے تھے بجز مسٹر سید امین احمد پنشن یافتہ آئی۔سی۔ایس کے صوبائی مسلم لیگ کے زیادہ تر ممبران اپنی پرانی وضع کو بالکل بدل کر آزادی کے ہر جلسہ میں پیش پیش رہے۔ مسٹر سید امین احمد کانگریس سے ہمیشہ الگ رہے اور آخر دم تک اسمبلی اور کاؤنسل میں مسلمانوں کے حقوق کے لیے لڑتے رہے۔ تقسیم ہند نے بہار کے مسلمانوں کو پست ہمت بنا کر ان میں اتنی زیادہ احساس کمتری پیدا کر دی، جو اب تک باقی ہے۔ اللہ ان کو ہمت عطا فرمائے۔ ؎

زندگی عزم طلب، عزم کو جرأت کی تلاش
خوف تجھ سے نہ کہیں موت کا پیماں لے لے

(عظیم)

شعبۂ فارسی کے حالات :

مذکورہ بالا سیاسی واقعات نے شعبۂ فارسی پر برا اثر ڈالا اور فارسی طلبار کی تعداد میں

بہت کمی آگئی۔ اس دور کے فارسی پڑھنے والے دو طلبا نے اپنی زندگی میں کافی شہرت حاصل کی۔ (۱) مسٹر شمس الحسن ہائی کورٹ کے جج ہوئے اور اب تک پٹنہ ہائی کورٹ کے نامور ججوں میں ہیں۔ (۲) ڈاکٹر جگدیش چندر کندرا آئی۔ اے۔ ایس ہوئے اور بہار کے ایڈیشنل چیف سکریٹری کے منصب پر فائز رہ کر آج بھی حکومت بہار کے نامور افسروں میں شمار کیے جاتے ہیں۔

پٹنہ یونیورسٹی کی سلور جبلی :

پٹنہ یونیورسٹی کی سلور جبلی نہایت ہی شان و شوکت سے ۱۹۴۴ء کے اواخر میں منائی گئی۔ اس تقریب میں ہندوستان کی چند ممتاز شخصیتوں کو اعزازی ڈگری ڈاکٹریٹ سے نوازا گیا جس میں ڈاکٹر ضیاءالدین کو ڈی۔ ایس سی کی اعزازی ڈگری ملی۔ بہار کے دو وزراء کو بھی اعزازی ڈگری دی گئی۔

مسٹر گاندھی کی موت :

جنوری ۱۹۴۸ء میں والد صاحب بہت سخت بیمار تھے اور ایک ماہ بعد انتقال کر گئے۔ ان کا وفادار خدمت گار، چمن میاں، روزانہ شام کو ان کی دوائیں اور پھلوں کو لانے کے لیے بازار جایا کرتا تھا۔ ۳۰ جنوری ۱۹۴۸ء کو جب وہ بازار میں چیزیں خرید رہا تھا کہ یکایک خبر پھیلی کہ گاندھی جی مارے گئے اور ان کا قاتل ایک مسلمان ہے۔ یہ سن کر چمن میاں ہم لوگوں کی رہائش گاہ دارالسلام واقع اگزبیشن روڈ نہایت ہی اضطرابی کیفیت میں پہنچا اور بغیر کچھ کہے سنے اس نے دروازوں کو بند کرنا شروع کر دیا۔ راقم نے جھنجھلا کر اس سے پوچھا کہ یہ سب کیا کر رہے ہو؟ جواباً اس نے وہ سب باتیں عرض کیں جو بازار میں سنی تھیں۔ اس کو اندیشہ تھا کہ ہندو مسلم فسادات نہ ہو جائیں۔ یہ بھی خبر دی کہ شہر میں کرفیو لگا دیا گیا ہے اور اب ہم لوگ گھر سے باہر نہ نکلیں کیونکہ جان کا خطرہ ہے۔ تھوڑی دیر بعد راقم نے اپنے ریڈیو سے مسٹر گاندھی کی موت کی خبر تفصیل سے سنی اور یہ بھی معلوم ہوا کہ انھیں ایک ہندو ناتھو رام گوڈسے نے قتل کیا ہے۔

ہندوؤں کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہ آسکتی تھی کہ کوئی ہندو مسٹر گاندھی کو قتل کر سکتا ہے، کیونکہ وہ تو ان لوگوں کے دیوتا تھے۔ والد صاحب گاندھی جی کے

قتل کے ساتویں دن ۶ فروری ۱۹۴۸ء کو انتقال کر گئے۔ والد صاحب مرحوم گاندھی جی کا بڑا احترام کرتے تھے، اس لیے میں نے ان سے مرتے دم تک اس خبر کو پوشیدہ رکھا۔

گاندھی جی کے مرنے کے چند دنوں بعد پٹنہ کالج کے پرنسپل اور اساتذہ نے پٹنہ کالج میں دریائے گنگا کے کنارے گاندھی جی کی یاد میں ایک پرارتھنا سبھا کی۔ کالج کے متعدد ہندو اساتذہ شریک نہ ہوئے، جس کا مجھے بہت افسوس ہوا۔ پرارتھنا ختم ہو جانے کے بعد ایک ہریجن طالب علم کے ہاتھ سے چاول کی پھرہی حاضرین میں تقسیم کی گئی۔ سب لوگوں نے پھرہی ہریجن کے ہاتھ سے لے کر کھائی میں نے بھی ایسا کیا۔ مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ کچھ ہندو اساتذہ نے پھرہی کو لے کر اپنی جیب میں رکھ لیا اور دو برہمن اساتذہ نے ہریجن کے ہاتھ سے پھرہی لینا قبول نہ کیا کیونکہ یہ دونوں حضرات چھوت کے بڑے قائل تھے۔

گاندھی جی میں بہت سی خوبیاں تھیں۔ موصوف "ستیہ اہنسا" کے پجاری تھے اور سادگی کے نمونہ۔ قوم انھیں اب تک "مہاتما" کے لقب سے یاد کرتی ہے۔ جدید دور میں کوئی ان سے بڑا ہندو لیڈر پیدا نہ ہو سکا۔ قوم ان کی بڑی عزت کیا کرتی اور ان کے اشاروں پر چلتی تھی۔ موصوف نے ہندوؤں کے درمیان اتنا اقتدار حاصل کر لیا تھا کہ ۱۹۳۰ء میں انگریزوں کے خلاف سول نافرمانی کی تحریک چلائی۔

مگر ان کا قتل ایک ہندو کے ہاتھ سے ہوا، اور عین اس وقت جب وہ عبادت کے لیے جا رہے تھے۔ گاندھی جی کی موت کبھی بھلائی نہیں جا سکتی ہے۔

نواں باب

جب میں پٹنہ کالج کے ہوسٹل کا وارڈن تھا

۱۹۵۰ء سے ۱۹۶۰ء

پٹنہ کالج ہوسٹل کا وارڈن :

راقم ۱۵۔ اگست ۱۹۵۰ء کو پٹنہ کالج کے ہوسٹلوں کا وارڈن مقرر کیا گیا اور اس عہدے پر ۱۵۔ اپریل ۱۹۶۰ء تک فائز رہا۔ اس زمانے میں ہر ہوسٹل کا ایک سپرنٹنڈنٹ ہوتا جو اپنے ہوسٹل کے کل کاموں کا ذمہ دار ہوتا تھا۔ ہر دو تین ہوسٹلوں کے لیے ایک وارڈن مقرر کیا جاتا اور کالج کے پرنسپل کی ماتحتی میں اسے کام کرنا پڑتا تھا۔ جب میں وارڈن مقرر ہوا تو مجھے دو ہوسٹل جیکسن ہوسٹل اور مسلم ہوسٹل (جو بعد میں اقبال ہوسٹل کے نام سے موسوم ہوا) کی ذمہ داری سپرد کی گئی۔

ہوسٹل کا انتظام :

اس زمانہ میں پٹنہ کالج کے طلبار کی رہائش کے لیے پانچ ہوسٹل تھے جن کے نام یہ ہیں : (۱) جیکسن ہوسٹل (۲) منٹو ہوسٹل (۳) مسلم ہوسٹل (۴) رانی گھاٹ ہوسٹل (۵) نیو ہوسٹل۔ ہر ہوسٹل میں تقریباً ۹۰ - ۱۰۰ طلبار کے رہنے کا انتظام تھا۔ زیادہ تر کمرے معزد تھے جس میں ایک طالب علم رہا کرتا تھا اور کچھ کمرے مشترک تھے جن میں چار طلبار رہتے تھے۔ طلبار کی رہائشی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے ہر طالب علم کو ایک چوکی، ایک میز، ایک کرسی، ایک کتاب رکھنے کا شلف، اور ایک الماری جو دیوار میں لگی ہوتی ملا کرتی تھیں۔ ہر ہوسٹل کے کمرے اچھے ہوتے تھے۔ ہر ہوسٹل میں چند وارڈ ہوا کرتے تھے اور ہر وارڈ کا ایک پریفکٹ مقرر کیا جاتا تھا جو اپنے وارڈ کی نگرانی کرتا۔ اس کام کے صلہ میں اس کے کمرے کے فرنیچر عام کردں

کے زنجیر سے بہتر ہوتے تھے۔ کالج چھوڑتے وقت وہ ایک خاص سرٹیفکیٹ کا مستحق ہوتا تھا۔ ہوسٹل کے میسوں میں طلبار اپنے کھانے کا انتظام خود کیا کرتے تھے جو عموماً اچھا ہی ہوتا تھا۔ جسمانی صحت برقرار رکھنے کے لیے ہر طالب علم کو کھیل کود اور ورزش میں حصہ لینا لازمی تھا۔ پڑھنے کے اوقات میں کسی کو اجازت نہ تھی کہ ہوسٹل کے اندر جاکر طلبار سے ملاقات کرسکے طلبار گیارہ بجے رات تک پڑھ سکتے تھے اور اس کے بعد کمروں کی روشنیاں بجھا دی جاتی تھیں۔

جیکسن ہوسٹل :

جیکسن ہوسٹل میں صرف ہندو طلبار رہتے تھے۔ یہ لوگ بڑی محنت سے پڑھتے اور اوقات کو فضول باتوں میں ضائع نہ ہونے دیتے تھے۔ اس جانفشانی کی بدولت یونیورسٹی کے امتحانوں میں شاندار کامیابیاں حاصل کرتے۔ آئی۔اے۔ایس اور دیگر کل ہند مقابلوں میں بھی کامیاب ہوتے۔ میرے زمانے میں مسٹر مچکنڈ دوبے نے آئی۔ایف۔ایس میں شاندار کامیابی حاصل کی، کئی ملکوں میں ہندوستان کے سفیر رہ چکے ہیں، اور آج کل یونائیٹڈ نیشنز میں ہندوستان کی نمائندگی کررہے ہیں۔ نہایت نیک مزاج، اور ملنسار انسان ہیں۔ راقم سے بہت انس رکھتے ہیں اور ان کی تصویر میرے کمرے میں اب تک آویزاں ہے۔

چند باتیں :

راقم یہاں ان چند باتوں کا تذکرہ کردینا ضروری سمجھتا ہے جن سے پتہ چل سکے کہ ۲۵۔۳۰ سال قبل جیکسن ہوسٹل کی زندگی کیسی تھی۔ جیسا کہ پہلے بیان کیا جاچکا ہے، کھانے کا انتظام اچھا تھا۔ متموّل لڑکے اپنے ناشتہ کے لیے بازار سے ڈبل روٹی، مکھن، انڈے اور مٹھائیاں منگاکر کھاتے تھے۔ ایسے لڑکے جن کے دیہاتوں میں باغات تھے، آم کے موسم میں گھروں سے آم منگواتے، خود کھاتے اور اپنے دوستوں کو بھی کھلاتے۔ جو لڑکے اپنے گھروں میں چوکیوں پر سونے کے عادی نہ تھے، ہوسٹل میں انھیں چوکیوں پر سونے میں تکلیف ہوتی اور موٹے گدے بچھاکر سوتے ایسے لڑکوں کی تعداد بہت کم تھی۔ ایک مرتبہ کسی امیر گھرانے کے لڑکے کا جب ہوسٹل میں داخلہ ہوا تو اس نے مجھ سے مل کر اس بات کی اجازت طلب کی کہ اپنے گھر سے ایک چھوٹی مسہری ڈنلپ کے گدے کے ساتھ اپنے کمرے میں لاکر بچھائے جس پر وہ آرام سے سوسکے۔ میں نے اسے مسہری لانے کی اجازت نہ دی مگر ڈنلپ کے گدے کو لانے سے منع نہ کیا۔ اس واقعہ کے

تیسرے دن مسٹر شرما نے جو اس زمانے میں "سرچ لائٹ" اخبار کے ایڈیٹر تھے۔ اپنے ایک اداریہ میں راقم پر اعتراض کرتے ہوئے تحریر کیا کہ وارڈن ہوسٹل کے پیسوں سے ڈنلپ کے گدے منگا کر امیر لڑکوں کو اپنی چوکیوں پر بچھانے کے لیے دیتے ہیں۔ میں نے ان سے ٹیلی فون پر باتیں کیں اور میں نے ان کو بتایا کہ یہ خبر بالکل غلط ہے۔ اگر لڑکے اپنی چوکیوں پر روئی کے گدے بچھا سکتے ہیں تو ڈنلپ کے گدے بھی بچھا سکتے ہیں اس پر مسٹر شرما نے مجھ سے معافی مانگی اور دوسرے دن اس خبر کی تردید اپنے اخبار میں شائع کی۔ ایک معزز خاتون کے کمسن لڑکے نے الہ آباد سے ہائی اسکول کا امتحان اول درجے میں نہایت اچھے نمبروں سے پاس کیا اور اس کا داخلہ جیکسن ہوسٹل میں بلا کسی دشواری کے ہوگیا تھا۔ یہ لڑکا دن میں زیادہ پڑھتا اور رات کو آٹھ بجے اپنے کمرے میں سو جاتا۔ ۹ بجے رات کو جب کھانے کی گھنٹی بجتی تو وارڈ سرونٹ اسے کھانے کے لیے بیدار کرتا اور دس بارہ روز تک ایسا ہی ہوتا رہا۔ ایک روز جب میں ہوسٹل گیا تو اس وارڈ کے پریفکٹ نے شکایت کی کہ یہ لڑکا روز آٹھ بجے سو جاتا ہے آپ اسے سمجھا دیں کہ ایسا نہ کرے۔ میں نے پریفکٹ سے کہا کہ وارڈ سرونٹ کو منع کر دو کہ نو بجے رات کو کھانے کے وقت اسے نہ اٹھائے اور جب ایک دو رات بھوکا رہے گا تو اسے خود ہی ۹ بجے رات تک جاگنے کی عادت پڑ جائے گی۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور لڑکا نو بجے رات تک جاگنے کا عادی ہوگیا۔ یہ لڑکا بڑا ہی مہذب، نیک مزاج اور محنتی تھا۔ پٹنہ میں اس کی طبیعت نہ لگی اور کچھ ہی دنوں بعد الہ آباد واپس چلا گیا۔

دردناک واقعات:

اس زمانے میں کئی دردناک واقعات بھی ہوئے۔ ایک لڑکا دریائے گنگا میں تیراکی سیکھتا تھا۔ غلطی سے دریا میں کچھ آگے بڑھ گیا اور موجوں کی زد میں آکر ڈوب گیا ان لوگوں نے جو دریا کے کنارے غسل کر رہے تھے اسے بچانے کی کوشش نہ کی۔ راقم کو جب اس واقعہ کی خبر ملی تو دریا میں بہت دور تک جال ڈلوایا مگر اس کی لاش نہ مل سکی۔

ایک لڑکا یکایک دماغی توازن کھو کر پاگل ہوگیا۔ کچھ لڑکے راقم کے پاس آئے اور خبر دی کہ وہ شاید خودکشی نہ کر لے۔ مجھے اس پر تشویش ہوئی اور ہوسٹل جا کر اس لڑکے کو دیکھا جو اپنے کمرے میں بالکل خاموش بیٹھا ہوا تھا۔ جب میں نے اس سے اس کا حال دریافت کیا تو

اس نے کوئی جواب نہ دیا میں نے فوراً رام داس کو جو ہوسٹل کا بڑا تجربہ کار وارڈ سرونٹ تھا ساتھ لے کر سپرنٹنڈنٹ کی رہائش گاہ پر گیا جہاں یہ فیصلہ ہوا کہ اس لڑکے کو رام داس کے ہمراہ گھر روانہ کر دیا جائے اور اس میں کوئی تاخیر نہ کی جائے۔ چونکہ سفر ریل کا تھا مجھے یہ ڈر تھا کہ کہیں لڑکا ریل سے کود نہ جائے اس لیے میں نے ایک لڑکے کو راضی کر کے رام داس کے ساتھ جانے کو کہہ دیا۔ لڑکا کسی طور سے گھر پہنچا دیا گیا اور رام داس اس وقت تک پٹنہ واپس نہ آیا جب تک اس کے باپ سے لڑکے کے پہنچنے کی رسید نہ لے لی۔

ہوسٹل کے لڑکے راقم کا بڑا احترام کرتے اور میں بھی ان لوگوں سے بڑی محبت کرتا تھا۔ بعض لڑکے تو اپنے نجی معاملات میں بھی مجھ سے مشورہ لیتے اور اس پر عمل کرتے۔ میرا پچاس سال کا تجربہ ہے کہ مسلمان لڑکوں سے کہیں زیادہ ہندو لڑکے اپنے بزرگوں کی قدر کرتے ہیں۔ میں اپنی طالب علمی کے زمانے میں اسی عمارت میں رہتا تھا جس میں اب جیکسن ہوسٹل ہے اس لیے یہ عمارت مجھے اگلے وقتوں کی یاد دلاتی تھی۔ جب میں ہوسٹل جاتا تو اکثر ان کمروں کے سامنے چند لمحوں کے لیے ٹھہر جاتا جن میں راقم اور اس کے عزیز دوست رہا کرتے تھے۔ پروفیسر انورودھ جھا جو ہوسٹل کے سپرنٹنڈنٹ تھے انھوں نے میرے جذبات سے متاثر ہو کر یہ فیصلہ کیا کہ میرے زمانے کے ان چند مسلم حضرات کو مدعو کیا جائے جو ان دنوں پٹنہ میں مقیم تھے۔ جلسہ کی صدارت مسٹر کرپاناتھ سنگھ نے کی جو پہلے مسلم ہوسٹل میں رہ چکے تھے اور ضلع مجسٹریٹ تھے۔ اس جلسہ میں مسٹر جسٹس خلیل احمد، مسٹر سید مہدی علی ڈائرکٹر انڈسٹریز، مسٹر عبدالحلیم اے۔ ڈی۔ ایم، مسٹر ایس۔ ایم۔ مظفر ہیڈ ماسٹر اور مسٹر امیر علی خاں دارثی ایڈوکیٹ تشریف لائے۔ اور اپنی پرانی جگہ کو دیکھ کر خوشی کا اظہار کیا۔ اس موقع پر جو تصویر لی گئی تھی راقم کے کمرے میں ابھی تک آویزاں ہے۔

سالانہ جلسہ:

جیکسن ہوسٹل کا سالانہ جلسہ جاڑوں میں نہایت ہی اہتمام سے منعقد کیا جاتا تھا۔ ان جلسوں کی تین تصویریں راقم کے پاس موجود ہیں جن میں (۱) کمار گنگانند سنگھ (وزیر تعلیم) (۲) مسٹر ہیر چند پٹیل (وزیر صحت) (۳) مسٹر راج کشور پرشاد (جج ہائی کورٹ پٹنہ) بحیثیت صدر نظر آرہے ہیں۔

سپرنٹنڈنٹ: جب میں وارڈن تھا تو پروفیسر انورودھ جھا، پروفیسر

بچن جھا، اور پروفیسر بتیا نند مشرا اجیلسن ہوسٹل کے سپرنٹنڈنٹ ہوئے۔ یہ تینوں حضرات کالج کے ممتاز اساتذہ میں تھے اور اچھی انتظامی صلاحیت کے مالک تھے۔ پروفیسر بتیا نند مشرا نے آکسفورڈ یونیورسٹی سے فلسفہ میں بی لٹ کی ڈگری حاصل کی تھی۔ موصوف کو راقم عرصہ دراز سے جانتا تھا۔ اب بھی مجھ سے جب ملاقات ہوتی ہے موصوف نہایت خلوص سے ملتے ہیں۔

مسلم ہوسٹل یا اقبال ہوسٹل :

۱۹۵۰ء میں جب راقم وارڈن مقرر کیا گیا تو اقبال ہوسٹل کا نام مسلم ہوسٹل تھا۔ کانگریسی حکومت کی خواہش ہوئی کہ لادینی سلطنت کے دور میں کسی کالج یا ہوسٹل کے نام کے ساتھ لفظ ہندو یا مسلم نہ رہے۔ چنانچہ پٹنہ کالج کے ہندو ہوسٹل کا نام تبدیل کر کے منٹو ہوسٹل کر دیا گیا۔ اسی پالیسی کے تحت سر محمد اقبال کے نام پر مسلم ہوسٹل کا نام بدل کر اقبال ہوسٹل رکھا گیا ہے۔ سر محمد اقبال کی وہ تصویر جو ہوسٹل میں آویزاں ہے بڑے اہتمام سے بنوائی گئی تھی۔ ہوسٹل کے سالانہ جلسہ کے موقع پر مہمان خصوصی مسٹر تی پی سنگھ آئی سی ایس کی تحریک پر مسٹر جسٹس ستیش چندر مشرا (جج ہائی کورٹ پٹنہ) نے اس تصویر کی نقاب کشائی کی۔ راقم اس جلسہ میں موجود تھا۔

اقبال ہوسٹل کی عمارت اور خصوصیت :

اقبال ہوسٹل کی دو منزلہ عمارت پٹنہ کالج کے تمام ہوسٹلوں میں جدید، خوب صورت اور آرام دہ ہے۔ اس ہوسٹل کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کے احاطے میں دو کمرے ایسے بنائے گئے ہیں جن میں لڑکے عبادت کر سکیں۔ ایک کمرہ مسلمان لڑکوں کی عبادت کے لیے اور دوسرا کمرہ عیسائی لڑکوں کی عبادت کے لیے مخصوص تھا۔ عرصہ دراز تک جب عیسائی لڑکوں نے اس ہوسٹل میں داخلہ نہ لیا تو ہوسٹل کے سپرنٹنڈنٹ اس کمرہ کو جس میں گرد و غبار بھرا ہوا تھا مختلف کاموں میں استعمال کرنے لگے۔ جب راقم وارڈن ہو گیا تو سپرنٹنڈنٹ کو تاکید کر دی کہ اگر ہوسٹل میں ایک بھی عیسائی لڑکے کا داخلہ ہو تو یہ کمرہ عیسائی عبادت گاہ میں تبدیل کر دیا جائے۔ میرے زمانہ میں دس برس تک ایک بھی عیسائی لڑکے نے ہوسٹل میں داخلہ نہ لیا اور یہ کمرہ کبھی بند رہتا اور کبھی گودام کے کام میں آتا۔

مسلم طلبار کی پریشانی :

۱۹۴۶ اور ۱۹۴۷ء میں بہار کے مسلمانوں کا کشت و خون ہوا اور کوئی مسلمان ایسا نہ تھا جس کے خاندان کے چند افراد مارے نہ گئے ہوں۔ اقبال ہوسٹل کے لڑکے بھی اپنے رشتہ داروں کے قتل کیے جانے کے غم میں مبتلا تھے۔ ان واقعات کو ہوئے اگرچہ ڈھائی تین سال ہو چکے تھے مگر لڑکوں کے دل و دماغ پر ایک خوف طاری تھا۔ ہر دو تین ماہ پر کچھ لڑکے اپنی پڑھائی ترک کر کے پاکستان چلے جاتے۔ اس مشکل دور میں لڑکوں کے لیے محنت اور لگن کے ساتھ پڑھنا کوئی آسان کام نہ تھا۔ باوجود ان مشکلات کے لڑکے یونیورسٹی کے امتحانات میں شریک ہوتے اور کامیابی بھی حاصل کرتے تھے۔ یہ بات ان لوگوں کے لیے قابل تحسین تھی۔

سالانہ جلسہ :

اقبال ہوسٹل میں دیگر ہوسٹلوں کی طرح سالانہ جلسے ہوا کرتے تھے۔ راقم کا خیال ہے کہ اقبال ہوسٹل کے جلسے جیکسن ہوسٹل کے جلسوں سے بہتر ہوتے تھے۔ ایک سال الحاج مسٹر جسٹس سید نقی امام (جج پٹنہ ہائی کورٹ) جلسہ کے صدر ہوئے۔ انھوں نے دوران تقریر مسلمانوں کی مالی زبوں حالی کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا کہ اس مشکل دور میں طلبا اسراف بیجا نہ کریں، اپنے قیمتی وقت کو کام میں لائیں اور شاندار کامیابی حاصل کریں۔ زندگی میں سادگی اور خیالات میں بلندی کو ہمیشہ مدنظر رکھیں۔ ایک مرتبہ سالانہ جلسہ کے موقع پر ایک مسلمان طالب علم نے میرا کی ایک بھجن ایسے جذبہ سے گا کر سنائی کہ مسٹر جگدیش چندر ماتھر آئی۔ سی۔ ایس جو اس زمانے میں محکمہ تعلیم کے سکریٹری تھے انتہائی متاثر ہوئے اور راقم سے لڑکے کے گانے کی بہت تعریف کی۔

سپرنٹنڈنٹ :

جب راقم وارڈن ہوا تو اس وقت ڈاکٹر سید عبدالمجید سپرنٹنڈنٹ تھے۔ ان کے بعد ڈاکٹر سید محمد محسن ۱۹۵۳ء سے ۱۹۵۶ء تک سپرنٹنڈنٹ رہے۔ بعد ازاں ڈاکٹر سید محمد

صدرالدین سپرنٹنڈنٹ ہوئے۔ ان تمام حضرات کا شمار اچھے اساتذہ میں ہوتا تھا۔ ڈاکٹر سید محمد محسن نے اپنے زمانے میں ہوسٹل کے کاموں کو نہایت ہی خوش اسلوبی سے انجام دیا۔

طبی سہولت :

طلبا کے علاج و معالجہ کے لیے ایک ڈاکٹر مقرر تھا جو روزانہ ہر ہوسٹل میں جاتا اور اگر کوئی طالب علم بیمار ہوتا تو اس کا طبی معائنہ کرکے دوا تجویز کرتا۔ اگر بیماری شدید ہوتی تو طالب علم کو اسپتال میں داخل کرنے کا مشورہ دیتا تھا۔ اس زمانے میں پٹنہ میڈیکل کالج کے اسپتال میں ایک وارڈ تھا جہاں علاج کے لیے طالب علموں کا داخلہ ہوتا اور ڈاکٹر مدھو سودھن داس جو ایک نامور، تجربہ کار ڈاکٹر تھے، اس وارڈ میں طلبا کی دیکھ بھال کرتے اور نہایت ذمہ داری سے ان کا علاج کرتے تھے۔ موصوف سے راقم کی اچھی ملاقات تھی اس لیے جیکسن ہوسٹل اور اقبال ہوسٹل کے طلبا کا علاج بہت دلچسپی سے کیا کرتے تھے۔ بیمار لڑکوں کی عیادت کے لیے راقم اکثر اسپتال جاتا اور ان کی مزاج پرسی کرتا۔

دسواں باب

بحیثیت صدر شعبۂ فارسی اور یونیورسٹی پروفیسر پٹنہ یونیورسٹی

۱۹۵۲ء سے ۱۹۶۰ء

رہائشی یونیورسٹی اور اس کے چار وائس چانسلر:

دوسری جنوری ۱۹۵۲ء کو پٹنہ میں ایک رہائشی یونیورسٹی وجود میں آئی جس کے پہلے وائس چانسلر ڈاکٹر کے۔ این۔ بھال مقرر ہوئے۔ موصوف لکھنؤ یونیورسٹی کے نامور پروفیسر تھے۔ آپ پٹنہ کے حالات اور یہاں کے لوگوں کے مزاج سے بالکل ناواقف تھے اور ان میں انتظامی صلاحیت بھی کم تھی۔ موصوف جب تک وائس چانسلر رہے کسی معاملہ کو طے نہ کر سکے اور گھبرائے گھبرائے رہتے تھے۔ آخر کار کچھ دنوں بعد لکھنؤ گئے اور وہیں خودکشی کر لی۔ ڈاکٹر بھال کے مرنے کے بعد پہلی اپریل ۱۹۵۳ء کو پروفیسر ڈی۔ کے۔ این مینن وائس چانسلر مقرر کیے گئے۔ عرصہ دراز تک موصوف لکھنؤ یونیورسٹی میں شعبہ پولیٹیکل سائنس میں لکچرر و ریڈر تھے۔ رہائشی یونیورسٹی کے قائم ہونے کے بعد پٹنہ یونیورسٹی میں پولیٹیکل سائنس کے پروفیسر مقرر ہو کر آئے اور موصوف میرے بنگلے کے متصل ایک دوسرے بنگلے میں قیام پذیر ہوئے۔ راقم کی ملاقات موصوف سے عرصہ دراز سے تھی، جب میرے چھوٹے بھائی انور حسین لکھنؤ یونیورسٹی میں انگریزی ایم۔ اے کے طالب علم تھے تو ان کا قیام دو سال تک محمود آباد ہوسٹل میں رہا اور مسٹر مینن اس ہوسٹل کے وارڈن تھے۔ جب موصوف پٹنہ آئے تو مجھ سے آ کر ملے اور پرانی باتوں کو یاد دلایا۔ موصوف مہذب، خوش مزاج، مگر آرام طلب انسان تھے۔ یونیورسٹی کے ہر کام کو تاخیر سے انجام دیتے تھے۔ انھیں سیاسی سرپرستی حاصل تھی اس لیے موصوف کے کاموں پر کوئی شخص اعتراض نہ

کر سکتا تھا۔ جب رہائشی یونیورسٹی قائم ہوئی تو چند اساتذہ اچھی تنخواہوں پر بحیثیت یونیورسٹی پروفیسر اور ریڈر مقرر کیے گئے مگر کلاس وَن کے پروفیسروں کو جو سرکاری ملازم تھے اور اچھی صلاحیت کے حامل تھے ان کو عرصہ دراز تک یونیورسٹی پروفیسر نہ بنایا گیا۔ مختلف قسم کے عذر پیش کیے جاتے اور اختلافات کی وجہ سے یہ معاملہ طے نہ ہو پاتا تھا۔ موصوف ۹ ماہ تک پٹنہ یونیورسٹی میں بحیثیت وائس چانسلر کام کرتے رہے اور ۳۱ دسمبر ۱۹۵۲ء کو دکھنی بھارت کی کسی یونیورسٹی میں وائس چانسلر ہو کر چلے گئے۔ راقم نے انھیں جو یونیورسٹی کے مختلف کاموں میں مدد پہنچائی تھی اس کا شکریہ بذریعہ خط ادا کیا اور یہ خط راقم کے پاس محفوظ ہے۔ پروفیسر ہبین کے بعد ڈاکٹر باس دیوبرائی جو پٹنہ میڈیکل کالج کے پرنسپل رہ چکے تھے وائس چانسلر مقرر کیے گئے۔ موصوف نے اپنی پوری زندگی پٹنہ میں گذاری تھی۔ یہاں کے نشیب و فراز اور لوگوں کے مزاج سے خوب واقف تھے۔ انھوں نے اساتذہ کو کسی نہ کسی طرح خوش رکھا اور اپنا کام چلایا۔ ان کے دور میں بھی یونیورسٹی پروفیسروں کی تقرری کا مسئلہ تین سال تک التوی میں پڑا رہا اور کچھ نہ ہوا۔ جب ڈاکٹر باس دیوبرائی اپنی وائس چانسلری کی مدت پوری کر کے چلے گئے تو ان کی جگہ پر ڈاکٹر بل بھدر پرشاد اپریل ۱۹۵۵ء میں پٹنہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر ہو کر آئے۔ صاحب موصوف کیمسٹری کے مشہور پروفیسر ہونے کے علاوہ اڑیسہ میں ڈی پی۔ آئی کی خدمات عرصہ دراز تک انجام دے چکے تھے اور اپنی انتظامی صلاحیت کے لیے مشہور تھے۔ ان کا تقرری بحیثیت وائس چانسلر یونیورسٹی کے کل حلقوں میں بہت مقبول ہوئی۔ انھوں نے ان سب کاموں کو جو پانچ سال تک ملتوی تھے بہت جلد بحسن و خوبی انجام دے دیا۔ آخر کار چار یونیورسٹی پروفیسروں کی تقرری عمل میں آئی آرٹس میں راقم اور ڈاکٹر کے کے دت یونیورسٹی پروفیسر بنائے گئے اور سائنس میں ڈاکٹر دگمبیندر ناتھ اور ڈاکٹر پی سی سنہا کو یونیورسٹی پروفیسر مقرر کیا گیا۔ ہم لوگوں کے ساتھ ڈاکٹر ٹی۔ پی۔ چودھری جو سنسکرت کے پروفیسر تھے امیدوار ہوئے مگر وہ یونیورسٹی پروفیسر نہ ہو سکے اور بہت جلد فوت کر گئے۔ اس موقع پر مجھے ایک پرانی بات یاد آگئی جس کا تعلق صاحب موصوف سے ہے۔ ۱۹۳۰ء میں حکومت بہار نے ایک وظیفہ کا اعلان کیا تاکہ یورپ جا کر عربی، فارسی، اور سنسکرت میں پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی جائے۔ اس وظیفے کے لیے ڈاکٹر چودھری کے ساتھ میں نے بھی درخواست دی مگر ڈاکٹر چودھری ہی کو وظیفہ عطا ہوا۔ انھوں نے لندن یونیورسٹی سے

سنسکرت میں پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی اور بہار ایجوکیشنل سروس کلاس ٹو میں اسسٹنٹ پروفیسر مقرر ہوئے۔ راقم بھی بڑی محنت کے بعد پٹنہ یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کر کے لکچرر اور اسسٹنٹ پروفیسر ہوا۔ اور آٹھ سال بعد کلاس وَن کا پروفیسر ہو گیا۔ ڈاکٹر چودھری میرے آٹھ دس سال بعد کلاس ون کے پروفیسر ہوئے۔ انھیں اس کا برابر سخت افسوس رہا کرتا تھا اور اکثر مجھ سے کہا کرتے تھے کہ میں نے لندن سے پی ایچ ڈی کر کے کیا پایا۔ تم نے تو گھر بیٹھے سب کچھ حاصل کر لیا۔

شعبۂ فارسی پٹنہ یونیورسٹی :

نئے پٹنہ یونیورسٹی ایکٹ سے عربی، فارسی اور اردو کو فائدہ پہنچا۔ ان تینوں زبانوں کے لیے الگ الگ شعبہ قائم کر کے ہر شعبہ کی صدارت اس شعبہ کے سینیئر استاذ کے سپرد کی گئی اور ہر شعبہ کے لیے یونیورسٹی پروفیسر کی ایک جگہ قائم کی گئی۔ شعبۂ عربی میں حافظ محمد قدوس صاحب اور شعبۂ اردو میں ڈاکٹر سید اختر احمد اورینوی صدر بنائے گئے اور راقم کو شعبۂ فارسی کا صدر بنایا گیا۔ میرے علاوہ ایک استاذ افرالدولہ فیاض الدین حیدر جو اسسٹنٹ پروفیسر تھے میرے ساتھ کام کرنے کے لیے مقرر کیے گئے۔ زیادہ تر کام راقم اور افرالدولہ فیاض الدین حیدر کو کرنا پڑتا تھا۔ مگر ہفتہ میں ایک دو کلاس پروفیسر سید حسن اور ڈاکٹر محمد صدیق بھی لیا کرتے تھے۔ اس زمانہ میں فارسی پڑھنے والے لڑکوں کی تعداد بہت کم ہو گئی تھی۔ ایم۔ اے سال پنجم اور ششم ملا کر طلبا کی کل تعداد پندرہ سے زیادہ نہ ہوتی تھی۔ ہمارے شعبہ میں طلبار کی سہولت کے لیے ایک سمینار لائبریری بھی تھی جس کے لیے ہر سال اچھی اچھی کتابیں خریدی جاتی تھیں۔ ہر سال یونیورسٹی ڈھائی سو روپیے کتابوں کی خریداری کے لیے دیا کرتی تھی مگر یہ رقم بالکل ناکافی تھی۔ غریب طلبا کے لیے ایک (Poor boys' library) پوربوائز لائبریری قائم کی گئی جس میں ہر درسی کتاب کی پانچ پانچ کاپیاں موجود رہتی تھیں۔ راقم نے ان کتابوں کو ہندوستان کے مشہور کتب فروشوں کے یہاں سے بلاقیمت منگوائی تھی۔ ہر غریب طالب علم کو درسی کتابیں دو سال کے لیے دے دی جاتیں اور طلبار دو سال بعد ان کتابوں کو واپس کر دیا کرتے تھے۔ افسوس کے ساتھ یہ کہنا پڑتا ہے کہ دو تین طالب علموں نے کچھ درسی کتابوں کو غائب کر دیا اور اس کی قیمت بھی ادا نہ کی۔ رائے صاحب لالہ کے۔ بی۔ اگروال جو الٰہ آباد کے نامی کتب فروش تھے اور راقم کے دوستوں میں تھے نہایت فراخ دلی سے درسی کتابوں کی

متعدد کاپیاں اس لائبریری کے لیے بلا قیمت بھیجا کرتے تھے۔ یہ لائبریری غریب طلبا کے لیے نہایت مفید ثابت ہوئی۔ ہر سال ایم۔ اے کے امتحان میں دو تین طلبا اول درجے میں پاس کیا کرتے تھے۔ گرچہ شعبے میں ریسرچ کی ہر سہولت موجود تھی مگر بہت کم طلبا اس سے فائدہ اٹھاتے تھے۔

میری ذمہ داریاں :

راقم کو یونیورسٹی نے جب صدر شعبہ بنایا تو نہ اس کے منصب میں اضافہ ہوا اور نہ تنخواہ میں۔ بحیثیت صدر شعبہ پٹنہ یونیورسٹی کے سینیٹ اور اکیڈیمک کونسل کا ممبر بنایا گیا اور ایک سال کے لیے سنڈیکیٹ کا بھی ممبر رہا۔ راقم کے شعبہ کا دفتر دربھنگہ ہاؤس میں تھا، یہاں دفتری کاموں کو انجام دینے کے لیے ایک چپراسی متعین تھا اور ایک اسٹینوگرافر بھی جو عربی، فارسی اور اردو شعبوں کے کاموں کے لیے مشترک تھا۔ راقم کو اسی زمانے میں پٹنہ یونیورسٹی جرنل کے ایڈیٹوریل بورڈ کا ممبر بنایا گیا اور وائس چانسلر عربی، فارسی اور اردو کے ہر معاملہ میں مجھ سے مشورہ لیا کرتے تھے۔ اس زمانے میں راقم کو الہ آباد، کلکتہ، دہلی، علی گڈھ اور لکھنؤ کی یونیورسٹیاں مختلف کاموں کو انجام دینے کے لیے بلایا کرتی تھیں۔ میں زیادہ تر کلکتہ، دہلی، اور لکھنؤ جایا کرتا تھا۔ کلکتہ یونیورسٹی (کلکتہ) میں ڈاکٹر محمد زبیر صدیقی اور ڈاکٹر محمد اسحاق عربی اور فارسی میں بین الاقوامی شہرت رکھتے تھے۔ یہ دونوں ہمارے عزیز ترین دوست تھے۔ ڈاکٹر محمد اسحاق مجھ سے اپنے سگے بھائی کی طرح ملتے اور جب موصوف کے ورثا نے پٹنہ یونیورسٹی کو غریب طلبا کی امداد کے لیے ۲۵ ہزار روپیے کا عطیہ دیا تو پٹنہ یونیورسٹی نے ایک کمیٹی بنائی جس میں ایک فیملی ممبر کا ہونا ضروری تھا اور موصوف کے ورثا نے مجھے فیملی ممبر بناکر نامزد کیا۔ اب تک میں کمیٹی کا اسی حیثیت سے ممبر ہوں۔ موصوف کے بھتیجے مرحوم ہاشم عبدالحلیم جو آج کل بنگال اسمبلی کے اسپیکر ہیں راقم کا بڑا احترام کرتے ہیں۔ ڈاکٹر محمد زبیر صدیقی راقم سے سن میں بڑے تھے اور میں ان کا بڑا احترام کرتا تھا موصوف بھی مجھ سے مثل بھائی کے ملتے اور میں جب کبھی یونیورسٹی کے کام سے کلکتہ جاتا تو مجھے کھانے پر مدعو کیا کرتے اور خوش اخلاقی سے پیش آیا کرتے تھے۔ ان کے صاحبزادے ڈاکٹر محمد خالد صدیقی کلکتہ کے ممتاز ترین ڈاکٹروں میں ہیں۔ جب کبھی راقم کلکتہ جاتا ہے تو میری منجھلی خالہ لیڈی رحیم،

سر عبدالرحیم اور ان لوگوں کا رسل اسٹریٹ کا عالی شان مکان یاد آتا ہے۔ مسٹر جسٹس زاہد سہروردی اور ان کے صاحب زادے مسٹر حسن شہید سہروردی بیرسٹر بھی یاد آتے ہیں۔ مسٹر حسن شہید سہروردی نے ہندوستان کی مسلم لیگی سیاست میں بڑا نام پیدا کیا تھا۔ میرے منجھلے ماموں غلام مولیٰ مرحوم کا کھیتر روڈ والا شاندار سسرالی مکان نظر آجاتا ہے اور پرانی باتیں یاد آتی ہیں۔ ایسے پرخلوص لوگ آج کی دنیا میں بہت کم ملتے ہیں۔ راقم جب الہ آباد جاتا تو زیادہ تر ڈاکٹر فردوس فاطمہ نصیر کے یہاں ٹھہرتا جو اس زمانے میں الہ آباد یونیورسٹی کے شعبہ اردو میں ریڈر تھیں اور ان کے شوہر ڈاکٹر نصیر خاں شعبہ جغرافیہ میں ریڈر تھے۔ مرحومہ پروفیسر محمد علی ناقی کی صاحبزادی تھیں۔ وہ جب بھی یونیورسٹی کے کاموں سے پٹنہ آتیں تو راقم کے یہاں قیام کرتیں۔ ان کو پٹنہ یونیورسٹی سے ڈی۔لٹ کی ڈگری عطا کی گئی تھی۔ اس ڈگری کے لیے تین ممتحنوں میں راقم بھی ایک ممتحن تھا۔ اس زمانے میں پروفیسر محمد احمد صاحب الہ آباد یونیورسٹی کے شعبہ فارسی میں ایک نامی پروفیسر تھے۔ حافظ غلام مرتضیٰ عربی، فارسی میں لکچرر تھے۔ موصوف نے عربی اور فارسی میں عراق و ایران سے ڈپلومہ حاصل کیا تھا۔ میرے دوست ڈاکٹر بل بھدر پرشاد جب الہ آباد یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے تو میں نے حافظ صاحب کو بغیر پی۔ایچ۔ڈی کیے ہوئے ڈی۔لٹ کے امتحان میں شریک ہونے کی اجازت دلوادی تھی۔ میں الہ آباد کم جایا کرتا تھا مگر جب بھی جاتا حافظ غلام مرتضیٰ میرے ساتھ رہا کرتے تھے۔ موصوف نہایت خوب انسان تھے۔ راقم یونیورسٹی کے کاموں کے لیے اکثر علی گڈھ جایا کرتا تھا۔ کبھی پی ایچ ڈی کا ممتحن ہوکر اور کبھی پروفیسر اور لکچرر کی تقرری کے لیے اکسپرٹ بناکر بلایا جاتا۔ ڈاکٹر تاراچند کی وفات کے بعد مجھے شاہ ایران پبلیکیشن فنڈ کمیٹی کا ممبر نامزد کیا گیا اور اس سلسلہ میں علی گڈھ جانا ہوتا تھا۔ بہت سی نایاب کتابیں اس فنڈ کی مالی امداد سے شائع کی گئیں جس میں راقم کی "تحفۂ سامی" بھی ہے۔ اس زمانے میں ڈاکٹر نذیر احمد فارسی کے پروفیسر اور صدر شعبہ تھے۔ صاحب موصوف اپنی علمی اور تحقیقی کاموں کی بدولت بین الاقوامی شہرت رکھتے تھے۔ اور انھیں بہت سے علمی اعزازات بھی ملے ہیں۔ آپ نے پندرہ ۱۵ بیس کتابیں تالیف کیں جو شائع ہوچکی ہیں۔ موصوف دومرتبہ حج اور زیارت مدینہ سے مشرف ہوئے ہیں۔ چالیس سال قبل صاحب موصوف سے راقم کی ملاقات پٹنہ میں ہوئی تھی اور اب تک موصوف میرے عزیز دوستوں میں ہیں۔ پنشن پاکر چند سال قبل علی گڈھ مسلم یونیورسٹی کی خدمات سے سبکدوش ہوگئے ہیں مگر تحقیقی کاموں میں اب

تک سرگرم ہیں۔ راقم ڈاکٹر صاحب موصوف کا بڑا احترام کرتا ہے۔ راقم جب بھی علی گڑھ جاتا تو خان بہادر نواب عبید الرحمٰن خاں شیروانی جو اس زمانے میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے رجسٹرار تھے۔ ان کی رہائش گاہ "حبیب منزل" جاکر ضرور ملاقات کرتا۔ صاحب موصوف نہایت ہی بلند خیال، مذہبی اور بڑے عالم ہیں۔ راقم کو ان سے بڑی عقیدت ہے اور ان کی علمی باتوں سے بہت متاثر ہوتا ہے۔ راقم لکھنؤ بیس سال کی عمر سے جایا کرتا ہے۔ یہاں میرے بہت سے رشتہ دار اور دوست آباد ہیں۔ جب بھی کوئی موقع آتا ہے خواہ یونیورسٹی کا کام ہو یا اپنا میں لکھنؤ ضرور جاتا ہوں۔ اگلے وقتوں میں جب راقم لکھنؤ جایا کرتا تھا تو پروفیسر سید مسعود حسن رضوی جو لکھنؤ یونیورسٹی کے شعبہ فارسی اور اردو کے صدر تھے، ان سے ملاقات کا شرف حاصل کرتا۔ موصوف ہندوستان کے ایک مشہور پروفیسر اور اردو کے نامور ادیب تھے۔ صاحب موصوف سے راقم کی پہلی ملاقات ۱۹۲۷ء میں مسوری میں ہوئی تھی اور تاحیات پروفیسر صاحب راقم کے ساتھ شفقت سے پیش آتے اور تحقیقی کاموں میں میری رہنمائی کیا کرتے تھے۔ صاحب موصوف کے صاحبزادے پروفیسر نیر مسعود ان دنوں شعبہ فارسی لکھنؤ یونیورسٹی کے ایک اچھے استاذ ہیں۔ پروفیسر شمشیر بہادر صمدی راقم کو یونیورسٹی کے چند متفرق کاموں کے لیے لکھنؤ بلایا کرتے اور میں ان کے اصرار پر لکھنؤ جایا کرتا تھا۔ اس زمانہ میں انگریزی زبان کے مشہور استاذ ڈاکٹر راؤ لکھنؤ یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے اور میرے دوستوں میں تھے۔ راقم لکھنؤ یونیورسٹی فیکلٹی آف آرٹس کا ممبر بھی رہ چکا ہے اور اس کے جلسوں میں برابر شریک ہوا کرتا تھا۔ میرے آخری دور میں مسز سچیتا کرپلانی اترپردیش کی وزیر اعلیٰ تھیں اور میں ان کی بڑی عزت کرتا تھا کیونکہ موصوفہ مشہور کانگریسی لیڈر پروفیسر کرپلانی کی اہلیہ تھیں اور پروفیسر کرپلانی مجھے عرصہ دراز سے جانتے تھے۔ راقم گومتی کے سرکاری مہمان خانہ میں قیام کرتا اور موصوفہ کی سرکاری رہائش گاہ مہمان خانہ کے سامنے سڑک کے اس پار تھی۔ دوران قیام میں اکثر موصوفہ کی رہائش گاہ پر جاتا اور مختلف موضوعات پر ان سے باتیں ہوتی تھیں۔ راقم اس وقت تک پٹنہ میں اپنا رہائشی مکان تعمیر نہ کرا سکا تھا اور پنشن پانے کے بعد لکھنؤ ہی میں بس جانا چاہتا تھا۔ میں نے اس بات کا تذکرہ موصوفہ سے کیا اور انھوں نے تین کٹھا سرکاری زمین میرے مکان تعمیر کرنے کے لیے دینے کا وعدہ کیا مگر چند وجوہ کی بنا پر پٹنہ میں مکان بنا کر یہاں کی سکونت اختیار کر لی۔ آج کل پروفیسر ڈاکٹر ولی الحق انصاری لکھنؤ یونیورسٹی

میں شعبہ فارسی کے صدر ہیں۔ آپ فرنگی محل کے مشہور حضرات میں ہیں۔ فارسی کی مسلم قابلیت اور علمی شغف کے لیے حکومت ہند سے آپ کو ایک سند عطا ہوئی ہے اور اسی کے ساتھ پانچ ہزار روپیہ سالانہ تاحیات بطور وظیفہ دیا جاتا ہے۔ راقم ان کی بڑی عزت کرتا ہے۔ راقم کا دہلی جانا سرکاری اور یونیورسٹی کے کاموں سے اکثر و بیشتر ہوا کرتا تھا۔ اس زمانے میں پروفیسر مرزا محمود بیگ جن کا خاندانی تعلق شاہان مغلیہ سے تھا، دہلی کالج کے پرنسپل تھے۔ موصوف نہایت مہذب، باوقار، خوش گفتار اور ملنسار انسان تھے۔ جو بھی ان سے ملتا ان کی شائستگی، تہذیب اور خوش گفتاری سے نہایت متاثر ہوتا تھا۔ کچھ عرصہ تک حکومت کشمیر میں اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے۔ ۱۹۴۷ء کی غارت گری کے بعد عربک کالج کی تشکیل دہلی کالج کے نام سے ہوئی۔ اس کالج کو زندہ کرنے والوں میں مرزا محمود بیگ صاحب کا نام سر فہرست لیا جاتا ہے اور ان کی مختلف خدمتوں کو دہلی کالج کبھی بھی فراموش نہیں کر سکتا۔ مرزا محمود بیگ صاحب راقم سے بہت خلوص سے ملتے تھے۔ میں بھی ان کا بڑا احترام کرتا تھا۔ اس زمانے میں پروفیسر سید منظور حسین موسوی کا دہلی میں قیام تھا۔ ان کے بھتیجے مسٹر اسد رضا ایڈووکیٹ الہ آباد ہائی کورٹ کی شادی نواب شمس العلما سید امداد امام اثر مرحوم کی صاحبزادی سے ہوئی تھی اس لیے موصوف مجھ سے مثل ایک رشتہ دار کے ملا کرتے تھے اور راقم بھی ان کی بڑی عزت کرتا تھا۔ دہلی کالج کی تشکیل نو میں انھوں نے بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا۔ موسوی صاحب کی مستقل مزاجی اور دور اندیشی نے اس کالج کو بڑا فروغ بخشا۔ موصوف اس کالج میں عہدۂ صدارت شعبۂ فارسی پر فائز تھے اور عرصۂ دراز تک کالج کے برسر رہے۔ ایک عرصہ تک وائس پرنسپل رہے۔ موصوف نے تقریباً سات سال تک کالج کے پرنسپل رہ کر پنشن پائی اور کالج کی خدمات سے عہدہ برآ ہوئے۔ ۱۹۷۸ء میں جب وہ الہ آباد جا رہے تھے تو دوران سفر ان کی روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی اور الہ آباد میں دفن ہوئے۔ وہ ایک عالم باعمل، مرد حق گو اور راست کردار تھے۔ ہر آدمی سے نہایت خلوص اور خاکساری سے ملتے تھے۔ راقم جب بھی دہلی جاتا تو وہ مجھے اپنے یہاں کھانے پر ضرور مدعو کرتے اور اپنے چند دوستوں کو بھی بلا لیا کرتے تھے۔ وقت نہایت ہی ہنسی خوشی سے گزر جاتا تھا۔ موصوف کے انتقال سے راقم کو بڑا صدمہ ہوا۔ ایسے لوگ اب کہاں ملتے ہیں۔ موسوی صاحب کے علاوہ ڈاکٹر سید امیر حسن عابدی جو اس زمانے میں دہلی یونیورسٹی میں فارسی کے لکچرر تھے۔ راقم سے

تقریباً ہر روز ملا کرتے اور اکثر جگہوں پر خصوصاً سفارت خانہ ایران ہمارے ساتھ جایا کرتے تھے۔ ابھی بھی مجھ سے بہت محبت سے ملتے ہیں اور میں ان کو مثل چھوٹے بھائی کے سمجھتا ہوں۔ ان کی اہلیہ بھی بہت ملنسار خاتون ہیں جن کی راقم بڑی عزت کرتا ہے۔ جب کبھی میں دلی جاتا ہوں مجھے اپنے یہاں کھانے پر مدعو کرتے ہیں اور میرے دیگر احباب بھی جو میرے ساتھ دلی جایا کرتے ہیں اس کھانے میں شریک ہوتے ہیں۔ موصوف اور ان کی اہلیہ نہایت ہی پر تکلف کھانوں سے ہم لوگوں کی تواضع کرتے ہیں۔ ان لوگوں کی اولاد نہایت ہی سعادت مند اور مہذب ہیں اللہ ان لوگوں کو ترقی عطا فرمائے۔

راقم نے عابدی صاحب کو ہر دور میں دیکھا ہے اور ان کی کارکردگی سے برابر متاثر رہا ہے۔ موصوف کو جب پروفیسری کا عہدہ دیا جانے والا تھا تو راقم نے بحیثیت ایکسپرٹ کے ان کی تقرری کے لیے پر زور سفارش کی اور مجھے خوشی ہوئی کہ تمام ممبران کمیٹی میرے ہم خیال تھے اور موصوف نہایت آسانی سے پروفیسر مقرر کر دیئے گئے۔ بحیثیت پروفیسر کے انھوں نے اپنے فرائض کو بحسن و خوبی انجام دیا۔ باکمال عزت و توقیر اب اس عہدے سے پنشن پا گئے ہیں۔ موصوف فارسی کے نہایت نامور پروفیسر ہیں۔ بارہ کتابیں تالیف کی ہیں اور پانچ علمی اعزازات سے سرفراز ہوئے ہیں۔ ایران، عراق، ترکی، لبنان، شام، افغانستان اور پاکستان کا سفر کیا ہے۔ ہندوستان کی تمام یونیورسٹیوں میں ان کی قدر ہے اور مختلف موضوعات پر لکچر دینے کے لیے بلائے جاتے ہیں۔ موصوف کی جگہ پر ڈاکٹر نورالحسن انصاری کی تقرری ہوئی ہے جو فارسی کے ایک باصلاحیت اور قابل استاذ ہیں۔ ڈاکٹر گنگولی جو بعد میں دلی یونیورسٹی کے وائس چانسلر ہوئے میرے ملاقاتیوں میں تھے۔ موصوف نے بحیثیت وائس چانسلر اپنے کاموں کو اس خوبی سے نبھایا کہ اساتذہ اور طلبا سب کے سب ان کے ثناخواں تھے اور ان کی بڑی قدر کرتے۔ موصوف جتنے دنوں تک وائس چانسلر کے عہدے پر فائز رہے یونیورسٹی میں کسی قسم کا ہنگامہ نہ ہوا۔ موصوف نہایت ہی بلند خیال انسان تھے اور میں ان کی بڑی عزت کرتا ہوں۔ جب کبھی میں ان سے ملنے جاتا تو وہ نہایت ہی خندہ پیشانی سے ملا کرتے اور دیر تک باتیں ہوا کرتی تھیں۔

سفارت خانۂ ایران :

راقم کا تعلق سفارت خانۂ ایران سے آقائی نورزاد کے زمانے سے ہے۔ ۱۹۵۸ء میں جب میں دلی گیا تو آقائی تقی مقتدری سے ملنے کی خواہش ہوئی۔ ڈاکٹر امیر حسن عابدی کے

ساتھ سفارت خانہ ایران جاکران سے ملاقات کی۔ مولوی عبدالجلیل وکیل پٹنہ بھی میرے ہمراہ سفارت خانہ گئے۔ ہم دونوں سے موصوف نے بہت دیر تک باتیں کیں اور اپنی لکھی کتابیں ہم لوگوں کو بطور تحفہ عنایت کیں۔ کچھ دنوں بعد ان کا تبادلہ حیدرآباد آندھرا پردیش ہو گیا جہاں انھوں نے حیدرآباد پر تاریخی نوعیت کی ایک کتاب لکھی جس کی ایک کاپی راقم کو بھیجی تھی۔ موصوف حیدرآباد سے ایران کے سفیر بناکر افغانستان بھیجے گئے جہاں انھوں نے افغانیوں کی طرز زندگی پر ایک کتابچہ لکھا جس کی ایک کاپی ازراہ کرم راقم کو بھی بھیجی تھی۔ موصوف سے برابر خط وکتابت ہوا کرتی تھی۔ راقم کا تعلق اب تک سفارت خانہ ایران سے قائم ہے۔ مئی ۱۹۸۶ء میں راقم کو اسلامی جمہوریہ ایران کی ثقافتی انقلابی کونسل کی یونیورسٹی پبلی کیشن سنٹر نے ایک سیمینار میں شرکت کی دعوت دی تھی۔ یہ سیمینار جنوبی ایشیا میں فارسی زبان کی ترقی اور فروغ میں حائل دشواریوں کے موضوع پر جون کے پہلے ہفتہ میں تہران میں منعقد ہونے والا تھا۔ خرابی صحت کی وجہ سے اس سیمینار میں راقم شرکت نہ کرسکا جس کا بڑا افسوس ہے۔

چند اور لوگوں سے ملاقاتیں :

ان دنوں ڈاکٹر راجندر پرشاد صدر جمہوریہ ہند تھے۔ موصوف سے ہم لوگوں کے خاندانی تعلقات تھے اور میرے والد مرحوم سے ان کی خط وکتابت ہوا کرتی تھی۔ صاحب موصوف مجھ سے بہت خلوص سے ملتے تھے۔ راقم کا قیام بہار بھون میں ہوا کرتا تھا جو راشٹرپتی بھون سے بہت قریب ہے اس لیے راقم راشٹرپتی بھون اکثر جاتا اور صدر موصوف سے ملاقات کا شرف حاصل کرتا تھا۔ پٹنہ کے ماہر چشم ڈاکٹر دکھن رام ان دنوں راشٹرپتی بھون میں ٹھہرے ہوئے تھے اور اس وجہ سے راشٹرپتی بھون جانے میں کوئی دشواری پیش نہ آتی تھی۔ مولوی عبدالجلیل صاحب وکیل پٹنہ بھی میرے ہمراہ راشٹرپتی بھون جاتے اور کچھ دیر تک صدر موصوف سے بہار اور پٹنہ کے متعلق ہم لوگوں سے باتیں ہوا کرتی تھیں۔ ایک روز شام کو موصوف نے ہم لوگوں کو ناشتہ پر مدعو کیا جس میں ڈاکٹر دکھن رام بھی شریک تھے۔ صدر موصوف کو شان وشوکت سے دور کا بھی لگاؤ نہ تھا اور جس سے بھی ملتے نہایت ہی خلوص وانکساری سے ملتے تھے۔ صدر موصوف کے بڑے صاحب زادے شری مرتنجے پرشاد راقم کے ہم سن اور عزیز دوستوں میں تھے۔

بابو جگ جیون رام : راقم کبھی کبھی بابو جگجیون رام کے یہاں جایا کرتا تھا۔ موصوف

سے میری ملاقات عرصہ دراز سے تھی۔ جب ان کو پٹنہ میں مکان بنانے کی خواہش ہوئی تو ہم لوگوں کے قدم کنواں کی زمینداری میں ایک قطعہ زمین خریدی چونکہ یہ زمین کاشت کاری کے لیے تھی اس لیے اس اراضی پر کوئی مکان بغیر زمیندار کی اجازت کے بغیر تعمیر نہ کیا جاسکتا تھا۔ موصوف مجھ سے آکر ملے اور میں نے انھیں والد مرحوم سے مکان تعمیر کرانے کی اجازت دلوا دی۔ زمین اور مکان ان کی اہلیہ کے نام پر تھا مگر صاحب موصوف اپنے کو بلا ضرورت ہم لوگوں کا رعیت تصور کیا کرتے اور والد مرحوم کی بڑی عزت کیا کرتے تھے۔ زمین کی سالانہ مال گذاری اپنی اہلیہ کی طرف سے خود ادا کیا کرتے تھے جس کی وصولی کے لیے ہم لوگوں کے گماشتہ منشی چھیدی لال ان کے پاس جایا کرتے تھے۔ صاحب موصوف منشی جی سے بہت اخلاق سے پیش آتے اور اکثر پانچ سال کی مالگذاری پیشگی ادا کر دیا کرتے تھے۔ ۱۹۳۷ء میں موصوف جب پارلیمنٹری سکریٹری مقرر ہو کر ڈاکٹر سید محمود وزیر تعلیم بہار کے ساتھ کام کرنے لگے تو راقم کی ملاقات وہاں ان سے برابر ہوا کرتی تھی۔ ان دونوں مذکورہ بالا وجوہات کی بنا پر موصوف راقم سے نہایت خلوص سے ملا کرتے تھے اور میں بھی ان کی بڑی عزت کیا کرتا تھا۔ جب کبھی میں نے انھیں کسی کام کے لیے زحمت دی تو موصوف اس کام کو نہایت خندہ پیشانی سے انجام دے دیتے تھے۔ ایک سال علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں ایک علمی کانفرنس ہونے والی تھی جس کے جلسہ میں شرکت کے لیے ہندوستان کے مختلف حصوں سے ممبروں کی آمد کی توقع تھی۔ اس کانفرنس کا نام ریلوے بورڈ کی فہرست میں نہ تھا اور ریلوے شریک ہونے والے ممبروں کو شرح ٹکٹ میں کوئی رعایت دینے کو تیار نہ تھی۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے کچھ اساتذہ نے مجھ سے شکایت کی۔ صاحب موصوف اس زمانے میں محکمۂ ریلوے کے وزیر تھے اور میں نے ان کی توجہ اس دشواری کی طرف مبذول کرائی اور ان کے حکم کے مطابق ریلوے بورڈ نے اس کانفرنس کو وہ تمام رعایتیں دیں جو عام طور سے مستند کانفرنس کے ممبروں کو دی جاتی تھیں۔

صاحب موصوف سبھی کے ساتھ خواہ وہ بڑا ہو یا چھوٹا نہایت عزت، اخلاق اور فراخ دلی سے پیش آتے۔ لوگوں کی شکایتوں کو غور سے سنتے اور حتی الوسع ان کو دور کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ پس ماندہ طبقوں کی ترقی کے لیے انھوں نے بے انتہا کوششیں کیں اور ان کی فلاح و بہبود کے لیے کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ پس ماندہ طبقوں کے لیے سرکاری ملازمتوں

میں الگ جگہیں مخصوص کرائیں اور اس کے علاوہ ان لوگوں کو حکومت سے طرح طرح کی دیگر سہولتیں ورعایتیں دلوائیں۔ یہ انھیں کا فیض ہے کہ آج بڑی بڑی سرکاری ملازمتوں میں پس ماندہ طبقے کے افراد نظر آتے ہیں۔ پچاس سال تک ہندوستان کی سیاست پر چھائے رہے اور اس دوران حکومت ہند کے بڑے بڑے محکموں کی وزارت پر فائز رہے۔ مزاج میں طنز، ظرافت اور نرمی تھی اور نہایت ہی خوش اندازی سے باتیں کیا کرتے تھے۔ ہندی خوب اچھی بولتے اور لکھتے تھے۔ راقم جب بھی ان سے ملنے جاتا تو دیر تک باتیں ہوا کرتی تھیں جو عموماً بہت پر لطف اور دلچسپ ہوتی تھیں۔

ہندوستانی ثقافتی کانسل :

مولانا ابوالکلام آزاد ۱۹۵۲ء میں Indian Council for Cultural Relations کے صدر تھے۔ انھوں نے ۸ جون ۱۹۵۳ء کو وائس چانسلر پٹنہ یونیورسٹی کے نام ایک خط روانہ کیا جس کے ذریعہ ایک ایسے پروفیسر کا نام طلب کیا جو عربی، فارسی یا ترکی زبان میں مہارت رکھتا ہو تاکہ اس کو تین سال کے لیے مذکورہ بالا کونسل کا ممبر بنایا جاسکے۔ ۲۳ جولائی ۱۹۵۳ء کو وائس چانسلر نے میرا نام تجویز کر کے بھیج دیا۔ مسٹر ایس۔ ایچ۔ برنی جو اس زمانے میں I.C.C.R. کے سکریٹری تھے، ۲۹ مئی ۱۹۵۴ء کو اپنے ایک خط سے مجھے مطلع کیا کہ ۲۵ مئی ۱۹۵۴ء سے تین سال کے لیے راقم کو ممبر بنا دیا گیا ہے۔ اس کے بعد مزید تین سال کے لیے یکم مارچ ۱۹۵۷ء سے مجھے دوبارہ ممبر بنایا گیا۔ راقم پابندی سے دہلی جاکر اس کے جلسوں میں شرکت کرتا کیونکہ مولانا آزاد سے ملاقات کا شرف بھی حاصل ہو جاتا تھا۔ ۱۴ فروری ۱۹۵۸ء کو I.C.C.R. کی جنرل اسمبلی کا اجلاس ہونے والا تھا۔ راقم دو روز قبل ۱۲ فروری ۱۹۵۸ء کو دہلی پہنچ کر مولانا آزاد کی رہائش گاہ پر گیا جو نمبر ۴ کنگ ایڈورڈ روڈ پر تھی اور مولانا موصوف سے ملاقات کی۔ میرے منجھلے ماموں مسٹر غلام مولیٰ مرحوم کی شادی کلکتہ کے ایک دولت مند گھرانے میں ہوئی تھی اور ماموں مرحوم کے تعلقات مولانا آزاد سے کلکتہ میں نہایت دوستانہ تھے۔ اس وجہ سے مولانا موصوف کی نظر عنایت مجھ پر رہا کرتی تھی۔ جب میں مولانا موصوف کی رہائش گاہ پر پہنچا تو بہت سے لوگ ملنے کے لیے جمع تھے اور مولانا اپنے کاموں میں مصروف تھے۔ تقریباً ایک گھنٹہ بعد مجھے ملاقات کا موقع ملا اور مولانا موصوف

سے میری دس منٹ تک باتیں ہوئیں۔ کچھ ہی دنوں پہلے مولانا موصوف نے پٹنہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر کے ذریعہ مجھ سے دریافت کیا تھا کہ اگر سعودی عرب جدہ کے ہندوستانی سفارت خانہ میں بحیثیت فرسٹ سکریٹری میرا تقرر کردیا جائے تو مجھے پسند ہوگا یا نہیں۔ میں نے اس ملاقات میں ان سے معذرت کی کہ اہلیہ سخت بیمار رہتی ہیں اور میرا گھر چھوڑنا ناممکن ہے۔

جنرل اسمبلی کا جلسہ :

آئی سی سی آر کے جنرل اسمبلی کا اجلاس ۱۴ر فروری ۱۹۵۸ء کو وگیان بھون دہلی میں ہوا اس جلسہ میں راقم پٹنہ یونیورسٹی کا نمائندہ تھا اور ڈاکٹر دکھن رام جو اس زمانے میں بہار یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے اپنی یونیورسٹی کے نمائندہ کی حیثیت سے شرکت کے لیے آئے تھے۔ ہم دونوں ایک ساتھ جلسہ میں شرکت کے لیے گئے۔ ہم لوگوں کے قریب کرنل بشیر حسین زیدی اور پنڈت سندر لال تشریف فرما تھے۔ جلسہ شروع ہونے سے پانچ سات منٹ پہلے مولانا ابوالکلام آزاد تشریف لائے اور دو چار آدمیوں سے باتیں کرتے ہوئے شہ نشیں کی طرف بڑھے اور جب اس پر چڑھنے لگے تو ایک طرف سے غلام السیدین صاحب اور دوسری طرف سے پروفیسر ہمایوں کبیر نے مولانا موصوف کو سہارا دیا۔ راقم اور ڈاکٹر دکھن رام کو مولانا موصوف کی اس حالت کو دیکھ کر خیال گذرا کہ مولانا کی طبیعت کچھ زیادہ ناساز ہے۔ مولانا کا انگریزی صدارتی خطبہ جو چار پانچ صفحات پر مشتمل تھا پہلے ہی سے حاضرین میں تقسیم کردیا گیا تھا۔ مولانا موصوف نے اسی حالت میں کھڑے ہوکر اس خطبہ کا اردو ترجمہ لفظ بہ لفظ زبانی سنایا۔ اس پیرانہ سالی میں ان کے حافظہ پر ہم لوگوں کو بڑی حیرت ہوئی۔

مولانا کی وفات : راقم ۱۷ر فروری کو دہلی سے پٹنہ واپس آیا اور ۱۹ر فروری کو ریڈیو سے خبر ملی کہ مولانا آزاد پر فالج کا دورہ پڑ گیا ہے۔ ۲۲ر فروری ۱۹۵۸ء سنیچر کو ریڈیو نے خبر دی کہ ان کا انتقال ہوگیا۔ ۲۳ر فروری ۱۹۵۸ء کو حکومت ہند نے سیاہ حاشیہ کے ساتھ ایک خصوصی گزٹ شائع کیا جس میں مولانا کی خوبیوں اور خدمات کا تذکرہ کیا گیا تھا۔ اسی دن جامع مسجد کے سامنے والے میدان میں سپرد خاک کیے گئے۔ راقم جب بھی دہلی جاتا ہے، مولانا کی قبر پر حاضر ہوکر فاتحہ ضرور پڑھتا ہے۔ ؎

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے ٭ بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

گیارہواں باب

ڈین کا عہدہ اور میرا انتخاب

۱۹۵۸ء سے ۱۹۶۰ء

ڈین کا عہدہ :

۲ جنوری ۱۹۵۲ء کو ایک ایکٹ کے ذریعہ پٹنہ میں رہائشی یونیورسٹی قائم کی گئی۔ یونیورسٹی کے قیام کے ساتھ اسی ایکٹ کے مطابق چند اعلیٰ عہدے وجود میں آئے جن میں ڈین آف فیکلٹی کا عہدہ بھی تھا۔ ڈین کا عہدہ بڑی اہمیت کا حامل تھا کیونکہ ایکٹ کے مطابق ڈین کا فرض منصبی تھا کہ وہ آئین، قانون اور قاعدوں پر مناسب طور سے عمل کرائے اور یہ بڑا ذمہ داری کا کام تھا.
ایکٹ کی انگریزی عبارت یوں ہے :

> "Shall be responsible for the due obser-
> -vance of the statutes the Ordinances and
> the Regulations relating to the Faculty."

ڈین کے عہدہ کی میعاد تین سال تھی اور تقرری بذریعہ ووٹ ہوتی جس میں متعلقہ فیکلٹی کے ممبران حصہ لیتے تھے.

رہائشی یونیورسٹی ایکٹ نے معاملات کو سلجھانے کی بجائے زیادہ تر الجھا دیا۔ اس سے پروفیسروں میں اختلاف بڑھے اور کئی گروپوں میں بٹ گئے۔ جو آپسی خیر سگالی کا ماحول تھا اس میں تلخی آ گئی اور ایک دوسرے سے اختلاف کا جذبہ پیدا ہو گیا۔ پٹنہ یونیورسٹی میں پہلے "ڈین" کی تقرری سنیورٹی کے بنا پر ہوتی تھی لیکن اس ایکٹ کے نفاذ کے بعد جب ڈین کی تقرری بذریعہ

ووٹ ہونے لگی تو اس طریقہ کار نے اساتذہ میں جو کچھ محبت و خلوص کا جذبہ باقی رہ گیا تھا وہ بھی ختم کر دیا۔ ہر ایک استاذ گروپ بندی کا بری طرح سے شکار ہو کر حقیقت کو پس پشت ڈال دیا۔

ڈین کے لیے مسٹر کلیم الدین احمد اور مسٹر کشوری پرشاد سنہا کا مقابلہ

۱۹۵۲ء میں مسٹر کے۔ پی۔ سنہا جو فیکلٹی آف آرٹس کے سب سے سینیر پروفیسر تھے، پرانے دستور کو مدنظر رکھتے ہوئے ڈین کے لیے امیدوار ہوئے۔ ان کے مقابلے میں مسٹر کلیم الدین احمد نے بھی اس عہدہ کی امیدواری میں اپنا نام پیش کیا اور اپنی حکمت عملی سے ان لوگوں کو جو مسٹر سنہا کے مخالف تھے اپنا ہم نوا بنا لیا اور بڑی کوشش کے بعد موصوف مسٹر کے۔ پی۔ سنہا کے مقابلے میں صرف ایک ووٹ سے کامیاب ہو گئے۔ کامیابی کے بعد انتخاب کی تلخ باتوں کو بھلا دینا چاہیے تھا لیکن مسٹر کلیم الدین احمد کے ہم نوا، مسٹر کے پی سنہا اور اپنے مخالف لوگوں کو عرصہ دراز تک برا بھلا کہتے رہے اور اکثر گالیاں بھی دیتے تھے۔ ان دنوں مسٹر کلیم الدین احمد کی صحت برابر خراب رہتی تھی اس لیے ڈین کے کاموں کو بحسن و خوبی انجام نہ دے سکے۔

ڈاکٹر کے۔ کے۔ دت کا انتخاب:

۱۹۵۵ء میں جب پھر ڈین کے انتخاب کا زمانہ آیا تو ڈاکٹر کے۔ کے۔ دت راقم کے پاس آئے اور تعاون کی درخواست کی۔ میں بھی امیدوار ہونا چاہتا تھا مگر مسٹر کلیم الدین احمد نے کہا کہ ڈاکٹر کے۔ کے۔ دت سینیر ہیں ان کو موقع ملنا چاہیے، حالانکہ مسٹر کلیم الدین احمد اپنے الکشن کے وقت اس اصول کو فراموش کر چکے تھے۔ ان کے کہنے پر میں نے موصوف کی مدد کی اور وہ بلا مقابلہ ڈین منتخب ہو گئے اور تین سال تک اس عہدہ پر برقرار رہے۔ ڈاکٹر کے۔ کے۔ دت ہر کام کو جس کا تعلق فیکلٹی سے ہوتا مسٹر کلیم الدین احمد اور ان کے ہم نوا پروفیسروں کے مشورے سے کیا کرتے تھے۔

راقم کا انتخاب:

۱۹۵۸ء میں جب ڈاکٹر کے۔ کے۔ دت کے بعد ڈین کی جگہ خالی ہوئی تو راقم نے ڈاکٹر کے۔ کے۔ دت اور مسٹر کلیم الدین احمد سے ملاقات کی اور اپنی نامزدگی کے لیے ان سے مدد چاہی مگر ان دونوں صاحبان میں سے کسی نے مجھے اطمینان بخش جواب نہ دیا بلکہ میرے مقابلے میں پروفیسر ارت دھاری

سنگھ کو الکشن کے لیے آمادہ کیا۔ افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ایک اردو کے پروفیسر میری مخالفت اور امرت دھاری سنگھ کی حمایت میں سرگرم عمل ہو گئے۔ راقم بھی ہمت کر کے فیکلٹی آف آرٹس کے ہر ممبر سے ملا اور زیادہ تر لوگوں کو اپنا ہمدرد بنا پایا۔ الیکشن سے دو روز پہلے پروفیسر امرت دھاری سنگھ نے میرے یہاں آ کر ملاقات کی اور مجھے اطمینان دلایا کہ وہ امیدوار نہ ہوں گے۔ انتخاب کے روز ڈاکٹر ٹی بھدر پرشاد وائس چانسلر نے جلسہ کی صدارت کی اور پانچ ممبران فیکلٹی نے ڈین کے عہدہ کے لیے میرا نام پیش کیا اور میں بلا مقابلہ ڈین منتخب ہو گیا۔ پروفیسر امرت دھاری سنگھ جلسہ میں شریک نہ تھے۔ وائس چانسلر اور بہت سے پروفیسروں نے مبارکباد دی۔ پروفیسر حافظ محمد قدوس جو عربی کے پروفیسر تھے اور اس مہم میں راقم کے ساتھ ہر جگہ گئے تھے، ان کی خوشی کی کوئی انتہا نہ تھی کیونکہ ان کو یقین تھا کہ امرت دھاری سنگھ اپنی امیدواری سے دست بردار نہ ہوں گے۔ مسٹر کلیم الدین احمد نے جن سے میرے خاندانی روابط تھے مبارکباد نہ دیا۔

کامیابی کی خبریں:

جب راقم ڈین منتخب ہوا تو پٹنہ کے انگریزی اخباروں نے ۱۳ اگست ۱۹۵۸ء کو نمایاں طور سے میری کامیابی کی خبر کو چھاپا۔ "ایران ٹوڈے" جو اس زمانہ میں ایرانی سفارت خانہ دہلی سے شائع ہوتا تھا۔ اس میں بھی یہ خبر شائع ہوئی تھی۔ آل انڈیا ریڈیو دہلی نے میری کامیابی کی خبر اپنی فارسی خبروں میں نشر کیا۔ مقامی اردو کے روزانہ اخباروں نے اداریے لکھے جو حسب ذیل ہیں:

اداریہ ۱

"تین سال کی مدت تکمیل کے بعد مسٹر کے۔ کے۔ دت پٹنہ یونیورسٹی کے ڈین آف فیکلٹی آف آرٹس کے عہدہ سے علیحدہ ہو گئے اور ڈاکٹر اقبال حسین صدر شعبہ فارسی اس عہدہ کے لیے باتفاق رائے چنے گئے۔ یونیورسٹی کی خودمختاری کے بعد ڈین آف فیکلٹی آف آرٹس کا عہدہ بڑا ہی اہم سمجھا جاتا ہے۔ بالخصوص اس وجہ سے بھی کہ ہر فیکلٹی آف آرٹس کا ایک ڈین بھی ہوتا ہے اور ہر کالج کا علیحدہ ایک پرنسپل بھی۔ ڈین اور پرنسپل کے فرائض میں کبھی کبھی تصادم کا اندیشہ بھی ہو سکتا ہے

اور کبھی یہ سوال بھی اٹھ سکتا ہے کہ کس کا احاطۂ عمل کہاں پر ختم ہو جاتا ہے؟ اس لیے محض علم و ادب ہی میں مہارت کی ضرورت نہیں۔ دور اندیشی و مصلحت بینی کا ہونا بھی کچھ کم ضروری نہیں۔ صرف اچھا معلم ہی نہیں ہونا چاہیے، اچھا منتظم بھی ہونا چاہیے۔ پٹنہ یونیورسٹی میں ایک دقت اور ہے۔ یہاں خود مختاری ابھی چند برسوں سے ملی ہے۔ اسے اچھی روایتوں کو قائم کرنا ہے۔ ایسے عہدے کے لیے ڈاکٹر اقبال حسین کا بلا مقابلہ چنا جانا بہت بڑی بات ہے، اور ان کی مقبولیت اور ہمہ گیری کا ناقابل تردید ثبوت۔ شاید اس کی بہت بڑی وجہ یہ ہے کہ صاحب موصوف نے اپنے کو یونیورسٹی کی "سیاست" سے علیحدہ رکھا اور گروپ بازی اور حلقہ بندی میں کبھی نہ پڑے۔ خوش مزاج اور خوش گفتار ہیں۔ طنز و ظرافت کا بھی شوق ہے۔ سب سے ملتے جلتے اور ہنستے بولتے ہیں جو انعام و اکرام ملا۔ اسے شکریہ کے ساتھ قبول کر لیا۔ اس کی تمنا کبھی نہ کی کہ سب کچھ مجھے ہی ملے، خواہ جس طور سے بھی ہو، اپنی سرگرمیوں کو برابر ہی یونیورسٹی کے دائرہ تک ہی محدود رکھا۔ اور اسی وقار کا برابر ثبوت دیا جو کبھی پہلے پروفیسروں کا طرۂ امتیاز سمجھا جاتا تھا۔ اور اب تیزی سے مفقود ہوتا جا رہا ہے۔ اسی دور میں فارسی کے ایک معلم کو فیکلٹی آف آرٹس کے ڈین کی ذمہ داریاں سونپنا قابل قدر فیصلہ ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ جناب ڈاکٹر اقبال حسین صاحب اس نئے عہدہ کے فرائض اس حسن و خوبی سے انجام دیں گے جس طور سے وہ اپنے محکمہ کے فرائض اب تک انجام دیتے آئے ہیں۔"

اداریہ ۲:

"ڈاکٹر اقبال حسین اپنی باغ و بہار طبیعت کی وجہ سے خلائق میں مشہور ہیں۔ آپ سادہ دل اور منکسر المزاج ہیں۔ بات عام ہو یا خاص لوگوں کے درمیان میں کہنے کے قائل ہیں۔ معاملات کی نزاکت تک بہت جلد پہنچ جاتے ہیں۔ اور مشکل مسئلوں کو سنجیدگی کے ساتھ سلجھانے میں کمال رکھتے ہیں۔ آپ کی دلچسپیاں محدود ہیں۔ اس لیے آپ کے دشمن بھی گویا نہیں ہیں۔ اس وقت کلاس وَن کے سینیر پروفیسر کی حیثیت سے آپ کے مدمقابل چند گنے ہوئے لوگ لائے جا سکتے ہیں۔ خوشی کی بات ہے کہ ڈین فیکلٹی آف آرٹس کی حیثیت سے باتفاق رائے ابھی آپ منتخب ہوئے

ہیں۔ اتفاق رائے سے منتخب ہونا ہی آپ کی مقبولیت کی دلیل ہے۔ مختلف مشاورتی کمیٹیوں میں رہنے کی وجہ سے اور ایک سینیر پروفیسر کی حیثیت سے گراں قدر تجربوں کے مالک ہیں۔ امید کرنی چاہیے کہ آپ کے قیمتی تجربوں سے پٹنہ یونیورسٹی کو مفید اور کارآمد مشورے ملیں گے۔ اور بہت ساری گتھیوں کو سلجھانے میں آپ نمایاں کامیابی حاصل کریں گے۔ آمین۔"

میرا طریقۂ کار :

راقم نے ڈین کا عہدہ سنبھالنے کے ایک ماہ بعد فیکلٹی آف آرٹس کی میٹنگ بلائی اور تین کمیٹیوں کی تشکیل دی۔ انہی کمیٹیوں کی مدد اور مشورے سے فیکلٹی کے کل کام انجام پاتے۔ ہر دو ماہ پر فیکلٹی آف آرٹس کی میٹنگ طلب کرتا اور ان کاموں کی توثیق کراتا جو گذشتہ دو ماہ میں انجام پا چکے تھے۔ کوئی اہم کام بغیر فیکلٹی کے مشورے سے نہ کرتا تھا۔ روزانہ کے کاموں کو قاعدوں کے مطابق انجام دیتا اور کسی کو شکایت کا موقع نہ ملتا۔ ڈاکٹر ملیجہ ریرشا دجوان دنوں پٹنہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے، انھوں نے محسوس کیا کہ جو ریگولیشنس امتحان سے متعلق مقرر ہیں ان میں اب تبدیلی نہایت ضروری ہے۔ اس خیال سے انھوں نے ایک کمیٹی تشکیل دی تاکہ سائنس اور آرٹس کے امتحانات سے متعلق نئے ریگولیشنس مرتب کیے جائیں۔ راقم، ڈاکٹر نگینہ ناتھ اور ڈاکٹر کامیشور پرشاد امبستھا اس کمیٹی کے ممبر مقرر کیے گئے۔ اس کمیٹی کی میٹنگ یونیورسٹی آفس میں ہوا کرتی تھی۔ ہم تینوں نے بڑی محنت اور جانفشانی کے بعد دو ماہ کے اندر ہی آرٹس اور سائنس کے امتحانات سے متعلق نئے ریگولیشنس ترتیب دے کر رجسٹرار کے حوالہ کر دیا، جس کے نفاذ کی منظوری بھی کچھ دنوں کے بعد مل گئی۔ یہی ریگولیشنس یونیورسٹی میں عرصہ تک رائج رہے۔

آنرس کا داخلہ :

اس زمانے میں ڈین بی۔ اے آنرس کا داخلہ طلبا کے نمبروں کی بنیاد پر کیا کرتا تھا۔ آنرس کی تعلیم کی پوری ذمہ داری ڈین پر ہوا کرتی تھی اور اس کے تینوں پرچوں کی تعلیم بھی صرف پٹنہ کالج میں ہوتی تھی، اس لیے یہاں دوسرے کالج کے اساتذہ بھی لکچر دینے آیا کرتے تھے اور طلبا کو تو بہرحال اپنے کالج سے یہاں آکر ہی پڑھنا پڑتا تھا۔ میرے ڈین کے عہدہ سنبھالنے سے پہلے مقررہ جگہوں سے زیادہ طلبا کا داخلہ کر لیا جاتا تھا جس سے بعض درجوں میں بیٹھنے کی جگہ ناکافی ہوتی۔ مجبوراً طلبا

کھڑے کھڑے لکچر سنا کرتے تھے، اس لیے میں اپنے زمانے میں داخلہ کے لیے جتنی جگہیں مقرر تھیں ان سے زیادہ داخلہ نہ لیتا، کسی کو سفارش کا موقع نہ دیتا اور نمبروں کی بنیاد پر داخلہ کرتا جس سے کسی کو شکایت نہ ہوتی۔ راقم نے اپنے وقت میں کوشش کی کہ سوشیالوجی میں بھی بی۔اے آنرس کا کورس شروع ہو جائے مگر اساتذہ کی قلت کی وجہ سے وائس چانسلر نے کہا کہ لکچرر کی کمی ہے فی الحال یہ پروگرام ملتوی رکھا جائے۔

اکزامینیشن بورڈ :

رہائشی یونیورسٹی کے قیام کے بعد ۱۹۵۲ء میں ایک اکزامینیشن بورڈ قائم کیا گیا جس کا صدر وائس چانسلر ہوتا تھا اور ہر فیکلٹی کا ڈین اس کا ممبر ہوا کرتا تھا۔ اس بورڈ کے قیام کا مقصد یہ تھا کہ امتحانات سے متعلق تمام نظم و نسق کو برقرار رکھا جائے اور طلبا کی نامناسب حرکتوں کی تادیبی کارروائی بھی کی جائے۔ جب تک ڈاکٹر ملبھدر پرشاد وائس چانسلر رہے بورڈ کا کام نہایت حسن و خوبی سے انجام پاتا رہا اور ممکن نہ تھا کہ سفارش کی بنا پر کوئی امیدوار اپنی غلط کاری کی سزا سے بچ سکے۔

عارضی لکچرر کی تقرری :

اس زمانے میں پٹنہ یونیورسٹی کے عارضی لکچرر کی تقرری کے لیے انٹرویو ہوا کرتا تھا۔ انٹرویو کمیٹی کا صدر وائس چانسلر ہوتا، اس کے علاوہ ڈین اور صدر شعبہ اس کے ممبر ہوا کرتے تھے۔ انھیں تینوں کے مشورے سے تقرری عمل میں آتی تھی۔ راقم نے اپنے زمانے میں جہاں تک ہو سکا نہایت ایمان داری کے ساتھ ان تقرریوں میں وائس چانسلر کی مدد کی اور حق و انصاف کو اپنے ہاتھ سے جانے نہ دیا۔ ایک مرتبہ راقم اور وائس چانسلر مسٹر دشسٹ نرائن رائے کے مسٹر مبین الدین رآز کی تقرری کے سلسلے میں اختلاف پیدا ہو گیا، مسٹر دشسٹ نرائن رائے پٹنہ ہائی کورٹ کے پنشن یافتہ جج تھے اور نہایت ہی مذہبی اور نیک جج انسان تھے راقم کے مشورہ اور گذارش پر میرے ہم خیال ہو گئے اور تقرری ہو گئی۔ اس وقت کا ایک اور واقعہ یاد آ گیا۔ ڈاکٹر کے۔ این پرشاد جو بعد میں پٹنہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر ہوئے تعلیم کے سلسلہ میں کیمبرج یونیورسٹی بھیجے گئے تھے۔ انھوں نے اپنا کام پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے خیال سے مزید تین ماہ کی رخصت کی درخواست دی تو مسٹر دشسٹ نرائن رائے اخراجات کا حساب کتاب لگانے لگے، اور

رخصت منظور کرنے میں پس وپیش کیا مگر راقم کے مشورہ پر رخصت منظوری کر لی۔ اور جو مزید رقم خرچ کے لیے درکار تھی اس کی بھی منظوری دے دی۔

میٹنگ میں شرکت :

ڈین ہو جانے کے بعد راقم کو بہت سی میٹنگ میں شرکت کرنا پڑتی تھی جس سے کلاس لینے میں پریشانی ہوتی کیونکہ اس وقت شعبہ فارسی میں راقم کے علاوہ صرف ایک لکچرر مسٹر قیام الدین حیدر تھے۔ اس لیے میں نے وائس چانسلر سے گذارش کی کہ میٹنگ صبح ۹ بجے سے اور شام کو ۳ بجے کے بعد رکھی جائے کیونکہ اساتذہ کی قلت کے سبب لکچر لینے میں خلل پڑتا ہے۔ چونکہ میرا عذر معقول تھا۔ صاحب موصوف نے میری میٹنگ کے اوقات میں تبدیلی کر دی۔

راقم نے اپنی سہولت کے خیال سے ڈین کے آفس کو شعبہ فارسی کے ایک کمرہ میں منتقل کرالیا اور غالباً یہ آفس آج تک اسی کمرہ میں قائم ہے۔ سری سرجو پرشاد جو ڈین آفس میں میرے اسسٹنٹ تھے وہ بقید حیات ہیں۔

شعبہ کے صدر :

جب راقم ڈین تھا حسب ذیل اساتذہ یونیورسٹی میں اپنے اپنے شعبہ کے صدر تھے :

ہندی : شری جگناتھ رائے شرما (عارضی)، سنسکرت : ڈاکٹر ٹی۔ چودھری، اینشینٹ انڈین ہسٹری اینڈ کلچر : ڈاکٹر بی۔ پی۔ سنہا، انگلش : ڈاکٹر آر۔ کے۔ سنہا، سائیکلوجی : مسٹر ایم۔ زیڈ۔ عابدین، فلوسفی : مسٹر ہری موہن جھا، ہسٹری : ڈاکٹر رام شرن شرما، جغرافیہ : ڈاکٹر پی۔ دیال، اردو : ڈاکٹر سید اختر احمد، عربی : مسٹر حافظ محمد قدوس، فارسی : ڈاکٹر اقبال حسین، اکانومکس : مسٹر دیبا کر جھا، پولیٹیکل سائنس : ڈاکٹر پی۔ ایس۔ مہار، لیبر اینڈ سوشل ویلفیر : مسٹر امرت دھاری سنگھ، سوشیالوجی : ڈاکٹر زبد لیشور پرشاد، میتھیلی : ڈاکٹر سدھاکر جھا، بنگالی : ڈاکٹر ایس این گھوشال۔

بارھواں باب

میری تقرری بحیثیت پرنسپل پٹنہ کالج

۱۹۶۰ء سے ۱۹۶۱ء

میری تقرری :

ڈاکٹر کے۔ کے۔ دت ۱۵۔ اپریل ۱۹۶۰ء کو اپنی پرنسپل کی ملازمت سے پنشن پانے والے تھے، اس لیے پٹنہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر نے راقم کو بلا کر کہا کہ ۱۶۔ اپریل ۱۹۶۰ء سے میں پٹنہ کالج کے پرنسپل کا عہدہ سنبھال لوں۔ میں نے عرض کیا کہ میں مستقل یونیورسٹی پروفیسر ہوں، پرنسپل کے برابر تنخواہ پاتا ہوں اور اس عہدہ کی تبدیلی میں میرا کوئی فائدہ نہیں بلکہ درد سری میں اضافہ ہو جائے گا۔ اگر آپ راقم کو ایک سال کے لیے مع پرنسپل الاؤنس مستقل پرنسپل بنا دیں تو میں خدمت انجام دینے کے لیے تیار ہوں۔ یہ کہہ کر میں ان سے رخصت ہو گیا۔ دو چار دن بعد مجھے پھر وائس چانسلر نے بلایا اور کہا کہ آپ کی شرط منظور ہے، اور مجھ سے پوچھا کہ پٹنہ کالج کے کاموں کے سلسلے میں کیا کیا مسائل در پیش ہوں گے اور کیا کیا خرابیاں کالج میں پیدا ہو گئی ہیں اور اب کن کن اصلاحوں کی ضرورت ہے۔ میں نے ایک مختصر سا خاکہ ان کے سامنے پیش کیا۔ مجھ سے اتفاق کرتے ہوئے وائس چانسلر نے فرمایا کہ میں ہر طرح سے آپ کی مدد کے لیے تیار ہوں۔ جس دن ۱۹۶۰ء کی گرمیوں کی چھٹی ہونے والی تھی میں نے وائس چانسلر کے حکم کے مطابق ڈاکٹر کے۔ کے۔ دت سے پرنسپل کا چارج لے لیا اور بقول اپنے استاد پرنسپل آرمیا پٹنہ کالج کا صرف پرنسپل ہی نہیں بلکہ کالج کا "امیر" اور "خان" بھی ہو گیا۔

عمارتوں کی مرمت :

پرنسپل کا چارج لیتے ہی میرے لیے سب سے اہم اور بڑا مسئلہ کالج کی عمارتوں کی مرمت کا درپیش آیا جو عرصہ دراز سے بے توجہی کا شکار تھیں۔ پٹنہ کالج کی پرانی ڈیچ عمارت، دو ہوسٹل اور پرنسپل کے بنگلہ کی عمارت کے بارے میں میں نے محسوس کیا کہ برسات سے پہلے ہی ان کی مرمت ہو جانی چاہیے۔ اس کام کے لیے راقم سکریٹریٹ جا کر چیف انجنیر حکومت بہار سے ملاقات کی اور انھیں اپنے ساتھ لاکر کالج کی تمام عمارتوں کی کس مپرسی اور خستہ حالی کو دکھایا اور ان سے کہا کہ اس تعطیل کے اندر ہی ان عمارتوں کی مرمت ہونا لازمی ہے کیونکہ اس کے بعد طلبا کی موجودگی سے کام میں بڑی دشواری ہوگی۔ اور نیز برسات کے آنے سے نقصان کا بھی امکان ہے۔ انجنیر صاحب ایک نیک اور شریف انسان تھے انھوں نے فوراً ان عمارتوں کی مرمت بیک وقت شروع کرا دی اور دو ماہ کے اندر ہی اپنی خصوصی توجہ اور موجودگی سے عمارتوں کو ہر طرح سے درست کرا دیا۔ اور وہ دو ہوسٹل جن کی چھتیں رانی گنج ٹائل سے بنی تھیں انکی ایسی مرمت کرائی کہ عرصہ دراز تک برسات ان پر اثر انداز نہ ہوسکی۔ تمام کام ہو جانے کے بعد وائس چانسلر نے معائنہ کی خواہش ظاہر کی تو میں نے انھیں تمام مرمت شدہ عمارتوں کو دکھایا اور موصوف کالج کا بدلا ہوا نقشہ دیکھ کر خوش ہوئے اور انجنیر موصوف کو شکریہ کا ایک خط لکھا۔

فرنیچر کی مرمت :

کالج میں فرنیچر کی قلت تھی اور جو تھے ان کی حالت اچھی نہ تھی۔ میں نے فیصلہ کیا کہ ان کی مرمت جلد ہو جانی چاہیے۔ راقم نے ڈاکٹر کامیشور پرشاد امبسٹھا سے جو میرے ہر کام میں بڑے مددگار رہا کرتے تھے استدعا کی کہ کالج کے بڑے بابو جٹا شنکر جھا اور کالج کے مستری گنگا بشن کو لے کر تمام فرنیچر کا معائنہ کر کے ایک جدید رجسٹر تیار کریں تاکہ ان کی تعداد اور حالت معلوم ہو سکے اور یہ بھی معلوم کیا جا سکے کہ کتنے اور فرنیچر کی ضرورت ہے۔ نئے فرنیچر کی خریداری کے لیے یونیورسٹی نے بہت کم رقم فراہم کی تھی اس لیے میں نے زیادہ توجہ ٹوٹے فرنیچروں کی مرمت پر دی، مرمت کرا کے تمام فرنیچر پر پالش کرایا اور یہ بالکل نئے معلوم ہونے لگے۔ رجسٹر مرتب ہونے کے بعد معلوم ہوا کہ کچھ فرنیچر گم ہیں جو غالباً سابق پرنسپل حضرات کالج سے جاتے وقت اپنے ساتھ لے گئے اس سلسلے میں یہ بھی پتہ چلا کہ پرنسپل کے کمرہ کی ایک نہایت خوبصورت الماری جسے میں نے بارہا دیکھا

تھا گم تھی۔ معلوم ہوا کہ ایک سابق پرنسپل اپنے ساتھ لے گئے ہیں۔ میں نے ان کو ایک خط لکھا کہ کالج کے پرنسپل کے کمرہ کی ایک الماری آپ کے یہاں غلطی سے چلی گئی ہے اسے واپس کر دیں۔ موصوف نے اقرار کرتے ہوئے لکھا کہ آپ اس قسم کی ایک الماری بنوا لیں اور میں اس کی قیمت ادا کر دوں گا۔ میں نے الماری بنوائی اور انھوں نے اس کی قیمت ادا کی۔

فرنیچر کی مرمت کے بعد کالج کی کشتیاں جو طلبا کی تفریح کا ذریعہ تھیں خراب ہو گئی تھیں میں نے ان کو بھی مرمت کرا کے قابل استعمال بنایا۔ میرے زمانے میں گرانٹ کی رقم ۲۵ فیصد کم کر دینے کی وجہ سے بجلی کے پنکھوں اور روشنی میں کچھ اضافہ نہ ہو سکا مگر پنکھوں کی صفائی اچھی طرح سے کرادی گئی۔

کالج کے میدانوں کی نگرانی :

کالج کے سامنے والا کھیل کا میدان، ولسن گارڈن اور عظیم گارڈن خراب ہو گئے تھے۔ پانی کی قلت اور دھوپ کی شدت کی وجہ سے گھاس مردہ ہو کر جل گئی تھی اور یہ میدان گائے اور بکریوں کی چراگاہ بن گئے تھے۔ راقم نے انھیں سیراب کرنے کے لیے کلکتہ کی ڈنلپ کمپنی سے ایک بہت لمبا پانی کا پائپ منگوایا جس کی مدد سے تمام میدان ہرے بھرے ہو گئے اور پھول کی کیاریاں درست کرا کر موسم کے پھول لگوائے۔ موسم برسات اور موسم سرما میں پھول خوب کھلے جس سے کالج کی خوب صورتی اور زینت میں اضافہ ہوا، خصوصاً گلاب کی کیاریاں نہایت ہی دل کش نظر آتی تھیں۔

اپنا طریقۂ کار :

راقم وقت کی پابندی سے کالج جاتا تھا۔ صبح کو تمام ضروریات سے فارغ ہو کر ۹ بجے کالج پہنچ جاتا اور ایک بجے کھانے کے لیے اپنے بنگلہ پر جو سائنس کالج کے احاطہ میں تھا، چلا جاتا، پھر ۳ بجے شام کو کالج جاتا اور ۵ بجے شام تک کل کاموں کو ختم کر کے گھر واپس آجاتا میرے اس طریقۂ کار سے متاثر ہو کر اور وقت کی پابندی کو دیکھ کر تمام لکچرر، پروفیسر اور ملازمین اپنے وقت پر آجاتے تھے۔ بی۔اے آنرس کے کلاس ۹ بج کر ۴۰ منٹ سے شروع ہوتے تھے اس لیے بیشتر ملازمین اور اساتذہ قبل از وقت پابندی سے چلے آتے تھے۔ میں نے اپنے زمانہ میں "Four Hours' Rule" کا پرانا قاعدہ جس پر عمل نہ ہو رہا تھا اس کی پابندی تمام اساتذہ سے کرائی۔ غفلت

برتنے والوں کو مہذب انداز سے اس کی پابندی پر آمادہ کیا۔ اس طرح اساتذہ وقت سے کلاس لیتے اور چھوڑنے میں بھی وقت کی پابندی کرتے۔ طلبا جو ٹیوٹوریل کلاس میں مسلسل دو بار غیر حاضر رہتے ان سے وجہ طلب کی جاتی۔ معقول وجہ نہ ہونے پر صدر شعبہ تادیبی کارروائی کرتا۔ طلبا کی سہولت اور ان کی دشواریوں کو حل کرنے کے خیال سے وقت کی پابندی کے بغیر راقم نے عام اجازت دے رکھی تھی کہ وہ مجھ سے مل کر اپنے مسائل کو حل کر لیں۔ اسی طرح آفس کے عملوں کو بھی ہدایت کر دی گئی تھی کہ اساتذہ اور طلبا کی دشواریاں فوراً دور کی جائیں۔ ایک دو اساتذہ بغیر اطلاع دیئے کالج سے غائب ہو جاتے تھے اور اپنی درخواست پر دستخط کر کے چپراسی کے حوالہ کر دیتے کہ اگر ان کے متعلق دریافت کیا جائے تو یہ درخواست کالج کے دفتر میں داخل کر دی جائے۔ اس طرح کی غیر حاضری سے لکچرس میں خلل پڑتا تھا اور طلبا کلاس میں شور و غل مچاتے۔ اس لیے میں نے ہدایت کی کہ Casual leave کے قاعدہ کی پابندی کی جائے اور تاکید کرا گیا۔ C. کسی بیماری یا اچانک ضرورت کی بنا پر لی جائے تو درخواست گیارہ بجے دن تک آفس میں آجانی چاہیے۔ اگر کسی دوسری ضرورت سے .C.L لینا ہو تو کم از کم دو روز پہلے دفتر کو آگاہ کر دیں تاکہ ان کے کلاس کے لیے کوئی متبادل انتظام کیا جا سکے۔ راقم کے پرنسپل ہونے سے پہلے کچھ اساتذہ پوری توجہ اور مستعدی سے کلاس نہ لیتے تھے۔ میں نے ان کی توجہ اس طرف مبذول کرائی۔ پڑھانے میں پابندی اور مستعدی لانے کے لیے راقم ہفتہ میں ایک دو روز کالج کا چکر لگاتا اور دیکھتا کہ اساتذہ اور طلبا پڑھانے اور پڑھنے میں لاپرواہی اور بے توجہی تو نہیں برت رہے ہیں۔ میرا تجربہ ہے کہ اس عمل سے طلبا اور اساتذہ میں پڑھنے پڑھانے کا ماحول بہتر ہو گیا اور مجھے ان سے کوئی شکایت باقی نہ رہی۔ پڑھائی میں باقاعدگی آجانے کے بعد طلبا کالج کے ٹرمینل امتحانات میں کثرت سے شریک ہونے لگے اور امتحانات کے نتائج بہت جلد شائع کر دیئے جاتے تھے۔ ٹرمینل امتحان کے سلسلے میں مجھ کو ایک بات یاد آگئی جو دلچسپی سے خالی نہیں ہے۔ انگریزی کے ایک جونیر لکچرر ٹرمینل امتحان کی سنو کاپیاں اپنی بغل میں دبائے میرے آفس میں آئے اور احتجاجاً کہا کہ مجھے صدر شعبہ انگریزی نے حکم دیا ہے کہ ان سو کاپیوں کو دیکھ کر اور ان کے نمبروں کو سلپ پر چڑھا کر کل ان کے حوالہ کر دی جائیں۔ ۱۲ گھنٹے کے اندر میرے لیے یہ کام انجام دینا ناممکن ہے۔ میں نے فوراً ان کے لیے ایک پیالی چائے منگوائی اور ہنس کر کہا کہ آپ ایک عملی لکچرر ہیں،

چند گھنٹوں میں اس کام کو انجام دے سکتے ہیں اور آپ کو وقت پر نمبر داخل کرنے میں کوئی دشواری نہ ہوگی۔ یہ کاپیاں تو سال اول کے لڑکوں کی ہیں ان کے دیکھنے میں آپ جیسے قابل آدمی کو کوئی دشواری نہ ہونی چاہیے۔ آپ مہربانی فرماکر میرے چیمبر میں چلے جائیں اور ایک گھنٹہ وہاں آرام سے بیٹھ کر کاپیوں کی جانچ کریں۔ مجھے یقین ہے کہ آپ پچیس تیس کاپیوں کی جانچ ایک گھنٹہ میں ضرور کرلیں گے۔ موصوف ایک گھنٹہ بعد ۲۵ کاپیوں کی جانچ کرکے میرے پاس آئے اور اپنی کارکردگی پر نہایت خوش نظر آرہے تھے۔ جب میں نے ان کی ہمت افزائی کی تو وہ پھر میرے چیمبر میں چلے گئے اور ایک گھنٹہ بعد مزید ۲۵ کاپیوں کی جانچ کرکے اور ان کے مارکس کا اندراج کرکے میرے پاس آئے اور اس طرح سے دو گھنٹے کے اندر میری ہمت افزائی کے سبب اپنا آدھا کام حسن وخوبی انجام دے دیا۔ اس کے بعد وہ اپنے شعبہ میں چلے گئے اور دوسرے دن جانچ کی ہوئی سو کاپیوں کو مع مارکس سلپ صدر شعبہ کے حوالے کردیا۔

طلباء کے کھیل کود کا انتظام :

تمام انتظام کے ساتھ ہی کالج میں کھیل کود کا بھی معقول انتظام کیا گیا۔ اس زمانے میں پروفیسر دیبی داس چیٹرجی Athletic Club کے صدر تھے اور وہ اپنی ذمہ داریوں کو نہایت خوبی سے انجام دیتے۔ گرچہ انھیں میرے مشورہ کی کوئی ضرورت نہ پڑتی تھی مگر موصوف بغیر میری رائے کے کوئی کام نہ کرتے تھے ان کی ایک بڑی خصوصیت یہ تھی کہ کلب کی رقم کو فضول کاموں میں صرف نہ ہونے دیتے تھے۔ طلباء فٹ بال میں سب کھیلوں سے زیادہ دلچسپی لیتے تھے۔ کالج کے کھلاڑیوں کی مہارت کی وجہ سے پٹنہ یونیورسٹی نے اپنی فٹ بال ٹیم میں پٹنہ کالج کے نو کھلاڑیوں کو شامل کر رکھا تھا اور اس ٹیم کا کپتان بھی پٹنہ کالج کا طالب علم تھا۔ اس سال پٹنہ کالج کی ٹیم کو کسی میچ میں شکست نہ ہوئی اور انعامات حاصل کرکے بہار میں بڑی شہرت حاصل کی۔ اس زمانے میں پٹنہ کالج کی کرکٹ ٹیم ایک نہایت شاندار ٹیم تھی۔ باوجود ہر کوشش کے کوئی ٹیم اسے ہرا نہ سکی اس ٹیم کے شاندار کارناموں کو دیکھ کر پٹنہ یونیورسٹی ٹیم میں چھ کھلاڑیوں کو پٹنہ کالج ٹیم سے لیا گیا اور یونیورسٹی ٹیم کے کپتان ہونے کا شرف پٹنہ کالج کے طالب علم ہی کو حاصل ہوا۔ یونیورسٹی کی ہاکی ٹیم میں چھ کھلاڑی پٹنہ کالج کے تھے اور اسی طرح پچاس فی صد کھلاڑی ٹینس ٹیم میں بھی پٹنہ کالج ہی کے تھے۔ راقم پٹنہ کالج کے کھلاڑیوں کی ہر موقع پر تعریف

کیا کرتا اور ان کی ہمت افزائی میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھتا تھا۔ ۱۹۶۱ء کے - Principals' Annual Report : 1961 - میں کھلاڑیوں کی شاندار کامیابی کا تذکرہ راقم نے نہایت ہی تشریح کے ساتھ کیا ہے جس کی ایک کاپی میرے پاس ابھی تک محفوظ ہے۔ میں لڑکوں کی حوصلہ افزائی کے خیال سے اکثر فٹ بال کے مقابلوں میں جایا کرتا اور اپنے ساتھ ایک دو بار استاد محترم پرنسپل سید معین الحق صاحب کو جو کھیل کی دنیا میں نہایت مشہور تھے مدعو کر کے لایا کرتا تھا۔ وہ لڑکوں کی خوب حوصلہ افزائی کرتے اور لڑکے ان سے بہت خوش رہا کرتے تھے۔

ان۔سی۔سی :

۱۹۶۰ء میں جب ان۔سی۔سی کا کیمپ بہٹا میں ہوا تو اس میں پٹنہ کالج کی ٹیم اول آئی اسی طرح سے جب اکتوبر ۱۹۶۰ء میں بمبئی میں مقابلہ ہوا تو ان۔سی۔سی کی بحری ونگ میں رام بینے سنگھ پورے ہندوستان میں دوسرے نمبر پر آئے۔ یہ دونوں کامیابیاں پٹنہ کالج کے لیے بڑی شہرت کی حامل ہوئیں۔

طلبا کی انجمنیں :

اسی زمانے میں کالج کی کل انجمنیں اپنے اپنے کاموں میں نہایت سرگرم عمل رہیں۔ خصوصاً میوزک اینڈ ڈرامہ سوسائیٹی اور بزم ادب۔ ان دونوں انجمنوں نے تین تین انعامات حاصل کیے۔ اور اپنی شاندار روایتوں کو قائم رکھا۔

سائنس کالج کی ہڑتال :

جب راقم پٹنہ کالج کی درستگی کے کاموں میں سخت مصروف تھا کہ اچانک ایک ایسا مسئلہ پیش آیا جس سے راقم کو دور کا بھی سروکار نہ تھا مگر اس کو سلجھانا ہی پڑا۔ ڈاکٹر نگینہ رنافۃ ڈین آف فیکلٹی آف سائنس نے ایم۔ ایس سی کے کچھ طلبا کا نام رجسٹر سے اس لیے خارج کر دیا کہ انھوں نے کالج کی ماہانہ فیس ادا نہ کی تھی اور ان کی جگہ دوسرے لڑکوں کے داخلے کی کارروائی بھی شروع کر دی گئی تھی اس سے طلبا میں غم و غصہ کی لہر دوڑ گئی اور انھوں نے سائنس کالج میں ہڑتال کر دیا اور ڈاکٹر نگینہ رنافۃ کے خلاف نعرے لگائے۔ نیز وائس چانسلر کے یہاں جا کر طلبا نے اپنی شکایتیں پیش کیں۔ وائس چانسلر مسٹر دشست رنائن رائے نے ان سے کہا کہ میں کل پٹنہ کالج کے وِلسن گارڈن میں ۳ بجے شام کو تمام طلبا کو خطاب کروں گا اور وہاں کل معاملات کے حل بھی

نکالے جائیں گے۔ اس کے بعد موصوف نے مجھے ٹیلی فون پر کہا کہ کل ۳ بجے دن کو ولسن گارڈن میں ایک جلسہ کا انتظام کیا جائے تاکہ میں طلباء کو وہاں خطاب کر سکوں۔ میں نے ان سے کہا کہ معاملہ سائنس کالج کا ہے بہتر ہوتا کہ جلسہ کا انتظام وہیں کیا جائے۔ مگر انھوں نے اصرار کیا کہ جلسہ پٹنہ کالج ہی میں ہوگا۔ اس لیے میں نے جلسہ کا باقاعدہ انتظام اپنے کالج میں کر دیا۔ اور اس جلسہ میں اساتذہ کو شرکت کی دعوت بھی دی۔ طلباء کے علاوہ تقریباً دو ہزار دوسرے افراد بھی جمع ہو گئے جن کا یونیورسٹی سے کوئی تعلق نہ تھا۔ ڈاکٹر نگینہ ناتھ خائف ہو کر اس جلسہ میں شریک نہ ہوئے۔ وائس چانسلر نے جوں ہی طلباء سے خطاب کرنا چاہا تو ایک طالب علم نے ان کے ہاتھ سے مائک چھین لیا اور اپنی پریشانیوں کو بیان کرتے ہوئے کہا کہ ڈاکٹر نگینہ ناتھ نے جو کچھ کیا ہے وہ سب آپ کی ذمہ داری ہے۔ چوبیس گھنٹے کے اندر تمام معاملات کو حل کر دیا جائے ورنہ حالات اس سے بھی سنگین تر ہو سکتے ہیں، یا تو آپ رہیں گے، یا ہم سب رہیں گے۔ اس پر راقم نے طلباء کو فضول گوئی سے منع کیا اور کہا کہ تم لوگ اپنا معاملہ حل کرانا چاہتے ہو یا ہنگامہ کرنا۔ اگر اپنی دشواریاں دور کرانا چاہتے ہو تو اپنے معاملہ کو میرے سپرد کر دو اور میں تمھیں یقین دلاتا ہوں کہ فیصلہ مناسب اور تمھارے حسب خواہش ہوگا۔ تم لوگ کل اپنے دس بارہ نمائندوں کو میرے پاس بھیج دو، میں انھیں وائس چانسلر کے آفس لے جا کر کل باتوں کو طے کرا دوں گا۔ پریشان ہونے اور ہنگامہ کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ میرے اس کہنے پر لڑکوں کا غصہ کم ہوا اس کے بعد میں نے جلسہ کے اختتام کا اعلان کر دیا۔ موقع کی نزاکت دیکھ کر وائس چانسلر موصوف کو ان کے موٹر کار میں بٹھا کر ان کے بنگلہ پر چھوڑ آیا۔ اسی رات ڈاکٹر نگینہ ناتھ اور وائس چانسلر کی برادری کے چند پروفیسران نے ان کی رہائش گاہ پر جا کر انھیں مشورہ دیا کہ ڈاکٹر اقبال حسین کی باتوں میں نہ آئیے، وہ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر اپنی ناموری حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ دوسرے دن طلباء میرے پاس آئے اور اپنے مطالبات کی ایک فہرست دی، میں نے ان کے مشورے سے اس میں کچھ تغیر و تبدل کر کے ان کے ساتھ وائس چانسلر کے آفس پہنچا تو دیکھا کہ ڈاکٹر نگینہ ناتھ اور وائس چانسلر کے کچھ حاشیہ نشینان بیٹھے ہوئے ہیں۔ اور ان کو مشورہ دے رہے ہیں کہ لڑکوں سے ملاقات نہ کی جائے۔ میں نے مطالبات کی فہرست کو وائس چانسلر کے حوالہ کیا اور پڑھنے کو کہا۔ موصوف یہ کہتے ہوئے اٹھے کہ اقبال حسین صاحب مجھے آپ پر پورا بھروسہ ہے۔ آپ نے جو کچھ کیا ہوگا، وہ سب ٹھیک ہی ہوگا اور فہرست کا بغیر مطالعہ کیے

اس پر اپنا دستخط ثبت کر دیا اور کاغذ کو راقم کے حوالے کر دیا اور کہا کہ آپ بھی اس پر اپنا دستخط کر دیں۔ روکے مطالبات کی منظوری سے بہت خوش ہوئے پھر میں نے طلبار سے مخاطب ہو کر کہا کہ تم لوگوں نے کل ایک بڑے بزرگ کے ساتھ بدتمیزی کی ہے، اب ان سے معافی مانگو۔ تمام طلبار نے ہاتھ جوڑ کر وائس چانسلر سے معافی مانگی۔ اس پر وائس چانسلر موصوف کی آنکھوں سے آنسو نکل پڑے اور کہا کہ میں نے تم سب طلبار کو معاف کیا۔ تم سب خوش رہو اور علم حاصل کرو۔

وائس چانسلر مسٹر دشست نرائن رائے پٹنہ ہائی کورٹ کے پنشن یافتہ جج تھے نہایت ہی مذہبی منکسر المزاج اور نیک انسان۔ راقم نے انھیں کبھی غصہ ہوتے نہیں دیکھا۔ اپنی زندگی کا بہت کچھ حصہ پانڈی چری آشرم میں گذارا تھا اور شری اروندو گھوش کے خاص مریدوں میں سے تھے۔ مسٹر دشست نرائن کو اپنے گرو شری اروندو گھوش سے بڑی عقیدت تھی۔ ان کے نقش پا کا فوٹو فریم کروا کر اپنی میز پر رکھتے اور اس کو ہر روز دیکھ کر دعا کرتے کہ مجھے مالک حقیقی اپنے گرو کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔

۱۲ راپریل ۱۹۶۱ء کو جب راقم بہار پبلک سروس کمیشن کا ممبر مقرر کیا گیا تو صاحب موصوف میری رہائش گاہ پر مبارک باد دینے کے لیے تشریف لائے اور انھوں نے کہا کہ میں پٹنہ کالج میں ۳۰ اپریل ۱۹۶۱ء تک کام کرتا رہوں کیوں کہ یونیورسٹی کے امتحانات جاری تھے اور طلبار کی یونین کا انتخاب بھی باقی تھا۔ راقم نے ان کے کہنے کے مطابق عمل کیا اور پہلی مئی ۱۹۶۱ء سے بہار پبلک سروس کمیشن میں کام کرنے لگا۔ صاحب موصوف کو میرے دونوں لڑکوں اکبر اور اشرف سے بڑا انس تھا اکبر اس زمانے میں انجینیرنگ کالج کے طالب علم تھے اور اشرف میڈیکل کالج میں تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ ان لوگوں پر صاحب موصوف کی بڑی شفقت رہا کرتی تھی۔

ڈانگے صاحب کی تقریر:

ایک روز اتوار کے دن سویرے جب راقم اپنے بنگلہ پر چند دوستوں کے ساتھ بیٹھ کر باتیں کر رہا تھا کہ میری ملاقات کے لیے ڈاکٹر مہار پانچ چھ کمیونسٹ طلبار کے ساتھ آئے۔ میں نے ان لوگوں کا خیر مقدم کیا اور چائے میں شریک کر لیا۔ جب میں نے ان لوگوں کے آنے کا مقصد دریافت کیا تو مہار صاحب نے فرمایا کہ ایک ہفتہ کے اندر ڈانگے صاحب پٹنہ آنے والے ہیں اور طلبار کی خواہش ہے کہ پولیٹیکل سائنس کی انجمن کے تحت پٹنہ کالج کے جمنازیم میں ان سے ایک تقریر کرائی جائے۔ ہم لوگ آپ سے اس کی اجازت طلب کرنے آئے ہیں۔ جواباً میں نے کہا کہ مسٹر ڈانگے سے میں واقف ہوں،

مجھے نہایت خوشی ہوگی کہ وہ میرے کالج میں آکر تقریر کریں۔ میں ان کی علمیت، شائستگی، تہذیب، اور مستعدی کا قائل ہوں مگر میری دو شرطیں ہیں، پہلی یہ کہ جلسہ کی صدارت میں خود کروں، دوسری یہ کہ ڈانگے صاحب کسی بحث طلب موضوع پر تقریر نہ کریں۔ تقریر کے لیے ایک گھنٹہ کا وقت لے سکتے ہیں۔ کل انتظام میں خود کرا دوں گا اور طلبا کو کسی طرح کی زحمت نہ دوں گا۔ تین دنوں بعد مہار صاحب اور طلبا مجھ سے پھر ملے اور تمام شرائط کو قبول کر کے اپنی خوشی کا اظہار کیا۔ ان لوگوں نے کہا کہ ڈانگے صاحب کی تقریر آدھ گھنٹہ کی ہوگی اور اگر آپ چاہیں تو وقت کو بڑھا بھی سکتے ہیں۔

جب میں نے ڈانگے صاحب سے ٹیلی فون پر باتیں کیں تو انھوں نے فرمایا کہ آپ اطمینان رکھیں، کوئی ایسی بات نہ ہوگی جس سے آپ کو رنجیدہ ہونا پڑے۔ طلبا نے ڈانگے صاحب کی تقریر کی تاریخ، جگہ اور وقت کا اعلان کر دیا مگر تقریر کا کوئی عنوان نہ دیا گیا تھا۔ جب اشتہار تقسیم ہوا تو اس کی ایک کاپی ضلع پٹنہ کے سپرنٹنڈنٹ آف پولس کو ملی جس کو پڑھ کر انھیں خیال گذرا کہ دوران تقریر غیر کمیونسٹ طلبا کچھ ہنگامہ آرائی نہ کریں، اس لیے انھوں نے ٹیلی فون پر مجھ سے دریافت کیا کہ اگر ان کی مدد مجھے درکار ہے تو وہ خوشی سے اس کے لیے تیار ہیں۔ میں نے ان سے کہا کہ آپ اطمینان رکھیں اور مجھ پر بھروسہ کریں مسٹر ڈانگے کی تقریر سے امن عامہ میں کوئی خلل نہ پیدا ہوگا۔ اسی روز میں نے چار پانچ کانگریسی خیال کے طلبا کو اپنے آفس میں بلایا اور ان سے باتیں کیں، یہ سب لڑکے میری ہر مدد کے لیے تیار ہو گئے۔ تقریر ۹ بجے دن کو ہونے والی تھی، میں نے پٹنہ کالج کے بڑے بابو اور چپراسیوں کو حکم کر دیا تھا کہ اس روز ۷ بجے صبح تک جمنازیم کے اندر اور دونوں طرف باہر فرش بچھا دیا جائے۔ چاروں طرف لاؤڈ اسپیکر لگایا جائے اور اس کی نگرانی کے لیے ایک آدمی کو مامور کیا جائے کہ کوئی شخص مائکروفون کے تار کو کاٹ نہ سکے۔ جب راقم سات بجے صبح نیو جمنازیم کے باہر کھڑا تھا کہ کچھ طلبا خوش خوش آئے جس میں کانگریس اور کمیونسٹ دونوں جماعت کے لڑکے تھے، ان طلبا کو میں نے کہا کہ ہوشیار رہیں اور کسی طرح کی کوئی گڑبڑی نہ ہونے دیں۔ ڈانگے صاحب تقریباً پونے ۹ بجے تشریف لائے اور ان کے ساتھ پانچ چھ نامی کمیونسٹ رہنما بھی تھے، میں نے ان سبھوں کو ڈانگے صاحب کے پیچھے ڈائس پر بٹھایا۔ پورا جمنازیم اور ارد گرد کا میدان سامعین سے بھرا ہوا تھا طلبا نے تالیاں بجا کر ڈانگے صاحب کا استقبال کیا۔ ٹھیک ۹ بجے جلسہ شروع ہوا۔ مہار صاحب نے حاضرین سے ڈانگے صاحب کا تعارف کرایا اس کے بعد ڈانگے صاحب نے راقم سے دریافت کیا کہ

کیا میں " Indian Constitution " (دستورِ ہند) پر تقریر کر سکتا ہوں اور کتنی دیر تک اپنی تقریر جاری رکھوں، میں نے کہا کہ آپ Indian Constitution کی خوبیوں اور خامیوں پر تقریر کریں۔ انھوں نے میری درخواست کو قبول کیا اور کہا کہ میں اپنی تقریر آدھ گھنٹہ میں ختم کر دوں گا۔ ڈانگے صاحب نے دستورِ ہند پر ایسی دامنح اور بصیرت افروز تقریر کی کہ طلبا ہمہ تن گوش ہو کر سنتے رہے اور دوران تقریر متاثر ہو کر تالیاں بجاتے تھے۔ جب آدھ گھنٹہ کا وقت ختم ہو گیا تو میں نے ڈانگے صاحب سے استدعا کی کہ تقریر کو مزید پندرہ منٹ تک جاری رکھیں، ڈانگے صاحب جب اپنی تقریر ختم کر چکے تو راقم نے بحیثیت صدر کے ان کا شکریہ ادا کیا اور لڑکوں نے ان کی بصیرت افروز تقریر کو بہت پسند کیا اور مشکور ہوئے۔ ڈانگے صاحب اپنی خوش گفتاری کے لیے مشہور ہیں اور جو بھی ان کی تقریر سنتا ہے ان کا گرویدہ ہو جاتا ہے۔ جلسہ کے دوسرے روز میں نے سنیئر ایس پی کو فون کر کے کہا کہ آپ اتنے بے چین کیوں تھے؟ میں طلبا کے مزاج کو آپ سے بہتر جانتا ہوں آپ نے جو پولس کے جوانوں کو امن وامان برقرار رکھنے کے لیے بھیجا تھا انھوں نے اپنی ہوشیاری کو کام میں لا کر اپنی ٹرک کو پٹنہ کالج کے احاطے سے باہر رکھا اور پولس کی مدد لیے بغیر ہر کام بحسن و خوبی انجام پا گیا۔ ڈانگے صاحب ایک امن پسند انسان ہیں اور مجھے ان کی تقریر سے امن وامان میں کوئی خلل پڑنے کا اندیشہ نہ تھا۔ بہر حال میں آپ کی سعی لاحاصل کا شکر گزار ہوں۔

ڈانگے صاحب کی عمر اب ۸۰ سال سے تجاوز کر چکی ہے۔ انھیں کچھ دن پہلے عوامی خدمات کے صلہ میں "لوک مانیہ تلک اعزاز" عطا کیا گیا ہے۔

ناانصافی :

ڈانگے صاحب غالباً پہلے اور آخری کمیونسٹ دانشور تھے جنھوں نے پٹنہ کالج میں آکر لکچر دیا۔ عرصہ دراز سے پٹنہ کالج کا یہ دستور رہا ہے کہ کانگریسی لیڈر "ہر خرے کر باشد" کو کالج میں مہمان خصوصی بنا کر بلایا جاتا ہے، جاہلانہ تقریر کرتا ہے اور تالیوں کی گونج میں گھر کی راہ لیتا ہے مگر بڑے سے بڑا کمیونسٹ دانش ور کالج میں تقریر کرنے کا حق دار نہیں ہے۔

۱۹۶۱ء کا فاؤنڈیشن ڈے :

۲۴ جنوری ۱۹۶۱ء کو پٹنہ کالج کا فاؤنڈیشن ڈے منایا گیا اس روز کالج کو قائم ہوئے ۹۸ سال ہو چکے تھے۔ طلبا اور اساتذہ کی خواہش تھی کہ فاؤنڈیشن ڈے نہایت دشان وشوکت

سے منایا جائے مگر پٹنہ یونیورسٹی نے اس کام کے لیے جو رقم منظور کی وہ نہایت ناکافی تھی اس لیے راقم نے جشن کے لیے صرف دو روز کا پروگرام مرتب کیا۔ ۲۴ جنوری کو اسپورٹس کے شروع ہونے سے پہلے ان سب کھلاڑیوں نے جو کھیل میں شریک ہونے والے تھے مارچ پاسٹ کرکے راقم کو سلامی دی اور میں نے انھیں چند الفاظ میں مخاطب کرتے ہوئے کھیلوں کی کامیابی کی دعا کی۔ پروفیسر دیبی داس چیٹرجی جو اتھلیٹک کلب کے صدر تھے اپنے رفقار کار کی مدد سے مقابلوں کو نہایت کامیاب بنایا۔ سہ پہر کو وائس چانسلر نے تشریف لاکر کھلاڑیوں کی ہمت افزائی کی اور اسپورٹس کے اختتام پر حاضرین اور کھلاڑیوں کی ناشتہ سے تواضع کی گئی۔

دوسرے روز ۲۵ جنوری کو ولسن گارڈن میں جنرل اسمبلی (جلسہ عام) منعقد کیا گیا، چونکہ سردی کافی تھی اس لیے ڈائس پر ایک نہایت خوب صورت شامیانہ لگایا گیا جس کو پھولوں اور مختلف رنگ کی روشنیوں سے مزین کیا گیا تھا۔ جلسہ کے صدر مسٹر جسٹس خلیل احمد تھے، ان سے پہلے پٹنہ کالج کے کسی اولڈ بوائے نے جنرل اسمبلی کی صدارت نہ کی تھی اور جلسہ کے مہمان خصوصی بہار کے وزیر تعلیم کمار گنگا نند سنگھ تھے۔ کمار صاحب ایک نہایت بلند خیال، مہذب اور ملنسار انسان تھے۔ جلسہ کے شروع ہونے سے پہلے پرنسپل کے کمرے میں صدر اور مہمان خصوصی کے علاوہ تقریباً پچاس معزز حضرات نے دعوت میں شرکت کی اور انھیں پر تکلف ناشتہ کرایا گیا جس کا انتظام پروفیسر زین العابدین نے نہایت خوش اسلوبی سے کیا تھا۔ اس کے بعد کل حضرات ولسن گارڈن میں جمع ہوئے اور راقم نے جلسہ کی کارروائی شروع کرنے کے لیے صدر سے اجازت لی۔ راقم نے پرنسپل کی سالانہ رپورٹ پڑھ کر سنائی جو چھاپ کر تمام حاضرین جلسہ میں پہلے ہی تقسیم کردی گئی تھی۔ شاید یہ پہلا موقع تھا کہ پرنسپل کی سالانہ رپورٹ چھاپ کر تقسیم کردی گئی ہو، اس رپورٹ میں میں نے پٹنہ کالج کی عمارتوں کے متعلق گورنمنٹ کی توجہ دلائی اور گورنمنٹ سے استدعا کی کہ لائبریری، ریڈنگ روم، اور اسمبلی ہال کی عمارتیں تعمیر کی جائیں اور اسی کے ساتھ سائیکولوجی بلوک کو دو منزلہ کردیا جائے، نئے ہوسٹلوں کی تعمیر بھی ضرور کی جائے۔ میں نے اس رپورٹ میں شکایت کی تھی کہ پٹنہ کالج کی عمارت جو ایک تاریخی عمارت ہے اس کو اچھی حالت میں رکھنا گورنمنٹ اور یونیورسٹی کا فرض ہے۔ مجھے اب یہ دیکھ کر خوشی ہوتی ہے کہ گورنمنٹ نے سائیکولوجی بلوک کو دو منزلہ کردیا، لائبریری کی نئی عمارت بھی بنائی گئی، مگر اسمبلی ہال جس کی کالج کو سخت

ضرورت ہے اب تک تعمیر نہ ہو سکا ہے اور کالج کی تاریخی عمارت ہنوز بری حالت میں ہے اور کوئی اس کا پرسان حال نہیں۔ رپورٹ کو ختم کرتے ہوئے راقم نے طلبار کو انگریزی میں مخاطب کیا جس کا اردو ترجمہ حسب ذیل ہے:

"اس سالانہ اجتماع میں آپ کو خطاب اور خیر مقدم کرنے کا مجھے پہلی بار افتخار حاصل ہو رہا ہے اور یہ میرا آخری موقع بھی ہوگا۔ میں نے اپنی بساط کے مطابق ۲۵ برسوں سے زیادہ پٹنہ کالج کی خدمت کی ہے۔ پٹنہ کالج میرے لیے اس کے ماضی، حال اور مستقبل کے پرنسپل اساتذہ اور طلبار کی گویا رفاقت کی مثال ہے۔ افراد سیمیں پردوں پر سایے کی طرح آئیں گے اور گذر جائیں گے لیکن پٹنہ کالج کی باہمی زندگی متعین دماغ اور مقاصد کے تحت ہمیشہ برقرار رہے گی۔ اگلے برس میں ہمارا کالج اپنی زندگی کے سو سال تمام کرے گا اور مجھے یہ کہنے میں فخر محسوس ہو رہا ہے کہ اس سو سالہ مدت میں پٹنہ کالج کی تاریخ گویا ریاست بہار کی تاریخ رہی ہے۔ ہم نے ہمیشہ شاندار خدمات انجام دی ہیں اور پٹنہ کالج علم و تحقیق کا مقدس مقام رہا ہے جہاں ہر فرقہ، مذہب اور گروہ کے لوگ علم کی دیوی کی پرستش کر سکتے ہیں۔ زندگی کے ہر شعبہ میں ہمارے طلبار کار فرما ہیں اور ان کی کارگزاریوں سے ہماری تاریخ تشکیل پا رہی ہے۔ ہمارے کالج کا ماضی شاندار روایات سے روشن ہے، اس کا مستقبل کیا ہوگا، یہ کہنا ذرا مشکل ہے لیکن میں یہ صاف طور سے دیکھ رہا ہوں کہ خیالات کے صحرا میں پٹنہ کالج کی حیثیت ہمیشہ علم و عرفان کے نخلستان جیسی رہے گی اور گنگا کے سیمیں دھاروں کی قربت میں یہ فکر و حسن کی جلوہ گاہ بن کر شاداب و سبز رہے گا۔ اب میں اپنے عزیز طلبا کو ایسے حسین اور مبارک موقع پر اپنی نیک خواہشات اور اچھی دعائیں پیش کرنا چاہتا ہوں۔ آپ ہمیشہ یاد رکھیں کہ آپ ایک عظیم الشان درسگاہ کے طلبار ہیں اس لیے یہ آپ کا فرض ہو جاتا ہے کہ آپ اس کے وقار اور اس کی نیک نامی کو برقرار رکھیں، یہ نہ بھولیں کہ زندگی میں کامیابی کا انحصار علمی کمالات حاصل کرنے سے زیادہ کردار کی پختگی، نیک خصلت اور استوار عادات پر ہوتا ہے۔ آپ کا

جسم کھلاڑی کا ہو مگر روح رشی کی ہو۔ آپ ہمیشہ خوش مزاج رہیں اور اس آرزو و سرگرمی کو مرجھانے نہ دیں جسے اللہ تعالیٰ نے تمام کم سن مردوں اور عورتوں کے دلوں کو بخشی ہے۔ آخر میں میں اپنے خطاب کو فارسی کے ایک عظیم شاعر یعنی حافظ کے ایک مشہور شعر پر ختم کرنا چاہتا ہوں جو یہ ہے:

ہاں مشو امید کہ واقف نئی از سر غیب
باشد اندر پردہ بازیہائے پنہاں غم مخور

ترجمہ: کبھی ناامید نہ ہو کیونکہ تم خدا کے فضل سے آگاہ نہیں ہو یہ ہمیشہ یاد رکھو کہ پس پردہ ہزاروں راز نہاں ہیں۔ اس لیے تم کبھی غمگین نہ ہو۔ خدا انھیں ہمیشہ سلامت رکھے۔

راقم کے سالانہ رپورٹ پڑھنے کے بعد جلسہ کے صدر مسٹر جسٹس خلیل احمد نے طلبا اور طالبات کو تقسیم انعامات و اسناد کیا جس میں آدھ گھنٹہ سے زیادہ کا وقت صرف ہوا۔ اس کے بعد صدر موصوف نے پٹنہ کالج کی خدمتوں کا تذکرہ کرتے ہوئے انگریزا اور ہندوستانی پروفیسروں کو اپنا خراج عقیدت پیش کیا جنھوں نے پٹنہ کالج کی ناموری اور فروغ کے لیے اپنی کوئی کوشش اٹھا نہ رکھی تھی۔ یہ انھیں کی خدمات کا صلہ ہے کہ پٹنہ کالج آج ہندوستان کے مشہور ترین کالجوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ یہاں کے فارغ التحصیل طلبا و زندگی کے ہر شعبہ میں خصوصاً ملازمت، سیاست اور علمی پیشوں میں نظر آئیں گے اور انھوں نے اپنی خدمات کی بدولت سربلندی حاصل کی ہے۔ صدر موصوف نے سب سے پہلے سر سید علی امام کا تذکرہ کیا جن کی کاوشوں کی بدولت ۱۹۱۲ء میں صوبہ بہار عالم وجود میں آیا۔ اسی کے ساتھ سر گنیش دت سنگھ کی تعریف کرتے ہوئے ان کے خدمات کو سراہا جنھوں نے اپنی آمدنی کا بیشتر حصہ قوم کی تعلیم کے لیے وقف کر دیا اور چار لاکھ روپیے کا عطیہ پٹنہ یونیورسٹی کو اعلیٰ تعلیم پر خرچ کرنے کے لیے دیا ہے۔ دوران تقریر صاحب موصوف نے ڈاکٹر سچیدانند سنہا کی بھی تعریف کی جنھوں نے ایک نہایت اچھا کتب خانہ اور انسٹی ٹیوٹ پٹنہ میں قائم کیا ہے۔ پٹنہ کالج کو اپنے ان سپوتوں پر ناز ہے اور ان کے کارنامے ناقابل فراموش ہیں۔ آخر میں موصوف نے فرمایا کہ پٹنہ کالج کی تاریخ درحقیقت بہار کی تاریخ ہے جس پر ہم لوگ جتنا بھی فخر کریں کم ہے۔ اور اپنے خطبہ کو دعا پر ختم کیا۔

جب صدر اپنا خطبہ ختم کر چکے تو حاضرین جلسہ میں تین حضرات نے ان کا شکریہ ادا کیا

اکبر حسین صاحب جو اس زمانہ میں پٹنہ یونیورسٹی کے خزانچی کے عہدے پر مامور تھے فرمایا کہ پٹنہ کالج کے اولڈ بوائے ہونے کی حیثیت سے میرا یہ فرض ہے کہ مجھ سے جو کچھ بھی ممکن ہو سکے پٹنہ کالج کے لیے کروں۔ پرنسپل نے جو اپنی رپورٹ میں پٹنہ کالج کی ضروریات کی فہرست پیش کی ہے، میں ان کی طرف چانسلر اور وائس چانسلر کی توجہ مبذول کراؤں گا اور امید ہے کہ اس کا نتیجہ اچھا نکلے گا۔ اس کے بعد رائے برج راج کرشن جو پٹنہ یونیورسٹی کے سنیٹ اور سنڈیکیٹ کے بااثر ممبر تھے انھوں نے اپنی تقریر میں یاد دہانی کرائی کہ اس سال کے بجٹ میں پٹنہ یونیورسٹی کافی رقم پٹنہ کالج کی ترقیات کے لیے رکھے گی۔ سب سے آخر میں مسٹر سید حیدر امام بیرسٹر نے شکریہ ادا کیا اور اپنے زمانے کے طلبا اور چند مشہور واقعات کو یاد دلاتے ہوئے ان اساتذہ کا تذکرہ کیا جنھوں نے پٹنہ کالج کے نام کو روشن کیا ہے۔ موصوف کی تقریر کے بعد جلسہ کی کارروائی ختم ہو گئی۔

راقم نے پبلک ریلیشن ڈیپارٹمنٹ سے فوٹو گرافر بلا کر فونڈیشن ڈے کی کل کارروائیوں کی تصویریں لیں جن میں سے چند تصویریں میرے پاس اب تک بطور یادگار موجود ہیں۔ اس کے علاوہ کل کارروائیوں پر مبنی ایک رنگین فلم تیار کی گئی تھی جس کی نمائش کالج میں کی گئی اور لڑکوں نے اس فلم کو نہایت شوق سے دیکھا اور پسند کیا۔ معلوم نہیں یہ یادگار رنگین فلم پٹنہ کالج میں اب تک محفوظ ہے یا ضائع کر دی گئی۔

رسل لکچر:

جیسا کہ پہلے ذکر کیا جا چکا ہے چارلس رسل جو پٹنہ کالج کے پرنسپل تھے ان کی یاد میں ایک لکچر دیا جاتا ہے جو رسل لکچر کے نام سے مشہور ہے۔ تقریباً سات سال سے یہ لکچر نہیں دیا گیا تھا، اس لیے میں نے وائس چانسلر مسٹر دسسٹ نراین رائے سے اس لکچر کے دیے جانے کے متعلق باتیں کیں۔ انھوں نے مشورہ دیا کہ صاحب موصوف اور راقم اس سلسلہ میں ڈاکٹر ذاکر حسین سے، جو اس زمانے میں چانسلر تھے مل کر تمام باتوں کو طے کر لیں۔ ایک ہفتہ بعد صاحب موصوف اور میں ڈاکٹر ذاکر حسین سے پٹنہ کے راج بھون میں جا کر ملاقات کی اور ان سے استدعا کی کہ کسی ایسے ممتاز شخص کا نام تجویز کریں جو اپنی علمی صلاحیت کے لیے بین الاقوامی شہرت رکھتا ہو۔ ڈاکٹر ذاکر حسین نے برجستہ پروفیسر ہمایوں کبیر کا نام تجویز کیا جو اس زمانے میں حکومت ہند کے وزیر تھے اور اپنی قابلیت کے لیے بہت مشہور تھے۔ راقم کو یہ نام بہت پسند آیا کیونکہ پروفیسر ہمایوں کبیر میرے عزیز

دستوں میں تھے اور میں ان کی بڑی قدر کرتا تھا سو ڈاکٹر ذاکر حسین نے پروفیسر موصوف کو خط لکھ کر اس کام کے لیے راضی کیا اور ان کے لکچر کی تاریخ ۱۶ اپریل ۱۹۶۱ء مقرر کرائی۔ تقریر کا موضوع "مرزا ابوطالب خان" تھا۔ لکچر کا معاوضہ پانچ سو روپیہ تھا اور اس معاوضہ کے علاوہ آمد و رفت کا خرچ بھی دیا جاتا تھا۔ یہ رقم رسل میموریل فنڈ سے ادا کی جاتی تھی۔ مسٹر دستشٹ نرائن رائے نے وعدہ کیا لکچر کے دن حاضرین کو جو دعوت دی جانے والی تھی اس کا کل خرچ یونیورسٹی کے فنڈ سے ادا ہوگا اور یہ بھی کہا کہ لکچر کی طباعت میں جو خرچ ہوگا یونیورسٹی برداشت کرے گی۔ پروفیسر ہمایوں کبیر کا لکچر ۱۶ اپریل ۱۹۶۱ء کو ساڑھے چار بجے پٹنہ کالج کے ولسن گارڈن میں ہوا جس کی صدارت ڈاکٹر ذاکر حسین نے کی۔ راقم نے پروفیسر ہمایوں کبیر کا خیر مقدم کرتے ہوئے صاحب موصوف کا شکریہ ادا کیا کہ انھوں نے اس گرمی کے موسم میں تشریف لاکر ہم لوگوں کو اپنی عالمانہ تقریر سننے کا موقع دیا۔ پروفیسر ہمایوں کبیر نے اپنے لکچر کے افتتاح میں فرمایا کہ مرزا ابوطالب خاں ایک نہایت ذہین اور عاقل انسان تھے جنھوں نے مختلف موضوعات پر کتابیں لکھی ہیں۔ شاعر بھی تھے اور ان کا دیوان انگریزی زبان میں ترجمہ ہوکر ۱۸۰۷ء میں لندن میں شائع ہوا ہے۔ انھوں نے اپنا سفرنامہ بھی لکھا ہے مگر حیثیت ایک مورخ کے وہ کافی شہرت کے حامل ہیں۔ وہ ۱۷۵۲ء میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے اور اپنے دوست کیپٹن ڈیوڈ رچرڈسن کے ساتھ ۱۷۹۹ء میں برطانیہ گئے جہاں وہ ۱۸۰۲ء تک قیام پذیر رہے۔ بعد میں انھوں نے فرانس، اٹلی، ٹرکی اور عراق کا سفر کرکے ۱۸۰۳ء میں ہندوستان واپس آئے۔ ۹۲-۱۷۹۱ء میں انھوں نے اپنی کتاب خلاصۃ الافکار تصنیف کی جس میں پانچ سو قدیم اور جدید شعرا کا تذکرہ ہے۔ ۱۸۰۴ء میں مرزا ابوطالب خاں نے علم ہیئت پر ایک کتاب تصنیف کی جو قابل تعریف ہے۔ انگریزوں کے متعلق ان کا خیال تھا کہ ان میں مذہبیت کی کمی ہے، ان کے مزاج میں بیجا غرور ہے، اور دوسری قوموں کی رسم و رواج کو نہایت حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ مگر ان کی حب الوطنی، قومی کاموں میں سرگرم رہنا اور سائنس کو ترقی دینا ان کی بڑی خوبیاں ہیں۔ مرزا ابوطالب خاں آئرلینڈ کے باشندوں کی غربت کا تذکرہ کرتے ہوئے رقمطراز ہیں کہ انھیں ایسے لوگوں سے ملاقات ہوئی جن کے پاس اتنی رقم بھی نہ تھی کہ جوتے خرید سکیں اور یہ لوگ سردی کے ایام میں بھی ننگے پاؤں سنگلاخ راستوں پر چلتے تھے۔ مرزا ابوطالب خاں کا خیال تھا کہ حکمرانوں کی عیش پرستی اور فضول خرچی حکومتوں کے زوال کا سبب ہوتی ہیں اور وہ رومیوں کی سلطنت یورپ میں اور مغلوں کی سلطنت ہندوستان

میں مثال کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ ہمایوں کبیر صاحب نے لکچر کے آخر میں کہا کہ مرزا ابوطالب خاں نے ان سب اصولوں کو نہایت تشریح کے ساتھ بیان کر دیا ہے جنھیں کارل مارکس نے پچاس برس کے بعد دنیا کے سامنے پیش کیا۔ ابوطالب خاں کی وفات ۱۸۰۶ء میں ہوئی۔ ہمایوں کبیر صاحب کا ابوطالب خاں پر عالمانہ انگریزی لکچر کتابی شکل میں پٹنہ یونیورسٹی نے ۱۹۶۱ء میں شائع کیا ہے۔

لکچر کے اختتام پر ڈاکٹر ذاکر حسین نے پروفیسر ہمایوں کبیر کی خوبیوں کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا کہ ہندوستان میں کون ایسا آدمی ہے جو ان سے واقف نہیں ہے۔ وہ فلسفی ہیں، شاعر ہیں، مورخ ہیں، اور ایک نہایت نامور دانشور۔ قوم کی خدمت کے لیے سیاست میں آئے ہیں اور اپنی انتھک کوششوں سے دنیا کے قوموں میں ہندوستان کا درجہ بلند کر رہے ہیں۔

لکچر کے ختم ہونے کے بعد ڈاکٹر ذاکر حسین اور پروفیسر ہمایوں کبیر کے ساتھ اساتذہ اور معزز حاضرین جلسہ پٹنہ کالج کے نیو جمنازیم میں تشریف لے گئے جہاں پٹنہ یونیورسٹی کی طرف سے ایک نہایت پرتکلف دعوت دی گئی جس میں وائس چانسلر نے نہایت خوش اسلوبی سے میزبانی کے فرائض انجام دیے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب نے رات کے کھانے پر دس حضرات کو مدعو کیا جس میں راقم بھی شریک تھا۔ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب ایک نہایت خوش گفتار انسان تھے۔ انھوں نے ابوطالب خاں کے متعلق کچھ ایسی باتیں کہیں جن سے ہم لوگ واقف نہ تھے۔

دوسرے دن پروفیسر ہمایوں کبیر دہلی واپس چلے گئے۔ جب پانچ سو روپیہ معاوضہ کی رقم راقم نے پیش کی تو وہ اس کو لینے کے لیے تیار نہ تھے مگر میرے بہت اصرار پر معاوضہ کی رقم قبول کر لی۔ قبل اس کے کہ پٹنہ کالج کی داستان ختم کی جائے یہ بیجا نہ ہوگا کہ راقم ان اساتذہ کا شکریہ ادا کرے جن کے ساتھ راقم نے ۲۵ سال تک شعبۂ عربی، فارسی اور اردو میں خدمات انجام دی ہیں ان کے اسماء گرامی یہ ہیں **شعبۂ عربی:** ۱۔ ڈاکٹر علی حسن، ۲۔ کپتان محمد اسماعیل، ۳۔ ڈاکٹر سید احمد ۴۔ حافظ محمد قدوس **شعبۂ فارسی:** ۱۔ پروفیسر عبدالمنان بیدل، ۲۔ پروفیسر حافظ شمس الدین احمد ۳۔ پروفیسر عبدالمجید، ۴۔ پروفیسر سید حسن، ۵۔ پروفیسر افسر الدولہ فیاض الدین حیدر، ۶۔ ڈاکٹر محمد صدیق، ۷۔ پروفیسر سید شاہ عطاء الرحمٰن۔

شعبۂ اردو: ۱۔ پروفیسر سید نجم الہدیٰ، ۲۔ ڈاکٹر اختر احمد اورینوی، ۳۔ ڈاکٹر سید صدرالدین احمد، ۴۔ ڈاکٹر ممتاز احمد، ۵۔ پروفیسر حسین مظہری۔

پٹنہ کالج سے علیحدگی :

رسل لکچر ختم کرانے کے بعد راقم کو پٹنہ کالج چھوڑنے کے لیے صرف دو ہفتے باقی رہ گئے تھے جن میں تمام کاموں کو ختم کر دینا تھا۔ میں نے حتی الوسع باقی کاموں کو نہایت ہی ذمہ داری سے انجام دیا۔ ۳۰ اپریل ۱۹۶۱ء کو مسٹر دشست نرائن رائے وائس چانسلر پٹنہ یونیورسٹی نے ڈاکٹر پرمیشور دیال جو صدر شعبہ جغرافیہ تھے انھیں میرے پاس بھیجا کہ مجھ سے پرنسپل کے عہدے کا چارج لے لیں۔ میں نے چارج شیٹ پر صاحب موصوف کا دستخط کرایا اور اپنا دستخط بھی اس پر ثبت کر کے پٹنہ کالج کے بڑے بابو کو کاغذ حوالہ کر دیا۔ ان الماریوں کی کنجیاں جن میں ضروری کاغذات بند تھے ڈاکٹر پرمیشور دیال کو دے دیا۔ اور ہر بابو اور ہر چپراسی سے معانقہ کر کے پٹنہ کالج کو الوداع کہا۔ ۱۹۲۴ء میں راقم بحیثیت طالب علم پٹنہ کالج میں داخل ہوا تھا اور ۳۰ اپریل ۱۹۶۱ء تک یہاں مختلف خدمات انجام دیتا رہا۔ پٹنہ کالج سے میرا ایک روحانی تعلق تھا اس لیے اس کے چھوڑنے کا مجھے بڑا صدمہ ہوا۔ اپنے بنگلہ پر جا کر اللہ کا شکر ادا کیا کہ ۲۵ سال کی سرکاری ملازمت عزت و وقار کے ساتھ ختم ہوئی۔

راقم نے ہر مذہب اور ہر فرقے کے لوگوں کے ساتھ کالج اور یونیورسٹی میں ۲۵ سال تک خدمت انجام دی۔ مگر اس لمبی مدت میں اپنے رفقاء سے کسی موقع پر اختلاف کی نوبت نہ آئی اور یہ میرے لیے بڑے فخر کی بات ہے۔ شاگردوں کی بے پایاں محبت ہمیشہ میرے ساتھ رہی اور آج بھی جب اپنے پرانے شاگردوں سے کہیں ملاقات ہو جاتی ہے تو یہ لوگ راقم سے نہایت محبت، خلوص، اور احترام سے پیش آتے ہیں۔

میری ایک خواہش جو پوری نہ ہو سکی :

ملازمت کی ابتدا میں راقم نے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ پنشن پانے کے بعد اپنے گاؤں نیورہ جا کر رہوں اور دیہاتی زندگی بسر کروں۔ والد صاحب نے میرے اس خیال سے متفق ہو کر نیورہ کا وسیع مکان قانونی طور سے میرے نام منتقل کر دیا مگر میری یہ دیرینہ تمنا پوری نہ ہو سکی۔ بہار کی کانگریسی حکومت نے زمینداری کا خاتمہ کر دیا اور ہم لوگوں کے لیے جو متوسط طبقے کے زمیندار تھے روز روز کی بڑھتی ہوئی بدامنی کے سبب دیہاتوں میں رہنا غیر ممکن ہو گیا۔ حالات سے تنگ آ کر راقم نے پٹنہ میں اپنا ایک رہائشی مکان تعمیر کرایا جس میں زندگی گزر رہی ہے۔

تیرھواں باب

بہار پبلک سروس کمیشن کی ممبری

(۱۹۶۱ء سے ۱۹۶۵ء)

مسلم ممبر کی جگہ :

راقم جب ۱۹۶۰ء میں پٹنہ کالج کا پرنسپل مقرر ہوا تو اس زمانہ میں بہار پبلک سروس کمیشن میں ایک ممبر کی جگہ خالی تھی۔ مسٹر محمد یحییٰ جو کمیشن میں مسلم ممبر تھے تقریباً دو سال پہلے اپنی ملازمت کی مدت پوری کر کے جا چکے تھے اور ایک مسلم ممبر کی تلاش تھی۔ کئی پنشن یافتہ مسلم افسران اس جگہ پر اپنی تقرری چاہتے تھے اور وزیر اعلیٰ اور دوسرے وزراء کے یہاں جا کر اپنے کو اس عہدہ کا حقدار بتاتے تھے۔ میں نے نہ کہیں جا کر پیروی کی اور نہ کسی سے اپنی خدمات کا تذکرہ کیا۔ راقم پوری عمر معلم کی زندگی بسر کرتا رہا تھا اور اس کی تمنا صرف یہ تھی کہ کچھ دنوں اور پٹنہ کالج میں بحیثیت پرنسپل رہ جائے۔ ڈاکٹر مہابیر پرشاد وائس چانسلر پٹنہ یونیورسٹی اور سردار سرن سنگھ سکریٹری محکمہ تعلیم کی بھی یہی خواہش تھی کہ میں ۳۰ اپریل ۱۹۶۱ء کے بعد بھی کچھ برسوں تک پٹنہ کالج کا پرنسپل رہوں۔ اس زمانے کے وزیر تعلیم میرے سخت مخالف تھے اور ۳۰ اپریل ۱۹۶۱ء کے بعد مجھے پرنسپل کے عہدہ پر توسیع مدت دینے کے لیے تیار نہ تھے اور ایک حکم صادر کر کے مجھے پہلی مئی ۱۹۶۱ء سے پٹنہ کالج کی خدمات سے سبکدوش کر دیا۔ مجھے اس حکم سے کوئی مالی نقصان کا اندیشہ نہ تھا کیونکہ نئے قاعدہ کے مطابق میں ۶۲ برس کی عمر تک یونیورسٹی پروفیسر رہ سکتا تھا۔

ڈاکٹر سری کرشن سنگھ سے میری باتیں :

اس زمانہ میں ڈاکٹر سری کرشن سنگھ بہار کے وزیر اعلیٰ تھے۔ موصوف نے شری لاجن دھاری سنگھ سے جو بہار پبلک سروس کمیشن کے چیئرمین رہ چکے تھے، مشورہ کیا کہ اس جگہ

برعکس مسلمان کی تقرری کی جائے۔ مسٹر راجن دھاری سنگھ نے برجستہ راقم کا نام پیش کیا اور وزیر اعلیٰ کے یہاں دوسرے دن میری طلبی ہوئی۔ جب میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا تو موصوف نے مجھ سے دریافت کیا کہ کیا میں بہار پبلک سروس کمیشن کا ممبر ہونا قبول کروں گا؟ میں نے وزیر اعلیٰ سے جواب کے لیے دو روز کی مہلت طلب کی اور گھر واپس چلا آیا۔ دوسرے روز راج بھون جاکر میں نے ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب سے جو اس زمانہ میں بہار کے گورنر تھے کل باتیں عرض کردیں۔ صاحب موصوف نے مشورہ دیا کہ میں اپنی منظوری بلا تاخیر وزیر اعلیٰ کو دے دوں۔ اسی شام میں نے اپنے دوست پروفیسر ہمایوں کبیر کو جو اس زمانے میں حکومت ہند کے وزیر تھے اس ملازمت کے متعلق ٹیلی فون پر باتیں کیں، جواباً انھوں نے کہا کہ میں دو چار روز میں پٹنہ آنے والا ہوں۔ مجھے راج بھون میں بلایا اور ذاکر صاحب نے پروفیسر ہمایوں کبیر سے باتیں کر کے یہ فیصلہ کیا کہ میں ڈاکٹر شری کرشن سنگھ کو اپنی رضامندی سے آگاہ کر دوں۔ ڈاکٹر سری کرشن سنگھ سے ہمارے والد مرحوم کے بڑے اچھے مراسم تھے اور صاحب موصوف مجھ پر بہت مہربان رہا کرتے تھے۔ جب میں نے صاحب موصوف کو اپنی رضامندی لکھ کر دے دی تو وہ بہت خوش ہوئے۔ فوراً بہار پبلک سروس کمیشن کی فائل کو منگا کر انھوں نے راقم کے نام کو غیر رسمی طریقے سے زرد کاغذ پر لال پنسل سے لکھ کر متعلقہ فائل میں رکھ دیا اور مجھے یقین دلایا کہ تقرری کا حکم بہت جلد صادر کر دیا جائے گا۔ ڈاکٹر سری کرشن سنگھ سے راقم کی یہ آخری ملاقات تھی۔ اس ملاقات کے کچھ دنوں بعد ڈاکٹر سری کرشن سنگھ کانگریس کے جلسہ میں شرکت کے لیے پٹنہ سے جا رہے تھے کہ کلکتہ میں اچانک سخت بیمار پڑ گئے۔ ایک ماہ تک وہیں علاج ہوتا رہا مگر کوئی افاقہ نہ ہوا، اور پٹنہ واپس لائے گئے۔ یہاں آکر چند دنوں بعد قضا کر گئے۔ ان کی موت سے مجھے سخت صدمہ ہوا اور ان کی آخری رسومات میں راقم ہر جگہ شریک ہوا۔ میرے مخالفوں کو یقین ہو گیا کہ ڈاکٹر سری کرشن سنگھ کی موت کے ساتھ میری تقرری کا معاملہ بھی ختم ہو گیا اور ان حضرات نے پھر اپنی دوڑ دھوپ شروع کر دی۔ راقم نے بھی اپنے ذہن سے اس معاملہ کو نکال دیا۔

پنڈت بنود انند جھا کا وزیر اعلیٰ ہونا اور میرا انتخاب :

ڈاکٹر سری کرشن سنگھ کے بعد شری بنود انند جھا بہار کے مستقل وزیر اعلیٰ منتخب ہوئے۔ یہ نہایت ہی پاک صاف قسم کے انسان تھے اور راقم ان کا بڑا احترام کرتا تھا۔ صاحب موصوف سے میری

ملاقات کچھ عرصہ سے تھی۔ ان دنوں پروفیسر بتیا نند مشرا پٹنہ کالج کے احاطہ میں رہا کرتے تھے اور شری بنود انند جھا سے ان کے بڑے اچھے تعلقات تھے۔ وزیر اعلیٰ موصوف پروفیسر بتیا نند مشرا کے یہاں اکثر آیا کرتے تھے۔ پروفیسر بتیا نند مشرا اور دوسرے دوستوں کے مشورے سے میں نے پنڈت بنود انند جھا سے ان کی رہائش گاہ پر جاکر ملاقات کی۔ انھوں نے اپنے پی۔اے کو بلاکر کہا کہ ایک ہزار فائل جو شری بابو کے یہاں سے آئی ہیں ان میں بہار پبلک سروس کمیشن والی فائل کو لاؤ۔ وہ فائل لے کر آئے اور کہا کہ یہ فائل مجھے بہت جلد مل گئی۔ پیلے رنگ کا غیر رسمی کاغذ جس پر شری بابو نے سرخ پنسل سے میرا نام لکھا تھا سب سے اوپر فائل میں رکھا ہوا تھا اس کو دیکھ کر پنڈت جی خوش ہوئے اور انھوں نے فرمایا کہ شری بابو کی خواہش کو میں ضرور پورا کروں گا اور آپ اطمینان رکھیں۔ میں اسی ہفتہ میں اس کاغذ کو کیبینیٹ کے جلسہ میں پیش کروں گا اور تمھاری تقرری بھی ضرور ہو جائے گی۔ وزیر صحت شری کابیر چند پٹیل جو تمھارے دوست ہیں اس کی خبر تمھیں دے دیں گے۔ اس روز میں پنڈت جی کے یہاں بہت تھوڑی دیر تک ٹھہرا، کیونکہ موصوف کسی شادی کی تقریب میں شرکت کو جا رہے تھے۔ پنڈت جی نہایت باوضع انسان تھے اور جس شادی میں شریک ہوتے کچھ نہ کچھ تحفہ ضرور لے کر جاتے۔ جب میری تقرری کیبینیٹ سے منظور ہو گئی تو مسٹر بیر چند پٹیل نے کچھ مٹھائیاں اپنے چپراسی کے معرفت میرے پاس بھیجیں جس سے میں سمجھ گیا کہ میری تقرری ہو گئی ہے۔ دوسرے روز مسٹر بیر چند پٹیل کی رہائش گاہ پر جاکر ان کا شکریہ ادا کیا اور کئی روز بعد پنڈت جی سے مل کر ان کی دعائیں لیں۔

میری تقرری کا حکم نامہ:

۱۲۔ اپریل ۱۹۶۱ء کو حکومت بہار نے اعلان کیا کہ دستور ہند کے آرٹیکل نمبر ۳۱۶ کے مطابق گورنر بہار نے راقم کو بہار پبلک سروس کمیشن کا ممبر مقرر کر دیا۔ دوسرے روز میری تقرری کی خبر انگریزی اور اردو اخباروں میں شائع ہوئی۔ راقم کی تقرری پر اردو اخبار "صدائے عام" نے ایک اداریہ لکھا جو حسب ذیل ہے:

ڈاکٹر اقبال حسین کا نیا عہدہ

اس خبر سے کہ جناب ڈاکٹر اقبال حسین پرنسپل پٹنہ کالج کو بہار پبلک سروس کمیشن کا ممبر مقرر کیا گیا ہے، تمام حلقوں میں بجا طور پر اظہار مسرت ہوگا۔ وہ ہر لحاظ سے اس جلیل القدر عہدہ کے مستحق تھے۔ حق بحقدار رسید۔ ہم ڈاکٹر صاحب

موصوف کو اس کامیابی پر تہہ دل سے مبارکباد پیش کرتے ہیں، اور یہ امید کرتے ہیں کہ جس طرح مختلف عہدوں پر وہ اپنے فرائض حسن وخوبی سے انجام دے کر تمام طبقوں میں مقبول رہے ویسے ہی پبلک سروس کمیشن کے ممبر کی حیثیت سے بھی شہرت اور مقبولیت حاصل کریں گے۔ جناب اقبال حسین اپنی انتظامی صلاحیت کے لیے اتنے ہی مشہور رہیں جتنے اپنے تعلیمی و تدریسی تجربوں کے لیے۔ تعلیمی حلقوں نے ان کو برابر ہی اچھا معلم، اچھا ادیب، اچھا مفکر اور اچھا منتظم سمجھا۔ ان کی قابلیتوں اور صلاحیتوں کا مختلف صورتوں سے دور و نزدیک شہرہ ہوا۔ انعامی اور امتیازی وظیفے اور عہدے بھی پیش ہوئے۔ کسی کو انھوں نے قبول کیا اور کسی کو ذاتی مصلحت کی بنا پر رد کر دیا۔ صاف گو، انصاف پسند، خوش اخلاق اور خوش گفتار ہیں۔ جہاں بیٹھے ہیں لوگوں کو اپنی طرف کھینچ لیتے ہیں۔ منکسر مزاج ہیں۔ بڑے سے بڑا عہدہ ان کی رفتار و گفتار میں فرق نہیں لا سکا۔ شکایتوں کو سننا اور خرابیوں اور خامیوں کو دور کرنا انھوں نے برابر اپنا شیوہ بنایا۔ بڑی خوبی یہ ہے کہ بے خوف ہیں۔ لگی لپٹی نہیں رکھتے۔ درباروں سے ہمیشہ دور رہے۔ کوشش و پیروی سے نہیں بڑھے۔ پٹنہ یونیورسٹی سے ڈین آف آرٹس باتفاق رائے چنے گئے۔ ان کی اس کامیابی نے فارسی، عربی اور اردو کے شعبوں کا نام اونچا کر دیا۔ اس مزید کامیابی سے ان شعبوں کے نام میں اور بھی چار چاند لگ گیا۔"

کمیشن کی ممبری کا عہدہ سنبھالا:

پہلی مئی ۱۹۶۱ء کو راقم نے پبلک سروس کمیشن کے دفتر میں جا کر ممبری کا عہدہ سنبھالا۔ مسٹر کے۔ ایس۔ وی۔ رمن کمیشن کے چیرمین تھے۔ ان کے علاوہ مسٹر بی۔ ایم۔ کے۔ سنہا اور مسٹر رام جیون سنگھ ممبران تھے۔ مسٹر بی۔ ایم۔ کے۔ سنہا انگریزی کے پروفیسر، پرنسپل اور بہار یونیورسٹی کے رجسٹرار رہ چکے تھے۔ راقم ان سے خوب واقف تھا۔ دوسرے ممبر مسٹر رام جیون سنگھ تھے جو ضلع اور سیشن جج کے عہدہ سے پنشن پا کر کمیشن میں آئے تھے۔ راقم ان سے بالکل واقف نہ تھا۔ کمیشن کے سکریٹری مسٹر جون لال تھے جنھوں نے پٹنہ کالج سے ۱۹۲۶ء میں راقم کے ساتھ بی۔ اے پاس کیا تھا اور اے ڈی ایم ہو کر پنشن پائی تھی۔ جب میں کمیشن آفس پہنچا تو مسٹر جون لال نہایت خوش خوش میرے استقبال

کے لیے آئے اور مجھے ایس وی رمن کے کمرے میں مجھے لے گئے۔ رمن صاحب سے میں خوب واقف تھا۔ نہایت دل چسپ آدمی تھے۔ بہار کے چیف سکریٹری کے عہدہ سے پنشن پاکر بہار پبلک سروس کمیشن کے چیئرمین مقرر کیے گئے تھے۔ صاحب موصوف بہت اچھی انگریزی لکھتے اور بولتے تھے۔ فائلوں پر مختصر نوٹ لکھتے اور اکثر ان کی تحریر ایسی بدخط ہوتی کہ راقم کے لیے پڑھنا دشوار ہو جاتا تھا۔ اکثر ہندو امیدوار جو دیہاتوں سے آتے انگریزی الفاظ کو نہایت ہی برے طور سے ادا کرتے تھے۔ "Is" کو "Ij"، "Was" کو "Waj" اور "Because" کو "Becauje" بولتے تھے۔ انگریزی تلفظ کی بے شمار غلطیاں کیا کرتے تھے۔ ایسے امیدواروں کو صاحب موصوف "مسٹر بیکاؤج" (Mr. becauje) کے نام سے مخاطب کرتے تھے۔ راقم بہار میں اب تک اچھے اچھے افسروں کو "راج" "واج" "بیکاؤج" کہتے ہوئے سنتا ہے۔ صاحب موصوف نہایت ہی ملنسار، خوش مزاج اور غیر متعصب انسان تھے۔ وقت کے بڑے پابند تھے اور آفس کبھی بھی دیر کر کے نہ آتے تھے۔ سگریٹ خوب پیتے تھے اور انھیں باغبانی کا بڑا شوق تھا۔ موصوف کے زمانے میں پبلک سروس کمیشن کا احاطہ ہر طرح کے موسمی پھولوں سے سالوں بھر گلزار رہتا تھا۔ ہم لوگ جاڑوں میں امیدواروں کا انٹرویو میدان میں لیا کرتے تھے جہاں ارد گرد طرح طرح کے پھول کھلے رہتے تھے۔ موصوف وزیر اعلیٰ یا کسی دوسرے وزیر کے یہاں بغیر بلائے نہ جایا کرتے تھے۔ اگر کوئی وزیر یا بڑا آدمی ان سے کسی امیدوار کے متعلق پیروی کرتا تو اس کا کوئی اثر ان پر نہ ہوتا تھا۔ انگریزی راج کے پرانے واقعات کو نہایت دل چسپ انداز سے راقم کو سنایا کرتے تھے۔ کتابوں کے پڑھنے کا بڑا شوق تھا، خصوصاً تواریخ۔ موصوف دکھنی بھارت کے رہنے والے تھے اور ہندی سے ان کا کوئی خاص لگاؤ نہ تھا۔ راقم انھیں اردو کی نظمیں اور غزلیں سنایا کرتا اور ان کا ترجمہ انگریزی میں کر دیا کرتا تھا۔ موصوف کا علمی ذوق بہت بلند تھا اور انھیں بہت سے انگریزی اشعار یاد تھے۔ راقم کو موصوف کے ساتھ کمیشن میں کام کرنے کا ایک سال کا موقع ملا۔ اس کے بعد وہ یونیورسٹی سروس کمیشن کے چیئرمین ہو کر چلے گئے۔ راقم ان کے یہاں کبھی کبھی جایا کرتا تھا اور وہ بھی از راہ کرم میرے یہاں آیا کرتے تھے۔ کئی سال ہوئے کہ حرکت قلب بند ہو جانے سے فوت کر گئے۔ موصوف انڈین سیول سروس کے ایک نامی افسر تھے اور انگریزی حکومت ان کی بڑی قدر کرتی تھی۔

پروفیسر بی۔ ام۔ کے۔ سنہا: جب میں کمیشن کا ممبر ہو کر گیا تو ایک ممبر مسٹر بی۔

ام ۔ کے ۔ سنہا تھے جنھوں نے لندن یونیورسٹی سے انگریزی میں ایم ۔ اے کی ڈگری حاصل کی تھی ۔ بی ۔ این کالج میں انگریزی کے پروفیسر رہے اور بعد میں دربھنگہ کالج کے پرنسپل اور بہار یونیورسٹی کے رجسٹرار ہوئے ۔ کمیشن کی ملازمت پوری کرنے کے بعد کچھ عرصہ تک بہار یونیورسٹی کے وائس چانسلر بھی رہے ۔ مسٹر بی ۔ ایم کے سنہا اچھی اور بامحاورہ انگریزی کمیشن کی فائلوں پر لکھا کرتے تھے ۔ راقم نے شاید ہی کبھی ان کے نوٹ سے اختلاف کیا ہو ۔ ملازمت سے سبکدوش ہونے کے کچھ دنوں پہلے ہندی زبان میں فائلوں پر کئی نوٹس تحریر فرمایا ۔ چونکہ راقم ہندی زبان سے بالکل واقف نہ تھا اس لیے میں نے موصوف سے استدعا کی کہ کمیشن کی فائلوں پر حسب دستور انگریزی میں نوٹ لکھا کریں جس سے مجھے کام میں آسانی ہو سکے ۔ صاحب موصوف نے از راہ کرم ایسا ہی کیا ۔ موصوف کی عمر اس وقت اسّی سال سے تجاوز کر چکی ہے مگر لکھنے پڑھنے کا شوق جاری ہے ۔ انگریزی اخبار اور رسالوں میں مضامین لکھا کرتے ہیں جنھیں لوگ شوق سے پڑھا کرتے ہیں ۔ موصوف نہایت ہی مہذب ، ملنسار اور باوقار انسان ہیں ۔ دفتر انگریزی لباس پہن کر آیا کرتے تھے صاحب موصوف سے راقم کے بہت اچھے تعلقات تھے اور اکثر ان سے مختلف طرح کی باتیں ہوا کرتی تھیں ۔ مسٹر سنہا نے ہندی ادب کا گہرا مطالعہ کیا تھا اور اس زبان کی جدید شاعری سے بھی خوب واقف تھے ۔ مسٹر بی این ردمنگی نے جو ان دنوں کمیشن کے چیرمین تھے مجھ سے کہا کہ جس روز مسٹر سنہا کمیشن کے کاموں سے سبکدوش ہوں انھیں ایک عصرانہ دیا جائے اور اس میں چند معزز لوگوں کو بلایا جائے"۔ موصوف کی یہ رائے مجھے پسند آئی اور میں نے دو چار روز پہلے پنڈت بنود انند جھا (وزیر اعلیٰ بہار)، مسٹر بیر چند پٹیل (وزیر صحت بہار) مسٹر سہدیو مہتو (نائب وزیر بہار)، ڈاکٹر ڈی این سنگھ (پرنسپل انجنیئرنگ کالج)، مسٹر محمد یحییٰ (سابق ممبر بہار پبلک سروس کمیشن) کو ٹیلی فون سے عصرانہ میں شرکت کی دعوت دی اور ان لوگوں نے آنے کا وعدہ بھی کیا ۔ مسٹر سہدیو مہتو تو دم تک راقم کو اپنا بزرگ سمجھتے تھے اور میری ہر بات کو پورا کرنے کی کوشش کرتے تھے ۔ موصوف کو میں نے تاکید کر دی تھی کہ ان سب حضرات کو یاد دہانی کرا کر عصرانہ میں ضرور لائیں ۔ یہ سب حضرات عصرانہ میں شریک ہوئے اور تقریباً ایک ڈیڑھ گھنٹے تک طرح طرح کی باتیں ہوتی رہیں جس میں پرنسپل معین الحق نے بہت سی دلچسپ باتیں کہیں ۔ مسٹر سنہا کی الوداعی تقریر کچھ کم دلچسپ نہ تھی ۔ اس عصرانہ کی تصویر میرے پاس اب تک بطور یادگار محفوظ ہے ۔ یہ تصویر پرانے دوستوں اور گذرے ہوئے زمانے کی یاد دلاتی ہے ۔ ایسی صحبتیں اس بدمذاقی کے دور میں مفقود ہو چکی ہیں ۔ میں مالک حقیقی سے دعا کرتا

ہوں کہ مسٹر سنہا عرصہ دراز تک زندہ رہیں اور سماج کی خدمت کرتے رہیں ۔

مسٹر رام جیون سنگھ :

دوسرے ممبر مسٹر رام جیون سنگھ منصف سے ترقی کر کے ضلع و سشن جج ہوئے اور پنشن پانے کے تھوڑے دنوں بعد کمیشن کے ممبر مقرر کیے گئے ۔ صاحب موصوف "تھیوسوفیسٹ تحریک" — (Theosophist movement) کے بڑے سرگرم کارکن تھے اور ہر مذہب کا احترام کرتے ۔ ایک مرتبہ راقم اور پروفیسر عبدالمنان بیدل نے اس تحریک کے ایک جلسہ میں شرکت کی جہاں رام جیون بابو بھی موجود تھے ۔ ہر مذہب کے لوگوں نے اس جلسہ میں تقریریں کیں اور اپنے اپنے مذہب کی خصوصیات کو بیان کیا جس سے ظاہر ہوا کہ ہر مذہب کا مقصد دنیا میں امن و امان قائم کرنا اور مختلف قوموں کے درمیان بھائی چارگی پیدا کرنا ہے ۔ صاحب موصوف نہایت خوش اخلاق، منکسر مزاج، انصاف پسند اور کھرے انسان ہیں ۔ وہ سب خوبی جو ایک اچھے راجپوت میں ہونی چاہیے ان میں بدرجہ اتم موجود ہے ۔ بہت خوش مزاج انسان ہیں اور راقم سے برابر ملتے جلتے رہتے ہیں ۔ میں اکثر ان کی رہائش گاہ پر جایا کرتا تھا ۔ نام و نمود سے برابر دور رہے ۔ مزاج میں سادگی اتنی ہے کہ موصوف جب کمیشن کے ممبر تھے تو اس زمانے میں بھی انھیں بس سے سفر کرنے میں کوئی تامل نہ ہوتا تھا ۔ موصوف کو قانون کی خوب واقفیت تھی جس کا اظہار ان کے نوٹس سے ہوا کرتا تھا ۔ کبھی کبھی لمبے لمبے نوٹس لکھا کرتے تھے جن سے تمام باتوں کی واقفیت ہو جایا کرتی اور فیصلہ دینے میں بہت آسانی ہو جاتی تھی ۔

رام جیون بابو قواعد و ضوابط کے بڑے پابند تھے ۔ انٹرویو کے روز آفس اسسٹنٹ ہر ممبر کو امیدواروں کی ایک فہرست دیا کرتا تھا جس میں امیدواروں کا نام، عمر، علمی صلاحیت اور ان کے تجربات کا اندراج رہتا تھا ۔ جب سول اسسٹنٹ سرجن کی بحالی کے لیے انٹرویو ہو رہا تھا ایک نوجوان لیڈی ڈاکٹر ہم لوگوں کے سامنے حاضر ہوئی ۔ حسب دستور رام جیون بابو نے فہرست کو پڑھ کر لڑکی سے اس کی استعداد وغیرہ کے متعلق سوالات کیے اور دریافت کیا کہ کیوں اس کے نام کے آگے نہ "مس" لکھا ہوا ہے اور نہ "مسز" ۔ اس سوال پر لڑکی کی آنکھوں سے آنسو نکل آئے اور کہا کہ اس وقت نہ میں مس ہوں نہ مسز میں ایک بیوہ عورت ہوں اور میرا شوہر ایک ماہ پہلے اچانک قضا کر گیا ۔ میرا باپ محکمۂ زراعت میں کم تنخواہ پر ملازم ہے اگر مجھے ملازمت مل گئی تو اپنے بھائی بہنوں کو اچھی تعلیم دلا سکوں گی ۔ اس کے بعد وہ زار و قطار رونے لگی ۔ میں نے اس سے کہا کہ تم اطمینان رکھو تمھاری ملازمت ہو جائے گی اور تمام مشکلات حل

ہوجائیں گی۔ میں نے رمن صاحب سے کہا کہ اس لڑکی کا انٹرویو ختم کیجیے اور کمرے سے باہر جانے کی اجازت دیجیے۔ لڑکی جب کمرے سے باہر چلی گئی تو رام جیون بابو کو اس طرح کا سوال کرنے پر بڑا افسوس ہوا۔ لڑکی کو ہم لوگوں نے باتفاق رائے لیڈی ڈاکٹر مقرر کر دیا۔ انٹرویو کے متعلق رام جیون بابو کا ایک دوسرا واقعہ مجھے یاد آگیا۔ ڈپٹی کلکٹری کے لیے انٹرویو ہو رہا تھا اور ایک امیدوار ہم لوگوں کے سامنے حاضر ہوا، اور ممبروں نے اس سے جتنے بھی سوالات کیے سب کا غلط جواب دیا۔ آخر میں رام جیون بابو نے اس امیدوار سے پوچھا کہ ملک ہالینڈ کہاں ہے؟ امیدوار نے برجستہ جواب دیا ہالینڈ، انگلینڈ اور اسکاٹ لینڈ کے درمیان واقع ہے۔ اس بیوقوفی کے جواب پر رام جیون بابو سخت برہم ہوئے اور اسے کمرے سے باہر جانے کو کہا۔ امیدوار کے چلے جانے کے بعد ہم سب لوگوں کو بڑا افسوس ہوا کہ بہار میں پڑھائی کا معیار اس قدر گر گیا ہے کہ گریجویٹ یہ بھی نہیں جانتا ہے کہ ملک ہالینڈ کہاں ہے۔ انٹرویو کے ختم ہو جانے کے بعد راقم نے اس امیدوار کی درخواست کو منگوا کر دیکھا تو پتہ چلا کہ موتی ہاری کے کسی کالج سے بی۔اے پاس کیا ہے۔ یہ نہایت افسوس کی بات ہے کہ بہار کے کالجوں میں تعلیم کا معیار اس قدر گر گیا ہے کہ طلبا یہ بھی نہیں بتا سکتے کہ کون سا ملک کہاں ہے، ایسا کیوں نہ ہو۔ طلبا نہ پڑھنا چاہتے ہیں نہ اساتذہ پڑھانا چاہتے ہیں اور سال کے چھ مہینے طلبا اور اساتذہ ہڑتال میں اپنا وقت برباد کیا کرتے ہیں۔

میری ممبری:

جب راقم ممبر ہوا تو پٹنہ یونیورسٹی میں رجسٹرار کی جگہ خالی ہوئی۔ اس ملازمت کے لیے ڈاکٹر کامیشور پرشاد امبشٹھا انگریزی کے پروفیسر اور کیمسٹری کے پروفیسر ڈاکٹر بھوبے لال ٹھاکر امیدوار ہوئے۔ انٹرویو کے موقع پر مسٹر دشست نرائن رائے پٹنہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر ایکسپرٹ ہو کر آئے۔ انٹرویو کے ختم ہونے پر یہ فیصلہ ہوا کہ ڈاکٹر کامیشور پرشاد امبشٹھا کا نام اول اور ڈاکٹر بھوبے لال ٹھاکر کا نام دوم رکھا جائے مگر دشست نرائن رائے نے ڈاکٹر بھوبے لال ٹھاکر کو ڈاکٹر کامیشور پرشاد امبشٹھا پر ترجیح دی۔ دوسرے روز مسٹر رمن صاحب آفس آئے تو اپنے کمرہ کے کل دروازوں کو بند کرا دیا اور اس کمرے میں ہم لوگوں کے علاوہ کوئی دوسرا آدمی نہ تھا۔ چیرمین اور دو ممبران نے ڈاکٹر کامیشور پرشاد امبشٹھا کو ڈاکٹر بھوبے لال ٹھاکر پر ترجیح دی۔ راقم ڈاکٹر امبشٹھا اور ڈاکٹر بھوبے لال ٹھاکر سے خوب واقف تھا اور دونوں حضرات کو رجسٹرار کے عہدے کے لیے نااہل سمجھتا تھا۔ اس لیے میں نے اپنی

رائے دینے سے اجتناب کیا۔ چونکہ چیئرمین اور دو ممبران کی رائے ڈاکٹر اسحق کی موافقت میں تھی، موصوف کو پٹنہ یونیورسٹی کے رجسٹرار مقرر کیے جانے کی کمیشن نے سفارش کی۔ کمیشن کو صرف سفارش کرنے کا اختیار تھا اور تقرری کا اختیار پٹنہ یونیورسٹی کے سنڈیکیٹ کو حاصل تھا۔ اگرچہ کمیشن کی سفارش پوشیدہ رکھی گئی تھی مگر معلوم نہیں کس ذریعہ سے غالباً بہت کوشش اور کافی دوڑ دھوپ کے بعد ڈاکٹر بھوئے لال ٹھاکر کے ہمدردوں کو یہ پتہ چل گیا کہ ڈاکٹر بھوئے لال ٹھاکر کا نام دوم آیا ہے اور ڈاکٹر اقبال حسین نے اپنی کوئی رائے نہ دی ہے۔ ڈاکٹر بھوئے لال ٹھاکر کے ہمدردوں کو امید تھی کہ راقم صاحب موصوف کی کمیشن میں مدد کرے گا اور کوئی دقیقہ ان کی تقرری میں اٹھا نہ رکھے گا کیونکہ ڈاکٹر بھوئے لال ٹھاکر کی سفارش کئی معزز لوگوں نے مجھ سے کی تھی۔ اس سبب سے ڈاکٹر بھوئے لال ٹھاکر کے ہمدرد حضرات مجھ سے بہت ناراض ہو گئے اور ٹیلی فون پر کہا کہ اب آپ کی خیر نہیں ہے ہم لوگ آپ کو قتل کر دیں گے۔ ٹیلی فون کے جواب میں میں نے کہا کہ میری حیات اور موت اللہ کے ہاتھ میں ہے اور آپ لوگ میرا کچھ بگاڑ نہیں سکتے ہیں یہ کہہ کر میں نے ٹیلی فون رکھ دیا اور اس بات کی خبر ٹیلی فون سے مسٹر رمن کو کر دی۔ مسٹر رمن اور مسٹر رام جیون سنگھ دونوں میری رہائش گاہ پر آئے اور انھیں سخت تعجب ہوا کہ یہ پوشیدہ بات کس طور سے لوگوں پر ظاہر ہو گئی۔ پٹنہ یونیورسٹی میں اس بات کا چرچہ کئی روز تک رہا اور لوگوں کو یہ شبہہ تھا کہ وائس چانسلر کے یہاں سے یہ خبر پھیلی ہے۔ رمن صاحب نے چیف سکریٹری کو اس خبر کی اطلاع دے دی اور انھوں نے فوراً میری محافظت کے لیے سادہ لباس میں ریوالور کے ساتھ ایک باڈی گارڈ کو میرے یہاں تعینات کیا وہ میری موٹر کار میں بیٹھ کر ہر جگہ میرے ساتھ جایا کرتا تھا۔ میں نے چیف سکریٹری کو کہا کہ یہ شرارت ڈاکٹر بھوئے لال کے کسی دوست پروفیسر کی ہے۔ مجھے کسی محافظ کی ضرورت نہیں ہے آپ اسے واپس بلا لیں مگر اس بات پر چیف سکریٹری راضی نہ ہوئے اور یہ محافظ ایک ماہ تک میرے ساتھ ہر جگہ جاتا رہا۔ اس خبر سے میرے گھر والوں کو سخت تردد ہوا۔ جب اس بات کی خبر میرے وفادار طلبا کو ملی تو وہ لوگ ڈاکٹر بھوئے لال ٹھاکر سے جا کر ملے اور ان سے کہا کہ یہ سب باتیں اچھی نہیں ہیں آپ اپنے طرف داروں کو جن سے ہم لوگ خوب واقف ہیں خبر کر دیں کہ اس طرح کی باتیں ٹیلی فون پر ڈاکٹر اقبال حسین سے آئندہ نہ کیا کریں ورنہ اس کا انجام آپ کے لیے اچھا نہ ہوگا۔ چند دنوں بعد میرے پاس پھر ایک ٹیلی فون آیا اور ٹیلی فون کرنے والے نے اپنا نام رمیش بتایا اور کہا کہ پہلا ٹیلی فون آپ کو کسی بدمعاش نے غلط فہمی میں کیا تھا۔ آپ اطمینان رکھیں اب ایسا نہ ہوگا۔ اگر آپ اجازت دیں تو میں

آپ کی رہائش گاہ پر آ کر معافی مانگ سکتا ہوں۔ میں نے جواباً کہا کہ اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اسی دن ڈاکٹر بچے لال ٹھاکر میرے گھر پر آئے اور ان لوگوں کو برا بھلا کہا جنھوں نے ایسی بدتمیزی کا ٹیلی فون کیا تھا۔ گورنمنٹ نے جب اعلیٰ کی تنبیہ کی تو پتہ چلا کہ ڈاکٹر بچے لال کے ایک دوست پروفیسر نے یہ ٹیلی فون کیا تھا۔ وہ اپنی آواز بگاڑ کر مجھ سے باتیں کر رہے تھے۔ جب حکومت بہار نے اس معاملہ میں مزید کارروائی کرنے کا فیصلہ کیا تو میں نے چیف سکریٹری سے مل کر کہا کہ اب آپ اس معاملہ کو رفت گذشت کر دیں۔ بہت مشکل سے وہ ایسا کرنے پر راضی ہوئے۔ دس دن بعد ڈاکٹر بچے لال ٹھاکر پھر میری رہائش گاہ پر آئے اور قریب آدھ گھنٹہ راقم سے ادھر ادھر کی باتیں کر کے چلے گئے۔ ایک ماہ بعد ڈاکٹر کامیشور پرشاد امبشٹھا کی تقرری رجسٹرار کے عہدہ پر ہو گئی۔

جب راقم کمیشن کا ممبر تھا تو ڈپٹی کلکٹری، منصفی اور اسی طرح کی دیگر ملازمتوں کے لیے امیدواروں کا تعلیمی معیار اچھا تھا۔ تیس فی صد امیدواران اچھی صلاحیت کے حامل ہوتے تھے، جن میں سے کچھ امیدواران نے صوبہ بہار سے باہر تعلیم حاصل کی تھی اور ۵۰ فی صد امیدواروں کی علمی صلاحیت کم تھی۔ اس زمانے میں بیس فی صد امیدوار جو تحریری امتحان میں شریک ہوتے تھے، نہایت ہی جاہل ہوا کرتے تھے اور راقم کو تعجب تھا کہ ان لوگوں نے کس طور سے ڈگری حاصل کی تھی۔ ڈاکٹری اور انجینیری کے امیدوار ۵۰ فی صد اپنے فن کا اچھا علم رکھتے تھے۔ اس زمانے میں کالج کے لکچرار اور پروفیسروں کی تقرری بھی بہار پبلک سروس کمیشن کے ذریعہ ہوا کرتی تھی۔ ان امیدواروں میں ۵۰ فی صد اچھے طلبا ہوا کرتے تھے۔ تقرری کے سلسلہ میں بڑے بڑے لوگ راقم کے پاس آ کر امیدواروں کی سفارش کیا کرتے تھے اور میں ان لوگوں کی سفارش پر کبھی بھی دھیان نہ دیتا تھا۔ راقم اپنے اسلامی جذبہ کو کام میں لا کر بہترین امیدواروں کا انتخاب کیا کرتا تھا۔ میرے زمانے میں مقابلہ کے امتحانوں میں دو تین مسلمان لڑکوں نے شاندار کامیابی حاصل کی، مگر یہ کامیابی ان کی تناسب آبادی کے لحاظ سے بہت کم تھی۔ اسی زمانے میں دو بار مسلمان امیدوار ڈپٹی کلکٹری کے مقابلہ کے امتحان میں اول آئے۔ ایک دوسرا مسلمان طالب علم ڈپٹی کلکٹری اور منصفی کے امتحان میں بیک وقت اول آیا۔ چونکہ یہ امیدوار یونین پبلک سروس کمیشن کے ریلوے کے امتحان میں بھی اچھے نمبروں سے کامیاب ہوا تھا اس لیے ریلوے کی ملازمت کو منصفی اور ڈپٹی کلکٹری پر ترجیح دی۔ موصوف آج کل محکمہ ریلوے میں ایک بڑے عہدہ پر فائز ہیں۔ دوسرا مسلمان طالب علم جو منصفی کے امتحان میں اول آیا تھا ان

دنوں ڈسٹرکٹ و سشن جج ہے۔ ایسی مثالیں بہار پبلک سروس کمیشن کے امتحانوں میں بہت کم ملتی ہیں حکومت بہار کا فرض ہے کہ مسلمانوں کو ان کی آبادی کو مد نظر رکھتے ہوئے انھیں ہر محکمہ میں جگہیں دے

مسٹر اننتا شا نیم اینگار :

جب تک ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب بہار کے گورنر تھے کسی کی ہمت نہ تھی کہ ان سے جا کر میری شکایت کرے۔ مجھ سے صاحب موصوف تقریباً ۳۰ سال کے عرصہ سے واقف تھے اور بیشتر موقعوں پر میری تعریفیں کیا کرتے تھے۔ ان کے جانے کے بعد مسٹر اننتا شا نیم اینگار بہار کے گورنر ہو کر آئے۔ صاحب موصوف بھی مجھے عرصہ دراز سے جانتے تھے کیونکہ میرے منجھلے خالو سر عبدالرحیم دہلی میں سنٹرل اسمبلی کے پریسیڈنٹ تھے اور اس زمانے میں مسٹر اننتا شا نیم اینگار کی ان سے دوستی تھی صاحب موصوف جب بہار کی گورنری کی مدت پوری کر کے پٹنہ سے جانے لگے تو راقم کو اپنی ایک تصویر دستخط کے ساتھ عطا فرمائی جو ان دنوں خدا بخش لائبریری کے کرزن ریڈنگ روم میں آویزاں ہے۔ صاحب موصوف اکثر راج بھون میں راقم کو ناشتہ پر بلایا کرتے تھے۔ گرچہ صاحب موصوف کو ذیابیطس کا مرض تھا مگر مٹھائیوں سے پرہیز نہ کرتے تھے، کہا کرتے تھے کہ میں مندر کے پجاری کا لڑکا ہوں اور بچپن سے مٹھائی کھانے کا عادی ہوں۔ یہ کیونکر ہو سکتا ہے کہ اب میں مٹھائی کھانا چھوڑ دوں۔ صاحب موصوف نے ایک روز راج بھون میں راقم اور مسٹر جگت نندن سہائے کو جو اس زمانے میں بہار پبلک سروس کمیشن کے ممبر تھے ناشتہ پر مدعو کیا۔ مسٹر جگت نندن سہائے کو ان دنوں پیشاب میں شکر آ رہی تھی اس لیے مٹھائی کھانا نہ چاہتے تھے۔ گورنر موصوف نے ان کی پلیٹ میں ہر عمدہ عمدہ قسم کی مٹھائیاں رکھ دیں اور فرمایا کہ ان مٹھائیوں کے کھانے سے آپ کو کوئی نقصان نہ ہوگا۔ صاحب موصوف نے گورنر کے اصرار پر ان مٹھائیوں کو کھا لیا۔

گورنر سے میری شکایت :

ایک مرتبہ جب راقم مسٹر اننتا شا نیم اینگار سے ملنے گیا تو انھوں نے فرمایا کہ کچھ ہندو ممبران اسمبلی نے مجھ سے آکر شکایتیں کی ہیں کہ ڈاکٹر اقبال حسین ایک متعصب مسلمان ہیں اور مسلمان امیدواروں کی بیجا مدد کیا کرتے ہیں۔ جواباً انھوں نے ان سے کہا کہ اگر آپ کو ڈاکٹر اقبال حسین سے شکایت ہے تو لکھ کر دیں تاکہ میں ضروری کارروائی کر سکوں۔ جب ان لوگوں نے مجھے کچھ لکھ کر نہ دیا تو میں سمجھ گیا کہ تم لوگوں کا اعتراض بالکل بے بنیاد ہے۔ موصوف نے راقم کو جب ان ممبران اسمبلی کا نام بتایا

تو میں نے عرض کیا کہ یہ حضرات مجھ سے اپنے ایک نااہل رشتہ دار کو ترقی دلوانا چاہتے تھے۔ راقم نے اس امیدوار کے خلاف ایک سخت نوٹ لکھا ہے اور ممبروں نے بھی قبول کیا اور اس امیدوار کی ترقی نہ ہو سکی۔ آپ اس امیدوار کے متعلق کل کاغذات کو دفتر سے منگوا کر دیکھ سکتے ہیں۔

پنڈت بنود انند جھا سے میرے تعلقات :

راقم ساڑھے چار برس تک بہار پبلک سروس کمیشن کا ممبر رہا۔ اس دور میں پنڈت بنود انند جھا اور مسٹر کرشن ولبھ سہائے بہار کے وزیر اعلیٰ رہے۔ جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے پنڈت جی ایک نہایت ہی مذہبی انسان تھے اور اگر کوئی ان کے یہاں جا کر کسی افسر کی شکایت کرتا تو وہ بہت ناراض ہوتے اور فرمایا کرتے تھے کہ اگر تمھیں کوئی شکایت ہے تو مجھے درخواست کی شکل میں لکھ کر دے دو تاکہ میں ضروری کارروائی کر سکوں۔ کسی کی مجال نہ تھی کہ کوئی شخص پنڈت جی سے کسی قسم کی گستاخی کر سکے۔ ہر آدمی ان سے مل کر خوش ہوتا تھا۔ راقم پر ان کا پورا بھروسہ تھا اور اکثر لوگوں سے کہا کرتے تھے کہ ڈاکٹر اقبال حسین اپنے کاموں کو نہایت ایمانداری سے انجام دیتے ہیں۔ ایک مرتبہ راقم جب دہلی کے بہار بھون میں ٹھہرا ہوا تھا تو پنڈت جی وہاں قیام کے لیے تشریف لائے اور حسب دستور کمرہ نمبر ۱ میں ٹھہرے۔ قریب نو بجے صبح کو جب میں ان سے ملنے گیا تو ان کو پوجا میں مصروف پایا۔ موصوف کا دستور تھا کہ جہاں کہیں بھی رہتے صبح کو کافی دیر تک پوجا کیا کرتے تھے اور سفر میں اپنے ساتھ پوجا کرنے کی چیزیں لے جایا کرتے تھے۔ راقم پنڈت جی کے مذہبی عقائد کا بڑا احترام کرتا تھا۔ ہر ماہ راقم ان سے ضرور ملتا تھا۔ اگر ملاقات ہونے میں دیر ہو جایا کرتی تو ٹیلی فون کر کے پنڈت جی اپنی رہائش گاہ پر مجھے بلایا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ پنڈت جی اپنے سرکاری دورہ پر کسی گاؤں میں گئے ہوئے تھے۔ اس علاقہ کا داروغہ ایک اچھا سا کدو کسی بوڑھے غریب دیہاتی کے چھپر سے توڑ کر پنڈت جی کے لیے لے آیا۔ جب پنڈت جی کو یہ خبر ہوئی کہ یہ کدو کس طور سے لایا گیا ہے تو موصوف داروغہ پر بہت ناراض ہوئے اور اس غریب دیہاتی کو بلوایا جس کے یہاں سے کدو لایا گیا تھا۔ پنڈت جی نے کدو واپس کر دیا اور پانچ روپیہ اپنی جیب سے اس غریب آدمی کو دے کر روانہ کیا۔ اس قصہ کو راقم سے پنڈت جی نے خود بیان کیا تھا۔

مسٹر کرشن ولبھ سہائے :

دوسرے وزیر اعلیٰ مسٹر کرشن ولبھ سہائے تھے۔ مسٹر کرشن ولبھ سہائے نے میرے

پھوپھی زاد بھائی مسٹر محمد وصی مرحوم ایڈوکیٹ پٹنہ ہائی کورٹ کے ساتھ ہزاری باغ کالج میں پڑھا تھا اور ان لوگوں کے درمیان بڑی دوستی تھی۔ راقم موصوف کو اپنا بڑا بھائی سمجھتا تھا اور وہ بھی مجھ سے نہایت ہی برادرانہ شفقت سے پیش آتے تھے۔ موصوف مرحوم پٹنہ یونیورسٹی کے بی۔اے انگریزی آنرس میں اول آئے تھے اور یونیورسٹی نے انھیں اس کامیابی پر ایک طلائی تمغہ عطا کیا تھا۔ انگریزی بہت ہی اچھی لکھا کرتے تھے۔ اور اپنی انتظامی صلاحیت کے لیے مشہور رہے۔ راقم اکثر ان کے یہاں جایا کرتا تھا۔ دس بجے رات کو جب موصوف اپنے کل کاموں سے فارغ ہو جاتے تو مجھ سے باتیں ہوا کرتی تھیں اور بغیر کھانا کھلائے واپس نہ آنے دیتے تھے۔ ان کے دسترخوان پر روزانہ بیس تیس آدمی کھانا کھایا کرتے تھے اور موصوف جو سادہ کھانا خود کھاتے اوروں کو بھی کھلایا کرتے تھے۔ نہایت ہی دلیر اور فیاض انسان تھے۔ موصوف ہی نے بہار میں زمینداری کا خاتمہ کیا۔ میر امجد علی کا اکبر حسین جوان دنوں "انڈین وائل کارپوریشن" میں لوبری کیشن انجنیئر تھا جب میرے ہمراہ صاحب موصوف سے ملنے گیا تو موصوف نے اس سے انڈین وائل کارپوریشن کے متعلق بہت سی باتیں دریافت کیں اور خوش ہو کر انھوں نے مسٹر مچھیشور دیال آئی۔اے۔ایس کو جو ان کے سکریٹری تھے حکم دیا کہ ایک گشتی چھٹی بہار کی کل شکر ساز کمپنیوں کو روانہ کی جائے جس میں یہ تاکید ہو کہ یہ کمپنیاں اپنے کام کے لیے "انڈین وائل کارپوریشن" کا تیل خریدا کریں۔ ان تمام کمپنیوں نے وزیر اعلیٰ کے حکم کی تعمیل کی اور آیندہ سال خریداری کے موقع پر انڈین اوئیل کارپوریشن کا تیل خریدا اور اس سے حکومت کو فائدہ پہنچا۔ کیونکہ "انڈین وائل کارپوریشن" سرکاری ملکیت ہے۔ صاحب موصوف جب اپنی موٹر کار سے ہزاری باغ جا رہے تھے تو راستہ میں ایک ٹرک ان کی موٹر کار سے ٹکرا گئی اور موصوف جائے حادثہ ہی پر فوت کر گئے۔ ان کے مرنے کا مجھے سخت صدمہ ہوا۔

مسٹر بی۔این۔روہتگی :

مسٹر رمن کے چلے جانے کے بعد پنشن یافتہ آئی۔اے۔ایس مسٹر بی این روہتگی بہار پبلک سروس کمیشن کے چیئرمین ہو کر آئے تھے جو میرے عزیز دوستوں میں تھے۔ پٹنہ سیٹی کے رہنے والے تھے اور ان کے والد ایک نامی وکیل تھے۔ شروع ہی سے بہت ذہین طالب علم تھے اور ایم۔اے اکنامکس میں بہت ہی اچھے نمبروں سے کامیابی حاصل کر کے گورنمنٹ بہار سے وظیفہ پا کر اعلیٰ تعلیم کے لیے لندن گئے۔ وہاں بھی انھوں نے نہایت شاندار کامیابی حاصل کی۔ ہندوستان واپس آنے پر، اونشا کالج کٹک

میں اسسٹنٹ پروفیسر مقرر کیے گئے۔ راقم نے بھی ریونشا کالج کٹک میں انھیں دنوں قریب ڈیڑھ سال تک کام کیا تھا۔ ان سے میرے بڑے اچھے مراسم رہے۔ موصوف سے زندگی بھر میرے بہت ہی برادرانہ تعلقات رہے۔ حکومت ہند نے جب بہت سے سرکاری ملازموں کو آئی۔ اے۔ ایس کا عہدہ عطا کیا تو ردھنگی صاحب بھی آئی۔ اے۔ ایس بنائے گئے، کمشنر رہے، رجسٹرار کوآپریٹو سوسائٹیز ہوئے اور عرصہ تک حکومت بہار کے کئی محکموں کے سکریٹری رہ کر پنشن پائی۔ پنشن پانے کے بعد پانچ سال تک بہار پبلک سروس کمیشن کے چیئرمین کے فرائض انجام دیتے رہے۔ جب اس ملازمت سے سبکدوش ہوئے تو کچھ دنوں تک رانچی یونیورسٹی کے وائس چانسلر رہے۔ بحیثیت چیئرمین کمیشن کے کاموں کو تشفی بخش طور سے انجام دیتے رہے۔ موصوف اور راقم کے درمیان کمیشن کے کاموں میں کبھی کبھی اختلاف ہوجاتا تھا مگر وہ بہت بحث و تکرار کے بعد میری رائے کو قبول کر لیا کرتے تھے۔ مسٹر رام جیون سنگھ کے پنشن پانے کے بعد قریب ایک سال تک حکومت بہار نے کسی کو کمیشن کا ممبر مقرر نہ کیا اور کمیشن کے کل کاموں کا بوجھ مسٹر ردھنگی اور راقم پر رہا۔ راقم ۶۰ سال کی عمر پوری کرکے کمیشن کے کاموں سے سبکدوش ہوگیا۔ ۲۲ نومبر ۱۹۶۵ء کو جب راقم کمیشن کے کاموں سے سبکدوش ہونے لگا تو مسٹر ردھنگی نے بہت اصرار کیا کہ مجھے ایک الوداعی دعوت دی جائے مگر میں اس پر راضی نہ ہوا۔

مسٹر جگت نندن سہائے:

مسٹر بی ایم۔ کے۔ سنہا اور مسٹر رام جیون سنگھ کی سبکدوشی کے عرصہ دراز بعد مسٹر جگت نندن سہائے اور مسٹر بھاگوت پرشاد ایم۔ ایل۔ سی کو بہار پبلک سروس کمیشن کا ممبر مقرر کیا گیا۔ مسٹر جگت نندن سہائے عرصہ دراز تک پٹنہ یونیورسٹی کے رجسٹرار تھے اور اپنی انتظامی صلاحیت کے لیے مشہور تھے۔ انگریزی میں پٹنہ یونیورسٹی سے ایم۔ اے کی ڈگری حاصل کی تھی اور نہایت ہی اچھی انگریزی لکھتے تھے۔ کمیشن کا کل کام انگریزی میں کیا کرتے تھے جس سے راقم کو بہت سہولت ہوتی تھی۔ مختلف موضوع پر کتابوں کے پڑھنے کا شوق آخر دم تک رہا۔ نہایت ہی خوددار انسان تھے اور بہت کم لوگوں سے ملتے تھے۔ کمیشن کے چیئرمین ہوکر پنشن پائی۔ صاحب موصوف نے میرے چھوٹے بھائی انور حسین مرحوم کے ساتھ پٹنہ کالج میں تعلیم حاصل کی تھی۔ مسٹر جگت نندن سہائے جب تک کمیشن میں رہے نہایت خوبی اور دیانت داری کے ساتھ اپنی خدمات کو انجام

دیتے رہے۔ ان سے کبھی کسی کو شکایت کا موقع نہ ملا۔ روایات کے ہمیشہ نہایت پابند رہے اور خوش اخلاقی کے نمونہ تھے۔ موصوف کو ڈاکٹر سچیدانند سنہا کے ساتھ کافی دنوں تک کام کرنے کا موقع ملا اس لیے اپنے تمام کاموں کو بہت ترتیب سے کیا کرتے تھے۔ موصوف کے اوصاف حمیدہ بے شمار تھے اور لوگ ان کا بڑا احترام کرتے تھے۔ پنشن پانے کے بعد ایک طرح کی گوشہ نشینی اختیار کر لی تھی اور راقم کبھی کبھی ان کی رہایش گاہ پر جاکر اگلی باتوں اور اگلے لوگوں کا تذکرہ کرتا تھا۔ اب ایسے لوگ کہاں ملتے ہیں۔ ۱۰ نومبر ۱۹۸۶ء کو قلب کی حرکت بند ہو جانے سے انتقال کیا۔

مسٹر بھاگوت پرشاد :

مسٹر بھاگوت پرشاد کی تقرری بحیثیت ممبر مسٹر جگت نندن سہائے کے ساتھ ہوئی۔ جب یہ دونوں حضرات کمیشن میں آکر کام کرنے لگے تو راقم کا بوجھ کچھ کم ہو گیا۔ مسٹر بھاگوت پرشاد ایم۔ ایل سی تھے اور شروع ہی سے کانگریسی سیاست میں رہے اور اس جماعت کے ایک نہایت سرگرم کارکن شمار کیے جاتے تھے۔ یہ پہلا موقع تھا کہ کوئی سیاسی کارکن بہار پبلک سروس کمیشن کا ممبر مقرر کیا گیا ہو۔ بھاگوت بابو گرچہ کانگریس کے ممبر رہے تھے مگر کمیشن میں آکر کبھی کانگریسی ذہنیت کا مظاہرہ نہ کیا اور دیانت داری سے کام کرتے رہے۔ نہایت ہی نیک مزاج انسان ہیں اور جب تک کمیشن میں رہے راقم سے ان کے بڑے اچھے مراسم تھے۔ دفتر کھادی کا کرتا، دھوتی اور گاندھی ٹوپی پہن کر آتے تھے۔ اپنے کل کاموں کو ہندی میں انجام دیا کرتے تھے۔ راقم چونکہ ہندی سے ناواقف تھا اس لیے بھاگوت بابو کے ہندی نوٹس کو اپنے پی۔ اے سے الگ کاغذ پر رومن رسم الخط میں لکھوا کر پڑھتا اور اپنی جو مناسب رائے ہوتی اسے انگریزی میں فائل پر لکھ دیا کرتا تھا۔ موصوف ابھی تک بقید حیات ہیں مگر عرصہ دراز سے ملاقات نہ ہو سکی ہے۔

میرا بہار پبلک سروس کمیشن کا زمانہ :

ساڑھے چار سال تک میں بہار پبلک سروس کمیشن کا ممبر رہا اور اس عرصہ میں دو چیرمین اور چار ممبروں کے ساتھ وقتاً فوقتاً کام کرنے کا موقع ملا۔ اس زمانے کے واقعات کی یاد میرے لیے نہایت خوش گوار اور دلچسپ ہے۔ اس تمام عرصہ میں راقم اور دیگر ممبران کے درمیان کسی مسئلہ میں شاید ہی اختلاف رائے ہوا ہو۔ راقم مسلمان امیدواروں کے حقوق کا تحفظ کیا کرتا تھا۔ ایک دو مرتبہ مسلمان امیدواروں کے متعلق راقم کو اختلافی نوٹ لکھنا پڑا۔ ہم سب ممبران معاملات کے

طے کرنے میں انصاف سے کام لیا کرتے تھے۔ کمیشن کی رائے گورنمنٹ پر قابل پابندی نہ تھی مگر کچھ ایسی رسم قائم ہو گئی تھی کہ عموماً آخری فیصلہ گورنمنٹ کمیشن کی رائے کے مطابق کیا کرتی تھی۔

ایکسپرٹ ممبر:

کل ملازمتوں کے انٹرویو میں امیدواروں کے انتخاب میں کمیشن کو مدد دینے کے لیے ہر شعبہ کے ماہرین آیا کرتے تھے۔ سرکاری ملازمتوں کے لیے صرف ایک ماہر آیا کرتا اور یونیورسٹی کی ملازمتوں کے لیے دو ماہرین فن بلائے جاتے تھے۔ یہ سب ماہرین اپنے اپنے شعبوں میں ممتاز عہدہ داران یا بلند پایہ اساتذہ ہوا کرتے تھے۔ میرے زمانے میں ہر شعبہ کے اعلیٰ افسران اور نامور اساتذہ ہندستان کے ہر حصہ سے آیا کرتے تھے۔ راقم کو ان لوگوں کی شرف ملاقات سے اپنی معلومات میں کچھ اضافہ ہوا کرتا تھا۔ ان ماہرین کی رائے ۹۰ فی صد ایمانداری پر مبنی ہوا کرتی تھی۔ مگر دس فی صد ماہرین ایسے بھی ہوا کرتے تھے جو سفارشوں سے متاثر ہو کر امیدواروں کے متعلق ایسی رائے دیا کرتے تھے جو انصاف سے دور اور کمیشن کے لیے ناقابل قبول ہوا کرتی تھی۔

چودھواں باب (۱۴)

خدابخش لائبریری سے میرے تعلقات

خدابخش لائبریری کا ڈائرکٹر ہونا :

جب راقم بہار پبلک سروس کمیشن کی ممبری سے الگ ہو گیا تو میں نے ایک دن راج بھون جاکر شری اننتا شائنم اینگار سے ملاقات کی جو اس زمانے میں بہار کے گورنر تھے۔ دوران گفتگو صاحب موصوف نے فرمایا کہ خدابخش لائبریری میں ڈائرکٹر کا عہدہ خالی ہے۔ اگر میں پسند کروں تو وہ مجھے اس جگہ پر مقرر کر سکتے ہیں۔ میں نے ایک ہفتہ کی مہلت مانگی اور اس درمیان میں اپنے دوست پروفیسر ہمایوں کبیر سے مشورہ طلب کیا۔ ہمایوں کبیر صاحب نے مجھے رائے دی کہ بہت جلد میں اپنی رضامندی اس عہدے کی تقرری کے لیے دے دوں اور یہ بھی استدعا کروں کہ میری تقرری کا معاملہ مجلس عاملہ کی آیندہ میٹنگ میں جو جلد ہی ہونے والی ہے پیش کر دیا جائے۔ جب مجلس عاملہ کی میٹنگ ہوئی تو زیادہ تر ممبران نے میری تقرری کے لیے رائے دی اور چند ممبروں نے راقم کی سخت مخالفت کی۔ مگر باوجود مخالفت کے گورنر موصوف نے مجھے لائبریری کا ڈائرکٹر مقرر کر دیا۔ تقرری کا حکم پاتے ہی راقم نے جلد ہی ماہ نومبر ۱۹۶۵ء کے آخر ہفتہ میں لائبریری کا چارج لے لیا۔ اس زمانے میں پروفیسر سید شاہ عطاء الرحمٰن عطا کاکوی لائبریری کے سکریٹری تھے۔ ان کے علاوہ شری مصطفیٰ احمد اور شری اطہر شیر اسسٹنٹ ڈائرکٹر تھے۔ راقم ۳۰؍ستمبر ۱۹۶۷ء تک لائبریری کا ڈائرکٹر رہا۔ خدابخش لائبریری کی مجلس عاملہ کا ایک جلسہ ۱؍ستمبر ۱۹۶۷ء کو ہوا اور رزولوشن نمبر ۴ میں راقم کی خدمات کی تعریف کی گئی اور میرا استعفا منظور ہوا۔

میری کارکردگی :

راقم جب پہلے دن لائبریری میں بحیثیت ڈائرکٹر کام کرنے کے لیے آیا تو اسسٹنٹ ڈائرکٹر

معنی احمد صاحب کو ساتھ لے کر لائبریری کے کل کمروں کا معائنہ کیا خصوصاً اس کمرے کا جائزہ لیا جہاں عربی مخطوطات کا ذخیرہ تھا۔ اس کمرے میں ایرکنڈیشنر لگا ہوا تھا مگر خیریت تھی کہ ایرکنڈیشنر کام نہیں کر رہا تھا۔ ایرکنڈیشنر کے سبب مخطوطات کے اوراق نم ہو جاتے ہیں اور جب میں نے اس وقت کچھ مخطوطات کو دیکھا تو ان کے اوراق نم ہو چکے تھے۔ دوسرے دن ان مخطوطات کو ہلکی دھوپ دکھا کر ان کی جگہوں پر رکھوا دیا اور تاکید کر دی کہ دس دن کے اندر کل مخطوطات کی گرد آلودگی کو صاف کر کے انھیں اپنی جگہوں پر رکھ دیا جائے۔ اس زمانے میں اسسٹنٹ ڈائرکٹر سید اطہر شیر لمبی رخصت پر گئے ہوئے تھے۔ تمام ملازموں کو ہدایت کر دی گئی کہ اپنے کاموں پر آنے میں تاخیر نہ کیا کریں اور میں حاضری کے رجسٹر کو اپنے کمرے میں اس لیے رکھا کرتا تھا کہ ملازمین اپنے آنے کے وقت کا اندراج ٹھیک طور سے کیا کریں۔ میں لائبریری وقت پر جایا کرتا اور کل ملازمین بھی وقت پر آنے کے عادی ہو گئے تھے۔ بڑے کمرے میں جہاں لوگ مخطوطات کا مطالعہ کیا کرتے تھے وہاں صرف دو چھوٹے ٹیبل پنکھے تھے۔ گرمیوں کے موسم میں ان چھوٹے پنکھوں سے مطالعہ کرنے والوں کو کوئی آرام نہ پہنچتا تھا اور کمرے کی چھت میں پنکھا لگانے کی کوئی گنجایش نہ تھی۔ میں نے آرام کے لیے دیوار میں بجلی کے دو بڑے پنکھے لگوائے جن سے ہوا کافی پھیلتی تھی اور پڑھنے والوں کو سہولت ہو گئی۔ لائبریری کے اکثر کمروں میں بجلی کی روشنی کا معقول انتظام نہ تھا، میں نے بجلی کے انجینئر کو بلا کر کہا کہ بلب کی جگہ ٹیوب لائٹ لگا دی جائیں۔ خصوصاً کرزن ریڈنگ روم میں جہاں شام کو لوگ کتب بینی کے لیے آیا کرتے تھے اور وہاں روشنی کا اچھا انتظام نہ تھا جس سے پڑھنے والوں کو دشواری ہوتی تھی۔ کچھ ایسے لوگ جو اسپتالی مریضوں کے ساتھ پٹنہ آتے رات کو کرزن ریڈنگ روم کے برآمدے میں سویا کرتے تھے۔ برآمدے کے اس حصہ میں جو گلی کی جانب ہے لوگوں نے کھانے پینے کی چیزوں کی دکانیں کھول رکھی تھیں جس سے بڑا شور و غل ہوا کرتا تھا۔ پولس والوں نے کئی بار ان دکانداروں کو بھگا بھی دیا تھا مگر یہ لوگ پھر واپس آجاتے۔ ان بدعنوانیوں کو رد کرنے کے لیے راقم نے کرزن ریڈنگ روم کے برآمدے میں چاروں طرف لوہے کی مضبوط جالیاں لگوا دیں اور لوہے کا ایک کلیپسیبل دروازہ بھی نصب کرا دیا اس طور سے کرزن ریڈنگ روم ہر طرح سے محفوظ ہو گیا اور شور و غل کا بھی خاتمہ ہوا۔ کرزن ریڈنگ روم کا فرش بہت دنوں سے بے مرمت ہو کر برا معلوم ہوتا تھا۔ راقم نے اس کے فرش، برآمدے اور زینوں کو موزائک کرایا۔ نیز اس کمرے کے تمام فرنیچر کو پالش کرا دیا۔ اس

انتظام سے کمرے کی خوب صورتی میں اضافہ ہو گیا۔ راقم نے لائبریری کی خاص عمارت میں تمام کھلے برآمدوں پر مضبوط لوہے کی جالیاں لگوا دیں اور کل دروازوں کو تالا لگوا کر بند کرا دیا۔ صرف صدر دروازہ کو آنے جانے والوں کے لیے کھلا رکھا تھا تاکہ کتابوں کی پوری حفاظت ہو سکے۔ باوجود ان سب حفاظتی انتظاموں کے ایک ایسا شرمناک واقعہ پیش آیا جو راقم کے وہم و گمان میں بھی نہ آسکتا تھا۔ ایک فارسی کے پروفیسر جب ایک قدیم قلمی نسخہ کو اپنے بیگ میں رکھ کر باہر جانے لگے تو لائبریری کے نگراں ملازم نے ان سے نسخہ کو واپس مانگا انھوں نے اس نسخہ کو اپنے بیگ سے نکال کر واپس کرتے ہوئے کہا کہ میں نے غلطی سے اس نسخہ کو اپنے بیگ میں رکھ لیا تھا۔ ان کے چلے جانے کے بعد نگراں ملازم نے جب مجھے اس کی خبر دی تو یہ سوچ کر مجھے بڑا افسوس ہوا کہ ایک ذمہ دار پروفیسر ایسی مذموم حرکت کر سکتا ہے۔ چپراسیوں اور دیگر ملازموں کے کوارٹرس بھی کچھ دنوں سے بے مرمت پڑے ہوئے تھے میرے کہنے پر پی۔ ڈبلیو۔ ڈی نے انھیں درست کرایا۔ لائبریری کے سامنے جو ایک چھوٹا سا میدان ہے اسے سرسبز رکھا جاتا اور مغرب کی نماز عرصہ دراز سے اسی میدان میں ادا کی جاتی تھی جس میں محلہ کے لوگ بھی شریک ہوا کرتے تھے۔ موسمی پھول برسات اور جاڑے کے موسم میں لائبریری کو زینت بخشتے تھے۔

کتابوں کی خریداری :

اس زمانے میں کتابوں کی خریداری کے لیے کم رقم ملتی تھی۔ مسٹر قاضی عبدالودود، راقم اور مسٹر صفی احمد اسسٹنٹ ڈائرکٹر لائبریری ایڈوائزری کمیٹی کے ممبر تھے۔ ہم لوگوں کے انتخاب اور مشورے سے لائبریری کے لیے کتابیں خریدی جاتی تھیں۔ مسٹر قاضی عبدالودود اچھے قلمی نسخوں کی خریداری پر زور دیا کرتے تھے اور راقم بھی اس معاملہ میں ان کا ساتھ دیتا تھا۔ میرے زمانے میں کچھ مخطوطات اور اچھی انگریزی کتابوں کی خریداری ہوئی۔ میرے مشورے پر بیروت کی چھپی ہوئی تفسیر حدیث اور اسلامیات کی کتابیں لندن سے منگائی گئیں۔

کتابوں کی اسٹاک ٹیکنگ :

راقم کو لائبریری کے انتظامی کاموں کا تجربہ تقریباً بیس سال کا تھا۔ جب میں خدا بخش لائبریری کا ڈائرکٹر ہو کر آیا تو اس سے پہلے میں پٹنہ کالج لائبریری کا جونیئر پروفیسر انچارج پندرہ سال تک اور پروفیسر انچارج تین سال تک رہا تھا۔ اس کے علاوہ دو سال تک پٹنہ یونیورسٹی

لائبریری کمیٹی کا ممبر بھی تھا۔ یہ دونوں کتب خانے قدیم اور مشہور ہیں۔ کتب خانوں میں سالانہ اسٹاک ٹیکنگ کرانا نہایت ضروری ہے اور میں اس لمبی مدت میں ہر سال نہایت پابندی سے کتابوں کی اسٹاک ٹیکنگ کرایا کرتا اور جو کتابیں غائب رہتی تھیں ان کے متعلق تفتیش کرتا تھا۔ اکثر گم شدہ کتابیں مل جایا کرتی تھیں۔ جب میں خدا بخش لائبریری کا ڈائرکٹر ہو کر آیا تو کتابوں کی اسٹاک ٹیکنگ کرائی جس سے پتہ چلا کہ حکیم مظاہر احمد صاحب کے یہاں سے جو قلمی نسخے خریدے گئے تھے ان میں سے چند چھوٹے چھوٹے رسالے غائب تھے۔ مگر تلاش کے بعد دستیاب ہو گئے۔ تقریباً سو مطبوعہ کتابیں جنھیں مختلف حضرات پڑھنے کے لیے لے گئے تھے غائب تھیں اور باوجود یاددہانی کے واپس نہ کی گئی تھیں۔ کتابوں کی واپسی کے لیے راقم نے بذریعہ خط لوگوں سے استدعا کی کہ کتابوں کو جلد واپس کر دیں۔ کچھ لوگوں نے کتابیں واپس کیں مگر زیادہ تر لوگوں نے خط کا جواب تک نہ دیا جن میں پٹنہ کالج کے ایک پروفیسر بھی تھے۔ لائبریری کے ایک سابق سکریٹری کے پاس واپسی کے لیے دس پندرہ کتابیں تھیں مگر انھوں نے ایک کتاب بھی واپس نہ کیا اور نہ قیمت ہی ادا کی۔ راقم کا تجربہ ہے کہ ہر سال کتابوں کی اسٹاک ٹیکنگ لائبریری میں غیر جانب دار حضرات سے کرائی جائے تاکہ معلوم ہو سکے کہ کون کون سی کتابیں غائب ہیں اور ان کی بازیابی کے لیے کیا صورت ہو سکتی ہے۔

ایک نایاب قلمی نسخہ کا دہلی بھیجا جانا :

خان بہادر خدا بخش خاں بانی خدا بخش لائبریری نے یہ قاعدہ بنایا تھا کہ کوئی قلمی نسخہ لائبریری سے باہر نہیں جا سکتا ہے۔ راقم جب ڈائرکٹر تھا تو دہلی سے حکومت ہند نے مغل بادشاہ اکبر اعظم پر ایک ڈاکومنٹری فلم تیار کرنے کے سلسلہ میں ایک نہایت ہی نایاب قلمی نسخہ کو طلب کیا۔ راقم نے اس قیمتی نسخہ کو دہلی بھیجے جانے کی سخت مخالفت کی اور حکومت ہند کو مطلع کیا کہ قاعدے کے مطابق یہ نسخہ بنام "تاریخ خاندان تیموریہ" کتب خانے سے باہر نہیں جا سکتا ہے اگر یہ دہلی بھیجے جانے میں گم ہو گیا تو کسی قیمت پر یہ نسخہ پھر حاصل نہیں ہو سکتا ہے۔ علاوہ ازیں ڈاکومنٹری فلم کے بنانے میں اگر نسخہ کو کچھ نقصان پہنچا تو اس کی تلافی کسی طور سے ممکن نہیں۔ میں نے بہار کے گورنر مسٹر اننتا شائنم اینگار کو اس خط کی ایک نقل روانہ کر دی اور انھوں نے بھی میری رائے سے اتفاق کیا۔ دو ہفتہ بعد گورنر بہار نے کچھ لوگوں سے اثر پذیر ہو کر راقم کے پاس حکم نامہ بھیجا کہ یہ نادر قلمی نسخہ کو لے کر دس دن

کے لیے مسٹر صفی احمد اور مسٹر اطہر شیر دہلی جائیں اور کام کے ختم ہو جانے کے بعد اس کو بحفاظت تمام پٹنہ واپس لائیں۔ نادر قلمی نسخوں کا دہلی بھیجا جانا بالکل غلط اور بانی کتب خانہ کے اصول کے خلاف تھا۔

چند متفرق کام :

راقم کے ڈائرکٹر ہونے سے پہلے قلمی نسخوں کے دو کیٹلاگ تیار ہو چکے تھے۔ میں نے اپنے ایک عزیز شاگرد مسٹر نور الہدیٰ سے جو بی۔این کالج میں انگریزی کے پروفیسر تھے بلا کسی معاوضہ کے انگریزی عبارت کی نظر ثانی کرائی اور یہ دونوں کیٹلاگ میرے زمانے میں چھپ کر شائع ہو گئے۔ عربی عبارت کی نظر ثانی ڈاکٹر سید احمد نے کی۔

جنوری ۱۹۶۶ء میں انڈین ٹوبیکو کمپنی نے کافی رقم خرچ کر کے ایک نہایت خوب صورت اور شاندار ڈسک کیلنڈر شائع کیا۔ اس کیلنڈر میں چھ رنگین تصویریں خدا بخش لائبریری کے نادر قلمی نسخوں سے لی گئی تھیں۔ تصویریں چھپ کر اس قدر مقبول ہوئیں کہ لوگوں نے ان تصویروں کو فریم میں لگا کر اپنے کمروں میں آویزاں کیا۔ اس زمانے میں ڈاکٹر ذاکر حسین صدر جمہوریہ ہند تھے، انھیں ان میں سے ایک تصویر اتنی پسند آئی کہ اس کی نقل دہلی کے ایک استاد مصور سے بڑے سائز میں تیار کرائی۔ جب یہ تصویر تیار ہوئی تو ڈاکٹر صاحب مرحوم نے مشہور مصور فیبرجی کو دکھایا اور انھوں نے اس نقلی تصویر کو اصلی قرار دیا۔ ڈاکٹر صاحب مرحوم نے جب فیبرجی کو کل حالات سے مطلع کیا تو وہ حیران ہو کر رہ گئے اور نقل کرنے والے مصور کی بہت تعریف کی۔ ڈاکٹر صاحب مرحوم نے اس تصویر کو نہایت نمایاں طور سے راشٹر پتی بھون کے اس کمرے میں آویزاں کیا جہاں وہ لوگوں سے ملا کرتے تھے۔ جب راقم کچھ دنوں بعد ڈاکٹر صاحب مرحوم سے راشٹر پتی بھون میں ملا تو انھوں نے ہنس کر اس واقعہ کا تذکرہ کیا اور یہ بھی کہا کہ دنیا میں بہت سی نقلی تصویریں اصلی بتا کر بڑی بڑی قیمتوں پر فروخت کی جاتی ہیں۔ یہ چھ تصویریں جن کو راقم نے فریم کرا کر لائبریری کو دیا تھا اب تک وہاں موجود ہیں اور یہ خدا بخش لائبریری کی بیش بہا تصویریں ہیں۔

جمیلہ بیگم مرحومہ زوجہ خان بہادر خدا بخش خاں کا اردو دیوان لائبریری میں موجود ہے۔ بیگم موصوفہ نے اپنے اشعار کی اصلاح پٹنہ کے مشہور شاعر حضرت شاد عظیم آبادی سے کرائی تھیں۔ راقم کو مرحومہ کی کچھ غزلیں پسند آئیں اور میں نے سوچا کہ بیگم مرحومہ کی منتخب غزلوں کو چھاپ کر شائع کر دیا

جائے۔ میں نے پٹنہ یونیورسٹی کے اردو کے پروفیسر ڈاکٹر ممتاز احمد کو اس کام کی انجام دہی کے لیے تیار کیا مگر افسوس ہے کہ یہ کام نہ ہو سکا کیونکہ میں بہت جلد استعفا دے کر لائبریری سے الگ ہو گیا۔

راقم کے اصرار پر بنارس کی امریکن اکاڈمی اپنے خرچ سے خدا بخش لائبریری کی تصویر دار مخطوطات کا ایک کیٹلاگ تیار کرنے پر راضی ہوئی۔ اس کیٹلاگ میں مخطوطات کی بیش بہا تصویروں کو اپنے اصلی رنگ و روپ کے ساتھ شائع کرنے کی تجویز بھی پیش کی۔ ۱۰ ستمبر ۱۹۶۷ء کو جب یہ مسئلہ مجلس انتظامیہ کے سامنے پیش ہوا تو کوئی معقول نتیجہ برآمد نہ ہوا۔

راقم نے پٹنہ یونیورسٹی کے مختلف مضامین کے مشہور اساتذہ کو اس بات پر راضی کیا کہ بلامعاوضہ یہ حضرات دلچسپ موضوعات پر خدا بخش لائبریری میں لکچر دیں جو بعد میں کتابی شکل میں شائع کیا جا سکے۔ آٹھ پروفیسروں نے نہایت خوشی سے لکچر دینے پر اپنی رضامندی کا اظہار کیا، مگر اس تجویز پر بھی کوئی کارروائی نہ کی جا سکی کیونکہ میں لائبریری سے الگ ہو گیا تھا۔ موجودہ ڈائرکٹر خدا بخش لائبریری ڈاکٹر عابد رضا بیدار ہندوستان اور بیرون ملک کی بڑی بڑی شخصیتوں کو مدعو کر کے خدا بخش لائبریری میں لکچرس دلایا کرتے ہیں اور یہ ہر لحاظ سے نہایت ہی مفید ہوتے ہیں۔ اکثر لکچرس چھاپ کر شائع کر دیئے گئے ہیں جنھیں لوگ شوق سے پڑھتے ہیں۔

لائبریری کی دوسری منزل :

جگہ کی کمی کی وجہ سے لائبریری کی عمارت میں توسیع کرانا نہایت ہی ضروری تھا۔ حکومت بہار نے جب اپنا حکم توسیع عمارت کے لیے صادر کر دیا تو میں نے گورنر بہار سے اجازت لے کر چیف انجینئر پی ڈبلیو ڈی، بہار سے ملاقات کی۔ صاحب موصوف نے اس معاملہ میں اپنی بڑی دلچسپی دکھائی اور کہا کہ تین ماہ کے اندر بالائی منزل کی تعمیر کا کام شروع کر دیا جائے گا۔ جب میں لائبریری کے کاموں سے سبکدوش ہو رہا تھا تو لائبریری کی توسیع کا کام بہت حد تک مکمل ہو چکا تھا۔ زینوں کی ساخت مجھے پسند نہ تھی مگر انجینئروں نے کہا کہ جگہ کی کمی کے باعث زینے ان سے بہتر نہیں بنائے جا سکتے ہیں۔ انجینئروں نے بالائی منزل کی عمارت کو نہایت ہی خوبصورتی سے تعمیر کیا ہے۔

کتابوں کی نمائش :

راقم کے آخر دور میں مخطوطات اور مطبوعات کی نمائش سامنے والے کمرے میں کی گئی۔ مسٹر اننتا شاینم اینگار گورنر بہار نے اس نمائش کا افتتاح کیا اور کافی لوگوں نے اس نمائش کو دیکھا

اور پسند کیا۔ افتتاح کے بعد گورنر موصوف نے دیر تک کتابوں کو بڑے شوق سے دیکھا اور جاتے وقت راقم سے فرمایا کہ ان کتابوں کی جہاں تک ممکن ہو حفاظت کرو۔ ہم لوگ ایک نہایت ہی پر آشوب دور سے گزر رہے ہیں۔ شر پسند عناصر اپنے بغض و عناد کی بنا پر آگ کی ایک چنگاری سے اس خوبصورت اور نادر کتابوں کے ذخیرے کو خاک کا ڈھیر بنا سکتے ہیں۔ میں نے جواباً عرض کیا کہ یہاں کا ہر ملازم لائبریری کو اپنی جان سے زیادہ عزیز رکھتا ہے مگر حکومت کا فرض ہے کہ کم از کم دو سنتری رائفل کے ساتھ ۲۴ گھنٹے لائبریری کی حفاظت کے لیے مقرر کیے جائیں۔ انھوں نے دو سنتریوں کے مقرر کیے جانے کا وعدہ تو کیا مگر پورا نہ کر سکے۔ مسٹر صفی احمد اور مسٹر اطہر شیر نے اس نمائش کو کامیاب بنانے میں بڑی محنت اور دلچسپی سے کام لیا۔ راقم کے لیے یہ بڑی خوشی کی بات ہے کہ موجودہ ڈائرکٹر بیدار صاحب نے تین پہرہ داروں کو بندوق کے ساتھ لائبریری کی حفاظت کے لیے مقرر کیا ہے۔ جو لائبریری کی پوری نگہبانی کرتے ہیں۔

لائبریری میں معزز حضرات کی آمد:

میرے زمانے میں کچھ معزز حضرات لائبریری میں تشریف لائے جن میں سے چند کا تذکرہ کر دینا میں ضروری سمجھتا ہوں۔ ۱۳۰ اپریل ۱۹۶۶ء کو برٹش ڈپٹی ہائی کمشنر مسٹر ایون پورٹر، کیتھرین پورٹر اور مسٹر جوناتھن ڈیوڈسن لائبریری میں تشریف لائے۔ یہ حضرات ایک گھنٹہ تک لائبریری کی مشہور کتابوں کو دیکھتے رہے اور ان کی خوبصورتی سے نہایت متاثر ہوئے۔ ان سب لوگوں نے لائبریری کی وزیٹرس بک میں تحریر فرمایا کہ یہاں کی کتابوں کے دیکھنے کے لیے ایک گھنٹہ ناکافی ہے۔ ہم لوگوں کی خواہش ہے کہ لائبریری میں پھر آئیں اور خوبصورت مخطوطات کو دیکھنے میں پورا دن گذاریں۔ کیتھرین پورٹر مجھے ایک نہایت ہی مہذب اور تعلیم یافتہ خاتون معلوم ہوئیں۔ انھوں نے مخطوطات کے علاوہ انگریزی، فرانسیسی، جرمن اور اٹیلین زبانوں کی قدیم اور مشہور کتابوں کو دیکھا جو لائبریری میں موجود ہیں۔ مسٹر ڈیوڈسن نے فارسی خطاطی اور تصویروں کی بڑی توصیف کی

مسٹر کرشن بلب سہائے:

اس زمانے میں مسٹر کرشن بلب سہائے بہار کے وزیر اعلیٰ تھے اور راقم کے دوستوں میں تھے۔ پٹنہ یونیورسٹی میں بی۔اے۔ کے امتحان میں اوّل آئے اور طلائی تمغہ حاصل کیا تھا۔ کتابوں کے بڑے شوقین تھے اور وقت نکال کر کتابوں کا مطالعہ کیا کرتے تھے۔ اپنی طالب علمی

کے زمانے میں اکثر خدا بخش لائبریری آیا کرتے تھے۔ ۱۱ رمئی ۱۹۶۶ء کو راقم صاحب موصوف کو مدعو کرکے خدا بخش لائبریری لایا اور انھوں نے کافی دیر تک لائبریری کی کتابوں کو دیکھا اور بہت متاثر ہوئے۔ خصوصاً ان مخطوطات سے جن کا تعلق شہنشاہ مغلیہ سے ہے۔ وزیٹرس بک میں موصوف نے خدا بخش لائبریری کے متعلق جو کچھ بھی لکھا ہے وہ ان کے جذبات کی صحیح ترجمانی ہے۔ شاید موصوف بہار کے پہلے اور آخری وزیراعلیٰ تھے جنھوں نے بحیثیت وزیراعلیٰ بہار خدا بخش لائبریری کا معائنہ کیا ہو۔

مسٹر صدیق اللہ رشتین :

اسی زمانے میں مسٹر رشتین جو افغانستان میں وزارت تعلیم کے آفیسر تھے پٹنہ آئے اور حکومت بہار کے مہمان کی حیثیت سے پٹنہ سرکٹ ہاؤس میں مقیم تھے۔ صاحب موصوف نے خدا بخش لائبریری آکر کتابوں کو دیکھا اور تین روز بعد واپس چلے گئے۔ گرچہ صاحب موصوف اچھی انگریزی اور فارسی بولتے تھے مگر وزیٹرس بک میں اپنے تاثرات کو پشتو زبان میں تحریر کیا جو ان کی مادری زبان تھی۔ صاحب موصوف ان دنوں پشتو اکیڈمی کے رئیس تھے۔

ڈائرکٹر کی تقرری پر اخباروں کی رائے :

راقم ایک سال دس مہینے تک خدا بخش لائبریری کی خدمت کرتا رہا۔ اس دوران میں خدا بخش لائبریری کی فلاح و بہبود کے لیے جو کچھ بھی ممکن تھا کیا۔ جب میں ڈائرکٹر مقرر ہوا تو پٹنہ کے اخباروں نے میری تقرری کی خبر کو نہایت ہی نمایاں طور سے شائع کیا اور ایک اردو اخبار نے اداریہ لکھا جو حسب ذیل ہے :

"ڈاکٹر اقبال حسین کا نیا عہدہ

" یہ خبر علمی حلقوں میں نہایت مسرت کے ساتھ سنی جائے گی کہ خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ کی مجلس انتظامیہ نے جس کے صدر بہار راج کے گورنر ہیں۔ ۲۷ نومبر کی میٹنگ میں ڈاکٹر اقبال حسین کو لائبریری کا ڈائرکٹر مقرر کر دیا ہے ڈاکٹر صاحب موصوف علمی دنیا کی ایک معروف شخصیت ہیں۔ خدا بخش لائبریری سے ان کا بہت دنوں کا تعلق رہا ہے۔ ایم۔ اے پاس کرنے کے بعد وہ عرصے تک یہاں اپنا تحقیقی کام کرتے رہے اور اپنی مشہور کتاب " ہندوستان

کے ابتدائی عہد اسلامی کے فارسی شعراء" مرتب کیا اور سام مرزا کی تالیف "تحفۂ سامی" کو ایڈٹ کیا۔ وہ نو سال تک اس لائبریری کی پرانی مجلس انتظامیہ کے ممبر رہے ہیں۔ اس طرح ان کو اس لائبریری کے تمام حالات سے پوری واقفیت اور اس کی فلاح و بہبود کے لیے انتہائی ہمدردی ہے۔ جب سے خدا بخش لائبریری کی نئی مجلس عاملہ مقرر ہوئی ہے اور اس نے لائبریری کی توسیع و ترقی کے لیے منصوبہ بنایا ہے اسی وقت سے یہ ضرورت محسوس کی جارہی تھی کہ ایک تجربہ کار اور ہوشیار ڈائرکٹر بحال کیا جائے۔ نئی مجلس انتظامیہ نے ڈاکٹر صاحب موصوف کا انتخاب کرکے بڑی دانش مندی کا ثبوت دیا ہے۔ ان کے جیسا لائق و فائق، تجربہ کار، ہر دل عزیز اور ہمدرد شخص ملنا مشکل تھا۔ خدا بخش لائبریری کی یہ انتہائی خوش قسمتی ہے۔ ہم مجلس انتظامیہ اور ڈاکٹر صاحب موصوف دونوں کو مبارک باد دیتے ہیں اور امید کرتے ہیں کہ ڈاکٹر صاحب کی نگرانی اور سرپرستی میں یہ قومی ادارہ روز افزوں ترقی کرے گا۔"

خدا بخش لائبریری سے میرا دیرینہ تعلق:

مسٹر ولی الدین خدا بخش مرحوم خاں بہادر خدا بخش خاں کے چھوٹے صاحبزادے تھے۔ ۱۹۱۹ء میں ان کی شادی میرے رشتہ کی ایک پھوپھی بیبی جو خان بہادر حشمت حسین مرحوم کی صاحبزادی تھیں، ہوئی۔ اس زمانے میں راقم اسکول کا طالب علم تھا مگر لائبریری کی شہرت سن کر ولی پھوپھا مرحوم کے ساتھ خدا بخش لائبریری گیا جہاں انھوں نے مجھے مغل دور کی کئی تصویریں دکھائیں۔ راقم ۱۹۲۴ء میں پٹنہ تعلیم کی غرض سے آیا اور فارسی آنرس میں داخلہ لیا۔ میرے فارسی کے نصاب میں نظامی عروضی کا چہار مقالہ بھی تھا جس کا انگریزی ترجمہ پروفیسر براؤن نے کیا تھا۔ یہ کتاب خدا بخش لائبریری میں موجود تھی۔ میں نے اس انگریزی ترجمہ کو پڑھا جس سے میری بہت سی دشواریاں حل ہوگئیں۔ بی۔ اے اور ایم۔ اے کے زمانے میں خدا بخش لائبریری جاکر فارسی کتابوں کی شرحوں کا مطالعہ کیا کرتا تھا اور ان کے علاوہ انگریزی کتابیں بھی وہاں سے لاکر پڑھا کرتا تھا۔ ۱۹۳۲ء میں راقم بحیثیت ریسرچ اسکالر لائبریری میں تحقیق کا کام کرنے لگا اور وہاں روزانہ دس بجے سے چار بجے تک اپنے کاموں میں مصروف رہتا۔ میرے لیے بالائی منزل میں ایک کمرہ مخصوص کر دیا

گیا تھا جہاں میں اطمینان سے کام کیا کرتا تھا۔ جنوری ۱۹۳۴ء میں پٹنہ میں ایک شدید زلزلہ آیا جس سے خدا بخش لائبریری کی بالائی منزل کو سخت نقصان پہنچا۔ خیریت تھی کہ بالائی منزل کے کمروں میں کتابیں نہ رکھی جاتی تھیں اس لیے کتابوں کو کسی قسم کا نقصان نہ پہنچا۔ عمارت کی نچلی منزل بالکل محفوظ رہی جہاں کتابوں کی الماریاں رکھی ہوئی تھیں اور کل کتابیں زلزلہ کے اثرات سے بچ گئیں۔ حکومت بہار نے بالائی منزل کو منہدم کرنے کا حکم صادر کیا اور لائبریری کی کل کتابیں بہار ینگ مین انسٹی ٹیوٹ کی عمارت میں جو لائبریری کے متصل ہے لے جا کر رکھ دی گئیں اور قریب چھ مہینے تک کتابیں وہاں محفوظ رکھی رہیں۔ جب بالائی منزل کو منہدم کر کے از سر نو چھت کی تعمیر پوری ہو گئی اور نچلی منزل کو بھی اچھے طور سے مرمت کر دیا گیا تو بہار ینگ مین انسٹی ٹیوٹ سے کل کتابیں لائبریری میں منتقل کر دی گئیں۔ اس وجہ سے قریب چھ ماہ تک میرا تحقیقی کام ملتوی رہا۔ سر ایڈوارڈ ڈینیسن روس خان بہادر خدا بخش خاں کے دوست تھے اور تاحیات لائبریری کے کاموں میں بڑی دلچسپی لیا کرتے تھے۔ فارسی مخطوطات کے انگریزی کیٹلاگ جلد اول کو صاحب موصوف نے تیار کیا تھا۔ لارڈ کرزن وائسرائے ہند کی توجہ لائبریری کی طرف صاحب موصوف نے مبذول کرائی تھی اور اس سے لائبریری کو عروج حاصل ہوا۔ جب راقم نے انھیں یہ خبر دی کہ زلزلہ سے خدا بخش لائبریری کی کتابوں کو کوئی نقصان نہ پہنچا ہے تو صاحب موصوف کو بہت خوشی ہوئی اور انھیں زیادہ خوشی اس بات پر ہوئی کہ عنقریب ایک خوب صورت عمارت لائبریری کے لیے تعمیر ہونے والی ہے۔

لائبریری کی نئی عمارت :

زلزلہ کے کچھ عرصہ بعد حکومت بہار نے لائبریری کی ایک نئی اور خوب صورت عمارت تعمیر کرنے کا حکم صادر کیا۔ ان دنوں پٹنہ ڈویژن کے اکزیکیٹو انجنیئر کریم صاحب تھے۔ موصوف پنجاب کے رہنے والے اور اپنی کارکردگی کے لیے نہایت مشہور تھے۔ حکومت بہار نے لائبریری کی تعمیر کا کام صاحب موصوف کو سپرد کیا اور انھوں نے نہایت خلوص سے اس کام کو شروع کرا دیا۔ عمارت کے لیے ایک نہایت ہی اچھا نقشہ تیار کرا کر لائبریری کی بنیاد رکھی۔ باہر سے سرخ اور بھورے رنگ کے پتھر منگوائے اور سنگ تراشوں کو راجستھان سے بلا کر عمارت کی تعمیر کے لیے مقرر کیا۔ تعمیری کاموں کی دیکھ بھال کے لیے ایک اسسٹنٹ انجنیئر کو متعین کیا۔ باوجود اپنی سخت مصروفیت کے صاحب موصوف روزانہ ایک دو بار خدا بخش لائبریری تشریف لاتے اور معماروں کو مزدوری

ہدایتیں دے کر واپس جاتے۔ صاحب موصوف اپنے اسلامی جذبے سے متاثر ہوکر عمارت کو اس انہاک سے بنواتے جیسے کوئی مسجد تعمیر ہو رہی ہو۔ سرخ پتھر کی یہ عمارت جو مغل طرز پر تعمیر کی گئی ہے ایک سال میں مکمل ہوئی۔ جب گورنر بہار نے اس نئی عمارت کا معائنہ کیا تو بہت خوش ہوئے اور کریم صاحب کا بیحد شکریہ ادا کیا۔ کریم صاحب نے اس عمارت میں کتابوں کو رکھنے کے لیے لوہے کی الماریاں پسند کیں، جن میں کتابیں بحفاظت تمام رکھی جاسکیں۔ راقم کریم صاحب کو پٹنہ یونیورسٹی لائبریری لے گیا جہاں کل الماریاں لوہے کی ہیں۔ انھیں یہ الماریاں پسند آئیں اور اسی طرز کی الماریاں کلکتہ سے خدابخش لائبریری کے لیے منگوایا۔ یہ سرخ رنگ کی عمارت نہایت ہی خوبصورت معلوم ہوتی تھی، مگر دوسری جنگ عظیم کے دوران جب پٹنہ کو ہوائی حملہ کا خطرہ لاحق ہوا تو سرخ پتھر پر بھورا رنگ چڑھا دیا گیا تاکہ یہ عمارت ہوائی حملہ سے محفوظ رہ سکے۔ بیش قیمت کتابوں کو پٹنہ سے باہر مختلف جگہوں پر منتقل کر دیا گیا جہاں ہوائی حملہ کا خطرہ کم تھا۔ اختتام جنگ پر یہ سب کتابیں خدابخش لائبریری میں صحیح سالم واپس آگئیں۔ راقم کو خوب یاد ہے کہ مسٹر ولی الدین خدابخش مرحوم نے جو اس زمانے میں لائبریری کے سکریٹری تھے کس محنت اور جاں فشانی سے لائبریری کی نئی عمارت کو آراستہ کیا اور کتابوں کو اپنی جگہوں پر رکھوایا۔ اس زمانے کے ملازمین لائبریری کو اپنی جان سے زیادہ عزیز رکھتے تھے اور کیا مجال تھی کہ کوئی چیز ادھر سے ادھر ہو جائے۔

لائبریری میں معزز حضرات کی آمد جب میں ریسرچ اسکالر تھا:

راقم جب خدابخش لائبریری میں تحقیق کا کام کر رہا تھا تو ہندوستان اور غیر ممالک کے نامور حضرات یہاں تشریف لایا کرتے تھے۔ کوئی بھی اسلامی ملک ایسا نہ تھا جہاں کے لوگ خدابخش لائبریری کو دیکھنے یا یہاں کام کرنے کے لیے نہ آتے ہوں۔ یورپ سے انگریز اور فرانسیسی محقق اسلامیات پر تحقیق کرنے کے لیے آتے تھے۔ راقم کو ان حضرات سے مل کر مسرت ہوتی تھی۔ ۲۵۔ مارچ ۱۹۳۳ء کو ایران کے نامور شاعر پروفیسر پور داؤد خدابخش لائبریری میں تشریف لائے اور تین دنوں تک لگاتار فارسی کتابوں کا مطالعہ کرنے کے لیے لائبریری آتے رہے۔ راقم کی استدعا پر انھوں نے میری کتاب "تحفۂ سامی" کا دیباچہ تیار کیا مگر جرمنی جا کر اس کو بھیجنے میں اتنی دیر کر دی کہ دیباچہ کتاب میں شامل نہ کیا جاسکا۔ موصوف کا یہ تحریر کردہ دیباچہ اب تک بطور یادگار محفوظ ہے۔ جب وہ واپس

جانے لگے تو راقم کو اپنے مندرجہ ذیل اشعار تحریر کر کے عنایت فرمایا جس کو راقم نے بحفاظت تمام رکھا ہے۔

گر بستہ شود در امیدت ۔ گر روز چو شب نماید ت تار

با روز نۂ امید میاز ۔ خورشید بتابدت دگر بار

مسٹر جاشنکر باجپئی ہندوستان کے ایک نامور آئی سی ایس گذرے ہیں۔ انگریزوں کے زمانے میں ان کی بڑی قدر و منزلت تھی اور آزادی کے بعد مزید عزت اور مرتبے حاصل کیے۔ فارسی نہایت اچھی جانتے اور خوب بولتے تھے۔ راقم کی ملاقات موصوف سے پہلی مرتبہ آغا کی نورزاد کی رہائش گاہ پر دلی میں ہوئی تھی۔ جب میں خدا بخش لائبریری میں تحقیق کر رہا تھا تو وہ پٹنہ تشریف لائے اور راقم کے ہمراہ خدا بخش لائبریری آئے۔ موصوف کو روپ متی اور باز بہادر کی تصویر پسند آئی جس پر شیخ سعدی کا یہ شعر لکھا ہوا ہے۔

" سرو سیمینا بہ صحرا می روی

سخت بد عہدی کہ بیما می روی "

یہ تصویر صاحب موصوف کو پسند آئی اور مجھ سے فرمایا کہ اس کی ایک خوب صورت نقل بنوا کر میرے پاس دلی بھیج دو۔ راقم نے پٹنہ کے مشہور مصور ہادی کو تکلیف دی کہ اس تصویر کی ایک اچھی نقل تیار کر دیں۔ ہادی مرحوم نے تصویر کی ایک نہایت ہی خوب صورت نقل تیار کی اور رنگ آمیزی ایسی کی تھی کہ جسے دیکھ کر مسٹر باجپئی خوش ہوئے اور ہادی مرحوم کو ڈیڑھ سو روپیے بطور نذرانہ دینا چاہا مگر انھوں نے اسے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ باجپئی صاحب نے شاید اس تصویر کو امریکہ میں کسی ادارہ کو تحفۃً دے دیا۔

پندرھواں باب ۱۵

یونیورسٹی گرانٹس کمیشن سے میرا تعلق اور دیگر ذمہ داریاں

یو جی سی کا انتخاب :

اس زمانے میں جب میں خدا بخش لائبریری کا ڈائرکٹر تھا تو یونیورسٹی گرانٹس کمیشن ایک اسکیم کے تحت پنشن یافتہ ممتاز پروفیسروں کو چھ ہزار روپیہ سالانہ بطور محنتانہ اور اس کے علاوہ ایک ہزار روپیہ متفرق اخراجات کے لیے سالانہ دیا کرتی تھی۔ ڈاکٹر ڈی۔ ایس۔ کوٹھاری جو اس زمانے میں یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کے چیرمین تھے، اپنے خط مورخہ ۴ فروری ۱۹۶۶ء سے راقم کو مطلع کیا کہ میرا انتخاب پٹنہ یونیورسٹی میں فارسی پڑھانے اور تحقیق کرانے کے لیے ہوا ہے۔ اس خط کے جواب میں راقم نے کوٹھاری صاحب کو مطلع کیا کہ میں ابھی خدا بخش لائبریری میں ڈائرکٹر کا کام کر رہا ہوں اور میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ ۳۰ ستمبر ۱۹۶۷ء کو استعفیٰ دے کر لائبریری کے کاموں سے سبکدوش ہو جاؤں۔ موصوف سے میں نے ایک سال ۹ مہینے کی مہلت طلب کی۔ اتنی طویل مہلت قواعد و ضوابط کے خلاف تھی اور سکریٹری یونیورسٹی گرانٹس کمیشن نے اتنی لمبی مہلت دینے کی سخت مخالفت کی مگر کوٹھاری صاحب نے ازراہ کرم مجھے اجازت دے دی کہ میں پہلی اکتوبر ۱۹۶۷ء سے پٹنہ یونیورسٹی میں کام کرنا شروع کر دوں۔

پٹنہ یونیورسٹی میں کام کی ابتدا :

راقم پہلی اکتوبر ۱۹۶۷ء کو پروفیسر مہندر پرتاپ سے جو اس زمانے میں پٹنہ کالج کے پرنسپل تھے، جا کر ملا۔ پرنسپل پرتاپ اتر پردیش کے رہنے والے ہیں اور میرے عزیز دوستوں میں ہیں۔ موصوف ترقی کر کے پٹنہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر ہوئے۔ پرنسپل پرتاپ کو یہ سن کر بڑی خوشی ہوئی کہ سات سال بعد میں پھر پٹنہ کالج واپس آ گیا ہوں۔ صاحب موصوف نے پٹنہ کالج کی نئی عمارت میں بالائی

منزل پر میرے لیے ایک کمرہ مخصوص کر دیا اور لائبریرین کو ہدایت کر دی کہ جو کتابیں مجھے درکار ہوں لائبریری انھیں فراہم کرے۔

میرا کام :

راقم ہفتہ میں تین دن سوموار، جمعرات اور سنیچر کو کالج جایا کرتا تھا اور ہر روز دو گھنٹے ایم اے کے لڑکوں کو پڑھایا کرتا تھا۔ یہ لڑکے مجھ سے قصائد خاقانی اور قصائد عرفی پڑھا کرتے تھے۔ ان کے علاوہ ایک دو لڑکے جو پی ایچ ڈی کر رہے تھے اپنے کاموں میں مجھ سے مدد لیا کرتے تھے۔ راقم پانچ سال تک اس طور سے یو۔ جی۔ سی کی خدمات کو انجام دیتا رہا۔ جب میں یو۔ جی۔ سی کے کاموں سے سبکدوش ہو گیا تو پٹنہ یونیورسٹی نے راقم کو تین سال کے لیے اسپیشل لکچرر بنا کر رکھا۔ دوران سیشن ۷۹-۱۹۸۰ یو۔ جی۔ سی نے راقم کو پونے دو ہزار روپیے ماہانہ پر ۹ مہینے کے لیے دیزٹینگ کو فیسر مقرر کیا اور اس کام کے اختتام پر راقم نے پٹنہ یونیورسٹی میں پڑھانے کے کاموں سے علیحدگی اختیار کر لی۔

مختلف ذمہ داریاں :

راقم کو دہلی یونیورسٹی نے ۲۲ مارچ ۱۹۷۱ء سے ۱۴ دسمبر ۱۹۷۳ء تک کے لیے فیکلٹی آف آرٹس کا ممبر نامزد کیا۔ میں ہمیشہ فیکلٹی آف آرٹس کے جلسوں میں شریک ہوا کرتا تھا اور ان موقعوں پر راقم کی ملاقات ہندوستان کے متعدد ممتاز پروفیسروں سے ہو جایا کرتی تھی۔ اس زمانے میں ڈاکٹر سید امیر حسن عابدی دہلی یونیورسٹی میں شعبۂ فارسی کے صدر تھے۔ ڈاکٹر نور الحسن انصاری جو آج کل دہلی یونیورسٹی میں فارسی کے صدر ہیں اس زمانے میں ترقی کر کے ریڈر ہو گئے تھے (سنہ ۱۹۸۸ء میں انتقال کر گئے)۔

پٹنہ یونیورسٹی کے زیر اہتمام انسٹی ٹیوٹ آف پبلک ایڈمنسٹریشن قائم ہے جس کے زیادہ تر ممبروں کو حکومت بہار نامزد کرتی ہے اور چند ممبروں کو وائس چانسلر پٹنہ یونیورسٹی منتخب کرتا ہے۔ ۱۸ ستمبر ۱۹۷۱ء کو وائس چانسلر نے یونیورسٹی کی طرف سے راقم کو تین سال کے لیے ایڈوائزری کمیٹی کا ممبر نامزد کیا اور راقم نے پانچ سال سے زیادہ اس کمیٹی میں رہ کر انسٹی ٹیوٹ کی خدمت کی۔ ڈاکٹر وی۔ پی۔ درما اس انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر تھے اور اپنے کاموں کو نہایت خوبی سے انجام دیا کرتے تھے۔ اس زمانے میں کمیٹی کے ممبران چیف سکریٹری بہار اور دیگر اعلیٰ حکام ہوا کرتے تھے۔

پٹنہ یونیورسٹی سنیٹ کی ممبری :

۲۰ اکتوبر ۱۹۷۱ء کو شری دیو کانت بروا (گورنر و چانسلر پٹنہ یونیورسٹی) نے راقم کو

بہت اصرار کے ساتھ پٹنہ یونیورسٹی سنیٹ کا ممبر نامزد کیا اور میں بحیثیت ممبر سنیٹ کے جلسوں میں شریک ہوا کرتا تھا۔ راقم نے محسوس کیا کہ جو نظم و ضبط پہلے سنیٹ کے جلسوں میں ہوا کرتا تھا وہ اب مفقود ہو چکا تھا۔ ممبران وائس چانسلر سے گستاخی سے پیش آتے اور اکثر آپس میں بھی جھگڑ جاتے تھے۔ یہ سب باتیں مجھے پسند نہ تھیں اس لیے میں سنیٹ کے جلسوں میں شریک نہ ہونے لگا اور کچھ دنوں بعد حکومت بہار نے اس سنیٹ کو ختم کر دیا۔

میرے اعزازات

پہلا اعزاز :

۱۴۔ اگست ۱۹۷۶ء کو صدر جمہوریہ ہند نے یوم آزادی کی انتیسویں سال گرہ کے موقع پر آٹھ اسکالروں کو ان کی علمی و ادبی خدمات کے اعتراف میں سند عطار کی اور انعامات سے نوازا جن میں چھ اسکالر سنسکرت کے ایک عربی اور ایک فارسی کے تھے۔ راقم کو فارسی کے کاموں کے صلہ میں سند دی گئی اور تین ہزار روپیہ سالانہ تاحیات بطور انعام ملا۔ تین ہزار کی رقم بڑھا کر اب دس ہزار روپیہ سالانہ کر دی گئی ہے۔ ۲۰۔ اپریل ۱۹۷۷ء کو راشٹرپتی بھون نئی دلی میں صدر جمہوریہ ہند نے ایک جلسہ کیا جس میں راقم کو سند اور ایک ریشمی چادر عطا کی۔ سند کی عبارت حسب ذیل ہے :

"میں بھارت کا قائم مقام راشٹرپتی بستپا داپنا جتی اقبال حسین کو فارسی کی مسلمہ قابلیت اور علمی شغف کے لیے یہ سند عطا کرتا ہوں۔"

دوسرا اعزاز :

راقم کو فارسی اساتذہ کی کل ہند انجمن نے لکھنؤ یونیورسٹی کے زیر اہتمام لکھنؤ میں بتاریخ ۲۹ دسمبر ۱۹۸۱ء کو اپنے چوتھے اجلاس میں استاذ ممتاز فارسی برائے ۱۹۸۱ء کا اعزاز پیش کیا۔ ایک سند عطا ہوئی اور اس کے ساتھ ایک قیمتی کشمیری شال دیا گیا۔ سند کی عبارت حسب ذیل ہے :

"انجمن استادان فارسی ہند بپاس خدمات شایستہ و ارزش جناب آقای پروفسور اقبال حسین در راه نشر و ترویج زبان و ادبیات و فرہنگ فارسی و تحقیقات ارزندہ آن دانشمند گرامی دار جمند را اعتراف نمودہ نشان استاد ممتاز فارسی را خدمت آنجناب تقدیم می نماید۔"

میری کتابوں کا دوسرا ایڈیشن :

کتاب "تحفۂ سامی" "صحیفہ پنجم جو سام مرزا صفوی کی تصنیف ہے۔ ۱۹۳۴ء میں راقم نے تصحیح کرکے پٹنہ یونیورسٹی کے توسل سے شائع کرایا۔ اس کتاب کو میں نے سر اسٹوورٹ میک فرسن سابق وائس چانسلر پٹنہ یونیورسٹی کے نام معنون کیا۔ اس کتاب کا دوسرا ایڈیشن ۱۹۷۳ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے طبع کرایا اور اس ایڈیشن کو راقم نے محمد رضا شاہ پہلوی شہنشاہ ایران کے نام معنون کیا، کیونکہ اس کتاب کی طباعت میں جو رقم خرچ ہوئی تھی شاہ ایران پبلی کیشن فنڈ سے ادا کی گئی تھی۔ آقائی کاردوش نے جو اس زمانے میں ہندوستان کے ایرانی سفارت خانہ میں ایک بڑا منصب رکھتے تھے اس کتاب کی طباعت میں بڑی دل چسپی لی۔

(۲) "دی اَرلی پرشین پوئٹس آف انڈیا" جس میں قدیم شعرائے ہند کا تذکرہ ہے، پٹنہ یونیورسٹی نے ۱۹۳۷ء میں شائع کرایا۔ اس کے پہلے ایڈیشن کو راقم نے اپنے انگریزی کے استاذ پروفیسر جون اسٹیوورٹ آرمر کے نام معنون کیا جن کا میں بڑا احترام کرتا تھا۔ اس کتاب کا دوسرا ایڈیشن پٹنہ یونیورسٹی نے ۱۹۸۰ء میں شائع کرایا۔ راقم نے اس ایڈیشن کو رومی کے اس شعر کے ساتھ اپنی بی بی مرحومہ کی یاد میں ڈیڈیکیٹ کیا :

فردا کہ خلائق را در حشر برانگیزند
بیچارہ من مسکین از خاک تو برخیزم

(۳) سکریٹری بہار اردو اکادمی پٹنہ نے راقم سے کئی بار اصرار کے ساتھ کہا کہ "دی اَرلی پرشین پوئٹس آف انڈیا" کا اردو ترجمہ اگر شائع کرا دیا جائے تو یہ کتاب بہت ہی کارآمد ثابت ہوگی۔ میں نے بہار اردو اکادمی کو اجازت دے دی کہ اس کتاب کا اردو ترجمہ کرا کر شائع کرا دے۔ چنانچہ بہار اردو اکادمی نے ۱۹۸۵ء میں اس اردو ترجمہ کو بنام "ہندوستان کے قدیم فارسی شعراء" شائع کیا۔ اس کتاب کو میں نے اپنے استاذ محترم الحاج ڈاکٹر عظیم الدین احمد مرحوم کے نام سے انتساب کیا ہے۔ جن کی زندگی میرے لیے ہمیشہ مشعل راہ بنی رہی ہے۔

پروفیسر محمد صدیق :

جب راقم پٹنہ یونیورسٹی میں یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کی طرف سے فارسی کا وزیٹنگ پروفیسر ہو کر آیا تو اس زمانہ میں ڈاکٹر محمد صدیق پٹنہ یونیورسٹی میں یونیورسٹی پروفیسر اور صدر شعبۂ فارسی تھے۔ پروفیسر موصوف ۱۹۵۸ء میں پٹنہ کالج میں فارسی کے لکچرر مقرر ہوئے اور راقم کے ساتھ

دو تین سال تک شعبہ فارسی میں خدمات انجام دیں۔ ۱۹۶۴ء میں پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری پٹنہ یونیورسٹی سے حاصل کی اور ۱۹۷۴ء میں یونیورسٹی پروفیسر مقرر ہوئے۔ زبان وادبیات فارسی کے ایک اچھے پروفیسر ہیں۔ پروفیسر موصوف کے اکثر شاگرد ان کی نگرانی میں پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کر چکے ہیں اور بہار کے اکثر کالجوں میں یہ لوگ فارسی زبان اور ادب کی خدمت کر رہے ہیں۔ ایک سال تک عربک وپرشین انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر بھی رہے اور دو سال تک پٹنہ یونیورسٹی میں ڈین کے عہدے پر فائز رہے۔ چار سال تک انجمن استادان فارسی ہند کے نائب صدر بھی رہے۔ اکثر فارسی میں اشعار کہتے ہیں۔ ان کی ایک فارسی نظم ۱۹۷۳ء میں رسالہ "سخن" میں شائع ہوئی۔ فارسی اور اردو میں صاحب موصوف کے متعدد مقالات مختلف رسالوں میں شائع ہو چکے ہیں۔ ڈاکٹر محمد صدیق ان دنوں پٹنہ کالج کے پرنسپل کے عہدہ پر فائز ہیں۔

———— ٭ ————

سولہواں باب

بہار مدرسہ اکزامینیشن بورڈ اور عربک پرشین انسٹی ٹیوٹ

ممبر و صدر بہار مدرسہ اکزامینیشن بورڈ :

راقم کو حکومت بہار نے پہلی مرتبہ ۱۹۳۸ء میں بہار مدرسہ اکزامینیشن بورڈ کا ممبر نامزد کیا اور وقتاً فوقتاً میں اس ادارہ کا ممبر نامزد ہوتا رہا۔ حکومت بہار نے ۱۳ نومبر ۱۹۶۵ کو ایک سرکاری حکم نامہ کے مطابق مجھے مدرسہ اکزامینیشن بورڈ کا صدر مقرر کیا اور میں اس عہدہ کے فرائض ۱۹۷۴ء تک انجام دیتا رہا۔ شاید ہی کسی نے اتنے دنوں تک مدرسہ اکزامینیشن بورڈ کی خدمت کی ہو۔ اس لمبے عرصہ میں زیادہ تر جناب صفات احمد صاحب اسسٹنٹ ڈائرکٹر ایجوکیشن (اسلامک) بحیثیت سکریٹری اپنے کاموں کو نہایت حسن و خوبی کے ساتھ انجام دیا کرتے تھے۔ سید ضیاء حسین بورڈ کے اسسٹنٹ تھے موصوف اپنی ذمہ داریوں کو خوب سمجھتے اور نہایت ایمان داری کے ساتھ کام کیا کرتے تھے۔ اگر یہ دو حضرات نہ ہوتے تو بورڈ کا کوئی کام وقت پر انجام نہ پا سکتا تھا۔

بورڈ کی تشکیل :

اس زمانے میں بہار مدرسہ اکزامینیشن بورڈ کے چودہ ممبران علاوہ صدر کے ہوا کرتے تھے اور بورڈ کا ایک سکریٹری بھی ہوتا تھا۔ دو ممبران بہ لحاظ عہدہ ہوا کرتے تھے جن میں ایک سپرنٹنڈنٹ آف اسلامک اسٹڈیز ہوتا اور دوسرا پرنسپل مدرسہ شمس الہدیٰ ہوا کرتا تھا۔ چھ مولوی ممبران ہوا کرتے تھے جن میں ایک شیعہ مولوی بھی ہوتا تھا۔ ان کے علاوہ ایک فارسی اور ایک عربی کے پروفیسر بھی نامزد کیے جاتے تھے۔ حکومت بہار اپنی مرضی کے مطابق تین ممبروں کو نامزد کیا کرتی تھی جو اپنے فن میں شہرت رکھتے تھے۔ اس زمانے میں یہ ایک چھوٹا بورڈ تھا مگر اس کے تمام کام قواعد و ضوابط کے مطابق نہایت ہی سرعت کے ساتھ انجام پاتے تھے۔ بورڈ کی میٹنگ سال میں

دور بتر مذ و رہوتی تھی اور مختلف کاموں کے لیے سب کمیٹیاں مقرر تھیں جو بورڈ کے حسب ہدایت کاموں کو انجام دیا کرتی تھیں۔ راقم کے زمانے میں نہایت ہی بلند مرتبہ لوگ بورڈ کے صدر مقرر کیے جاتے اور یہ لوگ بورڈ کے کاموں میں نہایت دلچسپی لیا کرتے تھے۔ سر خواجہ محمد نور، خان بہادر محمد اسمٰعیل ڈاکٹر عظیم الدین احمد، نواب زادہ سید محمد مہدی، پروفیسر عبد المنان بیدل جیسے نامور لوگ بورڈ کے صدر ہوئے ہیں۔ عرصہ دراز تک خان بہادر مبارک کریم بورڈ کے سکریٹری رہے۔

صدر مدرسہ اگزامنیشن بورڈ :

راقم ۱۹۶۵ء سے ۱۹۷۴ء تک مدرسہ بورڈ کا صدر رہا۔ اس پورے دور میں مسٹر صفات احمد صاحب اسسٹنٹ ڈائرکٹر بورڈ کے سکریٹری رہے۔ ممبران میں حسب ذیل حضرات تھے: مولوی سید محمد عابدی (مدرسہ سلیمانیہ پٹنہ سیٹی) مولوی سید فصیح احمد (مدرسہ احمدیہ استھاواں) مولوی عبید الرحمٰن (مدرسہ احمدیہ سلفیہ دربھنگہ) مولوی بہاء الدین (مدرسہ تنظیمیہ پورنیہ) مولوی شمس الحق (ابوبکر پور مظفر پور) مولوی محمد الیاس (مدرسہ اصلاحیہ رانچی) پروفیسر ڈاکٹر سید احمد (پٹنہ یونیورسٹی) پروفیسر سید حسن (پٹنہ یونیورسٹی) شری عبد الرزاق (ہائی انگلش اسکول اسلام پور) شری عبد المالک (سابق ایم ایل سی۔ دانا پور) ڈاکٹر عبد الحفیظ (پتھر کی مسجد پٹنہ) مولانا سید شاہ منت اللہ رحمانی (خانقاہ رحمانیہ مونگیر) مولانا سید شاہ عون احمد قادری (خانقاہ مجیبیہ پھلواری شریف) شری محمد عیسیٰ (بھاگلپور) حکیم احمد حسین (صاحب گنج، سنتھال پرگنہ) یہ سب ممبران مدرسہ بورڈ کے کاموں میں نہایت دلچسپی لیا کرتے تھے اور اس کے تمام جلسوں میں شریک ہوا کرتے تھے۔ راقم کو اپنے کام کی انجام دہی میں یہ حضرات بڑی مدد فرمایا کرتے تھے۔ مولانا سید شاہ منت اللہ رحمانی اور مولانا سید شاہ عون احمد قادری کی نامزدگی سے اس بورڈ کی بڑی عزت افزائی ہوئی اور ان صاحبان نے راقم کے تمام کاموں میں رہنمائی فرمائی جس کا میں شکر گزار ہوں۔

دفتر کا انتظام :

جب راقم صدر تھا تو ہفتہ میں چار بار مدرسہ اگزامنیشن بورڈ کے دفتر ضرور جاتا اور سید ضیاء حسین جو بورڈ کے اسسٹنٹ تھے کل کاغذات کو تیار کر کے میرے سامنے پیش کرتے اور میں اپنا حکم ان کاغذات پر لکھ دیا کرتا تھا۔ اس زمانہ میں مدرسہ اگزامنیشن بورڈ کے دو اہم کام تھے ایک کام تو مختلف مدارس کو الحاق دینا اور دوسرا مدرسہ بورڈ کے امتحانات کا انتظام کرنا اور ان کے

نتائج کو وقت پر شائع کرنا - یہ دونوں کام راقم کے زمانے میں قواعد و ضوابط کے مطابق بلا تاخیر انجام پاتے تھے ۔ الحاق کے متعلق صفات احمد صاحب اپنی رائے لکھ کر مجھے دے دیا کرتے تھے اور میں ان کاغذات کو مدرسہ اگزامینیشن بورڈ کے جلسوں میں ممبران کے سامنے پیش کر دیا کرتا اور مدرسوں کو بہت چھان بین کے بعد الحاق دیا جاتا تھا - اس معاملہ میں بورڈ کا رویہ سخت مگر منصفانہ ہوا کرتا تھا - ایک مدرسہ کی انتظامیہ کمیٹی کے ممبران کے درمیان مدرسہ کے جائے وقوع کے متعلق سخت اختلاف پیدا ہو گیا اور معاملات اتنے بڑھے اور پیچیدہ ہو گئے کہ فوجداری کی نوبت آگئی ۔ جب راقم کو خبر ملی تو مدرسہ کی انتظامیہ کمیٹی کے کل ممبران کو پٹنہ بلا کر کہا کہ اگر آپ لوگ معاملات کو حسن و خوبی طے نہ کریں گے تو مدرسہ کے الحاق کو منسوخ کر دیا جائے گا - بورڈ نے تین ممبران کی ایک کمیٹی بنائی کہ جائے وقوع کا معائنہ کر کے اپنی رپورٹ بورڈ کو پیش کریں ۔ عبدالمالک صاحب اس بورڈ کے صدر بنائے گئے اور انھوں نے کل معاملات کو صلح و صفائی کے ساتھ طے کرا دیا - اکثر ایسے مدارس جو قابل الحاق نہ ہوتے تھے بعض ممبران ان کے الحاق کی سفارش کیا کرتے ، مگر بورڈ ایسی سفارشوں کو نظر انداز کر دیا کرتا تھا - بورڈ انھیں مدارس کو الحاق دیا کرتا تھا جو ہر طور سے قابل الحاق ہوتے تھے ۔

بورڈ کے امتحانات :

سب سے مشکل اور پیچیدہ کام بورڈ کے امتحانات کا تھا - باصلاحیت اساتذہ کو ممتحن بنایا جاتا اور جب وہ اپنے سوالات کو بورڈ کے پاس بھیجتے تو بورڈ کی مختلف کمیٹیاں سوالات کو دیکھ کر ضروری تصحیح کر دیتی تھیں ۔ سوالات سرکاری پریس میں چھاپے جاتے تھے اور جناب صفات احمد صاحب اپنی نگرانی میں اس کام کو انجام دیتے تھے ۔ مختلف امتحانات کے پرچوں کو امتحان سے چند روز قبل امتحانات کے سپرنٹنڈنٹس کو حفاظت کے ساتھ بھیج دیا جاتا تھا اور امتحان کے روز ان کی سیل (مہر) توڑ کر امتحانات میں شریک ہونے والے طلبا کو پرچے تقسیم کیے جاتے تھے ۔ امتحان کی کاپیاں ممتحنوں کو بھیج دی جاتی تھیں اور یہ لوگ کاپیوں کی جانچ کر کے مارکس مدرسہ اگزامینیشن بورڈ کو بھیج دیا کرتے تھے ۔ زیر نگرانی سید ضیا حسین اور صفات احمد صاحب ٹیبولیٹرس رجسٹر میں امیدواروں کے مارکس کا اندراج کیا کرتے تھے اور امتحانات کے نتائج شائع ہونے تک ٹیبولیٹرس ہر چیز کو نہایت صیغۂ راز میں رکھتے تھے ۔ راقم کے زمانے میں شاید ہی کسی امیدوار کو اس کا نتیجہ وقت سے پہلے معلوم ہوا ہو ۔ راقم جب بورڈ کا صدر تھا تو تمام امتحانات کے نتائج وقت پر شائع کر دیے جاتے تھے ۔

امتحانات میں بدعنوانیاں :

راقم کے زمانے میں ملحقہ مدرسوں کی تعداد بڑھ گئی تھی اسی وجہ سے امتحانات کے سنٹرس میں بھی اضافہ کرنا پڑا۔ سنٹر سپرنٹنڈنٹس عام طور پر دوران امتحان اپنے کاموں کو جانفشانی اور ایمانداری سے انجام دیتے اور کسی طرح کی بدعنوانی نہ ہونے دیتے تھے۔ امتحان کے زمانے میں ضلع انسپکٹر آف اسکولس اپنے ماتحتوں کو مختلف سنٹرس میں معائنہ کے لیے بھیجا کرتا تھا اور یہ لوگ دیکھ بھال کر کے اپنی رپورٹیں سکریٹری مدرسہ اکزامینیشن بورڈ کو دیا کرتے تھے جن پر ضروری کارروائی مدرسہ اکزامینیشن بورڈ کے سالانہ جلسوں میں ہوا کرتی تھی۔ اگر کوئی امیدوار بدعنوانی کا مرتکب ہوتا تو اسے ایک یا دو سال کے لیے مدرسہ بورڈ کے امتحان میں شریک نہ ہونے دیا جاتا تھا۔ ایسے امیدواروں کی تعداد بہت کم ہوا کرتی تھی۔

ایک مرتبہ ضلع انسپکٹر آف اسکولس نے راقم کے پاس اپنی ایک رپورٹ روانہ کی اور اس رپورٹ کے ساتھ حدیث اور تفسیر کی کتابوں کے اوراق کو منسلک کر کے یہ تحریر کیا کہ گیارہ امیدواروں نے تفسیر اور حدیث کی کتابوں کو پیشاب خانہ میں لاکر رکھا اور اوراق کو کتابوں سے پھاڑ کر جوابات کے لکھنے میں مدد لی۔ یہ سب اوراق امیدواروں کے جیب سے دوران امتحان برآمد ہوئے ہیں۔ رپورٹ کے ساتھ تفسیر اور حدیث کی کتابوں کو بھی روانہ کیا جو پیشاب اور پانی سے تر ہو کر خراب ہو گئی تھیں۔ جب یہ رپورٹ مدرسہ اکزامینیشن بورڈ کے سالانہ جلسہ میں پیش کی گئی تو راقم کو بڑا افسوس ہوا کہ علم دین کے حاصل کرنے والے طلباء ایسی شرمناک حرکتیں کر سکتے ہیں اور میں نے فیصلہ کر لیا کہ ان لوگوں کے ساتھ کسی طرح کی رعایت نہ کی جائے۔ دو تین ممبران نے رائے دی کہ ان امیدواروں کو ایک سال تک امتحان میں شریک نہ ہونے دیا جائے۔ مگر راقم نے سخت رویہ اختیار کر کے ان گیارہ امیدواروں کو آئندہ تین سال تک امتحان میں شریک نہ ہونے کا حکم صادر کرایا۔ ان گیارہ امیدواروں نے حکم صادر ہونے کے بعد وزیر تعلیم بہار کے یہاں اپیل کی مگر وزیر تعلیم بہار نے بورڈ کے حکم کو برقرار رکھا۔ وزیر تعلیم بہار جو کہ ایک غیر مسلم تھے انھوں نے بھی راقم سے اس واقعہ پر اپنے افسوس کا اظہار کیا۔

صدر کا اعزازی عہدہ :

مدرسہ اکزامینیشن بورڈ کے صدر کا عہدہ برابر اعزازی رہا اور راقم کے وقت میں بھی یہ عہدہ اعزازی تھا۔ راقم سرکاری ملازمت سے سبکدوش ہو کر پنشن کی ایک معمولی رقم پر زندگی گذار رہا تھا مگر آٹھ سال تک میں نے کبھی بھی مدرسہ بورڈ کے آفس میں آنے جانے کے لیے کوئی کرایہ کی رقم وصول نہ کی۔

گرچہ میں اس کا حق دار تھا۔ جب پیٹرول کی قیمت میں اضافہ ہوا اور موٹر کار کے رکھنے میں کافی خرچ ہونے لگا تو میں نے اس کی شکایت وزیر تعلیم بہار سے کی جنھوں نے میرے لیے ڈھائی سو روپیہ ماہانہ کی رقم بطور "کار الاؤنس" مقرر کی جو قریب ڈیڑھ سال تک مجھے ملتی رہی۔ انگریزوں کے زمانے میں اکثر بڑے عہدے اعزازی ہوا کرتے تھے مگر تمام کام نہایت حسن و خوبی سے انجام پاتے تھے۔

بورڈ کا نیا نصاب اور ہادی حسن کمیٹی:

مدرسہ اکزامینیشن بورڈ کے نصاب میں عرصہ دراز سے کوئی تغیر و تبدل نہ ہوا تھا اور اس میں ترمیم کی سخت ضرورت تھی۔ نصاب کو جدید طرز کا بنانا ضروری تھا، اس لیے کئی مسلم ممبران بہار اسمبلی اور کونسل نے شری بدری ناتھ ورما سے جو اس زمانے میں وزیر تعلیم حکومت بہار تھے ملاقات کی اور درخواست کی کہ مدرسہ اکزامینیشن بورڈ کے نصاب کو جدید اور کارآمد بنایا جائے۔ شری بدری ناتھ ورما نے نصاب کی درستگی کے لیے ایک کمیٹی کی تشکیل کی جس کے صدر ڈاکٹر ہادی حسن (پروفیسر فارسی، علیگڑھ مسلم یونیورسٹی) مقرر کیے گئے اور راقم کے علاوہ حسب ذیل حضرات ممبر بنائے گئے:

نواب سید مبارک علی ممبر اسمبلی، مسٹر سید شاہ عزیز منعمی ممبر بہار کونسل، مولانا سید سلیمان ندوی دار المصنفین اعظم گڈھ، ڈاکٹر محمد اسحاق (پروفیسر فارسی، کلکتہ یونیورسٹی) شمس العلماء محمد یحییٰ، خان بہادر مبارک کریم، ڈاکٹر سید احمد، سید ریاست علی ندوی (پرنسپل مدرسہ شمس الہدیٰ، پٹنہ) بہت دنوں تک کمیٹی کی میٹنگ اس لیے نہیں ہوئی کہ مولانا سید سلیمان ندوی حج و زیارت مدینہ کے لیے گئے ہوئے تھے۔ شری بدری ناتھ ورما مولانا موصوف کا احترام کرتے تھے اور جب انھیں یہ خبر ملی کہ مولانا سید سلیمان ندوی حج کے بعد پاکستان چلے گئے اور اب ہندوستان نہ آئیں گے، تو یہ سن کر انھیں بہت افسوس ہوا۔ سکریٹری محکمہ تعلیم کو حکم دیا کہ نصاب کمیٹی کے انعقاد کے لیے کوئی تاریخ جلد مقرر کر دی جائے۔ سکریٹری نے ایک ماہ بعد کی تاریخ مقرر کر کے ہم لوگوں کو مطلع کیا۔ میٹنگ کے دن راقم شری بدری ناتھ ورما کی رہائش گاہ پر گیا اور ان کے ساتھ مدرسہ شمس الہدیٰ آیا۔ ہم لوگوں کے ساتھ سرکاری فوٹو گرافرس بھی آئے اور اس موقع پر مختلف تصویریں لیں جن میں سے کچھ تصویریں راقم کے پاس اب تک موجود ہیں۔ وزیر موصوف نے اپنی تقریر میں نصاب کو جدید بنانے پر بہت زور دیا اور فرمایا کہ موجودہ دور میں قدیم نصاب بالکل بیکار ہو چکا ہے اور نیا نصاب کا تیار کیا جانا نہایت ضروری ہے۔ تقریر کے

اختتام پر وزیر موصوف نے ہم لوگوں کا شکریہ ادا کیا اور کاموں کو جلد انجام دینے کے لیے کہا۔ ہم لوگوں نے جدید نصاب بنانے کا کام شروع کر دیا اور قریب دس روز میں کمیٹی کی رپورٹ، جدید نصاب اور سفارشات کے ساتھ سکریٹری محکمۂ تعلیم کو بھیج دی گئی۔ جب نصاب اور سفارشات کو سکریٹری محکمۂ تعلیم نے محکمۂ مالیات کو بھیجا تو محکمۂ مالیات نے کافی عرصہ بعد اخراجات کی تفصیل بنا کر محکمۂ تعلیم کو روانہ کیا۔ یہ سب کاغذات محکمۂ تعلیم میں تقریباً دو سال تک زیر غور رہے اور ہم لوگوں کی سفارشوں پر کوئی کارروائی نہ کی گئی۔ معاملہ اب تک ملتوی پڑا ہے۔

ایک دشواری :

جب نصاب کا وہ حصہ جس کا تعلق شیعہ عقائد سے تھا تیار ہونے لگا تو کمیٹی کو دشواری کا سامنا کرنا پڑا کیونکہ پروفیسر ڈاکٹر ہادی حسن جن کا تعلق شیعہ مذہب سے تھا انھوں نے شیعوں کی مستند مذہبی کتابوں سے اپنی لاعلمی ظاہر کی اور اسی طرح نواب سید مبارک علی صاحب نے بھی اپنی ناواقفیت کا اظہار کیا۔ راقم نے دوسرے روز مدرسہ سلیمانیہ کے مدرس اعلیٰ کو زحمت دے کر میٹنگ میں بلایا اور انھوں نے شیعہ دینیات کا نصاب خوبی سے مرتب کر دیا۔ اس کام میں راقم نے بھی مولانا کی مدد کی۔ جب شیعہ دینیات کا نصاب تیار ہو گیا تو ڈاکٹر ہادی حسن صاحب نے ہنس کر فرمایا کہ "اللہ حافظ ہے اس نصاب کا جس کو ڈیڑھ شیعوں نے مرتب کیا ہے۔"

ڈاکٹر ہادی حسن

ڈاکٹر ہادی حسن مرحوم اپنے زمانے کے ایک نامور فارسی کے پروفیسر تھے۔ انگریزی اور فارسی دونوں زبانوں پر کافی عبور حاصل تھا اور ان زبانوں میں نہایت ہی اچھی تقریریں کیا کرتے تھے۔ طرز تکلم ایسا تھا کہ ہر شخص ان کا گرویدہ ہو جاتا اور ان کی باتوں کو بہت شوق سے سنتا تھا۔ وہ ایک اعلیٰ خاندان کے چشم و چراغ تھے اور ان کے والد نے انھیں بڑے ناز و نعم سے پالا تھا۔ کیمبرج اور لندن میں تعلیم پائی تھی۔ جس کام میں لگ جاتے اسے پورا کر کے چھوڑتے تھے۔ پورے ہندوستان کا دورہ کر کے ایک کثیر رقم علی گڈھ میں میڈیکل کالج کے قائم کرنے کے لیے فراہم کی۔ یہ انھی کی محنتوں کا نتیجہ ہے کہ علی گڈھ میں ایک میڈیکل کالج قائم ہو سکا جو ان کی بہترین یادگار ہے۔ پٹنہ آتے تو ڈاکٹر سچیدانند سنہا کے یہاں قیام کرتے تھے۔ راقم ان کا بڑا احترام کرتا تھا۔ جو کچھ کام انھوں نے فارسی ادب پر کیا ہے وہ بے مثال ہے۔ انگریزی زبان میں شکنتلا کا ڈرامہ نہایت ہی ہنر اور خوبی سے سنایا کرتے تھے۔ راقم نے اتنی

خوبیاں ایک شخص میں بہت کم پائی ہے۔ راقم کو اس کا بڑا فخر ہے کہ مجھے موصوف کے ساتھ ہندوستان کی بہت سی یونیورسٹیوں میں کام کرنے کا موقع ملا۔ جب بہار مدرسہ بورڈ کا نیا نصاب کمیٹی نے تیار کیا تو پروفیسر موصوف اس نصاب کو ندوۃ العلماء اور دارالعلوم دیوبند لے گئے اور وہاں کے نامور اساتذہ سے مشورہ کر کے اس نصاب میں ضروری ترمیمیں کیں۔ افسوس ہے کہ حکومت بہار کی بے توجہی سے ہم لوگوں کی محنت رائیگاں گئی اور نیا نصاب جاری نہ کیا گیا۔

اچاریہ بدری ناتھ ورما:

جیسا کہ اوپر ذکر کیا جا چکا ہے کہ آچاریہ بدری ناتھ ورما (وزیر تعلیم بہار) کی کافی دلچسپی کی بدولت نصاب کمیٹی قائم کی گئی تھی مگر باوجود وزیر موصوف کی بے انتہا کوششوں کے کچھ نہ ہو سکا اور معاملہ موقوف التوا میں پڑا رہا جس کا وزیر موصوف کو برابر افسوس رہا۔ اچاریہ بدری ناتھ ورما پیشہ کے اعتبار سے معلم تھے۔ کانگریسی تحریک کے ابتدائی دور میں جب بہار ودیاپیٹھ پٹنہ میں قائم کی گئی تو اچاریہ بدری ناتھ ورما پروفیسر مقرر کیے گئے۔ ان کے علاوہ جگن ناتھ پرشاد، پریم سندر بوس، جگت نارائن لال، رام چرتر سنگھ، اور عبد البار ی بھی اس قومی کالج کے پروفیسر ہوئے۔ اچاریہ بدری ناتھ ورما، جگت نارائن لال اور رام چرتر سنگھ کانگریسی حکومت میں وزیر ہوئے۔ پروفیسر عبد الباری اگر چاہتے تو سب کچھ ہو سکتے تھے مگر مرتے دم تک انھوں نے فقیرانہ زندگی بسر کی۔ آچاریہ بدری ناتھ ورما ایک شریف اور نیک مزاج انسان تھے مگر کمزور ارادے کے تھے اس لیے بہت سے سرکاری کاموں کی انجام دہی نہ کرا سکتے تھے۔ وہ ہمیشہ کانگریس کے ایک سرگرم کارکن رہے اور کبھی بھی سرکاری عہدے کی پرواہ نہ کی۔ ڈاکٹر راجندر پرشاد کے اصرار پر موصوف نے وزیر تعلیم بہار کا عہدہ قبول کیا اور حتی الامکان اپنے کاموں کو خوبی سے انجام دینے کی کوشش کرتے رہے۔ صاحب موصوف کانگریس کے ایک نہایت ہی مخلص ممبر تھے مگر زندگی بھر گاندھی ٹوپی کا کبھی بھی استعمال نہ کیا۔ سیاہ رنگ کے کپڑے کی گول ٹوپی پہنا کرتے اور کاندھوں پر ایک چادر بھی ضرور رکھتے تھے۔ اس طرح کا لباس صاحب موصوف کو بہت زیب دیتا تھا۔ پان کھانے کے بڑے شوقین تھے، خود کھاتے اور دوستوں کو بھی کھلاتے۔ راقم کو بھی ایک مرتبہ بہت اصرار کے ساتھ پان کھلایا۔ موصوف نہایت ہی خوش مزاج اور ہنس مکھ انسان تھے۔ راقم کے پاس موصوف کی اسی لباس میں ایک تصویر بھی بطور یادگار موجود ہے۔

عربک اینڈ پرشین ریسرچ انسٹی ٹیوٹ :

۱۹۵۳ء میں وزیر تعلیم حکومت بہار نے راقم کو اپنے دفتر میں طلب کیا اور اظہار خیال کیا کہ پٹنہ میں عربی اور فارسی کے لیے ایک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ قائم کیا جائے۔ وزیر موصوف کے حکم پر سکریٹری محکمۂ تعلیم نے تین ممبروں کی ایک کمیٹی قائم کی جس میں راقم، پروفیسر عبدالمنان بیدل اور حافظ محمد قدوس تھے۔ راقم اس کمیٹی کا کنوینر بنایا گیا۔ ہم لوگوں نے ریسرچ انسٹی ٹیوٹ قائم کرنے کے لیے ایک نہایت ہی اچھی اسکیم مرتب کر کے حکومت بہار کو پیش کی۔ کچھ عرصہ تک اس اسکیم پر غور ہوتا رہا۔ اس زمانے میں حکومت اتنے اخراجات کو برداشت نہ کر سکتی تھی اس لیے ہم لوگوں کی اسکیم میں بہت کچھ تغیر و تبدل کر دیا گیا۔ ایک "کام چلاؤ" قسم کا انسٹی ٹیوٹ مدرسہ شمس الہدیٰ کی عمارت میں قائم کیا گیا اور ۲۲۔ اگست ۱۹۵۵ء سے یہ انسٹی ٹیوٹ تین کمروں میں وہاں اب تک کام کر رہا ہے۔ یہ نہایت افسوس کی بات ہے کہ اس انسٹی ٹیوٹ کو ایک شاندار نام تو عطا کیا گیا مگر کاموں کی انجام دہی کے لیے تیس (۳۰) سال گذر جانے کے بعد بھی انسٹی ٹیوٹ کے لیے ایسی عمارت جو اس کے شایان شان ہو اب تک تعمیر نہیں ہوئی ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ حکومت بہار کے کہنے اور کرنے میں کتنا تضاد ہے۔ ۱۹۔ نومبر ۱۹۶۳ء کو مدرسہ شمس الہدیٰ کے ہال میں انسٹی ٹیوٹ کے جنرل کاؤنسل کا جلسہ منعقد ہوا۔ اس جلسہ میں گورنر بہار، وزیر تعلیم بہار، ڈپٹی سکریٹری محکمۂ تعلیم، ڈائرکٹر آف پبلک انسٹرکشن، ڈپٹی ڈائرکٹر آف ایجوکیشن شریک تھے۔ شری اے۔ ایس۔ آئینگر گورنر بہار نے ایک لمبی تقریر کی۔ اس کے بعد شری ستیندر نرائن سنہا وزیر تعلیم بہار نے اپنی تقریر میں وعدہ کیا کہ حکومت بہار اس انسٹی ٹیوٹ کے فروغ کے لیے ہر ممکن کوشش کرے گی۔ ایک دوسرا جلسہ ۲۸۔ اگست ۱۹۶۶ء کو شری ستیندر نرائن وزیر تعلیم بہار کی آفس میں ہوا جس میں سکریٹری محکمۂ تعلیم حکومت بہار، ڈائرکٹر آف پبلک انسٹرکشن بہار، وائس چانسلر پٹنہ یونیورسٹی، وائس چانسلر بہار یونیورسٹی اور راقم شریک تھے۔ حسب دستور وزیر تعلیم نے انسٹی ٹیوٹ کی ترقی کے لیے اخراجات کے فراہم کرنے کا وعدہ کیا۔ راقم نے جب عمارت کے متعلق بات چھیڑی تو وزیر موصوف نے وعدہ کیا کہ عمارت کی تعمیر کے لیے سات لاکھ روپیے فراہم کیے جائیں گے، مگر ابھی تک یہ وعدہ پورا نہیں کیا گیا۔

انسٹی ٹیوٹ کی جنرل کاؤنسل، ایڈوائزری بورڈ، ایگزیکیٹیو کمیٹی :

انسٹی ٹیوٹ کا چانسلر گورنر حکومت بہار ہے اور وزیر تعلیم جنرل کونسل کا صدر ہوتا ہے۔ جنرل

کونسل کے ممبران کی تعداد ۲۴ ہے اور ایڈوائزری بورڈ میں پندرہ ممبران ہوتے ہیں۔ ایکزیکیٹیو کونسل ۱۱ ممبران پر مشتمل ہے۔ باوجود بہت سی دشواریوں کے پروفیسر عطا کاکوی، پروفیسر سید حسن، ڈاکٹر سید احمد اور ڈاکٹر سید علی حیدر نے جو اس انسٹی ٹیوٹ کے اساتذہ رہ چکے ہیں ۲۵ مخطوطات کو نہایت خوبی سے تصحیح کر کے طبع کیا اور اپنی اچھی کارکردگی کا مظاہرہ کیا ہے۔ اس ۳۳ سال میں ۱۲ طلبا سے زیادہ نے پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگریاں حاصل کیں اور کم از کم ۳۰ طلبا کامل کے امتحان میں کامیاب ہوئے ہیں۔ راقم کا تعلق جنرل کانسل اور ایڈوائزری بورڈ سے عرصہ دراز تک رہا ہے۔ اور انسٹی ٹیوٹ کی ترقی کے لیے میں برابر کوشاں رہا ہوں مگر افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ حکومت اب تک عدم توجہی سے کام لے رہی ہے۔

انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹرس :

عربک اینڈ پرشین انسٹی ٹیوٹ قائم ہونے پر ڈاکٹر سید احمد صاحب جو اُن دنوں پٹنہ یونیورسٹی میں عربی کے پروفیسر تھے، انسٹی ٹیوٹ کے پہلے ڈائرکٹر مقرر ہوئے۔ پروفیسر موصوف نے علی گڈھ مسلم یونیورسٹی سے عربی میں ایم اے کیا تھا اور حکومت بہار نے انھیں وظیفہ دے کر عربی کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے قاہرہ بھیجا جہاں سے انھوں نے ڈی۔ لٹ کی ڈگری حاصل کی۔ نہایت ہی متقی اور منکسر المزاج انسان تھے۔ انسٹی ٹیوٹ کے کاموں کو اپنے زمانہ میں نہایت ہی خوبی سے انجام دیتے رہے۔ ڈائرکٹری کے زمانہ میں صاحب موصوف نے ابو محمد کی کتاب "الوصایا" ایڈٹ کیا۔ ۱۹۶۱ء میں ڈاکٹر سید احمد یونیورسٹی پروفیسر آف عربک مقرر ہو کر پٹنہ یونیورسٹی واپس چلے گئے۔ ڈاکٹر سید احمد صاحب نے ابتدا میں ڈاکٹر ابو نصر محمد علی حسن جو پٹنہ کالج میں عربی کے پروفیسر تھے ان کی نگرانی میں تحقیقی کام کیا اور بعد ازاں پٹنہ کالج میں عربی کے لکچرر مقرر ہوئے۔ نہایت ہی مرنجان مرنج قسم کے انسان تھے اور جہاں بھی انھیں خدمات انجام دینے کا موقع ملا نہایت محنت اور دیانت داری سے کام کیا۔ پنشن پانے کے کچھ پہلے ہی سرطان کے مرض میں مبتلا ہو کر انتقال کیا۔ راقم پروفیسر مرحوم کی بڑی قدر کرتا تھا کیونکہ ان کے والد جناب حمید الدین صاحب ڈپٹی کلکٹر میرے والد مرحوم کے عزیز دوستوں میں تھے۔

پروفیسر سید حسن :

ڈاکٹر سید احمد کے بعد پروفیسر سید حسن انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر مقرر ہوئے۔ پروفیسر موصوف تقریباً تین سال ڈائرکٹر کے عہدہ پر فائز رہے اور اپنی خدمات کو نہایت خوبی اور محنت سے

انجام دیتے رہے۔ پروفیسر سید حسن سے میری ملاقات اس زمانے تھی جب میں ۱۹۳۶ء میں راونشا کالج سے پٹنہ کالج آیا۔ پروفیسر موصوف ۱۹۴۴ء میں بی۔این۔کالج سے پٹنہ کالج کے لکچرر ہوکر آئے۔ ان دنوں تعلیمی فضا پرسکون اور ہموار بھی اور ہر استاد اپنی ذمہ داری کو خوب سمجھتا تھا۔ پروفیسر عبدالمنان بیدل کے ساتھ راقم اور سید حسن صاحب شعبہ فارسی میں عرصہ تک درس وتدریس کا کام انجام دیتے رہے۔

سید حسن صاحب ۱۹۵۶ء میں حکومت بہار کی طرف سے فارسی جدید کے مطالعے کے لیے ایران گئے۔ ملازمت کے آخری دور میں پٹنہ یونیورسٹی میں فارسی کے یونیورسٹی پروفیسر اور صدر شعبہ مقرر ہوئے۔ پروفیسر موصوف کی نگرانی میں ایک درجن سے زیادہ طلبار نے پی۔ایچ۔ڈی کی ڈگریاں حاصل کیں اور پروفیسر موصوف جہاں بھی رہے پوری تندہی اور فرض شناسی سے کام کیا۔ ۱۹۷۲ء میں اپنے عہدے سے پنشن پائی۔ خدابخش لائبریری کے سکریٹری اور مدرسہ اکزامینیشن بورڈ کے صدر بھی رہے۔ ان کی تالیفات میں دو کتابیں "دیوان رکن صائن مروی" اور "دیوان شمس منظفر بلخی" قابل ذکر ہیں۔ صدر جمہوریہ ہند نے موصوف کو فارسی کی مسلمہ قابلیت اور علمی شغف کے لیے سند عطار کی تھی صاحب موصوف ہندوستان میں فارسی کے ایک بلند مرتبہ اور نامی پروفیسر تھے۔ ۱۹۸۸ء میں انتقال کر گئے۔

پروفیسر سید شاہ عطار الرحمٰن عطا کاکوی :

پروفیسر سید شاہ عطار الرحمٰن عطا کاکوی انسٹی ٹیوٹ کے تیسرے ڈائرکٹر مقرر ہوئے۔ اور انسٹی ٹیوٹ کے کاموں میں دلچسپی لیتے رہے۔ (۱) تذکرہ سفینۂ ہندی (۲) تذکرہ سفینۂ خوش گو (۳) دیوان خواجہ امین الدین (۴) اردو ترجمہ نشتر عشق (۵) تذکرہ سروش ایڈٹ کرکے نہایت آب وتاب سے شائع کرایا ہے۔ اور یہ پروفیسر موصوف کا بڑا کارنامہ ہے۔ طالب علمی کے زمانہ میں پروفیسر موصوف راقم سے ایک سال پیچھے تھے اور ہم دونوں کو استاد محترم ڈاکٹر عظیم الدین احمد سے فارسی پڑھنے کا شرف حاصل ہے۔ موصوف ایک اچھے شاعر اور ادیب ہیں۔ ملازمت کا زیادہ تر حصہ مظفرپور کالج میں گذرا اور وہاں بھی ادبی حلقوں میں نہایت شہرت حاصل کی تھی۔ اب تک تحقیق کاموں میں مصروف رہتے ہیں۔ جب میں خدابخش لائبریری کا ڈائرکٹر تھا تو صاحب موصوف وہاں سکریٹری کے عہدے پر مامور تھے۔ موصوف کو صدر جمہوریہ ہند نے فارسی کی مسلمہ قابلیت اور علمی شغف کے لیے سند عطا کی ہے۔

ڈاکٹر سیّد علی حیدر نیّر :

ڈاکٹر سید علی حیدر نیر کئی سال تک انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر رہے اور وہاں تدریسی خدمات بحسن وخوبی انجام دیتے رہے۔ موصوف کو فارسی ادب سے برابر دلچسپی رہی ہے اور تحقیقی کاموں میں اپنی قابلیت اور صلاحیت کا اچھا ثبوت پیش کیا ہے۔ موصوف کی شائع شدہ فارسی تالیفات ومقالات حسب ذیل ہیں۔ (۱) دیوان قاسم ارسلان طوسی (۲) اشعار پریشاں (۳) آصف نامہ (۴) عروض الہندی (۵) رسالہ ذکر مغنیان ہندوستان۔ جب راقم مدرسہ اگزامینیشن بورڈ کا صدر تھا تو کچھ دنوں تک صاحب موصوف مدرسہ اگزامینیشن بورڈ کے سکریٹری تھے۔ اور ہر موقع پر راقم کی مدد کرتے رہے۔

افسرالدولہ فیاض الدین حیدر :

پروفیسر فیاض الدین حیدر عرصہ دراز تک پٹنہ کالج میں فارسی کے استاذ رہے۔ موصوف کو حکومت ہند نے جدید فارسی کی تعلیم کے لیے وظیفہ دے کر ایران بھیجا۔ طہران یونیورسٹی میں ایک سال رہ کر جدید فارسی زبان اس زمانے کے نامی استاذوں سے پڑھی۔ جدید فارسی اچھی بول سکتے ہیں۔ ترقی کر کے انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر ہوئے اور بعد ازاں کچھ عرصہ تک لنگٹ سنگھ کالج مظفرپور کے پرنسپل بھی رہے اور وہاں سے واپس آکر ملازمت کی باقی مدت بحیثیت ڈائرکٹر انسٹی ٹیوٹ پوری کی۔ ۱۹۸۰ء میں صدر جمہوریہ ہند نے موصوف کو فارسی کی مسلمہ قابلیت اور علمی شغف کے لیے سند عطا کی۔

ڈاکٹر سیّد اطہر شیر :

ڈاکٹر سید اطہر شیر کا تعلق زیادہ تر زبان وادبیات عربی سے رہا ہے۔ حکومت ایران نے صاحب موصوف کو ۱۹۶۷ء میں ایک سال کا وظیفہ عطا کر کے دانش گاہ طہران میں جدید فارسی پڑھنے کا موقع عطا فرمایا۔ صاحب موصوف نے دانش گاہ طہران میں ممتاز ایرانی پروفیسروں سے جدید فارسی کی تعلیم پائی اور آخری امتحان میں اچھی کامیابی حاصل کی۔ جس زمانے میں راقم خدابخش لائبریری کا ڈائرکٹر تھا ان دنوں موصوف اسسٹنٹ ڈائرکٹر تھے۔ میں نے ان کی صلاحیت اور قابلیت کو مدنظر رکھتے ہوئے وظیفہ دیے جانے کے لیے سفارش کی تھی جو قبول ہوئی۔ خدابخش لائبریری میں صاحب موصوف کی ذمہ داری فہرست مخطوطات مرتب کرنے کی تھی اور انھوں نے

درج ذیل مخطوطات کو ترتیب دیا جو شائع ہو چکی ہیں۔

۱۔ فہرست مخطوطات فارسی جلد سوم (مرآۃ العلوم)

۲۔ فہرست مخطوطات عربی جلد سوم (مفتاح الکنوز)

۳۔ فہرست مخطوطات عربی متعلق تفسیر قرآن (توضیحی کیٹلاگ بزبان انگریزی)

۴۔ فہرست مخطوطات عربی متعلق حدیث

ایران سے واپس آنے کے بعد ایران وعراق کا اپنا سفر نامہ بنام "لالہ زار" اردو زبان میں ۱۹۶۸ء میں شائع کیا ہے۔ آج کل صاحب موصوف انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر کے عہدے پر فائز ہیں۔

سترھواں باب

میری ازدواجی زندگی اور اولاد

میری شادی :

۲۵، دسمبر ۱۹۳۰ء کو راقم کی شادی فخر النساء سے ہوئی۔ میری بیوی مسٹر ریاست حسین بیرسٹر کی اکلوتی بیٹی تھیں۔ خان بہادر حشمت حسین نے اپنے لڑکے ریاست حسین کو پندرہ برس کی عمر میں تعلیم کی غرض سے انگلستان بھیجا۔ انگلستان میں ان کی تعلیم لندن اور آکسفورڈ میں ہوئی۔ ۲۲ برس کے سن میں بیرسٹر ہوکر ہندوستان واپس آئے۔ موصوف نے بیرسٹری کی ابتدا چھپرہ سے کی اور پٹنہ ہائی کورٹ قائم ہونے کے بعد چھپرہ سے پٹنہ چلے آئے اور ہائی کورٹ میں بیرسٹری کرنے لگے۔ پٹنہ میں ان کی بیرسٹری اچھی چلی۔ صاحب موصوف انگریزی طرز کی زندگی گذارتے اور جو کچھ کماتے خرچ کر ڈالتے تھے۔ ان کی فضول خرچی کی کوئی انتہا نہ تھی۔ کئی سال تک مہارانی ہتھوا کے یہاں منیجر بھی رہے۔ جب آمدنی بڑھتی تو اسی تناسب سے ان کی فضول خرچی میں اضافہ ہوتا تھا۔ موٹر کار، گھوڑے گاڑیاں غرض کہ آرام کی کل چیزیں ان کے گھر میں موجود تھیں۔ انتخاب لڑنے کا انھیں ایک خبط تھا۔ میونسپلٹی سے لے کر کونسل آف اسٹیٹ تک کے انتخاب میں حصہ لیتے تھے۔ ان انتخابوں میں کبھی کامیاب ہوتے اور کبھی بری طرح سے شکست ہوتی تھی۔ فضول خرچی سے نوبت یہاں تک پہنچی کہ اپنی کل جائداد کو برباد کر دیا۔ اپنا رہائشی مکان واقع اکزیبیشن روڈ کو ڈاکٹر عبد الغفور کے ہاتھ فروخت کر کے کونسل آف اسٹیٹ دہلی کا انتخاب لڑے اور ناکامیاب ہوئے۔ اس مکان اور کمپاؤنڈ کی موجودہ قیمت ۵۰ لاکھ سے کم نہیں ہے۔ ان ناکامیوں کا اثر ان کے دل و دماغ پر بری طرح سے پڑا اور بیرسٹری چھوڑ کر پٹنہ سے چھپرہ چلے گئے جہاں ان کی سسرال تھی۔ راقم کی شادی کے پانچ مہینے کے بعد ۵۴ برس کے سن میں قضا کر گئے۔

میری بیوی :

میری بیوی کی تعلیم و تربیت قدیم طرز پر ہوئی تھی کیونکہ ان کی والدہ ایک قدامت پسند خاتون تھیں، مذہبی تعلیم کے علاوہ فارسی اور اردو کی بھی اچھی تعلیم پائی تھی۔ تھوڑی بہت انگریزی بھی جانتی تھیں، مختلف موضوعات پر اردو کی کتابیں بہت شوق سے پڑھا کرتیں اور آخر عمر میں صرف بزرگان دین کی سوانح عمریوں کا مطالعہ کرتی رہتی تھیں۔ اردو کی اچھی اچھی کتابیں پٹنہ یونیورسٹی لائبریری، پٹنہ کالج لائبریری اور اردو لائبریری سے منگا کر پڑھتی تھیں۔ انھیں اردو کے اچھے اشعار بہت یاد تھے۔ وہ سب خوبیاں جو ایک اچھی خاتون میں ہونی چاہیے ان میں موجود تھیں۔ مزاج میں سادگی، انکسار، فیاضی اور محبت بدرجہ اتم موجود تھی۔ اقربا پروری کے لیے مشہور تھیں۔ اپنے چھوٹے بھائی حفاظت حسین کی کالج کی تعلیم میں اچھی رقم خرچ کی۔ حفاظت حسین اسسٹنٹ رجسٹرار کواپریٹیو سوسائیٹیز ہوئے اور ۱۹۸۵ء میں اچانک انتقال کر گئے۔ بیوی فطرتاً مرنجان مرنج اور صاف دل خاتون تھیں۔ زندگی میں انھیں بہت دشواریوں کا مقابلہ کرنا پڑا مگر کبھی بھی ہمت نہ ہاریں۔ زندگی بھر والدہ مرحومہ کے احسانات کا تذکرہ کیا کرتی تھیں اور ان سے ایسی ہی محبت کرتی تھیں جیسی بیٹی ماں سے کیا کرتی ہے۔ پردہ کی سختی سے پابند نہ تھیں اور مرنے سے دس سال پہلے پردہ بالکل ترک کر دیا تھا۔ ہم لوگوں کے باہمی تعلقات برابر خوش گوار رہے۔ بیوی ہمیشہ میرے آرام کو اپنے آرام پر ترجیح دیا کرتی تھیں۔ عام طور سے بہار میں ساس بہو کے تعلقات ناخوش گوار ہوا کرتے ہیں مگر بیوی نے اپنی ساس کی برابر فرماں برداری کی اور ان کے حکم کو نہایت خوشی سے بجا لاتی تھیں۔ والد صاحب کے انتقال کے دس سال بعد تک والدہ مرحومہ ہم لوگوں کے ساتھ رہا کرتی تھیں اور اس دوران اکثر سخت بیمار ہو جاتیں۔ بیوی باوجود اپنی خرابی صحت کے والدہ مرحومہ کی دیکھ بھال اور علاج و معالجہ میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھتی تھیں۔ بیوی کو اپنی اولاد سے غیر معمولی محبت تھی اور ان لوگوں کی تعلیم کو کل باتوں پر مقدم سمجھتی تھیں۔ انھیں کی کوششوں کے بدولت بڑے لڑکے نے ایم۔ کوم کیا، منجھلے لڑکے نے انجینیرنگ کا امتحان پاس کیا اور چھوٹے لڑکے نے ڈاکٹری کے امتحان میں کامیابی حاصل کی۔ بیوی ہی کے اصرار پر راقم نے اگزیبیشن روڈ میں اپنا رہائشی مکان تعمیر کرایا۔ قریب بیس سال تک مختلف قسم کے امراض میں مبتلا رہیں اور اپنی سخت تکلیفوں کو صبر کے ساتھ برداشت کیا۔ ۲۶ مئی ۱۹۷۳ء کو ۷۵ برس کی عمر میں انتقال کیا اور پیر موہانی قبرستان میں مدفون ہوئیں۔ بیوی

کے انتقال کے بعد راقم اپنی روزمرہ کی زندگی میں ایک سخت تنہائی محسوس کرتا ہے اور اکثر موقعوں پر ان کی کمی محسوس ہوتی ہے ۔

میری اولاد :

میرے بڑے لڑکے مقبول حسین ۱۹۳۲ء میں پیدا ہوئے ۔ عربی، اردو اور انگریزی کی ابتدائی تعلیم گھر پر پانے کے بعد مسلم ہائی اسکول میں داخل ہوئے جہاں سے انھوں نے ہائی اسکول کا امتحان پاس کیا ۔ بی ۔ کوم کی تعلیم مارواڑی کالج میں ہوئی اور پٹنہ یونیورسٹی سے ایم ۔ کوم کے امتحان میں کامیاب ہوئے ۔ حکومت بہار کے محکمہ اعداد و شمار میں ملازم ہوئے اور آج کل اسسٹنٹ ڈائرکٹر آف اسٹیٹسٹکس کے عہدے پر فائز ہیں ۔ ان کی شادی مسٹر سید شمس العالم صاحب کی لڑکی سے ہوئی ۔ موصوف سینٹ زیویرس اور سینٹ مائیکل اسکولوں میں عرصہ تک اردو کے استاد رہے ۔ پنشن پانے کے بعد اب فارغ البالی کی زندگی گزر بسر کر رہے ہیں ۔ میرے منجھلے لڑکے اکبر حسین ۱۹۴۱ء میں پیدا ہوئے ۔ ابتدائی تعلیم گھر پر پانے کے بعد پٹنہ مسلم ہائی اسکول میں داخل ہوئے جہاں سے ہائی اسکول کا امتحان پاس کیا ۔ آئی ۔ ایس سی کی تعلیم پٹنہ سائنس کالج میں ہوئی ۔ آئی ۔ ایس سی پاس کرنے کے بعد بہار کالج آف انجنیرنگ میں داخلہ لیا جہاں سے انھوں نے میکانیکل انجنیرنگ میں ڈگری حاصل کی ۔ چھ ماہ تک حکومت بہار کے پبلک ورکس ڈپارٹمنٹ میں ملازمت کرنے کے بعد انڈین آئل کارپوریشن میں بحیثیت انجنیر ان کی تقرری ہوئی اور آج کل کلکتہ آفس میں بحیثیت منیجر (ٹیکنیکل) انڈین آئل کارپوریشن میں کام کر رہے ہیں ۔ ان کی شادی راقم کے چھوٹے بھائی مسٹر انور حسین کی لڑکی سے ہوئی ہے ۔ مسٹر انور حسین چیرمین بہار کمرشیل ٹیکسز ٹریبونل سے پنشن پا کر وکالت کرتے تھے ۔ ان کا انتقال ۲۲ جولائی ۱۹۸۴ء کو ہوا ۔ ایرپورٹ کے پاس جو قبرستان ہے اسی میں مدفون ہیں ۔ میرے چھوٹے لڑکے اشرف حسین ۱۹۴۲ء میں پیدا ہوئے ۔ ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی ۔ اسکول کی تعلیم پٹنہ مسلم ہائی اسکول میں ہوئی، جہاں سے انھوں نے ہائی اسکول کا امتحان پاس کیا ۔ آئی ۔ ایس سی کی تعلیم پٹنہ سائنس کالج میں ہوئی ۔ آئی ۔ ایس سی کے امتحان میں کامیاب ہونے کے بعد ڈاکٹری کی تعلیم کے لیے پٹنہ میڈیکل کالج میں داخلہ لیا جہاں سے انھوں نے ایم ۔ بی ۔ بی ایس کی ڈگری حاصل کی ۔ اس کے بعد اسی کالج سے فیزیالوجی (Physiology) میں ایم ۔ ایس سی اور ایم ۔ ڈی کے امتحانات پاس کیے ۔ ان کے علاوہ انھوں نے ایم ۔ ڈی کی ڈگری جنرل میڈیسین میں بھی حاصل کی ۔ ایم ۔ ایس سی کے امتحان میں فرسٹ کلاس فرسٹ ہو کر پٹنہ یونیورسٹی

سے ایک طلائی تمغہ بطور انعام پایا۔ تعلیم مکمل کرنے کے بعد پٹنہ میڈیکل کالج میں فیزی اولوجی میں لکچرر مقرر ہوئے اور بعد ازاں نالندہ میڈیکل کالج میں فیزی اولوجی کے پروفیسر رہے۔ انگلستان کے مختلف اسپتالوں میں کام کرنے کا شرف حاصل ہے آج کل سعودی عرب کے ریاض میڈیکل کالج میں بحیثیت پروفیسر فیزی اولوجی کام کر رہے ہیں۔ کئی کتابیں بھی تصنیف کی ہیں جو لندن سے شائع ہوئی ہیں اور ان کا شمار مقبول ترین کتابوں میں ہے۔

اشرف سلمہٗ نے مکہ مکرمہ میں حضرت مولانا سید شاہ امان اللہ قادری رحمۃ اللہ علیہ سے شرف بیعت حاصل کی اور ہمیشہ ان کے عزیز مریدوں میں رہے۔ اشرف حسین سلمہٗ کی شادی مسٹر محبوب عالم پنشن یافتہ آئی۔ اے۔ ایس کی منجھلی لڑکی سے ہوئی ہے۔ صاحب موصوف پنشن پاکر اپنے مکان واقع پاٹلی پترا کولونی میں قیام پذیر ہیں اور خوش حالی کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ ۱۹۸۶ء میں حج بیت اللہ کی سعادت نصیب ہوئی اور زیارت مدینہ منورہ کا بھی شرف حاصل کیا۔

خدا کے فضل سے راقم کے تینوں لڑکے ہونہار، بلند کردار، اخلاص شعار، اور سعادت مند ہیں۔ ماشاء اللہ سب صاحب اولاد ہیں۔ اللہ ان سبھوں کی عمر دراز کرے اور ہر طرح کی کامیابیوں سے مالا مال کرے۔ آمین

بہاری مسلمان اور تلک کی لعنت :

تقریباً ۲۵ سالوں سے بہاری مسلمانوں کے یہاں تلک لینے کی ہندوانہ رسم عام ہوگئی ہے، اور اس نازیبا اور مذموم رسم نے مسلمانوں کے معاشرے کو نہایت ہی گندہ کر دیا ہے۔ بہاری مسلمان خواہ چھوٹا ہو یا بڑا، جب اپنے لڑکے کی شادی کرنے لگتا ہے تو لڑکی والوں کو زیورات اور قیمتی چیزوں کی ایک لمبی فہرست پیش کرتا ہے اور اس کے ساتھ کثیر نقد رقم کا مطالبہ کرتا ہے۔ اس کے علاوہ براتیوں کے لیے نہایت ہی شاندار دعوت کی فرمائش کرتا ہے۔ راقم کا تجربہ ہے کہ بہت سے ایسے لوگ جنھوں نے کبھی اپنی موٹر کار نہیں رکھی ہے، اپنے لڑکوں کے جہیز میں اچھی اچھی موٹر کاریں مانگتے ہیں۔ لڑکی والے مجبوراً اپنی جائداد کو بیچ کر یا قرض لے کر جہیز کا سامان مہیا کرتے ہیں۔ اور اگر ایسا نہ کریں تو لڑکیوں کی شادی میں نہایت دشواری ہو جائے۔ شرم کی بات ہے کہ جہیز کی لعنت روز بروز بڑھتی جارہی ہے اور ہم لوگوں کا معاشرہ اس کو برداشت کر رہا ہے۔ اب وقت آگیا ہے کہ اس بری رسم کا جلد خاتمہ کیا جائے اور اسلامی شریعت کے مطابق شادیاں کی جائیں۔

اس معاملہ میں ہم لوگ رسول اکرم ؐ کی مثال کو بھول جاتے ہیں اور غیر مسلموں کی تقلید کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھتے ہیں۔

کی محمدؐ سے وفا تونے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں

یہاں پر یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ راقم نے اپنے ہونہار لڑکوں کی شادیوں میں نہ ایک پیسہ نقد لیا اور نہ جہیز۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے خزانۂ غیب سے ان لوگوں کو آرام کی کل چیزیں عطا فرمائیں۔

پدم بھوشن ڈاکٹر محمد عبدالحیؒ :

میری ازدواجی زندگی کے حالات میں کمی رہ جائے گی اگر مرحوم ڈاکٹر عبدالحی صاحب کا تذکرہ نہ کیا جائے۔

پدم بھوشن ڈاکٹر محمد عبدالحی ایم۔ڈی۔ ایف۔ آر۔ سی۔ پی۔ پٹنہ کے ایک نہایت ممتاز ڈاکٹر تھے اور اللہ تعالیٰ نے انھیں دست شفا عطا کیا تھا۔ آپ ڈاکٹر ذاکر حسین اور کئی دوسرے صدر جمہوریۂ ہند کے سرکاری معالج بھی رہے۔ موصوف ۱۹۸۵ء میں اس دنیا سے رحلت کر گئے اور باغ مجیبی پھلواری شریف میں مدفون ہوئے۔

میری اہلیہ مرحومہ تقریباً ۲۵ سالوں تک مختلف بیماریوں میں مبتلا رہیں۔ مرحومہ اپنا علاج موصوف کے علاوہ کسی دوسرے ڈاکٹر سے نہ کرائیں۔ ڈاکٹر عبدالحی صاحب نے مرحومہ کا علاج آخری دم تک کیا۔ بیماری کی اس طویل مدت میں صاحب موصوف باوجود ایک نہایت مشغول ڈاکٹر ہونے کے بڑی پابندی کے ساتھ موصوفہ کا علاج کرتے رہے۔ میں ان دنوں پٹنہ سائنس کالج کے احاطے میں رہتا تھا اور بسا اوقات رات کو جب مرحومہ کی حالت بہت خراب ہو جاتی تھی تو ڈاکٹر صاحب اگزبیشن روڈ سے چار کیلو میٹر کا فاصلہ طے کر کے دو دو ڈھائی بجے رات کو میرے یہاں مرحومہ کے طبی معائنہ کے لیے جایا کرتے تھے۔ میں ان کے ان تمام احسانات کو زندگی بھر فراموش نہیں کر سکتا۔ اللہ انھیں اپنے جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے۔

اٹھارھواں باب

میرے دو حج اور دو عمرے

۱۹۶۶ء سے ۱۹۸۵ء

میرے والدین کا حج :

۱۹۲۷ء میں والد صاحب مرحوم جن کا سن اس وقت ۴۸ سال تھا، والدہ کے ساتھ حج بیت اللہ کے لیے گئے۔ والد مرحوم نے راقم کو اپنے ساتھ سفر حج میں لے جانے کی خواہش ظاہر کی۔ اس زمانے میں بمبئی سے جدہ فرسٹ کلاس کا کرایہ آمد و رفت مع طعام بذریعہ بحری جہاز ۶۲۶ روپیے تھے۔ مکہ معظمہ میں فرسٹ کلاس ہوٹل کا کمرہ دس روپیہ پر مع طعام و قیام ملا کرتا تھا۔ والد صاحب مرحوم میرے حج کے سب اخراجات کو برداشت کرنے کے لیے تیار تھے۔ اس زمانے میں راقم پٹنہ کالج میں لکچرر تھا اور حکومت بہار مجھے چار ماہ کی رخصت پوری تنخواہ پر دینے کو تیار تھی۔ باوجود ان سب سہولتوں کے راقم سفر حج پر نہ گیا اور والدین کے ساتھ حج کرنے کی سعادت نصیب نہ ہوئی۔ جس کا مجھے آج تک افسوس ہے۔

میرا پہلا حج :

راقم پر حج بیت اللہ بہت پہلے فرض ہو چکا تھا مگر دنیاوی کاموں میں مشغول رہ کر فریضۂ حج کو وقت پر ادا نہ کر سکا۔ سرکاری ملازمت کی مدت ختم کر دی، تینوں لڑکے تعلیم سے فارغ ہو کر اپنے اپنے کاموں میں لگ گئے۔ ایگزبیشن روڈ میں اپنا رہائشی مکان تعمیر کر لیا اور جب تمام دنیاوی کاموں سے فراغت پائی تو ۶۲ سال کی عمر میں حج بیت اللہ کا خیال دل میں پیدا ہوا۔ اس تاخیر پر راقم بڑی ندامت محسوس کرتا اور اکثر غالب کا یہ شعر یاد آنے لگتا ہے :-

کعبے کس منہ سے جاؤ گے غالب ٭ شرم تم کو مگر نہیں آتی

دنیاوی کاموں کو فریضۂ حج پر ترجیح دینا ایک بڑی گناہ کی بات ہے۔ میں نے اللہ سے اس گناہ کی معافی مانگی اور سفر حج کے لیے کمربستہ ہوگیا۔ میرے دیرینہ دوست ڈاکٹر مسعود الحق کو جب یہ خبر ملی کہ راقم سفر حج پر جانے والا ہے تو وہ مجھ سے آکر ملے اور صاحب موصوف نے میرے ساتھ جانے کی خواہش ظاہر کی۔

ہم لوگوں کے قافلے میں راقم اور ڈاکٹر مسعود الحق کے علاوہ میری بیوی، میری بہن (زوجہ مرحوم سید امین احمد مرحوم آئی۔سی۔ایس) اور میری ممانی (زوجہ مرحوم غلام وارث مرحوم وکیل) تھیں۔ ان سب لوگوں نے بہت اصرار کرکے راقم کو سفر کے کل کاموں کا ذمہ دار بنایا۔ میں نے پٹنہ سے بمبئی تک کا پانچ ریلوے ٹکٹ خریدا اور ہوائی جہاز میں پانچ جگہیں جدہ تک کی مخصوص کرائیں اس کے بعد پانچ ٹکٹیں ہوائی جہاز کی جدہ سے مدینہ تک کے لیے خریدیں۔ ہم لوگوں کا قافلہ ۱ مارچ ۱۹۶۷ء کو پٹنہ سے بذریعہ ریل بمبئی کے لیے روانہ ہوا اور ۹۔ مارچ ۱۹۶۷ء کو ہم لوگ بمبئی سے جدہ پہنچے۔ بمبئی کے قیام کے دوران ہم لوگ کئی دنوں تک بمبئی پولس کلب میں ٹھہرے جس کا انتظام میرے چھوٹے بھائی مرحوم انور حسین مرحوم نے پہلے سے کر دیا تھا۔ ڈاکٹر مسعود الحق کے صاحبزادے ڈاکٹر مصباح الحق اور راقم کے ایک عزیز مسٹر محی الدین جو ریلوے میں ملازم تھے ہم لوگوں کے ہمراہ بمبئی گئے اور دوران سفر ہر طرح کی مدد پہنچائی۔ نہایت افسوس کی بات یہ ہے کہ دونوں حضرات عین جوانی میں انتقال کر گئے۔ اللہ غریق رحمت کرے۔

بمبئی کا قیام :

۳۔ مارچ ۱۹۶۷ء کو ہم لوگوں کا قافلہ بمبئی پہنچا۔ وکٹوریہ ٹرمینس اسٹیشن سے ہم لوگ پولس کلب گئے جہاں قیام کے لیے دو کمرے پہلے سے مخصوص تھے۔ پولس کلب میں رات کا کھانا نہیں ملتا تھا اس لیے محی الدین کچھ اچھے کھانے ایک ایرانی ہوٹل سے لائے جسے ہم لوگوں نے شوق سے کھایا۔ دوسرے دن میرے عزیز دوست پروفیسر نجیب اشرف ندوی ہم لوگوں سے ملنے آئے اور راقم نے ان کے ساتھ دس بجے دن کو حج کمیٹی کے ایکزکیٹو آفیسر سے ملاقات کی۔ انھوں نے ہم لوگوں کے پلگرم پاس اور ہوائی جہاز کی ٹکٹوں کو رسید لے کر راقم کے حوالہ کیا۔ اس زمانہ میں زاد راہ کی رقم زرمبادلہ ۹۳۰ ریال جو ۷،۱۵ روپیے کے برابر ہوتی ہر حاجی کو ادا کرنی پڑتی تھی۔ اس رقم کی ہنڈیاں ۷۔ مارچ ۱۹۶۷ کو راقم نے اسٹیٹ بنک کی حج کمیٹی "پے آفس" سے حاصل کی۔ اس زمانے میں ہر حاجی کے لیے ضروری تھا کہ وہ جہاز کی روانگی سے پہلے پانچ دنوں تک بمبئی میں قیام کرے کیونکہ بمبئی کا شہر سفینہ

کے مرض سے محفوظ سمجھا جاتا تھا۔ دورانِ قیام روزانہ ہم لوگ حج کمیٹی کے دفتر جایا کرتے تھے جہاں بہت سے عازمین حج سے ملاقات ہوجاتی تھی۔ پروفیسر نجیب اشرف ندوی بھی وہاں آجایا کرتے تھے۔ حج کمیٹی کا دفتر پولس کلب سے دور نہ تھا اس لیے آنے جانے میں کوئی دشواری نہ ہوتی تھی۔ ڈاکٹر مسعود الحق اور راقم نے تولیوں کا احرام ایک دُکان سے خریدا جو حج کمیٹی کے دفتر میں واقع تھی۔ اللہ کے فضل سے بمبئی میں ہم لوگوں کا قیام بہت ہی خوش گوار رہا اور کسی طرح کی تکلیف نہ ہوئی۔ ڈاکٹر مصباح الحق اور محی الدین برابر ہم لوگوں کے ساتھ رہا کرتے اور کل کاموں کو حسن وخوبی انجام دیا کرتے تھے۔

حجاز کے لیے روانگی :

ہم لوگوں کو ۹۔ مارچ ۱۹۶۷ء کو بمبئی سے حجاز کے لیے روانہ ہونا تھا اس لیے اس روز علی الصباح غسل کرکے ہم سب لوگوں نے عمرہ کے لیے احرام باندھا اور بمبئی کے سانتاکروز ایرپورٹ جانے کے لیے تیار ہو گئے۔ اپنی زندگی میں راقم نے اچھے سے اچھا کپڑا پہنا ہے مگر جامۂ احرام کی زیب و زینت کسی دوسرے لباس میں نظر نہ آئی۔ جب ہم لوگ سانتاکروز ایرپورٹ پہنچے تو حاجیوں اور ان کو الوداع کہنے والوں کا ایک ہجوم تھا۔ ہم لوگ ایر انڈیا کے چارٹرڈ فلائٹ سے قریب ۹ بجے روانہ ہوکر پانچ گھنٹے بعد جدہ پہنچ گئے۔ ڈاکٹر مسعود الحق کے رشتہ دار اور راقم کے دوست مولوی ظہیر قاسم صاحب ہم لوگوں کے استقبال کے لیے جدہ ایرپورٹ پر موجود تھے۔ ان کے ساتھ ہم لوگوں کے معلم سید محبوب شیخ کے بڑے صاحبزادے بھی حاضر تھے۔ ان دنوں ظہیر قاسم صاحب کے صاحبزادے مسٹر منہاج الدین احمد جدہ کے ہندوستانی سفارت خانہ میں ملازم تھے اور ان کی رہائش گاہ جدہ میں شارع عنیزہ پر واقع تھی۔ ظہیر قاسم صاحب ہم لوگوں کو اپنے صاحبزادے کی رہائش گاہ پر لے گئے۔ ہم لوگ ظہیر قاسم صاحب کے یہاں جاکر کافی دیر تک ٹھہر گئے۔ جب مکہ جانے کے لیے بس کی تلاش میں جدہ کے ہوائی اڈہ پر آئے تو معلوم ہوا کہ تھوڑی دیر بعد ایک بس مکہ معظمہ کے لیے روانہ ہونے والی ہے۔ ہم لوگ اس بس میں جاکر بیٹھ گئے۔ اس بس میں سفر کرنے والے تمام مسافر نائجیریا کے باشندے تھے جو حج کے لیے آئے تھے۔ ان لوگوں میں کوئی نظم وضبط نہ تھا۔ بس روانہ ہوئی تو یہ لوگ اپنی زبان میں گانے لگے اور جب بس مکہ معظمہ کے قریب پہنچی تو ان لوگوں نے اور بھی شور و غل مچایا۔ بس کی چادر پر ہاتھ مارتے اور گاتے۔ راقم کو ان لوگوں کی یہ وحشیانہ حرکت

پسند نہ آئی۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ یہ لوگ خوش ہو کر اپنی زبان میں اللہ کا شکر ادا کر رہے ہیں۔

مکہ معظمہ کا قیام:

مکہ معظمہ پہنچنے کے بعد ہم لوگوں نے خانہ کعبہ کا طواف اور سعی کر کے عمرہ ادا کیا۔ ہم لوگوں کے قیام کا انتظام سید محبوب شیخ نے اپنے بھتیجے جعفر شیخ کے مکان میں کیا جو جبل الہند پر واقع تھا۔ اس مکان میں ہم لوگوں کے آرام کا کل سامان موجود تھا۔ یہ جگہ حرم کعبہ سے کچھ دور تھی اس لیے وہاں آنے جانے میں عورتوں کو دشواری ہوا کرتی۔ دو تین روز بعد پٹنہ سے ایک دوسرا قافلہ یہاں قیام کے لیے آیا جس میں مسٹر سید اکبر حسین ایڈوکیٹ مع اہلیہ، ڈاکٹر حسیب صاحب مع اہلیہ اور بیگم ریاست حسین زوجہ ڈاکٹر ریاست حسین مرحوم تھیں۔ ان لوگوں کے علاوہ مولوی عبدالجبار صاحب اپنے نواسہ افضل کے ساتھ یہاں ٹھہرنے کو آئے۔ عبدالجبار صاحب میرے خالہ زاد بھائی سید شوکت کریم کے خسر تھے۔ اس دوسرے قافلہ کے آنے کے بعد ایسا معلوم ہونے لگا کہ ہم سب لوگ پٹنہ میں مقیم ہیں اور وقت نہایت خوشی اور اطمینان سے گذر گیا۔ سید محبوب شیخ حج سے قبل ہم لوگوں کو نہایت آرام سے منیٰ لے گئے۔ یہاں ہم سب لوگوں کے لیے الگ الگ خیمے مخصوص تھے۔ اس زمانے میں حجاز کا موسم نہایت خوش گوار تھا اس لیے ہم لوگوں کو خیموں میں کافی آرام ملا۔ منیٰ میں سید محبوب شیخ کی شان دیکھنے کے لائق تھی۔ شیخ موصوف موٹے تازے اور وجیہ آدمی تھے۔ اپنے خیمہ کے سامنے بڑی شان سے بیٹھ کر حقہ پیتے۔ ان کا حقہ نہایت ہی بلند اور خوب صورت تھا جس کی نے پیچ بھی بڑی لمبی تھی۔ شیخ کے ملازمین کچھ دیر دیر پر چلم بدل دیا کرتے تھے۔ لوگوں پر ان کا رعب اتنا غالب تھا کہ ان کی خیمہ گاہ میں کسی غیر آدمی کے آنے کی ہمت نہ ہوتی تھی۔ حج کے روز جعفر شیخ ہم لوگوں کو بہت آرام سے عرفات لے گئے۔ ہم لوگوں کے لیے وہاں بھی قیام کے لیے پہلے ہی سے خیمے مخصوص کر دیے گئے تھے۔ حج کے بعد عرفات میں سید محبوب شیخ نے اپنے کل حاجیوں کو ایک پر تکلف دعوت دی۔ ان کے انتظام سے ہم لوگوں کو بہت آرام ہوا۔ شام کو عرفات سے ہم لوگ مزدلفہ پہنچ گئے، جہاں رات کا قیام لازمی ہے۔ مزدلفہ کی رات ایسی سہانی تھی کہ راقم کو ابھی بھی بار بار یاد آتی ہے۔ شیخ کے دوسرے بھتیجے سید ابراہیم شیخ کے ہمراہ ہم لوگ مزدلفہ سے منیٰ کے لیے روانہ ہوئے۔ راستہ موٹر کاروں، بسوں اور لوگوں کے ہجوم سے اتنا بھرا ہوا تھا کہ ایک قدم آگے جانے کی گنجائش نہ تھی۔ ہم لوگوں نے اپنے کل سامان کو موٹر بس میں چھوڑ دیا اور پا پیادہ منیٰ واپس آ گئے۔ ہم لوگوں کے ساتھ عورتیں بھی پیادہ پا آ گئیں۔ سید ابراہیم شیخ نے قربان گاہ جا کر ہم لوگوں

کی طرف سے جانوروں کی قربانیاں کرائیں۔ اس کے بعد شام کو ہم لوگوں نے مکہ معظمہ جاکر طواف زیارت کیا۔
دوسرے روز رمی جمار کے لیے گئے تو وہاں لوگوں کا اس قدر مجمع تھا کہ راقم اور ڈاکٹر مسعود الحق کے لیے شیطان کو کنکریاں مارنا ایک نہایت ہی مشکل کام ہوگیا۔ خیریت تھی کہ ہم لوگوں کے ساتھ شیخ کا ایک نہایت ہی مضبوط ملازم تھا جو ہم لوگوں کے لیے راستہ ہموار کرتا گیا۔ جب ہم لوگ شیطان کو کنکریاں مار کر واپس آنے لگے تو راقم اور ڈاکٹر مسعود الحق کو اس مجمع غفیر میں چوٹیں آئیں۔ الحمد للہ کرکے اپنے قیام گاہ پر واپس آئے۔ ڈاکٹر مسعود الحق کو سر میں ایسی چوٹیں آئیں کہ کئی دنوں تک درد رہا۔ اس زمانہ میں رمی جمار میں بے انتہا بدنظمی رہتی تھی۔ لوگ سخت زخمی ہوجاتے اور کچھ لوگ مر بھی جاتے تھے۔ منیٰ کے قیام کو ختم کرکے ہم لوگ مکہ مکرمہ واپس آگئے۔ دوران حج راقم کی ملاقات کئی لوگوں سے ہوئی جو میرے بچپن کے دوست تھے اور ترک وطن کرکے انگلستان اور یورپ میں بس کر وہاں کے شہری ہوگئے تھے۔ سید منور حسین میرے بچپن کے ساتھی تھے اور انگلستان جاکر علم ریاضی میں لندن یونیورسٹی سے اچھی ڈگری حاصل کرکے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں علم ریاضی کے پروفیسر ہوئے۔ ہندوستان میں جی نہ لگنے کے باعث معلمی کا پیشہ ترک کرکے انگلستان چلے گئے اور تبلیغی جماعت میں داخل ہوکر اسلام کی خدمت کرنے لگے۔ اپنی جائداد کا ایک بڑا حصہ تبلیغی جماعت کے لیے وقف کردیا اور آخر دم تک اس جماعت کے امیر اور ایک سرگرم کارکن رہے۔ کچھ عرصہ ہوا کہ انتقال کرگئے۔ ایک گم گشتہ دیرینہ دوست سے مل کر قلبی سکون حاصل ہوا اور اللہ کا شکر بجالایا۔

مسجد حرام اور کعبہ :

راقم جب پہلے پہل عمرہ کرنے کے لیے مسجد حرام میں داخل ہوکر کعبہ بیت اللہ کے طواف کے لیے جانے لگا تو اللہ کی شان کریمی یاد آئی کہ مجھ جیسے گنہگار کو بھی حج کی سعادت حاصل ہونے والی ہے۔ اللہ نے ہمت بخشی اور میں نے نہایت ہی انہماک کے ساتھ طواف اور سعی کے فرائض کو انجام دیا۔
میرے ساتھ میری بیوی مرحومہ بھی تھیں جو ایک دائم المریض خاتون تھیں اور ان کے بائیں پیر پر فالج کا اثر بھی تھا۔ اس کے باوجود انھوں نے بغیر کسی مدد کے طواف اور سعی کرڈالا۔ ان دنوں کعبہ بیت اللہ اور مقام ابراہیم کے درمیان مطاف بہت تنگ تھا۔ راقم کو اس پر حیرت ہوئی کہ بیوی مرحومہ سات مرتبہ اس تنگ جگہ سے کس طرح گذر سکیں۔ اب تو مقام ابراہیم کو آگے بڑھا دیا گیا ہے اور وہاں پر مطاف کافی چوڑا ہوگیا ہے۔ پہلی سی دشواری اب باقی نہیں رہی۔ راقم نے بہت سی

خوب صورت عمارتیں دیکھی ہیں اور ہزاروں خوب صورت عمارتوں کی تصویریں بھی نظر سے گذری ہیں۔ مگر سادگی کے ساتھ جو حسن اللہ نے خانۂ کعبہ کو بخشا ہے اس کی مثال دنیا میں نہیں ملتی ہے۔ اس کی شان اور شوکت دیکھنے والوں کے دل و دماغ میں ہمیشہ کے لیے اپنی ایک جگہ بنا لیتی ہے۔ یہ کیوں نہ ہو؟ دنیا کے تنکدوں میں یہ خدا کا پہلا گھر ہے۔ خانہ کعبہ کو دیکھنا ہی ایک عبادت ہے۔ راقم کی نظر جب خانہ کعبہ پر پڑتی تو خاقانی کے مثنوی اشعار جو اس نے خانہ کعبہ کے نظارے سے متاثر ہو کر لکھے ہیں یاد آجاتے اور دل پر ایک والہانہ کیفیت طاری ہو جاتی تھی۔ مکہ معظمہ سے روانگی کے پہلے دستور کے مطابق مسجد حرام میں جا کر طواف وداع کیا اور خانہ کعبہ سے رخصت ہو کر جب باب وداع سے باہر آیا تو اللہ سے دعا کی کہ "الٰہی این کرم بار دگر کن" اللہ نے میری اس دعا کو شرف قبولیت بخشا اور پانچ سال بعد دوبارہ حج کو گیا۔

مسجد حرام اور خانہ کعبہ کی عظمت

مسجد حرام اسلامی دنیا کی سب سے بڑی اور عظمت والی مسجد ہے۔ دنیا میں شاید ہی اس سے بڑی کوئی عبادت گاہ ہے۔ بیک وقت یہاں لاکھوں مسلمان اپنی نمازیں ادا کرتے ہیں اور لوگ یہاں ۲۴ گھنٹے عبادت میں لگے رہتے ہیں۔ مسجد حرام کا وہ حصہ جسے ترکوں نے تعمیر کیا ہے، نزاکت اور خوب صورتی کا ایک اعلیٰ نمونہ ہے۔ اس مسجد کی پشت پر اب جو عمارت تعمیر کی گئی ہے وہ اسلامی طرز تعمیر کی ایک نہایت ہی دل آویز شاہکار ہے۔ چاروں طرف بلند و بالا دروازے بنائے گئے ہیں۔ اتنے دروازے اس لیے ہیں کہ نمازیوں کو جن کی تعداد ہر نماز میں ایک لاکھ سے زیادہ ہوا کرتی ہے۔ انھیں آنے جانے میں کوئی دقت نہ ہو۔ مسجد کے مینارے اتنے بلند ہیں کہ دور سے نظر آتے ہیں۔ شام سے صبح تک یہ مینارے برقی روشنیوں سے منور رہتے ہیں۔ مکہ میں داخل ہوتے وقت راقم کو ان میناروں کی روشنی کچھ دور سے نظر آئی اور میں اس نظارے سے بیحد متاثر ہوا۔ مسجد کے اندر برقی روشنیاں اتنی زیادہ ہیں کہ پوری مسجد بقعۂ نور نظر آتی ہے۔ اور ان روشنیوں کی بدولت خانہ کعبہ کا سیاہ غلاف نہایت ہی خوب صورت اور منور نظر آتا ہے۔ ۱۹۶۷ء میں جب راقم پہلی بار حج کو گیا تو نئی مسجد کی پہلی منزل تعمیر ہو چکی تھی۔ مسجد حرام کے بیچ میں کعبۂ بیت اللہ کی عمارت ہے، جس کو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اللہ کے حکم سے تعمیر کیا تھا۔ اس کے ایک کونے پر حجر اسود نصب ہے۔ طواف سے پہلے حاجی حجر اسود کا بوسہ لیتا ہے اور یہاں سے خانہ کعبہ کا طواف شروع کرتا ہے اور اسی طرح سات مرتبہ حجر اسود

کا بوسہ لے کر طواف کو ختم کرتا ہے۔ جب حجر اسود کے سامنے لوگوں کی کثرت ہوتی ہے اور بوسہ لینے کا موقع نہ ملتا ہے تو حاجی حجر اسود کی طرف رخ کر کے استیلام کرتا ہے اور طواف کرنا شروع کر دیتا ہے۔ ترکوں کے زمانے میں غلاف کعبہ مصر سے بن کر نہایت ہی تزک اور احتشام کے ساتھ آتا تھا۔ جہاں تک راقم کو علم ہے، غلاف کعبہ سعودی دور میں ایک مرتبہ ہمارے ملک سے بھی بن کر گیا ہے۔ اب غلاف کعبہ غالباً سعودی عرب ہی میں بنایا جاتا ہے۔ پرانے غلاف کعبہ کے ٹکڑوں کو حاجی اپنے ساتھ لے جاتے ہیں اور بطور تبرک اپنے پاس محفوظ رکھتے ہیں۔ راقم جب ۱۹۶۰ء میں ایک مرتبہ خانہ کعبہ کا طواف کر رہا تھا تو میرے آگے ایک مصری خاتون تھیں۔ جب وہ حجر اسود کا بوسہ لینے لگیں تو اپنا رومال حجر اسود پر رکھ کر بوسہ لیتیں اور انھوں نے ساتوں طواف میں ایسا ہی کیا۔ راقم کو یہ خیال گذرا کہ یہ مصری خاتون اپنے رومال کو حجر اسود پر اس لیے رکھ رہی ہیں کہ دوسروں کے لعاب دہن سے محفوظ رہیں اور ان کو کوئی چھوت کی بیماری نہ لگ جائے۔ راقم کو یہ دیکھ کر تعجب ہوا اور اس کے متعلق ایک مصری حاجی سے سبب دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ اکثر مصری خاتون ایسا کرتی ہیں اور حج سے واپسی پر ان رومالوں کو اپنے ساتھ لے جاتی ہیں۔ ان کے گھر والے اس رومال کا بوسہ لیتے ہیں۔ ۱۹۶۷ء میں حجاج کرام جو مختلف ممالک سے آئے ہوئے تھے ان کی مجموعی تعداد سرکاری اعداد و شمار کے مطابق ۳۱۶۲۲۶ تھی ان کے علاوہ مقامی حجاج کی تعداد بہت کافی تھی۔ یہ دیکھ کر نہایت تعجب ہوتا ہے کہ سعودی حکومت کیونکر اتنے لوگوں کے آرام و آسائش کا سامان مختلف جگہوں پر اس خوبی سے انجام دیتی ہے۔ ۱۹۶۷ء میں مسٹر رحمت قدوائی سعودی عرب میں ہندوستان کے سفیر تھے اور صاحب موصوف ہندوستانی حجاج کو آرام پہنچانے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھتے تھے۔ صاحب موصوف نے منیٰ میں راقم کو لکھنؤ کا پان کھلایا تھا۔

مدینہ منورہ کی روانگی اور وہاں کا قیام:

جب مکہ معظمہ کے کل کام ختم ہو گئے تو ہم لوگوں کا قافلہ جدہ سے بذریعہ ہوائی جہاز مدینہ پہنچا۔ مدینہ منورہ ہوائی اڈہ سے کچھ دوری پر واقع ہے۔ ہم لوگ وہاں سے بذریعہ ٹیکسی مدینہ منورہ پہنچے۔ یہاں پہنچ کر میں نے عبداللہ حیدری سے ملاقات کی جنھوں نے بہت جلد ہم لوگوں کے قیام کے لیے دو کمرے خلیج العرب ہوٹل میں دلوا دیے۔ خلیج العرب ہوٹل ایک پانچ منزلہ عمارت میں تھا اور ایک اچھا ہوٹل تھا۔ اس کا شرح کرایہ قیام کے لیے دس ریال یومیہ فی کس تھا جو اب بڑھ کر

کم از کم فی کس سٹو ریال ہو گیا ہو گا۔ خلیج العرب ہوٹل مسجد نبوی کے قریب تھا جہاں ہم لوگوں کو ہر طرح کا آرام تھا اور مسجد نبوی میں آنے جانے کی بڑی سہولت تھی۔ اس ہوٹل کا مالک شام کا رہنے والا اور اس کا منیجر لبنان کا باشندہ تھا۔ ہم لوگ مدینہ میں دس روز مقیم رہ کر مسجد نبوی میں چالیس وقت کی نمازیں ادا کیں۔ راقم کو ہر روز ایک دو مرتبہ ریاض الجنۃ میں نماز ادا کرنے کا موقع مل جاتا تھا۔ ہر نماز کے بعد مواجہ رسول پر حاضر ہو کر درود و سلام پڑھتا اور اسی کے بعد حضرت ابوبکرؓ و حضرت عمرؓ کے مرقد مبارک کے روبرو کھڑا ہو کر فاتحہ پڑھا کرتا تھا۔ راقم اپنا زیادہ تر وقت مسجد نبوی میں گذارتا اور وہاں اپنے دوست حمید لکھنوی کی نعتوں کو پڑھ کر سکون قلب حاصل کرتا تھا۔ اس جگہ کی کشش ایسی تھی کہ جی نہ چاہتا تھا کہ مسجد سے باہر جاؤں۔ یہاں بیٹھ کر اسلام کا ابتدائی دور نظر کے سامنے آجاتا تھا۔ ہر اذان کے وقت حضرت بلال حبشی کی اذان یاد آتی تھی اور اسی کے ساتھ وہ بزرگان دین بھی یاد آجاتے جنھوں نے اسلام کے فروغ کے لیے اپنی جانیں تک قربان کر ڈالیں۔ کچھ ایسے لوگ بھی یاد آتے جنھوں نے اس مسجد میں رسول اکرمؐ کے پیچھے نمازیں تو ادا کی تھیں مگر بعد میں آلِ رسولؐ کو ایذا پہنچانے میں کوئی دقیقہ باقی نہ رکھا، اپنے سیاسی مفاد کی خاطر قرآن کو نیزوں پر بلند کیا جس کی مثال تاریخ اسلام میں نہیں ملتی ہے۔ مدینہ متبرک جگہ ہے جہاں ہر وقت اللہ کی رحمت برستی رہتی ہے۔ یہاں فرشتے آتے تھے اور ہمیشہ آتے رہیں گے۔

مسجد نبوی:

ترکوں کی بنائی ہوئی مسجد نبوی فن تعمیر کا ایک اعلیٰ نمونہ ہے۔ سعودی دور میں مسجد نبوی کی توسیع کی گئی اور نہایت ہی خوبی اور ہنر کے ساتھ قدیم اور جدید حصوں کو ملایا گیا ہے۔ مسجد کا فرش قالینوں سے مزین رہتا ہے۔ راقم کبھی کبھی مسجد کے جدید حصہ میں بیٹھ کر گنبد خضرا کو دیکھا کرتا۔ مجھ پر ایک والہانہ کیفیت طاری ہو جاتی اور درود و سلام پڑھتا تھا۔ مسجد نبوی کے کل دروازے دس بجے رات کو بند کر دیئے جاتے ہیں اور نماز تہجد کے وقت کھول دیئے جاتے ہیں۔ راقم مسجد نبوی میں ہمیشہ باب مجیدی سے داخل ہو کر آتا جو مسجد نبوی کا صدر دروازہ ہے۔ مسجد حرام کی طرح مسجد نبوی میں بھی روشنی کا بڑا اچھا انتظام ہے۔ ترکوں کے زمانے کے جھاڑ اور فانوس مسجد کے پرانے حصے میں لگے ہوئے ہیں اور نہایت زیب و زینت بخشتے ہیں۔ مسجد کے میناروں کی روشنی قابل دید ہے۔

مدینہ سے واپسی، جدہ کا قیام اور میرا پٹنہ واپس آنا:

مدینہ منورہ میں دس روز قیام کے بعد ہم لوگوں کا قافلہ جدہ واپس آیا اور یہاں ایک ہفتہ شاہ منہاج الدین کے یہاں مقیم رہ کر ہم لوگ ۱۹-اپریل ۱۹۶۷ء کو جدہ سے بذریعہ ہوائی جہاز روانہ ہو کر اسی روز شام کو بمبئی پہنچ گئے۔ بمبئی میں ہم لوگوں کا قیام تین روز تک پولس کلب میں رہا اور ۲۱-اپریل ۱۹۶۷ء کو بمبئی کی جامع مسجد میں نماز جمعہ ادا کر کے ۲۲-اپریل ۱۹۶۷ء کو بذریعہ ریل بمبئی سے روانہ ہو کر ۲۴-اپریل ۱۹۶۷ء کو ہم سب لوگ بخیر و عافیت پٹنہ پہنچ گئے۔ ڈاکٹر مصباح الحق اور مسٹر محی الدین جو ہم لوگوں کے استقبال کے لیے بمبئی گئے تھے سفر میں ہم لوگوں کے ساتھ رہ کر ہر طرح کا آرام پہنچایا۔ اللہ ان دونوں کو جنت نصیب کرے۔

میری بیوی کی علالت:

حج سے واپسی کے ایک ماہ بعد میری بیوی پر قلب کا دورہ پڑا اور تقریباً تین چار سال تک قلب کے مرض میں مبتلا رہ کر انتقال کیا۔

اس زمانے میں بذریعہ ہوائی جہاز حج کے کل اخراجات فی کس چھ ہزار روپے ہوا کرتے تھے

راقم کا دوسرا حج:

قاعدے کے مطابق ہر حاجی پانچ برس سے پہلے اپنا دوسرا حج نہیں کر سکتا ہے۔ راقم نے ۱۹۶۷ء میں پہلا حج کیا تھا اور مجھے دوسرے حج کرنے کا حق ۱۹۷۳ء میں حاصل ہوا۔ میں اپنے استاذ محترم پروفیسر عبدالمنان بیدل سے جا کر ملا جو پانچ چھ حج کر چکے تھے۔ جب میں نے ۱۹۷۳ء کے حج میں شریک ہونے کا خیال ظاہر کیا تو پروفیسر صاحب نے فرمایا کہ وہ بھی حج میں جانے والے ہیں اور ان کے ہمراہ صاحب موصوف کے داماد اسحاق بابو اور مسٹر بہار الدین احمد منش یافتہ حج ۱۹۷۳ کے حج میں شریک ہوں گے۔ پروفیسر موصوف سے یہ معلوم کر کے نہایت خوشی ہوئی کہ پروفیسر سید محمد حسن مع اپنی اہلیہ، مسٹر سید نظیر حیدر ایڈیٹر "صدائے عام" مع اپنی اہلیہ اور حضرت سید شاہ عون احمد قادری بھی اس سال حج کو جائیں گے۔ چند دنوں بعد میرے شاگرد مسٹر علی وارث خاں رئیس جگدیش پور ضلع شاہ آباد مجھ سے ملنے آئے اور کہا کہ وہ بھی اپنی اہلیہ اور صاحبزادی کے ساتھ اس سال حج کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ اس زمانے میں علی وارث خاں صاحب کے صاحبزادے مغل لائن میں جہاز پر کام کیا کرتے تھے اور علی وارث خاں صاحب حکومت کی طرف سے مغل لائن کمیٹی

کے نامزد ممبر تھے اور انھیں جدہ جانے کے لیے بحری جہاز کا کوئی کرایہ ادا نہ کرنا پڑتا تھا۔ ان سب باتوں کو سن کر راقم نے ۱۹۷۲ء کے حج میں شریک ہونے کا فیصلہ کر لیا گرچہ اس زمانے میں میری اہلیہ سخت بیمار تھیں۔ ۲۴ جولائی ۱۹۷۲ء کو میں نے اپنی درخواست ۲۰۰۱ روپیے کے ڈرافٹ کے ساتھ جو اس زمانہ میں اسپیشل ڈک کلاس کا کرایہ تھا مغل لائن کے دفتر کو روانہ کیا۔ اس زمانے میں زادراہ کی زرجبادلہ کی رقم ایک ہزار چوبیس ریال جو ڈیڑھ ہزار روپیے کے برابر ہوتی تھی ہر حاجی کو ادا کرنی پڑتی تھی۔ اسپشل ڈک کلاس کا برتھ آرام دہ ہوا کرتا تھا جس پر ڈنلپ فوم کے گدے بچھے رہتے تھے۔

حجاز کے لیے روانگی :

راقم پٹنہ سے بمبئی کے لیے ۷۔ دسمبر ۱۹۷۲ء کو روانہ ہو کر ۹۔ دسمبر ۱۹۷۲ء کو بمبئی پہنچا۔ محی الدین اس دوسرے سفر میں بھی میرے ہمراہ تھے۔ میرے چھوٹے بھائی انور حسین کسی سرکاری کام کے سلسلہ میں مجھ سے دو روز پہلے بمبئی پہنچ چکے تھے۔ انھوں نے بمبئی کے ریلوے اسٹیشن پر ہم لوگوں کا استقبال کیا۔ حسب دستور راقم نے پولس کلب میں پانچ دنوں تک قیام کیا۔ میرے چھوٹے بھائی انور حسین سرکاری مہمان خانہ میں مقیم تھے اور ان کو ایک سرکاری موٹر کار بمبئی میں گھومنے پھرنے کے لیے دی گئی تھی۔ اسی موٹر کار سے راقم حج کمیٹی کے دفتر میں ۱۰۔ دسمبر کو حاضر ہو کر اپنا پلگرم پاس بمبئی سے جدہ تک کا سمندری جہاز کا ٹکٹ اور جدہ سے مدینہ تک کا ہوائی جہاز کا ٹکٹ حاصل کیا۔ اسی روز اسٹیٹ بینک سے ایک ہزار چوبیس ریال کی ہنڈی بھی حاصل کی۔ جو زادراہ کی رقم تھی۔ مغل لائن کے آفس میں جاکر ڈھائی سو روپیے کے کوپن کی خریداری کی۔ ان کوپنوں کو دوران سفر جہاز کے ریسٹوراں میں دے کر کھانے کی چیزیں خریدی جاسکتی تھیں۔ ان سب کاموں کو ختم کر کے راقم انسپکٹر شرما سے ملنے گیا جو "یلوگیٹ" تھانے کے انچارج تھے۔ مسٹر شرما میرا بڑا احترام کرتے تھے اور انھوں نے مجھے چار عدد پاس دیئے جن کو لے کر میرے دوست اور رشتہ دار جہاز پر جاکر مجھے الوداع کہہ سکتے تھے۔

بمبئی سے جدہ اور مکہ کے لیے روانگی :

۱۴۔ دسمبر ۱۹۷۲ء کو قریب تین بجے ہم لوگوں کا جہاز "اکبر" بمبئی سے روانہ ہو کر ساتویں دن جدہ کے بندرگاہ پر لنگر انداز ہوا۔ پروفیسر سید محمد محسن اور مسٹر نظیر حیدر ایڈیٹر "صدائے عام" اور حضرت سید شاہ عون احمد قادری بھی اسی جہاز میں سفر کر رہے تھے۔ میرے شاگرد علی وارث

خاں بھی ہم لوگوں کے ہم سفر تھے۔ میرے چھوٹے بھائی انور حسین اور محی الدین نے جہاز پر جاکر راقم کو الوداع کہا اور واپس چلے گئے۔ جس کیبن میں راقم کی جگہ تھی اس میں بھاگل پور کے تین حضرات نظام الدین، عبدالمجید خاں اور عبدالغنی صاحبان سفر کر رہے تھے۔ نظام الدین صاحب کا یہ دوسرا سفر حج تھا۔ ان تینوں حضرات سے میری پہلے کی ملاقات نہ تھی مگر طبیعت کی مناسبت کی وجہ سے راقم ان لوگوں سے بہت جلد مانوس ہوگیا۔ ان حضرات نے بھی راقم کو دوران سفر حج ہر طرح کی مدد پہنچائی۔ جس کا میں بہت شکر گزار رہا۔ مسٹر علی وارث خاں نے مجھے مسٹر فضل بھائی سے ملاقات کرائی جو ان دنوں مغل لائن کمپنی کے ایجنٹ تھے اور ہم لوگوں کے ساتھ "اکبر" جہاز سے جدہ جا رہے تھے۔ جہاز پر پنج گانہ نمازیں باجماعت کئی جگہوں پر ہوا کرتی تھیں اور راقم نے کئی جماعتوں میں نمازیں ادا کیں۔ صبح کی اذان ایک خوش الحان مؤذن دیا کرتا تھا اور یہ اذان نہایت ہی دل کش ہوتی تھی، جہاز کا سفر آرام سے کٹ گیا۔ چلتے وقت راقم نے بمبئی میں جو کوپنس خریدے تھے انھیں جہاز میں بدل کر صبح کا ناشتہ، دن اور رات کے کھانے لیا کرتا تھا۔ ناشتے اور کھانے انگریزی طرز کے ہوا کرتے تھے۔ کھانے جو حاجیوں کو مغل لائن دیا کرتی تھی اچھے ہوتے تھے مگر راقم صرف صبح کی چائے اور شام کا ناشتہ مغل لائن سے لیتا اور دن اور رات کے کھانوں کو دوسرے حاجیوں کو دے دیتا تھا کیونکہ یہ کھانے میرے ذوق کے مطابق نہ ہوتے تھے۔

جب ہم لوگوں کا جہاز یلملم پہاڑ کے نزدیک سے گذرنے لگا تو جہاز نے سیٹی دی اور ہم لوگوں نے نہا دھو کر احرام باندھا۔ کچھ گھنٹے بعد جہاز جدہ کے بندرگاہ پر آکر لنگر انداز ہوگیا۔ ہم لوگوں کے جہاز کے ساتھ ہی پاکستان کا جہاز "سفینۂ عابد" بھی آیا اور دونوں جہازوں کے حاجیوں نے نعرۂ تکبیر بلند کیا۔ ان لوگوں کی خوشی کی کوئی انتہا نہ تھی کیونکہ یہ سب اپنی منزل مقصود سے قریب آچکے تھے۔ راقم کے ساتھ صرف ایک سوٹ کیس اور ایک چھوٹا ہولڈ دل تھا جنھیں مسٹر فضل بھائی نے اپنے آدمی کو بھیج کر منگا لیا تھا اور یہ دونوں چیزیں نہایت آسانی سے صاحب موصوف کے سامان کے ساتھ جدہ بندرگاہ میں اتار دی گئیں۔ صاحب موصوف جدہ بندرگاہ میں اتر کر اپنے کاموں میں مصروف ہو گئے اور مجھے ہدایت کی کہ میں جدہ کے مدینۃ الحجاج پہنچ کر بوہرہ حضرات کے "فیض حسینہ" میں جاکر ٹھہر جاؤں۔ جدہ کے بندرگاہ پر صدیقی صاحب جو ہندوستانی سفارت خانہ کے افسر تھے ہم لوگوں کے استقبال کے لیے موجود تھے۔ ان دنوں مسٹر ٹی۔ ٹی۔ پی۔ عبداللہ سعودی عرب میں ہندوستان کے سفیر تھے۔ انھوں نے ہندوستانی سفارت خانہ میں کچھ لوگوں کی دعوت کا انتظام کیا تھا۔ مسٹر علی وارث

خاں اس دعوت میں شریک ہوئے مگر راقم دعوت میں شریک نہ ہوسکا کیونکہ میں بہت تھک گیا تھا۔ ایک گھنٹہ بعد مسٹر فضل بھائی اپنے کاموں کو ختم کرکے "فیض حبیبہ" میں آئے جہاں ہم لوگوں نے دن کا کھانا کھایا۔ ان کے اصرار پر مسٹر ملی وارث خاں، ان کی اہلیہ، صاحبزادی اور میں صاحب موصوف کی موٹر کار سے مکہ مکرمہ پہنچے۔ احمد شیخ جمال اللیل راقم کے معلم تھے اور قیام کے لیے مجھے انھوں نے اس مکان میں جگہ دی جہاں صرف پاکستانی حجاج ٹھہرے ہوئے تھے۔ راقم جب عمرہ کرکے آیا تو دیکھا کہ میرے کمرے میں پاکستانی حضرات جو پنجاب کے دیہاتوں کے رہنے والے تھے مقیم ہیں۔ یہ سب پنجابی زبان بولتے اور مجھے ان لوگوں کے ساتھ ٹھہرنے میں دشواری محسوس ہونے لگی۔ نظام الدین، عبدالحمید خاں، عبدالغنی صاحبان جب دوسرے روز مکہ پہونچے تو میرے کمرے میں آئے اور مجھے اپنے ساتھ وہاں لے گئے جہاں یہ لوگ مقیم تھے۔ گرچہ یہ کمرہ بڑا تھا مگر آٹھ آدمیوں کے آرام سے ٹھہرنے کی جگہ اس میں نہ تھی۔ ہم لوگوں کے قافلہ میں آٹھ آدمی تھے اور یہ سب لوگ ایک ہی جگہ رہنا چاہتے تھے۔ ان لوگوں نے راقم کے لیے اتنی جگہ مہیا کردی تھی کہ میں آرام سے رہ سکتا تھا اور دوران قیام مجھے کسی طرح کی تکلیف نہ ہوئی۔ کمرہ عمارت کی تیسری منزل پر تھا اور غسل خانہ اس کے متصل تھا۔

۱۹۷۳ء کا حج :

احمد شیخ جمال اللیل کے یہاں حاجیوں کی تعداد تقریباً سات سو تھی اور ان میں تین چوتھائی حاجی پاکستان کے تھے۔ منیٰ میں ان کی خیمہ گاہ کافی بڑی تھی اور یہاں پانی کی قلت نہ تھی کیونکہ پانی کا خزانہ خیمہ گاہ سے بالکل متصل تھا۔ منیٰ میں قیام کے لیے ان کے خیمے آرام دہ تھے اور ہر خیمے میں برقی روشنی کا اچھا انتظام تھا۔ خیمہ گاہ کے پاس کئی ہوٹل بھی تھے جہاں راقم ناشتہ اور کھانا کھایا کرتا تھا۔ عرفات میں بھی ہم لوگوں کے قیام کے لیے ایک اچھے خیمے کا انتظام کیا گیا تھا۔ احمد شیخ جمال اللیل راقم کا احترام کیا کرتے تھے کیونکہ وہ اس بات سے واقف تھے کہ حکومت ہند کے سفیر مسٹر ٹی۔ پی۔ پی عبداللہ میرا بہت خیال رکھتے ہیں اور اپنے کارندے کو میری خیریت دریافت کرنے کے لیے منیٰ بھیجا تھا۔ حج کے دن عرفات میں حاجیوں کی عام دعوت میں بد انتظامی کے سبب کچھ حاجیوں کو باورچی خانہ جاکر اپنا کھانا لانا پڑا۔ عرفات سے مزدلفہ ہم لوگ وقت پر پہنچ گئے۔ دوسرے روز صبح کو جب ہم لوگ مزدلفہ سے منیٰ واپس آنے لگے تو سواری کی قلت درپیش ہوئی۔ ہم لوگوں نے بہت منت و سماجت کے بعد ایک بس والے کو منیٰ پہنچانے کے لیے تیار کیا اور یہ بھی کہا کہ اگر شیخ اس بس کا کرایہ ادا نہ کریں گے تو کرایہ

کی رقم ہم لوگ ادا کر دیں گے۔ منیٰ پہنچنے پر شیخ نے اس بس والے کا کرایہ ادا کر دیا۔ منیٰ میں قربان گاہ جا کر نظام الدین، عبد الحمید خاں اور عبد الغنی صاحبان نے اپنی طرف سے قربانیاں کیں اور راقم کی طرف سے بھی ایک دنبے اور ایک بکرے کی قربانی کی۔ واپس آتے وقت قربانی کے جانوروں کا کچھ گوشت اور کلیجی اپنے ساتھ لا کر گریل اور کلیجی تل کر کھایا اور کھلایا۔ پروفیسر عبد المنان بیدل، علی وارث خاں اور چند دیگر دوستوں کو گریل اور کلیجی بہت پسند آئی۔

راقم رمی جمار کے لیے نہ گیا اور کنکریوں کو دوستوں کے سپرد کر دیا جنھوں نے میری طرف سے رمی جمار کیا۔ جب راقم طواف زیارت کے لیے مکہ جانے لگا تو محمد اکبر خاں نے جو کٹک کے رہنے والے تھے اور میرے دوست عبد السبحان خاں صاحب ایڈوکیٹ کٹک کے بھائی تھے میرے ساتھ طواف زیارت کے لیے جانے کی خواہش ظاہر کی۔ میں ان کو اپنے ساتھ لے جانے کو تیار نہ تھا مگر انھوں نے اتنا اصرار کیا کہ مجھے ان کو اپنے ساتھ لے جانا ہی پڑا۔ مکہ پہنچ کر ہم لوگ طواف زیارت اور سعی کر کے منیٰ کے لیے واپس ہوئے۔ محمد اکبر خاں منیٰ پہنچ کر مجھ سے الگ ہو گئے اور راستہ بھول کر کسی دوسرے خیمے گاہ میں چلے گئے۔ راقم نے اپنے خیمے میں واپس آ کر بہت دیر تک ان کا انتظار کیا اور ادھر ادھر تلاش کے بعد بھی وہ نہ مل سکے۔ ان کی گم شدگی کی اطلاع میں نے احمد شیخ جمال اللیل کو کر دی۔ انھیں بھی خان صاحب کے بھٹک جانے پر بڑی تشویش ہوئی کیونکہ معلم کا دیا ہوا شناختی کارڈ ان کے پاس موجود نہ تھا۔ اکبر خاں کا تھوڑا سا سامان ہم لوگوں کے خیمے میں تھا جسے دوسرے روز ہم لوگوں کو مکہ لے جانا پڑا۔

راقم نے اپنے دوسرے حج میں مسجد خیف اور مسجد نمرہ میں نمازیں پڑھیں۔ جبل رحمت پر بھی گیا جس کی بلندی پر کھڑا ہو کر نیچے کا خوش نما منظر دیکھا۔ جبل رحمت پر چڑھنے اور اترنے کے لیے ترکوں نے اپنے زمانہ میں آرام دہ زینے بنائے ہیں۔ مکہ میں کل مقامات مقدسہ کو دیکھنے کا موقع ملا۔ مگر افسوس کہ غار حرا کو نہ دیکھ سکا۔ جس روز ہم لوگ منیٰ سے مکہ واپس آ رہے تھے تو سہ پہر کو شاہ فیصل کا شاہی جلوس منیٰ سے مکہ گیا۔ راستہ کے دونوں جانب حجاج نہایت نظم و ضبط کے ساتھ کھڑے تھے۔ شاہ فیصل کی موٹر کار کے آگے اور پیچھے موٹر سوار فوجی دستے جا رہے تھے اور شاہ فیصل اپنی موٹر سے ہاتھ نکال کر سلام کرتے ہوئے گئے۔ احمد شیخ جمال اللیل جب ہم لوگوں کو منیٰ سے مکہ لے جانے میں دیر کرنے لگے تو نظام الدین صاحب نے کرایہ کی ایک موٹر کار کا انتظام کیا جس سے ہم لوگ عشاء کی نماز سے پہلے مکہ پہنچ گئے۔ موٹر کار کا ڈرائیور ایک نوجوان انگریزی داں عرب تھا اور راستہ بھر انگریزی میں مجھ سے

باتیں کرتا آیا۔ اکبر خاں جب دوسرے روز مکہ میں ہم لوگوں سے ملنے آئے تو اپنی گم شدگی کا حال تفصیل سے بیان کیا اور اپنی کل چیزوں کو لے کر واپس گئے۔

حج کے بعد مکہ کا قیام :

راقم حج سے پہلے اور حج کے بعد چالیس دنوں تک مکہ میں قیام پذیر رہا۔ اللہ کے فضل سے ہر روز کی پنجگانہ نمازیں مسجد حرام میں ادا ہوئیں۔ مکہ کے قیام کے دوران راقم ایک دو روز کے وقفہ پر استاذ محترم پروفیسر عبدالمنان بیدل سے ملنے جایا کرتا تھا جہاں مسٹر بہار الدین احمد سابق ممبر بہار پبلک سروس کمیشن اور اسحاق بابو سے بھی ملاقات ہو جاتی تھی۔ مسجد حرام میں ان لوگوں کے ساتھ نمازیں پڑھتا اور طواف کیا کرتا تھا۔ پروفیسر سید محمد محسن صاحب سے بھی مسجد میں روزانہ ملاقات ہوا کرتی اور ان حضرات کی علمی اور مذہبی باتیں میرے لیے نہایت سودمند ہوتی تھیں۔ راقم کے لیے یہ بڑے فخر کی بات ہے کہ میرا دوسرا حج استاذ موصوف کے ساتھ ہوا جو ان کا آخری حج تھا۔ اکثر ممالک کے حجاج کرام جو انگریزی بول سکتے تھے راقم سے ہندوستانی مسلمانوں کے حالات کو دریافت کرتے اور پاکستانیوں کے غلط پروپگنڈا سے متاثر ہو کر ہم لوگوں کے حال پر اظہار افسوس کیا کرتے اور ہندوستانی مسلمانوں کے فلاح و بہبود کی دعا کرتے تھے۔

راقم ایک روز ظہر کی نماز کے بعد مسجد حرام میں بیٹھ کر ایک پاکستانی انجینیر سے مناسک حج کے متعلق باتیں کر رہا تھا کہ ایک نوجوان پاکستانی ہم لوگوں کے پاس آئے اور ہم دونوں کو ایک ایک کارڈ عنایت فرمایا جس میں عربی، فارسی، ترکی، اردو اور انگریزی زبانوں میں یہ عبارت چھپی ہوئی تھی کہ "پاکستان کے لیے دعا کیجیے" میں نے ان کو اپنے پاس بٹھا کر عرض کیا کہ راقم دو شرطوں پر پاکستان کے لیے دعائیں کر سکتا ہے۔ پہلی شرط یہ ہے کہ یہاں ہندوستانی مسلمانوں کے خلاف غلط پروپگنڈا نہ کیا جائے اور دوسری شرط یہ ہے کہ اکثر معزز مسلمانوں کو جاسوس نہ کہا جائے۔ میری یہ باتیں سن کر پاکستانی انجینیر صاحب نے کہا کہ ہندوستان میں ہندو جاسوسوں کی کون کمی ہے؟ پاکستان میں یہ مشہور ہے کہ دوران حج سینکڑوں ہندو جاسوس مسلمانوں کی شکلیں بنا کر اور لمبی لمبی داڑھیاں بڑھا کر مکہ اور مدینہ آتے ہیں اور ہندوستان واپس جا کر حکومت کو اپنی رپورٹیں پیش کیا کرتے ہیں۔ انجینیر صاحب نے پاکستانی نوجوان سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ ڈاکٹر اقبال حسین ہندوستان کے ایک نامور کالج میں پرنسپل رہ چکے ہیں اور نہایت ہی صاف گو انسان ہیں۔ ان کے چند شاگرد پاکستان میں بہت اعلیٰ عہدوں پر

پر فائز ہیں۔ پاکستانی نوجوان مجھ سے ہاتھ ملا کر چلا گیا۔ حرم شریف میں راقم کی ملاقات چند انگریزی داں عربوں سے ہو جاتی تھی۔ ان میں سے کچھ ایسے بھی تھے جو ہندوستانی مسلمان کی دشواریوں سے بالکل باخبر تھے اور کہا کرتے تھے کہ ہندوستان میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان جو فرقہ وارانہ فسادات ہوتے ہیں وہ ملک کے لیے کس قدر شرمناک بات ہے۔ ہندو اکثریت کو چاہیے کہ مسلم اقلیت کے ساتھ فراخ دلی سے پیش آئے۔ ایرانی، افغانی کچھ عراقی اور ترک جو فارسی بول سکتے تھے راقم ان لوگوں سے مذہب کے متعلق باتیں کیا کرتا تھا۔ دو تین افغانی عالم جو ہرات سے آئے ہوئے تھے نہایت عبادت گذار تھے اور مذہب اسلام اور تاریخ اسلام سے خوب واقف تھے۔ یہ لوگ برابر ہندوستانی مسلمانوں کے لیے دعائیں کیا کرتے تھے۔ ایران کے حجاج کرام زیادہ تر شیعہ مسلک سے تعلق رکھتے تھے مگر میں نے کبھی بھی ان لوگوں سے سنی عقیدے کے خلاف کوئی بات نہ سنی۔ حج ایک اجتماعی عبادت ہے اور اس کے بے شمار فوائد ہیں۔ جب راقم پانچ سال بعد دوبارہ حج کے لیے آیا تو مسجد حرام کی عمارت دو منزلہ کر دی گئی تھی اور حرم شریف کے اندر اور باہر کافی توسیع ہو گئی تھی۔ مقام ابراہیم کو آگے بڑھا کر مطاف کا راستہ چوڑا کر دیا گیا تھا۔ ۱۹۷۳ء کے حج میں حجاج کرام کی مجموعی تعداد سرکاری اعداد و شمار کے مطابق ۶۴۵۱۸۲ تھی۔ ان کے علاوہ مقامی حجاج بھی کافی تعداد میں شریک تھے۔

مدینہ منورہ کے لیے روانگی اور وہاں کا قیام :

جب مکہ مکرمہ کے کل کام ختم ہو گئے، تو راقم نے مدینہ منورہ جانا چاہا۔ قاعدے کے مطابق مدینہ جانے کی اجازت مجھے پندرہ روز بعد ملنے والی تھی مگر میں نے ہندوستانی سفارت خانہ میں ایک درخواست دے کر اپنے وقت مقررہ سے قبل مدینہ منورہ جانے کی اجازت طلب کی۔ میری یہ درخواست منظور ہو گئی اور میں اپنے مقررہ وقت سے پہلے مدینہ منورہ چلا گیا۔ مکہ مکرمہ سے جدہ جا کر بذریعہ ہوائی جہاز مدینہ پہنچا۔ اس مرتبہ میں کسی ہوٹل میں نہ ٹھہرا بلکہ اپنے معلم عبید اللہ حیدری کے ساتھ رہا جنھوں نے مجھے ایک چھوٹا سا کمرہ غسل خانہ کے ساتھ میرے قیام کے لیے اپنے مکان میں دیا۔ جہاں راقم نے دس روز رہ کر مسجد نبوی میں چالیس وقت کی نمازیں ادا کیں۔ جس روز میں مدینہ منورہ پہنچا اسی دن شاہ فیصل بھی مدینہ منورہ تشریف لائے اور ہم لوگوں کے ساتھ مغرب کی نماز مسجد نبوی میں ادا کی۔ شاہ معظم بادشاہ ہونے کے بعد پہلی مرتبہ مدینہ منورہ آئے تھے۔ میرے رشتہ دار

پروفیسر سید سلطان احمد مرحوم کے لڑکے، لڑکی اور داماد عبید اللہ حیدری کے یہاں ٹھہرے ہوئے تھے۔ ان لوگوں سے مل کر راقم کو بڑی خوشی ہوئی۔ یہ لوگ قیام پاکستان کے بعد ہجرت کر کے پاکستان چلے گئے تھے اور کراچی میں فارغ البالی کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔

پروفیسر محسن کی آمد :

راقم کے مدینہ منورہ پہنچنے کے دوسرے روز پروفیسر سید محمد محسن اور مسٹر سید بہاء الدین احمد بھی مدینہ تشریف لائے۔ پروفیسر سید محمد محسن کے آجانے سے مجھے بڑا اطمینان ہوا کیونکہ پروفیسر موصوف میرے عزیز دوستوں میں ہیں اور حج کے سفر میں برابر ہم لوگوں کا ساتھ رہا۔ مسجد نبوی میں ہم لوگ روزانہ ملتے اور مختلف موضوعات پر باتیں ہوتیں۔ ایک پاکستانی انجینئر جن سے راقم کی ملاقات مکہ مکرمہ میں ہوگئی تھی وہ بھی میرے ساتھ مدینہ منورہ آئے تھے۔ صاحب موصوف حیدرآباد (دکن) کے رہنے والے تھے اور تقسیم ہند کے بعد ترک وطن کر کے کراچی چلے گئے تھے۔ موصوف ایک نہایت ہی مذہبی آدمی تھے اور پاکستان کی زندگی سے کچھ خوش نہ تھے۔ راقم روزانہ جنت البقیع جایا کرتا اور حضرت عثمان غنیؓ و دیگر بزرگان دین کے قبروں پر جاکر فاتحہ پڑھا کرتا تھا۔ یہ وہ قبرستان ہے جہاں بزرگان دین اور اسلام کے بڑے بڑے شیدائی مدفون ہیں۔ افسوس کی بات ہے کہ لوگوں نے اس مقام کی تاریخی حیثیت کو قائم نہیں رکھا ہے۔ پہلی محرم کی شام کو راقم تقریباً سو ایرانیوں کے ہمراہ جنت البقیع گیا اور ان لوگوں کے ساتھ حلقہ باندھ کر اس جگہ پر کھڑا ہوا جہاں روایت کے مطابق حضرت فاطمہ، حضرت امام حسن، حضرت امام زین العابدین اور حضرت امام جعفر صادق مدفون ہیں۔ مجتہد نے دعائیں پڑھیں اور ہم سب لوگوں نے حضرت فاطمہ اور آل رسول پر درود اور سلام پڑھا جو وہاں مدفون ہیں۔ اس کے بعد فارسی میں نعت اور منقبت لاؤڈ اسپیکر پر پڑھی گئیں۔ راقم پر ان سب چیزوں کا بڑا اثر پڑا اور اضطرابی کیفیت میں آنسو بہاتا ہوا جنت البقیع سے باہر آیا۔ دوران قیام راقم احد گیا اور جنگ احد کے شہدا پر فاتحہ پڑھی۔ یہ سب ایک گنج شہیداں میں مدفون ہیں۔ احد کے باغ کی کھجوریں بھی خرید کر کھائیں۔ پنج مساجد کو جاکر دیکھا اور وہاں نمازیں ادا کیں۔ وہاں جاکر جنگ خندق بھی یاد آئی۔ مسجد قبلتین دیکھنے کے لائق ہے اور قدیم مساجد میں اس کا بڑا مقام ہے۔ راقم نے یہاں بھی نمازیں ادا کیں اور مدینہ منورہ کے کل مقامات مقدسہ کی زیارت کا شرف حاصل کیا۔ عربی زبان نہ جاننے کی وجہ سے راقم کو بہت سی جگہوں پر دشواری محسوس ہوتی تھی۔ میرے معلم عبید اللہ حیدری مجھ پر بہت

مہربان رہا کرتے تھے اور ٹیکسی والوں سے عربی زبان میں باتیں کر کے واجب کرایہ طے کر دیا کرتے تھے۔ چند سال ہوئے کہ عبید اللہ حیدری انتقال کر گئے۔ اللہ انھیں غریق رحمت کرے۔ راقم نے جب پانچ سال بعد مدینہ آکر مسجد نبوی کو دیکھا تو اس میں کچھ بھی توسیع نہ کی گئی تھی۔ باب مجیدی کے سامنے جو خالی جگہ تھی اس پر ٹائلس بچھا کر خوب صورت صحن بنا دیا گیا تھا۔ اکثر اوقات جب مسجد نبوی نمازیوں سے بھر جاتی تھی تو لوگ اس صحن میں نماز پڑھا کرتے تھے۔ باب مجیدی کے دوسرے جانب اصطفیٰ منزل واقع ہے جہاں ہندوستانی زائرین بغیر کسی کرایہ کے قیام کرتے ہیں۔ حاجی محمد اصطفیٰ خاں کارخانہ اصغر علی محمد علی لکھنؤ کے مالک تھے۔ انھوں نے اس رباط کو ہندوستانی زائرین کے قیام کے لیے تعمیر کیا تھا۔ یہاں سال بھر ہندوستان سے آئے ہوئے زائرین کا اژدحام رہتا ہے۔ راقم اکثر یہاں جاتا اور بہت سے زائرین سے جو زیادہ تر اتر پردیش سے آیا کرتے تھے ملاقات ہو جاتی تھی۔ حاجی اصطفیٰ خاں صاحب میرے چچا سید فضل حسین مرحوم کے خسر تھے اور نہایت سخی، مخیر اور باوضع انسان تھے۔ تقسیم ہند کے بعد لکھنؤ سے ہجرت کر کے کراچی چلے گئے اور وہیں انتقال کیا۔ اللہ ان کو جنت فردوس میں اعلیٰ مقام عطا کرے۔

ایک ناخوش گوار واقعہ :

راقم ایک روز مکہ کے ایک ہوٹل میں دن کا کھانا کھا رہا تھا کہ اسی میز پر تین پاکستانی جو غالباً پنجابی تھے آکر کھانا کھانے لگے۔ دوران گفتگو ان میں سے ایک نے مجھ سے دریافت کیا کہ میں کس ملک سے آیا ہوں۔ میں نے جواباً کہا کہ میں ہندوستان کا باشندہ ہوں اور دوبارہ پانچ سال بعد حج کے لیے آیا ہوں۔ اس پر وہ لوگ متعجب ہوئے اور کہنے لگے کہ حکومت ہند نے کیونکر مجھے دوبارہ حج کے لیے زرمبادلہ فراہم کیا ہے۔ ہم لوگوں کو تو معلوم ہے کہ حکومت ہند بہت کم لوگوں کو زرمبادلہ حج کے لیے دیا کرتی ہے۔ زیادہ تر حجاج جو ہندوستان سے آتے ہیں انھیں زرمبادلہ نہیں ملتا ہے۔ یہ لوگ اپنے ان رشتہ داروں سے جو سعودی عرب میں کام کر رہے ہیں رقمیں قرض لے کر یہاں اپنا کام چلاتے ہیں۔ میں نے ان لوگوں کو بتایا کہ اس سال ۱۸ ہزار سے زیادہ حجاج کرام ہندوستان سے آئے ہیں اور ان میں سے ہر ایک کو دو ہزار کی رقم بطور زرمبادلہ دی گئی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ کچھ ایسے حاجی بھی آئے ہوں جنھوں نے حکومت سے کوئی رقم زرمبادلہ کی نہ لی ہو اور ان کے رشتہ دار جو یہاں کام کر رہے ہیں دوران حج ان کی مالی مدد کریں۔ اس کے بعد یہ لوگ کہنے لگے کہ ہندوستان

کی ہند وحکومت نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کو ہندو اساتذہ اور طلباء سے بھر دیا ہے اور اب یہ ایک ہندو یونیورسٹی بن گئی ہے۔ میں نے ان سے کہا کہ جب کسی مضمون کے پڑھانے کے لیے کوئی اچھا مسلمان استاذ نہیں ملتا ہے تو ہند وحکومت نہیں بلکہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے مسلم منتظمین خود ہی کسی قابل ہندو پروفیسر کو مقرر کرتے ہیں۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی یہ ایک نمایاں خصوصیت ہے کہ یہاں شروع سے ہی ہندو طلباء کا داخلہ لیا جاتا ہے۔ اس کے بعد یہ لوگ مہمل طریقے کی باتیں کرتے رہے اور راقم ان کے اعتراضوں کا خاطر خواہ جواب دیتا رہا مگر وہ لوگ قائل نہ ہوئے اور عاجز آکر الزام لگایا کہ میں ہند وحکومت کا جاسوس ہوں اور میرے سفر حجاز کے پورے اخراجات کو حکومت ہند برداشت کرتی ہے۔ راقم اپنا کھانا ختم کر چکا تھا اور میز سے اٹھتے وقت میں نے ان حضرات کو اپنا تعارفی کارڈ جس پر میرا نام پتہ وغیرہ لکھا ہوا تھا دے کر سلام عرض کیا اور ہوٹل سے باہر چلا آیا۔ پروفیسر سید محمد محسن نے اپنے ایک مضمون میں جو رسالہ "لنک" میں بتاریخ ۲۲۔ اپریل ۱۹۷۳ء کو شائع ہوا تھا اس واقعہ کو بیان کیا ہے۔

۱۹۷۳ء میں حج کے اخراجات اور مسٹر ٹی پی عبداللہ کے اوصاف حمیدہ :

۱۹۷۳ء کے حج میں راقم کے تقریباً چھ ہزار روپے خرچ ہوئے اور سفر آرام سے گذرا۔ پٹنہ سے بمبئی اور بمبئی سے پٹنہ بذریعہ ریل فرسٹ کلاس میں سفر کیا۔ بمبئی سے جدہ اور جدہ سے بمبئی بذریعہ بحری جہاز سفر کیا۔ مدینہ ہوائی جہاز سے گیا اور واپس آیا۔ مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ میں آرام سے رہا۔ اللہ کا شکر ہے کہ دوران سفر کبھی بیمار نہ پڑا۔ مسٹر ٹی پی عبداللہ نے جو اس زمانے میں سعودی عرب میں ہندوستان کے سفیر تھے ہر موقع پر راقم کی مدد فرمائی۔ میں نے انھیں ایک نہایت ہی شریف النفس انسان پایا اور وہ رعونت جو اکثر سفیروں میں ہوا کرتی ہے ان میں نہیں پائی جاتی ہے۔ گرچہ محکمۂ پولس میں سب سے اعلیٰ عہدہ پر رہ چکے تھے مگر کبھی بھی ان کی زبان سے کوئی تحکمانہ الفاظ نہ نکلتے تھے۔

پٹنہ کی آمد :

راقم حج وزیارت مدینہ کی سعادت حاصل کر کے ۱۹۔ فروری ۱۹۷۳ء کو بمبئی پہنچا۔ بمبئی میں ایک روز قیام کر کے دوسرے روز پٹنہ کے لیے روانہ ہو گیا کیونکہ میرے چھوٹے بھائی کی لڑکی

رومی کی شادی ڈاکٹر آفتاب احمد سلمۂ کے ساتھ ۲۳۔ فروری ۱۹۷۳ء کو ہونے والی تھی اور اس تقریب میں میرا شریک ہونا نہایت ضروری تھا۔ میرے استقبال کے لیے میرے بڑے لڑکے مقبول حسین اور محی الدین بمبئی گئے ہوئے تھے۔ گھر پہنچنے پر بیوی کو سخت بیمار پایا اور انھوں نے میرے واپس آنے کے تین مہینے بعد انتقال کیا۔ نہایت ہی وفادار اور خدمت گذار خاتون تھیں۔ اللہ انھیں جنت فردوس میں اعلیٰ مقام عطا کرے۔

قومی پرچم کے متعلق ایک غلط اعتراض :

راقم جب اپنے دوسرے حج اور زیارت مدینہ سے فارغ ہو کر پٹنہ آیا تو تقریباً تین ہفتہ بعد مسٹر علی صدیقی نے جو حیدرآباد کے ایک صحافی تھے اردو اور انگریزی اخباروں میں یہ بات زیر بحث لائی کہ دوران حج ۱۹۷۳ء تین دنوں تک مکہ معظمہ میں ہندوستان کا قومی پرچم بلند نہ کیا گیا اور اس بات کو ہندوستانی سفارت خانہ کی لاپرواہی پر محمول کیا۔ انھوں نے اس حرکت کو قوم کے لیے ایک نہایت ہی شرمناک بات بتائی۔ "ٹائمس آف انڈیا" دہلی مورخہ ۲۰۔ مارچ ۱۹۷۳ء میں یہ خبر نہایت ہی نمایاں طور سے شائع کی گئی۔ "صدائے عام" مورخہ ۲۲۔ مارچ ۱۹۷۳ء میں بھی یہ خبر شائع ہوئی۔ قومی پرچم بلند نہ کرنے کی وجہ یہ تھی کہ ایک قدیم رسم کے مطابق مکہ معظمہ میں دوران حج تین دنوں تک کسی حکومت کا قومی پرچم بلند نہیں کیا جاسکتا ہے۔ ان تین دنوں تک دوران حج حجاج کرام صرف اللہ کی بادشاہی کو تسلیم کرتے ہیں اور ہر وقت اسی کے بادشاہ حقیقی ہونے کا اقرار کرتے رہتے ہیں۔ کسی بادشاہ کی کیا مجال کہ اپنا پرچم بلند کرے۔ میں نے مسٹر آر۔ سی۔ اروڑہ، (ڈائرکٹر ای۔ این) وزارت خارجہ حکومت ہند دہلی کو بذریعہ خط مورخہ ۲۳۔ مارچ ۱۹۷۳ء اس معاملہ کے متعلق تفصیل کے ساتھ خبر کر دی تھی۔ اخباروں نے اس خبر کو اتنی اہمیت دی کہ لوک سبھا میں بذریعہ سوال نمبر ۷۰، اپریل ۱۹۷۳ء کو شری جگن ناتھ مشرا اور شری اندرجیت گپتا نے دریافت کیا کہ کیا حکومت کو اس بات کی خبر ہے کہ ہندوستان کا قومی پرچم دوران حج مکہ میں بلند نہیں کیا گیا اور اگر ایسا ہوا تو حکومت نے اس کے متعلق کیا کارروائی کی۔ شری سریندر پال سنگھ نے جو اس زمانے میں وزارت خارجہ کے وزیر سلطنت تھے اس سوال کے جواب میں کہا کہ ہندوستان کا قومی پرچم بلند نہیں کیا گیا کیونکہ دوران حج کسی قوم کا پرچم مکہ میں بلند نہیں کیا جاسکتا ہے۔ مسٹر آر سی اروڑہ نے بذریعہ خط مورخہ ۲۳۔ اپریل ۱۹۷۳ء کو راقم کو مطلع کیا کہ میرے خط اور اخبار کے تراشوں نے جنھیں میں نے اپنے خط کے ساتھ روانہ کیا تھا

صاحب موصوف کو پارلیمنٹ کے جواب تیار کرنے میں مدد پہنچائی۔

میرے دو عمرے

میرے چھوٹے لڑکے ڈاکٹر اشرف حسین سلمہ انگلستان سے ۱۹۷۲ء کے آخر میں سعودی عرب گئے اور اس زمانے سے اب تک ریاض یونیورسٹی کے میڈیکل کالج میں پروفیسر کے عہدے پر فائز ہیں۔ ان کے اصرار پر راقم ۲۳۔ مارچ ۱۹۷۶ء کو بذریعہ ہوائی جہاز پٹنہ سے دہلی، بمبئی، طہران ہوتا ہوا ریاض پہنچا۔ اس زمانے میں ریاض کا ہوائی اڈہ پرانا تھا اور شہر سے متصل تھا۔ اشرف سلمہ ہوائی اڈہ پر آکر راقم کو اپنی قیام گاہ پر لے گئے اور میں نے ان کے ساتھ ۵۔ جون ۱۹۷۶ء تک قیام کیا۔ ۶۔ جون ۱۹۷۶ء کو بذریعہ ہوائی جہاز دوبئی، کراچی، بمبئی اور دہلی ہوتا ہوا پٹنہ پہنچا۔ اس زمانے میں ریاض اتنا بڑا شہر نہ تھا جیسا اب ہے۔ ریاض سعودی عرب کا دارالسلطنت ہے جہاں بادشاہ اور شہزادوں کے محل ہیں۔ سعودی حکومت کے وزراء اور بڑے بڑے حکام یہاں رہتے ہیں۔ حکومت کے کل کام اسی شہر میں انجام پاتے ہیں۔ راقم کو شہر میں بہت کم اچھی اور بلند عمارتیں نظر آئیں۔ پرانے قسم کے مکانات ہر جگہ نظر آتے تھے۔ اس زمانے میں شہر کے اندر شاید ہی کوئی سات آٹھ منزلہ عمارت تھی۔ چار پانچ سڑکیں کافی کشادہ تھیں جہاں اچھی اچھی دکانیں نظر آئیں۔ شہر کا بازار غیر ملکی چیزوں سے بھرا پڑا رہتا تھا اور لوگ ان چیزوں کو نہایت شوق سے خریدا کرتے تھے۔ شہر میں یورپین طرز کے چند اچھے ہوٹل تھے جن کا شرح کرایہ کافی تھا۔ شہر کے خاص خاص حصوں میں صفائی کا اچھا انتظام تھا مگر راقم کو کچھ ایسی گلیاں بھی نظر آئیں جو نہایت گندہ تھیں۔ یہاں ہر ملک اور قوم کے لوگ نظر آئے جو اپنی روزی کمانے کے لیے آئے تھے۔ حکومت نے اس شہر کے لوگوں کے لیے پانی کی بڑی سہولت مہیا کی ہے اور گھروں میں کبھی بھی پانی کی قلت نہ ہوتی ہے۔ کسی گھر میں بجلی کی دشواری نہیں ہے۔ راقم نے کبھی بھی بجلی کو کچھ دیر کے لیے بھی بند ہوتے نہ دیکھا۔ عرب پٹرول کی آمدنی کی بدولت آرام کی زندگی بسر کر رہا ہے اور اسے کل کی کوئی فکر نہیں ہے۔ جو کماتا ہے خرچ کر ڈالتا ہے۔ پہلے زمانے کے عرب مہمان نوازی کے لیے مشہور تھے مگر اب اس جدید دور میں ان کی مہمان نوازی اور فیاضی بہت حد تک کم ہو چکی ہے۔ اس شہر میں کوئی تفریح گاہ نہیں ہے اور راقم کو پرانے طرز کے قہوہ خانے بھی نظر نہ آئے۔ گرمیوں کی شدت سے بچنے کے لیے امیر لوگ یورپ اور امریکہ چلے جاتے ہیں۔ ان ملکوں میں ان کی آرام دہ رہائش گاہیں ہیں جہاں یہ لوگ مع اہل و عیال چھٹیاں گزارتے ہیں۔ متوسط طبقے

کے لوگ بھی اپنے گھروں میں ائرکنڈیشنر لگا کر گرمی کی شدت سے بچتے ہیں۔ حکومت غریب عربوں کی کافی مالی مدد کیا کرتی ہے اور جو لوگ تجارت کرنا چاہتے ہیں انھیں سرمایہ فراہم کرتی ہے۔ زیادہ تر عوام کا مزاج مذہبی ہے اور اللہ سے ڈرتے ہیں۔ جرائم بہت کم ہوتے ہیں اور یہ ایک بڑی بات ہے۔
راقم کو شہر میں تھوڑی تھوڑی دوری پر مسجدیں نظر آئیں۔ حکومت کی طرف سے اس زمانے میں ملازمین مقرر تھے جو نماز کے وقت دکانوں کو بند کراتے اور لوگوں کو مسجدوں میں جاکر نماز ادا کرنے کو کہا کرتے تھے۔ زیادہ تر لوگ مسجد میں جاکر نمازیں ادا کرتے تھے مگر باوجود اس اہتمام کے کچھ غیر ملکی مسلمان مسجدوں میں نماز پڑھنے نہ جاتے اور نماز کے وقت سڑکوں پر ادھر ادھر گھوم کر اپنا وقت برباد کرتے تھے۔ مجھے ان کی یہ حرکت نہایت ہی شرمناک معلوم ہوتی تھی۔ جب میں ریاض میں تھا تو ہر کس و ناکس سے اعلیٰ حضرت شاہ فیصل کی تعریفیں سنیں۔ درحقیقت وہ ایک نہایت ہی دیندار، عادل اور دور اندیش فرمانروا تھے۔ راقم نے ملک معظم کو مسجد نبوی میں ایک مرتبہ بہت قریب سے دیکھا تھا اور ان کے ساتھ مغرب کی نماز ادا کی تھی۔ ان کو دیکھ کر خلفاء راشدین کی یاد تازہ ہوجاتی تھی۔ ان کی شہادت پر راقم کو بڑا صدمہ ہوا۔ ایک عرب نے مجھے چاندی کی ایک انگوٹھی بطور تحفہ عطا کی ہے جس پر جلالۃ الملک فیصل بن عبدالعزیز کی تصویر اور نام کندہ ہیں۔ یہ انگوٹھی راقم کے پاس بطور یادگار اب تک محفوظ ہے۔

میرا پہلا عمرہ اور زیارت مدینہ :

ریاض میں کچھ دنوں قیام کے بعد مکہ معظمہ جاکر مجھے عمرہ کرنے کی سعادت نصیب ہوئی۔ میرے چھوٹے لڑکے ڈاکٹر اشرف حسین، ان کی اہلیہ اور ان کی دونوں لڑکیاں بھی میرے ساتھ مکہ معظمہ گئیں۔ عبدالرقیب صاحب جو اشرف حسین سلمہ کے خاص دوستوں میں ہیں وہ ان دنوں ریاض میں مقیم تھے۔ صاحب موصوف بھی ہم لوگوں کے ہم سفر رہے۔ رات کا قیام ہم لوگوں نے مکہ معظمہ کے ایک اچھے ہوٹل میں کیا جو حرم شریف کے نزدیک تھا۔ گرچہ حرم شریف میں لوگوں کا اژدھام کافی تھا مگر راقم کو ہر طواف میں حجر اسود کا بوسہ لینے کا موقع نصیب ہوا۔ راقم کو تقریباً تین سال بعد حرم شریف کی عمارتوں کو دیکھنے کا شرف حاصل ہوا تھا۔ یہ دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی کہ حرم شریف کے اندر اور باہر کافی توسیع کی گئی تھی۔ دوسرے روز صبح کی نماز پڑھ کر ہم لوگ مدینہ منورہ کے لیے روانہ ہو گئے۔ اشرف حسین سلمہ نے مکہ سے مدینہ کے سفر کے لیے ایک بڑی اور آرام دہ موٹر کار کا انتظام کیا۔ ہم لوگوں نے مدینہ منورہ آرام سے پہنچ کر مسجد نبوی میں ظہر کی نماز ادا کی۔ ایک اچھے ہوٹل میں دس روز تک ٹھہرے

جو مسجد نبوی سے متصل تھا۔ دوسرے روز اشرف حسین سلمہ سرکاری کام سے طائف چلے گئے، اور پانچ دنوں بعد مدینہ منورہ واپس آئے۔ راقم اپنی ہر نماز مسجد نبوی میں ادا کرتا اور اپنا زیادہ تر وقت مسجد میں ہی گزارتا تھا۔ جمعہ کی نماز میں نے مسجد نبوی میں پڑھی اور راقم کو یہ دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی کہ نمازیوں کی تعداد اس قدر تھی جیسی کہ میں نے اپنے دو حج کے موقعوں پر دیکھی تھی۔ راقم نے دوران قیام مدینہ، گرد و نواح میں جو مسجدیں اور مقامات مقدسہ ہیں ان سب کو جاکر دیکھا۔ گرچہ میں ان سب جگہوں کو پہلے بھی کئی مرتبہ دیکھ چکا تھا۔ میں جنت البقیع بعد نماز عصر روزانہ جایا کرتا اور وہاں جو شہدا، صالحین اور صدیقین مدفون ہیں ان کے لیے دعائے خیر کیا کرتا تھا۔ ان جگہوں میں اتنی کشش ہے کہ انھیں بار بار دیکھنے کو جی چاہتا ہے۔ راقم کئی مرتبہ مدینہ منورہ آیا تھا مگر حضرت سلمان فارسی رضہ کے باغ کو نہ دیکھا تھا۔ اسی مقام پر حضرت سلمان فارسی کی رہائش گاہ تھی اور اس کے ارد گرد یہودیوں کی آبادی تھی۔ حضرت سلمان فارسی رضہ روزانہ بلا خوف و خطر مسجد نبوی میں عشا کی نماز ادا کرکے یہاں آتے اور علی الصباح یہاں سے روانہ ہوکر مسجد نبوی میں فجر کی نماز ادا کیا کرتے تھے۔ جب ہم لوگ حضرت سلمان فارسی رضہ کے باغ کو دیکھنے کے لیے جانے لگے تو ایک ٹیکسی کرایہ کی۔ ٹیکسی ڈرائیور کا تعلق غالباً اس مسلک سے تھا جنھیں تاریخی مقامات عزیز نہ تھے۔ مشکل سے وہاں جانے پر آمادہ ہوا اور کہا کہ باغ جانے کا راستہ اچھا نہیں ہے۔ ہم لوگوں کو باغ سے کچھ دوری پر موٹر سے اتار دیا اور آگے جانے سے بالکل انکار کیا۔ ٹیکسی ڈرائیور کا یہ کہنا کہ راستہ خراب ہے بالکل غلط تھا۔ راقم حضرت سلمان فارسی رضہ کا بڑا احترام کرتا ہے اور ہر وہ چیز جس سے ان کا تعلق تھا میرے لیے عزیز ہے۔ جب میں باغ میں داخل ہوا تو تقریباً سو ایرانی وہاں جمع تھے اور نہایت ہی خلوص کے ساتھ درود و سلام پڑھ رہے تھے اور راقم نے بھی ایسا ہی کیا۔ آج کل اس باغ میں کھجوروں کے پودوں کا ذخیرہ ہے اور ان پودوں کے درمیان کھجور کے دو بڑے درخت ہیں جن کے تنے بہت موٹے ہیں۔ لوگوں کا خیال ہے کہ یہ دونوں درخت حضرت سلمان فارسی رضہ کے زمانے کے ہیں۔ ایرانی زائرین ان درختوں کے چھلکے چھیل کر بطور تبرک اپنے ساتھ لے جاتے ہیں۔ یہ بالکل ناممکن ہے کہ کوئی بھی درخت چودہ سو برس تک اپنی جگہ پر قائم اور سرسبز رہ سکے۔ راقم کا خیال ہے کہ جب یہ کھجور کے درخت خشک ہوجاتے ہوں گے تو لوگ ان کی جگہوں پر کھجور کا کوئی دوسرا درخت لگادیتے ہوں گے۔ اور اس طور سے یہ تسلسل قائم ہے۔ اشرف حسین سلمہ نے راقم کی ایک تصویر ان کھجور

کے سایہ میں لی جواب تک میرے پاس محفوظ ہے۔ اور حضرت سلمان فارسیؓ کی یاد دلاتی ہے۔ کچھ ایرانی حضرات اس باغ کی مٹی بطور تبرک اپنے ساتھ لے جاتے ہیں اور اسے تیمم کے کام میں لاتے ہیں۔ دوران قیام راقم نے مسجد نبوی میں ایک مرتبہ نماز جمعہ ادا کی۔ اتفاقاً مجھے اللہ کے فضل سے اس بڑے مجمع میں ریاض الجنۃ میں نماز ادا کرنے کی سعادت نصیب ہوگئی۔ راقم جب مسجد نبوی میں آیا تو کل جگہیں بھر چکی تھیں اور ریاض الجنۃ میں نماز ادا کرنے کی صورت نہیں نظر آتی تھی۔ جب میں نماز ادا کرنے کے لیے پریشانی کی حالت میں جگہ تلاش کر رہا تھا کہ ایک عرب بزرگ کی نظر مجھ پر پڑی۔ انھوں نے جگہ خالی کر کے مجھے اپنی جگہ پر بٹھا دیا اور اس طور سے میں نے جمعہ کی نماز ریاض الجنۃ میں ادا کی۔ راقم جب ۱۹۷۶ء میں مسجد نبوی میں حاضر ہوا تو مجھے یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ مسجد کی عمارت میں کوئی توسیع نہیں ہوئی ہے۔ یہ عمارت بالکل اسی حالت میں تھی جیسا کہ میں نے اسے ۱۹۶۷ء اور ۱۹۷۳ء میں دیکھا تھا۔ مسجد کے باہر ایک جانب کافی تعداد میں الگ الگ سفید رنگ کے پختہ سائبان بنا دیے گئے تھے اور جب مسجد نبوی میں نمازیوں کی جگہ بالکل بھر جاتی تھی تو لوگ انہی سائبانوں میں نماز ادا کرتے۔

ریاض کا دوبارہ سفر اور میرا دوسرا عمرہ:

۱۷۔ مارچ ۱۹۸۵ء کو راقم دہلی سے روانہ ہو کر بذریعہ ہوائی جہاز اسی روز ریاض پہنچا اور وہاں سے ۸۔ مئی ۱۹۸۵ء کو پٹنہ واپس آگیا۔ راقم نے ریاض کو اس مرتبہ ایک نہایت بڑا اور خوب صورت شہر پایا۔ پورے شہر میں عمارتیں نہایت ہی خوب صورت اور شاندار تعمیر ہوئی ہیں اور بہت سی عمارتیں زیر تعمیر ہیں۔ ریاض کا نیا ہوائی اڈہ نہایت ہی وسیع، خوب صورت اور آرام دہ ہے۔ یہ ہوائی اڈہ شہر سے تقریباً ۶۰ - ۶۵ کیلومیٹر کی دوری پر واقع ہے۔ ریاض یونیورسٹی کی عمارتیں بہت خوب صورت اور وسیع بنائی گئی ہیں اور دیکھنے کے لائق ہیں۔ مارچ مہینے میں راقم نے یونیورسٹی کے اردگرد یورپ کے موسمی پھولوں کے تختے جابجا دیکھے جو ماحول کو نہایت خوب صورت اور دل کش بنا رہے تھے۔ لوگوں سے معلوم ہوا کہ ہر سال ایک بہت بڑی رقم ان پھولوں کے تختوں کو سجانے اور سرسبز رکھنے میں خرچ کی جاتی ہے۔ اشرف حسین سلمہٗ جس فلیٹ میں رہتے ہیں اس کی عمارت سات منزلہ ہے۔ پورے فلیٹ میں ایرکنڈیشن کام کرتا ہے اور کمرے آرام دہ ہیں۔ کمروں کو قالینوں اور اچھے فرنیچر سے مزین کیا گیا ہے۔ باورچی خانہ جدید یورپین طرز کا ہے اور ہر غسل خانہ بھی آرام دہ ہے۔ نہانے کے لیے بڑے بڑے ٹب لگے ہوئے ہیں۔ گرم اور ٹھنڈا پانی ہر

وقت موجود رہتا ہے۔ مجھے اس فلیٹ میں کسی چیز کی کمی نظر نہ آئی۔ شہر اور یہاں کے بازار امریکن طرز پر بنائے گئے ہیں اور راقم کو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ریاض کا پورا شہر امریکہ میں بنا کر عرب کی سرزمین پر لاکر رکھ دیا گیا ہے۔ باوجود ان سب آرام کے ریاض راقم کے لیے ایک اجنبی شہر تھا اور یہاں کوئی ایسی تفریح گاہ نہ تھی جہاں میں جا سکوں۔ مجھ سے ملنے والے بہت کم ہی لوگ تھے۔ مسٹر محبوب بشیر اور ڈاکٹر شفیق حیدر نہایت ہی باوضع حضرات ہیں جن سے مل کر راقم کو بڑی خوشی ہوتی تھی۔ ان کے علاوہ میرے دوست ظفر مرحوم کے صاحبزادے ڈاکٹر اظفر حسین ریاض یونیورسٹی میں انگریزی کے پروفیسر ہیں اور میرے برادر عزیز سید محمد احمد صاحب کے صاحبزادے ڈاکٹر شمیم احمد بھی یونیورسٹی میں انگریزی کے پروفیسر ہیں۔ یہ دونوں حضرات مجھ سے ملنے کے لیے برابر آیا کرتے تھے۔ ڈاکٹر عرفان الرحمٰن اور مسٹر امیر احمد ایک دو مرتبہ ملنے آئے۔ ڈاکٹر شمیم احمد نے مذہبی مزاج پایا ہے اور ان سے مل کر بزرگان دین سے متعلق باتیں ہوا کرتی تھیں۔ ریاض میں جب میرے قیام کے پندرہ بیس روز گذر گئے تو میں نے مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ جانے کا پروگرام بنایا۔ ان جگہوں پر مجھے اشرف سلمہ نے تنہا جانے نہ دیا۔ عزیز موصوف کو ہفتہ میں جمعرات اور جمعہ کو چھٹی رہتی ہے، اس لیے یہ بات طے پائی کہ ہم لوگ ایک بدھ کی رات کو ریاض سے روانہ ہو کر جمعرات اور جمعہ کو مکہ مکرمہ میں عمرہ ادا کریں اور جمعہ کی نماز مسجد حرام میں پڑھ کر ریاض واپس آجائیں۔ اسی طرح سے کسی دوسرے بدھ کی رات کو مدینہ منورہ جائیں اور جمعہ کی نماز مسجد نبوی میں ادا کر کے واپس آئیں۔

مکہ معظمہ کا سفر اور میرا دوسرا عمرہ:

اپریل ۱۹۸۵ء کے پہلے ہفتہ میں ہم لوگ مکہ معظمہ گئے اور عمرہ ادا کیا۔ راقم تقریباً آٹھ سال بعد مکہ مکرمہ آیا تھا۔ حرم شریف کے اندر اور باہر کافی توسیع کر دی گئی ہے جسے دیکھ کر مجھے بڑی خوشی ہوئی۔ مطاف کو بہت چوڑا کر دیا گیا ہے اور اس کے فرش میں ایسے سفید پتھر لگائے گئے ہیں جو ہر وقت ٹھنڈے رہتے ہیں اور طواف کرنے والے کو کوئی تکلیف نہیں ہوتی ہے۔ مسجد حرام میں ان سب جگہوں پر جہاں زمانہ قدیم سے کنکر بچھے ہوئے تھے، سنگ مرمر کا فرش بنا دیا گیا ہے جو ہر وقت ٹھنڈا رہتا ہے۔ مسجد حرام میں ہر جگہ واٹر کولر رکھے ہوئے ہیں جو آبِ زمزم سے بھرے رہتے ہیں۔ واٹر کولر کا رنگ نارنجی ہے اور نہایت ترتیب سے رکھے ہوئے ہیں۔ راقم کو ایک کبوتر بھی حرم شریف کے اندر نظر نہ آیا۔ یہ کبوترانِ حرم جو صدیوں سے حرم شریف میں

آباد تھے۔ اب حرم شریف کے باہر ان کے رہنے کا ٹھکانہ کر دیا گیا ہے۔ اشرف سلمہ کی بدولت ہم لوگوں کا قیام الحرم ہوٹل میں ہوا جو کہ مکہ معظمہ کا نامی اور آرام دہ ہوٹل ہے۔ اس ہوٹل کے ہر کمرے میں تلاوت کے لیے کلام اللہ مجید کا ایک ایک نسخہ موجود رہتا ہے۔ جس کمرے میں راقم ٹھہرا ہوا تھا اس میں علامہ یوسف علی کا انگریزی ترجمہ رکھا ہوا تھا۔ دوسرے روز راقم نے جمعہ کی نماز میں شرکت کی۔ پوری مسجد حرام نمازیوں سے بھری ہوئی تھی اور نمازیوں کی اتنی کثرت تھی جیسی کہ حج کے زمانہ میں ہوا کرتی ہے۔ گرد و نواح کے لوگ دو تین سو کیلومیٹر کا فاصلہ طے کر کے مسجد حرام میں نماز جمعہ ادا کرنے آتے ہیں۔ طواف میں حجر اسود کا بوسہ لینا سخت دشوار ہو جاتا ہے۔ راقم کو اپنے گزشتہ حج کا منظر یاد آگیا۔ راقم نے تمام مقامات مقدسہ کی زیارت کی اور کئی مسجد میں نفل نمازیں ادا کیں۔ مسجد حرام میں جناب صادق اخر دف سے ملاقات ہوئی۔ صاحب موصوف ایک نہایت ہی شریف انسان ہیں اور الجیریہ میں صنعت و حرفت کے سنیئر ڈائرکٹر ہیں۔ فرانسیسی زبان خوب جانتے اور بولتے ہیں۔ واپسی کے وقت راقم نے اللہ سے دعا کی کہ مجھے پھر کعبۃ بیت اللہ کی زیارت نصیب ہو۔ راقم ریاض واپس آکر کئی دنوں تک افسوس کرتا رہا کہ مکہ مکرمہ میں میرا قیام فقط دو روز کے لیے ہوا۔ اب مکہ معظمہ بہت بڑا شہر ہو گیا ہے اور دیکھنے کے لائق ہے۔

مدینہ منورہ کی زیارت :

دو ہفتہ بعد راقم بدھ کی شام کو ریاض سے روانہ ہو کر مدینہ منورہ جمعرات کو پہنچا۔ ہم لوگوں کا قیام حرم شریف کے نزدیک ایک انگریزی طرز کے ہوٹل میں ہوا جو بہت آرام دہ تھا۔ ان تمام مقامات مقدسہ اور مساجد کو جا کر دیکھا جنھیں راقم نے بہت بار دیکھا ہے۔ متفرق مسجدوں میں نفل نمازیں بھی ادا کیں۔ مواجہہ رسول کے سامنے کھڑا ہو کر درود و سلام پڑھا اور دوران قیام کل نمازیں مسجد نبوی میں ادا کیں۔ جب راقم جنت البقیع گیا تو دیکھا کہ اس قبرستان کے چاروں طرف اونچی اونچی دیواریں تعمیر کر دی گئی ہیں اور ان دیواروں میں جابجا جالیاں بنائی گئی ہیں جن سے قبرستان کا اندرونی حصہ نظر آتا ہے۔ دروازوں پر تالے لگا دیے گئے ہیں اور کسی کو اندر جانے کی اجازت نہیں ہے۔ سنا ہے کہ کچھ غیر عرب حجاج کرام کے اصرار پر ۱۹۸۶ء کے حج کے زمانے میں جنت البقیع کے دروازے کھول دیے گئے تھے اور حجاج کرام نے اندر جا کر مختلف مقامات پر فاتحہ پڑھا۔ جب میں احد گیا تو گنج شہیداں کے دروازے پر بھی تالا بند پایا اور باہر سے راقم نے فاتحہ پڑھا۔

یہ سب وہ مقامات ہیں جن سے اسلام کی ابتدائی تاریخ وابستہ ہے۔ جذبۂ غلو سے متاثر ہوکر ان جگہوں کی بے حرمتی کرنا کوئی اچھی بات نہیں ہے۔ راقم نے مسجد نبوی کو اسی حال میں پایا جیسا کہ میں نے ۱۹۶۷ء میں دیکھا تھا۔ بہت دنوں کے بعد سعودی حکومت کو مسجد کی توسیع کرنے کا خیال گزرا ہے۔ مسجد نبوی کے باب عبدالعزیز سے جو سڑک جنت البقیع کو جاتی ہے اس کے داہنے طرف جتنے مکانات تھے، ان کو توڑ کر میدان کر دیا گیا ہے اور اب باب مجیدی کے سامنے کی کل عمارتیں جن میں "اصطفیٰ منزل" بھی شامل ہے، توسیع مسجد کے لیے توڑ دی جانے والی ہیں اور اس طرح سے مسجد نبوی توسیع کے بعد ایک نہایت بڑی اور شاندار عمارت ہو جائے گی۔ ہوسکتا ہے اللہ اس مسجد کی جدید عمارت میں نماز ادا کرنے کا موقع راقم کو بھی عطا فرمائے۔ راقم نے جمعہ کی نماز مسجد نبوی میں ادا کی۔ نمازیوں کا اس قدر ہجوم تھا کہ مسجد کے اندر جگہ نہ ملنے کے باعث بہت سے لوگوں نے باہر جاکر نئے تعمیر شدہ سائبانوں میں نماز ادا کی۔ جمعہ کی نماز ادا کرنے کے بعد ہم لوگ مدینہ منورہ سے روانہ ہوکر ہوائی اڈہ پر پہنچے اور وہاں سے بذریعہ ہوائی جہاز ریاض واپس آگئے۔ راقم نے اس بار ایک نئی بات یہ دیکھی کہ ٹیکسی ڈرائیور مدینہ منورہ کے حدود میں درود پڑھتا ہوا داخل ہوا اور اسی طرح سے درود و سلام پڑھتا ہوا مدینہ منورہ سے باہر نکلا۔ راقم کو مدینہ منورہ چار بار آنے کی سعادت نصیب ہوئی ہے۔ پچھلی مرتبہ کم از کم دس روز کا قیام رہا تھا مگر اس بار یہاں صرف ڈیڑھ دن رہ سکا جس کا مجھے بہت افسوس ہے۔ راقم اپنے دو حج اور دو عمرے کو اپنی زندگی کا قابل قدر اور عظیم سرمایہ سمجھتا ہے۔ مدینۃ اللہ کے پیارے نبی کا پیارا شہر ہے اور اسلام کی ابتدائی تاریخ اس شہر سے وابستہ ہے۔ اللہ ہر مسلمان کو اس شہر کی زیارت کا موقع عطا فرمائے۔

انیسواں باب

خانقاہ مجیبیہ سے میرے خاندانی تعلقات

(۱) حضرت سید شاہ بدرالدین رح

خانقاہ مجیبیہ اور حضرت سید شاہ بدرالدین رح :

قصبہ پھلواری شریف ہم لوگوں کے آبائی گاؤں نیورہ ضلع پٹنہ سے تقریباً دس کیلومیٹر پر واقع ہے لوگوں کا خیال ہے کہ کسی زمانے میں یہاں ہندو راجہ اشوک کا باغ تھا اور اسی سبب سے یہ قصبہ پھلواری کے نام سے مشہور ہوا۔ یہاں کی خانقاہ مجیبیہ ہندوستان اور بہت سے دیگر ممالک میں عرصہ دراز سے مشہور رہی ہے۔ خانقاہ مجیبیہ پھلواری شریف ہمیشہ سے علماء اور مشائخ کا گہوارہ رہی ہے۔ راقم کے خاندان کو اس خانقاہ سے تقریباً ایک سو سال سے تعلق ہے۔ دادا صاحب مرحوم اور ظہیر دادا مرحوم (خان بہادر سید ظہیر الدین) غالباً کسی کے مرید نہ تھے مگر خانقاہ مجیبیہ کے سجادہ نشین اور وہاں کے علماء کرام کا بہت احترام کرتے تھے۔ خان بہادر سید ظہیر الدین تو تقریباً ہر ماہ پھلواری شریف جاکر جناب حضور سجادہ نشین سے ملنے کی سعادت حاصل کرتے۔ ماہ ربیع الاول میں عرس کے موقع پر خان بہادر موصوف پھلواری شریف ضرور جاتے اور مجلس سماع میں شریک ہوتے تھے۔ راقم کے والد اور خاندان کے دوسرے افراد حضرت حاجی وارث علی شاہ دیوا شریف ضلع بارہ بنکی کے مریدوں میں تھے۔ جب والدہ مرحومہ کو مرید ہونے کا خیال ہوا تو اس زمانے میں بہت سی ایسی نامی خانقاہیں تھیں جہاں جاکر وہ مرید ہو سکتی تھیں۔ والد صاحب مرحوم حضرت سید شاہ بدرالدین رحمۃ اللہ علیہ سجادہ نشین خانقاہ مجیبیہ کا بڑا احترام کرتے اور ان کے علم و عرفان کے بڑے قائل تھے۔ والد صاحب نے والدہ کو مشورہ دیا کہ حضرت سید شاہ بدرالدین رح سے پھلواری شریف جاکر مرید ہو جائیں۔

چنانچہ ۱۹۱۹ء کے اوائل میں والد صاحب اور والدہ صاحبہ پھلواری شریف جاکر حضرت موصوف سے ملاقات کی اور والدہ صاحبہ نے جناب حضور سے مرید ہونے کی سعادت حاصل کی۔ جناب حضور سید شاہ بدر الدین صاحب جب تک زندہ رہے والدہ مرحومہ ان کی خدمت میں اکثر حاضر ہوا کرتی تھیں اور اپنے پیر کے وصال کے بعد بھی انھوں نے پھلواری شریف جانا ترک نہ کیا۔ انتقال کے بعد والدہ مرحومہ کا جسد خاکی خانقاہ مجیبیہ کے قبرستان میں مدفون کیا گیا۔ جناب حضور سید شاہ امان اللہ نے جو اس زمانے میں صاحب سجادہ تھے نماز جنازہ پڑھائی اور دعائے مغفرت کی۔ راقم کو والدہ مرحومہ کے ساتھ پھلواری شریف جاکر کئی بار حضرت سید شاہ بدر الدینؒ سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔ اس زمانے میں راقم پٹنہ کالج میں بی۔ اے کا طالب علم تھا۔ اتوار کے دن خانقاہ کی خلوت میں راقم نے بہت سے پٹنہ کے وکلا، بیرسٹر، وزرا اور افسران کو حاضر ہوتے دیکھا ہے۔ مسٹر سید نور الہدیٰ مرحوم اور سر فخر الدین مرحوم بہت پابندی سے جناب حضور کی خدمت میں حاضر ہوا کرتے تھے۔

مولانا سید شاہ بدر الدینؒ ۲۷۔ جمادی الآخری ۱۲۶۸ھ کو پیدا ہوئے اور ۱۶۔ صفر ۱۳۴۳ھ کو وفات پائی اور تاج العارفین مخدوم شاہ محمد مجیب اللہ قدس سرہٗ کے مزار کے متصل مدفون ہوئے۔ مولانا سید سلیمان ندوی نے "معارف" کے ربیع الاول ۱۳۴۳ھ کی اشاعت میں حضرت مرحوم کے بارے میں یوں تحریر فرمایا ہے:

"حضرت مولانا شاہ بدر الدین، سجادہ نشین پھلواری شریف اس عہد کے جنیدؒ و شبلیؒ تھے۔ ان کا زہد و ورع نزاہت و اتقا، علم و عمل، صورت و سیرت ہر چیز نمونہ سلف تھی، کم و بیش چالیس برس تک یہ علم و عرفان کی شمع صوبہ بہار میں روشن رہی اور اس کی روشنی دور دور تک پھیلتی رہی، ان کے شب و روز کے چوبیس گھنٹے ذکر و فکر اور مطالعہ کتب کے سوا اور مشاغل میں کم تصرف ہوتے ہیں۔ ان کی نشست گاہ ایک کتب خانہ تھی ان کے چاروں طرف کتابوں کا انبار لگا رہتا تھا۔ اور اس کے بیچ میں یہ زندہ کتب خانہ جلوہ فرما رہتا تھا۔ اس عہد میں یہی ایک ہستی تھی جو ظاہر و باطن، علم و معرفت، حقیقت و شریعت کا مجمع البحرین تھی اور جس سے ہزاروں اور لاکھوں علم و معرفت کے پیاسے سیراب ہوتے رہتے تھے، پھلواری کا سجادہ

اس بزرگ ذات کی رونق افروزی سے چشمۂ خورشید تھا، افسوس کہ یہ آفتاب ہمیشہ کے لیے ڈوب گیا۔"

شمس العلماء کا خطاب اور اس کی واپسی :

حضرت الحاج سید شاہ بدر الدین رح کو حکومت برطانیہ نے آپ کے علمی کمالات اور ذاتی عظمت کی بنا پر ۱۹۱۵ء میں "شمس العلماء" کے خطاب سے سرفراز کیا۔ حضرت موصوف خلوت نشین تھے اور گورنر کے دربار میں جاکر اپنی خلعت اور سند نہ لے سکتے تھے۔ چنانچہ یہ بات قرار پائی کہ پٹنہ ڈویزن کا کمشنر، حضرت شاہ بدر الدین کی خلوت میں جاکر اپنے ہاتھوں سے انھیں شمس العلماء کی خلعت پہنائے اور اس خطاب کی سند عطا کرے۔ اس زمانے میں انگریز حکام بڑی شان و شوکت سے رہا کرتے تھے اور ان لوگوں کے لیے کسی خانقاہ میں جانا کوئی معمولی بات نہ تھی۔ ان دنوں مسٹر اولڈھم پٹنہ ڈویزن کے کمشنر تھے اور صاحب موصوف کی پر زور سفارشوں پر حضرت مولانا کو شمس العلماء کا خطاب دیا گیا تھا۔ مسٹر اولڈھم کو فارسی زبان اور اسلامی تواریخ سے کافی دلچسپی تھی (بعد میں لندن کی روائل ایشیاٹک سوسائٹی کے سکریٹری رہے)۔ مسٹر اولڈھم نہایت احترام کے ساتھ حضرت مولانا کی خدمت میں حاضر ہوئے اور سند پیش کی اور اپنے ہاتھوں سے خلعت پہنائی۔ یہ ایک بڑے انگریز حاکم کے لیے کوئی آسان کام نہ تھا۔ خان بہادر ظہیر الدین اور پٹنہ کے چند نامور مسلمان اس موقع پر موجود تھے۔ عرصہ تک اولڈھم صاحب کو اس بات پر بڑا فخر تھا کہ انھوں نے ایک عالم، دیندار اور حق پرست سجادہ نشین کو اپنے ہاتھوں سے خلعت پہنائی ہے۔ جب تحریک خلافت شروع ہوئی تو حضرت مولانا نے اپنے خطاب کی سند اور خلعت کو حکومت ہند کے یہاں واپس کر دی اور مسٹر اولڈھم کو اس بات پر بہت افسوس ہوا۔ خان بہادر ظہیر الدین اور خاندان نیورہ کے کل لوگوں کو حضرت مولانا کی یہ بات پسند نہ آئی۔

(۲) حضرت مولانا سید شاہ محی الدین رح

حضرت مولانا سید شاہ محی الدین رح اور میرے والد صاحب کے تعلقات :

حضرت الحاج مولانا سید شاہ محی الدین کی ولادت ۳۰ ذی الحجہ ۱۲۹۶ھ کو ہوئی اور ۲۹ جمادی الاول ۱۳۶۶ھ کو وفات پائی۔ اپنے والد حضرت سید شاہ بدر الدین کی وفات کے

بعد خانقاہ مجیبیہ کے سجادہ نشیں ہوئے اور ۹۔ ربیع الاول ۱۳۴۳ھ کو امیر شریعت بہار و اڑیسہ منتخب ہوئے۔

حضرت مولانا کو قرآن، حدیث، عربی، فارسی اور اسلامی فلسفہ پر بڑی قدرت حاصل تھی مگر حضرت موصوف کا مزاج تصوف کی جانب جھکا ہوا تھا۔ راقم جب کبھی بھی ان سے تصوف کے مسائل پر باتیں کرتا تو حضرت مولانا مشکل سے مشکل مسائل پر ژرف نگاہی کے ساتھ روشنی ڈالا کرتے تھے کہ دل کو تسکین ہو جاتی تھی۔ راقم اکثر ان کی خدمت میں حاضر ہوتا اور ان سے استفادہ کیا کرتا تھا۔ حضرت مولانا سے ایک مرتبہ باتوں باتوں میں جبر و اختیار کا مسئلہ چھڑ گیا۔ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد آپ نے تصوف کے اس مشکل مسئلہ کو نہایت خوبی اور وضاحت کے ساتھ بیان کیا کہ غلط فہمیوں کا امکان باقی نہ رہا۔ مولانا موصوف نہایت ہی منکسر المزاج، بردبار اور با اخلاق انسان تھے۔ اپنے دوستوں اور مریدوں سے بڑی محبت کرتے تھے اور ہر مرید ان کی محبت کا دم بھرتا تھا۔ والد مرحوم اور راقم کے چچا مشیر ریاست جیبن پور سر حضرت مولانا کے عزیز دوستوں میں تھے۔ مجھے مولانا موصوف کی خدمت میں حاضر ہونے کا پہلا موقع غالباً ۱۹۲۹ء میں چچا مرحوم کے ساتھ ہوا اور اس کے بعد راقم سال میں ایک دو بار ضرور حاضر خدمت ہوا کرتا تھا۔ والد صاحب مرحوم جب بھی پٹنہ تشریف لاتے تو پھلواری شریف جا کر حضرت موصوف سے ضرور ملاقات کرتے۔ ۱۹۳۲ء کے اوائل میں والد مرحوم کا تبادلہ پٹنہ بحیثیت صدر ایس۔ ڈی۔ او ہوا۔ پھلواری شریف کا تھانہ پٹنہ صدر میں پڑتا ہے اس لیے والد مرحوم کو ہر ماہ پھلواری شریف سرکاری کام کے لیے جانا پڑتا تھا۔ والد مرحوم اپنے سرکاری کاموں کو ختم کر کے خانقاہ جاتے اور کچھ دیر تک حضرت مولانا کے پاس بیٹھ کر باتیں کرتے تھے۔ باتیں کچھ اس انداز سے ہوتی تھیں کہ دیکھنے والا یہ سمجھتا کہ دونوں حضرات سگے بھائی ہیں اور یہ تعلق دونوں حضرات نے مرتے دم تک قائم رکھا۔

۱۹۳۴ء میں ایک بڑا زلزلہ بہار میں آیا۔ پٹنہ اور گرد و نواح کے مقامات اس زلزلہ سے سخت متاثر ہوئے۔ خانقاہ مجیبیہ کی عمارتوں کو شدید نقصان پہنچا اور کچھ عمارتیں اس طور سے متاثر ہوئیں کہ ان کا از سر نو تعمیر کرانا ضروری معلوم ہوتا تھا۔ زلزلہ کے دوسرے دن والد صاحب مرحوم پھلواری شریف آئے اور ان تمام عمارتوں کو دیکھا جن کو زلزلہ سے سخت صدمہ پہنچا تھا۔ اس زمانہ میں پٹنہ کا ضلع مجسٹریٹ ایک انگریز تھا جو والد صاحب کی باتوں کو بہت مانتا تھا۔ والد صاحب نے اس سے

مل کر پھلواری کے ان عمارتوں کا تذکرہ کیا جو زلزلہ کی زد میں آگئیں تھیں۔ ضلع مجسٹریٹ نے فوراً ایک ڈپٹی کلکٹر کو پھلواری شریف بھیجا کہ عمارتوں کی مرمت کے خرچ کا تخمینہ تیار کر کے ضلع مجسٹریٹ کے یہاں پیش کرے۔ جب ضلع مجسٹریٹ نے تخمینہ کو دیکھا تو والد مرحوم کو بلا کر کہا کہ یہ سب زلزلہ زدہ عمارتیں سرکاری خرچ سے مرمت کردی جائیں گی۔ یہ بات سن کر والد صاحب کو بڑی خوشی ہوئی اور حضرت سید شاہ محی الدین رح کو یہ خبر سنائی۔ جواب میں حضرت مولانا نے کہا کہ ہم لوگ اللہ کی مدد پر بھروسہ رکھتے ہیں اور مرمت کے کام میں حکومت کے ممنون منت نہ ہونا چاہتے ہیں۔ یہ سن کر والد صاحب خاموش رہے۔

۱۹۴۱ء میں جب والد صاحب پٹنہ کے ضلع مجسٹریٹ و کلکٹر تھے تو اچانک سخت بیمار ہو گئے۔ ڈاکٹروں نے تشخیص کی کہ قلب کمزور ہو گیا ہے اور آرام کی سخت ضرورت ہے۔ والد صاحب نے اپنی بیماری کی بنا پر لمبی فرصت لی اور اس کے اختتام پر پنشن لے کر سرکاری خدمت سے سبکدوش ہو گئے۔ علاج و معالجہ سے فائدہ ہوا اور پانچ چھ سال تک صحت مند رہے۔ یکایک مارچ ۱۹۴۷ء میں دوبارہ سخت بیمار ہو گئے۔ ان دنوں سید عبدالرزاق صاحب مرحوم پھلواری شریف سے پٹنہ والد صاحب سے ملنے آیا کرتے تھے۔ صاحب موصوف کو حضرت سید شاہ محی الدین رح سے بڑی قربت حاصل تھی۔ والد صاحب نے سید عبدالرزاق صاحب کو کہا کہ میرا ایک پیغام آپ شاہ محی الدین رح تک پہنچا دیں اور حضرت موصوف کے جواب سے بھی مجھے مطلع فرمائیں۔ پیغام یہ ہے کہ اب میری زندگی کے دن ختم ہو رہے ہیں اور میری تمنا ہے کہ مرنے کے بعد میں خانقاہ پھلواری شریف کے قبرستان میں دفن کیا جاؤں۔ کیا آپ اس کی اجازت دیں گے؟ حضرت موصوف نے دوسرے ہی روز عبدالرزاق چچا کے ذریعہ والد صاحب کو کہلا بھیجا کہ میری زندگی کا کیا ٹھکانہ ہے اگر میں زندہ رہا تو انشاء اللہ آپ کی تمنا ضرور پوری ہوگی۔ ۲۲۔ اپریل ۱۹۴۷ء کو حضرت سید شاہ محی الدین کی وفات ہوئی۔ ان کے وصال کے بعد حضرت سید شاہ امان اللہ رح سجادہ نشیں ہوئے۔ والد صاحب مرحوم نے عبدالرزاق چچا کے ذریعہ حضرت موصوف سے پھلواری شریف قبرستان میں دفن ہونے کی اجازت طلب کی۔ حضرت شاہ امان اللہ رح کل باتوں سے واقف تھے اور انھوں نے ایک اجازت نامہ لکھ کر والد صاحب مرحوم کے پاس بھیج دیا۔ اس کو دیکھ کر والد صاحب بہت خوش ہوئے اور اللہ کا شکر بجا لائے۔ والد صاحب کی بیماری روز بروز بڑھتی گئی اور بروز جمعہ ۶۔ فروری ۱۹۴۸ء کو انتقال

کیا۔ بعد نماز جمعہ ان کے جسد خاکی کو پھلواری شریف کے قبرستان میں دفن کیا گیا۔ اس طور سے والد مرحوم کی ایک دیرینہ خواہش پوری ہو گئی۔

خانقاہ مجیبیہ پھلواری شریف کے قبرستان میں صرف مریدوں کو دفن کیے جانے کا حق حاصل ہے۔ ایسے لوگ جو اس خانقاہ کے مریدوں میں نہیں ہیں عام طور سے انھیں یہاں دفن نہیں کیا جا سکتا ہے۔ والد صاحب مرحوم حضرت حاجی وارث علی شاہ دیوا شریف، ضلع بارہ بنکی کے مریدوں میں تھے اور قاعدے کی رو سے انھیں اس قبرستان میں دفن نہیں کیا جا سکتا تھا مگر حضرت شاہ امان اللہ کی کرم فرمائی کی بدولت والد مرحوم کو اس قبرستان میں دفن ہونے کی سعادت نصیب ہوئی۔ ایک قدیم دستور کے مطابق سجادہ نشیں خانقاہ مجیبیہ بعد نماز عصر روزانہ قبرستان جا کر فاتحہ پڑھتے ہیں اور یہ ایک بڑی بات ہے۔

سفر حج، زیارت حرمین و اماکن مقدسہ:

حضرت شاہ محی الدین رحمۃ اللہ علیہ خانقاہ مجیبی کے پہلے سجادہ نشیں تھے جنھوں نے سجادگی کے بعد حج کا سفر کیا۔ فریضۂ حج کی ادائیگی اور روضۂ اقدس کی حاضری کے بعد بیت المقدس، نجف اشرف، بغداد شریف اور دیگر مقامات مقدسہ کی زیارت کی اور ممالک اسلامیہ کا سفر کر کے پورے چھ ماہ پر وطن تشریف لائے۔ سید صالح حسین صاحب رئیس و زمیندار چھپرہ جو راقم کی اہلیہ مرحومہ کے سگے ماموں تھے حضرت موصوف کے ہمراہ بحری جہاز کے فرسٹ کلاس میں ہم سفر رہے اور اس سفر کا تذکرہ راقم سے نہایت ہی ذوق و شوق کے ساتھ کیا کرتے تھے۔

حضرت مولانا موصوف جذبات سے متاثر ہو کر اکثر فارسی میں غزلیں کہا کرتے تھے۔ حج سے واپسی کے بعد ردولی کی طرز پر فارسی میں ایک غزل کہی جس کے چند اشعار پیش کیے جاتے ہیں:

باز یاد آں گلستاں آید ھمی
دل چو بلبل در فغاں آید ھمی
فرخ آں رہ کز نسیم جانفزا اش
بوئے یار مہرباں آید ھمی
اے خوشا وقتے، مبارک ساعتے
دوست پیش دوستاں آید ھمی

ایک دوسری غزل کے چند اشعار ملاحظہ ہوں :

حبذا عہدیکہ ما بودیم و ایوان رسول
ایں بلند یہائے بختم خود ز فیضان رسول
کے شمردن می تواں خود راز مہمان رسول
ایں بس است اے دل شدم از عتبہ بوسان رسول
خرم آں روز یکہ بودم پیش او اندر حرم
چشم و دل می دید ہر سو ساز و سامان رسول

الحاج مولانا سید شاہ عون احمد قادری نے حضرت موصوف کی مکمل سوانح حیات شائع کی ہے اور قابل دید ہے۔ اس کتاب کا دوسرا ایڈیشن ۱۹۸۳ء میں خانقاہ مجیبیہ پھلواری شریف سے شائع ہوا ہے۔

(۳) حضرت مولانا سیّد شاہ امان اللہؒ

حضرت مولانا کے احوال :

حضرت سید شاہ امان اللہؒ کی ولادت ۸۔ محرم ۱۳۴۰ھ میں ہوئی۔ فارسی کی درسی کتابیں نہایت ذوق و شوق سے مولانا حکیم سید محمد شعیب علیہ رحمۃ سے پڑھیں اور عربی کی تعلیم اپنے سنجھلے چچا حضرت مولانا شاہ نظام الدین قادری قدس سرہ سے حاصل فرمائی۔ بعد ازاں مولانا محمد شریف صاحب اعظمی علیہ رحمۃ اور مولانا محمد عتیق صاحب فرنگی محلی علیہ رحمۃ کی شاگردی اختیار کی۔ مصطفےٰ آباد، اعظم گڈھ، لکھنؤ اور اجمیر شریف میں رہ کر منتہی کتابیں تمام فرما کر درسیات کی تکمیل کی۔ قیام لکھنؤ کے زمانے میں قاری محمد یونس صاحب مدرس مدرسہ فرقانیہ سے تجوید و قراۃ سیکھی۔ ۱۵۔ رجب ۱۳۶۲ھ کو دستار بندی ہوئی اور سند فراغ پائی۔ مولانا محمد شریف صاحب اعظمی نے تکمیل درسیات کی سند کے علاوہ مرویات حدیث کی سند بھی آپ کو عطا فرمائی۔ ۱۷۔ رمضان المبارک ۱۳۶۲ھ کو آپ پھلواری شریف تشریف لائے اور دار العلوم مجیبیہ میں درس و تدریس میں مصروف و منہمک ہو گئے۔ تدریس کا ذوق آپ کو تاحیات رہا۔ سجادگی اور خانقاہ مجیبی کی اہم ذمہ داریوں کے باوجود پڑھانے کے لیے ضرور وقت نکالتے، حدیث و تصوف کی کتابیں خصوصاً مشکوٰۃ شریف،

ابن ماجہ، موطا امام محمد، ریاض الصالحین اور فتوح الغیب وغیرہ درس میں رہتی تھیں۔

۱۳۵۸ھ میں اپنے والد ماجد حضرت مولانا سید شاہ محی الدین قادری قدس سرہٗ کے دست مبارک پر بیعت کی اور باطنی تعلیم شروع فرمائی۔ اپنے والد ماجد کے وفات کے بعد ۳ر جمادی الاول ۱۳۶۶ھ بروز جمعہ آپ سجادۂ مجیبی و مسند رشد و ہدایت پر متمکن ہوئے۔ عین جوانی کے زمانے ہی سے اپنی ذات کو اللہ تعالیٰ کی عبادت کے لیے وقف کر دیا توکل و قناعت آپ کی طبیعت میں بدرجہ اتم موجود تھیں اور جن کا اظہار ہمیشہ ہوا کرتا تھا۔ تقریباً ۳۸ برس تک ارشاد و ہدایت کا فریضہ انجام دے کر سجادہ پیر مجیب کا حق ادا کر دیا۔ حج بیت اللہ کی سعادت جناب حضور کو متعدد بار حاصل ہوئی۔ پہلی مرتبہ ۱۳۶۸ھ میں حج و زیارت روضۂ رسول سے مشرف ہوئے۔ وفات سے قبل بھی حرمین شریفین کی یادوں سے بے چین رہا کرتے تھے۔ ابتدا ہی سے ہی خلوت نشینی کی وجہ کر مختلف امراض میں مبتلا رہنے لگے جن کو صبر کے ساتھ برداشت کیا۔ قلبی تکلیف جناب حضور کو عرصہ سے تھی اور دوائیں برابر استعمال میں رہتی تھیں مگر ادھر چند سالوں سے یہ تکلیف زیادہ ہو گئی تھی۔ علاج کے لیے تقریباً ڈھائی سال قبل امریکہ تشریف لے گئے مگر قلب کی تکلیف ویسی ہی رہی۔ ۱۴۔ مئی ۱۹۸۵ء کی شام سے قلبی عارضہ شروع ہوا اور برابر بڑھتا گیا۔ ۱۵۔ مئی کی صبح کو اندرا گاندھی انسٹی ٹیوٹ آف کارڈیالوجی میں داخل کیے گئے۔ باوجود ہر ممکن تدبیر کے جاں بر نہ ہو سکے۔ ۱۷۔ مئی ۱۹۸۵ء مطابق ۲۶ شعبان ڈیڑھ بجے جمعہ کی رات کو داعی اجل کو لبیک کہہ کر واصل بحق ہو گئے اور اسی روز بعد نماز جمعہ جناب حضور کے جسد خاکی کو سپرد خاک کیا گیا۔

حضرت مولانا سے راقم کے تعلقات:

حضرت مولانا سے راقم کی پہلی ملاقات ۶۔ فروری ۱۹۴۸ء کو اس وقت ہوئی جب جناب حضور میرے والد مرحوم کی قبر پر فاتحہ پڑھنے کے لیے تشریف لائے۔ میں ان کے ساتھ خلوت کے حجرہ میں گیا اور تخلیہ میں باتیں ہوئیں۔ مولانا موصوف نے میرے والد مرحوم کے اوصاف حمیدہ کی تعریف کرتے ہوئے مجھے صبر کی تلقین کی، چند آیات قرآنی موت اور حیات کے متعلق پڑھ کر سنائیں اور میں مولانا موصوف کی دینی باتوں سے بہت متاثر ہوا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ جناب حضور میرے غم میں برابر کے شریک ہیں۔

ان کی نورانی صورت، خاندانی وجاہت، بے نظیر شرافت، بے مثال مروت نے

راقم کے دل و دماغ پر ایسا اثر ڈالا جواب تک قائم ہے۔ حضرت مولانا موصوف کا زیر لب تبسم راقم کو برابر یاد آتا ہے۔ مولانا موصوف میں کوئی ایسی شان نظر نہ آئی جو عام طور سے سجادہ نشینوں میں پائی جاتی ہے۔ جب بھی راقم خلوت میں حاضر ہوتا تو حضرت مولانا میرے استقبال کے لیے کھڑے ہو جاتے اور راقم کو اپنے پاس بٹھا کر دینی باتیں کیا کرتے تھے۔ جب بھی راقم جناب حضور کے سامنے اپنی طویل العمری کی شکایت کرتا تو وہ مجھے ایسی باتوں کے کہنے سے منع فرماتے۔ فروری ۱۹۸۴ء میں راقم نے ان کی خدمت میں ایک خط روانہ کیا جس میں اپنی طویل العمری کی شکایت کی۔ مولٰنا موصوف نے فوراً اپنا جواب تحریر فرمایا جس میں یہ لکھا کہ "خدا کا شکر ہے کہ آپ کی عمر میں اضافہ ہو رہا ہے تاکہ آپ کی عبادات اور حسنات میں اضافہ ہو۔" اور اسی خط میں یہ بھی تحریر فرمایا کہ "اللہ تعالیٰ ہمارا اور آپ کا خاتمہ بخیر کرے۔" اس خط کو میں نے اپنے پاس بطور یادگار اب تک محفوظ رکھا ہے۔ جب جناب حضور کی ایک صاحبزادی کی شادی برادر عزیز پروفیسر سید محمد احمد کے صاحبزادے ڈاکٹر وسیم احمد سلمہٗ سے ہوئی تو راقم سے مزید محبت اور شفقت کا اظہار کرنے لگے۔ جب بھی مجھے موقع ملتا جناب حضور کی خدمت میں حاضر ہوا کرتا تھا اور مولانا موصوف نے اس محبت کے رشتہ کو آخر دم تک قائم رکھا۔ جسمانی لحاظ سے مولانا موصوف برابر کمزور رہے لیکن بڑی ہمت اور حوصلہ کے مالک تھے۔

راقم کے چھوٹے لڑکے ڈاکٹر اشرف حسین سلمہٗ ۱۹۷۴ء میں حج کے لیے گئے تو مکہ معظمہ میں حضرت مولانا موصوف سے پہلی بار ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔ عزیز موصوف مولانا کی پرکشش شخصیت معصوم صورت اور ان کی سادگی سے اس قدر متاثر ہوئے کہ اسی روز مولانا کے دست حق پرست پر بیعت ہوئے اور مولانا کے عزیز مریدوں میں رہے۔ مختلف موقعوں پر ان کی ہدایت سے بھی مستفیض ہوتے رہے۔

مولٰنا سیّد شاہ رضوان اللہ قادری :

جناب حضور کے بڑے صاحبزادے مولانا سید شاہ رضوان اللہ قادری آپ کی وفات کے بعد ۲۰ مئی ۱۹۸۵ء کو خانقاہ مجیبیہ پھلواری شریف کے نئے سجادہ نشین منتخب ہوئے۔ ۱۹۸۶ء میں راقم کو ایک مرتبہ مولانا موصوف کی خدمت میں حاضری کا موقعہ ملا ہے اور یہ دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی کہ مولانا علمی اور عملی مسائل کے سلجھانے میں سرگرم ہیں۔ اللہ سے دعا ہے کہ ان کے ذریعہ علم و عرفان کی شعاعیں دور دور تک پھیلیں اور آپ کے زمانے میں خانقاہ مجیبیہ مرجع خلائق بنے۔

سید شاہ عبد الرزاق قادری مرحوم اور سید شاہ لطف احمد قادری :

راقم یہ محسوس کرتا ہے کہ خانقاہ مجیبیہ کا بیان اس وقت تک مکمل نہ ہوگا جب تک سید شاہ عبد الرزاق قادری مرحوم اور ان کے بڑے صاحبزادے سید شاہ لطف احمد قادری کی خدمات کا تذکرہ نہ کیا جائے ۔ جناب سید عبد الرزاق قادری مرحوم حضرت مولانا سید شاہ بدر الدین رح اور حضرت مولانا سید شاہ محی الدین رح کے زمانے میں پیش خدمت کے فرائض انجام دیا کرتے تھے اور تمام عرس کے موقعوں پر انتظام کار رہتے اور ان تقریبوں کو اپنی صلاحیت اور محنت سے بارونق اور کامیاب بناتے تھے ۔ عبد الرزاق صاحب والد مرحوم کے دوستوں میں تھے اور ہم لوگ ان کی بڑی قدر کیا کرتے تھے ۔ حضرت سید شاہ لطف احمد قادری ان دنوں وہ سب فرائض بحسن و خوبی انجام دے رہے ہیں جن پر ان کے والد مامور تھے ۔ راقم ان کا احترام مثل بڑے بھائی کے کرتا ہے ۔ اللہ ان کی عمر دراز کرے ۔

احوال مولانا سید شاہ نظام الدین رح :

حضرت مولانا سید شاہ نظام الدین رح کی ولادت ۲۲ صفر المظفر ۱۳۱۴ھ میں ہوئی ۔ ابتدائی تعلیم والد بزرگوار حضرت سید شاہ بدر الدین رح اور اپنے بڑے بھائی حضرت مولانا سید شاہ محی الدین قدس سرہ سے پائی ۔ اس کے بعد مدرسہ مجیبیہ پھلواری شریف میں مولانا سید عبد العزیز انجھری سے تعلیم حاصل کی ۔ بعد ازاں مولانا سید عبد الحمید اور مولانا مقبول احمد علیہ رحمۃ کے درس میں رہ کر ۱۳۴۱ھ میں تکمیل کی اور سند فراغ پائی ۔ اس موقع پر مولانا شاہ محمد سلیمان پھلواروی رح نے ایک قطعہ ارشاد فرمایا جس کا مصرعہ تاریخ یہ ہے :

"دلم گفت واللہ فارغ شدند" (۱۳۴۱ھ)

۱۳۴۱ھ میں تعلیم سے فارغ ہو کر درس و تدریس کا سلسلہ مدرسہ مجیبیہ پھلواری شریف میں شروع کیا اور بہت جلد ایسی شہرت حاصل کی کہ صوبہ بہار کے علاوہ دیگر صوبوں سے بھی ہونہار طلبا آپ کے درس میں نہایت ہی ذوق و شوق سے شریک ہونے لگے ۔ جوانی سے آخر عمر تک آپ کا

درس مسلسل جاری رہا۔ درس وتدریس کے علاوہ آپ کے قلم سے فقہی و علمی موضوعات پر تحقیقی رسالے اور مضامین شائع ہوتے رہے۔ ان میں دو مضامین ایک "مسئلۃ المصافحہ" اور دوسرا "عصمت انبیاء" بڑے اہمیت کے حامل ہیں۔ مولانا موصوف کے بہت سے قابل قدر مضامین رسالہ "المجیب" میں شائع ہوتے رہے۔ ہندوستان کے مشہور علماء سے آپ کے بہت اچھے تعلقات تھے اور جب یہ لوگ پٹنہ تشریف لاتے تو مولانا موصوف کی خدمت میں ضرور حاضر ہوکر شرف ملاقات حاصل کرتے تھے۔ مولانا موصوف بھی علماء کا بہت احترام کرتے اور ان سے ملاقات کرنے میں سبقت فرماتے تھے۔ تواضع، انکسار، خدا ترسی اور احساس ذمہ داری مولانا موصوف میں بدرجہ اتم موجود تھیں۔ شہرت و نمود سے ہمیشہ دور رہے۔ باوجود ضعف وپیری آخر عمر تک تفسیر بیضاوی و مسلم شریف کا درس دیتے رہے۔ نہایت ہی پیچیدہ اور مشکل ترین سوالات کے جواب بڑی آسانی سے دیا کرتے تھے۔ نوافل کی کثرت، درود شریف کا ورد اور کلام اللہ کی تلاوت کے بڑے پابند تھے۔ مولانا موصوف کی بے نفسی، خاموشی اور بے ریائی سے ہر شخص متاثر ہوتا تھا۔ وفات سے تقریباً ایک سال پہلے حضرت مولانا پر جسم کے داہنے جانب فالج آیا اور چلنے پھرنے سے مجبور ہو گئے۔ بیماری کی حالت میں بھی لوگوں کے سہارے مسجد تشریف لے جاتے اور نماز باجماعت ادا کرتے تھے۔ اپنے قدیم دستور کے مطابق روزانہ تکیہ کے سہارے بیٹھ کر کلام اللہ مجید کی تلاوت فرماتے تھے۔ باوجود اس سخت بیماری کے روزانہ کی عبادت وریاضت میں کوئی فرق آنے نہ دیا۔ ۸۸ سال کی عمر میں ۶۔ جمادی الاخری ۱۴۰۲ھ کی شب کو انتقال فرمایا اور اسی روز بعد نماز ظہر باغ مجیبیہ میں مدفون ہوئے۔ مولانا ایک جید عالم اور نامور استاد ہونے کے علاوہ ایک نہایت ہی کامل صوفی تھے اور اکثر لوگ انھیں "نظام الدین ثانی" کے لقب سے یاد کرتے تھے۔ ایسے لوگ دنیا سے مفقود ہوتے جاتے ہیں۔

حضرت مولٰنا سے راقم کی ملاقات:

راقم کی ملاقات حضرت مولانا سے تقریباً چالیس سال پہلے ہوئی اور اسی روز سے میں مولٰنا کا نہایت ہی قدرداں ہو گیا۔ میرے چھوٹے بھائی مرحوم انور حسین ان کے بڑے شیدائیوں میں تھے، اور ان کے کشف وکرامات کے بھی قائل تھے۔ حضرت مولانا بھائی مرحوم کے ساتھ نہایت شفقت اور محبت سے پیش آتے تھے اور بہت بہت دیر تک مرحوم سے دینی مسائل پر باتیں کیا کرتے تھے۔

میرے چھوٹے بھائی مرحوم کو پیشاب کی بیماری عرصہ سے تھی اور ڈاکٹروں نے مشورہ دیا کہ بنگلور جا کر آپریشن کرائیں۔ بنگلور میں ڈاکٹر بھٹ نے ان کے پروسٹریٹ کا آپریشن کیا جو نہایت کامیاب ہوا۔ دوران قیام بنگلور مجھے بھائی مرحوم کے متعلق بہت تشویش رہا کرتی تھی، اس لیے میں پریشانی کے عالم میں ایک روز صبح سویرے پھلواری شریف جا کر حضرت مولانا سے کل حالات بیان کیا۔ مولانا موصوف نے مراقبہ کے بعد مجھے تسلی دی کہ میرا بھائی صحت یاب ہو کر پٹنہ واپس آجائے گا اور یہ بھی فرمایا کہ روزانہ کئی بار سورۂ "بروج" کی تلاوت کر کے اللہ سے بھائی کی صحت یابی کے لیے دعا کی جائے۔ راقم نے پندرہ دنوں تک ایسا کیا اور حضرت مولانا کی دعائیں مستجاب ہوئیں۔ میرا بھائی مرحوم بالکل صحت مند ہو کر پٹنہ واپس آیا اور حضرت مولانا کی خدمت میں حاضر ہو کر ان کا شکریہ ادا کیا۔ عزیز محترم سید شمس الرحمن ایڈوکیٹ پٹنہ ہائی کورٹ جو حضرت مولانا کے خاص مریدوں میں ہیں اکثر راقم سے مولانا کے کشف و کرامات کا ذکر کرتے رہتے ہیں۔

بیوی مرحومہ کے انتقال کے بعد مجھے بہت تنہائی محسوس ہونے لگی اور ہر وقت مرحومہ کی یاد آتی رہتی تھی۔ اس زمانہ میں راقم اکثر و بیشتر حضرت مولانا کی خدمت میں حاضر ہوا کرتا تھا۔ ایک روز ارشاد ہوا کہ رضا اور تسلیم کا یہ تقاضا ہے کہ بندہ ہر حال میں اللہ کے حکم کے آگے سرنگوں رہے۔ اسی روز سے اللہ نے میرے قلب کو صبر و قرار بخشا۔ جاڑوں کے موسم میں حضرت مولانا اپنی خلوت کے آنگن میں ایک چبوترے پر بیٹھ کر تقریباً نو دس بجے دن تک تلاوت کلام اللہ مجید کیا کرتے تھے۔ اس وقت بھی راقم کو ان کی خدمت میں حاضر ہونے کی عام اجازت تھی۔ جب میں ان کے پاس جا کر بیٹھتا تو حضرت مولانا کلام اللہ کی تلاوت اس طور سے کرتے کہ راقم نہایت آسانی سے ان کی تلاوت سن سکتا تھا۔ اس وقت کی خوش الحانی راقم کو ابھی تک بار بار یاد آتی رہتی ہے۔ بیماری کے زمانہ میں جب میں ان کی مزاج پرسی کو جاتا تو خلوت سے برآمدہ میں باہر نکل کر تکیہ کے سہارے بیٹھ جاتے اور مجھ سے باتیں کرتے۔ کبھی بھی اپنی تکلیف کو ظاہر ہونے نہ دیا۔ حسب دستور اپنے پوتے ہلال میاں کو بلاتے اور میرے لیے چائے منگواتے۔ ایسا ملنسار انسان میں نے بہت کم دیکھا ہے۔ جب بھی پھلواری شریف جاتا ہوں تو ان کے مرقد مبارک پر حاضر ہو کر فاتحہ پڑھتا ہوں اور آنکھوں سے آنسو بہانے کی سعادت حاصل کرتا ہوں:

انکساری سے سدا اس نے اطاعت کی ہے
کوئی واقف نہ ہوا ایسی عبادت کی ہے

پروفیسر عبدالمنان کی عقیدت مندی :

استاذ مرحوم پروفیسر عبدالمنان بیدل کو حضرت مولانا سے بڑی عقیدت تھی اور اکثر ان کی خدمت میں حاضر ہوا کرتے تھے۔ کئی بار راقم کے ہمراہ پھلواری شریف جاکر مولانا موصوف سے ملنے کی سعادت حاصل کی۔ غالباً اسی روحانی تعلق کے سبب استاذ محترم اپنی وفات کے بعد باغ مجیبی میں مدفون ہوئے۔

اکبر حسین کی لڑکی کی بسم اللہ :

حضرت مولانا میرے مجھلے لڑکے اکبر حسین سلمہٗ کے ساتھ نہایت شفقت اور محبت سے پیش آتے تھے اور ان کے عقد نکاح کے موقع پر لڑکی والوں کی طرف سے قاضی ہوکر آئے تھے۔ اکبر سلمہٗ کی دلی تمنا تھی کہ ان کی لڑکی کی رسم بسم اللہ حضرت مولانا کے ذریعہ ادا ہو۔ حضرت مولانا نے پھلواری شریف میں اپنی دعاؤں کے ساتھ لڑکی کی بسم اللہ کرائی اور خیر و برکت کے لیے ایک پانچ روپیہ کا نوٹ لڑکی کو عطا کیا جو اب تک بطور یادگار محفوظ ہے۔

حضرت مولانا الحاج سید شاہ عون احمد قادری :

حضرت مولانا سید شاہ عون احمد قادری کی پیدائش ۱۳۴۰ھ مطابق ۲۲-۱۹۲۱ء میں ہوئی۔ حضرت نے ابتدائی تعلیم اپنے والد ماجد حضرت مولانا شاہ نظام الدین قادری رحمۃ اللہ علیہ اور اپنے گھر کے دوسرے بزرگوں سے حاصل کی۔ اس کے بعد مولانا شریف صاحب اعظم گڈھی و مولانا محمد عتیق صاحب فرنگی محل کے حلقۂ درس میں شامل ہوکر علمی و روحانی فیوض سے مستفیض ہوئے۔ ۲۰-۲۲ سال کی عمر میں جملہ علوم اور دورۂ احادیث وغیرہ سے اجمیر شریف کے مشہور دارالعلوم سے فراغت حاصل کی۔ تمام مروجہ علوم پر کامل عبور حاصل کرنے کے بعد پھلواری شریف تشریف لائے اور خانقاہ مجیبیہ کے مدرسہ میں جو اس خانوادے کا قدیم مدرسہ ہے تقریباً ۲۵ سال سے تدریس کی خدمت بحسن و خوبی انجام دے رہے ہیں۔ علمی تحقیق سے مولانا موصوف کو شغف رہا ہے جس کا اندازہ ان کی تصنیف "نبی الملۃ والدین" سے کیا جاسکتا ہے۔ سیرت نگاری کوئی آسان کام نہیں ہے لیکن مولانا نے اپنی پوری فہم اور معلومات خاندانی سے کام لے کر اس کتاب کو ممتاز و مقبول بنا دیا ہے۔ مولانا موصوف نے ایک رسالہ اردو زبان میں تحریر فرمایا ہے۔ جس میں شہداء، صالحین اور صدیقین کے زندہ جاوید ہونے کے متعلق دلائل پیش کیے گئے ہیں۔ گرچہ راقم کو مولانا کی بہت سی باتوں سے اتفاق نہیں ہے پھر بھی میرے خیال

میں یہ ایک دل چسپ کتاب ہے۔ مولانا موصوف کے اکثر مضامین اردو رسالوں میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ مولانا اب تک متعدد بار حج و زیارت روضۂ اقدس سے مشرف ہو چکے ہیں اور بغداد شریف اور دیگر مقامات مقدسہ کا بھی سفر کیا ہے۔ مولانا موصوف جمعیۃ علماء ہند بہار کے صدر کی حیثیت سے نمایاں خدمات انجام دیتے رہتے ہیں۔ مولانا کی دوستی، شرافت اور دل نوازی ہر شخص کو متاثر کرتی ہے اور ان کا گرویدہ بنا دیتی ہے۔

مولانا سے راقم کے تعلقات :

تقریباً تیس سال پہلے راقم کی ملاقات مولانا موصوف سے ہوئی جب حکومت بہار نے مولانا کو بہار مدرسہ اکزامی نیشن بورڈ کا ممبر نامزد کیا۔ میں اس زمانے میں بہار مدرسہ اکزامی نیشن بورڈ کا صدر تھا اور مولانا کی نامزدگی سے مجھے بڑی خوشی ہوئی کیونکہ وہ ایک جید عالم ہونے کے علاوہ ایک ایسے خانوادے سے تعلق رکھتے تھے جس کا احترام بہار کا ہر مسلمان کیا کرتا ہے۔ مولانا بورڈ کے کل کاموں میں نہایت دل چسپی سے حصہ لیا کرتے اور مشکل مسائل کے حل کرنے میں ہم لوگوں کی بڑی مدد کیا کرتے تھے۔ ان کی ہر رائے راست بازی اور دیانت داری پر مبنی ہوا کرتی تھی۔ اس وجہ سے کسی کو شکایت کا موقع نہ ملتا تھا۔ ہم لوگوں کے دوستانہ تعلقات رفتہ رفتہ بڑھتے گئے اور جب بھی مجھے پھلواری شریف جانے کا موقع ملتا ہے تو سب سے پہلے مولانا موصوف کے پاس جاتا ہوں، دینی اور دُنیاوی موضوعات پر باتیں ہوتی ہیں۔ جب کبھی میں نے ان سے تبادلۂ خیال کیا تو معلوم ہوا کہ مولانا ایک ذی علم اور قابل قدر شخص ہیں۔ اس زمانہ میں خانقاہ مجیبیہ پھلواری شریف میں ان سے بڑھ کر کوئی دوسرا عالم اور مفکر موجود نہیں ہے۔ اللہ ان کی عمر دراز کرے۔ جب مولانا ۱۹۷۳ء میں حج کو گئے تو راقم برابر ان کا ہم سفر رہا۔ ہم لوگوں کا سفر بمبئی سے جدہ تک بحری جہاز "اکبر" سے ہوا اور دوران سفر مولانا کی باتوں سے میری دینی معلومات میں بہت کچھ اضافہ ہوا۔ ایک روز میں نے مولانا سے استدعا کی کہ جہاز کی سب سے بلند منزل پر جاکر ہم چند لوگ ان کی امامت میں مغرب کی نماز ادا کریں۔ مولانا نے اس بات پر اپنی رضامندی ظاہر کی۔ جب ہم لوگ مغرب کی نماز ادا کرنے کے لیے جائے مقررہ پر حاضر ہوئے تو اتر پردیش کے ایک خانقاہی پیر صاحب امامت کے لیے آگے بڑھ گئے اور ہم لوگوں کو مولانا موصوف کی امامت سے محروم رکھا۔ دسمبر ۱۹۷۳ء میں راقم جب دوسری بار حج کے لیے گیا تھا تو میں نے مکہ مکرمہ میں ایک ماہ سے زیادہ قیام کیا۔ مولانا موصوف سے مغرب کی نماز کے وقت

ہر روز مسجد حرام میں ملاقات ہو جاتی تھی۔ مولانا موصوف مسجد حرام میں حطیم کے سامنے والے حصہ میں اپنی نمازیں ادا کیا کرتے تھے۔ یہاں مختلف ممالک کے علماء اور مشائخ جمع ہوتے اور اپنی نمازیں ادا کیا کرتے تھے۔ اگر مولنا موصوف سے میری ملاقات اس جگہ نہ ہوتی تو عبدالمجید خاں صاحب کو میری تلاش میں بھیج کر مجھے اپنے پاس بلاتے اور میں ان کے ساتھ اپنی نماز مغرب ادا کیا کرتا تھا۔ عبدالمجید خاں صاحب پھلواری شریف کے مریدوں میں ہیں اور مولینا موصوف سے ان کی قربت ہے۔ راقم کو اس جگہ نماز ادا کرنے میں تامل محسوس ہوتا کیونکہ میرا تعلق نہ طبقہ علماء سے تھا اور نہ طبقہ مشائخ سے بعد نماز مغرب مولانا موصوف مجھے ہندوستان کے ان سجادہ نشینوں سے ملاقات کراتے تھے جو حج کے لیے آئے ہوئے تھے۔ میں ان حضرات سے دین کی باتیں سنتا جو میرے لیے بہت سودمند ہوا کرتی تھیں۔ ایک روز جب راقم نماز مغرب ادا کر کے وہاں سے واپس آرہا تھا تو اتفاقاً ایک فارسی داں ترکی عالم سے ملاقات ہو گئی اور انھوں نے امام ابوحنیفہؒ کے متعلق بہت سی باتیں بتائیں جو مجھے بہت پسند آئیں اور ان سے میری معلومات میں بہت کچھ اضافہ ہوا۔ مولانا موصوف کی کرم فرمائی کی بدولت میری ملاقات اچھے اچھے عالموں سے ہوئی جس کے لیے میں ان کا مشکور ہوں۔ ۱۹۷۰ء میں میرے چھوٹے لڑکے ڈاکٹر اشرف حسین سلمہ کے عقد نکاح کے موقع پر لڑکی والوں کی طرف سے مولانا موصوف قاضی بن کر آئے اور بعد نکاح مجھے مبارکباد دیتے ہوئے دولھا اور دُلھن کے لیے اللہ سے دعائیں کیں۔ اللہ نے ان کی دعاؤں کو قبول فرمایا اور یہ شادی ہر لحاظ سے نہایت ہی مبارک اور کامیاب رہی ۱۹۷۳ء میں ازراہ کرم مولنا موصوف میری اہلیہ مرحومہ کے چہارم کے فاتحہ کے روز میری رہائش گاہ پر آئے اور دیر تک قیام کیا۔ جب سب لوگ قرآن خوانی اور فاتحہ کے بعد واپس چلے گئے تو میں مولنا موصوف کو زحمت دے کر اپنے کمرے میں لے گیا جہاں انھوں نے کلام اللہ کی تلاوت کر کے اہلیہ مرحومہ کے لیے دعاء خیر کی جس میں صرف راقم اور میرے تینوں لڑکوں نے شرکت کی۔ میں مولانا موصوف کی بڑی قدر کرتا ہوں اور میری دعاء ہے کہ اللہ انھیں صحت و تندرستی کے ساتھ عرصہ دراز تک دین و ملت کی خدمت کے لیے قائم رکھے۔

مولانا شاہ عزالدین ندوی :

مولانا عزالدین کا آبائی وطن پھلواری شریف تھا جہاں وہ ۱۹۱۴ء میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام شاہ معین الدین قادری تھا۔ آپ مولانا شاہ سلیمان کے نواسہ اور مولانا شاہ محی الدین

کے داماد تھے۔ موصوف اپنی ابتدائی تعلیم کے حصول کے لیے ندوۃ العلماء لکھنؤ گئے، جہاں سے انھوں نے فاضل کی ڈگری حاصل کی اور فرسٹ کلاس فرسٹ آئے۔ موصوف ندوہ کے ممتاز فارغین میں شمار کیے جاتے تھے۔ تعلیمی فراغت کے بعد وہ چند ماہ تک موتیہاری کے مدرسہ میں صدر مدرس کے عہدے پر فائز رہے۔ علامہ سید سلیمان ندوی نے انھیں دار العلوم ندوۃ العلماء میں ادب اور تفسیر کے استاذ کی حیثیت سے مقرر کیا مگر ندوہ میں ان کے قیام کی مدت صرف ایک سال رہی۔ مدرسہ اسلامیہ رانچی میں بھی کچھ عرصہ تک پرنسپل رہے۔ شاعر مشرق ڈاکٹر سر محمد اقبال کی دعوت پر لاہور گئے۔ ان دنوں ڈاکٹر سر محمد اقبال حمایت اسلام لاہور کے صدر تھے۔ انھوں نے شاہی مسجد لاہور کے امام اور خطیب کے لیے مولانا عز الدین کو مدعو کیا۔ موصوف چار سال تک شاہی مسجد کے امام اور خطیب رہے اور ان کے جمعہ کے خطبہ کی بڑی شہرت تھی۔ ڈاکٹر سر محمد اقبال ہر جمعہ کی نماز شاہی مسجد میں ادا کرتے اور بڑے ذوق و شوق کے ساتھ صاحب موصوف کا خطبہ سنا کرتے تھے۔ ۱۹۳۸ء میں ڈاکٹر سر محمد اقبال کے انتقال کے بعد مولانا اپنے وطن لوٹ آئے۔ ۱۹۵۶ء میں راقم کے سخت اصرار پر مدرسہ شمس الہدیٰ پٹنہ میں حدیث کے استاذ ہوئے اور اس کے بعد ۱۹۶۷ء میں پٹنہ کے ادارہ تحقیقات عربی و فارسی میں شعبہ عربی کے صدر مقرر کیے گئے۔ ۱۹۷۲ء میں پنشن پائی۔ ۱۱ مئی ۱۹۷۷ء کو پورنیہ میں صاحب موصوف کا انتقال ہوا اور ان کی لاش پھلواری شریف لائی گئی۔ آپ کی نماز جنازہ مولانا سید شاہ امان اللہ قادری نے پڑھائی اور باغ مجیبی میں دفن کیے گئے۔ ان کی تصانیف میں کتاب "علوم الحدیث" بڑی شہرت کی حامل ہے اور اس کے دو ایڈیشن نکل چکے ہیں۔ اس کتاب کے علاوہ "کشف الظلام" "حیات احمد بن حنبل" اور "سیرت اسلام" بھی تصنیف کی ہیں۔ ان کے علاوہ صاحب موصوف کے بہت سے مضامین جو عربی زبان میں لکھے گئے تھے، ملک اور بیرون ملک کے متعدد پرچوں اور اخباروں میں شائع ہوتے رہے۔ صدر جمہوریہ ہند نے مولانا موصوف کو ۲۔ اپریل ۱۹۷۷ء کو عربی کی مسلمہ قابلیت اور شغف کے لیے سند عطا فرمائی۔ صاحب موصوف بد قسمتی سے سند پانے کے صرف ایک ماہ بعد انتقال کر گئے، جس کا راقم کو بہت افسوس ہے۔ مولانا موصوف کے ساتھ راقم کو بھی صدر جمہوریہ ہند نے سند عطا فرمائی تھی۔

مولانا سے راقم کے تعلقات:

مولانا موصوف سے راقم کے خاندانی تعلقات تھے۔ آپ کے نانا مولانا قاری سید شاہ

محمد سلیمان پھلواروی میرے نانا مرحوم کے عزیز دوستوں میں تھے۔ اکثر نانا مرحوم انھیں اپنی رہایش گاہ پر مدعو کرتے اور مسجد سیف خاں میں ان سے وعظ کہلواتے اور سیرت النبی کے جلسوں میں ان سے تقریر کراتے تھے۔ مولانا عزالدین سے میری دوستی ۳۰-۳۵ سال تک قائم رہی اور ہم لوگ ایک دوسرے سے نہایت خلوص سے ملتے رہے۔ جب مولانا موصوف مدرسہ شمس الہدیٰ میں مدرس مقرر ہوئے تو ہفتہ میں دو چار بار راقم کی رہایش گاہ پر آتے تھے اور ہم لوگوں کے درمیان طرح طرح کی باتیں ہوا کرتی تھیں۔ مولانا کو پان کھانے کا بڑا شوق تھا اور اسی کے ساتھ بہت زیادہ مقدار میں تمباکو کھاتے تھے۔ میں نے مولانا کو بہت بار تمباکو خوردنی کی عادت کو ترک کرنے کو کہا مگر وہ آخر دم تک اپنی اس پرانی عادت پر قائم رہے۔ گرچہ موصوف ایک جید عالم تھے مگر کبھی بھی اپنے علم پر غرور نہ کیا۔ صاحب موصوف نہایت ہی منکسر مزاج اور ملنسار انسان تھے۔ میری والدہ مرحومہ ان کی بڑی عزت کرتی تھیں۔ جب مولانا موصوف راقم سے ملنے آتے تو والدہ مرحومہ انھیں نذرانہ پیش کرتی تھیں۔ والدہ مرحومہ کے انتقال کے بعد مولانا نے ان کے چہارم کا فاتحہ پڑھا اور دعائے خیر کی۔ مولانا موصوف کو والدہ کے انتقال پر بڑا صدمہ ہوا کیونکہ والدہ نے انھیں لڑکپن سے دیکھا تھا اور پیرزادہ صاحب کے لقب سے یاد فرمایا کرتی تھیں۔ ہر سال خدا بخش لائبریری میں خان بہادر خدا بخش خاں کی برسی منائی جاتی ہے اور اس موقع پر سیرت النبی ؐ کا جلسہ منعقد کیا جاتا ہے۔ بحیثیت ڈائرکٹر راقم نے کرزن ریڈنگ روم میں سیرت النبی ؐ کا ایک جلسہ منعقد کیا اور مولانا عزالدین کو مدعو کر کے رسول اکرم ؐ کے اوصاف حمیدہ پر تقریر کرائی جو نہایت ہی عالمانہ تھی اور حاضرین جلسہ نے اسے بہت پسند کیا۔

۱۹۷۶ء میں صدر جمہوریہ ہند نے مولانا کو عربی کی مسلمہ قابلیت پر سند عطا کی۔ راقم کو بھی اس سال فارسی کے لیے سند عطا ہوئی تھی۔ راقم اور مولانا اپنی اپنی سند لینے کے لیے ۲۱ مارچ ۱۹۷۷ء کو ایک ساتھ پٹنہ سے دہلی گئے اور ہم لوگوں کا سفر نہایت ہی ہنسی خوشی سے گذرا۔ مولانا کے استقبال کے لیے نئی دہلی کے ریلوے اسٹیشن پر صبح سویرے حضرت خواجہ حسن ثانی نظامی موجود تھے اور انھیں اپنی جیپ میں بٹھا کر اس ہوٹل میں لے گئے جہاں حکومت ہند نے مولانا کے تین روز کے قیام کا انتظام کیا تھا۔ تین روز بعد مولانا موصوف ہوٹل سے جا کر کئی روز حضرت خواجہ حسن ثانی نظامی کے ساتھ ٹھہرے۔ واپسی میں ہم دونوں پٹنہ ساتھ آئے۔ مولانا سے راقم کی یہ آخری

ملاقات تھی۔ پورنیہ کے لوگ مولانا کے بے حد معتقد تھے اور ان لوگوں کے اصرار پر صاحب موصوف پورنیہ تشریف لے گئے ہیں۔ ایک دن اچانک سینہ میں تکلیف شروع ہوئی اور عزیزوں سے دور پورنیہ میں انتقال فرمایا۔ نہایت خوب آدمی تھے۔ اللہ انھیں غریق رحمت کرے۔

بیسواں باب

ڈاکٹر ذاکر حسین سے میری چند ملاقاتیں

پہلی ملاقات :

میری ملاقات مرحوم ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب سے پہلی بار غالباً ۱۹۳۱ء میں دہلی میں ہوئی۔ میں ان کے پاس ایک تعارفی خط امام المشائخ حضرت خواجہ حسن نظامی ؒ کا لے کر گیا تھا۔ امام المشائخ ؒ کا خط دیکھ کر وہ بہت خوش ہوئے اور دیر تک ان کی خوبیوں کا تذکرہ کرتے رہے۔ اس زمانہ میں میں سام مرزا صفوی" کا تذکرہ "تحفۂ سامی" پر کام کر رہا تھا اور میں نے اس کام میں ڈاکٹر صاحب کا مشورہ لینا مناسب سمجھا تھا۔ اس کتاب کو پٹنہ یونیورسٹی شائع کرانے والی تھی اور میں اس کو نہایت خوبی کے ساتھ ایڈٹ کرنا چاہتا تھا۔ ڈاکٹر صاحب پروفیسر براؤن (Prof. Browne) کی "تاریخ ادبیات ایران" میں اس کتاب کے متعلق پڑھ چکے تھے۔ پروفیسر براؤن نے "تحفۂ سامی" کو ایک گراں بہا کتاب قرار دیا تھا۔ از راہ کرم ڈاکٹر صاحب نے مجھے مشورہ دیا کہ کتاب کو اس طرح ایڈٹ کیا جائے کہ متن میں کوئی غلطی اور خامی نہ رہ جائے اور حواشی کے نوٹ کو زیادہ طول نہ دیا جائے۔ میں نے ڈاکٹر صاحب کے اس مشورہ پر پورا عمل کیا۔ جب یہ کتاب ۱۹۳۴ء میں پٹنہ یونیورسٹی کے توسل سے شائع ہوئی تو ایران اور یورپ میں یہ ایڈیشن نہایت مقبول ہوا۔ میں نے ایک نسخہ کتاب کا ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں ڈاک سے روانہ کر دیا اور تین مہینوں بعد جب میں دلی جا کر ان سے ملا تو وہ کتاب "تحفۂ سامی" کو پڑھ چکے تھے۔ میری ہمت افزائی کی اور ان خطوط کو دیکھا جو میرے پاس کتاب کے بارے میں ایران اور یورپ سے آئے تھے خصوصاً مرزا محمد قزوینی اور آقائی محمد علی تربیت کے خطوں کو نہایت شوق سے پڑھا۔ مجھے اعتراف ہے کہ یہ سب کچھ ڈاکٹر صاحب کے اچھے مشوروں کی بدولت ہوا۔

ڈاکٹر صاحب ایک خوش مزاج انسان تھے اور ہر بات میں ان کی متین ظرافت کا اظہار ہوتا

تھا۔ کتاب کھول کر آگہی خراسانی کا احوال پڑھنا شروع کیا۔ سام مرزا نے اس شاعر کے بارے میں لکھا ہے کہ خباثت اس کے مزاج پر غالب تھی اور مختلف قسم کے "شہر آشوب" لکھا کرتا تھا۔

ڈاکٹر صاحب اس شاعر کے متعلق کہنے لگے کہ خوب آدمی تھے اور ایک بات تو ایسی کہی ہے جس کو میں نے پہلے کبھی نہیں سنا تھا۔ چیل کے بارے میں کہتے ہیں کہ چھ مہینے نر اور چھ مہینے مادہ رہتی ہے۔ آگہی خراسانی نے مولانا محمد طبسی کی (جو کہ عام طور سے احمد آتون کہے جاتے تھے) خوب ہنسی مندرجہ ذیل شعر میں اڑائی ہے ؎

احمد آتون گہی شیعی گہی سنی بود

چون غلیواجی کہ شش مادہ و شش نر زیست

پھر فرمایا کہ احمد آتون بڑے وقت شناس انسان تھے۔ کبھی اپنے کو شیعہ کہتے اور کبھی سنی یہ کہہ کر ڈاکٹر صاحب خوب ہنسے اور کہا کہ آپ کے پٹنہ میں ایسے لوگ موجود ہیں جو اپنے کو کبھی شیعہ اور کبھی سنی ضرورت کے مطابق کہتے ہیں یہ اشارہ میرے ملنے والوں میں ایک صاحب کی طرف تھا جو اپنے کو کبھی سنی اور کبھی شیعہ کہتے تھے۔ سام مرزا کے بارے میں کہا کہ جب وہ قید میں تھا تو اس نے وصیت کی تھی کہ جب وہ مرجائے تو دفن کرنے کے بعد اس کے لوحِ قبر پر یہ رباعی کندہ کردی جائے:

سامی زغم زمانہ بیغم می باش

با محنت درد عشق ہمدم می باش

چون موجب شادی حقیقی مرگ است

گر مرگ رسد تو شاد و خرم می باش

میں نے بعد تحقیق اس رباعی کو "تحفۂ سامی" کے دوسرے ایڈیشن کے دیباچہ میں درج کردیا ہے۔

دوسری ملاقات:

۱۹۳۷ء میں میری کتاب "The Early Persian poets of India" کو پٹنہ یونیورسٹی نے شائع کیا۔ میں نے پہلی کاپی ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں بذریعہ ڈاک روانہ کیا۔ جب کتاب دہلی پہنچی تو ڈاکٹر صاحب بیمار تھے اور شہر سے باہر گئے ہوئے تھے۔ وقت پر رسید نہ بھیجنے کی معذرت چاہی اور اپنے خط میں میری کتاب کی تعریف کرتے ہوئے مجھے تحقیقی کاموں کو جاری رکھنے کا مشورہ دیا۔ اس خط کو میں نے ۵۰ سال سے بطور یادگار اپنے پاس محفوظ رکھا ہے۔ ایک سال بعد

ڈاکٹر صاحب نے مجھ سے اس کتاب کی تین کاپیاں طلب کیں اور جب میں دہلی سرکاری کام سے گیا تو ان تین کاپیوں کو ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں پیش کیا وہ بہت خوش ہوئے اور کہنے لگے کہ میں محمود شیرانی سے اس بات پر اتفاق کرتا ہوں کہ کچھ عرصہ تک اس طرح کی کتاب نہیں لکھی جائے گی۔ ڈاکٹر صاحب مرحوم کا مقابلہ نئی کتابوں کے پڑھنے میں کوئی نہیں کر سکتا تھا۔ جب بھی کسی نئی کتاب کا تذکرہ کیجیے خواہ اردو کی ہو یا انگریزی کی یہ کتاب ڈاکٹر صاحب کی نظر سے گذر چکی ہوگی اور اس پر وہ اپنا عالمانہ تبصرہ فوراً دیتے تھے۔ کہنے لگے کہ میں شیرانی صاحب کا تبصرہ پڑھ چکا ہوں۔ لاؤ تمھارے سامنے کتاب کو پڑھوں۔ چونکہ میری کتاب Sir Denison Ross، ڈاکٹر عظیم الدین احمد اور ڈاکٹر ہادی حسن کے مشوروں سے مرتب کی گئی تھی کچھ دیر تک ان بزرگوں کا تذکرہ رہا۔ ڈاکٹر صاحب موصوف Sir Denison Ross سے خوب واقف تھے اور اکثر ان کی خدمات کی تعریف کیا کرتے تھے۔ میں نے ابوالفرج رونی کے بارے میں جو کچھ لکھا تھا اس کو بہت پسند کیا اور فیضی کے ایک قصیدہ کے چند اشعار پڑھے جس میں اس نے ابوالفرج رونی کا تتبع کیا تھا۔ رونی کی رباعیوں کو بھی بہت پسند کیا۔ عمیدالدین کے اشعار کو بھی شوق سے پڑھا خصوصاً اس نظم کو جس میں شراب اور بھانگ کے درمیان مناظرہ درج ہے۔ عمیدالدین کے اس قصیدے کو جس کی تشبیب یہ ہے :

دارم جفائی نو بہ نو زین چرخ ناخوش منظری
کوری کبودی کج روی عاقل کشی دون پروری

نہایت شوق سے شروع سے آخر تک پڑھا اور مندرجہ ذیل شعر کو کئی بار پڑھا :

برخیز بر عزم سفر زین جای ناخوش درگذر
کاندر تنور شیشہ گر قیمت ندارد جوہری

ڈاکٹر صاحب سے یہ ملاقات مجھے ہمیشہ یاد رہے گی۔ انھوں نے اپنے چند ضروری کاموں کو چھوڑ کر مجھے موقع دیا کہ میں ان سے کچھ استفادہ کر سکوں۔ میں بغیر اطلاع کیے ان سے ملنے گیا تھا اور انھوں نے نہایت خندہ پیشانی سے میرے ساتھ اپنا قیمتی وقت صرف کیا۔

تیسری ملاقات :

ڈاکٹر عبدالحفیظ فردوسی اپنے مرادپور کے بنگلے میں مقیم تھے۔ یہاں اب پٹنہ مارکٹ بن گیا ہے۔ ان کا لڑکا جامعہ ملیہ میں پڑھتا تھا۔ کسی کام سے ڈاکٹر ذاکر حسین غالباً ۱۹۴۳ء میں جب پٹنہ

تشریف لائے تو ڈاکٹر حفیظ نے ان کو اپنے یہاں چائے پر مدعو کیا اور مجھے بھی بلایا۔ میں مسٹر امتیاز محمد خاں (ایم۔اے علی گڑھ و لندن) کے ساتھ جو اس زمانہ میں داناپور کھگول ریلوے اسکول کے ہیڈ ماسٹر تھے اس دعوت میں شرکت کے لیے گیا۔ ہم لوگ کچھ پہلے پہنچے تو مسٹر امتیاز محمد خاں نے مجھ سے ڈاکٹر ذاکر حسین کے بنیادی تعلیم کی اسکیم پر اعتراض کرنا شروع کیا۔ میں نے ان کو روکا اور کہا کہ یہ موقع ان سب باتوں کا نہیں ہے۔ ڈاکٹر صاحب کا قیام پٹنہ میں تین دن اور رہے گا آپ ان سے مل کر اپنی بدگمانیوں کو دور کر لیں۔ اسی اثنا میں ڈاکٹر صاحب کمرے میں داخل ہوئے اور ہم مختلف موضوع پر، خصوصاً مسلمانوں کی تعلیم کے بارے میں ان سے باتیں کرتے رہے، چائے کی میز بڑی لمبی تھی اور ہر قسم کے کھانوں اور پھلوں سے لدی ہوئی تھی۔ جب چائے شروع کرنے میں دیر ہوئی تو ڈاکٹر صاحب نے اپنے مخصوص انداز میں کہا کہ یہ تو جنت کا نظارہ معلوم ہوتا ہے۔ کل اچھی اچھی چیزیں سامنے رکھی ہوئی ہوں گر کوئی ان چیزوں کی طرف توجہ نہیں کرنے والا ہے۔ میرے دوستوں میں سے ایک نے اپنے مل گروہ کے انداز میں کہا کہ حضرت جبرئیل کا انتظار ہے۔ وہ یہ کہہ ہی رہے تھے کہ مولانا سید سلیمان ندوی کمرے میں داخل ہوئے اور چند لوگوں نے جو مولانا سلیمان ندوی کے ہم سن تھے باآواز بلند کہا کہ حضرت جبرئیل آ گئے اب چائے شروع کی جائے۔ مولانا سید سلیمان ندوی سے لوگوں نے کہا کہ آج سے آپ کا خطاب جبرئیل ہو گیا۔ سلیمان ندوی صاحب نے بھی ہنسی میں شرکت کی اور تقریباً ایک گھنٹہ تک ڈاکٹر صاحب نے اپنی باتوں سے ہم لوگوں پر جادو کا اثر ڈالا اور ہم لوگ دم بخود ان کی باتوں کو سنتے رہے۔ کیونکہ گفتگو کا موضوع اسلامیات تھا۔ مولانا سلیمان ندوی۔ جب اسلامیات کی باتیں ہوں تو کب چپ رہنے والے تھے کبھی تو ڈاکٹر صاحب کا ساتھ دیتے تھے اور کبھی نہایت شدت سے اختلاف کرتے تھے۔ جی تو چاہتا تھا کہ ڈاکٹر صاحب کچھ دیر اور بیٹھیں۔ کیونکہ ان کی باتیں ہم لوگوں کے لیے نہایت سودمند اور دلچسپ تھیں۔ مگر مرادپور کی مسجد سے مغرب کی اذان ہوئی اور جلسہ ختم ہو گیا۔

چوتھی ملاقات :

راج بھون آج بھی اپنی ایک خاص نوعیت اور اہمیت رکھتا ہے۔ یہ ریاست کی ثقافتی اور نیم سیاسی زندگی کا مرکز ہوتا ہے۔ سرکار کا فرض ہے کہ اس کے واجب اخراجات کو فراخ دلی سے برداشت کرے۔ آج کل تو اکثر کہا جاتا ہے کہ گورنر کا عہدہ بیکار ہو چکا ہے اور یہ عہدہ اگر قائم ہی رکھا جائے تو راج پال جی کو کسی چھوٹے مکان میں منتقل کر دیا جائے۔ کوئی کہتا ہے کہ راج بھون

کی عمارت میں گوشالا کا صدر دفتر قائم کر لیا جائے یا اس میں دھرم شاستر کی کتابوں کا عجائب گھر کھول دیا جائے۔ جیسی عقل ویسی باتیں۔

ڈاکٹر صاحب کے آنے سے پہلے راج بھون کی رونق میں کمی آچکی تھی۔ جب ڈاکٹر صاحب تشریف لائے تو نقشہ ہی بدل گیا۔ فراش، چپراسی، جمعدار، چوب دار وغیرہ صاف سفید کپڑوں میں ملبوس نظر آنے لگے۔ راج بھون کی برساتی کے دوسری جانب جو کمرہ عرصہ دراز سے گورنر سے ملنے والوں کے لیے مخصوص تھا فرنیچر سے آراستہ کیا گیا اور نامور قومی لیڈروں کی تصویروں سے مزین ہوا۔ اس انتظام سے گورنر کے ملنے والوں کو بہت سہولت ہوگئی اور ان کو ADC کے کمرے میں بیٹھنے کی حاجت باقی نہ رہی۔ اکثر لوگ ADC کے کمرے میں بیٹھ کر انتظار کرنا پسند نہیں کرتے تھے۔

ڈاکٹر صاحب کی آمد نے بہار راج بھون کو ایک نئی زندگی بخشی۔ اس زمانہ میں کرنل بھٹناگر جو گورنر کے ملٹری سکریٹری تھے ایک نہایت تجربہ کار افسر تھے۔ ڈاکٹر صاحب کی ہمت افزائی کی بدولت راج بھون کے ہر دفتر اور شعبہ میں انھوں نے ایسی درستگی لائی جس کو لوگ اب تک یاد کرتے ہیں۔ دعوتوں کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ ڈاکٹر صاحب نے ہدایت کر دی کہ اخراجات اگر اس رقم سے جو گورنر کے مصارف کے لیے دی جاتی ہے (Governor's Sumptuary allowance) زیادہ ہو جائیں تو اس کمی کو ان کے نجی فنڈ سے پورا کر دیا جائے۔

ڈاکٹر صاحب کے گورنر ہونے کے بعد جو پہلی گارڈن پارٹی ۲۶ جنوری کو دی گئی وہ نہایت شاندار تھی۔ لان کی سبزی دیدہ زیب تھی اور موسمی پھول اپنی کیاریوں میں بہار دکھا رہے تھے۔ کل عمائدین شہر پارٹی میں موجود تھے اور ریاست کے اکثر اضلاع سے بھی مہمان آئے۔ ایک نئی بات یہ ہوئی کہ ریاست کے بہت سے سینئر پروفیسر نوید دے کر بلائے گئے۔ اس سے پہلے اکثریت سرکاری ملازمین اور ممبران اسمبلی اور کونسل کی ہوا کرتی تھی۔ جن لوگوں نے کچھ عرصہ سے راج بھون کی پارٹیوں میں آنا ترک کر دیا تھا وہ بھی شوق سے آئے۔ گورنر کا عہدہ نہایت عزت و قدر کا ہوتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے ایسا شریف انسان جب گورنر بہار ہو کر آیا تو ان سے ملنے کی تمنا ہر مہمان کے دل میں تھی۔ وقت معین پر ڈاکٹر صاحب پارٹی میں تشریف لائے۔ وہ چوڑی دار پائجامہ سیاہ رنگ کی شیروانی اور اسی رنگ کی ٹوپی پہنے ہوئے تھے۔ ان کے آتے ہی بینڈ نے "جن گن من" کی دھن بجائی اور اس کے بعد مہمان ناشتہ کی میزوں کی طرف گئے۔ ناشتہ نہایت پر تکلف تھا۔ انگریزی اور ہندوستانی

مٹھائیاں اور پھل موجود تھے۔ مہمانوں نے گاجر کا حلوہ جس کو ڈاکٹر صاحب نے شوق سے بنوایا تھا خوب کھایا اور پسند کیا۔ اعلیٰ قسم کے سگرٹ اور سگار سے مہمانوں کی تواضع کی گئی۔ ناشتہ کے بعد ڈاکٹر صاحب مہمانوں سے ملنے لگے۔ کرنل بھٹناگر بہت سے لوگوں سے واقف تھے انھیں ڈاکٹر صاحب سے ملانا شروع کیا خاص طور سے مسٹر الکھ نرائن سنہا، سابق انسپکٹر جنرل پولس، پرنسپل معین الحق، پدم شری دشنو کانت جھا، فادر مرفی اور ایسے ہی چند اشخاص کو ڈاکٹر صاحب سے ملایا۔ جب میں ڈاکٹر صاحب سے ملا تو انھوں نے مجھ سے میری اہلیہ کی خیریت دریافت کی جو ان دنوں سخت علیل تھیں۔ آج کل گورنر کے ملٹری سکریٹری بہت کم لوگوں سے واقف ہوتے ہیں اور مہمانوں کو گورنر سے ملانے میں ان کو دشواری ہوتی ہے۔ پہلے کا دستور بہت اچھا تھا کہ نوید کے کارڈ کے ساتھ ایک چھوٹا تعارفی کارڈ جس پر مہمان کا نام اور پتہ درج ہوتا بھیجا جاتا تھا۔ گورنر کے سامنے ملٹری سکریٹری اس چھوٹے کارڈ کو بڑھا دیتا تھا اور نہایت آسانی سے تعارف ہو جاتا تھا۔ اب تو مہمان کو خود ہی اپنا نام اور پتہ بتا کر تعارف کرانا ہوتا ہے۔
آج کل ان جلسوں میں لباس کی کوئی پابندی باقی نہیں رہی۔ پہلے تو سب لوگ سیاہ رنگ کی شیروانی یا بند کوٹ پہن کر آتے تھے اور گرمیوں میں لباس کا رنگ سفید یا بادامی ہوتا تھا۔ پارٹی ذرا دیر کر کے ختم ہوئی اور میں مرحوم بھائی عبدالجلیل صاحب وکیل کو ساتھ لے کر گھر واپس آیا۔ راستہ بھر بھائی جلیل ڈاکٹر صاحب کی جامعہ ملیہ کی قدیم باتوں کو یاد دلاتے آئے اور ان کی شفقت اور عنایت کا تذکرہ بہت خلوص سے کیا۔ یہ بھی یاد دلایا کہ ڈاکٹر صاحب شروع میں کس جفاکشی کی زندگی گزارتے تھے اور جامعہ ملیہ سے جامع مسجد پیدل جایا کرتے تھے، لباس بھی نہایت موٹے اور معمولی کپڑوں کا ہوا کرتا تھا اور موٹے کپڑے کی اونچی ٹوپی جو اب گاندھی ٹوپی میں بدل گئی تھی، پہنا کرتے تھے۔

پانچویں ملاقات :

اپنے عقیدے کی بنا پر مجھے ایک مرتبہ ڈاکٹر صاحب کی دعوت میں شریک ہونے سے انکار کرنا پڑا۔ بات یوں ہوئی کہ نیپال کے کوئی رانا پٹنہ آئے تھے اور ڈاکٹر صاحب نے ان کو رات کے کھانے پر مدعو کیا تھا۔ مسلمانوں میں لیڈی امام، نواب زادہ سید محمد مہدی، ڈاکٹر عبدالحیٔ اور میں بلایا گیا تھا۔ ڈاکٹر عبدالحی دعوت میں شریک ہوئے، لیڈی امام، نواب زادہ سید محمد مہدی اور میں نے کھانے میں شرکت نہ کی۔ دعوت کی رات شب عاشورہ تھی اس لیے ہم لوگوں کا دعوت میں جانا ناممکن تھا۔ لیڈی امام نے خط لکھ کر دعوت میں شریک ہونے سے انکار کیا اور یہ بھی لکھا کہ شب عاشورہ میں مسلمان

کو دعوت دینا ان کے جذبات کو مجروح کرنا ہے۔ میں نے نواب زادہ صاحب سے دریافت کیا کہ کیا جواب دیا جائے؟ نواب زادہ نے جو لیڈی امام کے جواب سے باخبر تھے مجھ سے کہا کہ لکھ دیا جائے کہ دوران عشرہ محرم میں کسی دعوت میں شریک نہیں ہوتا ہوں، اس لیے میری غیر حاضری معاف کی جائے۔ نواب زادہ نے خود بھی اسی طرح کا جواب روانہ کیا اور بات ختم ہو گئی۔

کچھ عرصہ پہلے تک یہ دستور تھا کہ جو لوگ گورنر سے ملتے یا ان کے یہاں دعوتوں میں شریک ہوتے ان کے نام "راج بھون" کی طرف سے پٹنہ کے اخباروں میں شائع کر دیے جاتے تھے۔ اس خبر کو دیکھ کر کہ ڈاکٹر عبدالحی بھی شریک تھے، کچھ لوگوں نے اعتراض کیا اور مختلف طرح کے تبصرے ہوئے۔ میں تو اس واقعہ کو بھلا چکا تھا اور اس میں میری کوئی دلچسپی باقی نہ رہی تھی۔ کچھ عرصہ تک میری ملاقات ڈاکٹر عبدالحی سے نہ ہو سکی۔ ایک دن ڈاکٹر صاحب کا خط آیا کہ میں "راج بھون" آکر ان کتابوں کو دیکھوں جن کو مسٹر اس۔ وی۔ سوہنی، آئی۔ سی۔ ایس موضع کواتھ ضلع شاہ آباد سے لائے تھے۔ یہ کتابیں میرے دوست الحاج جان محمد بلگرامی کی ملکیت تھیں اور ان سب کتابوں کو وہ خدا بخش لائبریری کو فروخت کرنا چاہتے تھے۔ ہر قسم کی کتابیں تھیں جن میں کچھ اچھی کتابیں بھی مجھے نظر آئیں۔ میں نے ان کتابوں کو تقریباً تین گھنٹے دیکھ کر ان کی اچھی قیمت لگا دی جو اس قیمت سے کچھ زیادہ تھی جو ایک صاحب پہلے لگا چکے تھے۔ جب یہ کام ختم ہو گیا تو ڈاکٹر صاحب مجھے چائے کے کمرے میں لے گئے اور دوران گفتگو عاشورہ کی دعوت کا تذکرہ آ ہی گیا۔ ایسا معلوم ہوا کہ ڈاکٹر صاحب کو ہم لوگوں کی غیر حاضری کا افسوس تھا۔ فرمانے لگے کہ شب عاشورہ ایک برکت والی رات ہے۔ عرب اس رات کو مبارک سمجھ کر دعوتیں کرتے ہیں اور لوگ شوق سے ان دعوتوں میں شریک ہوتے ہیں۔ میں ڈاکٹر صاحب کے سامنے کیا بولتا؟ تھوڑی دیر چپ رہنے کے بعد نہایت ادب کے ساتھ میں نے عرض کیا کہ شب عاشورہ تو میرے لیے غم کی رات ہے میں کیونکر دعوت میں شریک ہو سکتا تھا۔ کھانا تو بہت دور کی بات ہے میں تو غم امام مظلوم میں شب عاشورہ میں پانی تک نہیں پیتا ہوں۔ ڈاکٹر صاحب کچھ بولنا چاہتے تھے، معلوم نہیں کیوں خاموش ہو گئے اور دوسری دوسری باتیں کرنے لگے۔ مغرب کا وقت نزدیک تھا۔ میں اجازت لے کر گھر کے لیے روانہ ہو گیا۔ ڈاکٹر صاحب اپنے عقیدوں کا اظہار خواہ وہ مذہبی ہوں یا سیاسی نہایت دلیری سے کیا کرتے تھے۔

چھٹی ملاقات:

۱۹۶۰ء میں بحیثیت پرنسپل پٹنہ کالج پٹنہ میں رسل میموریل ٹرسٹ کا سکریٹری تھا۔ مسٹر

چارلس رسل ۱۹۰۴ء سے ۱۹۱۱ء تک پٹنہ کالج کے پروفیسر اور پرنسپل تھے۔ دوران پہلی جنگ عظیم مسٹر چارلس رسل وطن کی خاطر انگریزی فوج میں جو جنرل النبی کے کمان میں تھی داخل ہو گئے اور دوران جنگ نہایت گراں بہا خدمات انجام دیتے رہے۔ ۲۲ نومبر ۱۹۱۷ء کو جب انگریزی فوج حملہ آور ہو کر یروشلم کے فصیل تک پہنچ چکی تھی اور فتح رسل کی نظروں کے سامنے تھی کہ دشمن کی ایک گولی نے ان کی زندگی کا خاتمہ کر دیا۔ ایسے بہادر دانش ور کی یاد میں اس کے چند دوستوں نے یہ ٹرسٹ قائم کیا ہے۔ اس ٹرسٹ کی آمدنی سے کسی موضوع پر جس کا تعلق ادب یا فلسفہ یا سائنس سے ہو "لکچر" کا خرچ ادا ہوتا ہے اور یہ لکچرس "رسل لکچر" کے نام سے موسوم ہیں۔ پہلے یہ لکچرس "آکسفورڈ یونیورسٹی پریس" سے شائع ہوتے تھے، اور اب پٹنہ یونیورسٹی ان کو اپنے پریس سے شائع کراتی ہے۔ خطبہ دینے کے لیے کسی نہایت قابل اور نامور شخص کا انتخاب ہوتا ہے۔ ۱۹۶۱ء میں مقرر کا انتخاب میں نے ڈاکٹر صاحب کی مرضی پر چھوڑ دیا جو ان دنوں پٹنہ یونیورسٹی کے چانسلر تھے، ڈاکٹر صاحب نے اس کام کے لیے پروفیسر ہمایوں کبیر کو منتخب کیا جو مرکزی حکومت میں وزیر تھے اور اپنی اعلیٰ قابلیت کے لیے مشہور تھے۔ اس انتخاب سے مجھے بہت خوشی ہوئی کیونکہ پروفیسر موصوف میرے دیرینہ دوست تھے اور مرتے دم تک ان کی اور میری دوستی برقرار رہی۔ پروفیسر ہمایوں کبیر کے لکچر کا موضوع "مرزا ابوطالب خاں" تھا۔ جو اپنے زمانہ کے نامور دانشور، سیاح اور مورخ تھے۔ ۱۶۔ اپریل ۱۹۶۱ء کو جلسہ پٹنہ کالج میں ہوا۔ چونکہ دو بڑے دانشوروں (ڈاکٹر ذاکر حسین اور پروفیسر ہمایوں کبیر) کی شرکت ہونے والی تھی شائقین کا بڑا اجتماع ہوا اور جلسہ کا انتظام جگہ کی کمی کے باعث ولسن گارڈن کے کھلے میدان میں کرنا پڑا۔ پہلے ڈاکٹر صاحب مرحوم نے اپنا خطبۂ صدارت پڑھا جو کہ نہایت عالمانہ تھا اور حاضرین نے نہایت شوق سے سنا اور خوب داد دی، ڈاکٹر صاحب نے اپنے خطبہ میں افلاطون سے لے کر ٹیگور اور مولانا آزاد تک کا تذکرہ کیا اور بتایا کہ کس طور سے ان بزرگوں نے عوام کی خدمت کی ہے اور باوجود اپنی برتری کے کبھی بھی عوام الناس سے الگ نہیں رہے۔ ڈاکٹر صاحب نے فرمایا:

"These giants of the spirit had not been able to persuade themselves into an attitude of indifference towards the society of common man in which they

lived and had their being. Men and affairs have claimed their attention, and political thinking as well as political action have been enriched by their participation."

پھر پروفیسر ہمایوں کبیر نے اپنا خطبہ پڑھا اور اس کے ختم ہونے پر ہم لوگ چائے کی دعوت میں شریک ہوئے جس کا اہتمام پٹنہ یونیورسٹی نے کیا تھا۔ اس دعوت میں حاضرین سے ڈاکٹر صاحب انیسویں صدی کے مورخوں اور دانش وروں کا تذکرہ کرتے رہے۔ ان کی گفتگو کو لوگوں نے خوب جی لگا کر سنا۔ تمام کام ختم ہو جانے کے بعد میں پروفیسر ہمایوں کبیر کے ساتھ راج بھون گیا جہاں ڈاکٹر صاحب نے چند مہمانوں کو رات کے کھانے پر مدعو کیا تھا اور مجھے بھی اس دعوت میں شریک ہونا تھا۔ اس دن ڈاکٹر صاحب کے ٹیبل ٹاکس کا طرز گفتگو بالکل بدلا ہوا تھا۔ جو باتیں ہوئیں وہ سب کی سب نہایت عالمانہ تھیں۔ ڈاکٹر صاحب نے مرزا ابوطالب کے دیوان کا تذکرہ کیا جس کا انگریزی ترجمہ ۱۸۰۷ء میں لندن میں شائع ہوا تھا اور ابوطالب کے کچھ اشعار بھی سنائے۔ اس کے بعد فرمایا کہ مرزا ابوطالب خاں کی چند تصنیفوں کے نسخے بتیا میں مہاراجہ بتیا کے کتب خانہ میں موجود ہیں۔ مہاراجہ کا کتب خانہ اپنے وقت میں ایک مشہور کتب خانہ تھا جہاں بہت سی نادر کتابیں مل جاتی تھیں۔ جب بتیا کے کتب خانہ کا تذکرہ آیا تو میں نے عرض کیا کہ بہار میں زمینداری کے خاتمہ سے بہت سی اچھی چیزیں بھی ختم ہو گئیں اور ہو سکتا ہے کہ بتیا راج کے خاتمہ کے بعد اس کتب خانہ کا بھی خاتمہ ہو گیا ہو۔ ڈاکٹر صاحب نے کتب خانہ کے بارے میں دریافت کرنے کو کہا تھا۔ شاید بھول گئے، اور کوئی بات معلوم نہ ہو سکی۔ مہاراجہ کے کتب خانہ میں میری ذاتی دلچسپی تھی کیونکہ تقریباً سوا سو سال پہلے میرے خاندان کے ایک بزرگ سید نجم الدین صاحب مہاراجہ کے دیوان تھے اور نہایت ہی علم دوست انسان تھے۔ انھوں نے کتب خانہ میں بہت کچھ توسیع کی تھی اور ان کے زمانہ میں یہ کتب خانہ اپنی نوادرات کے لیے مشہور تھا۔ سید نجم الدین صاحب کا تذکرہ کرنل سلی مین نے اپنی کتاب Rambles and re-collections میں کیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی عالمانہ باتیں جب اس بدمذاقی کے دور میں یاد آتی ہیں

تو نہایت دکھ ہوتا ہے۔ اب ایسے لوگوں کا ملنا ناممکن ہے۔

ساتویں ملاقات :

دسمبر ۱۹۶۱ء میں خان بہادر عبید الرحمٰن خاں شروانی علی گڑھ سے ڈاکٹر صاحب کے اصرار پر پٹنہ تشریف لائے اور مہمان خصوصی کی حیثیت سے "راج بھون" میں ٹھہرے۔ ڈاکٹر صاحب نے مجھے ٹیلی فون کرکے کہا کہ میں خان بہادر کو پٹنہ کالج اور پٹنہ یونیورسٹی کے تمام تعلیمی اداروں کو دکھادوں خان بہادر عرصہ دراز سے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے خازن تھے اور ان کو پٹنہ یونیورسٹی کی درس گاہوں میں خاص دل چسپی تھی۔ میں خان بہادر کو سید اکبر حسین کے ہمراہ جو اُن دنوں پٹنہ یونیورسٹی کے خازن تھے اکثر درس گاہوں کو دکھا کر "راج بھون" واپس لایا۔ ڈاکٹر صاحب نے ہم لوگوں کا شکریہ ادا کیا اور پھر پٹنہ کالج کے متعلق باتیں ہونے لگیں۔ ڈاکٹر صاحب نے پٹنہ کالج کی صد سالہ خدمتوں کا تذکرہ کیا اور کالج کے چند نامی استادوں کو بھی یاد کیا خصوصاً استاذ محترم ڈاکٹر عظیم الدین احمد کا تذکرہ دیر تک ہوتا رہا۔

۱۲۔ دسمبر کی رات کو خان بہادر عبید الرحمٰن کے اعزاز میں ایک دعوت ہوئی، جس میں دس مہمانوں نے شرکت کی۔ کھانے کی میز کا نقشہ میرے پاس بطور یادگار محفوظ ہے۔ بھٹناگر صاحب نے مہمانوں کا استقبال کیا اور ہم لوگوں کو کھانے کے کمرے میں لے گئے۔ بہت جلد ڈاکٹر صاحب بھی تشریف لائے اور کل مہمانوں سے مل کر ان کی مزاج پرسی کی۔ ایک دو مہمانوں سے کچھ عرصہ پر ملاقات ہو رہی تھی اس لیے ان سے دیر تک باتیں کیں۔ یہ ڈاکٹر صاحب کا پرانا دستور تھا جس کے وہ بہت پابند تھے ڈاکٹر صاحب ایک خوش گفتار آدمی تھے اور نہایت ہی دل چسپ انداز سے باتیں کرتے تھے۔ اس رات بھی ڈاکٹر صاحب نے کھانے کی میز پر اپنے ٹیبل ٹاکس سے سب لوگوں کو بے حد خوش کیا۔ کھانے کے دوران مہمانوں کو طرح طرح کے قصے سنا کر ہنساتے رہے۔ ایک نواب صاحب کا قصہ سنایا جن کو ایک ہنرمند باورچی کی ضرورت تھی۔ نواب صاحب نے لکھنؤ جاکر چند اچھے باورچیوں میں سے ایک کا انتخاب کیا اور اس کو اپنے گھر لے گئے، گھر آکر نواب صاحب نے باورچی کو حکم دیا کہ وہ جو سب سے اچھا کھانا پکا سکتا ہے اسے پکاکر روزانہ دسترخوان پر حاضر کیا کرے۔ پہلی رات باورچی نہایت اچھی چپاتیاں اور نہایت خوش مزہ اور خوش رنگ قورمہ پکاکر دسترخوان پر لایا۔ نواب صاحب نے ان کو شوق سے نوش جان فرماکر باورچی کی تعریفیں کیں۔ دوسرے دن باورچی نے پھر وہی چپاتیاں اور قورمہ نواب صاحب کے دسترخوان پر

حاضر کیا۔ نواب صاحب نے نہایت برہم ہوکر فرمایا کہ میں تم کو ایک ہنرمند باورچی تصور کرتا تھا مگر اب معلوم ہوا کہ تم چپاتی اور قورمہ کے سوا کچھ نہیں پکا سکتے ہو۔ باورچی نے ہاتھ جوڑ کر عرض کیا کہ قورمہ اور چپاتی شریفوں کا کھانا ہے اور باقی چیزیں نوابوں کے چونچلے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے ایک دوسرا قصہ چین کی دعوتوں کا سنایا۔ چین کی دعوتوں میں کھانے کے بعد ہر مہمان کو ایک چورن کی شیشی دی جاتی تھی کہ خدانخواستہ اگر کسی مہمان کو کھانے کے بعد بدہضمی ہو جائے تو چورن کھا کر اپنی تکلیف کو دور کرے۔ اس قصہ پر خوب ہنسی ہوئی اور کسی نے کہا کہ آپ کی باتوں نے ہم لوگوں کو ہنسا کر دسترخوان پر ہی کھانا ہضم کرا دیا۔

ان سب قصوں کے بعد ڈاکٹر صاحب میری طرف متوجہ ہوئے۔ میں پندرہ سال تک خدابخش لائبریری کی مجلس انتظامیہ کا ممبر رہ چکا تھا اور کتابوں کی خریداری میں مجھ سے بھی مشورہ طلب کیا جاتا تھا۔ اور میرے کہنے پر مسٹر ایس وی سوہونی۔ آئی سی ایس اکثر کتابیں خریدا کرتے تھے۔ ڈاکٹر صاحب کہنے لگے کہ ایک شاہ صاحب کے پاس کلام اللہ مجید کا نہایت اچھا قلمی نسخہ ہے جس کی قیمت پانچ ہزار روپیے مانگتے ہیں۔ میں نے عرض کیا کہ قیمت زیادہ معلوم ہوتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ سب باتوں کو سن کر اس کی قیمت لگائیے۔ میں خاموش ہوگیا، اور ڈاکٹر صاحب کی باتوں کو سننے لگا۔ ڈاکٹر صاحب نے سلسلہ گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا کہ شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ حضرت امام حسینؑ جس کُرتے میں شہید ہوئے تھے، اسی کے کپڑے سے اس کلام اللہ مجید کا جزدان بنایا گیا ہے اور دو سو جنات اس نسخہ کے لیے ہمیشہ پہرہ داری کرتے رہتے ہیں۔ میں نے عرض کیا کہ یہ نسخہ خدابخش لائبریری کے لیے ضرور خریدا جائے کیونکہ لائبریری کو دو سو پہرے دار بلا تنخواہ والے مل جائیں گے۔ اس پر خوب ہنسی ہوئی۔ ڈاکٹر صاحب نے پھر فرمایا کہ ایک خانقاہی شاہ صاحب کے پاس اونچی استرخانی ٹوپی ہے اور عیدین کے موقع پر اس کو پہن کر نماز کے لیے جایا کرتے ہیں۔ اگر رکوع و سجود میں ان کے سر سے ٹوپی گرنے لگتی ہے تو دو جنات جو ان کے ساتھ ہمیشہ موجود رہتے ہیں ٹوپی کو گرنے سے بچا لیتے ہیں۔ نہایت ہنسی خوشی سے کھانا ختم ہوا اور ہم لوگ ڈاکٹر صاحب کا شکریہ ادا کرتے ہوئے گھر روانہ ہوئے۔ ڈاکٹر صاحب کی خوش مذاقی اور خوش گفتاری اکثر یاد آتی ہے۔ ان کے پاس سے ہٹنے کا جی نہیں چاہتا تھا۔

آٹھویں ملاقات :

بہار میں پانچ سال گورنر رہنے کے بعد ڈاکٹر صاحب جمہوریۂ ہند کے نائب صدر بنائے گئے۔ اس تقرری سے سارے ملک میں لوگوں کو خوشی ہوئی خصوصاً بہار میں تو بڑے اطمینان کا اظہار

کیا گیا۔ سارے صوبہ سے ہر طبقہ کے لوگ ڈاکٹر صاحب کو مبارک باد دینے کے لیے "راج بھون" جانے لگے۔ اور ڈاکٹر صاحب بھی ان لوگوں سے نہایت خندہ پیشانی سے ملتے اور شکریہ ادا کرتے۔ میرے لیے تو "دلّی دور است" والا مضمون پیدا ہوگیا اور مجھے پانچ سال سے جو قربت نصیب تھی وہ اب جلد ہی ختم ہونے والی نظر آنے لگی۔ اس کا مجھے افسوس تھا۔ سرکاری اعلان کے دس روز بعد جب میں ڈاکٹر صاحب کو مبارک باد پیش کرنے گیا تو تقریباً تیس طلباء قدیم و جدید جامعہ ملیہ اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے، ڈاکٹر صاحب کو مبارک باد دینے گئے ہوئے تھے۔ جامعہ ملیہ کے طلباء تو ڈاکٹر صاحب سے ہمیشہ والہانہ محبت کرتے تھے اور مسلم یونیورسٹی کے طلباء بھی باوجود چند اختلافات کے موصوف کا نہایت احترام کرتے تھے۔ ان لوگوں کے ہاتھوں میں خوشبودار پھولوں کے گلدستے تھے جن کو انھوں نے ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں پیش کیا۔ سارا کمرہ معطر تھا۔ اور ڈاکٹر صاحب ان لوگوں سے نہایت شفقت سے باتیں کر رہے تھے، اور ہر کا حال دریافت کر رہے تھے۔ جب ملاقات ختم ہوئی تو ڈاکٹر صاحب نے طلباء کے ساتھ برساتی تک آکر ان لوگوں کو رخصت کیا۔ تھوڑی دیر بعد میں بھی ڈاکٹر صاحب سے اجازت لے کر واپس ہوگیا۔

میں نے بہار میں گوروں اور کالوں کی حکومت کا دور خوب دیکھا ہے۔ بیس سال کے سن سے "گورنمنٹ ہاؤس" جاتا رہا ہوں اور پچاس سال سے ہر گورنر سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا ہے، مگر ڈاکٹر صاحب کے مقابلہ کا کوئی گورنر مجھے نہیں ملا۔ میرا اپنا خیال ہے کہ "راج بھون" کو ڈاکٹر صاحب جیسا گورنر نہ ملا ہے اور نہ ملے گا۔ بے ساختہ زبان سے نکلتا ہے کہ "بسیار خوباں دیدہ ام اما تو چیزے دیگری۔" میں اس صاف گوئی کے لیے معافی چاہتا ہوں۔ ڈاکٹر صاحب کی ملنساری کا یہ حال تھا کہ جو بھی ان سے ملتا، ان کو اپنا سمجھنے لگتا تھا۔ اس سلسلہ میں ایک واقعہ یاد آگیا۔ ایک مرتبہ وھیلر سنیٹ ہال میں جرمن کتابوں کی نمائش ہوئی۔ ڈاکٹر صاحب کو ایک جرمن نوجوان کتابیں دکھا رہا تھا۔ اور ڈاکٹر صاحب اس سے جرمن زبان میں باتیں کر رہے تھے۔ جب ڈاکٹر صاحب چلے گئے، تو میں نے اس نوجوان سے انگریزی میں پوچھا:

"How do you like our Governor?" اس نے فوراً جواب دیا کہ:

"Excellent, He is one of us"۔

ڈاکٹر صاحب کی دلّی روانگی کے قبل بہار اسٹیٹ گیسٹ ہاؤس کے میدان میں ایک نہایت شاندار الوداعی جلسہ منعقد ہوا جس میں ہر پیشے اور ہر طبقے کے لوگوں نے کثیر تعداد میں شرکت کی۔ جلسہ کی صدارت وزیر اعلیٰ نے کی اور ڈاکٹر صاحب کی خوبیوں کا تذکرہ کرتے ہوئے انھوں نے پرزور

الفاظ میں کہا کہ ڈاکٹر صاحب نے اپنی ذات سے کبھی کسی کو تکلیف نہیں پہنچائی ہے اور اس معاملہ میں ہر شخص ان کا مداح رہا ہے۔ ان کی وسعت نظری، علمی ذوق اور ملنساری سے ہر شخص بہت جلد ان کا گرویدہ بن جاتا ہے۔ صوبہ بہار سے ان کا دیرینہ تعلق رہا ہے اور گزشتہ پانچ سالوں میں ڈاکٹر صاحب نے بہار کے لوگوں کے لیے بہت کچھ کیا ہے۔ اس جلسہ میں اتنی کثیر تعداد میں لوگوں کی شرکت ڈاکٹر صاحب کی ہر دل عزیزی کا ایک بیّن ثبوت ہے۔ اپنا خیال ظاہر کرتے ہوئے وزیر اعلیٰ نے نہایت جذباتی انداز میں کہا کہ ڈاکٹر صاحب جیسے لوگ اب بہت کم ملتے ہیں۔ آخر میں ڈاکٹر صاحب کی صحت اور کامیابی کی دعا کی اور امید ظاہر کی کہ ڈاکٹر صاحب بہار کے لوگوں کو کبھی فراموش نہیں کریں گے۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنی جوابی تقریر میں بہار اور بہار کے لوگوں سے اپنی محبت کا اظہار کیا اور فرمایا کہ گذشتہ پانچ سالوں میں بہار کے ہر چھوٹے بڑے لوگوں نے کل کاموں میں ان سے پورا تعاون کیا ہے جس کے لیے وہ نہایت مشکور ہیں۔ بہار کا تذکرہ کرتے ہوئے انھوں نے فرمایا کہ زمانہ قدیم سے اس صوبہ کا بلند مقام رہا ہے اور ہمیشہ سے یہ تہذیب اور تمدن کا گہوارہ رہا ہے۔ قدرت نے اس صوبہ کو معدنیات کے ذخیروں سے مالا مال کر رکھا ہے اور وہ دن دور نہیں جب کہ ان خزانوں کی بدولت بہار جدید دور میں بھی سر بلند رہے گا۔ اپنی تقریر کو بہار اور بہار کے لوگوں کے لیے فلاح اور بہبود کی دعا پر ختم کیا۔ جلسہ کے اختتام پر ہر شخص ڈاکٹر صاحب سے مصافحہ کرنے کے لیے بیتاب نظر آرہا تھا اور قریب آدھ گھنٹے تک وہ حاضرین جلسہ سے ملتے رہے۔ میں نے ایسا شاندار الوداعی جلسہ کسی گورنر کے اعزاز میں نہیں دیکھا ہے۔

پبلک جلسہ کے چند دنوں بعد ڈاکٹر صاحب نے "راج بھون" میں اپنی طرف سے ایک الوداعی دعوت دی تقریباً ڈیڑھ سو مہمان رات کے کھانے پر بلائے گئے تھے، کھانا ضیافت کے کمرہ (Banquet Hall) میں ہوا۔ یہ کمرہ "راج بھون" میں نہایت خوب صورت کمرہ ہے جس کی دیواریں کاٹھ کے پینل سے مزین ہیں۔ میری دانست میں شاید ہی کسی گورنر نے اس کمرہ میں دعوت دی ہو۔ ڈاکٹر صاحب مہمانوں کے خیر مقدم میں مصروف تھے اور کھانا ختم ہونے پر مہمانوں سے ہاتھ ملا کر الوداع کہی۔ ڈاکٹر صاحب کی یہ آخری دعوت تھی جو راج بھون میں ہوئی جب ہم اور مسز سوہنی گھر جانے کے لیے روانہ ہوئے تو ہم دونوں کی آنکھیں نم تھیں، کیونکہ ڈاکٹر صاحب ہم لوگوں سے بہت دور جا رہے تھے۔

۲۱
اکیسواں باب

میرے چند قابلِ ذکر معاصرین

۱۔ مسٹر سید نور الہدیٰ ایم ایل اے (سی آئی ای)

میں مسٹر سید نور الہدیٰ مرحوم کے متعلق وہ چند معلومات جو میرے پاس ہیں ان کو قلم بند کر دینا چاہتا ہوں۔ راقم کی دعا ہے کہ مرحوم کی یاد ہم لوگوں کے دلوں میں قائم رہے اور ان کے نقش قدم پر چل کر قوم وملت کی خدمت کر سکیں۔ یوں تو ہر انسان کی زندگی سبق آموز ہوتی ہے مگر ان ہی اشخاص کی زندگی قابلِ تقلید ہوتی ہے جو قدرت کی عطا کردہ صلاحیتوں کو کام میں لاکر بڑے بڑے کام انجام دیتے ہیں۔ جب عزم صحیح کے ساتھ جد وجہد کرنے کے لیے بڑھتے ہیں تو اللہ ان کو نوازتا ہے اور ان سے بڑے بڑے کام انجام دلاتا ہے۔ دنیا ان کے کارناموں سے مستفید ہوتی ہے۔ ایسی شخصیتیں ماضی میں غروب نہیں ہوا کرتی ہیں۔ سید نور الہدیٰ صاحب مرحوم اسی طرح کی گنی چنی ہستیوں میں ایک تھے۔ قدرت نے ان کو گوناگوں خوبیوں سے آراستہ کیا تھا۔ ان کی ذات میں حسن اخلاق، خدا پرستی، مسلم دوستی، شرافت، سادگی اور معصومیت کا ایسا امتزاج تھا کہ جو شخص بھی ان سے ملتا تھا ان کا گرویدہ ہو جاتا تھا۔ میرے لیے ان کی سیرت کو پر لکھنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ ۱۹۲۶ء سے ۱۹۳۵ء تک راقم کو ان سے ملاقات کی سعادت بار بار حاصل ہوتی رہی۔ اس زمانہ میں مرحوم گوشہ نشینی کی زندگی بسر کر رہے تھے اور ہر بات کو معصومیت کے ساتھ نہایت کھل کر بیان کرتے تھے۔ آج کل ایسے لوگ دنیا سے مفقود ہو چکے ہیں۔ جب بھی ان کی یاد آتی ہے تو مولانا روم کا حسب ذیل شعر بے ساختہ زبان پر

پر آجاتا ہے ؎

بعد از وفات تربتِ ما در زمیں مجوئے
در سینہ ہائے مردم عارف مزار ماست

سید نور الہدیٰ صاحب ۱۸۵۴ء میں پیدا ہوئے اور ۱۹۳۵ء میں ۸۱ برس کی عمر میں رحلت فرمائی۔ ان کے والد سید شمس الہدیٰ صاحب پٹنہ شہر کے نامی گرامی زمیندار اور رئیس تھے۔ ہندوستانی اور انگریز ان کی قدر کرتے اور بہت سے مشکل کاموں میں ان سے مشورہ طلب کرتے تھے۔ صاحب موصوف کو مسلمانوں کی حالت پر بہت غم تھا اور ان کی حالت کو بہتر بنانے میں ہمیشہ سرگرم عمل رہتے تھے۔ ان لوگوں کی تعلیم کے لیے ایک اسکول بھی قائم کیا جس سے بے شمار لڑکے مستفید ہوتے رہے۔ سید شمس الہدیٰ صاحب مرحوم ایک کھرے مسلمان اور باصفا انسان تھے۔ محبت اور سلیقہ، تربیت اور تنظیم، جاں سازی اور جاں سپاری ان کا شیوہ بن گیا تھا۔ مسلمانوں کو انگریزی تعلیم حاصل کرنے کے لیے ہمیشہ تلقین کیا کرتے تھے اور انگریزی تعلیم ہی کو ان کی ترقی کا واحد ذریعہ تصور کرتے تھے۔ ۱۸۵۷ء کے غدر کا خونی منظر اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے تھے اور پٹنہ کے کمشنر مسٹر ٹیلر کی سفاکی ان کی نظر کے سامنے تھی۔ اس انگریز حاکم نے سینکڑوں بے گناہ مسلمانوں کو بغاوت کے بے بنیاد الزام میں پھانسی کی سزا دی اور ان کی لاشوں کو سڑک کے دو رویہ درختوں سے لٹکا دی تھی۔ انگریزوں کے ہندو کارندے بھی ہر وقت اچھے مسلمانوں کے خلاف ریشہ دوانی کرتے رہتے تھے۔ ان سب حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے صاحب موصوف اس نتیجے پر پہنچے کہ مسلمان اگر اپنی عزت برقرار رکھنا چاہتے ہیں تو انگریزی تعلیم حاصل کریں۔ جہاں تک ممکن ہو اسلام پر قائم رہ کر انگریزی تہذیب کو اختیار کریں اور اسی طور سے وہ انگریزوں کا تقرب حاصل کر سکتے ہیں۔ راقم نے ان سب باتوں کو سید نور الہدیٰ صاحب سے سنا ہے اور یہاں قلم بند کر رہا ہے۔ سید نور الہدیٰ صاحب جب بھی اپنے والد کا تذکرہ کرتے تو ان کی آنکھوں سے آنسو نکل جاتے تھے۔ ان کا یہ جذبہ محبت آخر دم تک قائم رہا۔

سید نور الہدیٰ صاحب ایک دولت مند گھرانے میں پیدا ہوئے تھے جہاں کسی چیز کی کمی نہ تھی اور نہایت عیش و آرام سے پرورش پائی۔ ابتدائی تعلیم نہایت خوبی کے ساتھ

شروع ہوئی۔ اردو اور فارسی کے علاوہ عربی اور انگریزی کی بھی تعلیم دی گئی۔ عربی تعلیم دینے کے لیے صوبہ بہار کے مشہور عالم مولانا محمد کمال کا انتخاب کیا گیا اور انگریزی پڑھانے کے لیے ایک ماسٹر مقرر کیا گیا۔ یہ سب تعلیم سید شمس الہدیٰ صاحب کے زیر نگرانی ہوتی رہی۔ ابتدائی تعلیم کے زمانہ ہی سے نور الہدیٰ صاحب ایک ذکی اور ذہین طالب علم تھے۔ چونکہ گھر کا ماحول مذہبی تھا اور تعلیم بھی نہایت اعلیٰ طرز کی دی جارہی تھی صاحب موصوف کی زندگی پر پسندیدہ نقوش ابھرے اور یہ زندگی بھر نمایاں رہے۔ کچھ دنوں کے بعد اسکول میں داخل کر دیے گئے اور امتیاز کے ساتھ انٹرنس کا امتحان پاس کیا۔ امتحان پاس کرنے کے بعد کلکتہ گئے اور وہاں انگریزوں سے انگریزی پڑھی۔ ۱۸۷۷ء میں تعلیم کی غرض سے انگلستان گئے اور وہاں کی مشہور کیمبرج یونیورسٹی میں تعلیم پائی۔ ۱۸۸۰ء میں کیمبرج یونیورسٹی سے بی۔اے کی ڈگری لی اور اسی کے ساتھ بیرسٹری کا امتحان پاس کیا۔ بعد میں ایل۔ایل۔ایم کی ڈگری کیمبرج یونیورسٹی سے حاصل کی۔ اس ڈگری کو اُن دنوں بہت کم ہندوستانی حاصل کر سکتے تھے اور مسلمانوں میں تو یہ شاید پہلے شخص تھے جس نے کیمبرج یونیورسٹی سے اس ڈگری کو حاصل کیا۔ کیمبرج یونیورسٹی اس زمانہ میں انگریزی تہذیب اور تمدن کا بہترین گہوارہ تھی اور مرحوم نے وہاں رہ کر علمی حلقوں میں اپنی جگہ بنالی تھی۔ کیمبرج یونیورسٹی کے احسان کو مرتے دم تک نہ بھولے اور وہاں کا تذکرہ بہت اچھے الفاظ میں کیا کرتے تھے۔ اکثر کہا کرتے تھے کہ میں نے کیمبرج میں صرف اعلیٰ تعلیم ہی حاصل نہیں کی بلکہ وہاں رہ کر رواداری فیاضی اور انسانی ہمدردی کا وہ سبق پڑھا جو اب تک یاد ہے۔ کیمبرج نے آپ کی طرز معاشرت پر اپنا اثر تو ضرور ڈالا مگر مذہبی خیالات میں کوئی تغیر نہ آیا۔ انگلستان سے واپس آنے کے بعد کلکتہ میں بیرسٹری کی پریکٹس شروع کردی مگر یہ سلسلہ دیر تک جاری نہ رہا۔ مختلف اسباب کی بنا پر اس پیشہ کو ترک کر دیا۔ اور پٹنہ واپس آگئے۔ اس کے کچھ دنوں بعد گورنمنٹ برطانیہ نے ان کے علم اور صلاحیت کو مدنظر رکھتے ہوئے آئی۔ایس۔او (I.S.O.) کا منصب عطا کیا جو بہت ہی کم ہندستانیوں کو دیا جاتا ہے۔ بہار میں کئی جگہوں پر فوجداری اور دیوانی عدالتوں کے کاموں کو سیکھا اور جب پوری مہارت حاصل ہوگئی تو حکومت نے انھیں بنگال میں ضلع کا جج مقرر کیا۔ ایک مدت تک ججی کی خدمت انجام دیتے رہے۔

بنگال میں ضلع بوگرا راج شاہی اور پٹنا میں جج کے فرائض کو نہایت خوبی سے انجام دیا اور کسی کو شکایت کا کوئی موقع نہ ملا۔ ۱۹۱۱ء میں قبل از وقت پنشن لے کر ججی کی خدمت سے سبکدوش ہو کر پٹنہ تشریف لائے اور مسلمانوں کی خدمت کرنے میں اپنی باقی زندگی کو وقف کر دیا۔ ایک بے مثال مدرسہ قائم کیا اور ایک شاندار مسجد تعمیر کی اور اپنی کل دولت ان پر لگا دی۔

نور الہدیٰ صاحب کی شادی ان کے انگلستان جانے سے کچھ قبل ہوئی تھی۔ مگر کچھ ہی دنوں کے بعد آپ کی اہلیہ محترمہ کا انتقال ہو گیا۔ پھر کبھی شادی کا ارادہ نہ کیا اور ہمیشہ اکیلی زندگی بسر کرتے رہے۔ آپ میں انکسار اس درجہ کا تھا کہ دولت مند ہونے کے باوجود نہایت سادہ زندگی بسر کرتے تھے۔ اکثر سوٹ میں ملبوس رہتے تھے، خصوصاً صاحب کسی یورپین سے ملنا ہوتا تھا۔ نہ کسی گورنر کی دعوت کی اور نہ کسی اعلیٰ حاکم کی ضیافت پر پیسہ برباد کیا۔ فضول خرچی اور نمایش ان کی زندگی سے بہت دور تھیں۔ اعتدال اور میانہ روی کا ہمیشہ خیال رکھتے تھے اور بہت کم لوگوں سے ملتے تھے۔ ہمیشہ اپنے دل میں کار خیر کا عزم رکھتے تھے۔ وکٹورین تہذیب اور قدیم اسلامی تمدن کے مجسمہ تھے۔ اس وقت راقم کے سامنے مرحوم کی دو تصویریں ہیں ـــ ایک کیمبرج یونیورسٹی میں بی۔ اے کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد کی تصویر جس میں مرحوم یونیورسٹی گاؤن اور ہوڈ میں ملبوس ہیں۔ اس تصویر میں ان کی وضع وکٹورین دور کے انگریز کی سی ہے اور کوئی نہیں کہہ سکتا ہے کہ وہ ہندوستانی ہیں۔ ان کی دوسری تصویر منیجنگ کمیٹی کے گروپ فوٹو میں ہے۔ اس فوٹو میں گرچہ وہ سوٹ میں ملبوس ہیں، مگر شکل سے اسلامی شان نمایاں ہے۔ قدیم اور جدید تمدن کا ان میں ایسا امتزاج تھا جو اس تصویر میں دیکھا جا سکتا ہے۔ انگریزوں کے انداز سے اکثر شانہ ہلا ہلا کر باتیں کرتے اور سگار بھی کچھ انگریزوں ہی کے انداز سے پیتے تھے۔ سگار اکثر منہ میں لگا رہتا تھا خواہ اس سے دھواں نکلتا ہو یا نہیں۔ نور الہدیٰ صاحب انگریزوں کی خوبیوں اور ان کی طرز زندگی کی بہت تعریف کرتے اور انگریز بھی ان کی بڑی قدر کرتے تھے۔ میں نے خود دیکھا ہے کہ ایسے انگریز جو ہندوستانیوں کے گھر جانے کو توہین سمجھتے تھے نور الہدیٰ صاحب کے یہاں جا کر ان سے ملتے اور مزاج پرسی کرتے تھے۔

سید نور الہدیٰ صاحب مرحوم اور راقم کے خاندان سے قدیمی تعلقات تھے۔ والد

صاحب جج صاحب کو ماموں کہا کرتے تھے، اور جج صاحب بھی ہمیشہ والد سے بڑی محبت اور شفقت سے پیش آتے تھے۔ سال میں کم از کم ایک بار تو ضرور والد صاحب سے ملنے آتے اور کچھ دیر تک ٹھہر جاتے تھے اگر ان ملاقاتوں کے وقت خان بہادر سید ظہیر الدین مرحوم ساکن نیورہ یا سید ریاض حسین خاں صاحب مرحوم ساکن رسول پور ضلع مظفر پور موجود ہوتے تو خوب خوب باتیں انگریزی حکومت اور انگریزوں کے بارے میں ہوا کرتی تھیں۔

مسٹر سید نور الہدیٰ پنشن پانے کے بعد بھی قومی اور علمی کاموں میں برابر حصہ لیتے رہے۔ بہار گورنمنٹ نے موصوف کو صغریٰ وقف اسٹیٹ بہار شریف کی کمیٹی کا صدر مقرر کیا اور صوبہ بہار کی حج کمیٹی کے صدر کی حیثیت سے موصوف نے اپنے کاموں کو نہایت حسن و خوبی سے انجام دیا۔ پٹنہ یونیورسٹی کی سنیٹ کے فیلو ممبر مقرر ہوئے اور یونیورسٹی میں آپ بہت سی کمیٹیوں کے صدر رہے۔ حکومت بہار کو جب یہ خیال ہوا کہ پٹنہ شہر سے باہر ایک رہائشی یونیورسٹی قائم کی جائے تو ایک کمیٹی مقرر ہوئی۔ حکومت ہند کے ایک نامور انگریز افسر مسٹر نیتھن کو صدر مقرر کیا گیا۔ اور یہ کمیٹی نیتھن کمیٹی کے نام سے موسوم ہوئی۔ اس کمیٹی کے سکریٹری مسٹر پی۔ سی ٹیلنٹس مقرر ہوئے۔ ہندوستانی ممبروں میں راجہ کانیکا، آنریبل سید محمد فخر الدین، مسٹر سید نور الہدیٰ، رائے بہادر دوارکا ناتھ اور پروفیسر ڈی۔ این۔ سین تھے۔ انگریز ممبروں میں پروفیسر ارچ بولڈ، مسٹر جیکسن، ڈاکٹر کاڈول وغیرہ تھے۔ ان سب ممبروں نے بہت محنت اور جانفشانی سے دو جلدوں میں کمیٹی کی رپورٹ تیار کی اور شائع ہوئی۔ افسوس ہے کہ بہار کے اکثر سیاست دانوں نے ایسی رہائشی یونیورسٹی کے قائم کرنے کی مخالفت کی اور یہ مثالی یونیورسٹی قائم نہ ہوسکی۔ کمیٹی کے کاموں میں مسٹر سید نور الہدیٰ نے بہت سرگرمی سے حصہ لیا جس کا تذکرہ مسٹر ٹیلنٹس (Mr. P. C. Tallents) ہمیشہ کیا کرتے تھے۔

سید نور الہدیٰ صاحب لوگوں سے اکثر کہا کرتے تھے کہ کلکتہ کی بڑی مسجد اور مدرسہ عالیہ کو دیکھ کر میرے دماغ میں یہ خیال پیدا ہوتا تھا کہ پٹنہ میں بھی میں ایک اچھا مدرسہ بناؤں اور ایک شاندار مسجد تعمیر کراؤں۔ اللہ نے صاحب موصوف کی نیک خواہش کو پورا کیا۔ چنانچہ صاحب موصوف نے یکم نومبر ۱۹۱۲ء کو ایک مدرسہ قائم کیا اور اسے اپنے والد مرحوم کے نام سے موسوم کیا۔ مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ صاحب موصوف کی قومی خدمات میں سب سے

شاندار اور اہم یادگار ہے۔ اس مدرسہ کے اخراجات کو پورا کرنے کے لیے اپنی ایک خاندانی جائداد کو جس کی آمدنی اُس زمانے میں تقریباً پندرہ ہزار روپے سالانہ تھی وقف کرکے رجسٹری کردی۔ آٹھ سال بعد ایک کثیر رقم خرچ کرکے صاحب موصوف نے مدرسہ کی ایک خوب صورت عمارت تعمیر کرائی اور طلبا کے قیام کے لیے ایک دارالاقامہ بھی بنوایا۔ مدرسہ کی ترقی کو مدنظر رکھتے ہوئے صاحب موصوف نے ۱۹۱۹ء میں سر سید فخرالدین، وزیر تعلیم بہار واڑیسہ کے مشورے پر مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ کو حکومت بہار کی تحویل میں دے دیا۔ اس اسکیم سے مدرسہ کو بہت فائدہ پہنچا۔ حکومت بہار مدرسہ کے کل اخراجات کو برداشت کرتی ہے اور مدرسہ حکومت کے زیر انتظام اب تک نہایت حسن و خوبی کے ساتھ چل رہا ہے۔ حکومتِ بہار نے مدرسہ شمس الہدیٰ کے لیے دو شاندار عمارتیں ایک شعبہ سینیئر کے لیے اور دوسری شعبہ جونیئر کے لیے تعمیر کرائی ہیں۔ افسوس کی بات ہے کہ شعبہ سنیئر کی عمارت چند سالوں سے زبوں حالی میں پڑی ہوئی ہے اور کسی حاکم کی توجہ اس کی درستگی کی طرف نہیں ہو رہی ہے۔ حکومت بہار نے مدرسہ کی دیکھ بھال کے لیے ایک گورننگ بوڈی دس ممبران پر مشتمل قائم کی ہے جس کا صدر پٹنہ ڈویزن کا کمشنر ہوتا ہے اور مدرسہ کا پرنسپل سکریٹری کا کام انجام دیتا ہے۔ راقم نے بحیثیت ممبر گورننگ بوڈی دس بارہ سال سے زیادہ مدرسہ کی خدمت کی ہے۔ اس سلسلہ میں مجھے دو صدر کے نام یاد آتے ہیں ایک تو مسٹر ای۔ او۔ لی اور دوسرے مسٹر این بخشی۔ یہ دونوں حضرات مدرسہ کے کل کاموں میں ذاتی دلچسپی لیا کرتے تھے اور مدرسہ کے عروج کے لیے بہت کچھ کیا۔ سید نور الہدیٰ مرحوم کی کوششوں کی بدولت امتحان سے متعلق کل کاموں کی انجام دہی کے لیے حکومت بہار نے مدرسہ اکزامی نیشن بورڈ قائم کیا جو سولہ اراکین پر مشتمل تھا۔ اس بورڈ کے پہلے صدر سید نور الہدیٰ صاحب ہوئے اور ڈاکٹر عظیم الدین احمد پہلے سکریٹری مقرر ہوئے۔ راقم تیس سال تک مدرسہ اکزامی نیشن بورڈ کی خدمت کرتا رہا اور دس سال تک اس کا صدر بھی رہا۔ مدرسہ شمس الہدیٰ کے نامی اساتذہ میں مولانا ظفر الدین بہاری، مولینا محمد سہول، مولٰنا محمد اصغر حسین، مولانا سید دیانت حسین، مولانا شاہ ابوالقاسم، اور مولانا عزالدین ہوئے ہیں۔ ان کل حضرات سے راقم کے اچھے تعلقات تھے اور میں ان سبھوں کا بڑا احترام کیا کرتا تھا۔

سید نورالہدیٰ صاحب نے مدرسہ کی قدیم عمارت کے متصل ایک شاندار مسجد تعمیر کی جو "نوری مسجد" کے نام سے مشہور ہے۔ صاحب موصوف کو اس مسجد سے زندگی بھر ایک روحانی تعلق رہا اور عیدین کے موقع پر عمائدین شہر اس مسجد میں نماز ادا کرنے کے لیے آتے تھے۔ عیدالفطر کے موقع پر صاحب موصوف خرما اور دودھ طشتری میں رکھ کر اپنے ہاتھوں سے کل نمازیوں کو پیش کیا کرتے اور مسجد کے صحن میں کھڑے ہو کر نمازیوں کا استقبال کیا کرتے تھے۔ صاحب موصوف کے انتقال کے بعد ان کے بھانجے استاد محترم مسٹر سید محمد شریف نے "نوری مسجد" کو بہت اچھے حال میں رکھ کر جج صاحب مرحوم کی روایت کو قائم رکھا۔ ڈاکٹر احمد عبدالحی نے مسجد کے فرش کو موزائیک کرا دیا ہے "نوری مسجد" آج کل نہایت اچھے حال میں ہے اور بہت شاندار معلوم ہوتی ہے۔ راقم کا "نوری مسجد" سے دیرینہ تعلق رہا ہے۔ ساٹھ سال سے راقم عیدین کی نماز برابر اسی مسجد میں ادا کرتا رہا ہے۔ صاحب موصوف حسن اخلاق اور ادب کے نہایت پابند تھے۔ نماز کی پابندی کا بہت زیادہ خیال رکھتے اور نماز صبح ادا کر کے دیر تک قرآن شریف کی تلاوت کیا کرتے تھے۔ حج بیت اللہ کیا اور مدینہ منورہ کی زیارت سے مشرف ہوئے۔ میلاد کے لیے جائداد وقف کر دی تھی۔ ہر سال میلاد کراتے تھے اور اس میلاد کا کل انتظام خود کرتے تھے۔ بعد اختتام محفل میلاد حاضرین میلاد کو اپنے ہاتھوں سے شیرنی تقسیم کیا کرتے تھے۔ مرحوم کی موقوفہ جائداد کے متولی ان دنوں مسٹر سید نورالوارث ایڈوکیٹ ہیں۔ موصوف میرے محترم دوست ڈاکٹر عبدالحی مرحوم کے داماد ہیں۔

سید نورالہدیٰ مرحوم کی کوٹھی جس میں وہ برابر قیام پذیر رہے ایک نہایت وسیع اور شاندار عمارت ہے۔ اس مکان میں موصوف نے تنہا رہ کر عرصہ تک زندگی بسر کی۔ ان دنوں "حیٔ کلینک" اسی عالی شان مکان میں قائم ہے۔ ڈاکٹر احمد عبدالحی کو اپنے نانا مسٹر سید محمد شریف سے یہ عالی شان مکان خاندانی ترکہ میں ملا ہے۔ اس کوٹھی کا احاطہ اس قدر وسیع ہے کہ آج کل "شریف کالونی" اس کے کمپاؤنڈ میں آباد کی گئی ہے اور اس حلقہ میں تقریباً تیس ۳۰ چالیس ۴۰ مکانات بنائے جا چکے ہیں۔

جج صاحب مرحوم آخر عمر میں ضعف پیری اور قویٰ کی کمزوری سے پریشان رہتے تھے اس زمانے میں بہت کم لوگ ان سے ملنے آتے اور صاحب موصوف راقم سے اپنی طویل العمری

اور پریشانیوں کی شکایت کیا کرتے تھے ۔ یکایک ۷ جون ۱۹۳۵ء کو دن کے چار بجے فالج کا حملہ ہوا اور رات کے آٹھ بجے ۸۱ برس کے سن میں جاں بحق ہوئے ۔ مرحوم نوری مسجد کے احاطہ میں مدفون ہوئے ۔ راقم اس زمانے میں لکھنؤ گیا ہوا تھا اور بدقسمتی سے ان کی تجہیز و تکفین میں شریک نہ ہوسکا ۔ دس پندرہ دنوں بعد ایک تعزیتی جلسہ ان کی موت پر پٹنہ یونی ورسٹی کے وھیلر سنیٹ ہال میں منعقد ہوا جس کی صدارت مسٹر جی ۔ ای ۔ فوکس ، ڈائرکٹر آف پبلک انسٹرکشنس بہار نے کی ۔ راقم اس جلسہ میں شریک تھا ۔ ہندو ، مسلمان اور انگریز سبھوں کو سید نورالہدیٰ صاحب کے مرنے کا بہت غم تھا ۔ پٹنہ میں راقم نے ایسا تعزیتی جلسہ بہت کم دیکھا ہے ۔ سید نورالہدیٰ صاحب کی موت کے ساتھ مسلمانوں کے ایک شاندار اور پر وقار دور کا خاتمہ ہو گیا ۔ اللہ مرحوم کو غریق رحمت کرے ۔

۲ ۔ استاد محترم ڈاکٹر عظیم الدّین احمد

ڈاکٹر عظیم الدین احمد صاحب مرحوم کی پیدائش گیا ضلع کے ایک قصبہ "قاضی سرائے امتھوا" میں ۲۵ جون ۱۸۸۰ء میں ہوئی تھی ۔ والد کی جانب سے آپ کا تعلق سہسرام کے ایک سجادہ نشین خانوادہ سے تھا ۔ اس خاندان کی دربار مغلیہ میں بڑی عزت تھی ۔ والدہ کی طرف سے آپ کا تعلق پٹنہ کے ایک ایسے خاندان سے تھا جس نے نہایت ہی ذی علم اور باوقار شخصیتوں کی پرورش کی ہے ۔ آپ کے نانا حکیم عبدالحمید پریشاں شہر کے ایک ممتاز طبیب ، ادیب اور شاعر تھے ۔ ڈاکٹر صاحب صرف سات ماہ کے تھے کہ ان کے والد شاہ واعظ الدین کا سایہ سر سے اٹھ گیا اور ان کی تعلیم و تربیت کی پوری ذمہ داری حکیم صاحب پر عائد ہوئی ۔ ابتدا میں عربی فارسی اور طب یونانی کی تعلیم اپنے نانا جان سے حاصل کی ۔ اس کے بعد محمڈن اینگلو عربک اسکول پٹنہ سیٹی میں داخل ہوئے ۔ جب اسکول کی تعلیم ختم ہوگئی تو پٹنہ کالج میں داخلہ لیا اور سائنس کے طالب علم ہوگئے ۔ اس زمانہ میں خان بہادر خدابخش خاں سی آئی ای نے انھیں اپنی لائبریری سے استفادہ کرنے کی ترغیب دی ۔ جب انھوں نے ان کے اندر صلاحیتیں دیکھیں تو مشہور مستشرق ڈاکٹر ایڈورڈ ڈینی سن روس سے جو بعد میں "سر" ہوئے ان کا تعارف

کرایا۔ سرایڈورڈ ردس نے ان کی علمی استعداد کے پیش نظر اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ میں عربی کے طبی مخطوطات کا کیٹلاگ تیار کرنے کی خدمت انھیں سپرد کی۔ آپ نے اس کام کو نہایت حسن وخوبی کے ساتھ انجام دیا۔ یہی وہ پہلا تحقیقی کام تھا جو ان کی شہرت کا سبب بنا، چنانچہ پروفیسر ای۔ جی۔ براؤن نے جو خطبات فریڈرک لکچرس کے نام سے انگلستان کے دانش کدہ اطبا میں دیئے تھے ان میں انھوں نے ڈاکٹر صاحب کا تذکرہ اس کیٹلاگ کے سلسلہ میں توصیفی کلمات کے ساتھ کیا تھا۔ ان توسیعی خطبات کی اشاعت کیمبرج یونیورسٹی نے نہایت ہی آب و تاب کے ساتھ کی تھی۔ سر ایڈورڈ ڈینی سن روس نے ان کی ٹھوس علمی صلاحیتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے یورپ میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے حکومت ہند سے وظیفہ دلوایا۔ ڈاکٹر صاحب اپنے انٹرویو کے سلسلے میں سلکشن کمیٹی کا حال نہایت ہی دلچسپ انداز میں سنایا کرتے تھے۔ اکسپرٹ کی حیثیت سے سرروس خود موجود تھے۔ آپ سے سرروس نے پوچھا کہ تمھارے خاندان میں عربی داں کون کون لوگ تھے؟ آپ نے خاندان صادق پور کے عربی دانوں کی ایک لمبی فہرست پیش کی۔ اس پر سرروس کا چہرہ غصہ سے سرخ ہوگیا اور وہ پنسل جو اُن کے ہاتھ میں تھی اسے اپنے دانتوں میں دبالی اور چپ ہوگئے۔ ڈاکٹر صاحب نے وجہ بھانپ لی۔ بات یہ تھی کہ بزرگانِ صادق پور وہابی تحریک میں پیش پیش تھے اور سرکار برطانیہ ان لوگوں کو حکومت کا دشمن قرار دے چکی تھی۔ آپ نے بات بدل کر دو اور نام جعفری برادران کے لیے جن میں ایک صاحب کلکتہ میں پروفیسر تھے اور دوسرے الٰہ آباد میں پروفیسر تھے۔ ان دونوں کو حکومت برطانیہ نے "شمس العلماء" کا خطاب عطا کیا تھا۔ یہ سن کر سرروس نے اپنے دونوں ہاتھوں کو میز پر مار کر کہا کہ یہی دونوں اصلی عربی داں ہیں۔ پہلے جن لوگوں کا نام تم نے لیا تھا ان کو عالم کہنا علم کی توہین کرنا ہے۔ ڈاکٹر ہیرو وٹز نے جو علی گڈھ کالج میں عربی کے پروفیسر تھے اور کمیٹی میں دوسرے اکسپرٹ تھے ڈاکٹر صاحب کی مخالفت کی مگر ممبران کمیٹی نے ڈاکٹر صاحب ہی کو وظیفہ سے سرفراز کیا۔ ۱۹۱۲ء میں ڈاکٹر صاحب نے جرمنی کی مشہور یونیورسٹی لپزگ یونیورسٹی میں داخلہ لیا اور اس نامور یونیورسٹی میں آپ نے چند نامی مستشرقین اور مفکرین یعنی (۱) ڈاکٹر اوگسٹ فشر (۲) پروفیسر ولیم ونڈٹ، (۳) پروفیسر زیمرین (۴) پروفیسر ہانس اسٹوما سے علم لسانیات اور فلسفہ کی تعلیم حاصل کی۔ یہ لوگ اپنے وقت کے یورپ کے مشہور اساتذہ میں تھے۔ چند سال بعد پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری

امتیاز کے ساتھ حاصل کی۔ آپ کا تحقیقی مقالہ "شمس العلوم" "گب میموریل سیریز میں شائع ہوا۔ اور آپ پہلے ہندوستانی تھے جن کا مقالہ "شمس العلوم" اس ادارہ سے شائع ہوا۔ ڈاکٹریٹ کرنے کے بعد ڈاکٹر صاحب لندن آئے اور ایک سال تک یونیورسٹی کالج لندن میں عربی کے پروفیسر کی حیثیت سے خدمت انجام دی۔ ہندوستان آنے پر پانچ سال تک پنجاب یونیورسٹی لاہور میں بحیثیت عربی کے پروفیسر بحسن وخوبی اپنے فرائض کو انجام دیا۔ ۱۹۲۰ء میں پٹنہ کالج میں عربی فارسی اور اردو کے صدر شعبہ مقرر ہوئے اور اپنے کاموں کو سولہ سال تک نہایت خوبی سے انجام دیتے رہے۔ ۱۹۳۶ء میں ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔ ۱۹۴۹ء میں آپ نے وفات پائی۔

۱۹۲۱ء میں والد مرحوم بحیثیت ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ سنسکاآپریشن بہار چھ ماہ کے لیے سرکار کی طرف سے پٹنہ میں تعینات ہوئے۔ ہم لوگوں کا قیام راجہ بھوپ بہادر کے مکان میں جو گلزار باغ گورنمنٹ پریس بہار کے متصل ہے ہوا۔ پٹنہ آنے کے چند ہی روز بعد والد مرحوم نے مجھ سے کہا کہ اپنے چچا سے ملنے کے لیے چلو۔ مجھے کچھ تعجب سا ہوا کہ یہ کون سے چچا ہیں جن کا نام بھی مجھے بتایا نہیں گیا ہے۔ میں شیروانی، ٹوپی پہن کر والد صاحب کے ساتھ ہولیا۔ ان کے ہمراہ خواجہ کلاں پہنچا۔ خواجہ کلاں کی گلی میں دریا کے قریب ایک مسجد ہے۔ اس کے پہلو میں ایک تنگ گلی نظر آئی جس میں ہم لوگ داخل ہوئے اور ایک پرانے قسم کے مکان میں گئے۔ باہر برآمدے میں ایک بڑی میز اور چند کرسیاں رکھی ہوئی تھیں۔ ایک کرسی پر چالیس سال عمر کے ایک خوش وضع شخص لنگی اور گنجی میں ملبوس نظر آئے۔ والد صاحب نے مجھے حکم دیا کہ جھک کر سلام کرو۔ یہ تمھارے محترم چچا ڈاکٹر عظیم الدین احمد ہیں۔ کوئی چار سال پر والد صاحب سے ڈاکٹر عظیم الدین احمد صاحب کی ملاقات ہو رہی تھی، اس لیے مختلف قسم کی باتیں ہوتی رہیں۔ میں اس وقت اسکول کا طالب علم تھا، اور بزرگوں کی باتوں میں کوئی دل چسپی نہ تھی۔ چپ چاپ کچھ دیر تک بیٹھا رہا اور دل میں سوچتا رہا کہ یا اللہ کب تک میری اس طور کی سزا ہوتی رہے گی۔ اللہ نے میرے حال پر رحم کیا۔ نظر اٹھا کر دیکھا تو مکان کے صحن میں ایک ٹھٹھری بلندی پر لگی ہوئی تھی جس پر اچھے اچھے کبوتر بیٹھے ہوئے تھے۔ مجھے کچھ کبوتروں میں دل چسپی تھی۔ نظر اٹھا کر دیکھا تو گرہ باز کبوتریں بھی تھیں۔ گھر کے کسی نوکر نے میرے اس شوق کو دیکھ کر چند کبوتروں کو اڑایا اور مجھے گرہ بازی کا نظارہ دیکھنے میں آیا۔ اس دوران والد

صاحب اور ڈاکٹر عظیم الدین صاحب کی ملاقات ختم ہو چکی تھی اور ان لوگوں کے ساتھ میں بھی اٹھ گیا۔ ڈاکٹر عظیم الدین صاحب نے زور سے میرے کاندھے پر ہاتھ مارا اور فرمایا کہ مجھے بھی کبوتروں کی گرہ بازی دیکھنے کا شوق ہے۔ استاد محترم سے یہ ہماری پہلی ملاقات تھی۔ علم وغیرہ تو میری سمجھ سے اس وقت باہر کی بات تھی، مگر یہ خوشی ضرور ہوئی کہ چچا کو کبوتروں کا شوق ہے اور میں انشاءاللہ ان سے کوئی اچھا گرہ باز کبوتر ضرور حاصل کروں گا اور پھر ہم لوگ گھر واپس چلے آئے۔

اس ملاقات کے قریب دو ہفتہ بعد استاد محترم سے پھر ملاقات ہوئی۔ اتوار کا دن تھا، قریب گیارہ بجے ہم لوگوں کے بنگلہ کے سامنے ایک پالکی گاڑی آکر رکی۔ اس گاڑی سے استاد محترم اترے۔ ہم لوگوں نے ان کا استقبال کیا اور والد صاحب کے ڈرائنگ روم میں لاکر بٹھایا۔ مولوی محمد رفیع اور میرے انگریزی پڑھانے والے پرائیویٹ ٹیوٹر ناٹک پرشاد بی۔ اے، استاد محترم کے ساتھ آکر بیٹھ گئے، اور میں نے والد صاحب کو ان کی آمد کی اطلاع کر دی۔ والد صاحب بھی فوراً ڈرائنگ روم میں آگئے، اور مختلف قسم کے موضوعات پر گفتگو ہونے کے بعد والد صاحب کے اصرار پر استاد محترم نے اپنی دو نظمیں سنائیں، ایک کا عنوان "تاثیر درد" اور دوسرے کا عنوان "سفر لندن" تھا۔ استاد محترم اپنے اشعار بہت کم لوگوں کو سنایا کرتے تھے اور جب سناتے تھے تو ایک خاص انداز ہوتا تھا۔ ان کے پڑھنے کا ایک مخصوص انداز تھا جو بڑا موثر تھا، خصوصاً ایسی نظمیں جن میں قومی یا ملی نقطۂ نظر کی وضاحت ہوتی تھی۔ "تاثیر درد" سر محمد اقبال کے کہنے پر ان کی نظم "تصویر درد" کے طرز پر لکھی گئی تھی، جس کے قوافی اور ردیف بھی یکساں تھے۔ ہم سب لوگوں نے اس نظم کو سنا۔ والد صاحب نے بے حد پسند کیا۔ خصوصاً یہ چند اشعار میرے ذہن میں اب تک گھر کیے ہوئے ہیں: ؎

زباں تو سر سے پہلے کٹ چکی ناخن سلامت ہیں
دلوں میں نیل ڈالیں یا الٰہی چٹکیاں میری
جو دل پر مہر ہو، آنکھیں ہوں اندھی کان بہرے ہوں
نہ کیوں اس حال میں پھر عمر جائے رائیگاں میری

اس نظم کے بعد نظم "سفر لندن" کو پڑھ کر سنایا۔ یہ نظم بحری سفر میں جب کہ سمندر میں تلاطم تھا لکھی گئی تھی۔ جہاز کے ڈگمگانے کا اور دیگر مناظر کی پرکیف تصویر کھینچی ہے۔ شاید

اس سے بہتر سمندری سفر کی تصویر نہیں کھینچی جاسکتی ہے۔ اس شعر کو لوگوں نے خوب پسند کیا:

افق پر آمدِ خورشید سے چھائی ہوئی لالی
وہ موجیں کف بلب، بیچین، ہم آغوش، متوالی

اس نظم میں اہلِ لندن کے ناچ کو بڑے دل چسپ انداز میں پیش کیا ہے ع

وہ بندر کی طرح سے ناچنا یارانِ لندن کا

اس میں بندر کے ناچ کی تشبیہ سے مولوی محمد رفیع اور منشی نانک پرشاد بی۔اے پر ایک وجدانی کیفیت طاری ہوگئی اور مولوی محمد رفیع نے گواہی دی کہ میں نے کلکتہ کے گرینڈ ہوٹل میں انگریزوں کو اسی طرح ناچتے دیکھا ہے۔ مولوی محمد رفیع ایک دل چسپ شخصیت کے مالک تھے۔ محکمۂ ڈاک و تار کی ملازمت مسٹر جسٹس اٹکنسن (Atkinson) جج پٹنہ ہائی کورٹ سے لڑ کر ترک کر دی تھی اور باقی عمر مختلف مشاغل میں میرے والد صاحب کے یہاں رہ کر گذار دی۔ اس زمانے میں ترکِ موالات کی تحریک کا بڑا زور تھا۔ مختلف قسم کے گانے اور اشعار مختلف زبانوں میں ان لوگوں کے خلاف لکھوا کر شہروں اور بازاروں میں پڑھوائے جاتے تھے۔ جن کو ہمدردِ سرکار سمجھا جاتا تھا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ وہ لوگ جو تحریکِ ترکِ موالات سے الگ تھے ان کی تحقیر ہو۔ ایسی نظمیں بہ عنوان "وکیلوا" "دروغوا" "ڈپٹیا" "زمیندروا" وغیرہ وغیرہ ہر جگہ ہندی اور اردو میں تقسیم ہوا کرتی تھیں۔ مولوی محمد رفیع گرچہ ایک انگریز ہی کی وجہ سے ملازمت ترک کرنے پر مجبور ہوئے تھے مگر اکثر انگریزوں کے بڑے طرفدار ہوجاتے تھے اور ان متذکرہ بالا نظموں کے جواب میں جو نظمیں لکھی جاتی تھیں اسے اپنے پاس محفوظ کر لیتے تھے۔ چنانچہ اپنی جیب سے ایک نظم جو انھیں اسی دن موصول ہوئی تھی نکال کر استادِ محترم کے سامنے پڑھنا شروع کیا۔ اس نظم کے چند اشعار اب تک مجھے یاد ہیں، کیونکہ ۱۹۴۶ - ۱۹۴۷ء میں ملک میں ایسے واقعات رونما ہوئے اور کانگریسیوں کے طفیل میں ہندوستان کی درگت بن گئی اور ملک تقسیم ہوگیا:

کانگریسیا تورے کارن واں چل جئے ہیں تلوار
مسلمنوا لڑھئے، ہندوا لڑھئے اور لڑھئے کرستان
اور ہوگی بڑی مار

اس روز کی یہ صحبت اسی طرح کی خوش گپی میں ختم ہوئی اور چلتے وقت مولوی محمد رفیع کو دس گولیاں

تمباکو کی جسے استاد محترم اپنے پان میں کھانے کے لیے لکھنؤ سے منگواتے تھے، عطا کیں۔ یہ دستور زندگی بھر قائم رہا۔

شاعری سے ڈاکٹر صاحب کو گہرا لگاؤ تھا اور یورپ سے واپس آنے پر ان کی شاعری میں ہر طرح سے یورپین اثرات ظاہر ہونے لگے تھے۔ ان کی اکثر نظمیں انگریزی اثرات کی حامل ہیں اور یہ اثر فکر اور فن دونوں پر غالب ہے۔ ہیئت اور فورم میں بھی اثرات نمایاں ہیں۔ ڈاکٹر صاحب ان چند ابتدائی لوگوں میں ہیں جنھوں نے اردو شاعری کو مغربی طرز فکر اور ہیئت سے نئی جہتیں دیں۔ آپ کا مجموعہ کلام "گل نغمہ" ایسے نئے ادبی تجربات کا ایک صحیفہ ہے۔ گرچہ وہ ایک اچھے شاعر تھے مگر وہ کبھی کسی مشاعرے میں نہیں جاتے تھے۔ اس دور کے شاعروں میں حضرت شادؔ عظیم آبادی کی شہرت تھی وہ ڈاکٹر صاحب سے عمر میں بڑے تھے مگر شاد صاحب بھی آپ کی عزت کیا کرتے تھے اور اکثر اپنے کلام کو انھیں سنایا کرتے تھے۔ ایک روز حضرت شادؔ ڈاکٹر صاحب سے ملنے آئے اور یہ شعر پڑھا ؎

سُنی حکایتِ ہستی تو درمیاں سے سُنی
نہ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم

ڈاکٹر صاحب تھوڑی دیر چپ رہے اس کے بعد انھوں نے حضرت شاد سے دریافت کیا کہ انسان حکایت ہستی کو کس سے سنتا ہے؟ یہ تو خود اس کے مشاہدات ہیں اگر اس شعر کو یوں کہا جاتا تو اچھا ہوتا: ؎

کھلی جو آنکھ تو رو میں تھی کشتیٔ ہستی
کہاں سے آئی کدھر جائے گی خدا معلوم

حضرت شادؔ نے ڈاکٹر صاحب کے اس شعر کو بہت پسند کیا۔

ڈاکٹر صاحب اقبال کی شاعری کے ثنا خواں تھے اور ان کی اکثر نظموں پر اقبال کے تاثرات موجود ہیں۔ ڈاکٹر صاحب پانچ برسوں تک لاہور کالج میں اقبال کے شریک کار رہے اور دونوں میں دوستانہ تعلقات گہرے تھے۔ اقبال کی وفات کی خبر سن کر استاد محترم رو پڑے اور ایک نظم بعنوان "انسان" عالم تحریر میں آئی:

انسان اور اطاعت ماحول افترا　　　آیا ہے اپنی آپ یہ دنیا لیے ہوئے

ہے دیکھنے میں ذرہ پہ صد مہر در بغل — وحدت ہے اس کی کثرت اشیا لیے ہوئے
ظاہر میں ایک پھول پہ صد گلستاں بجیب — بالفعل قطرہ ، بالقوہ دریا لیے ہوئے
معماریِ جہاں تو اس کی ہے زندگی — موت اس کی ہے حیات کا چشمہ لیے ہوئے

کس کی مجال ہے کہ اسے دیکھ کر کہے
آیا ہے اپنے ساتھ یہ کیا کیا لیے ہوئے

استاذ محترم کی ایک "حمد" ملاحظہ ہو :

احد کہیے تجھے اور خالقِ ارض و سما کہیے — ترے سب نام اچھے جو تجھے کہیے بجا کہیے
امیروں پر کرم تیرا غریبوں کا ہے تو یاور — تجھی کو قوتِ بازوئے بے برگ و نوا کہیے
جو صنعت ہائے گوناگوں سے عالم کو ہے زیبائش — تری کاریگری کی اس کو اک ادنیٰ ادا کہیے
الٰہی تو نے ہم لوگوں کی تلقین و ہدایت کو — نبی بھیجا وہ جس کو خاتمِ کل انبیا کہیے
ترے بھیجے ہوئے پر سب ہوں جان و مال سے شیدا — یہ کیسا جذب تھا یارب اسے کہیے تو کیا کہیے
یکایک شرک و بدعت اس طرح عالم سے مٹ جائے — نہ کہیے معجزہ قرآن کا اس کو تو کیا کہیے

عرب کا بغض و کینہ یوں اخوت سے بدل جائے
خدایا ! اِک کرشمہ اس کو تیرے رحم کا کہیے

آزادی کیا ہے ؟ اس کے متعلق استاذ محترم کی نظم ملاحظہ ہو :

آزادی کیا ہے ؟ کون ہے وہ آزاد رہا جو عالم سے ؟
آزاد کہاں ہیں ہم تم سے ؟ آزاد کہاں ہو تم ہم سے ؟
یہ ناممکن ، کوئل کی جب تک چیت میں ہر جا کوکو ہو
یا سارنگی کی نوا میں خواب آور اک جادو ہو ؟
یہ ناممکن موجوں کے جب تک رات کو ہوں ہلکے حلقے
اور دائیں بائیں کشتی کے ، بیخود ہوں ترنم ریزی سے
ممکن نہیں جب تک چاند کی کرنیں آڑی ترچھی گرتی ہوں
ہند اور عرب کے شہروں کی خاموش چھتوں پر پھرتی ہوں
ممکن نہیں ، جب تک بجلی کی بارش میں صدا طغیانی ہو

طیاروں کو گھر لانے میں اس مشغل سے آسانی ہو
ایامِ بہار روشب کی نوا اور وہ بھی موج دما دم سے
آزادی کیا ہے؟ کون ہے وہ آزاد رہا جو عالم سے؟
آزاد کہاں ہیں ہم تم سے؟ آزاد کہاں ہو تم ہم سے

استادِ محترم کا خیال تھا کہ اردو کی ترویج اور ترقی کے لیے یہ ضروری ہے کہ ہمیں مختلف زبان و ادب کا عموماً اور مغربی ادب کا خصوصاً مطالعہ کرنا چاہیے۔ اگر براہ راست ایسے ادب تک رسائی نہ ہو سکے تو تراجم سے استفادہ بھی مفید ثابت ہوگا۔

ڈاکٹر صاحب کو فنونِ لطیفہ میں موسیقی سے خاص دل چسپی تھی اور یہ دل چسپی مشرقی اور مغربی دونوں طرح کی موسیقی سے تھی۔ اس موضوع پر بھی ان کا اچھا خاصہ مطالعہ تھا اور انھیں مختلف قوموں کی موسیقی کی تاریخ سے واقفیت تھی اور اس کی تکنیک کو بھی جانتے تھے۔ اسپین کے دورانِ قیام میں اسپینی موسیقی کو بھی سننے کا انھیں اکثر اتفاق ہوا تھا۔ اس میں جو عربی اثرات اب تک باقی ہیں اس کا ذکر کیا کرتے تھے۔

ڈاکٹر صاحب میانہ قد اور خوش رو شخص تھے۔ رنگ صاف، کھڑا نقشہ اور کڑی کڑی مونچھیں تھیں۔ حج کے بعد فرنچ کٹ ڈاڑھی بڑھائی تھی۔ آنکھوں میں تھوڑی سرخی تھی اور ایک پیر میں ہلکی سی لغزش تھی جس کو وہ لغزشِ مستانہ سے تعبیر کیا کرتے تھے۔ گھر سے جب بھی باہر جاتے تو سوٹ میں ملبوس ہوتے۔ جامہ زیبی کا یہ حال تھا کہ جو بھی لباس زیبِ تن کرتے اچھا معلوم ہوتا تھا۔ جاڑوں میں نیلے رنگ کا سرج کا سوٹ پہنتے اور گرمیوں میں بادامی رنگ کا ریشمی سوٹ استعمال کرتے تھے۔ کبھی کبھی ہم لوگوں سے ہنس کر کہتے کہ دیکھو یہ جو تا دس سال پرانا ہے اس سوٹ کو میں نے بارہ سال پہلے کلکتہ کے مشہور انگریز خیاط "ہارمن" کے یہاں سلایا تھا۔ اپنے اوور کوٹ کے بارے میں بتاتے کہ اسے بیس سال پہلے جرمنی میں بنوایا تھا۔ سفید رنگ کی انگریزی ٹوپی جس کو برابر استعمال کرتے تھے اسے پندرہ سال پہلے آرمی اینڈ نیوی اسٹورس کلکتہ سے منگوایا تھا۔ ہم لوگوں کے بہت اصرار پر اس ٹوپی کو بدل کر ایک نئی ٹوپی کلکتہ سے منگائی تھی۔ ڈاکٹر صاحب کے ذاتی استعمال کی کل چیزیں استعمال میں رہتے رہتے آثارِ قدیمہ کی حیثیت اختیار کر چکی تھیں۔ معلوم نہیں کس سلیقہ سے یہ کپڑے استعمال کیے جاتے تھے کہ وہ پرانے

نہیں معلوم ہوتے تھے۔ اس قسم کی زندگی بسر کرنے والے امتیازی لوگ ہوتے ہیں جن کی ہر شخص قدر کرتا ہے اور عقل والے ان کے نقش قدم پر چلتے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب بڑی حد تک قدامت پسند تھے۔ اس کا اظہار ان کے رہن سہن طور طریقہ، اور بات چیت سے ہوا کرتا تھا۔ "یورپ زدگی" کا کہیں نام و نشان نہ تھا۔ ایک نئی دو منزلہ پختہ عمارت جب اپنی رہایش کے لیے تعمیر کرائی تو اس کو بھی پرانے قسم کے فرنیچر سے آراستہ کیا۔ عمارت کی طرز تعمیر بھی پرانی تھی۔ جب تک موٹر کار نہیں خریدی روزانہ ایک پرانی قسم کی پالکی گاڑی پر کالج آتے تھے اور اس کا کوچ مین بھی پرانے زمانے کی یادگار تھا۔

ڈاکٹر صاحب فطری طور پر کم آمیز تھے مگر جس سے ملتے تھے بہت خلوص اور محبت سے ملتے تھے۔ اخلاق اور مروّت کی تمام قدریں ان کے اندر موجود تھیں۔ دوستوں سے بہت کھل کر ملتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ جو بھی ان سے ایک بار ملتا ان کا گرویدہ ہو جاتا تھا۔ ان کی شخصیت ظاہری اور باطنی دونوں حیثیت سے دل چسپ تھی۔ بے حد نرم مزاج اور نرم گفتار انسان تھے۔ دوستوں اور شاگردوں کا ان کے پاس جمگھٹا رہتا تھا۔ وہ ادبی، سماجی، تاریخی، مذہبی غرض ہر موضوع پر گفتگو کرتے تھے۔ انداز بیان اتنا دل چسپ ہوتا تھا کہ ہر شخص محو ہو جاتا تھا۔ ڈاکٹر صاحب کی گھریلو زندگی سے کم لوگ واقف ہیں۔ چونکہ وہ میرے والد مرحوم کے عزیز دوستوں میں تھے اور میں ان سے بہت ملتا رہتا تھا اس لیے میں بہت سی باتوں سے واقف تھا۔ ان کی نجی زندگی بالکل درویشانہ تھی۔ چوبیس گھنٹوں میں صرف ایک بار کھاتے اور کھچڑی ان کی مرغوب غذا تھی۔ رات کو ایک بسکٹ، ایک انڈا اور "اوکسو" سے تیار کیا ہوا ایک پیالی سوپ پیا کرتے تھے۔ اپنی اولاد سے ان کو والہانہ محبت تھی اور ان کے ہر خرچ کو نہایت خوشی سے برداشت کرتے۔ اہلیہ مرحومہ کی وفات کے بعد ان کو برابر یاد کرتے تھے۔ اپنے آرام سے زیادہ دوسروں کے آرام کا خیال رکھتے تھے۔ زندگی بھر ایک پرانی مسہری پر سوئے اور اس پر کبھی کوئی تکلیف محسوس نہیں کی۔ اپنی کمائی کا ایک بڑا حصہ اپنے ضرورت مند رشتہ داروں پر صرف کرتے تھے۔ ان کے مرنے سے دو ہفتہ پہلے جب میں ان سے ملا تو ان کو دیکھا کہ اندرون حویلی ایک معمولی تخت پر لیٹے ہوئے تھے اور اس میں کوئی تکلیف محسوس نہیں کر رہے تھے۔ "کھانے، سونے، بولنے" تینوں چیزوں میں ڈاکٹر صاحب درویشی کے معیار پر پورے اترتے تھے۔ وہ واقعی اپنے زمانے کے لیے برکت تھے۔ ان کی شخصیت

میں بے پناہ محبت تھی، ایسی محبت جو سب لوگوں کے لیے یکساں ہو جو سب کو اپنا سمجھے اور سب کا بھلا چاہے۔ میری غیر مستقل مزاجی سے اکثر ناراض ہو جاتے تھے اور مجھے اچھی نصیحت کیا کرتے تھے جس سے مجھے اپنی زندگی میں بہت مدد ملی اور میری زندگی کامیاب رہی۔ وہ مجھے اپنی اولاد کی طرح سمجھتے تھے اور میں نے بھی زندگی بھر کوئی بات ان کی مرضی کے خلاف نہیں کی اور یہ میرے لیے باعث فخر ہے۔

ڈاکٹر صاحب عقیدے کے لحاظ سے اعتدال پسند تھے اور کسی دوسرے فرقے اور عقیدہ والوں سے نفرت نہ کرتے تھے۔ مذہب کا تصور ان کے نزدیک واضح تھا۔ وہ تنگ نظری کے شکار نہ تھے۔ نماز پڑھا کرتے تھے مگر پوشیدہ طریقے سے، نہایت خشوع اور خضوع کے ساتھ عبادت کرتے۔ ۱۹۳۷ء میں اللہ نے انھیں حج اور زیارت مدینہ کا شرف بخشا۔ حج کے لیے روانگی کے وقت جہاز میں وہ "امیر الحج" مقرر ہوئے اور حجاج کرام کے آرام کا سامان ہر طرح سے مہیا کیا۔ حج کے سلسلہ میں ان کے ساتھ ایک قابل ذکر واقعہ یہ ہوا جسے وہ بار بار بیان کرتے تھے، ان کی اکثر یہ تمنا رہتی تھی کہ مسجد نبوی میں "مواجہہ رسول" کے سامنے تخلیہ میں سلام و درود کا موقع مل جائے مگر یہ کوئی آسان کام نہ تھا اس لیے کہ وہاں ہر وقت لوگوں کا ازدہام لگا رہتا تھا۔ مگر لگن سچی ہو تو سب کچھ حاصل ہو جاتا ہے۔ چنانچہ مدینہ سے واپسی کے وقت بالکل غیر متوقع طور پر انھیں یہ موقع مل گیا۔ جب وہ درود و سلام میں مصروف تھے تو رقت طاری ہو گئی اور انھیں ایسا محسوس ہوا کہ ان کی ساری جسمانی قوت سلب ہو چکی ہے اور ان کے لیے اٹھنا محال ہے۔ لگتا تھا کہ کسی نے ان کے پیروں کو پکڑ لیا ہے۔ جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا ہے وہ ہر فرقہ کے لوگوں سے محبت کرتے تھے اور ساتھ ہی ان کا احترام بھی۔ اسی خیال کے مد نظر انھوں نے سنسکرت پڑھی اور وید کے پسندیدہ اشلوک کو نہایت ذوق کے ساتھ سنایا کرتے تھے۔ قرآن کی رو سے ہر قوم کے لیے اللہ نے ہادی بھیجا ہے۔ اسی خیال کے تحت وہ ہندوستان کے لیے سری کرشن جی کو اپنے وقت کا ہادی سمجھتے تھے اور ان سے ایسی عقیدت تھی کہ انھوں نے اپنے تاثرات کو ایک نظم میں پیش کیا۔ وہ کہا کرتے تھے کہ سری کرشن جی موحد تھے اور بت پرست برہمنوں نے بعد میں گوپیوں کی داستانیں ان سے منسوب کر کے ان کے کردار کو مسخ کر دیا۔ شاید یہ توحید اور بت پرستی کی رقابت کے جذبے کے تحت ایسا کیا گیا ہے۔ وہ قرآن کے شیدائی تھے اور اس کا انھوں نے گہرا مطالعہ

کیا تھا۔ تفسیر سے بھی ان کا خاص لگاؤ تھا۔ اکثر کہا کرتے تھے کہ قرآن کو پڑھنے کے ساتھ توریت اور انجیل کو بھی پڑھنا چاہیے اس لیے کہ بہت سے واقعات جن کا اشارہ قرآن میں ہے سمجھ میں آجاتے ہیں اور قرآن کی فوقیت بھی ثابت ہو جاتی ہے۔ قرآنی موضوعات پر وہ تحقیقی کاموں میں مشغول رہتے تھے اور ان ہی مشغولیتوں کا نتیجہ تھا کہ ان کی تین ضخیم کتابیں عربی زبان میں عالم وجود میں آئیں۔

(۱) رسالۃ فی الاخبار الصادقۃ فی القرآن عن المغیبات (۲) رسالۃ فی تنظیمات قریش فی مکۃ قبل بعثۃ رسول اللہ صلعم (۳) رسالۃ مسمی القواعد السیاسۃ الھیئۃ الصمد الخلافت النبویۃ۔

ڈاکٹر صاحب کو سیاست سے کم لگاؤ رہا۔ اپنی گفتگو میں جمال الدین افغانی کا نام بڑی عزت سے لیتے تھے اور ان کی اسلامی تحریک کے بڑے مداح تھے اس عہد میں پان اسلامزم (Pan Islamism) کا بڑا زور تھا اور اس کی گوناگوں سرگرمیوں سے مسلم دانشوروں میں سرور وکیف کے جذبات امڈے پڑتے تھے۔ ڈاکٹر صاحب بھی اس تحریک سے دلچسپی رکھتے تھے اور فرمایا کرتے تھے کہ تمام مسلم ممالک جو ابھی یورپی تسلط کے ماتحت بے بس اور مجبور ہیں ایک دن آزاد ہو جائیں گے اور اپنے سیاسی، تہذیبی اور سماجی مقاصد کی تکمیل میں کامیابی حاصل کریں گے۔ وہ ہمیشہ اس بات کے متمنی تھے کہ یہ مسلم ممالک خارجی طاقتوں کی پابندیوں سے جلد آزاد ہو کر آپس میں متحد ہو جائیں اور ایک محکم واستوار ملک قائم کریں۔ گرچہ اکثر باتوں میں وہ انگریزوں کے قدرداں تھے مگر مجموعی طور پر اسلامی دنیا میں ان کا جو سیاسی کردار رہا ہے اور مسلمانوں کو ان سے جو اذیتیں پہنچی ہیں ان سے انگریزوں کو مسلمانوں کا سب سے بڑا دشمن سمجھتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ تاریخ شاہد ہے کہ جتنا نقصان عظیم انگریزوں کے ہاتھوں مسلمانوں کو ہوا ہے اتنا کسی دوسری قوم سے نہیں ہوا ہے۔ جرمن قوم کے وہ نہایت مداح تھے۔ جرمن قوم کے کردار اور مزاج کو سمجھنے کا موقع انھیں بہت ملا تھا اور وہ جرمن قوم کی محنت اور سائنسی تجربات میں سارے عالم میں ان کی پیش قدمی سے بہت متاثر تھے اور کہا کرتے تھے کہ اگر جرمن قوم ختم ہو جائے تو سائنس کی دنیا میں جو نئے تجربات اور ترقیاں ہو رہی ہیں وہ یک سر ختم نہ بھی ہوں مگر اتنا ضرور ہوگا کہ ان میں جدت اور ترقی باقی نہ رہے گی۔ اکثر کہا کرتے تھے کہ جرمن قوم کو دنیا مٹا نہیں سکتی ہے کیونکہ اس قوم میں ابھرنے کی فطری صلاحیت موجود ہے اور ان کا یہ بھی خیال

تھا کہ روس کا دنیا پر چھا جانا مسلمانوں کی تباہی اور ہلاکت کا باعث ہو سکتا ہے۔ امریکن قوم کو نہایت خود غرض قوم کہا کرتے تھے جس کے وعدوں پر کبھی بھروسہ نہیں کیا جا سکتا ہے۔ ان کا عقیدہ تھا کہ قوموں کی جنگیں ناگزیر ہیں اور اسی میں قوموں کی ترقی کا راز پنہاں ہے۔

ڈاکٹر صاحب میرے والد مرحوم کے دوستوں میں تھے۔ کالج میں داخلہ لینے سے پہلے مجھے دو تین بار ان سے ملاقات کا شرف حاصل ہو چکا تھا۔ میں نے جولائی ۱۹۲۴ء میں پٹنہ کالج میں بی اے آنرس فارسی میں داخلہ لیا اور چار سال تک ان کے لکچرس میں شریک ہوتا رہا۔ اس زمانے میں ڈاکٹر صاحب بی۔ اے اردو کمپوزیشن کا کلاس بھی لیا کرتے تھے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ فارسی کلاس سے پہلے میں نے اردو کمپوزیشن کے کلاس میں شرکت کی تھی۔ وہ دو برسوں تک کمپوزیشن کا کلاس لیتے رہے اور میں ہمیشہ ان کے لکچرس میں بلاناغہ شریک ہوتا رہا۔ میں نے ان لکچرس کو اپنے لیے نہایت سودمند پایا۔ طلبا کی سہولت اور ادب کی تاریخ کے ادوار کو ذہن نشیں کرانے کی خاطر انھوں نے اردو کی تاریخ کو چند ادوار میں تقسیم کیا تھا اور اس کے مطابق وہ درس دیا کرتے تھے۔ چوں کہ ان کی طبیعت نظم کی طرف زیادہ راغب تھی اس لیے وہ اردو شاعری ہی کو زیادہ تر اپنی تدریس کا موضوع بناتے تھے اور آخری لکچرس میں اردو نثر پر بھی ناقدانہ نظر ڈالتے تھے۔ میرؔ، ذوقؔ، مومنؔ، غالبؔ اور داغؔ کے اشعار کی نہایت ہی عالمانہ انداز میں شرح کرکے ان کے فنی و ادبی پہلوؤں کو اجاگر کرتے اور ان کے شعری و ادبی محاسن پر تنقیدی نظر ڈالتے۔ ایسے طریقہ تدریس سے طلبا میں ادب کا ذوق پیدا ہونا فطری تھا۔ ان شعرا کے علاوہ انھوں نے مجھے خوب یاد ہے حالیؔ، اکبرؔ اور اقبالؔ کی شاعرانہ حیثیت پر بھرپور انداز میں اظہار خیال کیا تھا اور ان کے شاعرانہ اوصاف بیان کرتے تھے۔ حالیؔ کے پس منظر میں اکبرؔ اور اقبالؔ کی شاعرانہ عظمتوں کا انکشافات کرتے۔ اقبالؔ کے بڑے معترف تھے اور ان کی ہمیشہ مدح سرائی کرتے تھے۔ مختصر یہ کہ دو برس کی قلیل مدت میں اردو ادب کی تاریخ کا مکمل جائزہ طلبہ کے لیے بڑا ہی سودمند ہوتا اور اردو ادب کی پوری تاریخ ہمارے سامنے جلوہ گر ہو جاتی تھی۔ افسوس ہے کہ یہ لکچرس قلم بند نہ ہو سکے۔

ڈاکٹر صاحب فارسی کے آنرس کلاس میں ہم لوگوں کو قصاید خاقانی اور محمود شبستری کی "گلشن راز" جو اصول تصوف کی ایک جامع مثنوی ہے، پڑھاتے تھے۔ "تفکر، امر وحدت،

خودشناسی، انا الحق، ممکن وواجب، قدیم ومحدث، جزوکل" کے سوالات اس میں حل کیے گئے ہیں اور اکثر مسائل جو اس مثنوی میں بیان کیے گئے ہیں، ہم لوگوں کی سمجھ سے باہر تھے، مگر ڈاکٹر صاحب تصوف کے افکار وخیالات کے مصطلحات سے آشنا کراتے، پھر بھی وہ کہتے تھے کہ یہ تصوف کا کارنامہ ہے اور میں صوفی نہیں ہوں۔ میں نے تو پوری تشریح کردی، مگر "گلشن راز" راز ہی رہے گا۔ آج کل یہ مثنوی کسی یونیورسٹی کے بی۔اے کورس میں داخل نہیں ہے کیوں کہ آج کے نوجوان اس کو سمجھنے سے قاصر ہیں۔ ہم لوگوں کو قصاید قاآنی بھی پڑھایا کرتے تھے مگر وہ قاآنی کی شاعرانہ اہمیت کے قائل نہ تھے۔ ان کی نظر میں قاآنی کے قصیدوں میں وہ ساری خوبیاں نہ تھیں جو قدما کے کلام میں بطرز احسن موجود ہیں۔

ڈاکٹر صاحب ایم اے میں ہم لوگوں کو قصاید خاقانی "سنائی کے قصاید اور "حدیقۃ الحقیقۃ" پڑھایا کرتے تھے۔ خاقانی فارسی کا بزرگ ترین قصیدہ گوشاعر ہے اور وہ اپنی مشکل گوئی کے لیے مشہور ہے۔ ڈاکٹر صاحب خاقانی کے اشعار کو بڑی محنت، شوق اور لگن سے پڑھاتے۔ اکثر ایک دوشعر کی تشریح وتوضیح میں گھنٹہ ختم ہو جاتا تھا۔ شعر کی تشریح کے ساتھ ہی ساتھ دوسرے مشاہیر کے اشعار کو بھی زبانی پڑھتے اور ان کا باہمی موازنہ ومقابلہ کرتے اور ان کے ادبی اور شعری پہلوؤں کو واضح کرتے، جب تشبیہ، استعارہ، تلمیح یا دوسری لفظی ومعنوی صنعتیں آتیں تو وہ سارے نکات بیان کرتے اور کبھی وہ اچانک ہم لوگوں سے سوال کر بیٹھتے کہ کون سی صنعت استعمال کی گئی ہے۔ خاموشی دیکھ کر ان کے چہرے کا رنگ بدل جاتا، مگر وہ اپنی رو میں درس دینے لگتے۔ "حدیقۃ الحقیقۃ" پر جب درس دیتے تو اشعار کو بڑے جوش اور سرمستی سے پڑھاتے، رموز تصوف کو واشگاف کرتے۔ بعض مقامات پر ان کا انداز گفتگو بڑا ہی دقیق اور فلسفیانہ ہو جاتا اور ان کا طرز بیان ہمیشہ ادبی معیار کا حامل رہتا۔

۱۹۳۲ء سے ۱۹۳۵ء تک پی۔ایچ۔ڈی کی ڈگری کے لیے راقم تحقیقی مقالہ ترتیب دینے میں مشغول رہا۔ دوران تحقیق ان کی نگرانی میں کام کرنے کا مجھے فخر حاصل ہے۔ وہ مجھے ماخذ بتاتے اور میں مواد اکٹھا کرتا۔ مواد فراہم کرنے کے بعد جب میں ایک یا دو باب لکھ کر لے جاتا تو وہ بڑی ریاضت کے ساتھ مسودہ کو دیکھتے اور ضروری ہدایات دیتے، ان کی نظر بڑی نکتہ رس تھی۔ فنی نزاکت، تاریخی صحت، حواشی کی درستی، اور ترتیب وتنظیم میں پختگی کے دلدادہ

تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ میرا تحقیقی مقالہ ہر اعتبار سے مکمل ہو اس لیے وہ مجھ سے خوب محنت کراتے اس طریقۂ کار سے مجھے تاریخ، تذکرے، دواوین کے مطالعہ کا شوق پیدا ہوا۔ جب میرا مقالہ آخری مرحلے پر تھا تو وہ تصحیح کے لیے گھر پر بلاتے اور مئی اور جون کی تیز گرمی میں ان کے دولت کدہ واقع خواجہ کلاں پر جاتا۔ وہ بڑی خندہ پیشانی سے اس کام میں لگ جاتے اور اکثر پسینہ میں شرابور ہو جاتے مگر کام ختم کر کے ہی دم لیتے۔ میں ان کی اس عنایت کو کبھی بھول نہیں سکتا ہوں۔ انھوں نے جو ہدایت بھی دی میں اس پر عمل پیرا ہوتا اور شاید اسی ریاضت اور محنت کا ثمرہ تھا کہ میں نے پٹنہ یونیورسٹی سے سب سے پہلے پی۔ایچ۔ڈی کی ڈگری ۱۹۳۵ء میں حاصل کی۔ پٹنہ یونیورسٹی ۱۹۱۸ء میں قائم ہو چکی تھی، مگر ۱۹۳۵ء تک کسی نے یہ ڈگری کسی بھی مضمون میں نہیں پائی تھی۔ پٹنہ یونیورسٹی نے امتحان کا کل انتظام سر ایڈورڈ ڈینی سن روس کے سپرد کیا جو اس وقت لندن میں اسکول آف اورینٹل اسٹڈیز کے ڈائرکٹر تھے۔ ڈاکٹر صاحب کی نگرانی میں تحقیقی کام انجام دینے کا مجھے جتنا فخر ہو کم ہے۔ میرا موضوع "ہندستان کے قدیم فارسی شعراء" تھا جو ایک مشکل اور دشوار موضوع تھا مگر یہ مشکل مرحلہ ڈاکٹر صاحب کی مشفقانہ رہنمائی میں بآسانی طے ہو گیا اور میں یونیورسٹی کا پی۔ایچ۔ڈی میں پہلا سند یافتہ ہو گیا۔

درس و تدریس سے سبکدوش ہونے کے بعد بھی ان کی اعلیٰ علمی صلاحیت کی وجہ سے حکومت وقت علمی معاملات میں برابر ان سے مشورہ لیتی تھی۔ عربی، فارسی اور اردو کے متعلق جب سرکار کو کسی مشورے کی ضرورت آن پڑتی تھی یا کوئی مسئلہ درپیش ہوتا تھا تو آپ ہی اسے حل کرتے تھے۔

۱۹۳۶ء میں آصفیہ لائبریری حیدرآباد دکن کی جب تنظیم نو ہونے لگی تو خان بہادر اسد اللہ لائبریرین امپریل لائبریری کلکتہ اور ڈاکٹر صاحب کو شہریار دکن حضور نظام نے یاد فرمایا اور قریب ایک ماہ حیدرآباد میں قیام کر کے لائبریری کو بہتر طریقے سے منظم کرنے کی سفارش کی۔

مختصر یہ کہ ڈاکٹر صاحب کی زندگی ہر حیثیت سے بڑی کامیاب رہی۔ ان کی زندگی میں جلال بھی تھا اور جمال بھی۔ ان کی شخصیت پرشکوہ بھی اور عظیم۔ ان کے متعلق ہم لوگوں کے انگریزی کے محترم پروفیسر آرمر نے کیا خوب کہا ہے:

"آپ ایک خوش طبع، خلیق اور ملنسار انسان ہیں نیز نہایت ہی کامل استاد

اور فاضل اور زبان داں بھی ہیں۔"

چند الفاظ میں اس سے بڑھ کر اور کیا تعریف ہو سکتی ہے اور وہ بھی ایک انگریز دانش ور کی زبانی جو اپنی دیانت داری میں مشہور تھے۔ ان کی وفات سے میرے لیے ایک ایسا خلا پیدا ہو گیا جو کبھی بھی پُر نہیں ہو سکتا ہے۔

۳۔ سر عبدُالرحیم، ام۔ اے۔ ال ال ڈی۔ کے سی ایس آئی
پریسیڈنٹ انڈین لیجبلیٹو اسمبلی (سنٹرل) دہلی

سر عبدالرحیم ماہ ستمبر ۱۸۶۷ء میں مدناپور بنگال میں پیدا ہوئے۔ موصوف کا تعلق ایک نہایت ہی باعزت خاندان سے تھا۔ ان کے دادا ڈپٹی کلکٹری کے عہدے پر فائز تھے اور والد محترم مولوی عبدالرب مدناپور کے زمینداروں میں تھے۔ مولوی عبدالرب صاحب ایک جید عالم تھے اور سر عبدالرحیم نے عربی کی تعلیم اپنے والد سے حاصل کرنے کے بعد انگریزی تعلیم کے لیے سرکاری ہائی اسکول مدناپور میں داخلہ لیا۔ انٹرنس کے امتحان میں کامیاب ہو کر پریسیڈنسی کالج کلکتہ میں تعلیم حاصل کرنا شروع کر دیا۔ بی۔ اے کی ڈگری آنرس کے ساتھ حاصل کی۔ بعد ازاں اسی کالج سے انگریزی ادب میں ایم۔ اے کیا۔ صاحب موصوف پریسیڈنسی کالج کے نہایت ہی ممتاز اور ہونہار طالب علموں میں شمار کیے جاتے تھے۔ اپنے کل امتحانوں میں نہایت ہی شاندار کامیابی حاصل کی۔ ایم۔ اے میں کامیاب ہونے کے بعد قانون کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے انگلستان گئے اور ۱۸۹۰ء میں مڈل ٹیمپل سے بیرسٹری کا امتحان پاس کر کے ہندوستان واپس آئے اور اسی سال سے کلکتہ ہائی کورٹ میں بیرسٹری کرنے لگے۔ ۱۹۰۰ء سے ۱۹۰۳ء تک کلکتہ میں پریسیڈنسی مجسٹریٹ کے عہدے پر مامور رہے۔ حکومت نے موصوف کو ڈپٹی لیگل ریممبرنسر (Deputy Legal Remembrancer) کے عہدے پر مقرر کیا جو اس زمانے میں ایک بڑی عزت کی بات سمجھی جاتی تھی۔ ۱۹۰۷ء میں صاحب موصوف ٹیگور لا لکچرر مقرر ہوئے اور اسی دوران انھوں نے ایک نہایت ہی قابل قدر اسلامی اصول و قوانین پر ایک کتاب تصنیف فرمائی۔ یہ کتاب (Principles of Muhammadan Jurisprudence) کو آج بھی بڑے

بڑے قانون داں شوق سے پڑھتے ہیں اور کام میں لاتے ہیں۔ ۱۹۰۸ء میں موصوف مدراس ہائی کورٹ کے جج مقرر ہوئے جہاں انھوں نے اپنی بے غرضی اور انصاف کے بدولت شہرت حاصل کی۔ مدراس ہائی کورٹ کی اعلیٰ قدیم روایتوں کو ہر موقع پر برقرار رکھ کر لوگوں سے خراج تحسین حاصل کیا۔ اس زمانہ میں مدراس کا ہائی کورٹ اپنے قابل ججوں کے لیے بہت مشہور تھا۔ صاحب موصوف ۱۹۰۸ء سے ۱۹۲۰ء تک مدراس ہائی کورٹ کے جج رہے اور صاحب موصوف کے عالمانہ فیصلے جو قانون کے مطابق ہوا کرتے تھے، ہندوستان کے ہر ہائی کورٹ میں قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ ۱۹۱۰ء اور ۱۹۱۹ء میں عارضی طور پر مدراس ہائی کورٹ کے چیف جسٹس ہوئے۔ اس زمانہ میں بہت کم ہندوستانی ہائی کورٹ کے چیف جسٹس ہوا کرتے تھے۔ جب موصوف مدراس میں جج تھے تو تعلیمی اداروں کے کاموں میں دل چسپی سے حصہ لیتے۔ خصوصاً مسلم مدارس کے فروغ کے لیے کوشاں رہتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ ہر ہندوستانی شہری کو تعلیم کا موقع فراہم کیا جانا چاہیے۔ عرصہ تک مدراس یونیورسٹی کے سنیٹ اور سنڈیکیٹ کے ممبر رہے اور یونیورسٹی کی ترقی کے لیے نمایاں کام انجام دیا جس کے تذکرے مدراس یونیورسٹی کے سالانہ رپورٹوں میں موجود ہیں۔ حکومت برطانیہ نے سر عبدالرحیم کو Royal Commission on Public Service کا ممبر مقرر کیا اور موصوف نے ۱۹۱۳ء سے ۱۹۱۵ء تک اس کمیشن کی خدمات کو انجام دیا۔ اپنے اختلافی نوٹ کے ذریعہ حکومت برطانیہ پر دباؤ ڈالا کہ اعلیٰ ملازمتوں میں ہندوستانیوں کی تقرری کی جائے اور صاحب موصوف کا یہ ایک عظیم کارنامہ ہے۔ سر عبدالرحیم کی سفارشات کی بدولت ہندوستانیوں کی تقرری اعلیٰ ملازمتوں میں ہونے لگی اور یہ بھی طے پایا کہ انڈین سول سروس کا امتحان انگلستان اور ہندوستان میں بیک وقت ہو۔ موصوف کی یہ سب خدمتیں کبھی فراموش نہیں کی جاسکتیں۔ سر عبدالرحیم ۱۹۲۰ء تک مدراس ہائی کورٹ کے جج رہے اور حکومت نے انھیں اسی سال گورنر بنگال کے اکزیکیٹو کونسل کا ممبر مقرر کیا۔ اس عہدہ پر موصوف پانچ سال تک قائم رہے۔ ۱۹۲۵ء میں بنگال لیجس لیٹو کانسل کے ممبر منتخب ہوئے اور بنگال مسلم پارٹی کے لیڈر کی حیثیت سے اپنے کاموں کو نہایت دلیری سے انجام دیا۔ حکومت بنگال نے ۱۹۲۷ء میں باریسال کے لوگوں پر نہایت ظالمانہ انداز سے گولی چلوا دی۔ صاحب موصوف پر اس ناروا حرکت کا بڑا اثر ہوا اور وہ احتجاج کے طور پر کونسل کی ممبری سے الگ ہو گئے۔ ۱۹۳۱ء

میں موصوف کا ہندوستان کی مرکزی قانون ساز اسمبلی میں بحیثیت آزاد ممبر انتخاب ہوا۔ ۱۹۳۱ء سے ۱۹۳۴ء تک اسمبلی میں حزب مخالف کے لیڈر کی حیثیت سے اپنی خدمتوں کو بحسن وخوبی انجام دیتے رہے۔ ۱۹۳۵ء میں اسی مرکزی قانون ساز اسمبلی کے پریسیڈنٹ مقرر ہوئے اور دس سال تک اس عہدہ پر فائز رہے۔ موصوف کا دس سال تک اس جلیل القدر عہدہ پر قائم رہنا ان کی قابلیت اور ایمانداری کا ایک بیّن ثبوت ہے۔

سر عبدالرحیم انگلستان میں جوائنٹ پارلیامنٹری کمیٹی کے ممبر ہوئے اور ۱۹۳۵ء میں صاحب موصوف نے ہندوستانی وفد کے لیڈر ہوکر امپائر پارلیامنٹری کانفرنس میں شرکت کی۔ صاحب موصوف نے راؤنڈ ٹیبل کانفرنس میں ہندوستان کی نمایندگی کی جہاں انھوں نے نہایت ہی زوردار الفاظ میں ہندوستان کو آزادی دیے جانے کا مطالبہ کیا۔

سر عبدالرحیم ہمیشہ حکومت برطانیہ کی جابرانہ پالیسی پر اعتراض کیا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ آرڈیننس کے خلاف جو حکومت برطانیہ اکثر جاری کیا کرتی تھی صاحب موصوف نے سنٹرل اسمبلی میں اپنی ایک تقریر کے دوران فرمایا کہ برطانیہ کو پورا اختیار ہے کہ ہندوستان کو برباد کردے مگر اسے یہ یاد رکھنا چاہیے کہ اس طریقہ کار سے برطانیہ کی بھی بربادی ہوگی۔ انھوں نے بارہا کہا اور حکومت کی توجہ مبذول کرائی کہ ہندوستان کی غربت اور ناخواندگی ایسے دو اہم مسئلے ہیں جن کو جلد سے جلد حل کرنا نہایت ضروری ہے ورنہ ملک ترقی کی راہ پر گامزن نہ ہوسکے گا۔ صاحب موصوف کا تعلق کانگریس اور اس کی سیاست سے کبھی نہیں رہا۔ انھوں نے مسلم لیگ کے قائم کرنے میں بڑے ذوق وشوق سے حصہ لیا اور ممبر کی حیثیت سے ڈیپوٹیشن میں شرکت کی۔ مسلمانوں نے لارڈ منٹو سے اس ڈیپوٹیشن کے ذریعہ اپنے لیے جداگانہ انتخاب کا مطالبہ کیا تھا۔ ۱۹۲۵ء میں سر عبدالرحیم نے مسلم لیگ کے سالانہ جلسہ کی صدارت کی۔ اپنے خطبہ میں انھوں نے فرمایا کہ مسلمانوں کے طور وطریقے، مذہب، تاریخی روایات اور رہن سہن برادران وطن سے بالکل جداگانہ ہیں اس لیے مسلمانان ہند بہ نسبت برادران وطن کے دوسرے ممالک کے مسلمانوں سے اپنے کو قریب تر سمجھتے ہیں۔ صاحب موصوف کے اس بیان نے برادران وطن کے درمیان ایک ہیجانی کیفیت پیدا کردی اور کلکتہ کے بہت سے اخباروں نے صاحب موصوف کے خلاف مضامین شائع کیے مگر وہ اپنے بیان پر شدت سے قائم رہے۔ ان کا خیال تھا کہ کانگریس مسلم لیگ سے کل متنازعہ مسئلوں کو طے کرکے

کیبینیٹ مشن پلان کو بے کم و کاست قبول کر لے مگر ایسا نہ ہوا۔ ۱۹۴۷ء میں تقسیم ہند کے بعد صاحب موصوف نے اپنے دہلی کے شاندار مکان کو فروخت کر دیا اور پاکستان چلے گئے۔ تقریباً اسّی سال کی عمر میں کراچی میں انتقال کیا۔ اللہ غریقِ رحمت کرے۔ سر عبدالرحیم کی سیاسی زندگی ہمیشہ نہایت پاک اور صاف رہی۔ انھوں نے ملک اور ملت کی ایسی خدمت کی ہے جس کے سبب وہ ہمیشہ یاد رہیں گے۔

سر عبدالرحیم کی شادی میری سگی منجھلی خالہ نثار فاطمہ بیگم سے ہوئی تھی اور اولاد میں دو لڑکیاں اور تین لڑکے ہوئے۔ بڑی صاحبزادی کی شادی ۱۹۱۸ء میں مسٹر جسٹس زاہد سہروردی کے صاحبزادے مسٹر ایچ۔ ایس۔ سہروردی سے ہوئی جو ان دنوں کلکتہ ہائی کورٹ میں بیرسٹری کرتے تھے۔ موصوف نے متحدہ بنگال میں مسلم لیگ کی سیاست میں نہایت سرگرمی سے حصہ لیا اور ہندوستان میں سیاسی لیڈر کی حیثیت سے ایسی شہرت حاصل کی جو بہت کم لوگوں کو نصیب ہوئی ہے۔ کلکتہ کارپوریشن کے ڈپٹی میئر ہوئے اور متحدہ بنگال کے وزیر اعلیٰ بھی رہے۔ مسلمانوں کے ہر دل عزیز لیڈر تھے اور پاکستان کے قائم کرنے میں انھوں نے نمایاں طور سے حصہ لیا۔ تقسیم ہند کے بعد مشرقی پاکستان چلے گئے، اور وہاں بھی بہت عزت و شہرت حاصل کی۔ جب موصوف کا قیام ویلیسلی فرسٹ لین کلکتہ میں تھا تو راقم کو کئی بار ان کے ساتھ ٹھہرنے کا اتفاق ہوا اور میں نے انھیں نہایت ہی خوش طبع اور دل چسپ انسان پایا۔

جب ۱۹۱۸ء میں موصوف کی شادی سر عبدالرحیم کی بڑی صاحبزادی سے ہوئی تو لیڈی رحیم اور سر عبدالرحیم نے شادی میں شریک ہونے کے لیے خاندان کے کل لوگوں کو مدعو کر کے کلکتہ بلایا۔ شادی نہایت ہی تزک و احتشام سے سر عبدالرحیم کی رہائش گاہ واقع ۲۳ اے اولڈ بالی گنج روڈ کلکتہ میں ہوئی۔ بڑے بڑے انگریز اور ہندوستانی اس شادی میں شریک تھے اور مہمانوں کی ضیافت نہایت اچھے ہندوستانی اور انگریزی کھانوں سے کی گئی۔ سر عبدالرحیم نے ہر مہمان کا نہایت گرم جوشی سے استقبال کیا۔ راقم بھی اس شادی میں شریک تھا اور اس تقریب میں مجھے ڈاکٹر عبداللہ المامون سہروردی سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا جو اس زمانے میں کلکتہ یونیورسٹی کے پروفیسر تھے اور مشرقی زبانوں سے بہت واقفیت رکھتے تھے۔ چونکہ راقم کلکتہ پہلی بار گیا تھا اس لیے میں نے وہاں دو ہفتے تک قیام کیا اور شہر کو گھوم کر خوب دیکھا۔ مجھے ان انگریز حاکموں

کے مجسمے جو جا بجا شہر میں نصب تھے بہت پسند آئے۔ یہ مُبت تراشی کے اعلیٰ نمونے تھے، مگر آزادی کے بعد یہ سب مجسمے اپنی جگہوں سے ہٹا دیے گئے ہیں۔ آج کل ہر شہر میں کانگریسی لیڈروں کے مجسمے جا بجا نصب کیے جا رہے ہیں، مگر فن اور کاریگری کے لحاظ سے راقم کو ان میں کوئی خوبی نظر نہیں آتی ہے۔ اس زمانے میں وکٹوریہ میموریل کی عمارت زیر تعمیر تھی اور راقم نے اسے بھی جا کر دیکھا۔

شادی کے چند برسوں بعد سر عبدالرحیم کی صاحبزادی جن کی شادی بڑے دھوم دھام سے ہوئی تھی انتقال کر گئیں اور منجھلے خالو کو اس کا بڑا صدمہ ہوا۔ مسٹر عبدالمجید سر عبدالرحیم کے عزیز دوستوں میں تھے اور آسام میں عرصہ تک گورنر کے ایگزیکیٹو کونسل کے ممبر رہے۔ سر عبدالرحیم نے اپنی چھوٹی لڑکی کی شادی صاحب موصوف کے لڑکے انعام مجید سے کی جو برطانوی فوج میں کیپٹین کے عہدہ پر مامور تھے اور ایک نہایت ہی ہونہار فوجی افسر سمجھے جاتے تھے۔ شادی کے تقریباً آٹھ سال بعد سر عبدالرحیم کی دوسری لڑکی کا بھی انتقال ہو گیا۔

سر عبدالرحیم کے بڑے لڑکے مسٹر ضیاء الدین عبدالرحیم ایک نہایت ہی ہونہار نوجوان تھے انگلستان سے بیرسٹر ہو کر آئے اور کلکتہ ہائی کورٹ میں بیرسٹری کرنے لگے۔ اپنی قانون دانی اور ہنرمندی کے سبب بہت جلد اپنے لیے ہائی کورٹ میں اچھا مقام پیدا کر لیا اور کم عمری میں کلکتہ ہائی کورٹ میں اسٹینڈنگ کونسل کے عہدے پر فائز ہوئے۔ جب ہائی کورٹ میں ان کے جج مقرر کیے جانے کی تجویز زیر غور تھی تو اچانک موصوف کا انتقال ہو گیا۔ سر عبدالرحیم نے ان کی موت کو نہایت صبر کے ساتھ برداشت کیا۔

صاحب موصوف کے ایک دوسرے صاحبزادے مسٹر جلال الدین عبدالرحیم نے انگلستان جا کر آئی۔سی۔ایس کے امتحان میں کامیابی حاصل کی اور صوبہ مدراس میں ان کی تعیناتی ہوئی۔ چونکہ موصوف نہایت ہی محنتی اور قابل آفیسر تھے دہلی میں حکومت ہند نے انھیں اعلیٰ عہدوں پر رکھا۔ آزادی کے بعد موصوف پاکستان چلے گئے اور وہاں بھی نمایاں کام انجام دیتے رہے۔ مختلف ملکوں میں پاکستان کے سفیر بھی رہے۔ پنشن پانے کے بعد کچھ عرصہ تک مسٹر ذوالفقار علی بھٹو کی پیپلس پارٹی کے سکریٹری بھی رہے۔ سر عبدالرحیم کے تیسرے لڑکے فہیم عبدالرحیم ایک نہایت ہی شریف النفس انسان اور ایک ماہر انجنیئر ہیں۔ پاکستان میں نہایت ہی فارغ البالی کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ سر عبدالرحیم کو اپنی زندگی میں دو لڑکیاں، ایک لڑکے اور لیڈی رحیم کی موت سے بہت صدمہ

پہنچا اور فالج کے مرض میں مبتلا ہو کر انتقال کیا۔ راقم صاحب موصوف کا بڑا احترام کرتا تھا اور وہ بھی مجھ سے بہت خلوص سے ملتے تھے۔

جب سر عبدالرحیم گورنر بنگال کے اگزیکیٹو کونسل کے ممبر تھے تو ان دنوں ۱۳ نمبر رسل اسٹریٹ کلکتہ ان کی رہائش گاہ تھی۔ راقم جب بھی کلکتہ جاتا صاحب موصوف کے ساتھ قیام کرتا۔ ان کی رہائش بالکل انگریزی طرز کی تھی اور وہ اچھے انگریزی کھانوں کے شوقین تھے۔ اچھے کھانے خود کھاتے اور دوستوں کو بھی کھلاتے تھے۔ کھانے کی میز کے ساتھ چھ کرسیاں لگی رہتی تھیں۔ ایک کرسی پر وہ خود بیٹھتے اور دو کرسیوں پر ان کے دو صاحبزادے بیٹھا کرتے تھے۔ رات کے کھانے پر ان کے کئی احباب ضرور آجایا کرتے تھے۔ اکثر رات کے کھانے میں ان کے سمدھی مسٹر جسٹس زاہد سہروردی شریک ہوا کرتے تھے۔ مسٹر زاہد سہروردی ایک نہایت ہی خوش مزاج انسان اور مشرقی تہذیب کے دلدادہ تھے۔ ان کی باتیں نہایت ہی پر لطف اور دل چسپ ہوا کرتی تھیں۔ سر عبدالرحیم صاحب ایک کم سخن آدمی تھے اور ان کے احباب اپنے مزاحیہ ٹیبل ٹاکس سے ہم لوگوں کو خوش کیا کرتے تھے۔ کبھی کبھی کرنل حسان سہروردی (جو بعد میں سر اور کلکتہ یونی ورسٹی کے وائس چانسلر ہوئے) کھانے پر آیا کرتے تھے اور اپنے قصوں سے ہم لوگوں کو خوب ہنساتے تھے۔ اللہ مغفرت کرے نہایت ہی خوب آدمی تھے۔ بہت دنوں تک ایسٹ انڈین ریلوے کے چیف میڈیکل افسر رہے اور بہت شہرت حاصل کی۔

ڈاکٹر غلام امام میرے بڑے ماموں مسٹر محمد سلیمان بیرسٹر و جج کے بڑے صاحبزادے تھے اور عین جوانی میں انتقال کر گئے۔ کلکتہ اور دہلی میں ڈاکٹر اور سیاسی لیڈر تھے۔ سر عبدالرحیم بھائی غلام امام سے بے انتہا محبت کرتے تھے۔ بھائی موصوف نے بہت کافی وقت سر عبدالرحیم کے ساتھ گذارا تھا اور اس سبب سے ان کے مزاج اور حالات سے خوب واقف ہو گئے تھے۔ ایک مرتبہ راقم نے بھائی غلام امام سے دریافت کیا کہ کیا وجہ ہے کہ منجھلے خالو کبھی ریشمی سوٹ نہیں پہنتے ہیں اور چورنگی کے ایک انگریزی خیاط سے اچھے اچھے سوتی کپڑوں کے سوٹ سلوایا کرتے ہیں۔ ڈاکٹر غلام امام نے جواباً مجھ سے کہا کہ میں نے بھی ایک دفعہ یہی سوال سر عبدالرحیم سے کیا تھا تو انھوں نے فرمایا تھا کہ شرع کی رو سے مسلمان مردوں کے لیے ریشمی کپڑا پہننا ممنوع ہے۔ اس لیے میں سوتی کپڑوں کا استعمال کرتا ہوں۔ بھائی غلام امام نے اسی موقع پر سر عبدالرحیم کا ایک دوسرا

واقعہ بھی بیان کیا جس سے ان کے مذہبی مزاج کا پتہ چلتا ہے۔ جب لارڈ لیٹن بنگال کے گورنر تھے تو انھوں نے چند مخصوص لوگوں کی دعوت کی۔ اس ضیافت میں سب مہمانوں نے چاندی کی پلیٹ میں چاندی کے چھری کانٹوں سے کھانا کھایا مگر سر عبدالرحیم نے چینی کی پلیٹ اور نِکل کی چھری کانٹوں کا استعمال کیا۔ غالباً یہ سب خوبیاں موصوف نے اپنے والد بزرگوار سے حاصل کی تھیں جو شرعی قوانین کے نہایت پابند تھے۔ راقم نے اپنی زندگی میں سر عبدالرحیم جیسا صاحب کردار انسان بہت کم دیکھا ہے۔

لیڈی رحیم پردہ کی بہت پابند تھیں اور اکثر کہا کرتی تھیں کہ ہندوستان میں سب شریف مسلمان عورتیں پردہ میں رہنا چاہتی ہیں اور یہی بات ان کے لیے مفید بھی ہے۔ موصوفہ کی بڑی صاحبزادی بھی پردہ کی پابند تھیں۔ نئی دہلی میں جب وائسرائے ہاؤس بن کر تیار ہوا تو لارڈ اور لیڈی ولنگڈن اس محل میں جا کر قیام پذیر ہوئے۔ اس موقع پر ایک مخلوط پارٹی دیے جانے کا انتظام کیا گیا جس میں معزز ترین مرد اور عورتیں شریک ہونے والی تھیں۔ کافی عرصہ سے لیڈی ولنگڈن لیڈی رحیم سے واقف تھیں اور وہ یہ بھی جانتی تھیں کہ موصوفہ ایک پردہ نشیں خاتون ہیں۔ اگر پردہ نشیں خواتین کا الگ انتظام نہ کیا گیا تو لیڈی رحیم اس پارٹی میں ہرگز شریک نہ ہوں گی، اس لیے لیڈی ولنگڈن نے لیڈی رحیم کو بذریعہ خط کل باتوں سے آگاہ کر دیا اور انھیں پردہ پارٹی میں شریک دیکھ کر بہت خوش ہوئیں اور شکریہ ادا کیا۔ موصوفہ لیڈی رحیم کی بڑی عزت کیا کرتی تھیں۔ آج کل کی مسلمان عورتوں میں اسلامی شائستگی و تہذیب بالکل مفقود ہو چکی ہے اور مسلمانوں کا پورا معاشرہ بری طرح مغربی تہذیب کے رنگ میں ڈوبا ہوا ہے۔

۴۔ سر سید سُلطان احمد

لا ممبر، حکومتِ ہند

سر سید سلطان احمد، خان بہادر سید خیرات احمد کے دوسرے صاحبزادے تھے۔ آپ کی پیدائش ۲۴ دسمبر ۱۸۸۰ء کو علی نگر، پالی، ضلع گیا میں ہوئی۔ موصوف کا تعلق ایک تعلیم یافتہ متوسط

طبقے کے زمیندار خاندان سے تھا۔ آپ کے والد ماجد گیا کے ایک مشہور وکیل تھے اور اسی شہر میں موصوف کے بڑے بھائی بھی بیرسٹری کیا کرتے تھے۔ موصوف نے ۱۸۹۷ء میں گیا ضلع اسکول سے میٹریکولیشن کا امتحان پاس کیا اور پٹنہ کالج میں دو سال تعلیم حاصل کر کے ۱۹۰۲ء میں انگلستان گئے، جہاں انھوں نے "Gray's Inn" میں بیرسٹری کی تعلیم حاصل کی۔ ۱۹۰۵ء میں بیرسٹر ہو کر ہندوستان واپس آئے اور کلکتہ ہائی کورٹ میں ۱۹۰۵ء سے ۱۹۱۵ء تک بیرسٹری کرتے رہے جب پٹنہ ہائی کورٹ قائم ہوا تو اس عدالت عالیہ میں بیرسٹری کا کام کرنے لگے۔ اپنے پیشے میں کافی شہرت حاصل کی اور پٹنہ میں عرصہ تک پٹنہ ہائی کورٹ میں گورنمنٹ ایڈوکیٹ کے عہدہ پر فائز رہے اور ۲۰-۱۹۱۹ء میں کچھ عرصہ کے لیے پٹنہ ہائی کورٹ کے جج مقرر کیے گئے۔ ۱۹۲۳ء سے ۱۹۳۰ء تک پٹنہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر رہے۔ صاحب موصوف پٹنہ یونیورسٹی کے پہلے ہندوستانی وائس چانسلر تھے۔ ۳۱-۱۹۳۰ء میں لندن جاکر راؤنڈ ٹیبل کانفرنس میں شریک ہوئے۔ ۱۹۳۷ء میں سرکار برطانیہ نے انھیں وائسرائے کے ایکزیکیوٹو کانسل کا ممبر مقرر کیا۔ ۱۹۳۸ء میں لیگ آف نیشنس میں ہندوستان کی نمائندگی کی۔ اسی سال آپ کی نامزدگی "پرمیننٹ کورٹ آف انٹرنیشنل جسٹس" میں عارضی طور پر ہوئی۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران ۱۹۴۰ء میں موصوف کو وار کمیٹی کا ممبر نامزد کیا گیا اور ۱۹۴۱ء میں آپ حکومت ہند کے لا ممبر مقرر ہوئے۔ ۱۹۴۵ء میں موصوف اس عہدہ سے الگ ہو کر ۱۹۴۷ء میں "چیمبر آف پرنسس" کے مشیر مقرر ہوئے۔ بعد ازاں موصوف اس کمیٹی کے ممبر مقرر کیے گئے جس کا کام نظام حیدر آباد کو مختلف سیاسی مسائل پر مشورہ دینا تھا۔ ۱۹۲۷ء میں سلطان احمد صاحب کو "سر" کا خطاب ملا اور ۱۹۴۵ء میں حکومت برطانیہ نے انھیں کے۔سی۔ایس۔آئی کے خطاب سے سرفراز کیا۔ ۱۹۳۱ء میں پٹنہ یونیورسٹی نے موصوف کو ڈاکٹر آف لا کی اعزازی ڈگری عطا کی۔ سر سلطان احمد زندگی بھر ایک روشن خیال ہندوستانی رہے اور اپنی حب الوطنی کا ہر موقع پر اظہار کیا کرتے تھے۔ ہندوستان کی ہنگامہ خیز سیاست میں انھوں نے کبھی کوئی حصہ نہ لیا۔

۱۹۴۸ء میں موصوف اپنے کل سرکاری فرائض کو انجام دے کر پٹنہ واپس آئے اور پٹنہ ہائی کورٹ میں بیرسٹری کرنے لگے۔ بہ حیثیت بیرسٹر موصوف کی تحریر بڑی زبردست ہوتی تھی اور ہر مسئلہ کا تجزیہ بڑی قابلیت سے کرتے تھے۔ بحث پُر مغز ہوا کرتی تھی مگر زبان کے چٹخارے

کم ہوتے تھے۔ گفتگو کا انداز دل کش ہوتا تھا۔ نہایت ہی ذکی الطبع تھے اور ہر معاملہ کی تہہ تک پہنچنے میں دیر نہ لگتی تھی۔ موصوف نے دیوانی کے مقدموں میں بڑی شہرت اور کامیابی حاصل کی اور خوب دولت کمائی۔ اپنے جونیر وکیلوں سے مقدمات کے کاغذات کو نہایت محنت سے تیار کراتے تھے۔ ہائی کورٹ کے جج ان کی قابلیت اور قانون دانی سے بڑے متاثر رہا کرتے تھے۔

باوجود اپنی سخت مصروفیت کے موصوف کچھ نہ کچھ وقت نکال کر اپنے دوستوں سے مل لیا کرتے تھے۔ اکثر اپنے احباب کو رات کے کھانے پر مدعو کیا کرتے اور بہت سی اہم باتیں کھانے کے دوران ہی طے ہو جایا کرتی تھیں۔ سال میں دو چار مرتبہ راقم کو بھی ان کے ساتھ کھانا کھانے کا شرف حاصل ہوتا تھا۔ ۱۹۵۲ء میں جب پٹنہ یونیورسٹی قائم ہوئی تو کچھ لوگوں کو خیال گذرا کہ عربی اور اردو کے لیے ایک ایک پروفیسر کی جگہ قائم کی جائے، جیسا دستور عرصہ دراز سے شعبہ فارسی میں تھا۔ موصوف نے راقم کو اپنے یہاں رات کے کھانے پر بلایا اور ایک ہدایت نامہ لکھوا دیا جسے میں نے یونیورسٹی کے وائس چانسلر کے سامنے پیش کیا۔ مطالبہ معقول تھا اس لیے کچھ بحث و تکرار کے بعد عربی اور اردو کے لیے ایک ایک پروفیسر کی جگہ قائم کی گئی۔ کلیم الدین احمد نے اس معاملہ میں بڑی دلچسپی لی اور اپنے ہندو دوستوں سے پوری مدد حاصل کی۔ سر سلطان احمد کے جامع ہدایت نامہ نے بڑا کام کیا اور ہم لوگوں کو کامیابی حاصل ہوئی۔ جب راقم نے صاحب موصوف کو اس کامیابی کی خبر دی تو بہت خوش ہوئے۔

سر سلطان احمد بڑے دین دار مسلمان تھے۔ اللہ کی ذات پر انھیں پکا بھروسہ تھا۔ اہل بیت اور ائمۂ اطہار سے بڑی محبت کرتے تھے۔ متعدد بار کربلائے معلیٰ کی زیارت سے مشرف ہوئے۔ ہر سال پہلی محرم کو اپنے آبائی گاؤں بالی چلے جاتے، اور عشرہ محرم تک وہاں مقیم رہتے تھے۔ عزاداری کا خاص انتظام کیا جاتا تھا اور یہاں غم حسین نہایت ہی دینی جذبہ سے منایا جاتا تھا۔ سنا ہے کہ دس روز تک نہایت ہی پابندی سے مجلسیں منعقد ہوتیں جن میں واقعات کربلا پر روشنی ڈالی جاتی۔ شہدائے کربلا سے جو ظلم اور بے رحمی کا برتاؤ کیا گیا تھا اسے نہایت ہی تاریخی انداز میں پیش کیا جاتا اور غم حسینؑ کو موجب ثواب قرار دیا جاتا۔ مجالس کے اختتام پر خاندان کے کچھ نوجوان افراد خصوصاً علی اکبر کاظمی، سید حسن رضا کاظمی اور سید نجم الحسن نہایت جذبہ سے مرثیے پڑھتے۔ راقم نے سید علی اکبر کاظمی کو ایک مرتبہ رانچی میں مرثیہ پڑھتے ہوئے سنا تھا اور ان کی تحت اللفظ خوانی سے میں بہت

متاثر ہوا تھا۔ سر سلطان نے آخر عمر میں اپنے پوتے سید شمس الحسن کے ساتھ حج کی سعادت حاصل کی۔ اور مدینہ منورہ کی زیارت سے بھی مشرف ہوئے۔ موصوف جب حج سے واپس آئے تو راقم ان سے ملنے کے لیے "سلطان پیلیس" گیا اور موصوف سے ملاقات کی۔ سر سلطان احمد مجھے اپنے اس کمرے میں لے گئے جو ان کے آفس کے کمرے کی پشت پر تھا اور تقریباً ایک گھنٹہ تک اپنے سفر حج کا تذکرہ کرتے رہے۔ دوران گفتگو کئی مرتبہ موصوف کی آنکھوں سے آنسو نکل آئے۔ ان کی خواہش تھی کہ دوبارہ حج کو جائیں مگر مختلف وجوہ کی بنا پر ایسا نہ ہو سکا۔ مسٹر سید شمس الحسن آج کل ہائی کورٹ کے جج ہیں اور سر سلطان احمد موصوف سے محبت کرتے تھے۔ سر سلطان احمد سے ہم لوگوں کے خاندانی تعلقات تھے اور صاحب موصوف والد محترم سے نہایت ہی شفقت و محبت سے ملا کرتے تھے۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ ان کے ایک قریبی رشتہ دار سید حسن عسکری والد مرحوم کے عزیز دوست تھے۔ جب سر سلطان احمد کلکتہ ہائی کورٹ میں بیرسٹری کرتے تھے تو میرے منجھلے ماموں غلام مولیٰ صاحب اپنے کلکتہ کے مکان میں قیام پذیر تھے۔ سر سلطان احمد اور غلام مولیٰ صاحب ایک دوسرے کے عزیز اور جاں نثار دوست تھے۔ ہر ہفتہ سنیچر کے روز دوستوں کا اجتماع خواہ سر سلطان کی رہائش گاہ پر یا غلام مولیٰ صاحب کے مکان پر ہوتا جس میں مولانا ابوالکلام آزاد بھی شریک ہوا کرتے تھے۔ ان خاندانی تعلقات کی بنا پر سر سلطان احمد میرا اور میرے چھوٹے بھائی انور حسین کا بہت خیال کرتے تھے۔ انور حسین مرحوم کو سر سلطان کی سفارش پر آل انڈیا ریڈیو میں ملازمت ملی۔ سر سلطان بحیثیت انفورمیشن ممبر جب لکھنؤ ریڈیو اسٹیشن کا معائنہ کرنے گئے تو بخاری صاحب نے جو ان دنوں آل انڈیا ریڈیو کے ڈائرکٹر جنرل تھے، انور حسین کو سلطان احمد سے ملانا چاہا۔ سر سلطان احمد نے ہنس کر کہا کہ یہ تو میرے بھتیجے ہیں اور ان کو مجھ سے ملانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ بخاری صاحب اسی روز سے انور حسین پر بہت مہربان ہو گئے۔ کچھ عرصہ بعد انور حسین مرحوم نے آل انڈیا ریڈیو کی ملازمت کو ترک کر کے حکومت بہار کے بکری ٹیکس کے محکمہ میں افسر ہوئے۔ اور بہار کمرشیل ٹیکسز ٹرائبونل کے چیئرمین ہو کر پنشن پائی۔

سر سلطان احمد نے اپنی رہائش کے لیے پٹنہ میں ایک عالی شان مکان تعمیر کرایا جو اب تک "سلطان پیلیس" کے نام سے مشہور ہے۔ اس مکان میں موصوف نے ایک ریڈیو ریسیور نصب کیا اور پٹنہ کے بے شمار لوگ اس ریڈیو ریسیور سے گانے اور خبروں کو سننے کے لیے ہر سنیچر

کو سلطان پیلیس" جایا کرتے تھے۔ اس زمانہ میں پٹنہ کی کسی رہائش گاہ پر ریڈیو ریسیور نصب نہ تھا۔ سر سلطان احمد نہایت ہی مہمان نواز انسان تھے۔ ہر روز ہندوستان کے مختلف شہروں سے معزز مہمان آتے اور ان کے یہاں قیام کرتے تھے۔ اس عالی شان مکان میں مسٹر سید نجم الحسن کی شادی نواب زادہ سید محمد مہدی کی بہن سے ہوئی۔ اس موقع پر دس روز تک "سلطان پیلیس" کی شان و شوکت قابل دید تھی۔ راقم کو بھی اس شادی میں شریک ہونے کا موقع ملا تھا۔ مسٹر نجم الحسن کی ناتجربہ کاری کی بنا پر انھیں تجارت میں گھاٹا ہوا اور "سلطان پیلیس" کو مجبوراً گورنمنٹ بہار کے ہاتھ ۱۹۶۱ء میں فروخت کرنا پڑا۔ سر سلطان احمد کی شادی فروری ۱۹۰۰ء میں ہوئی۔ موصوف کو کوئی اولاد نہ تھی اس لیے انھوں نے اپنے چھوٹے بھائی کے لڑکے سید نجم الحسن کو گود لیا اور زندگی بھر انھیں اپنی اولاد کی طرح عزیز رکھا اور ان کے لیے سب کچھ کیا۔ کہا جاتا ہے کہ سر سلطان احمد کے پاس ایک انگوٹھی تھی جس کی برکت سے انھیں عزت اور دولت حاصل ہوئی۔ معلوم نہیں یہ بات کہاں تک سچ ہے۔ اب یہ انگوٹھی غالباً سر سلطان کے کسی پوتے کے پاس ہے۔ لیڈی سلطان احمد ایک نہایت بلند پایہ خاتون تھیں اور اپنے شوہر کی زندگی میں قضا کر گئیں۔ سر سلطان احمد نے ۲۷۔ فروری ۱۹۶۳ء کو انتقال کیا اور اپنے آبائی گاؤں پالی میں مدفون ہوئے۔ نہایت خوب آدمی تھے۔ اللہ غریق رحمت کرے۔

سید نجم الحسن راقم سے بہت خلوص اور محبت سے ملتے اور میں بھی ان کی بڑی عزت کرتا تھا۔ ان کی بے وقت موت سے جو ۱۹۷۲ء میں ہوئی راقم کو بہت صدمہ ہوا۔ نجم الحسن ایک نہایت ملنسار اور باوقار انسان تھے۔ کشش کا یہ عالم تھا کہ جس پارٹی یا دعوت میں موجود ہوتے اکثر لوگوں کی آنکھیں ان کی طرف لگی ہوتی تھیں۔ مرحوم کے صاحبزادے مسٹر جسٹس سید شمس الحسن پٹنہ ہائی کورٹ میں جج ہیں اور اچھی شہرت کے حامل ہیں۔ کل موقعوں پر خاندانی وقار کو ملحوظ رکھتے ہیں کئی سال تک پٹنہ کالج کے شعبہ فارسی میں ہم لوگوں کے شاگرد رہے۔ گاہے گاہے جب کبھی ملاقات ہو جاتی ہے تو راقم کی مزاج پرسی کر لیتے ہیں۔

۵۔ سر سیّد محمد فخر الدین خان بہادر

(صوبہ بہار و اڑیسہ کے پہلے مسلمان وزیر)

سر محمد فخر الدین کی پیدائش ۱۸۶۸ء میں ڈومری گاؤں ضلع پٹنہ میں ہوئی۔ آپ کے والد کا نام مولوی محمد علی تھا۔ موصوف نے عربی، فارسی اور اردو کی تعلیم اپنے گاؤں کے مکتب میں پائی۔ بعد ازاں اسکول کی تعلیم کے لیے پٹنہ آئے۔ مولوی محمد علی کے تعلقات مولوی محمد یحییٰ وکیل سے برادرانہ تھے اور ایک عرصہ تک صاحبزادے کی تعلیم کی ذمہ داری مولوی محمد یحییٰ پر رہی جو ان سے اپنی اولاد کی طرح محبت کرتے تھے۔ انٹرنس پاس کرنے کے بعد موصوف نے پٹنہ کالج میں داخلہ لیا اور ۱۸۹۱ء میں بی اے پاس کیا۔ ۱۸۹۳ء میں بی۔ ایل کی ڈگری حاصل کی اور پٹنہ کی ضلع عدالت میں بحیثیت وکیل مولوی محمد یحییٰ کے ہمراہ وکالت کرنا شروع کیا۔ صاحب موصوف راقم کے نانا کی بہت تعریف کیا کرتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ مولوی یحییٰ صاحب سے میں نے قانونی پیشہ کی مہارت ایسی حاصل کی جس سے مجھے بہت کچھ فائدہ پہنچا۔ حکومت بہار نے پٹنہ ہائی کورٹ کے قائم ہونے کے بعد انھیں سرکاری وکیل مقرر کیا اور اس عہدہ پر صاحب موصوف ۱۹۱۷ء سے ۱۹۲۰ء تک فائز رہے۔ آپ نے وکالت کے پیشہ میں بہت جلد ناموری حاصل کی اور آمدنی میں روز بروز اضافہ ہوتا گیا۔ صاحب موصوف نے اپنی سیاسی زندگی کم عمری میں شروع کی اور ۱۹۱۰ء میں ان کا انتخاب بنگال کونسل میں پٹنہ ڈویژن کے حلقہ سے ہوا اور سرکاری وکیل مقرر کیے جانے پر بنگال کونسل کی ممبری سے الگ ہو گئے۔ ۱۹۲۱ء میں بہار و اڑیسہ لیجسلیٹو کونسل کے ممبر منتخب ہوئے اور تاحیات پٹنہ کے حلقہ انتخاب سے کامیاب ہوتے رہے اور انھیں کوئی امیدوار شکست نہ دے سکا۔ حکومت برطانیہ کی نئی اصلاحات کے مطابق صاحب موصوف ۱۹۲۱ء میں صوبہ بہار میں وزیر مقرر کیے گئے اور اس عہدہ پر ۱۹۲۱ء سے ۱۹۳۳ء تک قائم رہے۔ وزیر تعلیم کے علاوہ موصوف چند دیگر اہم محکموں کے بھی وزیر رہے اور ان سب محکموں کو اپنے انتظام اور کارکردگی سے عروج پر پہنچایا۔ صاحب موصوف اسلامی شریعت کے بڑے پابند تھے اور اس کا اظہار ان کے کل کاموں میں ہوا کرتا تھا۔ چنانچہ جب حکومت بہار نے محکمۂ آب کاری کو صاحب موصوف

کے سپرد کیا تو انھوں نے اس محکمہ کو اپنی نگرانی میں نہ لیا اور یہ محکمہ ایک ہندو وزیر کے حوالہ کیا گیا۔ صاحب موصوف بہار میں تعلیم کی ترقی کے لیے بڑے کوشاں رہے اور اس معاملہ میں وہ بے حد کامیاب بھی ہوئے۔ موصوف کی وزارت کے زمانے میں بہار میں ابتدائی اور ثانوی تعلیم میں بڑی ترقی ہوئی۔ ان دنوں مسٹر جی۔ ای۔ فوکس ڈائرکٹر آف پبلک انسٹرکشنس تھے اور اپنی سخت مزاجی کے لیے مشہور تھے مگر انھوں نے کبھی بھی سر فخرالدین سے کسی معاملہ میں اختلاف نہ کیا اور ان کا بڑا احترام کرتے تھے۔ مسٹر فوکس نے ابتدائی اور ثانوی تعلیم کی ترقی کے لیے اپنے ڈپٹی ڈائرکٹروں کو جن کا تعلق ابتدائی اور ثانوی تعلیم سے تھا حکم کیا کہ صوبہ کا دورہ کریں اور زیادہ سے زیادہ ابتدائی اور ثانوی تعلیم کے لیے ہر جگہ اسکول قائم کرائیں اور ان اسکولوں کے لیے نئی عمارتیں بنائی جائیں۔ صاحب موصوف ابتدائی تعلیم کو قومی ترقی کے لیے نہایت اہم سمجھتے تھے۔ باوجود اس شدید مخالفت کے جو محکمہ مالیات کیا کرتا تھا سرکاری خرچ کے سالانہ حساب میں اس مد کے اخراجات کی رقم میں برابر اضافہ کراتے رہے۔ صاحب موصوف نے ابتدائی درجہ کے اسکولوں میں چرخہ کاتنے کی تعلیم کا انتظام کیا مگر ان کی یہ اسکیم کامیاب نہ ہو سکی۔

بہار واڑیسہ میں موصوف نے اعلیٰ تعلیم کے لیے جو خدمتیں انجام دیں وہ قابل رشک ہیں کوئی وزیر تعلیم اب تک اعلیٰ تعلیم کے لیے ان کے مقابلہ میں اس صوبہ میں کچھ نہ کر سکا ہے۔ سر فخرالدین نے اپنے اثرات کو کام میں لا کر حکومت بہار سے کالج اور ہوسٹلوں کی تعمیر کے لیے گراں قدر رقمیں حاصل کیں اور کالجوں اور ہوسٹلوں کے لیے ایسی شاندار عمارتیں تعمیر کرائیں جو سر فخرالدین کی تاریخی یادگاریں ہیں۔ بی۔ این۔ کالج اور اس کے تین منزلہ ہوسٹل کی عمارت از سر نو بنوائی گئی۔ سائنس کالج کی نہایت خوب صورت اور وسیع عمارت کو بنوایا۔ اسی کے ساتھ قدیم نیو کالج کی عمارت میں تغیر وتبدل کر کے ایک دو منزلہ اور بڑا ہوسٹل سائنس کالج کے لیے تعمیر کرایا۔ پٹنہ کالج کے کمپاؤنڈ میں کالج کے لیے ایک اچھا دو منزلہ ہوسٹل مسلمان اور عیسائی طلبا کی رہائش کے لیے بنوایا۔ جو آج کل اقبال ہوسٹل کے نام سے موسوم ہے۔ ایم۔ اے کے طلبا کی رہائش کے لیے رانی گھاٹ میں ایک شاندار دو منزلہ ہوسٹل بنوایا گیا۔ ان سب عمارتوں کے علاوہ پٹنہ ٹریننگ کالج اور اس کے ہوسٹل کی عمارتیں بھی تعمیر کرائی گئیں۔ سائنس کالج کی عمارت کی افتتاح کے لیے وائسرے ہند پٹنہ تشریف لائے اور انھوں نے اس موقع پر اپنی تقریر میں سر محمد فخرالدین کی بڑی تعریفیں کیں۔

پٹنہ سے باہر مظفر پور کے جی۔ بی۔ بی۔ کالج، کٹک کے راونشا کالج، اور بھاگل پور کے ٹی۔ این۔ بی کالج اور ان کے ہوسٹلوں میں اضافہ کرایا۔ مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ پٹنہ جس کو حکومت بہار نے اپنی نگرانی میں لے لیا تھا اس کے لیے دو نہایت ہی شاندار عمارتیں تعمیر کرائیں۔ یہ عمارتیں سر محمد فخرالدین کی دور اندیشی اور کاوشوں کی بدولت وجود میں آئیں۔ رانی گھاٹ میں پروفیسروں کے لیے آٹھ رہائش گاہیں تعمیر کرائی گئیں۔ سر محمد فخرالدین سیمنٹن کمیٹی کے ممبر رہ چکے تھے اور جب موصوف وزیر تعلیم بہار ہوئے تو انھوں نے پٹنہ یونیورسٹی کے توسیع اور ترقی کے لیے ایک اسکیم تیار کرائی جس کے تحت پٹنہ یونیورسٹی کو ایک رہائشی یونیورسٹی میں تبدیل کر کے اس کی عمارتیں سیمنٹن کمیٹی کی سفارشوں کے مطابق شہر سے دور پھلواری شریف کے نزدیک تعمیر کرائی جائیں۔ جب یہ معاملہ بہار لیجس لیٹیو کونسل کے سامنے پیش ہوا تو بہت سے ممبران نے اس تجویز کی سخت مخالفت کی اور ایک ممبر نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ سر محمد فخرالدین پٹنہ یونیورسٹی کو اپنے پیر کی دہلیز پر لے جانا چاہتے ہیں اور یونیورسٹی شہر سے بہت دور ہو جائے گی۔ حکومت بہار نے بھی اس تجویز کو رد کر دیا اور بدقسمتی سے پٹنہ یونیورسٹی ایک رہائشی یونیورسٹی میں تبدیل نہ ہوسکی۔ پٹنہ کے "سرچ لائٹ" اخبار نے افسوس کے ساتھ اظہار خیال کیا تھا کہ اگر حکومت بہار نے سر محمد فخرالدین کی اسکیم کو نامنظور نہ کیا ہوتا تو پٹنہ میں ایک اچھی یونیورسٹی بہت پہلے قائم ہو جاتی۔

انگریز اور ہندوستانی آئی۔ ای۔ ایس پروفیسروں کے چلے جانے کے بعد جب بہار اور اڑیسہ میں اچھے پروفیسروں کی کمی ہو گئی تو حکومت بہار نے بہار ایجوکیشنل سروس کلاس ون قائم کیا سر محمد فخرالدین نے خالی جگہوں کو پر کرنے کے لیے بہار اور ملک کے دوسرے حصوں سے اچھے اچھے اساتذہ کو لا کر ان جگہوں پر مقرر کیا۔ ڈاکٹر گیان چند (علم معاشیات) پروفیسر تارا پورے والا (تاریخ) پروفیسر جمنا پرشاد (علم نفسیات) وغیرہ پروفیسر مقرر ہوئے۔ ان کے علاوہ پروفیسر پل (انگریزی) اور پروفیسر شیو پاربتی پرشاد (فزکس) کی اعلیٰ تنخواہوں پر تقرری ہوئی۔ ان کے علاوہ عارضی جگہوں پر کئی اچھے اساتذہ مقرر کیے گئے جن میں پروفیسر نذیر لطیق احمد (تاریخ) بھی تھے جو بعد میں انڈھیری کالج بمبئی کے پرنسپل ہوئے اور حکومت ہند میں پبلک سروس کمیشن کے ممبر بھی رہے۔ عرصہ دراز تک کوئی امیدوار باوجود اچھی اچھی ہندوستانی ڈگریاں رکھتے ہوئے کلاس ون میں مقرر نہیں کیا جاتا تھا کیونکہ انگریزی حکومت نے یہ قید لگا دی تھی کہ امیدوار برطانیہ، یورپ یا امریکہ کی

ڈگری رکھتا ہو۔ تقرری کے وقت اس نارواشرط پر بہت زور دیا جاتا تھا۔ سر فخرالدین اس پابندی کے خلاف تھے۔ ۱۹۴۴ء میں جب ڈاکٹر کے۔کے۔دت (تاریخ) اور راقم (فارسی) امیدوار ہوئے تو حکومت نے اس قاعدے میں نرمی کردی۔ ہم دونوں کو جن کے پاس کوئی بیرونی ڈگری نہ تھی کلاس وَن میں پروفیسر مقرر کیا گیا اور ان امیدواروں پر ترجیح دی گئی، جن کے پاس بیرونی ڈگریاں تھیں۔

مختلف شعبوں میں اساتذہ کی کمی کو پورا کرنے کے لیے سر محمد فخرالدین نے اسٹیٹ اسکالرشپ کی ایک اسکیم تیار کرائی، جس کے تحت بہار واڑیسہ کے ان طلباء کو جو بی۔اے یا ایم۔اے کے امتحان میں اعلیٰ نمبروں سے کامیاب ہوتے انھیں وظیفہ دے کر آکسفورڈ، کیمبرج اور لندن اعلیٰ ڈگریاں حاصل کرنے کے لیے بھیجا جاتا تھا اور واپسی پر ان کی پروفیسر کے عہدے پر تقرری کردی جاتی تھی۔ یہ وظیفے مختلف شعبوں کی ضروریات کو مدنظر رکھتے ہوئے دیئے جاتے تھے۔ کشوری پرشاد سنہا، فضل الرحمٰن اور کلیم الدین احمد (انگریزی کے لیے)، گھنشیام داس (تاریخ کے لیے) بل بھدر پرشاد اور قمرالدین (کیمسٹری کے لیے) بھیرب ناتھ ردھنگی (علم معاشیات کے لیے) برطانیہ بھیجے گئے۔ یہ سب حضرات بہار واڑیسہ میں نامی پروفیسر ہوئے ہیں۔ راقم کے ایک دوست محمد مسلم کو فزکس کے لیے وظیفہ دیا گیا تھا مگر موصوف انگلستان روانہ ہونے سے ایک ماہ قبل انتقال کرگئے، جس کا راقم کو بڑا صدمہ رہا۔ سر فخرالدین کی وزارت کے اختتام کے ساتھ اسٹیٹ اسکالرشپ کا بھی خاتمہ ہوگیا۔

سائنس اور آرٹس کالجوں کے علاوہ سر محمد فخرالدین نے بہار اسکول آف انجنیئرنگ پٹنہ کو کالج کا درجہ دلوایا اور یہ اسکول بہار کالج آف انجنیئرنگ کہلانے لگا جو اس زمانے میں نہایت فروغ پر ہے۔ ایک نہایت ہی قابل انگریز کو بنارس ہندو یونیورسٹی سے لاکر کالج کا پرنسپل بنایا اور مسٹر بومن سنجنا کو بمبئی سے بلاکر سول انجنیئرنگ کے پروفیسر کا عہدہ عطا کیا۔ شہر سے دور پٹنہ میں بہار ویٹرنری کالج بھی قائم کرایا اور اس میں اساتذہ کو باہر سے لاکر پروفیسر مقرر کیا۔ موصوف کے زمانے میں صوبہ بہار واڑیسہ کے لیے دو وزراء ہوتے تھے اور ان کے اختیارات بہت حد تک محدود تھے۔ باوجود ان سب قانونی پابندیوں کے سر فخرالدین نے اپنی وزارت کے ہر شعبے کو کافی فروغ بخشا۔ ڈاکٹر راجندر پرشاد ان کی صلاحیت اور قابلیت کے بڑے قائل تھے اور موصوف کی خوبیوں کا ہمیشہ اعتراف کرتے تھے۔ اس زمانے میں امداد باہمی کا محکمہ بھی صاحب

موصوف کے سپرد تھا اور انھوں نے خان بہادر محی الدین کی مدد سے جو اس محکمہ کے رجسٹرار تھے امداد باہمی کے کاموں کو بہت کامیاب بنوایا۔ چند مخلص کارکنوں کا ایک جلسہ حاجی پور میں منعقد کیا گیا اور ترہٹ کے علاقوں میں تحریک امداد باہمی کو اچھی کامیابی حاصل ہوئی۔ راقم کے والد اس زمانہ میں حاجی پور میں ایس۔ ڈی۔ او تھے اور سر محمد فخر الدین کی تصویر جو اس موقع پر چند کارکنوں کے ساتھ لی گئی تھی، راقم کے پاس موجود ہے۔

سر محمد فخر الدین میانہ قد کے ایک خوش رو انسان تھے۔ رنگ نہایت گورا تھا اور تمام عمر داڑھی رکھی جو اُن کے چہرے پر بہت زیب دیتی تھی۔ موصوف اخلاق شعار، دوست نواز اور منکسر مزاج تھے۔ خانقاہ مجیبیہ، پھلواری شریف کے مریدوں میں تھے اور وہاں کے بزرگوں کی بڑی قدر کرتے تھے۔ نماز کے بہت پابند تھے اور کبھی بھی اپنی نماز قضا نہ ہونے دی۔ ایک مرتبہ بہار کے گورنمنٹ ہاؤس میں گارڈن پارٹی کے موقع پر جب مغرب کی نماز کا وقت ہوا تو والد مرحوم نے کھلے میدان میں جاکر اذان دی اور سر محمد فخر الدین نے اس نماز کی امامت کی۔ انگریزی لباس کبھی استعمال نہ کرتے تھے۔ شیروانی کے ساتھ ہمیشہ پائجامہ پہنتے اور ترکی ٹوپی برابر استعمال کرتے۔ موصوف کی پہلی شادی ۱۸۹۰ء میں ہوئی جس سے دو لڑکے اور ایک لڑکی پیدا ہوئی۔ اہلیہ محترمہ کے قضا کر جانے کے بعد موصوف کی دوسری شادی غالباً ۱۹۰۵ء میں ہوئی اور دوسری اہلیہ کی بطن سے ایک لڑکا اور ایک لڑکی پیدا ہوئی۔ موصوف کے ایک صاحبزادے مسٹر عزیز الحق فخر الدین پٹنہ ہائی کورٹ کے نامی وکیل تھے، دوسرے صاحبزادے مسٹر انیس الحق فخر الدین ڈپٹی کلکٹر تھے۔ آپ کے تیسرے صاحبزادے حبیب الحق فخر الدین راقم کے ساتھ لا کالج میں پڑھا کرتے تھے اور بعد میں عہدۂ منصفی پر فائز ہوئے۔ عین جوانی میں انتقال کر گئے۔ سر فخر الدین کے بڑے داماد الحاج سید عبد الرحمن پٹنہ کے ایک نامی وکیل گذرے ہیں اور والد مرحوم کے ساتھ اسکول میں تعلیم پائی تھی اور تاحیات ان کے عزیز دوستوں میں رہے۔

سر فخر الدین ایک نہایت مخیر انسان تھے اور حاجت مندوں کی وقت ضرورت مدد کیا کرتے تھے۔ پٹنہ جنکشن ریلوے اسٹیشن کے متصل ایک چھوٹی سی مسجد تھی اور خستہ حالی کا شکار ہو گئی تھی۔ صاحب موصوف نے اس مسجد کو از سر نو تعمیر کرایا اور اس کے بنوانے میں بیس پچیس ہزار روپئے کی رقم خرچ کی۔ عرصہ تک یہ مسجد سر فخر الدین کی مسجد کہلاتی تھی۔ اِن دنوں اس مسجد میں

مسلمانوں نے بہت کچھ اضافہ کیا ہے اور اب یہ مسجد شہر کی جامع مسجد بن گئی ہے۔

سر فخرالدین نے اپنی رہائش کے لیے پٹنہ میں لور روڈ پر ایک اچھا مکان بنوایا جو اب تک قائم ہے۔ موصوف اپنی وزارت کے دور میں اسی مکان میں قیام پذیر رہے اور کبھی کسی سرکاری مکان میں نہ گئے۔ جب حکومت بہار نے پولس کا ایک دستہ ان کی محافظت اور گھر کی نگہبانی کے لیے بھیجا تو انھوں نے حکومت کو مطلع کیا کہ اللہ میرا نگہبان ہے اور مجھے حفاظتی دستہ کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ موصوف کی وفات ۱۹۳۳ء میں ہوئی اور خانقاہ مجیبیہ پھلواری شریف کے قبرستان میں مدفون ہوئے۔ ایسا درویش صفت وزیر راقم نے اپنی زندگی میں نہیں دیکھا ہے۔

سر فخرالدین نے سیاست میں ہمیشہ میانہ روی اختیار کی۔ بہار پروینشل کانفرنس کے کاموں میں برابر حصہ لیتے رہے۔ انھوں نے ایک یادداشت (Memorandum) تیار کی اور سائمن کمیشن کے سامنے پیش کی جس کی مخالفت کچھ مسلمانوں نے کی تھی۔ صاحب موصوف کو انگریزی اور اردو دونوں زبانوں پر عبور حاصل تھا اور ان دونوں زبانوں میں اچھی تقریریں کیا کرتے تھے۔ انگریز ہندو اور مسلمانوں کا ایک بڑا طبقہ ان کی بڑی عزت کیا کرتا تھا۔ موصوف کو حکومت برطانیہ نے پہلے "خان بہادر" کے خطاب اور بعد ازاں "سر" کے خطاب سے سرفراز کیا۔

"خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہوگئیں"

۶۔ مسٹر سیّد عبدالعزیز، وزیر تعلیم بہار

مسٹر سید عبدالعزیز ۱۸۸۵ء میں پیدا ہوئے اور ۷ جنوری ۱۹۴۸ء کو انتقال کیا۔ آپ کے والد کا نام سید حفاظت حسین تھا۔ موصوف ایک مشہور طبیب تھے اور زیادہ تر رئیسوں، زمینداروں اور راجاؤں کا علاج کیا کرتے تھے۔ آپ کا اصلی وطن پھلواری شریف تھا اور موصوف کی شادی نیورہ کے خاندان میں ہوئی تھی۔ اس طور سے مسٹر عزیز کی نانیہال نیورہ تھا۔ چونکہ مسٹر عزیز کے والد برابر پھلواری شریف سے باہر رہتے تھے موصوف کی پرورش و پرداخت زیادہ تر نیورہ میں

ہوئی۔ گھر پر فارسی اور اردو کی تعلیم حاصل کر کے مسٹر عزیز نے اپنا داخلہ پٹنہ کولجیٹ اسکول میں لیا اور انٹرنس پاس کرنے کے بعد پٹنہ کالج اور بی۔ این کالج میں تعلیم حاصل کی۔ کچھ دنوں بعد بیرسٹری کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے لندن گئے اور ۱۹۱۱ء میں مڈل ٹمپل سے امتحان پاس کر کے بیرسٹر ہوئے اور ہندوستان واپس آئے۔ ۱۹۱۳ء میں کلکتہ ہائی کورٹ کے بیرسٹر ہوئے اور جب پٹنہ ہائی کورٹ قائم ہوا تو ۱۹۱۶ء میں اسی عدالت عالیہ میں بحیثیت بیرسٹر کام کرنا شروع کیا اور نمایاں کامیابی حاصل کی۔ انگلستان میں قیام کے دوران موصوف اپنے انگریز دوستوں میں نہایت ہر دلعزیز تھے چنانچہ جب پٹنہ آئے تو ان کے دو انگریز دوست مسٹر گوڈا اور مسٹر فاکنر بھی ان کے ہمراہ آئے اور مسٹر عبدالعزیز کے ساتھ عرصہ تک قیام پذیر رہے۔ ان دونوں حضرات نے ایک موٹر کا کارخانہ قائم کیا اور میونسپلٹی سے ٹھیکہ لے کر شہر کی خاص سڑکوں پر گیس کی روشنیاں لگائیں جو اس زمانے میں پٹنہ کے لیے ایک انوکھی چیز سمجھی جاتی تھی۔ جب تک پٹنہ شہر میں الکٹرک روشنی کا انتظام نہ ہوا یہی گیس کی بتیاں شہر کی بڑی سڑکوں کو منور کرتی رہیں۔ کچھ عرصہ بعد موصوف کے ایک انگریز دوست نے پٹنہ میں انتقال کیا اور دوسرے دوست نے کافی رقم کمائی اور انگلستان واپس چلے گئے۔

مسٹر سید عبدالعزیز بہار کے ایک نہایت ہی کامیاب فوجداری کے بیرسٹر تھے اور مقدمات میں ایمانداری اور تندہی سے کام کیا کرتے تھے۔ مؤکل کے حقوق کے تحفظ کے لیے عدالتوں میں ہمیشہ آمادہ رہتے تھے۔ مقدمات میں سخت محنت کرتے اور چھوٹے چھوٹے واقعات کو بغور مطالعہ کر کے جرح اور بحث میں کام لیتے تھے۔ انگریزی اور اردو دونوں زبانوں پر انھیں کافی عبور تھا۔ گواہوں پر خوب جرح کرتے بحث بھی بڑی اچھی ہوتی اور بحث کا انداز نہایت موثر ہوتا تھا۔ موصوف کو فوجداری کے بڑے سے بڑے مقدمات میں کام کرنے کا اتفاق ہوا اور ہمیشہ نمایاں کامیابی حاصل کی۔ حکومت بہار اور حکومت ہند موصوف کی بڑی قدر کرتی اور بے شمار مقدمات میں حکومت انھیں اپنا بیرسٹر مقرر کیا کرتی تھی۔ آواز بلند اور پرکشش تھی۔ جس عدالت میں کام کرتے حاکم عدالت کا ادب ملحوظ خاطر رکھتے اور حاکم کی تعظیم و تکریم میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھتے تھے۔ اس طریقہ کار سے حاکم عدالت بھی موصوف سے بہت خوش رہتے تھے۔ حکومت ہند نے موصوف کو "دہلی کونسپریسی کیس" میں اپنا بیرسٹر مقرر کیا اور مسٹر عزیز نے اس پیچیدہ مقدمہ میں نہایت شاندار کامیابی حاصل کی۔ ایسے مقدمات میں جن کا تعلق قومی اداروں سے ہوتا تھا کبھی کوئی فیس نہ لی اور اکثر موقعوں پر اپنی جیب سے

کافی رقم خرچ کر دیا کرتے تھے۔ بے گناہوں کے حقوق کو کبھی پامال ہونے نہ دیا۔ ان کی بے شمار خوبیوں کی بدولت لوگ ان کی بڑی عزت کرتے تھے اور موصوف کو "عزیز ملت" کے خطاب سے یاد کرتے تھے۔ مسٹر عبدالعزیز کی زندگی کا بیشتر حصہ پٹنہ بیرسٹری میں گذرا مگر کبھی بھی کسی کو ان سے کوئی شکایت کا موقع نہ ملا۔ ہر مظلوم کی مدد کے لیے ہمیشہ تیار رہتے تھے۔ صاحب موصوف اپنے دور کے ممتاز بیرسٹروں میں تھے اور آج بھی لوگوں کے دلوں میں ان کی محبت و احترام باقی ہے۔

مسٹر سید عبدالعزیز زندگی بھر سماجی کاموں میں سرگرم عمل رہے۔ انجمن اسلامیہ میں اردو پبلک لائبریری قائم کی اور عرصہ دراز تک اس انجمن کے صدر رہے۔ یتیم خانہ خادم الاسلام کی فلاح و بہبود کے لیے کوشاں رہ کر اس یتیم خانہ کو ایک کارآمد ادارہ بنایا۔ اپنی جیب خاص سے ہمیشہ اس کی مالی مدد کرتے رہے اور اپنے اثر و رسوخ کو کام میں لاکر حکومت بہار سے اکثر اس یتیم خانہ کے لیے امداد فراہم کراتے رہے۔ موصوف نے پٹنہ نیو کلب کے قائم کرنے میں بہت دلچسپی لی اور اسے بہت عروج پر پہنچایا۔ بلا تفریق مذہب و ملت عوام الناس کے دکھ و درد کو محسوس کرتے اور ان کی تکلیف کو دور کرنے کے لیے ہزاروں روپیے کی رقم ہر سال خرچ کر دیا کرتے تھے۔ اگر کوئی حاجت مند صاحب موصوف سے اپنی پریشانیوں کا حال بیان کرتا تو آپ ضرور اس کی مدد فرماتے۔ آج سے پچاس برس قبل صوبہ بہار کے شہروں اور دیہاتوں میں بے شمار لوگ مختلف قسم کے امراض چشم میں مبتلا رہتے اور موتیا بند کی بیماری بہت عام ہو گئی تھی۔ غریب لوگوں کی آنکھوں کا آپریشن کرانے کا کوئی معقول انتظام نہ تھا۔ بہت سے لوگ اندھے ہو کر اپنی زندگی نہایت ہی بے بسی اور پریشانی میں گذارتے۔ ان کے لیے اسپتالوں میں جاکر آپریشن کرانا کوئی آسان کام نہ تھا۔ ان حالات سے متاثر ہو کر صاحب موصوف نے فیصلہ کیا کہ ہر سال موسم سرما میں آنکھوں کے آپریشن کرنے کے لیے ایک "بلائنڈ ریلیف کیمپ" ان کی رہائش گاہ کے احاطہ اور "لون" (جو اب گاندھی میدان کہلاتا ہے) میں لگایا جائے، جہاں امیر اور غریب لوگ اپنی آنکھوں کا آپریشن مفت کرائیں۔ اس کار خیر کے لیے موصوف ہر سال ڈاکٹر متھرا داس کو موگا پنجاب سے اچھی فیس دے کر بلاتے اور دس دنوں تک ڈاکٹر موصوف ہر روز تقریباً چار یا پانچ سو مریضوں کی آنکھوں کا آپریشن کیا کرتے تھے۔ ان کی مدد کے لیے پٹنہ کے کچھ ڈاکٹروں اور نرسوں کو بھی فیس دے کر اس کام میں لگاتے تھے۔ بہت سے مریضوں کو عینک اور کھانا بھی مفت دیا جاتا تھا۔ ڈاکٹر متھرا داس مسٹر عزیز کے دوستوں میں تھے

اور پنجاب میں اپنا کل کام چھوڑ کر دس روز کے لیے پٹنہ آجاتے تھے۔ بلائنڈ ریلیف کیمپ کا سلسلہ قریب آٹھ دس سال تک قائم رہا اور بے شمار لوگ جو بینائی سے محروم ہو گئے تھے، ان کی آنکھوں میں اللہ کے فضل سے دوبارہ روشنی آگئی۔ مسٹر سید عبدالعزیز کا یہ ایک بڑا کارنامہ تھا اور ہر سال موصوف اس کام کے لیے پندرہ بیس ہزار روپے خرچ کیا کرتے تھے۔ ڈاکٹر عبدالغفور مالک گرین میڈیکل ہال اس کام میں پیش پیش رہتے تھے۔ مسٹر سید عبدالعزیز اس نیک کام کو نہایت ہی خلوص اور محبت سے انجام دیتے رہے۔ ہر سال بے شمار ہندو بھی ان کی اس فیاضی سے مستفیض ہوتے اور اپنی آنکھوں میں نئی بصارت لے کر گھر واپس جاتے تھے۔ موصوف ایک نہایت ہی بلند حوصلہ اور صاحب کردار انسان تھے اور کبھی بھی انھوں نے ہندو اور مسلمان میں کوئی فرق نہ کیا۔

۱۹۳۴ء میں صوبہ بہار میں ایک نہایت سخت زلزلہ آیا جس سے لاکھوں انسان متاثر ہوئے۔ مسٹر سید عبدالعزیز اس زمانے میں حکومت بہار کے وزیر تھے۔ صاحب موصوف نے ہر طور سے مصیبت زدگان کی مدد کی۔ اپنے مکان کا ایک حصہ جو چند ماہ پہلے تعمیر ہوا تھا ڈاکٹر راجندر پرشاد کے حوالہ کیا جس میں انھوں نے "سنٹرل ریلیف کمیٹی" کا صدر دفتر قائم کیا اور مکان کا یہ حصہ "دی ریلیف" کے نام سے بہت دنوں تک قائم رہا۔ تقسیم ہند کے بعد یہ مکان ہندوؤں کے قبضہ میں چلا گیا اور ان لوگوں نے اس تاریخی نام کو قائم نہ رکھا۔ یہ مکان اگزبیشن روڈ پر واقع ہے۔

مسٹر سید عبدالعزیز فن تعمیر میں بڑی دلچسپی رکھتے تھے اور اپنے مکانوں کو نہایت ہی ہنرمندی اور نفاست سے تعمیر کرا کر اچھے اچھے ناموں سے موسوم کیا کرتے تھے۔ اپنے شاندار رہائشی مکان کا "دلکشا" نام رکھا اور اس کے متصل جو دوسرا مکان تھا اس کو "پُرفضا" کے نام سے منسوب کیا۔ موصوف نے اپنی زندگی میں اپنی رہائش گاہ "دلکشا" کو مہاراجہ ہتھوا سے فروخت کیا اور "پُرفضا" کا ایک حصہ خان بہادر مسٹر سید بشیر الدین سے فروخت کیا۔ اسی مکان کا کچھ حصہ ڈاکٹر عبدالغفور نے خریدا جس کو کچھ عرصہ بعد ان کی لڑکی نے بیچ ڈالا اور اب یہاں "اپسرا" سینما کی عمارت کھڑی ہے۔ مسٹر سید عبدالعزیز نے ہمیشہ تجرد کی زندگی بسر کی اور اپنے بھانجوں کو اپنی اولاد سمجھتے رہے تقسیم ہند کے بعد یہ لوگ پاکستان چلے گئے۔ اور حکومت ہند نے مکانوں کے کچھ حصوں کو جن پر مسٹر سید عبدالعزیز کے بھانجوں کا قبضہ تھا نیلام کر کے فروخت کر دیا اور ان کی کل جائداد دوں کو ہندوؤں نے خریدا اور ان پر قابض ہیں۔

مسٹر سید عبدالعزیز ایک نہایت دوست پرور اور مہمان نواز انسان تھے۔ ہر روز دو چار مہمان ان کے ساتھ آکر ٹھہرتے اور ان کی خوب پذیرائی ہوتی تھی۔ موصوف کا دسترخوان بہت وسیع تھا اور ہر ماہ دعوتیں ہوا کرتی تھیں جن میں ہر طبقہ اور مختلف سیاسی خیال کے لوگ شریک ہوتے تھے۔ تقریباً پندرہ سال تک عید کے روز اور دو دنوں بعد تک بے شمار لوگوں کو دعوت دے کر بلاتے اور نہایت لذیذ کھانے کھلاتے۔ موصوف کی یہ دعوت "مغلیہ ڈنر" کے نام سے مشہور تھی۔ اس زمانے میں افغانیوں کی ایک بڑی تعداد پٹنہ میں مقیم تھی اور یہ لوگ تین دنوں تک "مغلیہ ڈنر" میں حاضر رہا کرتے تھے موصوف گورنر اور انگریز حکام کو اکثر اپنے یہاں مدعو کرتے اور اچھے کھانے انگریزی ٹھاٹ باٹ سے کھلاتے تھے۔ اپریل ۱۹۳۵ء میں جب سر جون ہبک گورنر بہار کے ایکزیکیٹو کونسل کے ممبر ہوئے تو صاحب موصوف نے ان کے اعزاز میں ایک نہایت ہی شاندار دعوت دی جس میں ڈیڑھ سو مہمان شریک ہوئے۔ ہر مہمان کے لیے میز پر الگ الگ کرسیاں لگائی گئی تھیں۔ آٹھ کورس کا ڈنر تھا اور ہر کورس پر رکابیاں بدل دی جاتی تھیں۔ کھانے کا انتظام شاید کلکتہ کے کسی انگریزی ہوٹل نے کیا تھا۔ دعوت آٹھ بجے شب کو "دلکشا" کے کھلے میدان میں دی گئی تھی۔ اس دعوت میں عمائدین شہر کے علاوہ بڑے بڑے گورے اور کالے حکام شریک تھے۔ راقم نے پٹنہ میں ایسی دعوت بہت کم دیکھی ہے۔ دس پندرہ سال پہلے برادر مرحوم مسٹر سید حیدر امام بیرسٹر پٹنہ مارکیٹ نہایت ہی فیاضی سے دوستوں کی دعوتیں کیا کرتے تھے۔ ان کے قضا کر جانے کے بعد شہر عظیم آباد کی یہ پرانی روایت ختم ہوگئی۔ بھارت کی آزادی کے بعد پٹنہ اور صوبہ بہار کے تمام مسلمان ان چالیس سالوں میں نہایت ہی مالی اور معاشی بدحالی میں مبتلا ہو گئے ہیں اور مجبوراً اپنی روایتی فیاضیوں کو کام میں نہیں لا سکتے ہیں عظیم آباد کی اگلی دعوتیں خواب و خیال بن کر رہ گئی ہیں۔ برخلاف اس کے غیر مسلموں کے گھروں میں اور بڑے بڑے ہوٹلوں میں ایسی ایسی شاندار دعوتیں اکثر دی جاتی ہیں، جن کو دیکھ کر راقم حیران رہ جاتا ہے۔ ان ضیافتوں میں شراب پانی کی طرح بہائی جاتی ہے۔ اللہ مسلمانوں کے حال پر رحم فرمائے اور ان کو مفلسی سے نجات دے۔

مسٹر سید عبدالعزیز جب حکومت بہار کے وزیر تھے تو ایک سال انھوں نے انجمن اسلامیہ ہال میں صوبہ بہار کے مختلف اقسام کے اچھے آموں کی نمائش لگوائی جس کو سب لوگوں نے بہت پسند کیا۔ بے شمار کالے اور گورے حضرات اس نمائش میں شریک ہوئے اور اچھے اچھے آموں کو خرید کر

گھرے جاتے تھے۔ نمائش کے اختتام پر دو خوب صورت بکسوں میں صوبہ بہار کے بارہ قسم کے آموں کو رکھ کر ایک بکس کو باشندگان بہار کی طرف سے وائسرائے ہند کو بھیجا گیا۔ اس تحفہ کو وائسرائے نے نہایت ہی شکریہ کے ساتھ قبول کیا۔ دوسرا بکس نہایت ہی آب و تاب سے سجا کر شہنشاہ جارج پنجم کی خدمت میں بطور تحفہ حکومت ہند کے توسل سے روانہ کیا گیا۔ جب یہ دوسرا تحفہ لندن پہنچا تو شہنشاہ ہند کے دفتر خصوصی نے اس کو فوراً ہندوستان واپس بھیج دیا اور واپس بھیجے جانے کی وجہ یہ بتائی گئی کہ قاعدے کے مطابق شہنشاہ ہند کسی وزیر کا تحفہ قبول نہیں کر سکتے ہیں۔ جب یہ بکس ہندوستان واپس آیا تو اخباروں نے اس خبر کو سرخی لگا کر شائع کیا اور اپنی ناراضگی کا اظہار بھی کیا کیونکہ یہ تحفہ باشندگان بہار کی طرف سے تھا اور اس کی قبولیت میں کوئی قباحت نہ تھی۔ اس آموں کی نمائش میں راقم بھی شریک تھا اور خلیل احمد عرف بندھو مختار ساکن سبزی باغ پٹنہ جن کے بہت سے آموں کے باغات تھے اس موقع پر پیش پیش تھے۔

مسٹر سید عبدالعزیز صوبہ بہار کی سیاست میں برابر حصہ لیتے رہے۔ ۱۹۲۶ء، ۱۹۳۰ء اور ۱۹۳۷ء میں صوبہ کی لیجس لیٹو اسمبلی کے ممبر منتخب ہوئے اور ان تینوں موقعوں پر انتخاب میں نہایت شاندار کامیابی حاصل کی۔ ۱۵ جنوری ۱۹۳۴ء کو حکومت بہار نے انھیں وزیر تعلیم مقرر کیا اور وہ اس عہدہ پر ۱۹۳۷ء تک فائز رہے۔ دوران وزارت ان کا شمار ہندوستان کے نامور وزراء میں ہوتا رہا۔ جب وہ وزیر مقرر ہوئے تو بہار میں ایک ایسا شدید زلزلہ آیا جس کی تباہ کاری کا اثر صوبہ بہار پر عرصہ دراز تک رہا۔ بحیثیت وزیر صاحب موصوف نے اپنی ان تھک کوششوں سے باشندگان بہار کو بہت راحت پہنچائی۔ پورے صوبہ بہار کا دورہ کیا اور ان سب اسکول اور کالج کی عمارتوں کو جو بری طرح متاثر ہوئی تھیں چند ماہ کے اندر مرمت کرا دیا جس کی وجہ سے طلباء کو بہت کم تعلیمی نقصان اٹھانا پڑا۔ خدا بخش لائبریری کو بھی زلزلہ سے بہت نقصان پہنچا تھا اور اس کی بالائی منزل بری طرح سے متاثر ہوئی تھی۔ صاحب موصوف نے حکومت بہار کو تجویز پیش کی کہ لائبریری کے احاطہ میں ایک نئی عمارت جلد تعمیر کی جائے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور لائبریری کی نئی خوب صورت عمارت بہت جلد تعمیر ہو گئی۔

صاحب موصوف اپنی وزارت کے زمانے میں اردو زبان و ادب کی ترقی و ترویج کے لیے کوشاں رہے اور بہار میں جو چند اردو کانفرنسیں ہوئیں ان کی صدارت بھی کی۔ اردو

مصنفین، شعراء اور نثر نگاروں کی مالی مدد کر کے ان کی ہمت افزائی فرمائی۔ مبارک عظیم آبادی کی نظموں کا مجموعہ بنام "مرقع سخن" دو جلدوں میں سرکاری خرچ سے چھپوایا۔ افسوس ہے کہ یہ مجموعہ کلام دوبارہ شائع نہ ہو سکا اور اب مفقود ہے۔

علامہ سید سلیمان ندوی اور چند علماء کی مدد سے بہار مدرسہ اگزامینشن بورڈ کا نیا نصاب تیار کرایا اور صوبہ بہار کے کچھ نامور مدارس کو سرکاری فنڈ سے اچھی رقمیں بطور امداد دلوائیں۔

بحیثیت وزیر حکومت بہار نے صاحب موصوف کو زراعت، صنعت وحرفت، امداد باہمی اور تعلیم کے محکمے سپرد کیے تھے۔ اس زمانے میں بہار کے کاشت کار نہایت غربت کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ صاحب موصوف نے چھوٹے کاشت کاروں کو محکمہ امداد باہمی سے قرض دلا کر ان کی مالی حالت کو بہتر بنایا۔ گھریلو صنعتوں کی بھی مالی حالت کو بہتر بنایا۔ گھریلو صنعتوں کو اچھی مالی مدد دلوا کر ترقی کی راہ پر گامزن کیا۔ صوبہ بہار و اڑیسہ کے کوٹیج انڈسٹریز کے بنائے ہوئے سوتی کپڑے خصوصاً چادریں اور پردے نہایت مقبول ہوئے اور ہندوستان میں ہر جگہ فروخت ہوئے تھے۔ تعلیم کے ہر شعبہ میں اچھی ترقی ہوئی۔ اور اس دور میں ابتدائی اور ثانوی تعلیم کو بہت فائدہ پہنچا۔

مسٹر سید عبدالعزیز ایک نہایت ہی دور اندیش انسان تھے۔ ۲۹ دسمبر ۱۹۳۴ء کو انڈین اکونومک کانفرنس کا اٹھارہواں اجلاس پٹنہ میں منعقد ہوا۔ اس جلسہ میں بے شمار ماہرین نے شرکت کی جو ملک کے ہر حصہ سے آئے تھے۔ بحیثیت وزیر تعلیم بہار و اڑیسہ موصوف نے اپنی افتتاحی تقریر میں چند مسائل کا تذکرہ کیا جو اس زمانے میں صوبہ بہار و اڑیسہ کو درپیش تھے اور ماہرین حضرات کی توجہ ان مشکل مسائل کی طرف مبذول کراتے ہوئے ان سے ان کا حل طلب کیا۔ آج سے ۵۲ برس پہلے جب کسی کے ذہن میں خاندانی منصوبہ بندی کا خیال پیدا نہ ہوا تھا صاحب موصوف نے اس کانفرنس میں بہار کی بڑھتی ہوئی آبادی پر اپنے تردد کا اظہار کیا اور ہندوستان کی بڑھتی ہوئی آبادی کی طرف توجہ دلائی۔ ان دنوں صوبہ بہار میں ترہت کے علاقے کی بڑھتی ہوئی آبادی تشویش کا سبب بنتی جا رہی تھی۔ اس کو روکنے کا کوئی معقول طریقہ تلاش کرنا صاحب موصوف کے خیال میں ماہرین کا ایک اہم فریضہ تھا۔ صاحب موصوف کی اس تقریر کا کتابچہ بالکل نایاب ہو گیا ہے مگر اس کی ایک کاپی راقم کے پاس موجود ہے۔

۱۹۳۷ء میں "DYARCHY" کا خاتمہ ہوگیا اور اسی سال مسٹر سید عبدالعزیز کی وزارت بھی ختم ہوگئی۔ حکومت برطانیہ نے ۱۹۳۷ء میں ایک نیا دستور ہندوستان کے لیے نافذ کیا۔ جب اس آئین کے تحت انتخابات ہوئے تو سب سے بڑی پارٹی کانگریس کی تھی اور اس کے بعد تعداد کے لحاظ سے مسلم انڈپینڈنٹ پارٹی تھی۔ تشکیل وزارت میں جب کانگریس نے حصہ لیا تو مسلم انڈپینڈنٹ پارٹی نے وزارت بنائی اور مسٹر محمد یونس بہار کے وزیر اعلیٰ ہوئے۔ کچھ دنوں بعد کانگریس پارٹی تشکیل وزارت پر راضی ہوگئی اور اپنی وزارت بنائی۔ ۱۹۴۰ء میں صاحب موصوف کو حضور نظام نے حیدر آباد دکن میں اپنی حکومت کا قانونی اور امور مذہبی کا ممبر مقرر کیا اور مسٹر عزیز نے نہایت ہی خوش اسلوبی سے اپنے کاموں کو انجام دے کر حیدر آباد میں کافی شہرت حاصل کی۔ موصوف نے اپنی حیدر آباد کی دور وزارت میں ایک قانون مرتب کرا کر گداگری کو ممنوع قرار دلوایا اور مفلسوں کے لیے آرام سے رہنے کی جگہیں قائم کرائیں۔

آل انڈیا مسلم لیگ کا سالانہ جلسہ پٹنہ میں دسمبر ۱۹۳۸ء میں ہوا اور موصوف Reception committee (رسیپشن کمیٹی) کے چیرمین تھے۔ اپنی انتھک کوششوں سے اس جلسہ کو نہایت کامیاب بنایا۔ آج تک ایسا عظیم الشان جلسہ پٹنہ میں کبھی نہیں ہوا تھا۔ اس موقع پر موصوف نے بے انتہا خراج تحسین حاصل کیا اور یہ ان کا ایک بڑا کارنامہ تھا۔ صاحب موصوف عرصہ تک بہار مسلم لیگ کے صدر رہے اور مسٹر محمد علی جناح تمام اہم باتوں میں ان سے مشورہ کیا کرتے تھے۔ صاحب موصوف اپنی بلند ہمتی، دلیری، اور قومی خدمت کے لیے ہمیشہ مشہور رہے، جو بھی کام کیا اسے نہایت سرگرمی سے پایۂ تکمیل کو پہنچایا۔ مسٹر سید عبدالعزیز ہندوستان کے نامی قومی لیڈروں میں تھے اور اپنی خدمات کے لیے ہمیشہ یاد کیے جائیں گے۔

مسٹر سید عبدالعزیز بہار و اڑیسہ لیجس لیٹو کونسل میں مسلمانوں کے جائز حقوق کے لیے ہمیشہ اپنی آواز بلند کرتے رہے اور مسلمانوں کے حقوق کو کبھی بھی پامال نہ ہونے دیا۔ ۱۸۔۱۹؍ مارچ ۱۹۳۰ء کو بہار لیجس لیٹو کونسل میں موصوف نے ان مظالم کے متعلق جو دھرم پور اور دوسرے علاقوں کے مسلمانوں پر ہو رہے تھے ایک سوال اٹھایا۔ دو دنوں تک مسلمانوں کے حقوق کی تحت پامالی کے بارے میں بحث کی جس سے متاثر ہو کر حکومت بہار نے مسلمانوں کو کچھ مراعات عطا کیں۔ اس زمانے میں بہار صوبائی مسلم کانفرنس ایک نہایت ہی فعّال سیاسی تنظیم تھی اور بہار کے مسلمانوں

کے حقوق کی نگہبانی کیا کرتی تھی۔ کانفرنس نے مسٹر سید عبدالعزیز کی معرکۃ الآرا تقریر جو انھوں نے کونسل میں کی تھی اس کا ایک کتابچہ تیار کر کے ۵۰ برس پہلے پٹنہ سے شائع کیا۔ اس کا ایک نسخہ راقم کے پاس اب تک محفوظ ہے۔ بھارت کی آزادی کے بعد بہار میں مسلمان پریشانی، زبوں حالی اور بے روزگاری کے شکار ہیں اور ان کی حالت قابلِ رحم ہے۔ نہایت افسوس کی بات ہے کہ ان دنوں بہار میں کوئی تنظیم ایسی نہیں ہے جو مسلمانوں کے حقوق کی نگہبانی کر سکے۔

قیام حیدرآباد کے آخری دور میں مسٹر سید عبدالعزیز کی صحت خراب ہوگئی اور موصوف پٹنہ واپس چلے آئے۔ بہت کچھ علاج ہوا مگر صحت یاب نہ ہو سکے۔ ۷ جنوری ۱۹۴۸ء کو صبح سویرے اپنی رہائش گاہ واقع اکزیبیشن روڈ میں انتقال کر گئے۔ نماز جنازہ میں بے شمار لوگوں نے شرکت کی۔ مرحوم کا جسد خاکی اسی روز خورۃ کے قبرستان میں دفن کر دیا گیا۔

" حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا "

۷۔ مسٹر محمد یونس، وزیر اعلیٰ بہار

مسٹر محمد یونس کی پیدائش ۴۔ مئی ۱۸۸۴ء کو پنہرا گاؤں ضلع پٹنہ میں ہوئی۔ صاحب موصوف کے والد اپنے زمانے کے ایک مشہور اور کامیاب مختار تھے۔ مسٹر محمد یونس بہار کے ایک نامور خاندان کے فرد تھے۔ آپ کے مورث اعلیٰ حضرت شاہ ابراہیم ملک بیا بحیثیت مجاہد بہار آئے اور ان کا مقبرہ بہار شریف کی پہاڑی پر واقع ہے۔ موصوف کی ابتدائی تعلیم اپنے گھر ہی پر ہوئی۔ اردو، فارسی اور عربی کی تعلیم مکمل کر کے ان کا داخلہ پٹنہ کولیجیٹ اسکول میں ہوا۔ انھوں نے اس اسکول سے انٹرنس کے امتحان میں کامیابی حاصل کی اور بعد ازاں اعلیٰ تعلیم کے لیے اپنا داخلہ پٹنہ کالج میں کرایا۔ کالج کے قیام کے دوران صاحب موصوف کرکٹ کے کھیل میں کافی حصہ لیتے تھے۔ اس کھیل میں اتفاقاً ایک مرتبہ چوٹ لگ گئی اور کرکٹ کا کھیلنا ترک کر دیا۔

صاحب موصوف بیرسٹری کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے ۱۹۰۳ء میں لندن گئے اور ۲۶ جنوری ۱۹۰۶ء کو مڈل ٹیمپل سے بیرسٹر ہو کر پٹنہ واپس آئے۔ ۱۹۰۶ء میں بحیثیت بیرسٹر کلکتہ

ہائی کورٹ میں اپنا نام درج کرایا اور جب پٹنہ ہائی کورٹ قائم ہوا تو اس عدالت عالیہ کے بیرسٹر ہوئے۔ اپنے پیشہ میں بہت کامیابی حاصل کی خصوصاً جینش کے مقدموں میں ان کی پریکٹس خوب چلی۔ ۱۹۳۰ء میں راقم جب چھپرہ میں وکالت کرتا تھا تو ایک مرتبہ موصوف کے ہمراہ جونیر وکیل کی حیثیت سے مجھے کام کرنے کا موقع ملا۔ جرح اور بحث دونوں ہی نہایت خوبی سے کیا کرتے تھے اور حاکم کو بھی خوش رکھنا خوب جانتے تھے۔ انگریزی فصاحت کے ساتھ ٹھہر ٹھہر کر بولتے جس سے حاکم بہت متاثر ہوتا تھا۔ ایک اینگلو انڈین خاتون مس ڈورن سے جنسی تعلقات کی بنا پر ایک بنگالی ڈاکٹر پر مقدمہ قائم کیا گیا۔ اس سنسنی خیز مقدمہ میں پٹنہ کے متعدد نوجوانوں کی دلچسپی تھی۔ کامیابی حاصل کرنے کے بعد صاحب موصوف نے لوگوں کے اصرار پر مقدمہ کی کل روئداد کو ایک کتابچہ کی شکل میں شائع کرا کر فروخت کرایا۔ صاحب موصوف پٹنہ ہائی کورٹ میں بحیثیت بیرسٹر اچھی شہرت رکھتے تھے اور ہر جگہ قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ جب دہلی میں فیڈرل کورٹ قائم ہوا تو انھوں نے وہاں بھی اکثر مقدموں میں کام کیا اور کامیابی حاصل کی۔

مسٹر محمد یونس بیرسٹری کے ساتھ مختلف سماجی اور سیاسی کاموں میں بھی حصہ لیا کرتے تھے بارہ سال تک بہار ینگ مین ایسوسی ایشن کے سکریٹری رہے اور انسٹی ٹیوٹ کی عمارت کی تعمیر میں کافی دلچسپی لی۔ کئی سال تک بہار اسٹوڈنٹس ایسوسی ایشن کے صدر رہے۔ پٹنہ سیٹی میونسپلٹی میں تین مرتبہ بحیثیت میونسپل کمشنر منتخب ہوئے۔ ۱۹۰۸ء میں کانگریس کے لاہور سیشن میں ڈیلی گیٹ کی حیثیت سے شرکت کی۔ ۱۹۱۶ء میں امپریل لیجس لیٹو کونسل کے ممبر ہوئے۔ ۱۹۲۱ء اور ۱۹۳۲ء میں بہار لیجس لیٹو کونسل کے ممبر چنے گئے۔ موصوف جہاں بھی رہے اپنے فرائض کو بحسن و خوبی انجام دیا کرتے تھے۔ نئے قانون ہند کے تحت ۱۹۳۷ء میں بہار لیجس لیٹو کونسل کے ممبر ہوئے اور بہار مسلم انڈپنڈنٹ پارٹی کے لیڈر چنے گئے۔ کونسل کے اندر کانگریس پارٹی کے بعد انڈپنڈنٹ پارٹی سب سے بڑی پارٹی تھی۔ جب کانگریس پارٹی نے اصولاً وزارت سازی سے انکار کر دیا تو گورنر بہار نے مسٹر یونس کو وزارت تشکیل کرنے کے لیے طلب کیا۔ صاحب موصوف نے وزارت تشکیل کی اور بحیثیت وزیر اعظم و پریمیر اپنے عہدہ کا حلف لیا۔ نواب عبدالوہاب خاں، کمار اجیت پرشاد سنگھ اور بابو گرسہائے لال کو اپنی کابینہ میں وزیر بنایا۔ گرچہ صاحب موصوف کی وزارت عظمیٰ کی مدت بہت تھوڑی رہی مگر انھوں نے دوران حکومت چند مفید خدمات انجام دیں۔ عدالت کے کاموں

میں ہندی رسم الخط کے ساتھ اردو رسم الخط کو بھی جاری کرنے کا حکم صادر کیا اور یہ ان کا ایک بڑا کارنامہ ہے۔ بیرسٹری کے علاوہ صاحب موصوف کاشت کاری اور تجارت کے کاموں میں بھی مشغول رہا کرتے تھے۔ اپنی زمین پر جدید طریقہ سے کھیتی کراتے جس سے انھیں بہت نفع ہوا کرتا تھا۔ مسٹر یونس بہار بختیار پور لائٹ ریلوے کے چیئرمین تھے۔ فریزر روڈ پر گرانڈ ہوٹل قائم کیا اور یہ انگریزی طرز کا ہوٹل اب تک چل رہا ہے۔ اورینٹ بنک اور بہار یونائیٹڈ لائف انشورنس کمپنی کو قائم کر کے ان کے مینیجنگ ڈائرکٹر اور چیئرمین ہے۔ صاحب موصوف کا ایک انگریزی پریس بھی تھا جہاں سے ان کا ایک روزانہ اخبار بنام "پٹنہ ٹائمس" نکلا کرتا تھا۔ پریس، اخبار، ہوٹل، بینک، انشورنس کمپنی اور لائٹ ریلوے کے کل کاموں کو اپنی نگرانی میں کراتے تھے۔ اتنے کاموں کو بیک وقت خوبی سے انجام دینا ہر آدمی کے بس کی بات نہیں ہے۔

مسٹر یونس کی پہلی شادی ۱۹۰۲ء میں مولوی عبدالجبار وکیل ساکن مرزا پور اتر پردیش کی اکلوتی صاحبزادی سے ہوئی۔ اہلیہ محترمہ کے قضا کر جانے کے عرصہ بعد موصوف کی دوسری شادی "ڈاکٹر حبیب الرحمن ساکن ارکی ضلع گیا کی بڑی صاحبزادی سے ہوئی۔ پہلی بیوی سے دو لڑکے محمد یسین یونس اور محمد یعقوب یونس پیدا ہوئے۔ دوسری اہلیہ سے جن کا انتقال چند سال قبل ہوا کوئی اولاد نہ ہوئی۔ ۱۹۳۳ء میں موصوف نے فریضہ حج ادا کیا اور مدینہ منورہ کی زیارت سے مشرف ہوئے۔ اس سفر حج کے دوران مشرق وسطیٰ، عرب اور شمالی افریقہ کے مسلم ممالک کا بھی سفر کیا۔ ۱۳؍ مئی ۱۹۵۲ء کو لندن میں انتقال کیا اور "بروک وڈ" کے مسلم قبرستان میں مدفون ہوئے۔

میرے والد الحاج خان صاحب احمد حسین مرحوم اور مسٹر محمد یونس مرحوم کے زندگی بھر اچھے تعلقات رہے۔ ان حضرات نے پٹنہ کولیجیٹ اسکول میں تعلیم پائی تھی اور اسی زمانے سے ان دونوں میں دوستی ہو گئی تھی۔ صاحب موصوف والد مرحوم سے سن میں دو سال بڑے تھے اور اس سبب سے والد مرحوم ان کا احترام مثل بڑے بھائی کے کیا کرتے اور بہت سے کاموں میں ان سے مشورہ بھی لیتے تھے۔

مسٹر محمد یونس میرے خسر مسٹر ریاست حسین بیرسٹر کے بڑے مخلص اور بڑے عزیز دوست تھے اور ان لوگوں کی دوستی میں زندگی بھر فرق نہ آیا۔ یہ دونوں حضرات مڈل ٹمپل لندن میں بیرسٹری کی تعلیم حاصل کرتے تھے اور اسی زمانے سے ان لوگوں کے درمیان بعید برادرانہ تعلقات

قائم ہو گئے تھے۔ مسٹر محمد یونس، مسٹر ریاست حسین سے دو برس پہلے بیرسٹر ہو کر ہندوستان واپس چلے آئے۔ ان کی واپسی سے مسٹر ریاست حسین کو بہت پریشانی اور اکیلا پن محسوس ہونے لگا۔ صاحب موصوف اکثر کہا کرتے تھے کہ مسٹر محمد یونس کی کمی ہر جگہ اور ہر موقع پر مجھے ستاتی تھی ہر ہفتہ مسٹر محمد یونس کو آکسفورڈ سے خط لکھا کرتے تھے اور صاحب موصوف بھی پٹنہ اور بہار کی کل باتوں اور خبروں سے انھیں آگاہ کیا کرتے تھے۔ مسٹر ریاست حسین انگلستان میں سات سال تعلیم کی غرض سے مقیم رہے اور جب ہندوستان واپس آئے تو پٹنہ میں بیرسٹری شروع کی جہاں مسٹر یونس بھی بیرسٹری کیا کرتے تھے۔ یہ دونوں حضرات ہمیشہ ایک دوسرے سے بہت نزدیک رہے اور دوستی کا پورا حق ادا کیا۔ مسٹر محمد یونس مرحوم ایک نہایت ہی سنجیدہ اور منتظم انسان تھے۔ انھوں نے بارہا مسٹر ریاست حسین مرحوم کو ان کی فضول خرچیوں سے روکنا چاہا مگر صاحب موصوف کسی کی بات نہ مانتے تھے، آخر کار اپنی کل جائداد کو جس کی قیمت اس زمانے میں کئی لاکھ روپے تھے برباد کر دیا اور ۴۵ سال کی عمر میں قضا کر گئے۔ مسٹر محمد یونس کو ان کی بے وقت موت پر بڑا صدمہ ہوا اور اکثر انھیں یاد کرتے اور افسوس کے ساتھ صاحب موصوف کا تذکرہ کیا کرتے تھے۔ ایسے عزیز دوست اب کہاں ملتے ہیں۔

تقریباً تیس سال تک مسٹر محمد یونس مرحوم کو راقم نے بہت نزدیک سے دیکھا ہے اور موصوف کی خوبیوں کو پرکھنے کا کافی موقع ملا۔ موصوف نہایت ہی ذہین، خوش خلق اور بلند حوصلہ انسان تھے۔ اپنے فرائض کو خوب سمجھتے تھے اور بڑی زبردست قوت عمل کے حامل تھے۔ کبھی کسی کے احسان کا بوجھ نہ اٹھایا اور اپنے کاموں میں نہایت ہی سرگرم رہے۔ زندگی بھر قومی کاموں کو بحسن و خوبی انجام دیتے رہے اور ہر موقع پر جرأت کے ساتھ اپنے خیالات کا اظہار کیا کرتے تھے۔ جب لارڈ سنہا بہار کے گورنر ہو کر آئے تو مسٹر محمد یونس مرحوم کو ججی کے عہدہ پر مقرر کرنا چاہا مگر موصوف نے معذرت کے ساتھ اس جلیل القدر عہدہ کو قبول کرنے سے انکار کر دیا اور اس دور میں یہ کوئی معمولی بات نہ تھی۔ موصوف ایک نہایت ہی صابر انسان تھے جب ان کے ہونہار لڑکے مسٹر محمد یٰسین یونس کا انتقال ہوا تو صاحب موصوف نے اس جانکاہ صدمہ کو نہایت صبر کے ساتھ برداشت کیا۔ اور راقم سے کہا کہ موت اور حیات اللہ کے ہاتھ میں ہیں۔ انسان مجبور محض ہے اور اس کو راضی برضا رہنا چاہیے۔ جب راقم سے یہ باتیں ہو رہی تھیں تو ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ میں

ان کے آنسوؤں کو برداشت نہ کر سکا اور کمرے سے روتا ہوا باہر نکل آیا۔ یسین اسکول میں میرے ہم جماعت تھے اور راقم کے بڑے بے تکلف دوست بھی تھے۔

راقم کو مسٹر محمد یونس مرحوم کی شفقت اور مروت کا تذکرہ کر دینا بھی نہایت ضروری معلوم ہوتا ہے۔ صاحب موصوف میری اہلیہ کو مثل اپنی بیٹی کے مانتے تھے اور وہ میری خوش دامن اور میری اہلیہ سے ملنے کے لیے میری قیام گاہ پر اکثر آجایا کرتے تھے۔ ان دنوں میں پٹنہ کالج میں لکچرر تھا اور محلہ پیر بہور میں کرایہ کے ایک مکان میں رہا کرتا تھا۔ یہ مکان ایک تنگ گلی میں واقع تھا اور صاحب موصوف کی تشریف آوری اس مکان میں زحمت سے خالی نہ ہوتی تھی مگر صاحب موصوف اس کا کچھ خیال نہ کرتے تھے۔ ۲۵ ردسمبر ۱۹۳۰ء کو راقم کی شادی چھپرہ میں ان کے عزیز دوست مسٹر ریاست حسین بیرسٹر کی لڑکی سے ہوئی۔ شادی سے ۵ دن پہلے صاحب موصوف چھپرہ تشریف لائے۔ چونکہ مسٹر محمد یونس ایک نامی بیرسٹر تھے ان پانچ دنوں کے قیام کے دوران بھی انھیں ایک فوجداری مقدمہ میں کام کرنا پڑا۔ جو کچھ آمدنی اس مقدمہ سے ہوئی صاحب موصوف نے اس کو میری اہلیہ کے کپڑوں پر صرف کیا۔ تحفتاً ایک نہایت اچھی قیمتی چادر بھی عطا کی جس کو میری اہلیہ نے عرصہ دراز تک اپنے پاس بہ طور یادگار محفوظ رکھا۔ صاحب موصوف شادی کے موقع پر ہر جگہ پیش پیش رہے۔ مسٹر محمد یونس کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ زندگی بھر انھوں نے کسی کے آگے اپنا سر خم نہ کیا۔ وہ خود فرماتے ہیں:

خم نہ کی گردن کسی حاجت روا کے سامنے
جب جھکا میں تو جھکا اپنے خدا کے سامنے

مسٹر محمد یونس کے بڑے صاحبزادے مسٹر محمد یسین یونس اسکول میں راقم کے ہم جماعت تھے۔ وکیل ہوئے اور بعد میں مڈل ٹمپل سے بیرسٹر ہو کر پٹنہ ہائی کورٹ میں بیرسٹری کرنے لگے تو پٹنہ لا کالج میں قانون کے پروفیسر بھی رہے۔ زندگی نے وفا نہ کی اور تقریباً چالیس سال کی عمر میں ۱۹۴۷ء میں انتقال کیا۔ یسین میرے بہت اچھے دوست تھے۔ جب میں اپنے گاؤں نیورہ میں جا کر قیام کرتا تو وہ میرے یہاں آ کر ایک دو روز تک ٹھہرتے اور ہم لوگوں کا وقت نہایت ہنسی خوشی میں گزر جاتا تھا۔ ہم لوگوں کی دوستی میں کبھی فرق نہ آیا۔ ان کی موت سے راقم کو بہت صدمہ پہنچا۔ یسین اچھی انگریزی بولتے اور لکھتے تھے۔ جب ڈاکٹر ہادی حسن پروفیسر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی کتاب بنام "Persian Navigation" انگلستان میں طبع ہو

رہی تھی تو ان دنوں لیبین کا قیام لندن میں تھا۔ انھوں نے اس کتاب کا پروف شروع سے آخر تک نہایت ہی دیدہ ریزی سے پڑھا اور اس کتاب میں کوئی غلطی باقی نہ رہی۔ ڈاکٹر ہادی حسن اس کام کے لیے لیبین کے بڑے مشکور تھے اور اس کا تذکرہ صاحب موصوف نے مجھ سے کئی بار کیا۔ لیبین نے کبھی بھی اس کا تذکرہ مجھ سے نہ کیا کیونکہ وہ اس طرح کی خدمات کو کوئی اہمیت نہ دیتے تھے اور نہ ان کاموں سے اپنی شہرت حاصل کرنا چاہتے تھے۔ مرحوم وسیع القلب، وضع دار اور دوست پرست انسان تھے۔ ان سے مل کر مجھے بڑی خوشی ہوتی تھی۔ اللہ انھیں غریق رحمت کرے۔

مسٹر محمد یونس کے چھوٹے صاحبزادے مسٹر محمد یعقوب یونس خوش طبعی، شرافت، خلوص اور محبت کے پیکر ہیں۔ موصوف نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے بی۔اے اور ایل ایل بی کی ڈگریاں حاصل کیں اور پٹنہ ہائی کورٹ میں بحیثیت ایڈوکیٹ کے کام کرنا شروع کیا۔ مگر بہت جلد وکالت سے کوئی عملی سروکار نہ رکھا۔ چونکہ صاحب موصوف کی طبیعت علم و ادب کی طرف مائل تھی اس لیے پیشۂ وکالت ان کو پسند نہ آیا اور وہ اس سے بالکل الگ ہو گئے۔ والد کے انتقال کے بعد جب موصوف پر کافی انتظامی ذمہ داریاں پڑ گئیں تو انھوں نے اپنی تھکاوٹ دور کرنے کے لیے شکار اور کتب بینی کے مشاغل اختیار کیے۔ موصوف نے شکار پر انگریزی میں کئی مضامین شائع کیے ہیں۔ "مجلس ادب" کا انعقاد ۱۹۵۹ء میں ہوا اور موصوف اس مجلس کے ایک اہم رکن رہے ہیں۔ اس کی نشستوں میں پڑھنے کے لیے متعدد مضامین لکھے، جن کا مجموعہ "انوکھی باتوں" کے عنوان سے ۱۹۸۵ء میں شائع ہو چکا ہے۔ صاحب موصوف کی ملی معاملات میں دلچسپی ہنوز برقرار ہے اور وہ مسلم مجلس مشاورت کے ایک سرگرم رکن بھی رہے ہیں۔ راقم کے چھوٹے بھائی مسٹر انور حسین مرحوم موصوف کے عزیز دوستوں میں تھے۔ بھائی مرحوم کے قضا کر جانے کے بعد آج تک یعقوب صاحب ان کے اہل خاندان سے نہایت ہی خلوص اور محبت سے ملتے ہیں اور وہ خلوص جو ان دونوں کے درمیان زندگی میں تھا اب تک قائم ہے۔ کوئی ہفتہ ایسا نہیں گزرتا ہے کہ مسٹر محمد یعقوب یونس یا ان کی اہلیہ بیگم انور حسین سے ملنے کے لیے نہ آتی ہوں۔ ایسے مخلصانہ تعلقات اس دور میں بہت کم دیکھنے میں آتے ہیں۔ ان کی اہلیہ محترمہ مسٹر حمید اللہ بیگ سابق چیف جسٹس آف انڈیا کی سگی بھانجی ہیں اور نہایت ہی منکسر مزاج خاتون ہیں۔ ہم سب

لوگوں سے نہایت ہی خلوص سے ملتی ہیں۔

۸۔ مسٹر عبدُالقیوم، وزیرِ حکومتِ بہار

عبدالقیوم کا نام آتے ہی میری زندگی کے ۷۰ سال ذہن میں متحرک اور زندہ ہو جاتے ہیں اور میں اسکول کی کھوئی ہوئی آزاد زندگی کو محسوس کرنے لگتا ہوں۔ عبدالقیوم اور راقم دونوں سہسرام ہائی اسکول کے طالب علم تھے۔ بہار کے اس تاریخی مقام میں میری ان کی ملاقات پہلی بار ۱۹۱۷ء میں ہوئی تھی۔ وہ اپنے بھائی عبدالقدوس کے ساتھ اسکول آتے تھے۔ عنابی رنگ کی ترکی ٹوپی، شیروانی اور پائجامہ میں ملبوس اور یہی ان دنوں شرفا کا لباس تھا۔ وہ ہر روز اپنے والد کے بمبو کارٹ پر سوار ہو کر اپنے بھائی کے ساتھ ڈہری سے سہسرام آیا کرتے تھے۔ ہم دونوں درجہ ہفتم کے طالب علم تھے اور کلاس میں ایک ہی جگہ بیٹھتے تھے۔ اپنی صورت اور سیرت اور لباس سے ان کی شخصیت اسکول کے اندر امتیازی شان رکھتی تھی۔ اسکول کے دور ہی سے ان کا ذوق ادبی و شعری تھا۔ یہ ادبی میلان تدریجاً بڑھتا گیا۔ ترنم سے اشعار پڑھا کرتے تھے اور یہ انداز بہت دنوں تک باقی رہا۔ سیاسی مصروفیتوں اور کارگذاریوں سے ادبی ذوق کے کھل کھیلنے کا موقع نہ مل سکا۔ ادبی ذوق اور ابتدائی علمی سرگرمیوں کی بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ وہ ایک ادیب اور شاعر کی حیثیت سے بھی ممتاز شخصیت کے مالک ہوتے، اگر انھیں اپنے ذوق کی تکمیل کا مناسب ماحول ملتا۔ ڈہری سے تقریباً پچاس سال پہلے "حسن و عشق" نام کا رسالہ ان کی ادارت میں نکلتا تھا۔ یہ رسالہ رومانی قصوں کہانیوں اور ہیجان افروز نظموں کا رسالہ نہ تھا بلکہ تصوفانہ حسن و عشق کا ادراک پیش کرتا تھا۔ اس رسالہ کے متعدد شماروں میں قیوم کے اخلاقی اور عارفانہ مضامین شائع ہوئے تھے۔ اس کے علاوہ ان کی صوفیانہ غزلیں بھی شائع ہوئی تھیں۔ قیوم کا خاندان عالموں اور خدا ترسوں کا خاندان ہے اور اپنے ایسے خاندان کی مخصوص فضا میں ان کے ذہن کی تربیت ہوئی تھی۔ ۱۹۶۵ء میں بیل گاڑی کے حادثہ میں وہ سخت مجروح ہوئے اور کئی مہینوں تک پٹنہ کے جنرل اسپتال میں زیر علاج رہے۔ حادثہ کے بعد جب راقم ان سے ملنے اسپتال گیا تو ان سے کہا کہ آپ کا خاندان عالموں اور مرتاضوں کا خاندان ہے، صدقہ دے دیں تو یہ مصیبت دور ہو جائے گی۔ وہ میری باتوں سے بہت متاثر ہوئے اور میرے کہنے پر عمل کیا۔ اللہ نے انھیں جلد شفا عطا کی۔

مرحوم اکثر مجھ سے اس صدقہ دینے کا تذکرہ کیا کرتے تھے۔ قیوم کو مذہبی رنگ کی پختگی ان کی ننھیال سے ملی تھی۔ ان کے ناناجان محمد عبداللہ صاحب ایک عالم اور صوفی تھے۔ ان کی بزرگی کی شہرت سارے ملک میں تھی اور قیوم کے والد ماجد مولوی عبدالحیٰ صاحب مرحوم اپنی کثیر دولت کے باوجود ایک نہایت ہی منکسر المزاج انسان تھے۔ راقم نے انھیں سہسرام میں اپنے والد مرحوم کے یہاں کئی بار دیکھا تھا اور ان کے اخلاق سے بہت متاثر ہوا تھا۔ اس زمانے میں میرے والد مرحوم سہسرام کے سکنڈ افیسر تھے اور صاحب موصوف کی بڑی عزت کرتے تھے۔

تصورات کی حدیں لامتناہی ہوتی ہیں مگر میں اپنے اسکول کے زمانے میں یہ تصور نہیں کرتا تھا کہ ہندوستان اتنا جلد غلامی کی زنجیروں کو کاٹ پھینکے گا اور ہمیں آزادی حاصل ہوگی اور یہ بھی نہیں سوچ سکتا تھا کہ عبدالقیوم کرسی وزارت پر متمکن ہوں گے۔ یہ تصور کرنا بھی میرے لیے محال تھا کہ عبدالقیوم کی شاندار شیروانی اور ترکی ٹوپی غائب ہو جائے گی اور وہ کھدر کے کرتے اور کھدر کی ٹوپی میں جلوہ گر ہوں گے۔

میں نے عبدالقیوم کو زندگی کے ہر دور میں دیکھا ہے۔ ان کا لڑکپن دیکھا، ان کی جوانی دیکھی اور ان کی زندگی کے آخری زمانہ تک ہم دونوں نہایت ہی عزیز دوست رہے۔ عبدالقیوم بے شمار خوبیوں کے حامل تھے۔ راقم کو ان کی خوبیوں کا اندازہ ان کی ہر باتوں سے ہوتا تھا۔ وہ نمایش کے آدمی نہ تھے اور وہ بے حد شریف، منکسر المزاج اور وسیع القلب انسان تھے۔ دوست بنانے کی صلاحیت انھیں بے انتہا تھی۔ جب بھی راقم ان سے ملتا تو مرحوم نہایت ہی محبت سے ملتے اور گزشتہ باتوں کا تذکرہ کیا کرتے تھے۔ عبدالقیوم اپنے اصولوں کے بڑے پابند تھے۔ ۱۹۵۱ء میں وہ الکشن میں ہار گئے۔ جیسے ہی نئی وزارت کی تشکیل ہوئی انھوں نے سرکاری موٹر کار واپس کر دی اور بہت جلد اپنے بڑے سرکاری مکان کو چھوڑ کر ایک چھوٹے سرکاری بنگلے میں آکر قیام پذیر ہوئے۔ بہ عوض موٹر کار کے شہر میں رکشوں پر نکلتے اور کبھی اس سواری سے کوئی تکلیف محسوس نہ کی۔ ان کی سیاسیات سے میرا کوئی تعلق نہیں رہا۔ کچھ لوگ ان کے سخت مخالف تھے اور راقم سے جب ان کے متعلق شکایتیں کرتے تو میں انھیں یہ جواب دے کر خاموش کر دیتا کہ "اچھا ہے یا برا ہے وہ دوست ہے ہمارا۔" اور یہ جواب سن کر کسی کی ہمت نہ پڑتی تھی کہ راقم کے سامنے کہیں بھی کوئی عبدالقیوم کی شکایت کر سکے۔ مرحوم میدان سیاست میں تاحیات

سرگرم عمل رہے اور سخت سے سخت مشکل حالات میں بھی ان کی پیشانی پر کبھی بھی شکن نہ آتا اور کوئی شکوہ زبان پر نہ لاتے۔ میری زندگی ایک معلم اور منتظم کی رہی ہے لیکن معاشرے کے ایک ذمہ دار انسان ہونے کی حیثیت سے تو میں نہیں کہہ سکتا کہ مجھے سیاست سے کوئی دلچسپی نہ رہی ہو۔ اکثر عبدالقیوم سے مختلف سیاسی مسئلوں پر میری باتیں ہوا کرتی تھیں مگر زیادہ تر ہم لوگوں میں اختلاف رائے ہوا کرتا تھا۔ میں یہ چاہتا تھا کہ وہ کل مسلمان قوم کے رہنما بنیں، مومن اور غیر مومن کے ہنگاموں میں نہ پڑیں مگر مرحوم نے کبھی میری اس رائے سے اتفاق نہ کیا۔ میں کہا کرتا تھا کہ ایسی سیاسی تقسیم غیر اسلامی ہے اور یہ تقسیم و تحریک مسلمانوں کے درمیان اتفاق کے بجائے نفاق پیدا کرے گی۔ میں جب عبدالقیوم سے ملا تھا تو وہ صرف عبدالقیوم تھے، عبدالقیوم انصاری نہ تھے۔ میں نے کبھی انھیں عبدالقیوم انصاری نہ کہا اور برابر یہی دعا کی وہ عبدالقیوم انصاری نہ رہیں بلکہ صرف عبدالقیوم :

عبدالقیوم دینی خدمات کو اپنی زندگی کا بڑا کام سمجھتے تھے۔ نماز اور روزے کے بڑے پابند تھے۔ ان کی نمازیں اور روزے شاید ہی کبھی قضا ہوئے۔ ۱۹۴۵ء میں ڈاکٹر سچدانند سنہا نے پٹنہ یونیورسٹی کے سنیٹ میں عبدالقیوم کو ممبر نامزد کیا اور اس زمانے میں راقم بھی سنیٹ کا نامزد ممبر تھا، پروفیسر عبدالمنان بیدل سنیٹ کے منتخب ممبر تھے۔ ہم لوگوں کے علاوہ سنیٹ میں چند اور مسلم ممبران تھے۔ سنیٹ کے جلسہ میں جب مغرب کی نماز کا وقت آتا تو سب سے پہلے قیوم اٹھ جاتے۔ ان کے پیچھے راقم ہو لیتا اور اس کے بعد دوسرے لوگ بھی نماز میں شریک ہو جاتے تھے۔ نماز یونیورسٹی کے برآمدہ میں ہوتی اور پروفیسر عبدالمنان صاحب امامت کا فرض انجام دیتے تھے۔

عبدالقیوم جو بات کہتے تھے پوری کرتے اور وہ اس معاملہ میں دوسرے وزیروں کے قطعی برعکس تھے۔ ایک واقعہ ۱۹۵۰ء کا ہے۔ اس زمانے میں راقم پٹنہ کالج کومن روم کا صدر تھا اور مسٹر کے پی سنہا کالج کے پرنسپل تھے۔ راقم نے کومن روم کی سالانہ تقریب کے موقع پر عبدالقیوم کو بحیثیت صدر مدعو کیا۔ ہمارے دوستوں کو یہ خدشہ تھا کہ کہیں دوسرے وزیروں کی طرح عبدالقیوم بھی کسی عطیہ کا زبانی وعدہ کر کے نہ چلے جائیں لیکن میں نے نہایت وثوق کے ساتھ کہا کہ میرا دوست ایسا نہیں ہے۔ کومن روم کا پرانا ریڈیو چوری ہو گیا تھا۔ میں نے کومن روم کے طلبا عہدیداروں

کو بتایا کہ وہ مہمان وزیر سے نقد رقم کے عطیہ کا مطالبہ کرنے کے بجائے ایک نئے ریڈیو کی مانگ کریں۔ عبدالقیوم جب کومن اردوم کی تقریب میں آئے تو راقم نے ان سے کہا کہ کومن روم کو ایک ریڈیو کی سخت ضرورت ہے اور آپ اسے خرید وادیجیے۔ عبدالقیوم بغیر کسی چون وچرا کے راضی ہو گئے۔ دوسرے روز راقم اور پرنسپل کے۔ پی سنہا مادھو پور کی ایک ریڈیو کی دکان میں گئے اور چھ سو روپیے کا ایک شاندار ریڈیو کومن روم کے لیے انتخاب کیا اور فون پر عبدالقیوم کو میں نے اس بات کی اطلاع دے دی۔ قیوم نے مجھے فوراً یہ رقم بھجوادی۔ کومن روم کو منشار کے مطابق ایک ریڈیو سٹ مل گیا۔ اس واقعہ کا اثر متعلقہ لوگوں پر پڑا اور یہ سب لوگ عبدالقیوم کے شکر گزار ہوئے۔

۱۹۶۶ء میں میرے چھوٹے لڑکے ڈاکٹر اشرف حسین حکومت بہار کے محکمہ صحت میں سول اسسٹنٹ سرجن مقرر ہوئے۔ ان کی تقرری کے فوراً بعد راقم اپنی اہلیہ کے ساتھ فریضہ حج ادا کرنے کے لیے جانے والا تھا اور اشرف حسین سلمہٗ کو میرے غائبانہ میں گھر پر رہنا نہایت ضروری تھا۔ راقم ڈاکٹر محمود حسن سے جاکر ملا جو اس زمانہ میں محکمہ صحت کے ڈائرکٹر تھے اور استدعا کی کہ اشرف کو چند ماہ کے لیے پٹنہ ہی میں رکھا جائے یا پٹنہ کے قرب وجوار میں تعینات کیا جائے جہاں سے وہ روزانہ پٹنہ آجا سکیں۔ ڈاکٹر محمود حسن نے اشرف حسین کا تبادلہ پٹنہ سے بہت دور سنتھال پرگنہ کے ایک دور افتادہ گاؤں میں کردیا۔ راقم نے بہت منت سماجت کی مگر وہ اپنے حکم نامہ میں کسی قسم کی کوئی تبدیلی کرنے کو تیار نہ تھے۔ عبدالقیوم ان دنوں وزیر صحت تھے۔ میں نے ان سے جاکر کل باتیں عرض کیں۔ حسب دستور ہنستے ہوئے راقم سے کہا کہ آپ سفر حج پر روانہ ہو جائیں اور میں اشرف حسین کو پٹنہ یا پٹنہ کے قریب کسی جگہ رکھوں گا جہاں سے وہ روزانہ پٹنہ آجا سکیں۔ عبدالقیوم نے جو کہا تھا وہ کیا۔ اشرف حسین سلمہٗ کا تبادلہ جہان آباد کر دیا اور عزیز موصوف میرے غائبانہ میں روزانہ پٹنہ آیا جایا کرتے تھے۔ عبدالقیوم وعدے کے سخت پابند تھے اور جو کہتے تھے وہی کرتے تھے۔

عبدالقیوم اپنی بے نفسی اور وضع داری کے علاوہ ایک نہایت ہی محنتی انسان تھے اور اپنے کل کاموں کو خود ہی انجام دیا کرتے تھے۔ راقم کا ان سے زندگی بھر کا ساتھ رہا مگر تکلیف کی شکایت میں نے ان کی زبان سے کبھی نہیں سنی۔ میں نے خود دیکھا ہے کہ انھیں مونج کی پلنگ پر اتنا ہی آرام ملتا تھا جتنا کہ ایک ڈنلپ کشن والی مسہری پر۔ وہ جفاکشی کے عادی تھے۔ ۱۹۶۲ء کے الکشن میں انھوں

نے ڈہری کے دیہی علاقوں کا دورہ سائیکل پر کیا ہے اور یہ ایک غیر معمولی بات تھی۔ ان کی شخصیت کا حیرت انگیز پہلو یہ تھا کہ وہ ہر حال میں اپنی وضع پر قائم رہتے خواہ وہ منسٹر رہے ہوں یا نہیں۔ اس سے ان کی متوازن ترقی یافتہ کردار کا بین ثبوت ملتا ہے۔

شاید ۱۹۴۲ء کا زمانہ تھا۔ سراسٹیفورڈ کرپس الہ آباد میں آنند بھون میں قیام پذیر تھے۔ عبدالقیوم نے ان سے ملاقات کی تھی اور اپنے خیالات کا اظہار کیا تھا۔ سرکرپس نے ان کی گفتگو کا تذکرہ اپنے ایک ہندوستانی دوست سے کیا تھا جس سے میری ملاقات تھی۔ انھوں نے عبدالقیوم کے متعلق کرپس کے تاثرات بیان کرتے ہوئے مجھ سے کہا تھا کہ کرپس اگرچہ عبدالقیوم کے سیاسی خیالات سے متفق نہیں ہوئے لیکن ان کے اخلاق، خلوص، سنجیدگی، متانت اور تہذیب سے بہت متاثر ہوئے تھے۔

بہار کی سیاسی زندگی میں آں جہانی سری کرشن سنہا کا مقام انفرادیت کا حامل تھا۔ وہ بڑے ذی فہم، باشعور اور مردم شناس وزیر اعلیٰ تھے اور عبدالقیوم کا بڑا احترام کرتے تھے۔ مجھ سے شری بابو اکثر ان کی خوبیوں کا تذکرہ کیا کرتے اور دیر تک ان کے متعلق باتیں کیا کرتے تھے۔ راقم نے خدا بخش لائبریری میں ناظم کی حیثیت سے تقریباً ڈیڑھ سال تک خدمت انجام دی مگر معلوم نہیں قیوم کی علمی تشنگی نے انھیں اس آب حیواں سے کیوں دور رکھا۔ نہ راقم نے انھیں خدا بخش لائبریری میں بلایا اور نہ وہ خود آئے۔ غالباً انھیں بے حد سرکاری مصروفیات کی وجہ سے لائبریری آنے کا موقع نہ ملا ہوگا۔

ہندوستان میں بہار پردیش کانگریس کمیٹی کے صدر کی بڑی اہمیت ہے وہ ہندوستان گیر سیاسی جماعت کانگریس کی ریاستی تنظیم کا ضامن ہوتا ہے۔ عبدالقیوم پردیش کانگریس کمیٹی کے صدر بھی رہے اور صدر کی حیثیت سے اپنے عہدہ کے اہم ذمہ دارانہ کاموں کو حسن وخوبی انجام دیا۔ وہ مرکزی کانگریس ورکنگ کمیٹی کے ممبر بھی تھے جب مسز اندرا گاندھی کانگریس کی صدر تھیں۔ ان کے علاوہ وہ مختلف تحریکوں کو کامیاب مفید اور پراثر بناتے تھے اور دوسرے گوناگوں پیچیدہ مسئلوں کو بھی اپنے ذاتی اثر سے حل کیا کرتے۔ ۱۹۵۲ء کے جنرل الیکشن میں ناکامیاب ہونے پر بھی وہ اپنے نصب العین میں منہمک رہے۔ مشکل اور بدلے ہوئے حالات میں بھی اپنا وقار اور اپنا مزاج برقرار رکھا۔

عبدالقیوم زندگی بھر اپنی ذمہ داریوں کو اور سرکاری خدمتوں کو نہایت ہی جاں فشانی اور خلوص سے انجام دیتے رہے اور زندگی کے آخری لمحات تک غریبوں اور پریشان حالوں کی خدمت کرنے میں لگے رہے۔ ۱۸ جنوری ۱۹۷۳ء کو امیاور جار ہے تھے جہاں نہر کا پشتہ ٹوٹ گیا تھا جس کے باعث وہاں کے ہزاروں باشندے بے گھر ہو گئے تھے۔ ان مصیبت زدہ لوگوں کو امداد پہنچانے کے لیے عبدالقیوم کسی اپنے ماتحت افسر کو بھیج سکتے تھے مگر ان کی حمیت اس کو گوارہ نہ کر سکی کیونکہ امیاور کا علاقہ ان کے حلقۂ انتخاب میں تھا۔ امیاور جانے کا راستہ بے حد خراب تھا پیدل چلے اور تھک کر بیٹھ گئے۔ قلب کی حرکت اچانک بند ہو جانے سے روح پرواز ہو گئی۔ اللہ غریق رحمت کرے۔ راقم کو بہار میں عبدالقیوم ایسا کوئی وزیر نہ ملا جس نے لوگوں کی خدمت کرنے میں اپنی جان تک گنوا دی ہو۔

عبدالقیوم سماجی خدمت کا بڑا جذبہ رکھتے تھے۔ جب وہ وزیر جیل ہوئے تو انھوں نے یہ تجویز پیش کی کہ ہر جیل میں قیدیوں کی اصلاح اور تعلیم کے لیے ایک اسکول قائم کیا جائے تاکہ مجرم قیدی رہائی پانے کے بعد ایک اچھا شہری بن سکے۔ تجربہ کے طور پر مظفر پور کے مرکزی جیل میں ایک ہائی اسکول قائم کیا گیا۔ اس اسکول میں تعلیم پاکر بے شمار مجرم قیدی اچھے شہری بن گئے۔ سارے بہار میں جیل کے اندر کوئی ایسا اسکول قائم نہیں ہے۔ اس اسکول سے جو ۱۹۵۷ء میں قائم ہوا کم از کم دو سو قیدیوں نے تیس برس کے اندر میٹریکولیشن کی سند حاصل کی ہے۔ گذشتہ سال سے اس اسکول کا درجہ بڑھا کر انٹرمیڈیٹ اسکول کر دیا گیا ہے حکومت اس اسکول کے کل اخراجات کو برداشت کرتی ہے۔ یہ اسکول عبدالقیوم کی ایک بڑی یادگار ہے۔

عبدالقیوم میرے ہم سن تھے۔ وہ پہلی جولائی ۱۹۰۵ء کو پیدا ہوئے اور ۱۸ جنوری ۱۹۷۳ء کو تقریباً ۶۸ سال کی عمر میں انتقال کیا۔ جنوری ۱۹۷۳ء میں راقم بعد حج مکہ مکرمہ میں قیام پذیر تھا اس زمانے میں ڈاکٹر محمد اسلام اللہ خاں مکہ کے ہندوستانی شفاخانہ میں میڈیکل افسر تھے ڈاکٹر محمد اسلام اللہ خاں کا وطن اتر پردیش ہے اور موصوف نے میرے عزیز ڈاکٹر مشتاق مرحوم کے ساتھ لکھنؤ میڈیکل کالج میں تعلیم پائی تھی۔ ڈاکٹر صاحب حجاز کے سفر کے دوران میری صحت اور آرام کا بہت خیال رکھتے تھے۔ راقم ان کے یہاں جا کر اکثر ان اخباروں کو پڑھتا جو ہندوستانی شفاخانہ میں آیا کرتے تھے۔ ایک روز اچانک عبدالقیوم کے قضا کرنے کی خبر پٹنہ کے اخبار

"انڈین نیشن" میں پڑھی۔ عبدالقیوم کی موت کی خبر پڑھ کر مجھے بہت صدمہ ہوا۔ زندگی کے کھوئے ہوئے اوراق کی دھندلی سی تصویر میری نظروں کے سامنے آگئی اور عبدالقیوم کی یاد بہت دنوں تک راقم کے دل کو بے چین کرتی رہی۔

۹۔ مسٹر شریدھر سوہنی (آئی۔سی۔ایس)

جوانی میں خوب صورت، ۵۵ برس کے سن میں جوان نظر آتے اور آج بھی ۷۳ برس کی عمر میں خوبرو اور توانا ہیں۔ گورا رنگ، اچھا قد، ہنس مکھ، دوست پرور اور سخن شناس۔ یہ ہیں ہمارے دوست محترم سوہنی صاحب۔ ان سے میری ملاقات ۱۹۴۸ء میں ڈاکٹر سچدانند سنہا کے یہاں ہوئی اور آج تک اس دوستی میں کوئی فرق نہ آیا ہے۔ دوست نوازی کا یہ حال ہے کہ چند مہینوں پہلے پٹنہ آئے اور گورنر کے مہمان ہو کر راج بھون میں ٹھہرے۔ آمد کے چند گھنٹوں بعد راقم سے ملنے کے لیے راج بھون سے روانہ ہوئے مگر ڈرائیور میرے گھر کا راستہ بھول گیا اور سوہنی صاحب کو اکزبیشن روڈ تک آکر واپس جانا پڑا۔ دوسرے روز طبیعت کچھ ناساز تھی مگر اسی حالت میں صاحب موصوف میرے یہاں آئے اور تقریباً دو گھنٹے بیٹھ کر مجھ سے باتیں کیں۔ میری خودنوشت سوانح عمری کو جابجا سے پڑھا اور پسند کیا۔ میری کتاب کو پڑھ کر موصوف کو اگلی صحبتیں یاد آئیں اور وہ لوگ یاد آئے جن کی بدولت صوبہ بہار نے جدید دور میں شہرت حاصل کی ہے۔ ایسے دیانت دار اور پرخلوص لوگ اب مفقود ہو چکے ہیں۔

سوہنی صاحب ۱۹ مئی ۱۹۱۴ء کو ضلع رتناگیری صوبہ مہاراشٹر میں پیدا ہوئے۔ ان کا خاندان عالموں کا خاندان ہے اور موصوف ابتدا ہی سے ایک نہایت ہی ہونہار طالب علم تھے۔ ۱۹۳۴ء میں علم اقتصادیات میں بی۔اے آنرس کی ڈگری حاصل کی اور دو سال بعد بمبئی یونی ورسٹی سے علم اقتصادیات میں ایم۔اے کا امتحان اول درجہ میں پاس کیا اور کل کامیاب امیدواروں میں اول آئے۔ آئی۔سی۔ایس میں تقرری کے بعد کیمبرج یونیورسٹی سے ایم۔اے کی سند حاصل کی۔ زبان دانی کا انھیں بہت شوق ہے۔ انگریزی، مراٹھی، ہندی، اردو، گجراتی، سنسکرت، پراکرت اور پالی جانتے ہیں اور ان زبانوں کی بہت سی کتابوں کا مطالعہ کیا

کیا ہے۔ تعلیم کے زمانہ میں صاحب موصوف اپنی کامیابیوں کے سبب اسکول اور کالج میں نہایت ہی ممتاز رہے۔ کون سا انعام اور وظیفہ ایسا تھا جو انھوں نے حاصل نہ کیا ہو۔ ۱۹۳۲ء سے ۱۹۳۶ء تک چار نامی وظیفے ملے اور ان کے علاوہ انعامات اور طلائی تمغوں سے بھی سرفراز ہوئے۔ صاحب موصوف جب انگلستان میں قیام پذیر تھے تو ڈاکٹر ای۔ جے۔ ٹومس کے زیر نگرانی ہندوستان کی تواریخ پر تحقیقی کام کیا جو بڑا مقبول ہوا۔

سومنی صاحب بحیثیت آئی۔ سی۔ ایس افسر ۱۹۳۸ء میں بہار کے صوبہ میں تعینات ہوئے اور ۱۹۴۵ء تک اس صوبہ کے مختلف اضلاع میں متعدد عہدوں پر فائز رہے۔ ۱۹۴۵ء سے ۱۹۴۹ء تک صاحب موصوف نے صوبہ اڑیسہ میں کام کیا جہاں دیگر خدمتوں کے علاوہ پولیٹیکل سکریٹری بھی رہے۔ آپ نے اسی زمانہ میں حکومت اڑیسہ کے حکم سے ایک میمورنڈم تیار کیا جس میں یہ بتایا کہ اڑیسہ کی چھوٹی چھوٹی دیسی ریاستوں کو کس طور سے صوبہ سے ملحق کیا جائے۔ صاحب موصوف کی رائے نہایت ہی مقبول ہوئی اور دوسرے صوبوں میں بھی دیسی ریاستوں کے الحاق کے متعلق آپ کے میمورنڈم سے بہت مدد ملی۔ اڑیسہ کے قیام کے دوران آپ نے راجدھانی بھوبنیشور کی تعمیر میں بہت کچھ حصہ لیا اور راورکیلا اسٹیل پلانٹ اور مہانندا ریور پروجکٹ کے قائم کرنے میں بھی نمایاں کام انجام دیا۔ ۱۹۴۹ء میں صاحب موصوف پھر بہار واپس آگئے اور حکومت بہار کے سکریٹریٹ میں مختلف محکموں کے سکریٹری رہے۔ ۱۹۵۲ء سے ۱۹۶۴ء تک پٹنہ، ترہٹ اور چھوٹا ناگ پور میں کمشنر کا کام کیا۔ بعد ازاں بہار گورنمنٹ کی ماتحتی میں چند بڑے عہدوں پر فائز رہے۔ ریونیو بورڈ کے ممبر اور چیف سکریٹری بھی ہوئے۔ ایک مرتبہ جب بہار میں صدارتی راج قائم ہوا تو صاحب موصوف گورنر کے مشیر مقرر ہوئے۔ ۱۹۷۰ء میں ۵ سال کے لیے لوک آیوکت مقرر ہوئے اور نہایت حسن وخوبی سے اپنے کاموں کو انجام دیا۔

مسٹر سومنی نے اپنی سرکاری مصروفیتوں کے باوجود اتنی علمی خدمات انجام دی ہیں جس کا تذکرہ یہاں راقم مختصر طور سے کر رہا ہے۔ صاحب موصوف چار سو سے زیادہ تحقیقی مضامین شائع کر چکے ہیں۔ آپ نے بہار ریسرچ سوسائٹی کے جرنل کی خدمت دس سال سے زیادہ بحیثیت چیف ایڈیٹر کی ہے۔ موصوف نے ہندوستان میں بے شمار علمی جلسوں کی صدارت

بھی کی ہے۔ بدھسٹ اکیڈمی کے چیرمین ہوئے اور دربھنگہ کی سنسکرت یونیورسٹی کے وائس چانسلر رہ چکے ہیں۔ موصوف دو سال تک "Numismatic Society of India" کے صدر رہے ہیں۔ انھیں ڈی لٹ کی اعزازی ڈگری دربھنگہ، نالندہ اور وکرم یونیورسٹی سے ملی ہے۔ ڈاکٹر راجندر پرشاد کی ہدایت پر بہار راشٹر بھاشا پریشد کے لیے ڈاکٹر راجندر پرشاد کی کتاب "چمپارن میں مہاتما گاندھی" کی نظر ثانی کی اور اس کا ایک نہایت ہی اچھا دیباچہ لکھا ہے۔ آج کل پونا یونیورسٹی میں تواریخ کے اعزازی پروفیسر ہیں اور "مہاراشٹر ٹیکنیکل ایجوکیشن سوسائٹی" کے صدر ہیں۔

سوہنی صاحب کو خدا بخش لائبریری سے ہمیشہ ایک والہانہ محبت رہی ہے۔ عرصہ دراز تک لائبریری کی انتظامی کمیٹی کے صدر رہے اور راقم اس کمیٹی کا ممبر تھا۔ حکومت بہار خدا بخش لائبریری کے لیے بہت کم امداد کی رقم دیا کرتی تھی اور سوہنی صاحب کی کوششوں کی بدولت حکومت نے سالانہ امداد میں کچھ اضافہ کر دیا اس طور سے ہم لوگوں کو خریداری میں تھوڑی سہولت ہوگئی۔ صاحب موصوف کے دور میں چند ممبروں کی ایک کمیٹی بنائی گئی جس کے مشورے سے کتابیں خریدی جاتی تھیں۔ مسٹر احسن شیر لائبریری کے سکریٹری تھے اور لائبریری کے لیے زیادہ سے زیادہ کتابوں کی خریداری کا مشورہ دیا کرتے تھے۔ راقم زیادہ تر مخطوطات کی خریداری پر زور دیا کرتا تھا۔ اس معاملہ میں سوہنی صاحب میری رائے پر عمل کرتے اور بلند پایہ مخطوطات کی خریداری کا حکم صادر کرتے تھے۔ جب ڈاکٹر ذاکر حسین بہار کے گورنر ہوکر آئے تو انھوں نے لائبریری کی ترقی کے لیے کوئی کوشش اٹھا نہ رکھی اور امداد کی رقم میں بھی کچھ اضافہ کرایا۔ ڈاکٹر صاحب موصوف مخطوطات کی خریداری کو نہایت ضروری سمجھتے تھے۔ ان دنوں مسٹر سوہنی کو خبر ملی کہ موضع کواتھ ضلع شاہ آباد میں سید جان محمد بلگرامی اپنے مخطوطات کے ذخیرے کو فروخت کرنا چاہتے ہیں۔ صاحب موصوف نے فوراً اپنے ایک ماتحت ڈپٹی کلکٹر کو کواتھ روانہ کیا اور کل مخطوطات کو پٹنہ منگوا کر راج بھون میں رکھوایا۔ ڈاکٹر ذاکر حسین کو یہ کتابیں پسند آئیں اور مخطوطات کا ایک اچھا ذخیرہ سوہنی صاحب کی کاوشوں کی بدولت کم قیمت پر خدا بخش لائبریری کو مل گیا۔

سوہنی صاحب ایک خدا ترس انسان ہیں اور مسلمان صوفیوں کی بڑی عزت کرتے ہیں۔ صاحب موصوف جب صوبہ بہار میں سرکاری ملازم تھے تو یہاں کی بہت سی خانقاہوں میں تشریف

لے جایا کرتے اور وہاں کے عالموں اور صوفیوں سے مل کر سکون قلب حاصل کرتے تھے۔ خانقاہ مجیبیہ پھلواری شریف سے بڑی عقیدت مندی رکھتے ہیں اور آپ کا جب پٹنہ میں قیام تھا تو اکثر پھلواری شریف جاکر صاحب سجادہ سے ملاقات کا شرف حاصل کرتے اور ان سے دعائیں لیتے۔ شاید انھیں دعاؤں کی بدولت سوہنی صاحب کا گھر آباد ہے اور ان کا خاندان عروج پر ہے۔ حضرت شاہ امان اللہ مرحوم سجادہ نشین خانقاہ مجیبیہ سوہنی صاحب کی بڑی تعریفیں کیا کرتے اور ہمیشہ ان کے لیے دعائیں کرتے تھے خانقاہ مجیبیہ پھلواری شریف جانے کی سڑک نہایت ہی شکستہ حالت میں تھی اور لوگوں کو خانقاہ جانے میں بڑی تکلیف ہوا کرتی تھی۔ سوہنی صاحب نے اس راستہ کو درست کرا دیا جس سے ہر خاص و عام کو فائدہ پہنچا۔

مولوی سید شاہ وجیہ ساکن چھپرہ نے والد مرحوم کے ساتھ علی گڑھ میں تعلیم پائی تھی اور ہم لوگوں کے یہاں اکثر آیا کرتے تھے۔ بی۔اے کے امتحان میں جب ناکامیاب ہو گئے تو پڑھنا ترک کر دیا۔ ان کی شادی خان بہادر سید عبدالصمد صاحب سرکاری وکیل چھپرہ کی صاحب زادی سے ہوئی تھی۔ مولوی وجیہ خود بھی خوش حال تھے اور ان کی سسرال کی آمدنی بھی کافی تھی اس لیے اچھے اور مذہبی کاموں میں اپنا وقت صرف کر دیا کرتے تھے اور کچھ عرصہ تک حاجی پور ہائی اسکول میں معلم بھی رہے۔ صوفیائے کرام سے ان کی بڑی عقیدت مندی تھی۔ آخر عمر میں موصوف بڑے عبادت گذار ہو گئے تھے اور لوگوں کو خواہ ان کا کوئی بھی مذہب ہو اچھی مذہبی زندگی گذارنے کی تلقین کیا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ جب راقم سائنس کالج کے کمپاؤنڈ میں قیام پذیر تھا تو صاحب موصوف میرے یہاں آئے اور دوران گفتگو مسٹر سوہنی کی منکسر مزاجی اور غریب نوازی کا تذکرہ آگیا۔ انھیں یہ سن کر کچھ حیرت سی ہوئی کہ باوجود ایک ممتاز آئی۔سی۔ایس ہونے کے مسٹر سوہنی ہر غریب و امیر سے یکساں طور سے ملتے ہیں اور نہایت ہی خندہ پیشانی سے پیش آتے ہیں۔ جو بھی ان سے ملتا ہے ان کا ثناخواں ہو جاتا ہے۔ مسٹر سید محمد افضل ان دنوں کمشنر پٹنہ ڈویژن کے پرسنل اسسٹنٹ تھے اور مسٹر سوہنی ان کی قدر کرتے تھے۔ راقم کے یہاں قیام کے دوران مولوی شاہ محمد وجیہ مسٹر سید محمد افضل کے ہمراہ سوہنی صاحب کی قیام گاہ پر گئے، اور ان سے ملاقات کا شرف حاصل کیا۔ صاحب موصوف کی بے نظیر شرافت کو دیکھ کر مولوی محمد وجیہ بہت متاثر ہوئے۔ چائے نوشی کے دوران تقریباً ایک گھنٹے تک باتیں ہوتی رہیں۔ جب صاحب

موصوف میری قیام گاہ پر واپس آئے تو سومنی صاحب کی بے حد تعریفیں کیں اور کہا کہ انھیں چیف سکریٹری کا عہدہ بہت جلد مل جائے گا۔ مولوی محمد وجیہ کی دعائیں قبول ہوئیں اور کچھ عرصہ بعد سومنی صاحب حکومت بہار کے چیف سکریٹری مقرر ہو گئے۔

مسٹر سومنی نے جب اپنی ملازمت کی مدت پوری کر کے پنشن پائی تو اپنے وطن پونا جانے کی تیاری میں مشغول ہو گئے۔ راقم کو ان کے پٹنہ چھوڑنے کا بہت افسوس تھا کیوں کہ میرے قدیم دوستوں میں چند ہی لوگ بچ گئے تھے جن کے یہاں میرا آنا جانا ہوتا تھا۔ ایک روز جب راقم ان کی رہائش گاہ پر گیا تو دیکھا کہ ان کی چیزیں لکڑی کے بکسوں میں بند کر کے ان پر لوہے کی کیلیں ٹھونکی جا رہی ہیں۔ یہ دیکھ کر راقم کو بڑا افسوس ہوا اور دل میں خیال پیدا ہوا کہ اللہ کرے سومنی صاحب کچھ اور دنوں پٹنہ میں رہ جائیں کہ ان کے یہاں میرا آنا جانا برقرار رہے۔ سومنی صاحب نے بھی پٹنہ چھوڑنے پر اپنی افسردگی ظاہر کی اور راقم ان سے مل کر جلد ہی اپنی قیام گاہ پر واپس آ گیا۔ مجھے متردد دیکھ کر عبد الغفار جو میری موٹر کا ڈرائیور تھا سبب سمجھ گیا اور کہنے لگا کہ آپ فکر نہ کریں یہ سب بکس جو آج بند کیے جا رہے ہیں بہت جلد کھول دیے جائیں گے اور سومنی صاحب ابھی کچھ اور دنوں تک پٹنہ ہی میں رہیں گے۔ اس واقعہ کے کچھ عرصہ بعد راقم نے اخباروں میں یہ خبر پڑھی کہ حکومت بہار نے سومنی صاحب کو ۵ سال کے لیے بہار کا "لوک آیکت" مقرر کر دیا ہے۔ دوسرے روز راقم سومنی صاحب کی رہائش گاہ پر گیا اور انھیں مبارکباد دی اور اس پیشین گوئی کا جو میرے ڈرائیور نے کی تھی، تذکرہ کیا۔ سومنی صاحب نے متاثر ہو کر میرے ڈرائیور کو بلایا اور اس کی دعاؤں کا شکریہ ادا کیا مجھ سے ہنس کر کہا کہ تمہارا ڈرائیور ایک "پہنچا فقیر" ہے۔

راقم کی ہر خوشی میں سومنی صاحب شریک رہے ہیں میرے دونوں لڑکے اکبر حسین اور اشرف حسین کی شادی میں نہایت خوشی سے شرکت کی۔ جب میرے چھوٹے لڑکے اشرف حسین کی شادی مسٹر محبوب عالم آئی۔ اے۔ ایس کی صاحبزادی سے ہونے لگی تو سومنی صاحب نے موصوف سے کہہ دیا کہ میں براتی بن کر آؤں گا اور انھوں نے ایسا ہی کیا اگرچہ ان کی ملاقات مسٹر محبوب عالم سے کافی عرصہ سے تھی۔ راقم کی ملاقات اور دوستی بہت سے انگریز اور ہندوستانی آئی سی ایس افسروں سے رہی ہے مگر وہ برادرانہ محبت جو سومنی صاحب نے مجھ سے کی کسی دوسرے آئی سی ایس افسر نے نہیں کی ہے۔ راقم نے چند ایسے کالے یورپ زدہ آئی سی ایس افسروں کو دیکھا ہے

جن میں گورے آئی۔سی ایس افسروں سے کہیں زیادہ رعونت تھی مگر پنشن پانے کے بعد ان کی جو درگت بنی میں نے ان کا بھی مشاہدہ کیا ہے۔ سوہنی صاحب آج بھی اسی طرح ہر دل عزیز ہیں جیسا کہ وہ دوران ملازمت تھے۔ مسز سوہنی بھی ایک نہایت منکسر مزاج اور ملنسار خاتون ہیں۔ میری جائے رہائش گاہ پر تشریف لاکر میری عزت افزائی کی ہے۔ موصوفہ کا تعلق ایک نہایت ہی اعلیٰ مرتبہ خاندان سے ہے۔

۱۰۔ پدم شری پروفیسر کلیم الدّین احمد

میرے عزیز ہم پیشہ دوستوں میں پروفیسر کلیم الدین احمد ایک ممتاز شخصیت کے مالک تھے۔ یہاں پر ان کے تمام حالات زندگی لکھنا مقصود نہیں ہے اس لیے کہ وہ اپنی زندگی کے متعلق کل حالات اپنی خود نوشت سوانح حیات میں لکھ چکے ہیں اور دوسروں نے بھی ان کے متعلق بہت کچھ لکھا ہے۔ یہاں صرف وہی باتیں پیش کی جارہی ہیں جن کا تعلق صرف مجھ سے اور ان سے رہا ہے۔ موصوف اپنی کمزور صحت کے باوجود زندگی کے آخری لمحہ تک اہم کاموں کی انجام دہی میں منہمک رہے اور یہ کام ایسے تھے جو ہمیں زندگی بھر ان کی یاد دلاتے رہیں گے۔ موصوف ان خوش نصیب لوگوں میں تھے جو زندگی کے متعدد شعبوں میں کامیاب رہے۔ بہ حیثیت ایک نامی انگریزی کے پروفیسر، ڈائرکٹر آف پبلک انسٹرکشن بہار اور ایک منفرد اردو تنقید نگار کے موصوف محتاج تعارف نہیں ہیں۔

کلیم الدین احمد ڈاکٹر عظیم الدین احمد کے چھوٹے لڑکے تھے۔ ۱۵ ستمبر ۱۹۰۸ء کو اپنے آبائی مکان واقع خواجہ کلاں میں پیدا ہوئے۔ پٹنہ سیٹی کے محمڈن اینگلو عربک اسکول میں تعلیم حاصل کر کے ۱۹۲۴ء میں میٹرکولیشن کا امتحان پاس کیا۔ اس کے بعد انٹرمیڈیٹ کی تعلیم کے لیے اپنا داخلہ پٹنہ کے نیو کالج میں لیا جہاں اس زمانے میں انٹرمیڈیٹ آرٹس کی پڑھائی ہوا کرتی تھی۔ اس کالج سے آئی۔اے کا امتحان اول درجہ سے پاس کر کے پٹنہ کالج میں داخلہ لیا اور دو سال بعد بی۔اے کے امتحان میں انگریزی آنرس کے ساتھ دوسرے درجہ میں اول آئے اسی کے ساتھ اگریگیٹ مارکس میں بھی اول آئے۔ ان کامیابیوں کی بدولت موصوف کو یونیورسٹی

سے تین طلائی تمغے عطا ہوئے جس کا تذکرہ مبارک عظیم آبادی نے اپنی ایک نظم میں کیا ہے۔ ۱۹۲۰ء میں انگریزی ایم اے کے امتحان میں فرسٹ کلاس فرسٹ ہوئے اور ایک طلائی تمغہ حاصل کیا ۱۹۲۰ء میں اسٹیٹ اسکالرشپ کے لیے درخواست دی اور ۱۶- امیدواروں کے ساتھ جس میں راقم بھی تھا انٹرویو کے لیے بلایا گیا اور ہر سبجکٹ کے لیے ایک ہی امیدوار بلایا گیا تھا۔ سر فخر الدین وزیر تعلیم صدر اور مسٹر جی۔ای۔ فوکس ڈائرکٹر آف پبلک انسٹرکشنس اس کمیٹی کے سکریٹری تھے۔ انتخاب میرٹ پر نہیں ہوا کرتا تھا بلکہ مختلف شعبوں کی ضروریات کو مدنظر رکھ کر وظیفہ دیا جاتا تھا۔ اس سال کمیٹی نے یہ فیصلہ کیا کہ ایک وظیفہ انگریزی کے لیے دیا جائے اور دوسرا وظیفہ فزکس کے لیے۔ اس بنا پر کلیم الدین احمد کو انگریزی کے لیے وظیفہ ملا اور محمد مسلم کو فزکس کے لیے انتخاب کیا گیا۔ یہاں یہ بات صاف کر دینا مناسب ہے کہ وظیفہ کے لیے انتخاب "میرٹ" پر نہیں ہوتا تھا (جیسا کہ کلیم نے اپنی سوانح حیات میں لکھا ہے) اور اس کا ثبوت انھیں کا بیان ہے کہ ان کا انٹرویو صرف تین منٹ میں ختم ہو گیا جس سے ظاہر ہے کہ انگریزی میں وظیفہ دیا جاتا تھا۔ وہ تنہا انگریزی کے امیدوار تھے اس لیے پہلے ہی طے کر لیا گیا تھا کہ وظیفہ انھیں کو دیا جائے گا اور ان سے زیادہ سوالات کرنے کی ضرورت نہ محسوس کی گئی۔ یہ درست ہے کہ راقم کا انٹرویو آدھ گھنٹے تک ہوا کیونکہ میں نے لسانیات کی تعلیم کے لیے درخواست دی تھی مگر اس سبجکٹ میں اسکالرشپ دینا مقصود نہ تھا۔ آکسفورڈ کے تعلیم یافتہ مسٹر فوکس جو خود ماہر لسانیات تھے محض اپنی دل چسپی کے لیے مجھ سے مختلف سوالات کرتے رہے اور انھوں نے راقم سے فرمایا تھا کہ تمھارے جوابات سب تشفی بخش ہیں مگر لسانیات میں وظیفہ دیا جانا نہیں ہے اس لیے مجھے افسوس ہے کہ میں تمھارے لیے کچھ نہیں کر سکتا ہوں۔

حکومت بہار نے اپنی ضروریات کو مدنظر رکھتے ہوئے کلیم الدین کو انگریزی زبان اور ادب میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے انگلستان بھیجا۔ موصوف نے اپنا داخلہ کیمبرج یونیورسٹی میں لیا اور انگریزی میں ٹرائپس لے کر پٹنہ واپس آئے۔ پٹنہ کالج میں اسی مضمون کے اسسٹنٹ پروفیسر مقرر ہوئے اور کچھ دنوں بعد انھیں ترقی دے کر انگریزی کا پروفیسر بنایا گیا۔ بہار ایجوکیشنل سروس کلاس ون میں ان کا تقرر ہوا۔ وہ پٹنہ یونیورسٹی میں انگریزی کے ہیڈ آف دی ڈپارٹمنٹ بنے، پٹنہ کالج کے پرنسپل بھی ہوئے اور صوبہ بہار کے سررشتہ تعلیمات کے ڈائرکٹر ایک

عرصہ تک رہے۔ حکومت نے انھیں بہار سکنڈری اگزامینیشن بورڈ کا چیرمین بھی بنایا۔ وہ جس عہدے پر رہے اپنی ذمہ داریوں کو خوش اسلوبی اور فرض شناسی کے ساتھ انجام دیا۔

جب نئے ایکٹ کے مطابق رانچی پٹنہ یونیورسٹی قائم ہوئی تو مختلف فیکلٹیوں کے لیے ڈین کے عہدے وجود میں آئے۔ مسٹر کے۔ پی۔ سنہا جو اُن دنوں پٹنہ کالج کے پرنسپل تھے ڈین فیکلٹی آف آرٹس کے انتخاب کے لیے امیدوار ہوئے۔ ان کے مقابلہ میں مسٹر کلیم الدین کے دوستوں نے موصوف کا نام پیش کیا۔ دونوں امیدواروں نے اپنی کامیابی کے لیے کوئی کسر اٹھا نہ رکھی اور یہ انتخاب پروفیسروں کے درمیان کشیدگی اور تلخی کا سبب بنا۔ مسٹر کے۔ پی۔ سنہا کو ایک ووٹ سے شکست ہوئی اور مسٹر کلیم الدین ڈین فیکلٹی آف آرٹس ہو گئے۔ ہنگاموں سے عاجز آکر میں نے انتخاب میں حصہ نہ لینے کا فیصلہ کر لیا تھا مگر مسٹر کے۔ پی۔ سنہا اور مسٹر کلیم الدین نے متعدد بار مجھ سے مل کر اپنے حق میں ووٹ دینے کی فرمائش کی۔ راقم نے خاندانی تعلقات کی بنا پر کلیم الدین احمد کو ووٹ دیا مگر موصوف مجھے عرصہ دراز تک مسٹر کے۔ پی۔ سنہا کا معاون تصور کرتے رہے۔ میں نے ان باتوں کی کوئی پرواہ نہ کی اور ہم لوگوں کی دوستی میں کوئی فرق نہ آیا۔ راقم کلیم کو اپنا چھوٹا بھائی سمجھتا تھا اور کسی موقع پر ان کی مخالفت نہ کی۔ جبّن ڈاکٹر عظیم الدین احمد کے احسانات کو کیسے بھلا سکتا تھا؟۔ وہ میرے والد کے عزیز دوست اور میرے محترم استاد تھے۔

سرکاری نیم سرکاری اور یونیورسٹی کی بے شمار کمیٹیوں میں مجھے کلیم کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا۔ ہم لوگوں کے درمیان بہت کم اختلاف ہوا کرتا۔ اکثر و بیشتر وہ میرے مشوروں کو قبول کر لیا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ ہم دونوں کے درمیان سخت اختلاف پیدا ہو گیا۔ چند ممتاز کانگریسیوں کے اشاروں پر صاحب موصوف شری راجا گوپال اچاری کو رسل لکچرر منتخب کرنا چاہتے تھے۔ میں نے اس تجویز کی مخالفت کی کیوں کہ کسی سیاست داں کا رسل لکچرر بنایا جانا مجھے پسند نہ تھا۔ کلیم اپنی رائے پر قائم رہے اور مسٹر آر۔ آر۔ دیواکر جو اس زمانے میں گورنر بہار تھے کلیم کے اس انتخاب سے بہت خوش ہوئے اور فوراً اپنی رضامندی دے دی۔ راقم کو وھیلر سنیٹ ہال میں جلسہ کا انتظام کرنا پڑا۔ جب راجا گوپال اچاری ہال میں داخل ہوئے تو ان کے مخالفوں نے جن میں زیادہ تر ماشترا کی تھے، شور و غل مچانا شروع کیا اور موصوف مجبوراً ہال سے باہر نکل کر یونیورسٹی لائبریری کے میدان میں آئے اور لکچر دینا شروع کیا۔ وہاں بھی لکچر کے دوران کچھ لوگ گاہے

گاہے شور و غل مچاتے رہے مگر لکچرر موصوف نے اپنا مضمون جو "ہند و فلسفہ" پر تھا شروع سے آخر تک پڑھ کر دم لیا۔ ان موقعوں پر راجا جی اکثر بہت ہی ضدی بن جایا کرتے اور اپنی شکست ماننے کو تیار نہ ہوتے تھے۔ کلیم نے اس واقعہ کا تذکرہ اپنی سوانح عمری میں نہایت ہی تفصیل سے کیا ہے اور راقم کی تعریف بھی کی ہے

جب میں پٹنہ کالج میں طالب علم تھا اور علیم الدین احمد اور کلیم الدین احمد دونوں برادران بھی اسی کالج میں تھے تو اس زمانے میں استاد محترم ڈاکٹر عظیم الدین احمد اکثر کہا کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے میری جسمانی طاقت میرے بڑے بیٹے علیم الدین احمد کو بخشی ہے اور میری دماغی قوت میرے چھوٹے بیٹے کلیم الدین کو عطا کی ہے۔ یہ بات ان دونوں بھائیوں کے لیے آیندہ زندگی میں درست ثابت ہوئی۔ علیم الدین احمد کی زندگی محنت اور مشقت میں گذری۔ کلیم الدین احمد اس زمانے میں کیا، بلکہ تمام عمر کتاب کے کیڑے بنے رہے۔ جب دیکھو کتاب کا ساتھ ہے اور کسی سے بات کرنا بھی ان کے خیال میں امر لا حاصل تھا۔ موصوف طالب علمی کے زمانے میں نہایت کم سخن تھے۔ ایک مرتبہ کا واقعہ ہے کہ ٹم ٹم پر سوار ہو کر پٹنہ سیٹی سے پٹنہ کالج آئے۔ کرایہ میں ایک روپیہ ٹم ٹم والے کو دیا اور چار آنے کرایہ کے کاٹ کر بارہ آنے پیسے کی واپسی کا مطالبہ تک نہیں کیا۔ کم سخن ہو تو ایسا! کلیم اپنے آداب و اطوار، رہن سہن، خوراک اور لباس کے معاملہ میں زندگی بھر بے حد سادگی پسند رہے۔ یوں کہیے کہ موصوف سادگی اور بلند نظری کے اصول پر ہمیشہ کاربند رہے۔ ایک بھورے رنگ کا سوٹ جو کیمبرج سے پہن کر آئے تھے، عرصہ تک زیب تن رہا۔ آخر میرے اصرار پر یہ سوٹ کسی کو بخش دیا۔ میرا اور کلیم کا ساتھ بہ حیثیت پروفیسر پٹنہ کالج میں ۱۹۳۶ء سے ہوا اور ۴۵ سال سے زیادہ مجھے موصوف کو نہایت ہی قریب سے جاننے کا موقع ملا۔ میں ان کی پہلی شادی میں شریک تھا۔ ان کی پہلی اہلیہ مسٹر عبدالحفیظ بی۔اے (آکسن) بیرسٹر کی صاحبزادی تھیں۔ شادی کے کچھ عرصہ بعد جب ان کا انتقال ہو گیا تو کلیم کی دوسری شادی حفیظ صاحب کی دوسری لڑکی سے ہوئی۔ کلیم جوانی میں نہایت ہی شرمیلے تھے اور اپنی ازدواجی زندگی کا کبھی کوئی تذکرہ نہ کرتے تھے۔ ان کی پہلی شادی کے کچھ دنوں بعد جب راقم نے انھیں شادی کی مبارک باد دی تو موصوف سر جھکائے چپ بیٹھے رہے اور شکریہ تک ادا نہ کیا۔ کلیم آخر تک بظاہر زاہد خشک نظر آتے تھے مگر اکثر اوقات رنگین مزاجی کا بھی ثبوت دینے سے

باز نہیں آتے تھے۔ اس سلسلہ میں مجھے دو ایسے واقعات یاد آگئے ہیں جن کا ذکر دلچسپی سے خالی نہیں ہوگا۔ پہلا واقعہ یہ ہے کہ آج سے تقریباً ۳۵ سال قبل ہم لوگوں کے ایک دوست کی سالی اپنے جوڑے کو پھولوں سے سجائے ہم دونوں کے آگے سے جا رہی تھی کہ اتفاقاً اس میں سے ایک پھول گر پڑا۔ کلیم نے اسے اٹھانے کی فرمائش مجھ سے کی لیکن میں ان کی فرمائش اس شرط پر پوری کرنے کو تیار ہوا کہ وہ جوڑے سے گرے ہوئے پھول کو اپنے بٹن ہول میں لگا لیں۔ کلیم میری اس شرط پر مسکراتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔ دوسرا واقعہ بھی جو تقریباً ۲۵ سال پہلے کا ہے، سن لیجیے۔ ایک دن کلیم اپنے بنگلے پر فلم "بھوانی جنکشن" کی نمائش کرنے والے تھے۔ جنوری کی انتہائی سرد رات تھی، موٹر بھیج کر مجھے پکڑوا منگوایا۔ نمائش کے دوران میں ان کے پاس ہی بیٹھ گیا اور ان پر فلم کے ردعمل کا جائزہ لیتا رہا۔ چنانچہ میں نے یہ دیکھا کہ وہ فلم کے رومانی مناظر سے بے حد لطف اندوز ہوتے رہے۔ ان واقعات سے ظاہر ہے کہ کلیم کی خشک طبیعت کے ریگستان میں کہیں کہیں رومانیت کا نخلستان بھی موجود تھا۔

راقم جب ۱۹۳۶ء میں ٹرنک کالج سے پٹنہ کالج آیا تو خیال گذرا کہ استاد محترم ڈاکٹر عظیم الدین احمد کے کلام کا مجموعہ نہایت ہی آب و تاب سے چھپوا کر شائع کیا جائے۔ اس میں جتیار دشواریاں تھیں، خصوصاً ڈاکٹر صاحب سے اس کام کے لیے ان کی رضامندی حاصل کرنا یہ میرے بس کی بات نہ تھی۔ میں نے پروفیسر فضل الرحمن سے اس کا تذکرہ کیا اور استدعا کی کہ وہ کلیم الدین کو اس کام کی انجام دہی پر راضی کریں۔ پروفیسر فضل الرحمن کو میری یہ بات بہت پسند آئی اور انھوں نے ڈاکٹر عظیم الدین احمد سے مل کر موصوف سے ان کے کلام کی طباعت کے لیے اجازت حاصل کر لی۔ پروفیسر فضل الرحمن کے اصرار پر کلیم الدین بھی ہر طرح کی مدد کرنے کے لیے تیار ہو گئے۔ ڈاکٹر صاحب کے کلام کا بیشتر حصہ ان کے پاس موجود تھا۔ کچھ غزلیں اور نظمیں جو پروفیسر محمد مسلم کے پاس تھیں انھوں نے سب کو کلیم الدین کے حوالہ کر دیا۔

مرحوم ولی الدین خدا بخش سکریٹری خدا بخش لائبریری کے پاس ڈاکٹر صاحب کے کلام کا تقریباً پورا مجموعہ موجود تھا جسے انھوں نے ایک خوشخط کاتب سے لکھوا کر اپنے پاس محفوظ کر رکھا تھا۔ موصوف نے اپنی اس بیاض کو میری استدعا پر کلیم کے حوالے کر دی۔ کلیم نے کتاب کے مسودہ کو نہایت محنت اور سلیقے سے تیار کیا۔ شروع میں ایک دیباچہ لگایا اور کتاب کے آخر

میں "اشارات" کا اضافہ کیا۔ جب کتاب تیار ہو گئی تو اسے ایک ماہر خوش نویس سے لکھوا کر ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں پیش کیا۔ موصوف نے اپنے کلام پر نظر ثانی کی اور کچھ اشعار میں ردوبدل بھی کیا نیز کچھ نئی نظموں کا اضافہ بھی ہوا۔ ڈاکٹر صاحب نے غالب کے شعر

"نہ گلِ نغمہ ہوں نہ پردہ ساز
میں ہوں اپنی شکست کی آواز"

کو مدنظر رکھتے ہوئے اپنے کلام کے مجموعہ کا نام "گلِ نغمہ" رکھا۔ اس کتاب کو مسٹر کے۔ بی۔ اگروال نے شانتی پریس الہ آباد سے چھپوا کر نہایت ہی آب و تاب سے شائع کیا ہے۔ کتاب انگریزی ہینڈ میڈ پیپر پر چھاپی گئی ہے اور اس کی کتابت خوش نویسی کا بہترین نمونہ ہے۔ اب تک اردو میں چند ہی کتابیں اس زیب و زینت کے ساتھ چھاپی گئی ہیں۔ اردو کے لیے کلیم الدین کی یہ پہلی خدمت تھی جو بہت مقبول ہوئی۔

زبان اردو سے کلیم کو ابتدا ہی سے گہرا لگاؤ رہا۔ اردو تنقید نگاری میں نئی راہ اختیار کی جو ان کی شہرت کا سبب بنی۔ مولوی عبدالحق مرحوم ان کی تنقید کو "بے باکانہ تنقید" کہا کرتے تھے، مگر سچ یہ ہے کہ ان کی تنقید نے اردو زبان میں ایک نئی روح ڈال دی۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو اردو تنقید میں ان کا کوئی ہم پلہ نہیں، بلکہ اردو کے تمام جدید نقادوں نے ان کی پیروی اور ہم نوائی کی ہے، ان کی تنقید پر کلیم الدین احمد کی تنقید سے استفادے کا اثر ظاہر ہے۔ کلیم صرف ایک اعلیٰ پایہ کے نقاد ہی نہیں بلکہ شاعر بھی تھے اور اپنی شاعرانہ صلاحیتوں کا ثبوت اپنے دو شعری مجموعوں کے ذریعہ دے چکے ہیں۔ حکومت ہند نے انگریزی اردو، اردو انگریزی ڈکشنری کو مرتب کرنے کا کام ان کے سپرد کیا تھا، جس کو کلیم الدین نے نہایت ہی خوش اسلوبی سے انجام دیا۔ جب پٹنہ میں بہار اردو اکادمی قائم ہوئی تو کلیم الدین اس کے نائب صدر مقرر کیے گئے اور مرتے دم تک اس عہدہ پر فائز رہ کر تندہی کے ساتھ اپنا کام انجام دیتے رہے۔ رسالہ "معاصر" ان کی یادگار ہے جس میں راقم کا ایک مضمون چندر بھان برہمن پر شائع ہوا تھا۔ کلیم الدین نے میری انگریزی کتاب "THE EARLY PER-SIAN POETS OF INDIA" کا اردو میں ترجمہ کرا کر بہار اردو اکادمی سے ۱۹۸۵ء میں شائع کرایا۔

۲۱ دسمبر ۱۹۸۲ء کو صبح سویرے کلیم نے راقم کو ٹیلی فون کیا اور پروفیسر براؤن کی کتاب "ARABIAN MEDICINE" کو اپنے مطالعہ کے لیے مانگ بھیجا۔ میں نے وعدہ کیا کہ اس کتاب کو کل سویرے ان کے یہاں بھیج دوں گا۔ یہ آخری باتیں تھیں جو راقم اور کلیم کے درمیان ہوئیں۔ اسی شام نو بجے میرے ٹیلی فون کی گھنٹی بجی اور ایک اجنبی شخص نے جس نے اپنا نام اشوک بتایا یہ خبر دی کہ کلیم الدین احمد کا آج ساڑھے سات بجے شام اچانک انتقال ہو گیا۔ مجھے اس شخص کی بات پر یقین نہ آیا اور بہت تفتیش کے بعد یہ پتہ چلا کہ موت کی خبر سچ تھی۔ دوسرے روز صبح سویرے راقم مرحوم کی رہائش گاہ واقع کرشنا پوری پر گیا اور ان کے آخری دیدار کے لیے اس کمرہ میں داخل ہوا جہاں وہ روزانہ سویا کرتے تھے۔ دیکھا کہ کم آمیز و کم سخن کلیم اپنی مسہری پر ابدی نیند سو رہے ہیں۔ اس منظر کو دیکھ کر راقم کے دل و دماغ پر گہرا اثر پڑا اور کلیم کی پوری زندگی نظروں کے سامنے آ گئی۔ نماز جنازہ میں بے شمار لوگوں نے شرکت کی جس میں بہار کے گورنر اخلاق الرحمٰن قدوائی بھی تھے۔ مرحوم کا جسد خاکی اپنے آبائی مکان واقع خواجہ کلاں پٹنہ سیٹی کے احاطہ میں دفن کیا گیا۔ اللہ غریق رحمت کرے۔

پروفیسر کلیم الدین احمد کی دوسری اہلیہ مسز زہرہ کلیم نے پچھتر سال کی عمر میں ۸ جولائی ۱۹۸۷ء کو انتقال کیا۔ موصوفہ کی ابتدائی تعلیم کلکتہ اور شملہ میں ہوئی۔ انھوں نے اعلیٰ تعلیم کیمبرج اور برلن میں حاصل کی تھی۔ تین مرتبہ ۱۹۶۷ء تک بہار لیجسلیٹو اسمبلی کی ممبر منتخب ہوئیں۔ کچھ عرصہ تک مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں انگریزی کی لکچرار بھی رہیں۔ مرحومہ ایک نہایت ہی شریف النفس خاتون تھیں۔

۱۱۔ مُبارک عظیم آبادی

مبارک حسین، مبارک عظیم آبادی کی پیدائش ۱۸۷۹ء میں قصبہ تاج پور ضلع دربھنگہ میں ہوئی جہاں ان کے والد مولوی سید فدا حسین منصفی کے عہدے پر فائز تھے۔ صاحب موصوف کا خاندان زمانہ قدیم سے علم و فن میں ممتاز رہا ہے۔ ان کے مورث اعلیٰ قاضی یار محمد اورنگ زیب کے زمانے میں ایک نامور بزرگ گذرے ہیں۔ مولوی سید فدا حسین کو جب سرکاری کاموں سے فرصت ملتی تو شاعری کرتے اور وامق تخلص کرتے تھے۔ وہ ایک نہایت دیندار اور بااخلاق انسان

تھے ۔خواجہ کلاں گھاٹ کی مسجد کو جسے ان کے مورث اعلیٰ قاضی یار محمد نے بنایا تھا اسکو از سر نو تعمیر کرایا اور ایک قطعہ تاریخ لکھا جس کا آخری شعر یہ ہے:

ازروئے ادب سال بنا وامق گفت
ایں مسجد کہنہ شدہ تعمیر جدید

مبارک حسین نے ابتدا میں فارسی اور اردو کی تعلیم اپنے والد اور قابل اساتذہ سے حاصل کی ۔ صاحب موصوف کو فارسی اور اردو دونوں زبانوں پر بڑا عبور تھا ۔ فارسی اور اردو کے اشعار انھیں ہزاروں کی تعداد میں یاد تھے ۔ اردو اور فارسی کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد اسکول میں داخلہ لیا اور انٹرنس کے درجہ تک پڑھا ۔ والد کے انتقال کے بعد وہ معاشی بحران میں مبتلا ہو گئے ۔ علم طب اور ہومیوپیتھک کی کتابوں کا درس لے کر ایک اچھے طبیب ہو گئے اور کچھ تجربہ حاصل کرنے کے بعد ہومیوپیتھک ڈاکٹر کی حیثیت سے بیگو سرائے اور پٹنہ میں کام کرنے لگے ۔ اس پیشہ میں کامیابی حاصل کی اور فارغ البالی کی زندگی بسر کرنے لگے ۔ نہایت ہی فیاض آدمی تھے اور جو کچھ کماتے خرچ کر ڈالتے تھے ۔ صاحب موصوف کی شادی راقم کے ایک رشتہ کی خالہ سے ہوئی جو اچھی تعلیم یافتہ خاتون تھیں اور انھوں نے سہسرام میں لڑکیوں کا ایک اسکول چلایا جس کی آمدنی سے بال بچوں کی پرورش کی ۔ مبارک عظیم آبادی کے صاحبزادے کیپٹن نذیر مرحوم نے دوسری جنگ عظیم میں فوج میں رہ کر نمایاں کام انجام دیا اور پاکستان جاکر بیرسٹری کا پیشہ اختیار کیا ۔ مبارک عظیم آبادی کی بڑی صاحبزادی کی شادی میرے رشتہ کے بھائی سید غنی حیدر سے ہوئی جن کا پیشہ معلمی تھا ۔ بہت سے سرکاری اسکولوں میں استاد رہ کر اپنے کاموں کو نہایت ایمانداری سے انجام دیا اور ترقی کر کے ہیڈ ماسٹر ہوئے سہسرام ہائی اسکول میں کچھ دنوں تک ماسٹر تھے اور راقم کو ان سے تعلیم حاصل کرنے کا موقع ملا ۔ کل شاگردان کی بڑی تعظیم کیا کرتے تھے ۔ موصوف بہت اچھی انگریزی اور اردو لکھا کرتے تھے ۔ ان کے اکثر انگریزی اور اردو کے مضامین رسالوں میں شائع ہو چکے ہیں ۔ بھائی غنی حیدر نے اپنا رہائشی مکان موتیہاری شہر میں تعمیر کرایا اور اسی مکان میں سکونت پذیر ہوئے ۔ اسی شہر میں ۱۹۸۱ء میں تقریباً ۸۲ سال کی عمر میں قضا کیا ۔ بھائی غنی حیدر راقم سے بڑی محبت کرتے تھے اور میں بھی ان کی بڑی تعظیم کرتا تھا ۔ مرنے سے کچھ دنوں پہلے

جب وہ نہایت کمزور ہو چکے تھے تو موصوف مونہار سے پٹنہ کا تکلیف دہ سفر طے کرکے راقم سے ملنے آئے اور کئی دنوں تک میرے ساتھ قیام پذیر رہے۔ یہ ملاقات میرے لیے باعث سعادت تھی۔ ان سے راقم کی یہ آخری ملاقات تھی۔ صاحب موصوف کے لڑکے اور لڑکیاں ہندوستان اور پاکستان میں فارغ البالی کے ساتھ عزت کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ ان کے صاحبزادے نسیم حیدر وکالت کا امتحان پاس کرکے حکومت بہار کے ماتحت ایک اچھے عہدے پر فائز ہیں۔

مبارک عظیم آبادی دبلے اور میانہ قد کے تھے۔ گورا رنگ تھا اور چوڑی پیشانی۔ موچھیں اچھی بڑی رکھتے تھے۔ نہایت ہی خوش وضع، خوش طبع، خوش فکر، خوش اخلاق اور خوش گفتار تھے۔ کسی کی برائی نہ کرتے اور دوستوں سے بڑی محبت کرتے تھے۔ ان کے پسینے پر اپنا خون چھڑکنے کے لیے تیار رہتے تھے۔ نہایت ہی نکتہ سنج تھے اور دوسروں کے اچھے اشعار کو سن کر دل کھول کر داد دیا کرتے تھے۔ پوری زندگی مالی دشواریوں میں گذاری۔ جب کبھی کچھ پیسے ہاتھ آجاتے تو دل کھول کر دوستوں کی دعوت کیا کرتے تھے۔ نہایت خود دار انسان تھے اور اپنے عزیز دوستوں کے یہاں بھی دو چار روز سے زیادہ قیام کرنے کے لیے تیار نہ ہوتے تھے۔ راقم کے ماموں زاد بھائی ڈاکٹر غلام امام مرحوم اپنی رہایش گاہ مدرسہ ہاؤس پٹنہ سیٹی میں انھیں مدعو کرکے لائے اور اپنے ساتھ دو چار مہینے بہت اصرار کے ساتھ مہمان بنا کر رکھتے تھے۔ چونکہ ڈاکٹر غلام امام مرحوم ان کے نہایت ہی قریبی رشتہ دار تھے اس لیے ان کے ساتھ قیام کرنے میں صاحب موصوف کو کوئی مضائقہ نہ ہوتا تھا۔ ۱۹۲۸ء میں راقم مدرسہ ہاؤس میں دو مہینے بھائی غلام امام مرحوم کے ساتھ ٹھہرا اور ان دنوں مبارک عظیم آبادی بھی وہاں قیام پذیر تھے۔ بھائی غلام امام کے دوستوں کا حلقہ بڑا وسیع تھا۔ روزانہ شام کو کچھ احباب ان کی رہایش گاہ پر جمع ہوتے اور ہم سب لوگ مبارک عظیم آبادی کے کلام کو نہایت ہی ذوق و شوق سے سنا کرتے تھے۔ مبارک عظیم آبادی اپنے اشعار کو نہایت ہی سوز و گداز کے ساتھ پڑھا کرتے تھے جو بڑا اثر ہوتا تھا۔ وہ خود فرماتے ہیں:

مبارک کی غزل خوانی کہیں یا مرثیہ خوانی
ٹپکنے جاتے ہیں آنسو غزل خواں ہوتے جاتے ہیں

راقم کے اصرار پر صاحب موصوف نے ایک غزل لکھی جو حسب ذیل ہے:

نہ پوچھو مجھ سے کہ بیتاب ہوں کہاں کے لیے
کہاں سے لاؤں زباں اپنی داستاں کے لیے

خدا کی راہ ذرا سی پلا دے بادہ فروش
دعائے خیر کروں گا تری دکاں کے لیے

نسیم نے نہ صبا نے سُنی ہماری آہ
کہا تو سب سے تری خاکِ آستاں کے لیے

یہ کہہ رہے ہیں مبارک کے سیدھے سادے شعر
کہ ہم میں نکتے ہیں یارانِ نکتہ داں کے لیے

راقم کو یہ غزل بہت پسند آئی اور میں نے موصوف ہی کے الفاظ میں غزل کی داد دی۔

دھاک اقلیم سخن میں ہے مبارک اپنی
یعنی استاد ہے وہ داغ سخنور اپنا

اُن دنوں جب راقم کا قیام مدرسہ ہادس میں تھا تو بھائی غلام امام مرحوم کے ساتھ اکثر میں اور مبارک عظیم آبادی استاد مرحوم ڈاکٹر عظیم الدین احمد کی رہائش گاہ پر جایا کرتے تھے تین تین چار چار گھنٹے وہاں بیٹھ کر علمی باتیں ہوا کرتی تھیں۔ ہم لوگوں کے بہت اصرار پر استاد محترم اپنا تازہ کلام سنایا کرتے تھے۔ ایک روز جب استاد محترم نے حضرت مبارک سے اپنی کوئی تازہ غزل سنانے کی فرمایش کی تو صاحب موصوف نے یہ غزل پڑھی۔

رسائی تا بہ منزل ہر قدم ناکام ہوتی ہے
انھیں ناکامیوں میں صبح اپنی شام ہوتی ہے

ستم ڈھاتی ہے کیا پردہ نشینی آپ کیا جانیں
یہ اس سے پوچھیے جس کی نظر ناکام ہوتی ہے

نہ جانے کیا ہوئی آگے جو صبح و شام ہوتی تھی
نہ اب وہ صبح ہوتی ہے نہ اب وہ شام ہوتی ہے

مبارک میری جانب انگلیاں اٹھتی ہیں یاروں کی
نظر بازی مری پیری میں بھی بدنام ہوتی ہے

راقم کو مبارک عظیم آبادی کے اکثر اشعار بہت پسند ہیں : چند اشعار ملاحظہ ہوں :

ہمیشہ حسرت و حرماں و غم کی میزبانی کی
سلیقہ کس نے بخشا دل کو اس مہماں نوازی کا

قیدِ ہستی سے وہاں بھی نہ رہائی ہوگی
بعد مرنے کے بھی سنتے ہیں کہ جینا ہوگا

غم کیا یہاں کا اے دلِ ناداں نشاط کیا
جو چیز بے ثبات ہے اس کی بساط کیا

ہر حال میں شکر کر مبارک
تازہ ملے رزق یا شبینہ

برق بگڑا ہوا مرقع ہے ؞ کسی عاشق کے مضطرب دل کا

جبینِ شوق ہے سجدے میں ان کا آستانہ ہے
کبھی دہلیز پر سر ہے کبھی ہے پائے درباں پر

جستجو کی منزلیں باقی رہیں ؞ اور پائے جستجو باقی نہیں

تماشاگاہ دنیا اک نمایش گاہ حسرت ہے
تماشائی جو آتے ہیں وہ حیراں ہوتے جاتے ہیں

گھٹا اٹھی ہے کالی اور کالی ہوتی جاتی ہے
صراحی جو بھری جاتی ہے خالی ہوتی جاتی ہے

وہ جو بکھرے ہوئے گیسو کی ادا ہوتی ہے
پوچھو آشفتہ مزاجوں سے کہ کیا ہوتی ہے

نظر جب اچھی صورت آئے گی دل آہی جائے گا
خطا کاران الفت سے خطا یہ عمر بھر ہوگی

راقم نے بیچین ہوکر سینکڑوں بار اس شعر کو پڑھا ہے، شعر ملاحظہ ہو۔

مشاطۂ خیال تری عمر ہو دراز
صدقے ترے دکھادے انھیں پھر سنوار کے

حضرت مبارک عظیم آبادی قطعۂ تاریخ بہت خوب لکھا کرتے تھے۔ راقم کے کہنے پر موصوف نے کئی قطعے تحریر فرمائے، ساٹھ برس سے زیادہ کا زمانہ گذر گیا ہے اور معلوم نہیں یہ سب قطعات تاریخ کیا ہو گئے، خوش قسمتی سے چند دنوں پہلے پرانے کاغذات میں موصوف کا لکھا ہوا ایک قطعہ ملا جو بالکل نایاب ہے۔ اس قطعہ کی راقم کے پاس صرف ایک کاپی رہ گئی ہے۔ یہ قطعہ تاریخ ۱۹۳۵ء میں لکھا گیا تھا۔ ۱۹۳۵ء میں پٹنہ یونیورسٹی نے مسٹر ہنری لیمبرٹ پرنسپل پٹنہ کالج کو پی ایچ۔ ڈی کی اعزازی ڈگری عطا کی تھی۔ اس موقع پر حضرت مبارک نے ایک قطعہ تاریخ میری فرمایش پر تحریر فرمایا۔

قطعۂ تاریخ

مخاطب شدن عالی جناب معلی القاب مسٹر ہنری لیمبرٹ، پرنسپل پٹنہ کالج بخطاب
پی۔ ایچ۔ ڈی

از نتائج طبع جناب استاد فاضل سید مبارک حسین، مبارک عظیم آبادی

وہ لیمبرٹ ہمارے پرنسپل مشہور
خطاب خوب پی ایچ ڈی ملا انھیں فی الحال
عطا کی پٹنہ یونیورسٹی نے یہ ڈگری
مبارک ان کو یہ برتر خطاب اہل کمال
یہ سچ ہے شادی وغم اس جہاں میں توام ہیں
خوشی خطاب کی، جانے کا آپ کے ہے ملال

خوشا! وہ وقت کہ آئے یہ پٹنہ کالج میں / کہ ان کے فیض سے کیا کیا ہوا یہ مالا مال
سنوارنا تھا جہاں تک اسے سنوار چلے / بنا کے جاتے ہیں کالج کو یہ پری تمثال
یہ حسن نظم کے سانچے میں اس کو ڈھال گیا / کہ اوج حسن پہ ہے اس کا حسن اور جمال
بہار جھوم کے آئی ، بہت پھلا پھولا / زبان حال سے یہ کہہ رہے ہیں اس کے نہال
نہ بھولیں گے انھیں شرمندۂ کرم ان کے / کہ ان کو یاد دلائیں گے ان کے نیک اعمال
کٹک میں بھی رہے پٹنے میں بھی رہے یعنی / جہاں رہے وہاں پھولے یہ خوبیاں یہ کمال
شفیق باپ کے اشفاق پڑھنے والوں پر / یہ چہیتے بیٹے تھے ان کو تو طالبان کمال
دلوں پہ یوں کیا حسن سلوک نے قبضہ / بدل تھے راضی و شاکر پژو فسردہ حال
یہ پیش کش ہے دعاؤں کا ہر طرف سے آج / کہ ہنستے بولتے گذرے، خدا رکھے خوشحال

یہ بات آئی ہے برجستہ عیسوی تاریخ
خطاب خوب ہے مسٹر لکھو مبارک سال

۱۹۳۵ء

مبارک عظیم آبادی نے اس قطعہ تاریخ کو ریشمی ساٹن پر چھپوا کر پرنسپل ہنری لیمبرٹ کو تحفتاً پیش کیا۔ صاحب موصوف نے اس قطعہ کو راقم سے پڑھوا کر سنا اور حضرت مبارک عظیم آبادی کا بہت شکریہ ادا کیا۔ دوسرے روز حضرت مبارک اور راقم کو اپنے یہاں چائے پر مدعو کیا اور حضرت مبارک کی کئی اردو نظمیں ان سے سنیں۔ پرنسپل لیمبرٹ اردو سمجھتے تھے اور پڑھتے وقت راقم ہر شعر کا ترجمہ انگریزی میں کرتا جاتا تھا۔ پرنسپل موصوف نے اس قطعہ کو ایک خوب صورت فریم میں لگا کر اپنے ڈرائنگ روم میں آویزاں کر دیا تھا۔ پنشن پا کر جب ہندوستان سے جانے لگے تو اس فریم شدہ قطعہ کو اپنے ساتھ بطور یادگار انگلستان لے گئے۔

غزل گو شعرا میں مبارک عظیم آبادی کا ایک اہم مقام ہے۔ ان کے کمال شاعری کے متعلق نوح ناروی فرماتے ہیں کہ "جملہ محاسن شاعرانہ ان کے کلام میں موجود ہیں۔ قدرت نے انھیں شاعر پیدا کیا ہے اور پھر مشق سخن نے ان کو ایسے بلند مقام پر پہنچا دیا ہے جہاں ہر شاعر نہیں پہنچ سکتا۔ یہ شعر کہتے وقت ہمیشہ خیال رکھتے ہیں کہ استاد داغ کا رنگ جانے نہ پائے۔ وہی بندش، وہی ترکیب، وہی لفظوں کا رکھ رکھاؤ، وہی محاکات، وہی دلی کی ٹکسالی زبان،

سب اُن کے کلام میں ہیں جن کے باعث داغ کا کلام اس قدر مقبول خاص وعام ہوا"۔ مبارک عظیم آبادی کی منتخب غزلوں کا مجموعہ ڈاکٹر سید محمود وزیر حکومت بہار کی ادب نوازی کی بدولت "جلوۂ داغ" کے نام سے نظامی پریس بدایون سے شایع ہوا ہے جس کے متعلق مبارک عظیم آبادی یوں فرماتے ہیں۔

"جلوۂ داغ" کی قسمت چمکی

لطف فرما ہے نگاہ محمود"

مبارک عظیم آبادی نے بہت سی نظمیں بھی لکھی ہیں۔ ان کی ان نظموں میں سادگی اور فصاحت پائی جاتی ہیں۔ مسٹر سید عبدالعزیز وزیر تعلیم حکومت بہار کو مبارک عظیم آبادی کی بہت سی نظمیں پسند تھیں۔ چنانچہ ان کی نظموں کے دو مجموعے موسوم بہ "مرقع سخن" سرکاری خرچ سے شائع کرایا۔ افسوس ہے کہ "مرقع سخن" کے نسخے اب بالکل نایاب ہو گئے ہیں۔

مبارک عظیم آبادی کی آخری زندگی بیماری اور تنگ دستی میں گذری۔ مسٹر سید اکبر حسین رئیس ایڈوکیٹ اور بعد میں جج پٹنہ ہائی کورٹ نے انھیں پٹنہ سیٹی لے جا کر اپنے آبائی مکان میں رکھا اور موصوف کی ہر طرح سے مدد کی۔ اسی مکان میں رہ کر ۱۹۵۸ء میں مبارک عظیم آبادی نے انتقال کیا۔

۱۲۔ قاضی عبدُالودُود (بیرسٹر و محقق)

مسٹر قاضی عبدالودود دانش ور اور اردو کے مشہور محقق تھے۔ آپ نے تقریباً ساٹھ سالوں تک اردو کی بے شمار خدمتیں کیں۔ چنانچہ ان کی شہرت ادبی دنیا میں قائم ہے اور بلاشبہ عرصے تک قائم رہے گی۔ موصوف کے متعلق بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور میں ان سب باتوں کو دہرانا نہیں چاہتا۔ راقم یہاں پر صرف ان کے نجی حالات اور اوصاف حمیدہ کا تذکرہ کرنا چاہتا ہے جن سے میں پوری طور سے واقف ہوں۔

قاضی صاحب کے والد کا نام قاضی عبدالوحید تھا۔ قاضی عبدالودود کی پیدائش ۸ مئی ۱۸۹۶ء کو موضع کاکو ضلع جہان آباد میں ہوئی جو ایک مشہور گاؤں ہے۔ عربی و فارسی کی ابتدائی

تعلیم اپنے والد صاحب کے زیر نگرانی گھر ہی پر ہوئی اور کلام اللہ مجید بھی حفظ کیا۔ سولہ سال کی عمر میں پٹنہ سیٹی محمڈن اینگلو عربک اسکول سے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ اس کے بعد پٹنہ کالج میں داخلہ لیا اور اسی کالج سے بی اے کی ڈگری حاصل کی۔ ۱۹۲۳ء میں اعلیٰ تعلیم کے لیے انگلستان گئے اور کیمبرج یونی ورسٹی سے ۱۹۲۷ء میں اقتصادیات میں بی اے کی ڈگری ٹرائپوس کے ساتھ حاصل کی۔ مڈل ٹمپل سے بیرسٹر ہوئے اور ۱۹۲۹ء میں ہندوستان واپس آئے۔

قاضی صاحب کا عقد مارچ ۱۹۲۱ء میں پٹنہ کے ایک ممتاز وکیل شاہ رشید اللہ صاحب کی صاحبزادی سے ہوا۔ شاہ رشید اللہ صاحب سے راقم کے چھوٹے ماموں مولوی غلام وارث صاحب ایڈوکیٹ کے خصوصی تعلقات تھے اور خود راقم بھی اپنی زمینداری کے مقدمات کے سلسلے میں شاہ صاحب کی خدمت میں اکثر حاضر ہوا کرتا تھا اور موصوف راقم سے شفقت سے ملتے تھے۔ قاضی صاحب کی اولاد میں صرف ایک صاحبزادے مسٹر قاضی محمد مسعود ہیں جنھوں نے ایم۔ اے اور ایل ایل بی کی ڈگریاں حاصل کیں اور بہ حیثیت ایڈوکیٹ اپنے خاندان کی عزت و وقار کو برقرار رکھتے ہوئے پٹنہ میں رہ کر فارغ البالی کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ قاضی عبدالودود صاحب کا قد متوسط، رنگ گندمی اور چہرہ گول تھا۔ گرچہ زندگی بھر صحت اچھی نہیں رہی مگر کبھی بھی چہرے پر بیماری کے آثار نظر نہ آتے تھے۔ انگلستان کے دوران قیام قاضی صاحب کو پلورسی ہو گئی اور ان کے پھیپھڑے کمزور ہو گئے تھے۔ مختلف اوقات میں تین چار سال کا عرصہ علاج کے لیے یورپ کے نامی سنی ٹوریموں میں گذارا۔ پٹنہ کے ڈاکٹروں نے انھیں ٹی بی کا خدشہ دلایا تھا، لیکن امراض سینہ کے ڈاکٹروں نے مختلف طرح کی جانچ کرنے کے بعد ان کا یہ خدشہ دور کر دیا۔ ۱۹۷۰ء میں انھیں پراسٹریٹ کی تکلیفیں شروع ہوئیں جو آخر وقت تک رہیں اور چند وجوہات کی بنا پر آپریشن ممکن نہ ہو سکا جس کی وجہ سے مرتے دم تک کافی تکلیفوں کا سامنا کرنا پڑا۔ اس بیماری کے دوران بھی صاحب موصوف نے ہمت سے کام لیا اور اپنے معمولات میں کوئی فرق آنے نہ دیا۔ صحت کے بارے میں موصوف نے کبھی مایوسی کا اظہار نہ کیا۔ راقم جب ایک روز ان سے ملنے گیا تو دیکھا کمرے سے باہر کھلی چھت پر بیٹھے داڑھی بنا رہے ہیں اور جب میں نے ان سے خیریت دریافت کی تو بغیر کسی تردد کا اظہار کیے ہوئے نہایت ہی سرسری طور سے فرمایا کہ کچھ دن پہلے ایک ہاتھ پر فالج آگیا تھا۔ اتنا کہہ کر وہ اپنے کام میں مشغول ہو گئے اور سخت بیماری کو کوئی اہمیت نہ دی۔

یہ آپ کی برداشت اور بلند ہمتی کا ایک نمونہ ہے۔ علاج و معالجہ کے معاملہ میں قاضی صاحب بہت ہی محتاط تھے اور دواؤں کا استعمال نہایت ہی پابندی سے کیا کرتے تھے۔ کھانے میں انگریزی طرز کی ہلکی اور طاقت بخش غذا استعمال کرتے۔ روزانہ چھ بجے صبح اٹھتے" اور بستر ہی پر صبح کی چائے نیبو ڈال کر پیتے تھے اور پھر اخبار پڑھنے میں مشغول ہو جاتے۔ تھوڑی دیر بعد ناشتہ کرتے اور پلنگ ہی پر بیٹھ کر لکھنے پڑھنے میں لگ جاتے تھے۔ اس درمیان جو لوگ ملنے جلنے آتے ان کو بھی کچھ وقت دیتے اور ایک ہی ساتھ کئی لوگوں سے مختلف موضوعات پر گفتگو کرتے تھے۔ دن کا کھانا عموماً بارہ بجے کھاتے اور کھانے کے بعد کچھ دیر کے لیے آرام کرتے تھے۔ تین بجے سے پھر لکھنے پڑھنے کا سلسلہ شروع ہو جاتا تو آٹھ بجے رات تک جاری رہتا تھا۔ اپنے ان معمولات میں کبھی کوئی فرق نہ آنے دیا۔ آپ خطوط کے جواب نہایت پابندی کے ساتھ دیا کرتے تھے۔ ہمیشہ انگریزی لباس فلٹ ہیٹ کے ساتھ استعمال کیا کرتے تھے۔ راقم نے قاضی صاحب کو کبھی ہندوستانی لباس میں نہیں دیکھا۔

قاضی عبدالودود ایک کھاتے پیتے خوش حال زمیں دار خاندان کے فرد تھے۔ بیرسٹری کی سند حاصل کر کے جب ہندوستان واپس آئے تو ڈاکٹروں کی ہدایت کے مطابق بیرسٹری کے پیشے سے الگ رہے اور انھوں نے اس سند سے کبھی کوئی فائدہ نہیں اٹھایا۔ ان کے علمی ذوق نے انھیں اس بات کی فرصت ہی نہ دی کہ وہ کچہری کے ہنگاموں میں الجھیں۔ آپ کا زیادہ وقت یکسوئی کے ساتھ کتب بینی، تعلیم و تعلم میں گذرتا۔ موصوف ان چند خوش قسمت دانش وروں میں سے تھے جنھیں بہ یک وقت علمی ذوق و صلاحیت، فکر معاش کی الجھنوں سے آزادی اور ساتھ ہی ساتھ خدا بخش خاں کے عظیم کتب خانہ کا قرب حاصل تھا۔ چنانچہ قاضی صاحب نے ان تمام باتوں سے پورا فائدہ اٹھایا اور اردو محققین کے درمیان اپنا ایک خاص مقام پیدا کیا۔ علمی معاملات میں وہ نوجوانوں کی ہمیشہ ہمت افزائی اور رہنمائی کیا کرتے اور ان میں صحیح تحقیقی ذوق پیدا کرنے کے لیے کوشاں رہتے تھے۔ میری نظر میں قاضی صاحب ایک مجموعہ اضداد شخصیت کے مالک تھے۔ علمی معاملات میں انتہائی سخت لیکن ذاتی معاملات میں نہایت ہی نرم، بہ ظاہر ایک غیر جذباتی دانش مند لیکن حقیقت میں ایک حساس دل کے مالک تھے۔ خود کو لامذہب کہنے والے، لیکن مسلمانوں کے معاملات سے دل چسپی رکھتے تھے۔ عرصے تک کانگریس کے ممبر رہے اور ہندوؤں سے ان کے بہت اچھے تعلقات تھے اگر

ان کے سامنے ان کی فرقہ وارانہ ذہنیت کی مذمت کیا کرتے تھے۔ یہ باتیں میں اپنے ذاتی مشاہدے کی بنا پر لکھ رہا ہوں۔ ان کے مذہبی خیالات خواہ کچھ بھی ہوں، لیکن دوسروں کے مذہب کا احترام ہمیشہ ان کے پیش نظر رہا کرتا تھا اور خود راقم کے سامنے اپنے ملحدانہ خیالات کا انھوں نے کبھی بھی اظہار نہ کیا۔

علمی معاملات میں ان کی سختی کا یہ عالم تھا کہ مختلف یونیورسٹیوں سے جو تحقیقی مقالات ان کے پاس بھیجے جاتے تھے، موصوف انھیں اکثر رد کر دیتے تھے۔ پروفیسر ولی الحق انصاری کے ڈی لٹ کے تحقیقی مقالے کے سوا غالباً کسی دوسرے مقالے پر موصوف نے ڈگری دیئے جانے کی کبھی سفارش نہ کی۔ قاضی صاحب بعض لوگوں کے علمی کارناموں پر سخت سے سخت تنقیدیں کرتے مگر یہی لوگ جب پٹنہ آکر ان سے ملتے تو موصوف ان لوگوں کی ہر طرح سے خاطر مدارات کیا کرتے تھے، جس سے یہ صاف ظاہر ہوتا تھا کہ قاضی صاحب ذاتی معاملات میں نظریاتی اختلافات کو دخل انداز نہ ہونے دیتے تھے۔ قاضی عبدالودود اپنے عزیزوں اور دوستوں سے بہت خلوص و محبت سے ملا کرتے تھے اور ان کی ہر خوشی و غم میں شریک رہا کرتے۔ مسٹر فخرالدین علی احمد سابق صدر جمہوریۂ ہند، دہلی کے سابق میئر مسٹر نورالدین ان کے عزیز ترین دوستوں میں سے تھے۔ جب یہ حضرات پٹنہ تشریف لاتے تو ان لوگوں کے اعزاز میں قاضی صاحب نہایت شاندار دعوتیں کیا کرتے تھے۔ اکثر لوگوں کے اعزاز میں سبسکرپشن ڈنر (Subscription Dinner) بھی دیا جاتا تھا جس کا انتظام ان کے بھائی قاضی سعید کیا کرتے تھے۔ راقم کو ان دونوں قسموں کی دعوتوں میں شریک ہونے کا شرف حاصل ہوا ہے۔ موصوف میرے تینوں لڑکوں کی شادیوں کے موقع پر برات میں شریک تھے۔ جب ان کے عزیز دوست فخرالدین علی احمد صدر جمہوریہ ہند مقرر ہوئے تو ان کی خوشی کی کوئی حد نہ رہی۔ دہلی کے اخبارات میں یہ خبر شائع ہوئی کہ اس تقرری سے بیگم فخرالدین علی احمد اور صدر کے عزیز دوست قاضی عبدالودود کی خوشی کی کوئی انتہا نہ تھی۔

قاضی صاحب کی اہلیہ ایک دیندار خاتون تھیں۔ صوم و صلوٰۃ کی پابندی کے ساتھ ایسے رسومات جو عام طور سے سنی گھرانوں میں رائج ہیں منایا کرتی تھیں۔ اکثر مجلس میلاد بھی منعقد کراتیں جس میں میرے محترم شاگرد سید اطہر شیر جو آج کل پٹنہ کے عربک پرشین

انسی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر ہیں، محترمہ کے اصرار پر میلاد خوانی کے فرائض انجام دیتے تھے۔ قاضی عبدالودود کے خیالات ان معاملات میں اپنی اہلیہ کے بالکل مختلف تھے مگر اپنی اہلیہ کے جذبات کا احترام کرتے ہوئے میلاد خوانی کو گوارہ کر لیتے اور غالباً تبرک کی مٹھائیاں بھی کھاتے ہوں گے۔

قاضی صاحب بظاہر ایک خشک منطقی انسان تھے لیکن ان کی طبیعت میں جذبۂ محبت بدرجہ اتم موجود تھا۔ اپنے دونوں بھائی پروفیسر قاضی فرید اور مسٹر قاضی سعید سے والہانہ محبت کرتے تھے۔ قاضی سعید یورپ سے واپس آنے کے بعد قاضی عبدالودود صاحب کے ساتھ زندگی بھر قیام پذیر رہے اور دونوں بھائیوں کے درمیان بے انتہا محبت تھی۔ قاضی سعید صاحب میرے دوستوں میں تھے اور میں اکثر ان سے ملنے قاضی صاحب کی رہائش گاہ پر جایا کرتا تھا۔ موت سے پہلے قاضی سعید قلب کی سخت بیماری میں مبتلا ہو گئے، جو ان کے لیے جان لیوا ثابت ہوئی۔ میں ان کی بیماری سے پریشان رہتا اور کئی مرتبہ عیادت کے لیے گیا۔ دو ہفتے کی مسلسل بیماری کے بعد اچانک قضا کر گئے۔ ایک روز خدابخش لائبریری جاتے وقت راقم کو خبر ملی کہ قاضی سعید کی حالت نہایت تشویشناک ہو گئی ہے اور ان کے معالج ان کی زندگی سے مایوس ہو چکے ہیں۔ اس خبر کو سن کر جب میں خدابخش لائبریری پہنچا تو عزیز محترم سید اطہر شیر (جو اس وقت مذکورہ لائبریری کے اسسٹنٹ ڈائرکٹر تھے) سے کہا کہ میری طرف سے قاضی سعید کی خیریت ٹیلی فون سے دریافت کر لیں۔ جواب میں مسٹر جسٹس خلیل احمد جو قاضی سعید ہی کے پاس موجود تھے خبر دی کہ سعید اب دم توڑ رہے ہیں آپ لوگ جلد آجائیں۔ چنانچہ سید اطہر شیر اور میں نہایت سراسیمگی کی حالت میں قاضی عبدالودود صاحب کی رہائش گاہ پر پہنچ کر قاضی سعید کے کمرے میں گئے، جہاں وہ غشی کے عالم میں پڑے ہوئے تھے اور بجز مسٹر جسٹس خلیل احمد اور ایک نوکر کے کوئی تیسرا آدمی وہاں نہ تھا۔ قاضی سعید کی یہ حالت ہم سے دیکھی نہ گئی، اور ہم تینوں آبدیدہ کمرے سے باہر نکل آئے اور پھر دس منٹ کے اندر قاضی سعید رحلت کر گئے۔ ہم لوگوں نے کچھ دیر تک اس سانحے کی خبر قاضی عبدالودود صاحب کو نہ دی جو اپنے ڈرائنگ روم میں پہلے ہی سے نڈھال پڑے ہوئے تھے۔ جب بھائی کی موت کی خبر سنی تو پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے اور ان کا یہی حال مرحوم کے فاتحہ چہارم کے موقع پر بھی تھا۔

قاضی عبدالودود صاحب سے میری پہلی ملاقات غالباً ۱۹۳۰ء میں جناب سید ریاض

حسین خاں خیال رئیس رسول پور ضلع مظفر پور کے دولت کدہ واقع گولا دریا پور پٹنہ میں ہوئی۔ اس زمانے میں میرا قیام زیادہ تر پٹنہ سے باہر رہتا تھا لہٰذا قاضی صاحب سے سرسری ملاقاتیں ہی ہوا کرتی تھیں۔ سید ریاض حسین خاں صاحب ذوق شاعر تھے اور ان کی قیام گاہ قاضی عبدالودود صاحب کے مکان سے بہت دور نہ تھی اور اس علمی ذوق نے ریاض حسین خاں صاحب اور قاضی صاحب میں بہت حد تک یگانگت پیدا کر دی تھی۔ قاضی صاحب ان کے اشعار کو پسند کرتے تھے اور ہفتہ میں دو چار بار ان کے دولت کدہ پر ضرور جایا کرتے۔ ایک روز جب میں سید ریاض حسین خاں صاحب کی رہائش گاہ پر پہنچا تو دیکھا کہ ریاض حسین خاں صاحب اور قاضی عبدالودود صاحب کے درمیان حسرت موہانی کے اشعار کے متعلق باتیں ہو رہی ہیں۔ ریاض حسین خاں صاحب حسرت کی شاعری کی عظمت کے قائل تھے مگر قاضی صاحب حسرت کو اردو شعرا میں کوئی اعلیٰ مقام دینے کے لیے تیار نہ تھے۔ اس موضوع پر بہت دیر تک باتیں ہوتیں رہیں اور میں بھی دل چسپی سے ان لوگوں کی بحثوں کو سنتا رہا، کیونکہ میں بھی حسرت کی شاعرانہ خوبیوں کا معترف تھا۔ تھوڑی دیر بعد بغیر کسی نتیجے پر پہنچے ہوئے باتیں ختم ہو گئیں۔ خوش قسمتی سے قاضی صاحب سے میری طویل ملاقاتیں ۱۹۳۲ء سے ۱۹۳۵ء تک ہوتی رہیں۔ راقم اس زمانہ میں پٹنہ یونیورسٹی کی طرف سے خدا بخش لائبریری میں تحقیق کا کام کیا کرتا تھا اور اس لائبریری میں موصوف تقریباً روزانہ آیا کرتے تھے۔ ان کے ہاتھ میں ہمیشہ ایک نوٹ بک ہوا کرتی تھی جس میں مختلف کتابوں کو پڑھ کر موصوف یادداشتیں لکھا کرتے اور جا بہ جا ان پر اپنی طرف سے حاشیوں کا بھی اضافہ کرتے تھے۔ اس طور سے وہ یادداشتیں نہایت مفید ہو جایا کرتی تھیں راقم نے بھی اکثر ان یادداشتوں سے استفادہ کیا جو صفوی دور کی تاریخ پر مشتمل تھیں مگر شاہ اسمٰعیل اور سام میرزا کے چند حالات کے متعلق ہمارے درمیان اتفاق نہ ہو سکا۔

۱۹۳۴ء کے عظیم زلزلے سے پہلے جو لوگ تحقیق کے کام سے یا مطالعہ کی غرض سے خدا بخش لائبریری آتے وہ کرزن ریڈنگ روم میں ہی بیٹھ کر کام کرتے۔ چار بجے شام سے سات بجے شام تک اسی کمرے میں اخبارات و رسائل، بہار گزٹ اور دیگر سرکاری مطبوعات پڑھنے کے لیے عوام الناس کی ایک بھیڑ لگی رہتی تھی، جس کمرے میں ان دنوں خدا بخش لائبریری کا نوادر رہی اس میں مخمل کی چادر سے ڈھکی ہوئی سنگ مرمر کی ایک گول میز اور

چند کرسیاں لگی رہتی تھیں۔ کبھی کبھی اسی کمرے میں باہر سے آنے والے معززین کو لائبریری کی مشہور اور نادر کتابیں دکھائی جاتی تھیں۔ یہ کمرہ "وزیٹرس روم" کہلاتا تھا۔ مسٹر ولی الدین خدا بخش نے جوان دنوں لائبریری کے سکریٹری تھے، قاضی عبدالودود، راقم اور چند دیگر اسکالروں کو اس کمرے میں بیٹھ کر کام کرنے کی اجازت دے دی تھی اور نواب میاں جو لائبریری کے کتاب دار تھے ہم لوگوں کی مدد کے لیے حاضر رہتے۔ ڈاکٹر سید منظم حسین جو ڈھاکہ یونیورسٹی میں عربی کے مشہور پروفیسر تھے کئی مہینوں تک اسی کمرے میں ہم لوگوں کے ساتھ بیٹھ کر اپنی تحقیق کا کام کرتے رہے۔ صاحب موصوف نے آکسفورڈ یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی تھی آپ عربی زبان دانی میں اپنا ایک خاص مقام رکھتے تھے۔ باوجود ان کمالات کے موصوف ایک نہایت منکسر المزاج انسان تھے۔ آپ اپنے کارناموں کی بدولت ڈھاکہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر کے عہدے پر کچھ عرصے تک فائز رہے اور پنشن پائی۔ چند ماہ بعد پٹنہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر کی سفارش پر مسٹر ولی الدین خدابخش نے لائبریری کی بالائی منزل پر ایک کمرہ جس میں پہلے خان بہادر عبدالمقتدر کام کیا کرتے تھے راقم کے لیے مخصوص کر دیا جہاں میں زلزلے کے سال تک کام کرتا رہا اور پھر جب تک لائبریری کی نئی عمارت قائم نہ ہوئی ہم لوگ کرزن ریڈنگ روم ہی میں کام کرتے رہے۔

۱۹۳۶ء میں راقم کا تبادلہ کٹک کالج سے پٹنہ کالج بہ حیثیت لکچرر فارسی ہوا۔ ان دنوں مجھے تحقیق اور مختلف کاموں کے سلسلے میں خدابخش لائبریری جانا ہوتا تھا۔ وہاں برابر قاضی عبدالودود سے ملاقاتیں ہو جایا کرتی تھیں۔ قاضی عبدالودود صاحب جو ایک خوددار انسان تھے بہت کم لوگوں سے ملنے ان کے یہاں جایا کرتے تھے۔ سید ریاض حسین خاں صاحب سے قاضی صاحب کے نہایت گہرے مراسم تھے اور قاضی صاحب ہفتہ میں دو تین بار ان کے یہاں ضرور جایا کرتے تھے اور میں بھی ریاض حسین خاں صاحب کے علم کی قدر کرتا تھا۔ چنانچہ اسی ہم نشینی کی وجہ سے میرے اور قاضی صاحب کے تعلقات مزید گہرے ہو گئے اور راقم قاضی صاحب کی رہائش گاہ پر پہلے سے زیادہ آنے جانے لگا۔

۱۹۳۸ء میں جب بہار میں کانگریسی حکومت قائم ہوئی تو ہندی کی ترویج کے لیے محلہ قدم کنواں میں ہندی ساہتیہ سملن کی ایک شاندار عمارت تعمیر کرائی گئی اور اس میں ایک ہندی کی لائبریری قائم کی گئی۔ اس زمانے میں ڈاکٹر سید محمود حکومت بہار میں وزیر تعلیم تھے، آپ نے اردو کے

شائقین کے اصرار پر خدا بخش لائبریری کے متصل ایک چھوٹی سی اردو لائبریری قائم کرائی۔ لیڈی انیس امام اس لائبریری کی صدر مقرر ہوئیں اور مسٹر سید حمید رامام بیرسٹر اس کے سکریٹری ہوئے۔ اس لائبریری کے لیے ایک انتظامیہ کمیٹی بھی قائم ہوئی جس کے اور لوگوں کے علاوہ قاضی عبدالودود صاحب اور راقم بھی ممبر تھے۔ قاضی عبدالودود، راقم اور چند دیگر ممبران مسلسل تقریباً دس سال تک اس لائبریری کو ایک مثالی اردو لائبریری بنانے کی کوشش کرتے رہے مگر حکومت بہار نے اس طرف کوئی توجہ نہ دی۔ چنانچہ قاضی عبدالودود صاحب نے مایوس ہو کر اپنے کو لائبریری کی ممبری سے الگ کر لیا اور راقم نے بھی دل برداشتہ ہو کر لائبریری کے معاملات میں دلچسپی لینا کم کر دیا۔ لائبریری کے معاملات میں ہمیشہ راقم اور قاضی صاحب کے خیالات میں ہم آہنگی رہی اور ہمارے درمیان کبھی کوئی اختلاف نہ ہوا۔

قاضی عبدالودود صاحب سے راقم کے دوستانہ اور برادرانہ تعلقات ۴۵ سال تک رہے۔ جب میں ۱۹۶۵ء کے اواخر میں خدا بخش لائبریری کا ڈائرکٹر مقرر کیا گیا تو یہ تعلقات اور بڑھے۔ تقریباً دو سالوں تک ہم لوگوں نے لائبریری کے کاموں میں مل جل کر حصہ لیا اور جہاں تک ہو سکا لائبریری کے فروغ کے لیے ہر طرح کی کوششیں کیں۔ قاضی صاحب مخطوطات کی اہمیت کو خوب سمجھتے تھے اور خدا بخش لائبریری کی شہرت برقرار رکھنے کے لیے ان کی مسلسل خریداری پر زور دیا کرتے تھے۔ اور اس معاملے میں ہم دونوں ہمیشہ ہم خیال رہے۔ مطبوعات کی خریداری کے لیے صاحب موصوف صرف انھی کتابوں کی خریداری کی سفارش کرتے جو نہایت اہم مفید اور معیاری ہوا کرتی تھیں۔ قاضی صاحب نے ان گزشتہ ساٹھ سالوں میں خدا بخش لائبریری کی جو بے شمار خدمتیں کی ہیں انھیں کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا ہے۔ راقم کو بہت سی کمیٹیوں میں قاضی صاحب کے ساتھ کام کرنے کا اتفاق ہوا اور میں نے انھیں اپنے تمام کاموں میں ایک ایماندار، دلیر اور فرض شناس انسان پایا۔ یہی وجہ تھی کہ لوگ ہمیشہ ان کی رائے سے اتفاق کیا کرتے تھے۔ قاضی صاحب نے اردو کے فروغ کے لیے ۱۹۵۴ء میں "ادارہ تحقیقات اردو" قائم کیا اور اسی ادارے کے تحت ۱۹۵۹ء میں اردو کی کتابوں کی ایک نمائش کرائی جو نہایت کامیاب رہی۔ آج کل یہ ادارہ خدا بخش لائبریری سے ملحق ہے اور اردو کی ترقی کے لیے کامیابی سے کام کر رہا ہے۔ یہ ادارہ ان کی بہترین یادگار ہے۔ ہندوستان

کا کوئی اردو اور فارسی کا علمی اعزاز ایسا نہ تھا جس سے قاضی صاحب مشرف نہ ہوئے ہیں۔

قاضی صاحب کی وفات ۲۵۔جنوری ۱۹۸۴ء کو پٹنہ میں ہوئی۔ صاحب موصوف کی وفات نے علمی حلقہ میں عموماً اور اردو حلقے میں خصوصاً ایک ایسا خلا پیدا کر دیا جو آسانی سے پر نہیں ہو سکتا۔

ع "حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا"

۱۴۔ مسٹر سیّد مہدی امام (بیرسٹر و دانش ور)

مسٹر سید مہدی امام ۱۸ فروری ۱۹۰۲ء کو نیورہ ضلع پٹنہ میں پیدا ہوئے۔ آپکا خاندان چار پشتوں سے قانون دانی اور علمیت کے لیے مشہور تھا۔ مسٹر مہدی امام کے پردادا خان بہادر شمس العلماء وحید الدین اپنے زمانے کے ایک نہایت ہی قابل اور نامور صدر اعلیٰ تھے اور حکومت ان کی بڑی قدر کرتی تھی۔ MOORE'S INDIAN APPEALS کی ورق گردانی سے پتہ چلتا ہے کہ وحید الدین صاحب کے بے شمار فیصلوں کو ہائی کورٹ کے فیصلوں پر ترجیح دی جاتی تھی اور ان کے بہت سے فیصلے جنھیں ہائی کورٹ رد کر دیتی تھی اپیل میں برقرار رہتے۔ آپ کے دادا نواب شمس العلماء امداد امام نے بھی وکالت کی تعلیم حاصل کی تھی مگر وکالت کا پیشہ اختیار نہ کیا۔ موصوف کے والد مسٹر سید حسن امام اور چچا سر سید علی امام قانون دانی کے لیے نہایت مشہور رہتے اور ان لوگوں کا شمار ہندوستان کے نہایت ہی ممتاز بیرسٹروں میں تھا۔ افسوس اب ایسے لوگ مسلمانوں میں مفقود ہو چکے ہیں۔ مسٹر سید حسن امام نے مسٹر مہدی امام کو کم سنی میں تعلیم حاصل کرنے کے لیے انگلستان بھیجا اور آپ نے اپنی ابتدائی تعلیم آکسفورڈ کے ڈریگون پری پیرٹری اسکول میں شروع کی اور جب آٹھ سال کے ہوئے تو وہ یونانی زبان سیکھنے لگے۔ اس زبان کی بدولت انھیں یونانی زبان کے کلاسیکی ادب سے مستفیض ہونے کا موقع ہاتھ آیا۔ اس کے بعد آپ لاطینی زبان پڑھنے لگے اور جلد ہی اس میں بھی مہارت حاصل کر لی۔ ان مدارج کے طے کرنے کے بعد آپ ۱۹۱۵ء میں ہیرو کے نامور پبلک اسکول میں داخل ہوئے۔ پھر آکسفورڈ یونیورسٹی کے ادریل کالج سے بی۔ اے کی ڈگری نہایت امتیاز کے ساتھ حاصل کی۔ چونکہ آپ یونانی

اور لاطینی زبانوں سے گہرا شغف رکھتے تھے اس لیے علوم انسانی (Literae Humaniores) کے درجہ تک پہنچ گئے، جو ان زبانوں کا سب سے اعلیٰ نصاب ہے اور ہندوستان میں چند ہی لوگوں نے یہ اعزاز آکسفورڈ یونیورسٹی سے حاصل کیا ہے۔ چونکہ قانون دانی مہدی امام نے ورثہ میں پائی تھی اور اسے ان کے دور میں اعلیٰ تعلیم کا ایک نمایاں معیار سمجھا جاتا تھا اس لیے وہ قانون کی تعلیم میں مشغول ہو گئے۔ اور اس کی تکمیل کے بعد ۱۹۲۵ء میں بیرسٹر ہوئے۔ صاحب موصوف ۱۹۲۵ء سے ۱۹۵۷ء تک پٹنہ ہائی کورٹ میں پریکٹس کرتے رہے۔ اس طرح وہ ایک لمبے عرصے تک اسی کام میں منہمک رہے اور شہرت حاصل کی۔ ان کا نیک کردار ضرب المثل تھا اور آپ کسی ایسے آدمی کا مقدمہ نہ لیتے جو جھوٹا ہوتا اور معاملہ مشکوک نظر آتا۔ مسٹر سید مہدی امام بہار سرکار کے قانونی مشیر مقرر ہوئے اور اس عہدے کو ۱۹۴۶ء میں اس وقت ترک کر دیا جب قومی آزادی کی تحریک نقطۂ عروج کو پہنچ چکی تھی۔

مسٹر سید مہدی امام کی شادی مسٹر جسٹس سر سید فضل علی کی صاحبزادی سے ہوئی تھی جن کے بطن سے ایک لڑکا اور ایک لڑکی پیدا ہوئے۔ لڑکا خوبرو، خوش مزاج، ذہین اور کامیاب طالب علم تھا۔ کم سنی ہی میں بیرسٹر ہو کر انگلستان سے آیا اور عین شباب میں نہایت ہی حسرت ناک طریقے پر اس کی موت واقع ہو گئی۔ اس غم کو مسٹر سید مہدی امام زندگی بھر نہ بھلا سکے۔ ماں پر بھی جوان بیٹے کی موت کا بے حد اثر پڑا جو اب تک باقی ہے۔ راقم کو کبھی اس بات کی ہمت نہ پڑی کہ مسٹر مہدی امام سے ان کے جوان لڑکے کی موت پر ان کے سامنے اپنے صدمے کا اظہار کر سکے۔ ایک عرصہ دراز کے بعد مسٹر مہدی امام جب خود اپنے لڑکے کے بارے میں مجھ سے کچھ حسرت بھری گفتگو کرنے لگے تو میں نے ان سے کہا کہ اگر امام مظلوم اپنے ننھے بچے کی موت کو جو ان کی گود میں واقع ہوئی تھی برداشت کر سکتے تھے تو آپ بھی اس عظیم سانحہ کو راضی بہ رضا ہو کر برداشت کیجیے۔ میری اس بات کو سن کر مسٹر مہدی امام دیر تک خاموش ہو گئے۔ ایک بار اور صاحب موصوف پر اسی طرح کی مراقبے کی کیفیت طاری ہوتے ہوئے راقم نے دیکھا تھا، جب میں نے انھیں غالب کا یہ شعر:

بیگانگیِ خلق سے بے دل نہ ہو غالبؔ ٭ کوئی نہیں تیرا، تو مری جان، خدا ہے

پڑھ کر سنایا تھا۔ موصوف نے مجھ سے اس شعر کا انگریزی میں ترجمہ کرایا اور فرمایا کہ میں غالب کے ان خیالات کو مدنظر رکھتے ہوئے انگریزی میں ایک نظم لکھوں گا۔ معلوم نہیں موصوف یہ انگریزی نظم لکھ سکے یا نہیں۔ مجھے اس بات کا بے حد افسوس ہے کہ موصوف کے نگارشات اور منظومات کے بہت سے مسودے ضائع ہوگئے۔ موصوف نے تیسویں پارے کی بہت سی سورتوں کا ترجمہ انگریزی نظم میں کیا تھا اور راقم کو اپنے مخصوص انداز میں وقتاً فوقتاً سنایا تھا۔ آپ کو یہ خلش تھی کہ انگریزی ترجمہ قرآن کی عربی عبارت کے عین مطابق ہو اس لیے اپنے مسودے کو ڈاکٹر سید صدرالدین کو جو پٹنہ کالج میں عربی کے پروفیسر تھے نظر ثانی کے لیے دیا۔ انھیں نہایت تاکید کی کہ ترجمہ بالکل نص قرآنی کے مطابق ہو۔ ڈاکٹر سید صدرالدین صاحب نے اس مسودے کو اپنے پاس رکھ چھوڑا اور کچھ دنوں بعد قضا کر گئے۔ اس طرح ایک قیمتی سرمایہ ضائع ہوگیا۔

ہدی امام صاحب نے ۱۹۶۵ء میں حج کیا اور زیارت مدینہ منورہ سے مشرف ہوئے۔ ہندوستان واپس آنے پر انگریزی میں ایک کتاب "فلائٹ ٹو مکہ" (مکہ کی پرواز) لکھی۔ یہ تصنیف آپ کے مذہبی جذبات کی بہترین ترجمانی کرتی ہے۔ اللہ اور رسول کی محبت آپ کے ہر بیان سے عیاں تھی۔ موصوف نے اس کتاب کے کچھ حصوں کو راقم کو سنایا تھا۔ یہ بات آج تک میری سمجھ میں نہیں آئی کہ کس طور سے اس نایاب کتاب کا مسودہ غائب ہوگیا۔ ان کی اہلیہ بھی اس کے متعلق کچھ نہ بتا سکیں۔

عرصہ دراز تک بہت کم لوگوں کو یہ معلوم تھا کہ ہدی امام زبان و ادب سے گہرے طور پر دلچسپی رکھتے تھے اور انھیں انگریزی شعر و سخن کا ذوق بھی تھا۔ ۱۹۲۷ء میں انھوں نے اپنا شعری مجموعہ شائع کرایا جس میں شاعری بھی تھی اور فلسفہ بھی۔ اس انگریزی مجموعہ کلام کا نام "POETRY OF - THE INVISIBLE" - (ان دیکھے کی شاعری) رکھا۔ ان کی نظموں میں صوفیانہ عناصر موجود ہیں اور زبان ایسی دل کش ہے کہ کتاب کو بار بار پڑھنے کو جی چاہتا ہے۔ اس کتاب کا کچھ حصہ موصوف نے اپنے قیام کشمیر کے دوران لکھا تھا۔ بابو ہری ہر پرشاد سنگھ موصوف کے منشی تھے اور کشمیر کے اس سفر میں موصوف کے ساتھ تھے۔ ان کا بیان ہے کہ اکثر رات رات بھر جاگ کر آپ نے اس کتاب کو لکھا جس پر مجھے بے حد حیرت ہوتی تھی کہ اتنی محنت ان سے کیوں کر ہو پاتی ہے ہری ہر بابو میرے ملنے والوں میں تھے۔ عرصہ ہوا انگلستان چلے گئے اور معلوم نہیں اب وہ بقید

حیات میں یا نہیں۔ مسٹر مہدی امام کی دوسری کتاب "SCENES FROM INDIAN - MYTHOLOGY" (ہندوستانی اساطیر کے مناظر) انگریزی زبان میں شائع ہوئی جس سے ان کے گہرے علم کا اندازہ ہوتا ہے۔ تمام لوگوں کو یہ حیرت تھی کہ ایسا شخص جو بچپن ہی سے ہندستان کی طرز زندگی سے الگ رہا تھا ایسی کتاب کیوں کر لکھ سکا۔ دنیا کے بہت سے خطوں میں جب دوسری جنگ عظیم اپنے دہانے سے آگ اگل رہی تھی تو ان کی تیسری کتاب "شہزادہ ارجن کا ڈرامہ" انگریزی زبان میں شائع ہوئی۔ اس کتاب میں موصوف نے بھگوت گیتا کے فلسفے کے علمی پہلوؤں کو نہایت خوبی سے اجاگر کیا ہے۔ اس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ وہ اس کتاب کے فلسفے سے پورے طور سے واقف تھے۔ مسٹر مہدی امام کی جوانی کا زمانہ ایسا تھا جب کہ سارے خوش گوار رجحانات نمایاں طور پر کارفرما تھے۔ علم، مذہب، قومیت اور وطن دوستی کے جذبات نمو پذیر تھے اور پورے ملک پر اثر انداز ہو رہے تھے۔ ان نئی کیفیتوں کا اندازہ ساری دنیا کو ہو رہا تھا۔ مہدی امام کی شخصیت ہمیشہ ترقی پذیر ہوتی رہی۔ وہ ایک عالم تھے اور وطن دوست بھی ۱۹۵۷ء میں جب انھوں نے پٹنہ ہائی کورٹ میں پریکٹس چھوڑ دی تو ان کی شخصیت کا شگفتہ ترین پہلو نمودار ہوا۔ آپ شری اربندو آشرم میں قیام پذیر ہوئے زندگی کی صداقتوں کی تلاش کا جذبہ جو اب تک ان کی شخصیت میں پوشیدہ تھا نمایاں و متحرک ہو گیا اور جب تک وہاں رہے دنیا کے ہنگاموں سے بالکل غیر متعلق رہے۔

مہدی امام شکسپیئر کے ڈراموں سے بھی گہرے طور پر متاثر تھے۔ اس شاعر عظیم کے وطن "اسٹراٹ فورڈ آن ایون" کی بھی زیارت کی تھی اور یہی وہ جگہ تھی جہاں سے انھوں نے اپنا اہم ترین ادبی سفر شروع کیا جو "ساوتری" کے سلسلے کے نام سے مشہور ہے۔ اس کے پانچ مجموعے ہو گئے، جس کا ایک حصہ ۱۹۸۰ء میں شائع ہوا۔ اس میں مہدی امام نے فلسفہ و ادب کی بلندیوں کو چھو لیا ہے اور اس میں خیالات کی گہرائی بھی موجود ہے کیونکہ یہ "ساوتری" صرف اساطیری ساوتری نہیں بلکہ اربندو کا رزمیہ ہے۔ یہ یزدانی روشنی ہے اور ایک فلسفہ بھی جس کے معنی یہ ہیں کہ الوہی روشنی کو اپنے آپ میں داخل ہونے دو اور اپنے کو بدل دینے دو۔ بہر حال مہدی امام کا اخلاقی نقطہ سطحی نہیں، ایقان کا اظہار ہے، یہ ایک طرز حیات ہے جو آنے والی نسلوں کے لیے ایک حقیقت بن کر ہمیشہ تابان رہے گی۔

اپنی زندگی کے آخری ایام میں مہدی امام نے دنیا کے بہت سے ملکوں کا سفر کیا تھا اور وہ جہاں بھی گئے شاعری اور ہندوستانی کلچر پر تقریریں کیں۔ اس آخری دور میں وہ اپنے آپ میں سمٹ کر رہ گئے تھے اور ان کی داخلی دنیا صرف مذہب و ادب کی دنیا رہ گئی تھی، جس میں انھوں نے پناہ لے لی تھی اور ان کے اردگرد کتابوں کا ایک انبار لگا رہتا تھا اور یہی کتابیں ان کی مونس و غم خوار تھیں۔ وہ ایک ایسے دانش ور تھے جسے سماج پورے طور پر نہ سمجھ سکا یا جو عام لوگوں کی شناخت سے بہت بلند تھا۔

ان کی زندگی کے آخری لمحے بیماری اور پریشانی میں گذرے ان کے وفادار ملازم فقیر محمد نے مرتے دم تک ان کا ساتھ دیا۔ جب موصوف کی بیماری انتہا کو پہنچ گئی تو انھیں پٹنہ اسپتال میں داخل کرایا گیا جہاں ۱۹ مارچ ۱۹۸۷ء میں انتقال کیا۔ اور اپنے مکان "نشیمن" کے احاطے میں مدفون ہوئے۔

ان کی بہت ساری تصنیفات غیر مطبوعہ ہیں، بہت سی کتابوں کی شرحیں موجود ہیں۔ ان کا مضمون "گیتا اور وید کے رموز" لائق توجہ ہے اور درخور مطالعہ ہے۔ یہ موخرالذکر کتاب ان کے ذاتی کتب خانہ میں موجود ہے۔ اس کے علاوہ اور بھی بہت سی کتابیں ہیں جو مختلف موضوعات سے تعلق رکھتی ہیں اور موصوف کی ادبی ذوق کا عمدہ نمونہ اور آپ کی بہترین یادگار ہیں۔ راقم جب کبھی نشیمن کے سامنے سے گذرتا ہے تو بھائی مہدی امام کی یاد ان کی تمام خوبیوں کے ساتھ میرے دل میں تازہ ہو جاتی ہے اور میں "سلام علیک" کہتا ہوا گذر جاتا ہوں۔

۱۴۔ ڈاکٹر سچدانند سنہا
(بیرسٹر، دانش ور، صحافی اور سیاست داں)

ڈاکٹر سچدانند سنہا کی پیدائش آرہ میں ۱۰ر نومبر ۱۸۷۱ء کو ہوئی موصوف نے اپنی تعلیم آرہ ضلع اسکول میں ۱۸۷۷ء سے ۱۸۸۸ء تک پائی۔ ۱۸۸۸ء میں ٹی کے گھوش اکیڈمی

پٹنہ سے انٹرنس کا امتحان پاس کیا۔ انٹرنس پاس کرنے کے بعد جولائی ۱۸۸۸ء میں اپنا داخلہ پٹنہ کالج میں لیا اور ستمبر ۱۸۸۹ء میں سٹی کالج کلکتہ میں پڑھنے کے لیے گئے۔ اسی سال ۲۶ دسمبر کو قانون کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے لندن گئے اور اپریل ۱۸۹۰ء میں مڈل ٹمپل لندن میں قانون کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے داخلہ لیا۔ تین سال بعد ۲۶ جنوری ۱۸۹۳ء کو مڈل ٹمپل سے بیرسٹر ہوئے۔ اپریل ۱۸۹۳ء میں کلکتہ ہائی کورٹ کے ایڈوکیٹ ہوئے اور نومبر ۱۸۹۶ء میں الہ آباد ہائی کورٹ کے ایڈوکیٹ بنے۔ مارچ ۱۹۱۶ء میں جب پٹنہ ہائی کورٹ قائم ہوا تو اس عدالت عالیہ کے بھی ایڈوکیٹ ہوئے۔ گرچہ موصوف کا تعلق پیشہ بیرسٹری سے تھا مگر اپنا زیادہ تر وقت سیاست، صحافت اور علمی مشاغل میں صرف کیا کرتے تھے۔ بے شمار سیاسی جلسوں کی صدارت کی۔ اپریل ۱۹۰۹ء میں بہار پروونشیل کانفرنس کی صدارت کی جو بھاگل پور میں منعقد ہوئی تھی۔ اپریل ۱۹۱۳ میں آگرہ اودھ پروونشیل کانفرنس جو کان پور میں ہوئی تھی اس کے صدر ہوئے۔ موصوف ہندو قوم اور کائستھ ذات کے ایک نہایت وفادار فرد تھے۔ آپ نے بہت سے ہندوؤں اور کائستھوں کے جلسوں کی صدارت کی۔ بہار پروونشیل ہندو کانفرنس جو ۱۹۲۷ء میں پٹنہ میں ہوئی تھی موصوف اس کے مجلس استقبالیہ کے چیئرمین تھے اور آل انڈیا کائستھا کانفرنس کا ۳۵ واں اجلاس جو مارچ ۱۹۲۹ء میں دہلی میں ہوا تھا موصوف نے اس جلسہ کی صدارت کی تھی۔ "کائستھا سماچار" جولائی ۱۹۰۰ء میں آپ کے زیر ادارت شائع ہونا شروع ہوا جس نے کائستھ برادری کو بہت سارا فائدہ پہنچایا۔ موصوف نے مرتے دم تک ہندوؤں اور کائستھوں کی بڑی خدمت کی۔ ہندو قوم اور کائستھ برادری موصوف کے احسانات کو کبھی فراموش نہیں کرے گی۔

استاد الفت رائے پٹنہ کے ممتاز طبلہ نواز نے راقم سے کئی بار یہ کہا تھا کہ ڈاکٹر سچدانند سنہا جوانی کے ایام میں موسیقی کے بڑے شوقین تھے۔ غالباً ان کے اس شوق کو مدنظر رکھتے ہوئے آل انڈیا میوزک کانفرنس جو الہ آباد میں ۱۹۳۴ء میں منعقد ہوئی اس کا صدر انھیں منتخب کیا گیا۔ موصوف کے خطبہ صدارت کو حاضرین نے بہت پسند کیا۔ اس جلسے میں ہندوستان کے بہت سے مشہور استادان موسیقی موجود تھے۔ ان لوگوں نے بھی اس فن کے لیے موصوف کی خدمات کا اعتراف کیا۔ جب موصوف پٹنہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے تو یونیورسٹی کی جوبلی بہت ہی شان و شوکت سے منائی گئی۔ موصوف کے اصرار پر موسیقی

کی ایک نشست بھی ہوئی جس میں ہندوستان کے چند نامور موسیقار شریک ہوئے اور موصوف نے اس جلسے کی صدارت کی۔ گرچہ داخلہ بذریعہ ٹکٹ تھا پھر بھی پنڈال لوگوں سے بھرا ہوا تھا اور تمام لوگ خصوصاً شری رائے برج راج کرشن اور خان بہادر محمد اسماعیل رئیسان پٹنہ سیٹی ڈاکٹر سچدانند سنہا کے شکرگزار تھے کہ انھوں نے پٹنہ کے لوگوں کے لیے ایسا نادر موقع فراہم کیا۔ راقم بہ حیثیت ممبر سینیٹ پٹنہ یونیورسٹی اس تقریب میں شریک تھا۔

ڈاکٹر سچدانند سنہا جوانی سے لے کر آخر دم تک ہندوستان کے مختلف قانون ساز اسمبلیوں کے ممبر رہے۔ موصوف امپیریل قانون ساز کانسل کے دو مرتبہ ۱۹۱۰ء اور ۱۹۱۹ء میں ممبر ہوئے۔ ۱۹۲۰ء میں ہندوستان کی قانون ساز اسمبلی کے ممبر ہوئے اور ۱۹۲۱ء میں اس کے پہلے نائب صدر ہوئے۔ ۱۹۳۰ء سے ۱۹۳۶ء تک بہار و اڑیسہ قانون ساز کانسل کے ممبر تھے اور حزب مخالف کے لیڈر بھی رہے۔ ۱۹۳۷ء اور ۱۹۴۴ء میں بہار کے قانون ساز اسمبلی کے ممبر ہوئے۔ ۱۹۴۶ء میں اسی اسمبلی کی طرف سے ہندوستان کی دستور ساز اسمبلی کے ممبر منتخب ہوئے اور ۹ دسمبر ۱۹۴۶ء کو دہلی میں جب اس دستور ساز اسمبلی کا جلسہ ہوا تو موصوف کا بہ حیثیت عارضی صدر انتخاب ہوا، اور آپ کے لیے یہ ایک بہت بڑا اعزاز تھا جس پر انھیں بڑا فخر تھا۔

ڈاکٹر سچدانند سنہا ۱۹۲۱ء سے ۱۹۲۶ء تک بہار و اڑیسہ گورنمنٹ میں گورنر کے اکزیکیٹو کانسلر رہے۔ آپ کے سپرد خزانہ اور قانون کے محکمے تھے۔ موصوف اپنے سیاسی خیالات میں کانگریسی تھے اس لیے گورنر اور ان میں اکثر اختلاف ہو جایا کرتا تھا۔ اس زمانے کے قانون کے مطابق گورنر کو اختیار تھا کہ وہ اکزیکیٹو کانسل کے ممبر کی رائے کو قبول کرے یا رد کر دے۔ کئی مرتبہ گورنر نے موصوف کی رائے سے اتفاق نہ کیا۔ آپ آزاد خیال آدمی تھے اور اپنے کل کاموں میں اپنے قومی نقطہ کو پیش کیا کرتے تھے۔ شاید ان ہی اختلافات کی بنا پر جب موصوف اپنے عہدے سے سبکدوش ہوئے تو انھیں "سر" کے خطاب سے نوازا نہ گیا۔ موصوف کی تمام باتیں نہایت پرلطف ہوا کرتی تھیں۔ آپ نے راقم سے ایک مرتبہ اڑیسہ کے ایک راجہ کا قصہ نہایت ہی دلچسپ انداز میں بیان کیا۔ اڑیسہ میں بہت سی چھوٹی چھوٹی ریاستیں تھیں۔ موصوف جب اکزیکیٹو کانسل کے ممبر تھے تو ایک مرتبہ اپنے سرکاری دورے میں انھیں اڑیسہ کی ایک نہایت چھوٹی سی ریاست میں جانے کا اتفاق ہوا۔ جب موصوف موٹر کار سے راجہ

کے علاقے میں داخل ہونے لگے تو راجہ کے دیوان نے آپ کی موٹر کار کو روکا اور کہا کہ جب تک حضور عالی کو بندوق کی ۲۵ سلامی نہ دی جائے آپ کا آگے تشریف لے جانا ہماری ریاست کے قاعدوں کے مطابق نہ ہوگا۔ موصوف کی دیوان سے یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ دو بندوقچیوں نے موٹر کار کے آگے کھڑے ہو کر اپنی بندوقوں سے بطور سلامی پچیس فائر داغ دیئے اور پھر موٹر کار آگے بڑھی۔ راجہ صاحب جو اپنے محل کے سامنے موصوف کے استقبال کے لیے کھڑے تھے نہایت ہی مودبانہ انداز سے موصوف کو اپنے محل کے اندر لے گئے اور اپنی ریاست کی سرحد پر موصوف کے روکے جانے کے لیے معذرت چاہی اور کہا کہ شہنشاہ جارج پنجم نے تمام والیان ریاست کے لیے ان کے حسب مراتب توپ کی سلامی مقرر کی ہے۔ شہنشاہ معظم کی اس مثال کو مدنظر رکھتے ہوئے صوبے کے مختلف اعلیٰ حکام کے لیے میں نے بھی بندوق کی سلامی کا قاعدہ جاری کیا ہے۔ گرچہ اس میں تھوڑی زحمت تو ہو جاتی ہے مگر تمام اعلیٰ حکام نے میرے اس طریقہ کو کافی پسند کیا ہے۔ اگر حضور عالی کو کوئی زحمت ہوئی ہو تو میں معافی کا خواستگار ہوں۔ موصوف کی ریاست سے واپسی کے وقت بھی انھیں پچیس بندوقوں کی سلامی دی گئی۔ صاحب موصوف پانچ برسوں تک اکزیکیٹو کانسل کے ممبر رہے اور اس دور میں ہندو قوم اور کائستھ برادری کے لیے جو کچھ ان سے ممکن ہو سکا کیا۔

ڈاکٹر سچدانند سنہا ابتدا ہی سے انڈین نیشنل کانگریس کے نہایت سرگرم کارکن رہے۔ انڈین نیشنل کانگریس کا ستائیسواں اجلاس جو پٹنہ میں دسمبر ۱۹۱۲ء میں منعقد ہوا موصوف اس کے استقبالیہ کمیٹی کے سکریٹری تھے اور عرصہ دراز تک بہار کانگریس کمیٹی کے صدر رہے۔ موصوف نے ۱۹۲۰ء میں جب گاندھی جی کی عدم تعاون اور سول نافرمانی کی تحریک شروع ہوئی تو کانگریس سے علاحدگی اختیار کر لی مگر اندرونی طور سے برابر کانگریسی تحریک کو تقویت پہنچاتے رہے اور وقتاً فوقتاً اپنے مشوروں سے بھی کانگریسی کارکنوں کی ہمت افزائی کرتے رہے۔ پٹنہ میں جو بھی نامور کانگریسی آتا آپ کے یہاں قیام کرتا تھا۔ بابو راجندر پرشاد ان کے خاص معاون تھے اور موصوف کی ہدایات پر اپنا کام انجام دیا کرتے تھے۔ لوگوں کا خیال تھا کہ ان کی کانگریس سے عارضی علیحدگی اس لیے ہوئی کہ انھیں ڈر تھا کہ کہیں انھیں جیل نہ جانا پڑے۔ آپ کے سیاسی گرو پنڈت مدن موہن مالویہ تھے۔ پنڈت موتی لال نہرو اور سر تیج بہادر سپرو کے خیالات سے موصوف بہت متاثر رہتے

تھے۔ گرچہ موصوف کا ظاہری تعلق کانگریس سے کچھ نہ تھا مگر مرتے دم تک اپنے کو بڑے فخر سے سب سے قدیم ترین کانگریسی کہتے رہے۔

ڈاکٹر سچدانند سنہا ایک ممتاز صحافی، دانش ور اور ماہر تعلیم تھے۔ موصوف نے ایک ماہانہ رسالہ "ہندوستان ریویو" کے نام سے ۱۹۲۱ء میں جاری کیا اور اپنی موت تک اس رسالے کو شائع کرتے رہے۔ ہر ماہ "ہندوستان ریویو" میں مسٹر سچدانند سنہا ایک ایڈیٹوریل لکھا کرتے تھے جس میں موصوف مہینے بھر کے واقعات اور حالات کا ایک دل چسپ جائزہ لیا کرتے اور اس جائزہ کو قارئین نہایت شوق سے پڑھا کرتے تھے کیونکہ یہ بہت ہی اچھی انگریزی زبان میں لکھا ہوتا تھا اور ہمیشہ ظرافت اور مذاق سے پُر ہوا کرتا تھا۔ بہت سے لوگ تو "ہندوستان ریویو" کو صرف اسی جائزے کے پڑھنے کے لیے خریدا کرتے تھے۔ موصوف کے اصرار پر راقم تقریباً پندرہ سال تک اس ماہانہ رسالے میں نئی کتابوں پر اپنا تبصرہ شائع کرتا رہا اور اس کے لیے موصوف راقم کے برابر شکرگزار رہے۔ راقم کا ایک تبصرہ جو "پوئٹری آف ماڈرن ایران" پر تھا اور "ہندوستان ریویو" نومبر۔ جنوری ۱۹۴۵ء کے شمارے میں چھپا تھا بہت پسند کیا گیا۔ اس کتاب کا تعلق لندن کے ایک ممتاز پروفیسر ڈی، منورسکی سے تھا۔ راقم کے مضامین بھی اکثر اس رسالے میں شائع ہوا کرتے تھے۔ ۱۹۰۹ء میں جب پنڈت مدن موہن مالویہ اور مسٹر موتی لال نہرو نے "لیڈر" اخبار کی تشکیل کی تو ڈاکٹر سچدانند سنہا نے مسٹر سی۔ وائی۔ چنتامنی کو نائب ایڈیٹر بنایا۔ مسٹر چنتامنی کی کامیاب صحافت سے "لیڈر" کا شمار ہندوستان کے ممتاز ترین اخباروں میں ہونے لگا۔ موصوف نے ۱۵۔ اگست ۱۹۱۸ء کو "سرچ لائٹ" اخبار کا اجرا پٹنہ میں کرایا۔ ابتدا میں مسٹر سید حسن امام نے اپنی کافی دولت اس اخبار کی ترقی کے لیے صرف کی۔ تقریباً ساٹھ برس تک اس اخبار نے بہار کی بڑی خدمت کی۔ عرصہ دراز تک بابو مرلی منوہر پرشاد اس اخبار کے ایڈیٹر رہے۔ ۱۹۸۰ء سے اس اخبار کا نکلنا بند ہو گیا۔ اس کے کل اثاثے برلا کے قبضے میں چلے گئے ہیں اور اسی کے پریس سے اب "ہندوستان ٹائمس" نکلتا ہے۔

ڈاکٹر سچدانند سنہا کے یہاں روزانہ بے شمار اخبارات اور جریدے آیا کرتے تھے، جنھیں وہ پڑھتے اور ایسی خبریں اور مضامین جن کا تعلق خواص و عوام سے ہوتا تھا لال پنسل سے ان پر نشان لگا دیتے تھے۔ دفتری انھیں تراش کر موٹے کاغذ پر چسپاں کر کے دوسرے روز موصوف کے سامنے پیش کیا کرتا تھا اور یہ تراشے سنہا لائبریری میں روزانہ بھیج دیے جاتے تھے جہاں یہ سب

آج تک محفوظ ہیں۔ یہ پچاس برس کے ذخیرے مختلف مضامین پر ریسرچ کرنے والوں کے لیے نہایت مفید ثابت ہوئے ہیں اور لوگ انھیں بہت شوق سے پڑھتے ہیں۔ راقم نے بھی بہت سے اخبارات کے تراشے جو اس زمانے میں مسلم لیگ اور مسٹر جناح کے متعلق چھپا کرتے تھے۔ موصوف کے حوالہ کیا تھا جو اب تک سنہا لائبریری میں موجود ہیں۔ موصوف کا یہ ایک بڑا کارنامہ تھا۔ ہندستان میں شاید ہی کسی صحافی نے ایسے تراشے جمع کیے ہوں گے۔

ڈاکٹر سچدانند سنہا کا تعلق برابر تعلیمی اور علمی اداروں سے رہا۔ ابتدا میں جب موصوف الہ آباد میں مقیم تھے تو عرصے تک "کائستھ پاٹھ شالہ" کے سکریٹری رہے اور ہمیشہ ہندوستان کی مختلف یونیورسٹیوں سے آپ کا تعلق رہا۔ جب صوبہ بہار میں پٹنہ یونیورسٹی کے قائم کرنے کے لیے بیٹھک کمیٹی کی تشکیل ہوئی تو آپ اس کے ممبر مقرر ہوئے۔ ۱۹۳۶ء میں موصوف ہندوستانی اکیڈیمی الہ آباد کے تیسرے جلسے کے صدر ہوئے۔ آل انڈیا لائبریری کانفرنس کا چوتھا اجلاس جو پٹنہ میں ۱۹۴۰ء میں منعقد ہوا آپ اس کے صدر ہوئے۔ اگست ۱۹۳۶ء میں حکومت بہار نے موصوف کو پٹنہ یونیورسٹی کا وائس چانسلر مقرر کیا اور آپ متواتر ۹ سال تک پٹنہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر رہے اور اپنے فرائض کو نہایت حسن و خوبی کے ساتھ انجام دیا۔ اس دور میں موصوف کے زیر نگرانی پٹنہ یونیورسٹی نے کافی ترقی کی۔ موصوف کی یاد کو قائم رکھنے کے لیے لوگوں نے ان کے نام پر اورنگ آباد میں سچدانند کالج قائم کیا۔ موصوف کے زمانے میں پٹنہ یونیورسٹی کی جوبلی نہایت شان و شوکت سے منائی گئی اور اس موقع پر ہندوستان کی چند نہایت ممتاز شخصیتوں کو ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگریاں دی گئیں۔ آپ ہندوستان کے انٹر یونیورسٹی بورڈ کے صدر بھی رہے ہیں۔ لکھنؤ یونیورسٹی میں ۱۹۳۵ء میں، ناگ پور یونیورسٹی میں ۱۹۳۷ء میں اور انسکل یونیورسٹی میں ۱۹۴۰ء میں موصوف نے کونوکیشن کے موقعوں پر نہایت عالمانہ خطبے دیئے جو بہت مقبول ہوئے۔ ان کی بے شمار قومی اور علمی خدمتوں کو مد نظر رکھتے ہوئے الہ آباد یونیورسٹی نے ۱۹۳۷ء میں، پٹنہ یونیورسٹی نے ۱۹۴۷ء میں اور بنارس ہندو یونیورسٹی نے ۱۹۴۸ء میں موصوف کو ڈی لٹ کی اعزازی ڈگری عطا کی۔

ڈاکٹر سچدانند سنہا کو کتابوں کے جمع کرنے کا شوق اپنے والد بخشی رام یاد سنہا سے ورثہ میں ملا تھا۔ موصوف کے پاس جب بے شمار کتابیں جمع ہو گئیں تو خیال گزرا کہ ایک اچھا کتب خانہ

پٹنہ میں قائم کیا جائے۔ اس وقت آپ کے پاس تقریباً بیس ہزار کتابیں اور دو سو رسالے موجود تھے۔ موصوف نے ایک نہایت شاندار عمارت بنام رادھیکا سنہا انسٹی ٹیوٹ اور سچدانند سنہا لائبریری ڈیڑھ لاکھ روپیے کے خرچ سے تعمیر کرائی۔ جب لائبریری کی عمارت تعمیر ہو گئی تو موصوف نے اپنی تمام کتابوں کو اس کتب خانہ میں فروری ۱۹۲۴ء میں منتقل کر دیا۔ کتب خانہ روز بہ روز ترقی کرتا گیا اور آج کل اس کا شمار ہندوستان کے ممتاز کتب خانوں میں ہوتا ہے۔ حکومت ہند اور حکومت بہار اس کتب خانہ کے کل اخراجات کو برداشت کرتی ہیں۔ ڈاکٹر سچدانند سنہا کو کتابوں کے پڑھنے کا بڑا شوق تھا۔ مختلف موضوعات پر جو نئی کتابیں شائع ہوتیں موصوف ان کا بڑے شوق سے مطالعہ کرتے اور کتاب کے اس حصہ میں جو انھیں دلچسپ معلوم ہوتا سطروں کے نیچے لال پنسل سے نشان لگا دیا کرتے تھے۔ ایسی نشان لگائی ہوئی کتابیں سنہا لائبریری میں ہزاروں کی تعداد میں موجود ہیں۔

ڈاکٹر سچدانند سنہا کی جوانی کے زمانے میں ہندو قوم اور خصوصاً کائستھ برادری مختلف قسم کے رسم و رواج کی پابند تھی۔ صاحب موصوف ان سب رسومات کے نہایت مخالف تھے۔ ان کی جوانی کے زمانے میں ہندوؤں کے یہاں یہ ممانعت تھی کہ کوئی ہندو مرد یا عورت سمندر پار کسی غرض سے کہیں جائے۔ موصوف نے اس رسم کو ۱۸۸۹ء میں توڑا اور سمندر پار ہو کر انگلستان تعلیم کی غرض سے گئے۔ ۱۸۹۳ء میں جب وہ ہندوستان واپس آئے تو کائستھ برادری نے یہ فیصلہ کیا کہ موصوف برادری میں پھر اس شرط پر لیے جا سکتے ہیں اگر وہ چند مذموم رسومات کو انجام دیں۔ صاحب موصوف نے کائستھ برادری کی تمام شرائط کو نامنظور کیا اور وہ صوبہ بہار کے پہلے ہندو تھے جنھوں نے سماج کی پروا کیے بغیر ایک بری رسم کو برابر کے لیے ختم کر دیا۔ اس مذموم رسم کو پرائسچت کہا جاتا تھا۔ اس رسم کے مطابق برادری میں واپس لیے جانے کے لیے اکثر لوگوں کو اچھی کامیابی بھی بھینا پڑتا تھا۔ زمانہ قدیم سے ہندو قوم ذات کی مختلف رسومات کی پابند تھی۔ کائستھ برادری مختلف گوتروں میں بٹی ہوئی تھی اور ایک گوتر کے افراد کی شادی اپنی ہی گوتر میں ہو سکتی تھی۔ ہندو بیواؤں کی شادیاں بالکل ممنوع تھیں۔ ڈاکٹر سچدانند سنہا نے ان دونوں رسومات کو ترک کر کے رادھیکا دیوی سے شادی کی جو دوسرے گوتر کی ایک بیوہ خاتون تھیں۔ اس زمانے میں ایسا کرنا بڑی ہمت کی بات تھی اور ڈاکٹر سنہا نے ایسا کر کے ایک بہترین نمونہ قائم کیا جس کی وجہ سے ہندو سماج

میں اب یہ سب رسم ورواج معدوم ہو چکے ہیں۔ ڈاکٹر سچدانند سنہا کا ہندو قوم پر یہ ایک بہت بڑا احسان ہے اور وہ آج بھی ایک مصلح کی حیثیت سے یاد کیے جاتے ہیں۔

برطانوی حکومت کے ابتدائی دور سے بہار، بنگال پریسیڈنسی کا ایک حصہ تھا۔ ڈاکٹر سچدانند سنہا نے اپنے قیام انگلستان کے دوران یہ محسوس کیا کہ انگریزوں کے علاوہ بہت سے پڑھے لکھے ہندوستانی بھی بہار کے نام سے واقف نہ تھے۔ اس کی خاص وجہ یہ تھی کہ بہار سیاسی، تعلیمی اور اقتصادی لحاظ سے ایک پس ماندہ علاقہ تھا اور اس کی اپنی کوئی سیاسی حیثیت نہ تھی۔ حکومت بنگال اس کی ترقی کی طرف کوئی توجہ نہ دیتی تھی۔ بنگالی ہندو ملازمتوں کے علاوہ بہار میں زندگی کے مختلف شعبوں پر چھائے ہوئے تھے۔ یہ لوگ نہ چاہتے تھے کہ بہار کا ایک الگ صوبہ قائم کیا جائے۔ ڈاکٹر سچدانند سنہا جب ۱۸۹۳ء میں بیرسٹر ہو کر پٹنہ آئے تو انھوں نے بہار کو بنگال سے الگ کرانے کی ایک زوردار مہم شروع کی جس میں سر سید علی امام، مسٹر سید حسن امام، مسٹر مظہر الحق اور دیگر ممتاز بہاری مسلمانوں نے ان کی مدد کی۔ ڈاکٹر سچدانند سنہا کی جدوجہد سے اس تحریک کو کامیاب بنانے کے لیے ۱۸۹۴ء میں پٹنہ سے بابو مہیش نارائن کی ادارت میں ایک اخبار "بہار ٹائمس" کے نام سے شائع ہونا شروع ہوا جس کا نام آگے چل کر ۱۹۰۶ء میں "بہاری" کر دیا گیا۔ اس اخبار کی ہر اشاعت میں بہار کے لوگوں کی پریشانیوں اور حکومت بنگال کی غفلتوں کا حال چھپتا رہا جس سے تحریک کو کافی تقویت حاصل ہوئی۔ بہار میں نہ ہائی کورٹ تھا نہ کوئی یونیورسٹی نہ اچھے تعلیمی ادارے، بہاریوں کو ہر چھوٹے بڑے کام کے لیے کلکتہ جانا پڑتا تھا۔ "بہاری" اخبار نے ان تمام پریشانیوں کو جلد دور کرنے کے لیے ہر ممکن جدوجہد کی مگر حکومت بنگال نے ان شکایتوں کی طرف کوئی توجہ نہ دی۔ اور بہار کے باشندے حسب سابق پریشانیوں میں مبتلا رہے۔

ڈاکٹر سچدانند سنہا نے بہار کو ایک الگ صوبہ بنوانے کے سلسلے میں بڑی جدوجہد کی۔ ۱۹۰۶ء میں موصوف نے "بہاری اسٹوڈنٹس کانفرنس" اور ۱۹۰۸ء میں "بہار پروونشیل کانفرنس" اور "بہار پروونشیل کانگریس کمیٹی" کی ترتیب دی اور ان کے ذریعے عوام کو صوبہ بہار کا ایک الگ صوبہ قائم کرانے کے لیے مستعد کیا۔ کلکتہ کے ان تمام اخبارات نے جو انگریزی اور بنگلہ زبان میں شائع ہوتے تھے اس تحریک کی بڑی شدت سے مخالفت کی۔ موصوف ۱۹۱۰ء میں

"امپریل لیجس لیٹو کانسل" کے ممبر منتخب ہوئے جس کی وجہ سے انھیں اس تحریک کو تقویت پہنچانے میں بہت کچھ مدد ملی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ڈاکٹر سچدانند سنہا نے بہار کو ایک الگ صوبہ بنوانے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی، مگر یہ کام اتنا آسان نہ ہوتا اگر سر سید علی امام حکومت ہند کے لا ممبر نہ ہوتے۔ ۱۹۱۱ء کے دلی دربار میں شہنشاہ جارج پنجم نے بہار واڑیسہ کے ایک صوبہ بنانے کا اعلان کیا اور اسی کے ساتھ تقسیم بنگال جو ۱۹۰۵ء میں ہوئی تھی اس کو ختم کرنے کا اعلان کیا اور بہار واڑیسہ کا صوبہ پہلی اپریل ۱۹۱۲ء کو وجود میں آیا۔ تقسیم بنگالہ کی منسوخی کا اعلان ہندوستانی مسلمانوں کے لیے ایک بڑا سانحہ تھا اور یہ ان واقعات میں سے تھا جس نے مسلمانوں کو خواب غفلت سے جگا دیا۔ راقم سے کئی بار ڈاکٹر سچدانند سنہا نے کہا تھا کہ مسٹر محمد علی کو اس واقعہ کا اتنا غم و غصہ ہوا کہ جب سر سید علی امام دلی دربار سے اپنی رہائش گاہ پر واپس آئے تو مسٹر محمد علی جو اس وقت انھیں کے یہاں مقیم تھے نہایت ہی جذباتی انداز میں سر سید علی امام کا ہاتھ پکڑ لیا اور کہا کہ آپ نے تقسیم بنگالہ کی منسوخی میں مدد کر کے مسلمانوں پر خصوصاً بنگال و بہار کے مسلمانوں پر ایک ایسا ستم ڈھایا ہے جو کبھی بھلایا نہیں جا سکتا۔ کل خدا کو کیا منہ دکھایئے گا۔ تقسیم بنگالہ کی منسوخی کے متعلق سر سید رضا علی اپنی سوانح حیات "اعمال نامہ" میں صفحہ ۲۴۳ پر یوں رقم طراز ہیں :

> "یہ سچ ہے کہ تقسیم بنگالہ کی تجویز مشرقی بنگال کے مسلمانوں کے حق میں مفید تھی اور آخر وقت میں مسلمانوں کی فلاح و بہبود کا تذکرہ برائے نام اپنی تجویز کو تقویت پہنچانے کی غرض سے لارڈ کرزن نے کیا مگر انگریزی گورنمنٹ نے جو پالیسی ابتدا ہر حکومت سے برتی اس نے بنگال کے مسلمانوں کو اس درجہ کمزور کر دیا تھا کہ وہ بیچارے نہ اپنی مدد کر سکے، نہ گورنمنٹ کی۔ تاہم نواب سر سلیم اللہ بہادر نے بڑی ہمت و جرأت سے کام لے کر تقسیم بنگالہ کی حمایت کی اور مشرقی بنگال کے مسلمانوں کی حالت کو بہتر بنانا چاہا۔ ہمارے ملک کی موجودہ صدی کی تاریخ کا یہ عبرت ناک واقعہ ہے کہ چھ سات برس بعد جب تقسیم بنگال کی تجویز منسوخ کی گئی تو اس وقت اس صوبہ کے مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے مسئلہ کو گورنمنٹ نے قطعاً نظر انداز کر دیا۔"

صوبہ بہار و اڑیسہ کے قائم ہو جانے کے بعد سر سید علی امام کو مختلف القاب سے یاد کیا جانے لگا۔ "فخر بہار"، "بابائے جدید بہار" اور "معمار جدید بہار" جیسے شاندار الفاظ موصوف کے لیے استعمال کیے جانے لگے، مگر آپ کی وفات کے فوراً بعد ڈاکٹر سچدانند سنہا کے حامیوں نے ان تمام القاب کو سر علی امام سے چھین کر ڈاکٹر سچدانند سنہا کے حوالے کر دیا۔ ستم بالائے ستم یہ کہ دو بہاری کائستھ پروفیسروں نے "ڈکشنری آف نیشنل بایوگرافی جلد چہارم صفحہ ۲۴۳" میں یہاں تک لکھ دیا کہ ڈاکٹر سچدانند سنہا کی حکمت عملی ہی کی بدولت سر سید علی امام وائسرائے ہند کے ایگزکیوٹو کاؤنسل کے لا ممبر مقرر کیے گئے۔

ڈاکٹر سچدانند سنہا نے انگریزی زبان میں مندرجہ ذیل کتابیں تحریر کی ہیں:

1. The Partition of Bengal or Separation of Bihar (1906)
2. Speeches and Writings of Sahchidanand Sinha (1942)
3. Kashmir : The Playground of Asia (1947)
4. Some Eminent Bihar Contemporaries (1944)
5. Iqbal: The poet and his message (1947)
6. Some eminent Indian Contemporaries. (1976)

ڈاکٹر سچدانند سنہا سے راقم کے خاندانی تعلقات تھے۔ میرے تمام خاندان والوں نے موصوف کو کبھی ڈاکٹر سچدانند سنہا کے نام سے موسوم نہ کیا۔ والد مرحوم انھیں بھیا کہتے تھے اور راقم انھیں سنہا چچا کہا کرتا تھا۔ صاحب موصوف زندگی بھر میرے والد اور مجھ سے نہایت محبت سے پیش آتے رہے اور کبھی بھی ان کے اس رویے میں کوئی فرق نہ آیا۔ موصوف کے والد بخشی رام یاد سنہا ڈمراؤں راج کے وکیل تھے اور اس زمانے میں راقم کے دادا امجد حسین صاحب ضلع شاہ آباد کی کلکٹریٹ میں ریونیو آفیسر اور ناظر اعلیٰ کے عہدے پر مامور تھے۔ بخشی رام یاد سنہا دادا مرحوم کے یہاں ڈمراؤں راج کے معاملات کے سلسلے میں برابر

آیا جایا کرتے تھے۔ ان دونوں حضرات کے درمیان دوستی اور اخوت کا رشتہ قائم ہو گیا تھا جو دونوں بزرگوں کے درمیان زندگی بھر برقرار رہا۔ چچا سنہا بھی اکثر دادا جان کے پاس دعا لینے کی غرض سے آیا کرتے تھے۔ دادا جان سنہا چچا سے بڑی محبت کرتے تھے۔ راقم کے چھوٹے دادا خان بہادر حشمت حسین صاحب سنہا چچا کے عزیز دوستوں میں تھے۔ موصوف کا تعلق خاندان نیورہ سے اس وقت بڑھا جب آپ انگلستان میں سر سید علی امام اور مسٹر سید حسن امام کے ساتھ مڈل ٹمپل میں بیرسٹری پڑھنے لگے۔ دو سال تک مسٹر سید حسن امام اور سنہا چچا ایک ہی کمرے میں مقیم رہے۔ ہندوستان واپس آکر ان تعلقات میں روز بروز اضافہ ہوتا گیا اور صاحب موصوف سر علی امام کے ہر رشتے دار کو اسی رشتے سے پکارنے لگے جو سر علی امام کے ساتھ تھا۔ آپ سر سید علی امام کو بھیا مسٹر حسن امام کو حسنو اور نواب شمس العلماء امداد امام کو ابا کہتے تھے اور نواب امداد امام صاحب کے سوتیلے بھائی خان بہادر فضل امام صاحب کو چچا کہتے تھے۔ اسی طرح چوں کہ راقم کے منجھلے خالو سر عبدالرحیم سر علی امام صاحب کے رشتے میں بہنوئی ہوتے تھے اس لیے انکل سنہا اور سر عبدالرحیم کے درمیان خوب ہنسی مذاق کی باتیں ہوا کرتی تھیں۔ جب سر عبدالرحیم مدراس ہائی کورٹ میں چیف جسٹس تھے تو انکل سنہا کو بحیثیت بیرسٹر ایک مرتبہ ان کے اجلاس میں کام کرنے کا موقع ملا۔ انکل سنہا نے راقم سے کئی بار کہا تھا کہ بحث کی ابتدا سے پہلے میں نے انھیں نہایت ہی شستہ اردو میں گالی گلوج کے چند الفاظ سے نوازا۔ سر عبدالرحیم مسکرا کر رہ گئے کیونکہ وہ اس وقت میری گالیوں کا کوئی جواب نہ دے سکتے تھے۔ چونکہ مدراسی وکیل اور متخاصمین شستہ اردو سمجھ نہ سکتے تھے لہٰذا ان لوگوں کا خیال ہوا کہ انکل سنہا سر عبدالرحیم کی عزت افزائی کے لیے اردو کے چند اچھے الفاظ استعمال کر رہے ہیں۔ انکل سنہا سر عبدالرحیم ہی کے یہاں مقیم تھے، گھر آکر سر عبدالرحیم نے انکل سنہا کو خوب خوب گالیاں سنائیں مگر انکل سنہا نے کہا کہ تم تو مجھے گھر پر گالیاں دے رہے ہو، میں نے تو تمھیں اجلاس پر گالیاں سنائی ہیں، اسے خوب یاد رکھنا۔ چونکہ سر سید علی امام سر سید سلطان احمد کو چچا کہتے تھے اس لیے انکل سنہا بھی ہمیشہ موصوف کو سلطان چچا ہی کہتے رہے۔ ڈاکٹر محمد بخش جو پٹنہ کے ایک ممتاز ڈاکٹر تھے انکل سنہا کے عزیز دوست تھے اور ان کی اہلیہ کا علاج ہمیشہ بڑی تندہی سے کیا کرتے تھے۔ جب انکل سنہا ایگزیکیوٹو کانسل کے ممبر تھے تو بھائی سید قدیر احسن ان کے پرسنل

اسسٹنٹ تھے۔ چونکہ موصوف ڈاکٹر محمد بخش کے داماد تھے اس لیے انکل سنہا مثل اپنے داماد کے ان کی قدر کیا کرتے تھے۔ جب کبھی سرکاری دورے پر دہلی اور بڑے بڑے شہروں میں جایا کرتے تو ان کی دعوتیں ہوا کرتی تھیں آپ ان دعوتوں میں بھائی سید قدیر احسن کو اپنا داماد بتا کر لوگوں سے ان کا تعارف کرایا کرتے تھے۔ ان تمام دعوتوں میں ان کو اپنے ساتھ لے جاتے اور اپنے بغل میں بٹھا کر کھانا کھلایا کرتے تھے۔ راقم سے بھائی قدیر احسن اس بات کو بڑے فخر سے بیان کیا کرتے تھے۔ انکل سنہا والد مرحوم کی بڑی قدر کرتے تھے اور زندگی بھر نہایت محبت سے پیش آتے رہے والد صاحب بھی ان کی بڑی عزت کرتے تھے اور انھیں اپنا بڑا بھائی سمجھتے تھے یہ دونوں بزرگ ایک دوسرے کے خوشی و غم میں برابر شریک رہے۔ مختصر یہ کہ انکل سنہا ہمیشہ اپنے کو نیورہ خاندان کا ایک فرد سمجھتے رہے اور نیورہ والوں نے بھی ان کے اس جذبے کی پوری قدر کی۔

راقم والد مرحوم کے ساتھ پندرہ سال کی عمر میں انکل سنہا سے پٹنہ میں ان کی رہائش گاہ پر ملا۔ موصوف سے راقم کی یہ پہلی ملاقات تھی اور آخری ملاقات انکل سنہا سے ان کی وفات سے پانچ دن پہلے ہوئی۔ اس لمبی مدت میں موصوف کی کرم فرمائیاں راقم پر برابر ہوتی رہیں۔ ۱۹۳۶ء میں جب راقم کا کٹک کالج سے پٹنہ کالج میں تبادلہ ہوا تو اس زمانے میں موصوف پٹنہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے۔ آپ پٹنہ یونیورسٹی کی آفس میں بجز سنڈیکیٹ کی میٹنگ کے کسی اور کام کے لیے نہ آیا کرتے اور یونیورسٹی کے کل کام اپنی رہائش گاہ پر کیا کرتے تھے اگر دن میں میٹنگ ہوتی تو سبھی ممبران کو لنچ دیا جاتا اور اگر سہ پہر کو میٹنگ ہوتی تو شام کی پرتکلف چائے سے خاطر کی جاتی تھی، ہر سال جاڑوں میں اپنی طرف سے گورنر کے اعزاز میں ایک ڈنر دیا کرتے تھے جس میں صرف مخصوص لوگوں کو ہی مدعو کیا جاتا تھا۔ کوئی سال ایسا نہ گزرا کہ راقم ان دعوتوں میں بلایا نہ گیا ہو۔ اس کے علاوہ کوئی ہفتہ ایسا نہ گزرا کہ راقم انکل سنہا کے ساتھ ان کے یہاں رات کا کھانا نہ کھاتا ہو۔ موصوف فطرتاً ایک بڑے مہمان نواز شخص تھے۔ ہندوستان کا شاید ہی کوئی بڑا شخص ہو جو آپ کی مہمان نوازی سے فیض یاب نہ ہوا ہو۔ صاحب موصوف خود روزانہ نہایت پرتکلف کھانا کھاتے اور انھیں ایسا ہی کھانا دوسروں کو بھی کھلانے کا بیحد شوق تھا۔ ان کا باورچی جوگن جو گوا کا رہنے والا تھا کھانا پکانے کے فن سے خوب

واقف تھا۔ ایسے باورچی کم ہی ملتے ہیں۔

انکل سنہا ایک نہایت ہی خوش مذاق اور خوش گفتار انسان تھے۔ کھانے کی میز پر ایسی ایسی دل چسپ باتیں کیا کرتے تھے کہ لوگ کھانے سے زیادہ ان کی باتوں سے لطف اندوز ہوتے تھے۔ ان کا "ٹیبل ٹاک" اکثر عالمانہ بھی ہوا کرتا تھا۔ ایک دفعہ رات کے کھانے کے دوران راقم سے مخاطب ہو کر کہنے لگے کہ اگر تم کسی سے کام نکالنا چاہتے ہو تو اس کے تین ہی طریقے ہیں۔ اول "بھات" دوسرے "بات" اور تیسرے "لات" لیکن پہلا طریقہ نہایت کارگر ہوتا ہے۔ انگریز بھی یہ کہتے ہیں کہ اگر کسی سے کام نکالنا ہو تو "بھات" ہی والے طریقے کو کام میں لاؤ۔ ان کا مقولہ ہے : —— "Enter through his belly"
حاضرین انکل سنہا کی یہ پر مذاق گفتگو سن کر خوب ہنسے اور پھر ایک صاحب کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ آپ کی تمام کامیابیاں "بھات" ہی کی بدولت ہوئیں جس کا ان صاحب نے اقرار بھی کیا ڈاکٹر ہادی حسن جو علی گڑھ یونیورسٹی میں فارسی کے مشہور پروفیسر تھے جب بھی پٹنہ آتے تو انکل سنہا ہی کے یہاں قیام کرتے اور کھانا ختم ہو جانے کے بعد "شکنتلا" کا اپنا انگریزی ترجمہ حاضرین کو اپنے خاص انداز میں سناتے تھے اور سب لوگ دم بخود ہو کر ان کی ایکٹنگ دیکھتے اور خوش ہو کر تالیاں بجاتے تھے۔ انکل سنہا پرانی تہذیب کے ایک اعلیٰ نمونہ تھے۔ آج بھی راقم ان پرانی صحبتوں کو یاد کر کے انکل سنہا کی کمی شدت سے محسوس کرتا ہے۔

۱۹۳۶ء میں جب راقم پٹنہ کالج میں لکچرر ہو کر آیا تو انکل سنہا پٹنہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے۔ انھیں میرے پٹنہ آنے سے بے حد خوشی ہوئی اور مجھے پندرہ روز بعد بہار کے گورنر سے جو پٹنہ یونی ورسٹی کے چانسلر بھی تھے اپنے ساتھ لے جا کر ملایا اور بہت کچھ تعریفیں بھی کیں۔ اس زمانے میں میری انگریزی کتاب "Early Persian poets of India" ہندوستان کے قدیم فارسی شعرا کا تذکرہ الٰہ آباد کے ایک پریس سے چھاپی جا رہی تھی۔ موصوف گرچہ اپنے کاموں میں نہایت مصروف رہتے تھے مگر وقت نکال کر میری پوری کتاب کا فائنل پروف خود سے پڑھا۔ ان کی اس قدردانی کا میں آج تک ممنون ہوں۔ موصوف ایک مرتبہ راقم سے فرمانے لگے کہ جب تم پٹنہ یونیورسٹی کے پہلے پی۔ ایچ۔ ڈی ہوئے تو حکومت بہار نے تمھیں تین سال کے اندر لکچرر سے اسسٹنٹ پروفیسر بنا دیا مگر یونیورسٹی نے تمھیں کوئی اعزاز

بخشا۔ سر خواجہ محمد نور جو اس وقت پٹنہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے ان سے جو چوک ہو گئی ہے میں اب اس کی تلافی کرنا چاہتا ہوں۔ کل دس بجے دن میں مجھ سے ملو میں تمھیں کچھ انعام دوں گا۔ دوسرے روز جب راقم موصوف کی رہائش گاہ پر حاضر ہوا تو دیکھا کہ تقریباً چالیس کتابیں جو اس وقت تک پٹنہ یونیورسٹی سے شائع ہوئی تھیں ان کی میز پر ریشمی فیتوں سے بندھی ہوئی رکھی تھیں جن کی مجموعی قیمت ڈھائی ہزار روپیوں سے اوپر ہوگی۔ موصوف نے فرمایا کہ یونیورسٹی کی طرف سے میں بحیثیت وائس چانسلر یہ کتابیں تمھیں بطور انعام دے رہا ہوں۔ ان کتابوں کی بنڈل میں پہلی کتاب سر جدوناتھ سرکار کی تصنیف مغل حکومت کے بارے میں تھی (The Mughal Administration : Sarkar) - اس پر موصوف نے اپنے ہاتھ سے انگریزی میں حسب ذیل عبارت لکھ کر مجھے دعا کے ساتھ عطا کی :

"To Dr. Syed Iqbal Hussain with my blessings and good wishes to whom (in appreciation of his scholarship) I have had presented a complete set of Patna University publications.

Sachchdidananda Sinha

Vice-Chancellor 6/12/40"

ترجمہ : ڈاکٹر سید اقبال حسین کو ان کی علمیت کی قدر دانی کرتے ہوئے میں اپنی نیک خواہشات اور دعاؤں کے ساتھ پٹنہ یونیورسٹی کی مطبوعات کا پورا سیٹ نذر کرتا ہوں ۔

سچدانند سنہا، وائس چانسلر، ۶/۱۲/۴۰ء

میں نے کچھ دنوں پہلے یہ سب کتابیں بطور عطیہ خدا بخش لائبریری کو دے دیا ہے۔ صرف جدوناتھ سرکار کی تصنیف مغل ایڈمنسٹریشن جس پر انکل سنہا کی تحریر اور دستخط ثبت ہے، ۴۷ سال سے میرے پاس محفوظ ہے۔ نو سال تک انکل سنہا پٹنہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر رہے، اور راقم اس دوران اسسٹنٹ پروفیسر تھا مگر موصوف نے راقم کو ان سب جگہوں پر نامزد کیا

جن پر سینیئر پروفیسروں کی ہی نامزدگی ہوا کرتی تھی۔ بہت سے سینیئر پروفیسروں پر ترجیح دے کر راقم کو پٹنہ یونیورسٹی کے سینیٹ کا ممبر نامزد کرایا۔ پٹنہ یونیورسٹی جرنل کے ایڈیٹوریل بورڈ کا ممبر بنایا اور یونیورسٹی کی کوئی کمیٹی ایسی نہ تھی جس کا راقم ممبر نہ ہو۔ پرنسپل آرمر جو میرے استاد تھے ان سب نامزدگیوں میں انکل سنہا کا ساتھ دیا کرتے تھے۔ ۱۹۴۲ء میں راقم کو پٹنہ یونیورسٹی نے آل انڈیا اورینٹل کانفرنس میں جو اس سال بنارس میں ہوئی تھی، اپنا نمائندہ بنا کر بنارس بھیجا انکل سنہا کو یہ خیال آیا کہ میں بنارس ہندو یونیورسٹی کے مہمان خانے میں آرام سے نہ رہ سکوں گا اس لیے انھوں نے میرے قیام و طعام کا انتظام بنارس کینٹونمنٹ کے سسل ہوٹل میں کرا دیا تھا جہاں میں نہایت آرام سے ایک ہفتہ ٹھہرا۔ مجھے بنارس کینٹونمنٹ سے بنارس ہندو یونیورسٹی لے جانے کے لیے ایک ٹیکسی کا بھی انتظام کرا دیا تھا۔ ان سب اخراجات پر پٹنہ یونیورسٹی میں کسی نے کوئی اعتراض نہ کیا۔ انکل سنہا کو اردو کے ایم۔ اے کا ممتحن ہونے کا بڑا شوق تھا اور ہر سال ایم۔ اے اردو کا وہ پرچہ جس کا تعلق ہندی ادب اور ہندی ادبی تاریخ سے ہوا کرتا تھا، آپ اس کے ممتحن ہوتے اور امیدواروں کو دل کھول کر نمبر دیا کرتے تھے۔

انکل سنہا کو سر محمد اقبال کی وفات کے چند سال بعد یہ خیال گذرا کہ سر محمد اقبال اور ان کی شاعری کے متعلق ایک کتاب تصنیف کریں۔ چونکہ موصوف فارسی زبان سے بہت کم واقف تھے لہٰذا راقم نے انھیں مشورہ دیا کہ فارسی زبان کی واقفیت کے بغیر اقبال پر کچھ لکھنا مناسب نہ ہوگا، مگر انھوں نے میرے مشورے سے اتفاق نہ کیا اور کتاب کا لکھوانا شروع کر دیا جس کی تکمیل تقریباً چار سالوں میں ہوئی۔ موصوف اقبال اور ان کی شاعری کے سلسلے میں ہمیشہ منفی پہلو اختیار کرتے اور ان کے اسلامی خیالات کو ناپسند کیا کرتے تھے۔ انھوں نے اس کتاب کے لکھنے اور ترتیب دینے میں الہ آباد اور پٹنہ کے بہت سے لوگوں سے مدد لی مگر اس سلسلے میں بہت کچھ ذمہ داری راقم پر ہی ڈالی گئی۔ پریس میں جانے سے پہلے صاحب موصوف نے کتاب کا مسودہ لاہور کے پروفیسر ڈبلو سی۔ اسمتھ اور پٹنہ کالج کے پروفیسر کلیم الدین احمد اور پروفیسر فضل الرحمٰن کو دکھلایا۔ ان دونوں آخر الذکر پروفیسروں نے اس کتاب کی درستگی کے سلسلے میں بہت سے مفید مشورے دیئے۔ جب کتاب کا مسودہ پروفیسر کلیم الدین احمد اور پروفیسر فضل الرحمٰن کے مشوروں کے ساتھ مجھے نظر ثانی کے لیے دیا گیا تو میں نے بھی ان کے مشوروں

سے اتفاق کرتے ہوئے کئی ابواب کو کتاب سے نکال دینے کے لیے کہا مگر موصوف سوائے چند معمولی تبدیلی کے کسی ترمیم پر راضی نہ ہوئے اور وہ مسودہ جسے موصوف نے خود تیار کیا تھا، رام نرائن لال کتب فروش الہ آباد کے مطبع نیشنل پریس میں طباعت کے لیے بھیج دیا گیا۔ موصوف نے اپنی کتاب کے دیباچہ صفحہ ۲ پر پروفیسر ڈبلو۔ سی۔ اسمتھ، پروفیسر کلیم الدین احمد، پروفیسر فضل الرحمن اور راقم کا اس تعاون کے لیے شکریہ ادا کیا ہے۔ علاوہ ازیں راقم کا مزید شکریہ اقبال کے اشعار جمع کرنے اور ان کا انگریزی میں ترجمہ کرنے کے سلسلے میں بھی ادا کیا۔ ۱۹۴۷ء میں یہ کتاب پانچ سو بارہ[۱۳] صفحات پر مشتمل "اقبال: شاعر اور ان کا پیغام (Iqbal: The poet & his message) - کے نام سے شائع ہوئی۔ موصوف کی یہ محنت رائیگاں گئی کیونکہ جس شخص نے بھی اس کتاب کو پڑھا اس نے موصوف کی محنت کی داد تو دی مگر کتاب کے مضامین کو ناپسند کیا اور یہ کتاب مقبول نہ ہو سکی۔ جب کتاب کے چند نسخے الہ آباد سے چھپ کر آئے تو موصوف نے مجھے اپنے یہاں بلوا کر کتاب کا ایک نسخہ عطا فرمایا، جس پر انھوں نے اپنے ہاتھ سے یہ عبارت لکھ کر دی:

"To Iqbal - scholar, senator and education-
-alist - with my blessings, love and good
wishes. Sachchidanand Sinha
22/2/47

(اقبال کو جو عالم، سینیٹر، اور معلم ہیں، اپنی دعائیں، محبت اور نیک خواہشات کے ساتھ دیتا ہوں۔

سچدانند سنہا
۲۲/۲/۴۷ء

موصوف زندگی کے ہر شعبے میں قدیم وضع داری کے پابند تھے اور ہر ایک چیز کی دقعت خوب سمجھتے تھے۔ ماہ فروری ۱۹۵۰ء میں جب وہ سخت بیمار تھے اور کمزوری کے سبب دستورِ ہند پر دستخط کرنے کے لیے دلی نہ جا سکتے تھے تو دستورِ ہند کے ہندی، انگریزی مسودے ان کے دستخط کے لیے بحفاظت تمام پٹنہ لائے گئے اور ان کی رہائش گاہ کے ایک کمرے میں سپاہیوں کے پہرے میں رکھے گئے۔ ۱۴ فروری ۱۹۵۰ء کو موصوف نے ان اہم مسودوں پر اپنے دستخط ثبت

کیے جوان مسودوں پر آخری دستخط تھے۔ یہ کمرہ آپ کی خواب گاہ سے کچھ دوری پر تھا مگر موصوف شیروانی، پائجامہ اور ٹوپی پہن کر دستخط کرنے کے لیے خود سے چل کر اس کمرے تک پہنچے جہاں دستورِ ہند کے مسودے رکھے ہوئے تھے اور نہایت ہی احترام کے ساتھ ان مسودوں پر دستخط کیا۔ جب لوگوں نے موصوف سے یہ کہا کہ ان مسودوں پر آخری دستخط آپ ہی کا ہے جو بہار کے لیے فخر کا باعث ہے تو وہ ہنس کر بولے کہ اس کی کوئی اہمیت نہیں ہے کہ دستخط پہلا ہو یا آخری اور یہ بھی کہا کہ آج یہ کس کو یاد ہے کہ امریکا کے دستور پر کس نے پہلا دستخط کیا اور کس نے آخری۔ ہر چیز وقت کے ساتھ گذر جاتی ہے اور لوگ اسے بھول جاتے ہیں۔ میرے لیے یہی بات قابلِ فخر ہے کہ دستورِ ہند کی تیاری میں میرا بھی کچھ حصہ رہا۔ اس تقریب کے بعد موصوف خود سے چل کر اپنی خواب گاہ تک آئے اور پلنگ پر لیٹ گئے اور تقریباً ایک گھنٹہ تک خاموش پڑے رہے۔ وہ اس وقت مسلسل بیماری کی وجہ سے نہایت کمزور ہو گئے تھے۔ یہ تقریب موصوف کے انتقال سے صرف تین ہفتہ پہلے ہوئی تھی۔

ڈاکٹر سچدانند سنہا کی شادی رادھیکا دیوی سے ہوئی تھی جو لاہور کے بیرسٹر مسٹر شیو ارام کی اکلوتی بیٹی تھیں۔ موصوفہ کا انتقال ۳۰ر جولائی ۱۹۱۹ء کو ہوا۔ موصوفہ نے بابو بھونیشور پرشاد کے دوسرے لڑکے رادھا کرشن سنہا کو گود لیا تھا اور دونوں میاں بیوی کو اس لڑکے سے بڑی محبت تھی۔ رادھیکا دیوی کے انتقال کے بعد ڈاکٹر سچدانند سنہا نے مسٹر رادھا کرشن سنہا کو بہت اچھی تعلیم دی اور مرتے دم تک ان سے بے حد محبت کرتے رہے۔ افسوس کی بات ہے کہ مسٹر رادھا کرشن سنہا نے ۱۹۶۹ء میں اکیاون برس کی عمر میں قضا کیا۔ موصوف راقم کو اپنے بڑے بھائی کی طرح سمجھتے تھے۔ آپ کچھ دنوں تک پٹنہ یونیورسٹی کے خازن بھی رہے۔ ڈاکٹر سچدانند سنہا نے سنہا لائبریری کے متصل اپنی رہائش کے لیے ایک وسیع اور خوب صورت مکان تعمیر کرایا جس میں وہ تقریباً ۲۵ سالوں تک نہایت آرام و آسائش سے رہے۔ ان کی وفات کے بعد یہ خوب صورت مکان فروخت ہو گیا اور اب اس میں اسکول اکزامینیشن بورڈ کا دفتر ہے۔ راقم جب بھی ادھر سے گزرتا ہے تو قدیم باتیں اور پرانی یادیں تازہ ہو جاتی ہیں اور مجھے غمگین بناتی ہیں۔

انکل سنہا ایک نہایت ہی خوش خلق اور زندہ دل انسان تھے۔ ظرافت، خوش طبعی،

بلند کرداری اور سخاوت کے لیے مشہور تھے، ان کی باتوں میں ایسی کشش تھی کہ جو بھی ان سے ملتا ان کا گرویدہ ہو جاتا۔ موصوف کی شان و تمکنت ایسی تھی کہ بڑے سے بڑے سرکاری عہدیداران کو بھی ان سے بحث کرتے ہوئے تامل ہوتا تھا۔ آپ کی اقرباپروری کا یہ حال تھا کہ اپنی برادری کے بے شمار لوگوں کی مالی امداد کیا کرتے تھے۔ راقم کو اس بات کا ذاتی تجربہ ہے کیونکہ راقم خود ایک ممتاز کائستھ وکیل کو جو اپنی بیماری کی وجہ سے مجبور ہو گئے تھے تقریباً ایک سال تک ہر ماہ ایک اچھی رقم کا چیک انکل سنہا کے حکم سے وکیل صاحب کے اخراجات کے لیے ان کے گھر پہنچایا کرتا تھا۔ راقم سے انکل سنہا کی سیاسی بحثیں خوب ہوا کرتی تھیں۔ موصوف اکھنڈ بھارت کے طرف دار تھے اور تقسیم ہند کے سخت مخالف۔ راقم بھی تقسیم ہند کا مخالف تھا مگر میں مسلمانوں کو غیر منقسم ہندوستان میں چند ضروری مراعات دیئے جانے کا حامی تھا۔ موصوف کا خیال تھا کہ ہندو قوم جو آٹھ سو سال تک مسلمانوں کی محکوم رہ چکی ہے اب وہ جذبہ انتقام کے تحت مسلمانوں کو کسی طرح کی رعایت دیئے جانے کے لیے تیار نہیں ہو سکتی۔ انکل سنہا نے نہایت تیقن کے ساتھ راقم سے یہ بھی کہا کہ اگر ہندوستان تقسیم ہو گیا تو ہندوستانی مسلمان کی زبوں حالی کی کوئی انتہا نہ ہو گی، یہاں تک کہ ہندوستانی مسلمان لکڑی کاٹنے والا اور پانی بھرنے والا بن کر رہ جائے گا۔ راقم ان کی اس بے لاگ گفتگو کو سن کر سوچ میں پڑ جاتا تھا کہ منقسم ہندوستان میں مسلمانوں کے ساتھ آیندہ کیا پیش آنے والا ہے۔ انکل سنہا کی اچھی خاصی جائداد لاہور میں تھی، تقسیم ہند کے بعد یہ تمام جائداد حکومت پاکستان کے قبضے میں آگئیں اور انھیں اس جائداد کے عوض پاکستان سے کچھ معقول معاوضہ بھی نہ ملا۔ انھیں اس بات کا سخت رنج تھا مگر اپنے رنج کو کبھی کسی کے سامنے ظاہر نہ کیا اور اپنے مسلمان دوستوں سے ملنے جلنے میں کوئی فرق نہ آنے دیا۔

ڈاکٹر سچدانند سنہا نے نومبر ۱۹۴۹ء میں اپنی زندگی کے ۷۹ سال پورے کیے، اگرچہ موصوف اس وقت کافی کمزور ہو چکے تھے مگر اپنے تمام کاموں کو باقاعدگی کے ساتھ انجام دیتے رہے۔ اپنی موت سے پانچ دن پہلے ۲ مارچ ۱۹۵۰ء کو صاحب موصوف نے ڈاکٹر راجندر پرشاد سے اپنی اور اپنی اہلیہ کی تصویروں کی نقاب کشائی کرائی۔ اسی روز اپنے خاندان کے افراد اور گورنر بہار کے ساتھ ایک گروپ فوٹو بھی کھنچوائی جو ان کی آخری تصویر تھی۔

۷ مارچ ۱۹۵۰ء کو صاحب موصوف نے پٹنہ میں اپنی رہائش گاہ پر ۴ ۱/۲ بجے صبح میں انتقال کیا اور گنگا کے کنارے بانس گھاٹ پر ان کا جسد خاکی نذر آتش کیا گیا۔ گورنر اور حکومت بہار کے

بڑے بڑے عہدے داران کے علاوہ بہار کے بے شمار عوام الناس بھی ان کی آخری رسومات میں شریک رہے۔ بہار کی تاریخ میں یہ پہلا موقع تھا کہ کسی غیر سرکاری فرد کی آخری رسومات کو سرکاری اعزاز کے ساتھ انجام دیا گیا ہو اور اس دن بیجس لیٹو اسمبلی کی عمارت پر سرکاری پرچم سرنگوں کر دیا گیا۔ تقریباً چالیس سالوں کے دوران راقم نے انکل سنہا سے بہت کچھ سیکھا جن پر عمل کر کے مَیں نے اپنی زندگی میں کامیابیاں حاصل کیں وہ میرے لیے ایک نمونہ تھے اور کوئی ہفتہ خالی نہ جاتا تھا کہ جس میں موصوف سے علمی، ادبی اور سیاسی مسائل پر میری تفصیلی گفتگو نہ ہوتی ہو۔ موصوف پنڈت جواہر لال نہرو سے لے کر بے شمار لوگوں کے لیے زندگی بھر انکل سنہا رہے اور ان کی موت پر ان لوگوں نے آنسو بہائے۔ ان کی موت نے میرے لیے ایک ایسا خلاء پیدا کر دیا جو کبھی پُر نہ ہو سکا۔ ان کی موت کے ساتھ ایک مشترکہ ہندوستانی تہذیبی دور کا خاتمہ ہو گیا۔ کسی انگریز نے کیا خوب کہا ہے :

" To live
In the memory
of those who knew you
Is not to die "

—— ※ ——

بائیسواں باب

نیورہ خاندان کے ہائی کورٹ کے چھ جج

(پہلے جج)

مسٹر جسٹس سید شرف الدین

نیورہ گاؤں کے حالات، مشاہیر نیورہ کے مختلف دور اور باشندگان نیورہ کی خدمات کا تذکرہ راقم نے اس کتاب کے پہلے حصّہ کے ساتویں باب میں تفصیل کے ساتھ کیا ہے۔ پچاس سال کے دوران اس گاؤں کے چھ قانون داں حضرات کو کلکتہ اور پٹنہ ہائی کورٹ میں جج ہونے کا شرف حاصل ہوا ہے۔ ہندوستان کے کسی گاؤں سے شاید ہی اتنے جج ہوئے ہیں۔

نیورہ خاندان کے پہلے شخص جنھیں ہائی کورٹ کے جج ہونے کا فخر حاصل ہوا مسٹر سید شرف الدین بیرسٹر تھے۔ سید فرزند علی جو چھپرہ میں وکالت کرتے تھے ان کے تین لڑکے تھے۔ ایک لڑکے خان بہادر سید نصیر الدین سی آئی ای ریاست بھوپال میں وزیر مالیات تھے اور مسٹر سید شرف الدین صاحب سید فرزند علی صاحب کے چھوٹے لڑکے تھے۔

مسٹر شرف الدین کی تعلیم دس سال کی عمر میں شروع ہوئی اور ابتدائی تعلیم گھر پر پائی۔ اس کے بعد اپنا داخلہ پٹنہ کالجیٹ اسکول میں لیا اور وہاں سے انٹرنس پاس کر کے کلکتہ چلے گئے جہاں سینٹ زیویرس کالج میں دو سال تک تعلیم حاصل کی۔ موصوف دو سال بعد بیرسٹری کی تعلیم کے لیے انگلستان چلے گئے اور ۱۸۸۰ء میں مڈل ٹمپل سے بیرسٹر ہوئے۔ انگلستان سے واپس آکر پٹنہ میں بیرسٹری کرنے لگے اور اپنے پیشہ میں بڑی شہرت اور کامیابی حاصل کی۔ کچھ دنوں

بعد موصوف نے اپنی رہائش کے لیے ایک شاندار مکان تعمیر کیا جو "جوبلی ہاؤس" کے نام سے مشہور تھا۔
یہ مکان خدابخش لائبریری کے متصل تھا اور اس کا احاطہ کافی وسیع تھا۔ ان کی وفات کے بعد حکومت
بہار نے اس مکان کو سرکاری کاموں کے لیے خرید لیا۔ اسی عمارت میں پٹنہ لاکالج بہت دنوں تک قائم
رہا۔ آج کل اس کے ایک حصہ میں گورنمنٹ اردو لائبریری ہے اور "اردو بھون" کی عمارت کچھ دنوں
پہلے اس کے احاطہ میں تعمیر کی گئی ہے۔ موصوف گرچہ ایک نہایت ہی مشغول بیرسٹر تھے مگر وقت نکال
کر شہری زندگی میں برابر حصہ لیتے رہے۔ نو سال تک مسلسل پٹنہ میونسپلٹی کے میونسپل کمشنر رہے
اور عرصہ تک پٹنہ ڈسٹرکٹ بورڈ کے وائس چیئرمین بھی تھے۔ ابتدائی دور میں موصوف نے
انڈین نیشنل کانگریس کے کاموں میں خوب دلچسپی لی اور مالی مدد بھی کیا کرتے تھے۔ ہائی کورٹ
جج ہونے کے بعد بھی صاحب موصوف چند بار بحیثیت مہمان کانگریس کے مختلف اجلاس میں شریک
ہوتے رہے مگر ہائی کورٹ کے جج مقرر ہو جانے کے فوراً بعد کانگریس سے علیحدہ ہو گئے۔

حکومت برطانیہ نے مسٹر شرف الدین کو کلکتہ ہائی کورٹ کا جج مقرر کیا اور صاحب موصوف
دوسری جنوری ۱۹۰۷ء سے ججی کی خدمات کو انجام دینے لگے۔ یہ پہلا موقع تھا کہ بہار کا کوئی باشندہ
کلکتہ ہائی کورٹ کا جج مقرر کیا گیا ہو اور موصوف سے پہلے کوئی بیرسٹر جو اضلاع میں بیرسٹری کیا
کرتا تھا ہائی کورٹ کا جج مقرر نہیں کیا گیا تھا۔ ان دونوں وجوہات کی بنا پر صاحب موصوف جب
جج مقرر ہوئے تو بہار کے لوگوں میں ایک خوشی کی لہر دوڑ گئی اور عوام الناس کو ان کے جج مقرر
کیے جانے پر بڑا فخر محسوس ہوا۔

صاحب موصوف ۱۹۰۷ء سے ۱۹۱۶ء تک کلکتہ ہائی کورٹ کے جج رہے۔ مارچ ۱۹۱۶ء
میں جب پٹنہ ہائی کورٹ قائم ہوا تو مسٹر جسٹس شرف الدین کا تبادلہ کلکتہ سے پٹنہ ہو گیا۔ اس زمانے
میں پٹنہ ہائی کورٹ ایک چیف جسٹس اور چھ ججوں پر مشتمل تھا۔ صاحب موصوف نے پٹنہ ہائی کورٹ
میں ججی کے فرائض کو ۱۹۱۷ء تک انجام دیا۔ موصوف کلکتہ اور پٹنہ ہائی کورٹ میں اپنے کاموں کو
نہایت ہی ایمانداری اور خوبی سے انجام دیتے رہے اور کافی شہرت حاصل کی۔ ججی سے پنشن پا جانے
کے بعد موصوف کچھ عرصہ تک گورنر بہار واڑیسہ کے اگزیکیٹیو کانسل کے ممبر بھی رہے۔

مسٹر جسٹس شرف الدین نہایت ہی مرنجاں مرنج، سادہ مزاج، شریف طبع اور صاف دل انسان
تھے۔ مشرقی اور مغربی تہذیبوں کے قابل قدر نمونہ تھے۔ ان کی رہائش گاہ پر ہمیشہ دوستوں کا ایک

مجمع رہتا تھا جن میں کچھ ایسے لوگ بھی تھے جو کم و بیش مصاحبت کے فرائض انجام دیتے تھے۔ صاحب موصوف بچوں اور لڑکوں سے بڑی محبت سے ملتے تھے جس کا راقم کو ذاتی تجربہ ہے۔ میرے چھوٹے دادا خان بہادر حشمت حسین علاوہ رشتہ داری کے مسٹر سید شرف الدین کے عزیز دوستوں میں تھے۔ خان بہادر موصوف کے بڑے صاحبزادے مسٹر ریاست حسین بیرسٹر بی۔این۔ کالج کے متصل ایک بنگلہ میں رہا کرتے تھے جہاں راقم کا بھی اکثر قیام رہتا تھا۔ مسٹر سید شرف الدین ہر سنیچر کو اپنی رہائش گاہ "جو ہیٹ ہاؤس" سے الفنسٹن سنیما تصویر دیکھنے کے لیے جایا کرتے تھے۔ مسٹر ریاست حسین کا بنگلہ راستہ میں پڑتا تھا اس لیے ہر سنیچر کو تقریباً ایک گھنٹہ صاحب موصوف مسٹر ریاست حسین کے یہاں ٹھہر جاتے اور ادھر ادھر کی باتیں ہوا کرتی تھیں۔ مسٹر سید شرف الدین اپنی گھوڑا گاڑی پر کئی مصاحبوں کے ساتھ سنیما جاتے اور ایک آرام کرسی اپنے ساتھ سنیما ہال کے اندر لے جاتے جس پر بیٹھ کر آرام سے فلم دیکھا کرتے تھے۔ مئی ۱۹۱۹ء میں راقم مسٹر ریاست حسین کے یہاں ٹھہرا ہوا تھا اور اس زمانے میں دسویں جماعت کا طالب علم تھا۔ جب راقم نے جج صاحب کو چائے پیش کی تو وہ بہت خوش ہوئے اور دعائیں دے کر کہا کہ تم بھی آج میرے ساتھ سنیما چلو۔ میں نہایت خوشی سے ان کے ہمراہ سنیما گیا۔ اس زمانے میں بولتی تصویروں کا رواج نہ تھا اور تصویروں کا قصہ جو انگریزی زبان میں لکھا ہوتا تھا تصویروں کے ساتھ پردہ پر پیش کیا جاتا تھا۔ جج صاحب نے مجھے ہدایت کی کہ پردہ پر لکھی ہوئی انگریزی عبارتوں کو پڑھ کر انہیں سناؤں۔ صاحب موصوف مجھ سے بہت خوش ہوئے کیونکہ میں نے انگریزی عبارتوں کو صحیح طور سے انھیں پڑھ کر سنا دیا۔ موصوف نے مجھے تاکید کی کہ اچھی عبارتوں کو یاد کر لوں کیونکہ یہ عبارتیں سہل انگریزی کا نمونہ ہوا کرتی تھیں۔ راقم نے ان عبارتوں کو بہت دنوں تک یاد رکھا۔

مسٹر جسٹس سید شرف الدین کا قد میانہ تھا۔ رنگ کے گورے اور خوب صورت شکل کے تھے۔ نہایت ہی مہمان نواز، یار باش اور دوست پرور انسان تھے۔ حضرت حاجی وارث علی شاہ دیوا شریف ضلع بارہ بنکی کے خاص مریدوں میں تھے اور حضرت موصوف ان سے بڑی محبت کرتے تھے۔ جج صاحب نے اپنے پیر کی ایک تصویر کسی یورپین مصور سے بنوائی تھی جو فن مصوری کا اعلیٰ نمونہ تھی۔ میں نے اس تصویر کو مسٹر سید صفدر امام بیرسٹر پٹنہ کے یہاں دیکھی تھی۔ معلوم

نہیں یہ تصویر اب کس کے پاس ہے۔
مسٹر سید شرف الدین نے ۱۹۲۱ء میں انتقال کیا اور نیورہ کے قبرستان میں مدفون ہوئے۔
مسٹر جسٹس سید شرف الدین کے صاحبزادے مسٹر سید احمد شرف الدین پٹنہ ہائی کورٹ میں بیرسٹری کرتے تھے اور اپنے اس پیشے میں کامیاب بھی تھے۔ موصوف میرے چچا مسٹر ریاست حسین کے عزیز دوستوں میں تھے اور راقم کبھی کبھی ان کی رہائش گاہ واقع فریزر روڈ پر ان سے ملنے جایا کرتا تھا۔ موصوف ایک دوست پرست اور مخلص انسان تھے۔ مسٹر جسٹس شرف الدین ان سے بڑی محبت کرتے تھے اور ان کے خرچ کے لیے جتنی رقم درکار ہوتی تھی بے دریغ دیا کرتے تھے۔ آپ نے تقریباً چالیس سال کی عمر میں انتقال کیا۔ موصوف کی بیوہ اور دو لڑکے تقسیم ہند کے بعد پاکستان چلے گئے۔ مسٹر احمد شرف الدین کے بڑے لڑکے احسن شرف الدین چار سال تک پٹنہ کالج میں میرے شاگرد رہے چند سال ہوئے کہ موصوف قضا کر گئے۔ راقم کو اب ان لوگوں کے متعلق کچھ حال معلوم نہیں گرچہ یہ لوگ میرے قریبی رشتہ داروں میں تھے۔ شاید یہ بھی تقسیم ہند کا ایک کرشمہ ہے۔

(دوسرے جج)

سر سید علی امام، کے سی۔ ایس۔ آئی

سر سید علی امام، خاندان نیورہ کے دوسرے فرد تھے جنھیں حکومت برطانیہ نے ججی کا عہدہ عطا کیا تھا۔ صاحب موصوف نیورہ ضلع پٹنہ میں ۱۱ر فروری ۱۸۶۹ء کو پیدا ہوئے۔ آپ کے والد محترم نواب شمس العلماء سید امداد امام صاحب اثر کی ذات میں ایسی جامعیت موجود تھی جو بہت کم لوگوں میں پائی جاتی ہے۔ آپ کو فن طب، شعر و سخن، ادب و تنقید نگاری میں ایک خاص مقام حاصل تھا۔ عربی فارسی کے علاوہ انگریزی بھی جانتے تھے۔ کچھ عرصہ تک پٹنہ کالج میں فارسی ادب کے پروفیسر رہے مگر انگریز پرنسپل سے کچھ اختلافات کی بنا پر ملازمت سے علیحدگی اختیار کر لی۔ سر سید علی امام ایک ایسے نامور دانشور اور مفکر کے بڑے صاحبزادے تھے۔
سر سید علی امام نے انٹرنس کا امتحان آرہ ضلع اسکول سے ۱۸۸۷ء میں پاس کیا۔ چند ماہ بعد بیرسٹری کی ڈگری حاصل کرنے کے لیے انگلستان گئے اور مڈل ٹمپل سے جون ۱۸۹۰ء میں بیرسٹر

ہوئے۔ انگلستان سے واپس آکر صاحب موصوف ماہ نومبر ۱۸۹۰ء میں بحیثیت ایڈوکیٹ کلکتہ ہائی کورٹ کے تحت کام کرنے لگے۔ تقریباً بیس سال تک پٹنہ میں رہ کر بیرسٹری کی۔ اپنی جادو بیانی، قانون فہمی اور قانون دانی کی وجہ سے اتنی شہرت حاصل کی کہ ہندوستان کے ہر صوبہ میں بڑے سے بڑے مقدموں میں بیرسٹر مقرر کیے جاتے اور ان میں کامیاب ہوتے تھے۔ ۱۹۰۹ء میں موصوف حکومت ہند کے اسٹینڈنگ کونسل مقرر کیے گئے۔ اس کے کچھ عرصہ بعد ۱۹۱۱ء کے اواخر میں حکومت ہند کے لا ممبر ہوئے اور اس جلیل القدر عہدہ پر دسمبر ۱۹۱۵ء تک فائز رہے۔ جب اس عہدہ سے علیحدہ ہوئے تو پٹنہ ہائی کورٹ میں ۱۹۱۶ء سے بیرسٹری کرنے لگے۔ ستمبر ۱۹۱۷ء میں صاحب موصوف نے پٹنہ ہائی کورٹ میں جج کا عہدہ قبول کیا اور ایک سال تک اس عہدہ پر قائم رہے۔ حکومت بہار نے صاحب موصوف کو ۱۹۱۸ء میں ایگزیکیٹو کونسل کا ممبر مقرر کیا جہاں انھوں نے اگست ۱۹۱۹ء تک اپنے فرائض کو بحسن وخوبی انجام دیا۔ اگست ۱۹۱۹ء میں نظام حیدرآباد نے انھیں وزارت عظمیٰ کا کام سپرد کیا۔ دو سال بعد اس عہدہ سے الگ ہو گئے اور پٹنہ واپس آکر بیرسٹری کرنے لگے۔ اس زمانہ میں پٹنہ ہائی کورٹ میں کوئی قانون داں ان کا ہمسر نہ تھا۔ پہلی جنگ عظیم کے ختم ہونے کے بعد ایک بین الاقوامی ادارہ قائم ہوا جس کا نام لیگ آف نیشنس رکھا گیا۔ دنیا کے مختلف ممالک نے اپنا اپنا نمائندہ اس ادارہ کے لیے منتخب کیا اور سر علی امام پہلے ہندوستانی تھے جنھوں نے لیگ آف نیشنس میں ہندوستان کی نمائندگی کی اور صاحب موصوف کے لیے یہ ایک بہت بڑا اعزاز تھا۔ سر سید علی امام آخری راؤنڈ ٹیبل کانفرنس ۱۹۳۱ء میں مسلمانان ہند کے نمائندے کی حیثیت سے شریک ہوئے اور ایک پرزور تقریر کی کہ ہندوستان کو آزادی دی جائے۔ حکومت برطانیہ نے انھیں کے۔ سی۔ ایس۔ آئی۔ کے خطاب سے سرفراز کیا۔

سر سید علی امام اپنے زمانے کے قابل ترین مسلمان تھے اور انھوں نے جو ملک وملت کی بے نظیر خدمت کی ہے اس کی مثال بہت کم ملتی ہے۔ بحیثیت وزیر قانون سر علی امام نے مسجد مچھلی بازار کان پور کا سنگین معاملہ اپنی دوراندیشی، محنت اور جاں فشانی سے ختم کرا کر ہندوستان کے مسلمانوں کی ایک بہت بڑی الجھن کو دور کیا۔ مسلم قوم ان کی اس بے لوث خدمت کو کبھی فراموش نہیں کر سکتی ہے۔ مسئلہ برار ایک عرصہ سے نظام حیدرآباد کے لیے دردسر بنا ہوا تھا۔ نظام حیدرآباد نے سر علی امام کی خدمات حاصل کیں اور انھیں اپنا وکیل بنا کر لندن بھیجا کہ حکومت

برطانیہ کے سامنے اس مسئلہ کو پیش کر کے اس کا کوئی حل نکالیں۔ سر علی امام کی کوششوں کی بدولت نظام حیدر آباد کو چند مراعات حاصل ہو گئیں اور حضور نظام کے بڑے لڑکے پرنس آف برار کہلانے کے مستحق ہو گئے۔ سر علی امام نے کانگریس کے کسی اجلاس میں بحیثیت ممبر شرکت نہ کی اور مسلمانوں کے حقوق کی سختی سے محافظت کرتے رہے۔ صاحب موصوف کا مسلم لیگ سے عرصہ دراز تک تعلق رہا اور آپ اس سالانہ اجلاس کے صدر ہوئے جو ۱۹۰۸ء میں امرتسر میں منعقد ہوا تھا۔ سر محمد اقبال کو سر سید علی امام سے بڑی عقیدت مندی تھی۔ چنانچہ سر محمد اقبال نے اپنے شعر میں سر علی امام کو "نگہدار حقوق امت خیر البشر" کہا ہے جس سے سر سید علی امام کی عظمت کا پتہ چلتا ہے۔

بحیثیت وزیر قانون سر سید علی امام نے بنگال سے بہار اور اڑیسہ کے صوبہ کو الگ کرانے میں کارنمایاں انجام دیا اور شاہ جارج پنجم نے اپنے دہلی دربار کے موقع پر دسمبر ۱۹۱۱ء میں بہار اور اڑیسہ کے ایک الگ صوبہ بنائے جانے کا اعلان کیا۔ موصوف کو "بابائے جدید بہار اور اڑیسہ" کا لقب تو ضرور حاصل ہوا لیکن بنگال سے الگ ہو جانے کے بعد بہار میں مسلمانوں کی دس فیصد اور اڑیسہ میں چار فی صد آبادی ہو گئی اور مسلمان بہار و اڑیسہ میں اقلیت بن کر رہ گئے۔ معلوم نہیں یہ کارروائی سر سید علی امام نے کس جذبے کے تحت کی تھی۔ ۱۹۲۸ء میں پنڈت موتی لال نہرو نے "Indian Reforms" پر اپنی ایک سیاسی اسکیم مرتب کی جو نہرو رپورٹ کے نام سے مشہور ہوئی۔ اس نہرو رپورٹ پر سر سید علی امام نے اپنا دستخط ثبت کر دیا اور رپورٹ کی تائید میں ایک جلسہ عام میں تقریر بھی کی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ سر سید علی امام نے اس رپورٹ پر بغیر زیادہ غور و خوض کئے اپنا دستخط کر دیا تھا۔ نہرو رپورٹ کی مخالفت میں مسٹر سید عبد العزیز اور مولانا شفیع داؤدی نے پٹنہ میں ایک جلسہ منعقد کیا جس میں مولانا شوکت علی، مولانا محمد علی اور سر سید علی امام بھی شریک تھے۔ مولانا محمد علی نے اپنی تقریر میں نہرو رپورٹ کی دھجیاں اڑا دیں اور مسلمانان ہند اس رپورٹ کی مخالفت پر کمربستہ ہو گئے۔ بعد ازاں یہ رپورٹ بے کار ہو کر رہ گئی۔ جیسا کہ اوپر ذکر کیا جا چکا ہے، علامہ سر محمد اقبال سر سید علی امام کی شخصیت سے بہت متاثر تھے اور ہمیشہ موصوف کے بڑے مداح رہے۔ اپنی کتاب "اسرار خودی" کو انیس[19] اشعار کا ایک قصیدہ لکھ کر سر علی امام کے نام سے معنون کیا۔ اسرار خودی کے دو ایڈیشنوں میں یہ قصیدہ موجود ہے مگر معلوم نہیں کیوں بعد کے ایڈیشنوں میں یہ قصیدہ درج نہیں ہے۔

سر سید علی امام ننھیالی رشتہ سے میرے ماموں ہوتے اور ددھیالی رشتہ سے چچا تھے۔ موصوف سے تیسرا رشتہ اس وقت قائم ہوا جب راقم کی ایک خالہ زاد بہن کی شادی سر علی امام سے ہوئی۔ موصوفہ لیڈی انیس امام کے نام سے مشہور ہوئیں اور سماجی، سیاسی، علمی اور مذہبی کاموں میں نمایاں حصہ لیتی رہیں۔ عرصہ دراز تک بہار لیجس لیٹو کونسل کی ممبر بھی رہیں۔ چند سال ہوئے انتقال کر گئیں۔ موصوف کی دوسری بیوی میری (مریم) نام کی ایک عیسائی خاتون تھیں۔

سر سید علی امام راقم کے والد سے بڑی محبت کرتے اور والد صاحب بھی ان کی بڑی عزت کرتے تھے۔ اس تعلق کا تذکرہ والد صاحب نے اپنی نگارشات میں کیا ہے۔ سر علی امام نے والد صاحب سے ایک موقع پر فرمایا تھا کہ "وجود باری تعالیٰ پر مجھے ایسا ہی یقین ہے جیسا کہ کسی ذاتی مشاہدہ کی چیز پر یقین ہوتا ہے۔" موصوف کے اس جملہ کا ایک گہرا اثر والد صاحب پر ہوا۔ سر سید علی امام کی ہر سالگرہ کے موقع پر والد مرحوم انھیں کوئی نہ کوئی تحفہ پیش کیا کرتے تھے۔ آخری سالگرہ کے موقع پر والد صاحب نے قرآن کریم کا ایک نسخہ نذر کیا اور یہ سوچا کہ آیندہ یوم پیدایش پر قرآن اور احکام قرآن کے متعلق ایک کتابچہ لکھ کر سر علی امام کو نذر کریں۔ والد صاحب کا یہ ارادہ پورا نہ ہو سکا کیوں کہ سر سید علی امام کا اچانک انتقال ہو گیا اور حالات بدل گئے۔ والد مرحوم کی وفات کے چند سال بعد ان کی یاد تازہ رکھنے کے لیے خیال آیا کہ ان مقالات کی طباعت اور اشاعت ہو جائے تو بہتر ہے۔ چنانچہ راقم نے اس کتابچہ کو "چھ مقالے" کا نام دے کر ۱۹۷۱ء میں چھپوا کر لوگوں میں تقسیم کیا۔ راقم سر سید علی امام کی خدمت میں اکثر حاضر ہوا کرتا تھا اور ان کے خصائل حمیدہ سے بہت متاثر ہوتا تھا۔ سر سید علی امام کی عاجزی اور انکساری کا یہ حال تھا کہ اپنے سے کمتر درجہ کے لوگوں سے بھی نہایت اخلاق سے ملتے تھے۔ ایک روز "مریم منزل" پٹنہ میں راقم سر سید علی امام کے ساتھ دن کا کھانا کھا رہا تھا کہ ان کے دور کے ایک نوجوان رشتہ دار جنھیں جذام کا مرض تھا یک بیک کھانے کے کمرے میں داخل ہو گئے۔ انھیں دیکھ کر سر سید علی امام نے فرمایا کہ آپ بھی ہم لوگوں کے ساتھ کھانے میں شرکت کریں۔ مریض رشتہ دار نے نہایت خوش ہو کر ہم لوگوں کے ساتھ بیٹھ کر ٹیبل پر کھانے میں شرکت کی۔ کھانا چونکہ انگریزی طرز سے کھلایا جا رہا تھا اس لیے چھوت کا اندیشہ بہت کم تھا۔ کھانا ختم ہو جانے کے بعد سر سید علی امام نے اپنے خدمت گار کو اشارے سے ہدایت کی کہ ٹیبل پر وہ

سب چیزیں جنھیں رشتہ دار موصوف نے استعمال کی تھیں الگ کر دی جائیں۔

والد مرحوم کی وصیت کے مطابق راقم کی طرف سے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اس امیدوار کو جو ایل۔ایل۔بی کے امتحان میں اسلامی قانون میں سب سے زیادہ نمبر لاتا ہے ایک میڈل سر سید علی امام کے نام پر ہر سال ہماری دی ہوئی رقم سے عطا کرتی ہے۔ ڈاکٹر سچید انند سنہا کی طرف سے پٹنہ یونیورسٹی ایک میڈل ہر سال دیتی ہے۔ افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ موصوف کے ورثاء نے اب تک سر سید علی امام کی کوئی یادگار قائم نہ کی ہے۔ سر سید علی امام کو انگریزی زبان کے علاوہ اردو زبان پر بھی کافی عبور حاصل تھا اور انھیں سینکڑوں اردو کے اشعار یاد تھے۔ اردو زبان میں فی البدیہہ تقریریں نہایت ہی سلاست اور روانی سے کیا کرتے تھے جن کو سن کر بڑے سے بڑے اردو زبان کے ماہرین بھی دم بخود رہ جاتے تھے۔ سر سید علی امام قوی الجثہ انسان تھے اور اپنی صحت کو برقرار رکھنے کے لیے روزانہ ورزش کیا کرتے تھے۔ موصوف کی پہلی شادی ان کے اپنے خاندان ہی میں ہوئی تھی۔ صرف پہلی اہلیہ سے چار لڑکیاں اور پانچ لڑکے پیدا ہوئے۔ ان کے سب لڑکوں نے انگلستان جا کر کیمبرج یونیورسٹی میں تعلیم پائی اور اعلیٰ ڈگریاں حاصل کیں۔ تین لڑکوں نے پٹنہ ہائی کورٹ میں بیرسٹری کی اور دو لڑکے پٹنہ ہائی کورٹ کے جج ہوئے اور کافی شہرت حاصل کی۔ سر سید علی امام اپنی بے مثال رواداری، شرافت اور بے شمار خوبیوں کے لیے ہمیشہ یاد رہیں گے۔

سر سید علی امام کو اللہ کی ذات پر بڑا بھروسہ تھا۔ وہ اپنے تمام کاموں میں اللہ کی ہی خوشنودی ڈھونڈتے اور ہمیشہ راضی بہ رضا رہے۔ ایک شاندار مکان "انیس کاسل" (Anis Castle) اپنی تیسری بیوی کے نام پر رانچی میں تعمیر کرا رہے تھے اور اس سلسلے میں اکثر پٹنہ سے رانچی بذریعہ موٹر کار جایا کرتے تھے۔ آخری بار اپنے چھوٹے صاحبزادے مسٹر سید نقی امام کو اپنے ساتھ لے کر رانچی گئے جہاں ان پر قلب کا دورہ پڑا اور جاں بحق ہو گئے۔ مسٹر سید نقی امام کا بیان ہے کہ ان کی موت نہایت سہل طریقے پر ہوئی اور اللہ کا نام لیتے ہوئے اس دار فانی سے کوچ کر گئے۔ جن لوگوں کے اعمال اچھے ہوتے ہیں اللہ ان کی موت کو آسان کر دیتا ہے۔ سر سید علی امام نے ۳۱ اکتوبر ۱۹۳۲ء کی شب میں انتقال کیا اور "انیس کاسل" رانچی میں اپنی مقرر کردہ جگہ پر مدفون ہوئے۔

(تیسرے جج)

مسٹر جسٹس سید حسن امام

نیورہ خاندان کے تیسرے ہائی کورٹ کے جج مسٹر سید حسن امام تھے۔ موصوف نواب شمس العلما امداد امام اثر کے صاجزادے اور سر سید علی امام کے چھوٹے بھائی تھے۔ نواب امداد امام کا تعلق ایک متوسط زمیندار خاندان سے تھا۔ مسٹر سید حسن امام موضع نیورہ ضلع پٹنہ میں ۳۱ر اگست ۱۸۷۱ء کو پیدا ہوئے۔ گھر پر اپنے والد سے ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد اسکول میں داخلہ لیا مگر صحت کی خرابی کے سبب اسکول کی تعلیم مکمل نہ کر سکے۔ جولائی ۱۸۸۹ء میں موصوف تعلیم حاصل کرنے کے لیے انگلستان گئے۔ لندن پہنچ کر اٹھارہ برس کی عمر میں قانون کی تعلیم کے لیے اپنا داخلہ مڈل ٹمپل میں لیا اور ۱۸۹۲ء میں وہاں سے بیرسٹری کا امتحان پاس کیا اور اسی سال ہندوستان واپس آکر پٹنہ میں کلکتہ ہائی کورٹ کے تحت بیرسٹری کرنے لگے۔ موصوف کی پہلی شادی اپنے خاندان میں ہی ہوئی تھی اور بہت دنوں بعد دوسری شادی ایک عیسائی خاتون سے ہوئی۔ پہلی بیوی کے بطن سے دو لڑکے اور دو لڑکیاں پیدا ہوئیں۔ موصوف کے لڑکے الحاج مسٹر مہدی امام کی تعلیم بچپن سے انگلستان میں ہوئی۔ آکسفورڈ یونیورسٹی سے نہایت اعلیٰ ڈگری حاصل کی اور بیرسٹر ہو کر پٹنہ ہائی کورٹ میں کام کرنے لگے۔ انھوں نے بحیثیت مصنف، مفکر اور دانش ور نہایت شہرت حاصل کی۔ کچھ دن ہوئے موصوف ۸۵ سال کی عمر میں انتقال کر گئے۔ مسٹر سید مہدی امام کی شادی مسٹر جسٹس سر سید فضل علی کی صاجزادی سے ہوئی تھی۔ مسٹر سید حسن امام کی دونوں لڑکیوں نے بھی یورپ میں تعلیم حاصل کی۔ بڑی لڑکی کی شادی مسٹر سید عبدالسمیع بیرسٹر سے اور چھوٹی لڑکی کی شادی مسٹر جسٹس سید جعفر امام سے ہوئی تھی۔ دونوں لڑکیاں بھی قضا کر چکی ہیں۔ عیسائی خاتون کے بطن سے ایک لڑکا پیدا ہوا جو بقید حیات ہے۔

مسٹر سید حسن امام میانہ قد خوبرو اور صحت مند انسان تھے۔ برابر انگریزی لباس زیب تن کیا کرتے۔ کبھی کبھی ہندوستانی لباس بھی استعمال کرتے تھے، مگر گاندھی جی کی سودیشی تحریک سے متاثر ہو کر کچھ دنوں تک کھادی کے کپڑے بھی پہنے۔ نہایت ہی جامہ زیب

انسان تھے اور جو لباس بھی پہنتے بھلا معلوم ہوتا۔ اپنی اولاد سے والہانہ محبت کرتے تھے۔ عام طور سے اپنے عزیزوں اور دوستوں سے نہایت خلوص اور محبت سے ملتے مگر بسا اوقات انہی لوگوں سے نہایت تندی و ترشی سے باتیں کیا کرتے اور بعد میں معافی بھی مانگ لیتے تھے۔ موصوف کی رہائش بالکل انگریزی طرز کی تھی۔ انگریز دانشوروں اور قانون دانوں کے بڑے مداح تھے۔ ان کی نئی نئی تصانیف کو خرید خرید کر پڑھا کرتے اور اکثر اپنے انگریز دوستوں سے ملنے انگلستان جایا کرتے تھے۔ مسٹر مونٹیگو، سکریٹری آف اسٹیٹ فار انڈیا نے اپنے روزنامچے "انڈین ڈائری" میں مسٹر حسن امام کا تذکرہ نہایت ہی عزت سے کیا ہے۔ کچھ نامور انگریز ممبران پارلیامنٹ بھی ان کے مداح تھے۔ ہندوستان میں جو انگریز حکمراں ہو کر آتے ان سے سیاسی اختلافات کی بنا پر مسٹر سید حسن امام کی کبھی نہ بنی۔ راقم کو اس سلسلے میں انگریزوں کا موصوف کے ساتھ برتاؤ کا ایک دل چسپ واقعہ یاد آگیا۔ موصوف رات کی گاڑی سے رانچی جا رہے تھے اور کرتے پاجامے میں ملبوس فرسٹ کلاس کے ایک برتھ پر آرام کر رہے تھے۔ اسی دوران ایک انگریز مسٹر کلیٹن جو حکومت بہار کا چیف انجنیئر تھا اسی کمپارٹمنٹ میں داخل ہوا اور موصوف ہی کے برتھ پر ان کے پہلو میں بیٹھ گیا۔ جب موصوف کے نوکر نے مزاحمت کی اور اسے اٹھانا چاہا تو مسٹر کلیٹن نے غصے میں آکر مسٹر سید حسن امام کے پیٹ پر بیٹھ جانے کی کوشش کی۔ اس کی اس مذموم حرکت پر نوکر کو طیش آگیا اور اس نے مسٹر کلیٹن کی گردن میں ہاتھ دے کر ڈبے سے نیچے اتار دیا۔ جب مسٹر کلیٹن کو حقیقت حال کا علم ہوا اور یہ معلوم ہوا کہ یہ صاحب مسٹر سید حسن امام ہیں تو اس نے فوراً موصوف سے معافی مانگی۔ اسی اثنا میں پلیٹ فارم پر تماشائیوں کی ایک بھیڑ کمپارٹمنٹ کے سامنے جمع ہو گئی، مگر مسٹر سید حسن امام کے کہنے پر وہ لوگ منتشر ہو گئے۔ دوسرے روز اخباروں نے نمایاں طور پر اس خبر کو شائع کیا اور ہندوستان میں ہر جگہ اس خبر کی کافی تشہیر ہوئی۔

مسٹر سید حسن امام نے بجز ان چار سالوں کے جب وہ کلکتہ ہائی کورٹ کے جج تھے، اپنی ساری عمر پیشہ بیرسٹری میں صرف کی اور نہایت کامیابی اور شہرت حاصل کی۔ اس زمانے میں ہندوستان میں بہت کم قانون داں ایسے تھے جو شہرت، عزت اور قانون دانی میں ان کی ہمسری کر سکتے تھے۔ صاحب موصوف ہندوؤں کے قانون کے متعلق بھی ایک مستند اور ماہر قانون داں سمجھے جاتے تھے۔ دوران بحث، ہندو لا رکو سامنے رکھ کر اس کے حوالوں سے ایسے ایسے نکتے پیش کرتے

جن کو سن کر بڑے بڑے پنڈت بھی دم بخود رہ جاتے تھے۔ اس پیشے سے موصوف نے بے انتہا دولت حاصل کی اور مرنے کے بعد تقریباً ایک کروڑ روپیے کی ملکیت اپنے ورثاء کے لیے چھوڑ گئے۔ مرنے سے کچھ دنوں پہلے موصوف نے پٹنہ میں فریزر روڈ پر اپنے لیے ایک عالی شان مکان بنوایا، جس کا نام "رضواں" رکھا۔ یہ مکان یورپ کے فن تعمیر کو مد نظر رکھتے ہوئے بنایا گیا اور آرام و آسائش کی تمام چیزیں اس میں فراہم کی گئی تھیں بجلی اور پانی کا اپنا ذاتی انتظام تھا۔ اتنے بڑے مکان میں صرف صاحب موصوف، ان کی والدہ، ان کی عیسائی بیگم اور دو لڑکے رہا کرتے تھے۔ کاش اس بڑے مکان میں ایک مسجد بھی ہوتی۔

مسٹر سید حسن امام ۱۹۱۲ء سے ۱۹۱۶ء تک کلکتہ ہائی کورٹ میں جج رہے اور بحیثیت جج نہایت شہرت حاصل کی۔ اس زمانے میں انگریز آئی۔ سی۔ ایس افسروں کا بڑا زور تھا اور کبھی کبھی یہ لوگ اپنے حکم ناموں سے عوام الناس کو دشواریوں میں ڈال دیا کرتے تھے۔ مسٹر سید حسن امام نے چند آئی۔ سی۔ ایس افسروں کے خلاف نہایت سخت فیصلے صادر کیے اور ساتھ ہی ساتھ تادیبی کارروائیوں کے احکام بھی جاری کیے۔ انہی وجوہات کی بنا پر بنگال، بہار اور اڑیسہ کے انگریز آئی۔ سی۔ ایس حکام مسٹر سید حسن امام کے مخالف ہو گئے۔ آج سے تقریباً پچاس سال پہلے مسٹر ڈی۔ وسٹن، آئی۔ سی۔ ایس ترہت ڈویژن کے کمشنر تھے۔ وسٹن صاحب کے ساتھ والد مرحوم نے کچھ عرصے تک بحیثیت سب ڈویژنل مجسٹریٹ کام کیا تھا اور راقم صاحب موصوف سے دو چار بار ملا تھا۔ ایک ملاقات میں وسٹن صاحب نے مسٹر سید حسن امام کے چند فیصلوں پر سخت تنقید کی اور کہا کہ مسٹر حسن امام کے ایسے فیصلے انگریز دشمنی پر مبنی ہوا کرتے تھے۔ انہی وجوہات کی بنا پر بہار، بنگال اور اڑیسہ کے تمام انگریز آئی۔ سی۔ ایس۔ حکام مسٹر سید حسن امام کے سخت مخالف ہو گئے اور جب صاحب موصوف کا مارچ ۱۹۱۶ء میں تبادلہ کلکتہ ہائی کورٹ سے پٹنہ ہائی کورٹ ہونے لگا تو لفٹننٹ گورنر بہار و اڑیسہ نے اس کی سخت مخالفت کی اور ان کا تبادلہ پٹنہ ہائی کورٹ میں نہ ہو سکا۔ مسٹر سید حسن امام نے اس سازش کی کوئی پرواہ نہ کی اور منصب ججی سے اپنا استعفا داخل کر دیا۔ پٹنہ ہائی کورٹ میں اسی روز سے بیرسٹری کرنے لگے جس روز یہ ہائی کورٹ قائم ہوا تھا۔ گرچہ مسٹر سید حسن امام تھوڑے ہی عرصے تک ہائی کورٹ کے جج رہے مگر اپنی قابلیت کی وجہ سے اس قلیل مدت میں کافی شہرت اور عزت حاصل کر لی تھی۔ عام طور پر راقم نے گورے

حکام میں ایسی ایسی خوبیاں دیکھی ہیں جو آج کل کے منور کالے حکام میں بالکل مفقود ہیں ۔ انگریز آئی۔ سی۔ ایس رشوت ستانی سے بہت دور رہتے تھے اور عوام الناس کی فلاح و بہبود کے کاموں میں اپنا بہت کچھ وقت صرف کرتے تھے۔

ولسن صاحب کا تذکرہ ادھورا رہ جائے گا جب تک کہ راقم ان کے پالتو طوطے کا ذکر نہ کرے۔ ان کا "کاکاطوا" پتلی زنجیر سے بندھا ہوا ان کے کمرے کی آتش دان پر بیٹھا رہتا تھا اور اکثر ان لوگوں کے سروں پر آکے بیٹھ جاتا تھا جو ولسن صاحب سے ملنے آیا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ جب راقم ولسن صاحب سے ملنے گیا تو میں بار بار خائف ہو کر کاکاطوا کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ولسن صاحب نے میرے اطمینان کے لیے ہنس کر فرمایا کہ میرا کاکاطوا بڑا مہذب پرندہ ہے یہ ان لوگوں کے سروں پر ہرگز نہیں بیٹھتا جو سوٹ میں ملبوس آتے ہیں بلکہ یہ ان ہندو زمینداروں کے سروں پر بیٹھتا ہے جو بڑی بڑی پگڑیاں باندھ کر آتے ہیں اور وہ لوگ اپنے سروں پر کاکاطوا کے بیٹھنے کو اپنی خوش بختی سمجھتے ہیں۔

مسٹر سید حسن امام بہار کے معاشرے کی اصلاح چاہتے تھے۔ اسی خیال کے مدنظر بہار کی عورتوں میں پردے کا جو قدیم رواج تھا اس کے سخت مخالف ہوئے اور اپنی دونوں جوان لڑکیوں کا پردہ ترک کرادیا۔ اس زمانے میں بہار کی عورتوں میں تعلیم کا رواج بہت کم تھا اس لیے موصوف عورتوں کی تعلیم پر بہت زور دینے لگے۔ بحیثیت ممبر نگاری بورڈ آف ٹرسٹیز انھوں نے لڑکیوں کی تعلیم کے لیے چند اسکیمیں چلائیں۔ صاحب موصوف علی گڑھ کالج کے ایک ٹرسٹی تھے اور آپ نے کالج کے لیے چندہ فراہم کرنے میں مدد کی تھی۔ پٹنہ کے بی۔ این۔ کالج کو اپنی جیب سے ایک ہزار روپیے کا سالانہ عطیہ دیا کرتے تھے۔

مسٹر سید حسن امام نے ۱۹۰۸ء میں پہلی مرتبہ سیاست میں حصہ لینا شروع کیا۔ ۱۹۰۹ء میں صاحب موصوف بہار کانگریس کمیٹی کے ممبر منتخب ہوئے اور اسی سال بہار اسٹوڈنٹس کانفرنس کے چوتھے اجلاس کی صدارت کی۔ "ہوم رول" کی تحریک میں بھی حصہ لیا کرتے تھے اور مسز بسنت کے بڑے ہمدرد تھے۔ ۱۹۱۸ء میں انڈین نیشنل کانگریس کا ایک خصوصی اجلاس بمبئی میں ہوا جس کی صدارت مسٹر سید حسن امام نے کی۔ گرچہ مسٹر سید حسن امام کانگریس کے ممبر تھے مگر کانگریس کی ہنگامہ خیز تحریکوں سے برابر الگ رہے۔ تحریک خلافت میں

بھی حصہ لیا۔ صاحب موصوف اس کانگریسی وفد کے ممبر تھے جس نے انگلستان جاکر حکومت برطانیہ کو مسلمانوں کے سیاسی مسائل اور خیالات سے آگاہ کیا تھا۔ ۱۹۲۰ء میں سول نافرمانی کی تحریک میں بھی شریک رہے۔ بحیثیت سکریٹری سودیشی لیگ کھادی کے استعمال پر بڑا زور دیتے تھے۔ ۱۹۲۱ء میں صاحب موصوف بہار واڑلیہ لیجس لیٹو کونسل کے ممبر نامزد کیے گئے، اور آپ اس کانسل کے پہلے منتخب نائب صدر ہوئے۔ لیگ آف نیشنس کے چوتھے اجلاس میں موصوف نے بحیثیت ممبر شرکت کی۔ مسٹر سید حسن امام نے ۱۹ راپریل ۱۹۳۳ء کو انتقال کیا، اور موضع جیپلا ضلع شاہ آباد میں مدفون ہوئے۔

تحریک ترک موالات کے زمانے میں مسٹر گاندھی نے مسٹر حسن امام سے کئی بار کہا کہ وہ بیرسٹری چھوڑ دیں اور تحریک میں شامل ہو جائیں مگر مسٹر حسن امام نے بیرسٹری نہ چھوڑی مگر مالی امداد میں کثیر رقم دیتے رہے۔ ان کے تحریک میں شامل نہ ہونے کی بنا پر "زمیندار" مورخہ ۲۰ر فروری ۱۹۲۲ء میں ان پر ایک ہجویہ نظم چھپی جس کے چند اشعار حسب ذیل ہیں:

وہ کون ہے جو نہیں آج کل اسیر فرنگ
سی۔آر۔داس نہیں یا ابوالکلام نہیں
بحیرت اس پہ کہا ایک دوست نے مجھ سے
کہ اس گروہ میں شامل حسن امام نہیں
کہا یہ دوست سے مَیں نے وہ مرغ دانا ہیں
حریص دانہ ہیں لیکن حریص دام نہیں

مسٹر سید حسن امام کے نواسے مسٹر سید حسن سمیع راقم سے بڑی محبت کرتے تھے۔ انگریزی اور اردو میں اشعار کہتے تھے۔ اور اشتراکی سیاست میں حصہ لیا کرتے تھے۔ سید حسن سمیع کے لڑکے رضا سمیع کی شادی میرے ماموں زاد بھائی مسٹر جال وارث کی لڑکی سے ہوئی ہے۔

(چوتھے جج)

مسٹر جسٹس سید جعفر امام

یہ کم ہی دیکھا گیا ہے کہ باپ کی طرح بیٹا بھی ہو لیکن سر سید علی امام کو اللہ نے یہ فخر بخشا کہ اسی ہائی کورٹ میں جہاں وہ جج تھے ان کے دو صاحبزادے بھی ججی کے منصب پر فائز ہوئے۔

سر سید جعفر امام نیورہ خاندان کے چوتھے فرد تھے جو پٹنہ ہائی کورٹ میں جج ہوئے۔

موصوف سر سید علی امام کے تیسرے لڑکے تھے۔ آپ کی پیدائش ۱۸۔ اپریل ۱۹۰۰ء میں نیورہ ضلع پٹنہ میں ہوئی۔ اپنی پہلی اہلیہ کی موت کے بعد سر سید علی امام نے اپنے پانچوں بچوں کو جو نہایت ہی کم سن تھے ایک مشفق اور قابل انگریز کی نگرانی میں تعلیم و تربیت کے لیے انگلستان روانہ کیا اور اس انگریز اتالیق نے بھی نہایت ہی ایمان داری کے ساتھ اپنا فرض ادا کیا۔

صاحب موصوف کی ابتدائی تعلیم Lynamus School اور Malbern - Public School - میں ہوئی جو اس زمانے میں کافی شہرت رکھتے تھے۔ اسکول کی تعلیم مکمل کر کے صاحب موصوف نے اپنا داخلہ ٹرینیٹی کالج میں لیا جو کیمبرج یونیورسٹی کا ایک نہایت ہی نامور کالج ہے اور یہاں سے بی۔اے کا امتحان ٹرائپوس کے ساتھ پاس کیا۔ چونکہ ابتدا ہی سے آپ کا طبعی میلان قانون دانی کی طرف تھا، اس لیے آپ نے ایل۔ایل۔بی کی ڈگری بھی اسی یونیورسٹی سے امتیاز کے ساتھ حاصل کی۔ مڈل ٹیمپل سے جنوری ۱۹۲۲ء میں بیرسٹر ہو کر پٹنہ واپس آگئے اور مارچ ۱۹۲۲ء سے بحیثیت بیرسٹر پٹنہ ہائی کورٹ میں کام کرنے لگے۔ تھوڑی ہی مدت میں آپ کی اعلیٰ قانونی کارکردگی اور صلاحیت کی بنا پر حکومت بہار نے موصوف کو ۳۲ ۱۹ء میں اسسٹنٹ گورنمنٹ ایڈوکیٹ کے عہدے پر مقرر کر دیا جس عہدے پر موصوف ۴۲ ۱۹ء تک فائز رہے۔ ۴۳-۴۲ ۱۹ء میں ایک سال کے لیے ایڈوکیٹ جنرل بھی ہوئے۔ ۴۳ ۱۹ء میں حکومت نے موصوف کو پٹنہ ہائی کورٹ کا جج مقرر کیا اور آپ ۱۹۵۲ء تک اپنے فرائض حسن و خوبی کے ساتھ انجام دیتے رہے۔ ان کی اعلیٰ قانونی صلاحیت سے متاثر ہو کر ۱۹۵۲ء میں حکومت نے انھیں پٹنہ ہائی کورٹ کا چیف جسٹس مقرر کیا اور اس عہدہ پر موصوف نے جنوری ۱۹۵۵ء تک کام کیا۔ آپ کے فیصلے نہایت منصفانہ اور قانون کے مطابق ہوتے

تھے اور کسی کے لیے شکایت کی ذرا بھی گنجایش نہ رہتی تھی۔ حکومت نے مسٹر سید جعفر امام کو جنوری ۱۹۵۵ء میں سپریم کورٹ آف انڈیا کا جج مقرر کیا۔ اس عہدے پر موصوف پنشن پانے تک فائز رہے۔ موصوف کی تقرری چیف جسٹس آف انڈیا کے عہدے پر ہونے والی تھی کہ اچانک بیمار ہوگئے۔ اس بیماری میں بھی کچھ دنوں تک آپ اپنے فرائض انجام دیتے رہے۔ جب صحت یابی کی کوئی امید باقی نہ رہی تو کچھ دنوں کے لیے فرصت لے لی اور بعد میں اپنے عہدے سے سبکدوش ہو کر پٹنہ واپس آگئے۔ ساری عمر موصوف نے قانونی خدمات میں صرف کردی اور کبھی بھی کسی قسم کی سیاست میں حصہ نہ لیا۔ صاحب موصوف سے پہلے پٹنہ ہائی کورٹ میں ۹ چیف جسٹس ہوئے جن میں چھ انگریز تھے اور آپ پٹنہ ہائی کورٹ کے چوتھے ہندوستانی چیف جسٹس تھے۔

سر سید علی امام کے پانچوں لڑکوں میں مسٹر جعفر امام سب سے زیادہ خوبرو تھے اور یہ خوبروئی بڑھاپے تک قائم رہی۔ فطرتاً نہایت مردم شناس، مہذب مگر جذباتی انسان تھے، بہت کم لوگوں سے ملتے لیکن جس سے بھی ملتے خلوص و محبت سے ملتے اور اپنے تعلقات کو حتی الامکان قائم رکھنے کی کوشش کرتے تھے۔ آپ کی شادی مسٹر سید حسن امام کی چھوٹی لڑکی اسمار امام سے ہوئی تھی اور ان کے بطن سے ایک لڑکا اور دو لڑکیاں پیدا ہوئیں۔ موصوف کے صاحبزادے مسٹر سید اکرام امام بیرسٹر ہو کر آئے اور پٹنہ ہائی کورٹ میں کام کرنے لگے۔ اس پیشے میں ابتدا ہی سے ترقی کرتے گئے، مگر حیات نے وفا نہ کی اور جوانی ہی میں فوت ہوگئے۔

مسٹر جعفر امام کی بڑی لڑکی کی شادی مسٹر حمید اللہ بیگ سے ہوئی جنھوں نے چیف جسٹس آف انڈیا ہو کر پنشن پائی۔ موصوف ۱۹۸۸ء میں انتقال کر گئے۔

جعفر بھائی اور اسمار باجی نے راقم سے زندگی بھر برادرانہ تعلق قائم رکھا۔ جب بھی میں ان لوگوں سے پٹنہ یا دلی میں ملنے جاتا تو دونوں میاں بیوی نہایت ہی خندہ پیشانی سے میرا خیر مقدم کرتے تھے۔ جب اکرام امام کا داخلہ کالج میں ہوا تو اسمار باجی نے مجھے اکرام کا مقامی گارجین بنوایا اور میں نے جہاں تک ممکن ہو سکا اس ذمہ داری کو نبھایا۔ مسٹر جعفر امام اور ان کی اہلیہ دونوں کو اکرام امام سے والہانہ محبت تھی جس کا مظاہرہ اکثر ہوا کرتا تھا۔ اکرام امام شروع ہی سے ایک اچھے مقرر تھے۔ ایک سال جاڑوں میں انگریزی بین المدارس مباحثہ منعقد ہوا جس میں اکرام امام نے

بھی شرکت کی تھی - میری ذمہ داری یہ تھی کہ مسٹر سید جعفر امام کی رہایش گاہ پر آ کر اکبر امام کو اپنے ساتھ لے جاؤں اور مباحثے کے ختم ہونے پر انھیں گھر بھی پہنچا جاؤں - مباحثہ قریب دس بجے رات کو ختم ہوا اور میں اکبر امام کو اپنے ساتھ لے کر قریب پونے گیارہ بجے رات کو جب جعفر بھائی کی رہایش گاہ پر پہنچا تو دیکھا کہ ماں اور باپ دونوں نہایت اضطرابی کیفیت میں ان کے آنے کے منتظر ہیں - میں نے اسما باجی کو ٹیلی فون پر تاخیر کی اطلاع دے دی تھی اور اس میں پریشانی کی کوئی وجہ نہ تھی -

مسٹر سید جعفر امام اور ان کی اہلیہ کا رہن سہن ہمیشہ مغربی طرز کا رہا لیکن اس کے باوجود دونوں میاں بیوی مذہب کا کافی احترام کرتے تھے - چنانچہ بیگم جعفر امام نے چار مرتبہ حج کیا اور زیارت مدینہ منورہ سے مشرف ہوئیں - اپنے سفر حج کا تذکرہ نہایت ذوق وشوق اور احترام سے کیا کرتی تھیں - انھوں نے جعفر امام صاحب کی موت کے چند سال بعد ۱۹۶۷ء میں پہلی مرتبہ حج کیا - اپنا دوسرا حج مسٹر جعفر امام کے لیے بطور حج بدل کیا - اور تیسرا حج اپنے والد مرحوم مسٹر سید حسن امام کے لیے کیا - موصوفہ جب بھی حج سے واپس آتیں تو فقرا کو خیرات دیتیں، ایک محفل میلاد النبی بھی منعقد کراتیں جس میں عام طور سے مولانا سید شاہ صبیح الحق صاحب عمادی پٹنہ سیٹی فضائل رسول صلی اللہ علیہ وسلم بیان کرتے تھے - نیز تقریباً دو ڈھائی سو لوگوں کی نہایت پرتکلف کھانوں سے تواضع کرتی تھیں - راقم بھی ان محفلوں میں شریک ہوا کرتا تھا -

پنڈت موتی لال نہرو مسٹر سید علی امام کے خاص دوستوں میں تھے - اسی تعلق کی بنا پر دہلی میں قیام کے دوران مسٹر سید جعفر امام پنڈت جواہر لال نہرو سے اکثر ملا کرتے تھے - پنڈت جی مسٹر جعفر امام سے بڑی محبت سے ملتے اور مسٹر جعفر امام بھی انھیں اپنا بڑا بھائی سمجھتے اور ان کا احترام کرتے تھے - پنڈت جواہر لال نہرو اور مسٹر جعفر امام دونوں نے ٹرینیٹی کالج کیمبرج میں مختلف زمانوں میں تعلیم پائی تھی -

مسٹر سید جعفر امام نے ۱۹۶۵ء میں انتقال کیا اور نیورہ کی مسجد کے احاطے میں دفن ہوئے - مسٹر جعفر امام کے قضا کرنے کے بعد بیگم جعفر امام تقریباً بیس سال زندہ رہیں - مسٹر سید حسن امام نے جو وقف علی الاولاد قائم کیا تھا موصوفہ اس وقف کا انتظام نہایت دانش مندی وخوبی سے کرتی رہیں اور مکانات بنا کر وقف کی جائداد میں اضافہ بھی کیا - بیگم جعفر امام اپنے عقائد کی پختگی، دانش مندی اور ہمت کے لیے مشہور تھیں - موصوفہ جب اپنے پہلے حج کی سعادت حاصل کر کے

پٹنہ واپس آئیں تو دوسرے ہی روز صبح سویرے مجھ سے ملنے آئیں۔ ان کے چہرے پر اس وقت خوشی کے آثار تھے اور مجھ سے فرمایا کہ میں یہ خوش خبری لے کر آئی ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے میرے حج کو قبول فرمایا۔ گرچہ یہ میرا یقین ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر حاجی کا حج قبول کرتا ہے مگر بلا وجہ میرے دل میں ایک وسوسہ پیدا ہو گیا تھا کہ میرا حج قبول ہوا یا نہیں۔ میں اسی ادھیڑ بن میں خانہ کعبہ کے سامنے بیٹھ کر رونے لگی اور قبولیت حج کے لیے دعا کی۔ جب میں مسجد حرام سے باہر آئی تو یہ وسوسہ شیطانی میرے دل سے نکل چکا تھا۔ میں سیدھے اپنے معلم کی رہایش گاہ پر خوشی خوشی واپس آئی۔ معلم کی بیوی خدیجہ نے میرے لیے پہلے سے پھولوں کا ایک گلدستہ تیار کر رکھا تھا اور اس گلدستے کو انھوں نے نہایت خوشی کے ساتھ "حج مبرور، حج مبرور" کہتے ہوئے میرے ہاتھوں میں دے دیا۔ اس واقعہ کے بعد مجھے بالکل یقین ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے قبولیت حج کا شرف بخشا ہے۔ میں اس وقت تمھارے پاس صرف اس خوش کن واقعہ کو سنانے آگئی ہوں اتنا کہا اور فوراً واپس چلی گئیں۔

موصوفہ کو دعاؤں کی قبولیت میں بڑا یقین تھا اور وہ اکثر کہا کرتی تھیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی بے شمار دعائیں قبول فرمائی ہیں۔ آج سے تقریباً گیارہ سال پہلے پٹنہ میں ایک تباہ کن سیلاب آیا تھا جس کی وجہ سے شہر کے اکثر حصوں میں کئی دنوں تک پانی بھرا رہا۔ اس زمانے میں موصوفہ راجندر نگر میں کرایہ کے ایک مکان میں رہا کرتی تھیں اور ان کے ساتھ ان کی ایک دائی اور ایک نوکر بھی رہا کرتے تھے۔ سیلاب کی تیزی دیکھ کر ان کی دائی اپنے گھر چلی گئی۔ رات کو سیلاب کا پانی اتنا بڑھا کہ یہ خدشہ محسوس ہونے لگا کہ پانی اب گھر میں داخل ہو جائے گا۔ موصوفہ اس صورت حال کو دیکھ کر نہایت پریشان ہوئیں اور اللہ سے دعا کی کہ پانی گھٹ جائے اور ان کے کمروں میں داخل ہو کر ان کی چیزوں کو برباد نہ کرے۔ دعا کرنے کے بعد کلام اللہ کو اپنے ہاتھوں میں لے کر بلند آواز سے کہا کہ اے نجس پانی اللہ کے حکم سے میرے کمروں میں داخل نہ ہو۔ یہ کہہ کر موصوفہ نے کلام اللہ مجید کے نسخے کو برآمدے میں ایک میز پر رکھ دیا اور زوردار آواز میں اپنے نوکر سے کہا کہ اس نجس پانی میں یہ طاقت نہیں ہے کہ اس میز کے پائے کو بھی چھو سکے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور صرف اتنا ہی نہیں بلکہ پانی گھٹتا ہی چلا گیا۔ ان کی اس بلند آواز کو ان کے ہمسایوں نے بھی سنا تھا اور مہینوں وہ لوگ مختلف انداز سے ان

کی بات پر ہنس ہنس کر تبصرہ کرتے رہے۔

ان تمام سنجیدگیوں کے باوجود موصوفہ کی باتیں اکثر دلچسپ بھی ہوا کرتی تھیں، جن کو لوگ اب تک ہنس ہنس کر یاد کرتے ہیں جب مسٹر سید جعفر امام سپریم کورٹ کے جج ہو کر دہلی گئے تو انھیں ان کی رہائش کے لیے ایک اچھا بڑا سا مکان ملا۔ یہ مکان کچھ دنوں سے خالی تھا اور بہت سے زہریلے سانپ اس گھر میں اور ارد گرد کے میدان میں بھی جمع ہو گئے تھے۔ اسی سبب سے لوگ اس مکان میں رہنا پسند نہیں کرتے تھے۔ گرچہ یہ مکان کافی آرام دہ تھا لیکن سانپوں کی کثرت کی بنا پر مسٹر جعفر امام کو پسند نہ آیا اور محکمہ تعمیرات عامہ سے شکایت کی کہ ان کے لیے کوئی دوسرا مکان تجویز کیا جائے مگر محکمہ تعمیرات نے ان کی باتوں پر کوئی توجہ نہ دی۔ بیگم جعفر امام کو محکمہ کی اس بے توجہی پر بہت غصہ آیا۔ چنانچہ انھوں نے ایک سپیرے کو بلوا کر اپنے احاطے کے چند زہریلے سانپوں کو پکڑوا دیا اور دوسری جگہوں سے چند اور سانپ پکڑوا کر منگوایا اور ان کو ایک جالی دار بکس میں بند کرا کے وزیر محکمہ تعمیرات عامہ کے گھر پر لے جا کر انھیں تحفتاً پیش کیا اور کہا کہ میرے مکان کے تمام کمرے ان سے سجائے جا چکے ہیں اب آپ بھی ان باقی ماندہ زہریلے سانپوں سے اپنے کمروں کو سجائیے۔ وزیر موصوف پر ان کی باتوں کا گہرا اثر ہوا اور گھبرا کر فوراً مسٹر جعفر امام کی رہائش کے لیے ایک دوسرا مکان تجویز کر دیا اور تمام سانپوں کو آگ میں جلوا دیا موصوفہ اسی طرح کی مزاحیہ باتوں سے اکثر موقعوں پر اپنا کام نکال لیا کرتی تھیں۔

گرچہ موصوفہ ایک بڑے باپ کی بیٹی، ایک نامور جج کی بیوی اور انگلستان کی تعلیم یافتہ تھیں مگر مزاج میں ذرا غرور نہ تھا۔ ہر شادی بیاہ اور دیگر تقریبات میں جہاں مدعو کی جاتیں ضرور شریک ہوا کرتیں مگر بعض اوقات غصہ میں آ کر جو کچھ منہ میں آتا بول جاتیں جس کا انھیں بعد میں احساس ہونے پر افسوس ہوتا تھا۔ مزاج کی یہ تیزی انھیں ورثہ میں ملی تھی۔ انگریزی اور ہندوستانی کھانا پکانے کا بھی اچھا شوق اور سلیقہ تھا۔ جب کبھی کسی کی دعوت کرتیں بڑے شوق سے مہمانوں کو کچھ نہ کچھ اپنے ہاتھوں کی پکائی ہوئی چیزیں ضرور کھلاتیں۔

موصوفہ زندگی کے آخری دور میں اکثر بیمار رہیں اور ان کی بہن کے صاحبزادے سید حسن سمیع ان کے علاج و معالجہ میں ہمہ تن مصروف رہے مگر مرض بڑھتا ہی گیا اور ستمبر ۱۹۸۴ء میں اسی برس کے سن میں قضا کر گئیں اور پولو روڈ کی قبرستان میں مدفون ہوئیں۔ راقم ان کی بیماری اور تجہیز و تکفین میں برابر شریک رہا۔ آپ کی وفات کے ساتھ مسلم خواتین کا ایک شاندار دور ختم ہو گیا۔

(پانچویں جج)

مسٹر جسٹس سید نقی امام

مسٹر سید نقی امام نیورہ خاندان کے پانچویں فرد تھے جنھیں حکومت ہند نے پٹنہ ہائی کورٹ کا جج مقرر کیا۔ آپ سر سید علی امام کے سب سے چھوٹے صاحبزادے تھے۔ ۳۰۔ اگست ۱۹۰۲ء کو موضع نیورہ ضلع پٹنہ میں پیدا ہوئے۔ سات برس کے سن میں سر سید علی امام نے موصوف کو تعلیم کی غرض سے انگلستان بھیجا۔ موصوف کی تعلیم انگلستان میں آکسفورڈ پریپریٹری اسکول اور ریسٹن پارک پبلک اسکول میں ہوئی جو اس زمانے میں وہاں کے مشہور اسکول تھے۔ ان اسکولوں میں موصوف نے مختلف امتحانات میں اچھی کامیابیاں حاصل کیں۔ یونیورسٹی کی تعلیم کے لیے کیمبرج یونیورسٹی میں داخلہ لیا اور وہاں سے بی۔ اے کی ڈگری ٹرائی پوس کے ساتھ حاصل کی۔ دوران تعلیم اساتذہ کو اپنی محنت اور ذہانت سے کافی متاثر کیا۔ کھیل کود میں بھی خوب حصہ لیتے تھے اور تیراکی سے آپ کو خاص لگاؤ تھا۔ عرصہ تک آپ لائف سیونگ سوسائٹی کے ممبر رہے۔ دو موقعوں پر دریا میں ڈوبتے ہوئے لڑکوں کی جان بچائی جس کے صلے میں ایک سونے کا اور ایک چاندی کا تمغہ عطا ہوا جن کو موصوف نے اپنے پاس بڑی حفاظت سے رکھا تھا اور ان تمغوں کو اکثر موقعوں پر بہت ہی فخر سے دکھایا کرتے تھے۔ معلوم نہیں یہ تمغے اب کہاں ہیں۔ مڈل ٹمپل سے بیرسٹری کا امتحان پاس کیا اور ہندوستان واپس آکر پٹنہ ہائی کورٹ میں بیرسٹری کرنے لگے۔ بیرسٹری کے ساتھ ساتھ عام سیاست میں بھی حصہ لینا شروع کیا۔ بہار لیجس لیٹو کونسل کے ممبر ہوئے اور ۱۹۳۷ء سے ۱۹۴۰ء تک اس کونسل کے نائب صدر رہے کچھ عرصہ تک A.I.L.T.A کے بہار دار لہ شاخ کے سکریٹری رہے۔ کیمبرج سے بی۔ اے کی ڈگری تواریخ میں حاصل کرنے کے بعد موصوف کی بڑی خواہش تھی کہ آئی۔ سی۔ ایس ہو جائیں یا انھیں برطانوی فوج میں کمیشنڈ آفیسر کی جگہ مل جائے جس کے لیے آپ صحت، رنگ و روپ اور قد و قامت کے لحاظ سے نہایت موزوں تھے، مگر سر سید علی امام نے انھیں برطانوی فوج میں آفیسر ہونے سے روک دیا۔ چار و ناچار موصوف کو بیرسٹری کا پیشہ اختیار کرنا پڑا جس میں وہ ابتداء میں کچھ زیادہ کامیاب نہ ہو سکے۔ اس ناکامی کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ موصوف جب ہندوستان واپس آئے تو ہندی اور اردو زبان سے بالکل ناواقف تھے۔ اضلاع کی عدالتوں میں ہندی رائج تھی اس لیے یہاں کام کرنا

ان کے لیے دشوار تھا۔ ہائی کورٹ میں کل کام انگریزی میں ہوا کرتے تھے، اس لیے موصوف کو ہائی کورٹ میں کافی مشغولیت رہا کرتی تھی اور مقدمات میں کامیاب بھی ہوا کرتے تھے۔ بعد ازاں بڑی محنت اور شوق کے ساتھ موصوف نے اردو و ہندی سیکھی اور مہارت حاصل کی۔ موصوف کو خط نستعلیق کی خوب صورتی بہت پسند تھی چنانچہ اپنے بنگلے (واقع فریزر روڈ) کے دروازے پر اپنے نام کا جو بورڈ لگایا وہ اردو خط نستعلیق ہی میں تھا۔ اس کے علاوہ کوئی دوسرا بورڈ ہندی یا انگریزی کا نہ تھا۔ موصوف کو حکومت بہار نے ۱۹۴۰ء میں ضلع جج مقرر کیا۔ اس عہدے پر آپ نے چودہ برس تک نہایت ہی ایمانداری، محنت اور کامیابی کے ساتھ اپنے فرائض کو انجام دیا۔ موصوف کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ آپ کبھی بھی فیصلوں کے صادر کرنے میں دیر نہ کیا کرتے جو عام طور سے ضلع عدالتوں میں ہوا کرتا ہے۔ صاحب موصوف نے مختلف اضلاع میں بحیثیت جج کام کیا۔ مونگیر اور پٹنہ کی ضلع عدالتوں میں جو بہت سی خرابیاں آگئی تھیں انھیں دور کیا۔ جب موصوف اجلاس میں آکر بیٹھ جاتے تو کسی کی مجال نہ ہوتی کہ شور و غل کرے۔ تمام کام نہایت ہی سنجیدہ ماحول میں ہوا کرتے اور ان کی وجیہ شخصیت اجلاس کے ماحول کو بےحد متاثر کیا کرتی تھی۔ مسٹر سید نقی امام کو حکومت نے ۱۹۴۹ء میں رجسٹرار پٹنہ ہائی کورٹ مقرر کیا جس عہدے پر آپ ۱۹۵۲ء تک فائز رہے۔ ہائی کورٹ میں رجسٹرار کا عہدہ ایک کلیدی عہدہ ہے جس میں کاموں کو نہایت سرعت اور ذمہ داری سے انجام دینا پڑتا ہے۔ موصوف نے ان تمام ذمہ داریوں کو جو اس عہدے سے وابستہ ہیں نہایت خوبی سے انجام دیا اور کبھی بھی مقررہ قاعدوں سے انحراف نہ کیا۔ ۱۹۵۴ء میں ہائی کورٹ کے جج مقرر ہوئے اور ۱۹۵۹ء تک جب تک وہ بقید حیات رہے اس عہدے پر نہایت ہی خوبی سے اپنے فرائض انجام دیتے رہے۔ فوجداری اور دیوانی دونوں کے مقدموں میں ان کے فیصلے قابلانہ ہوا کرتے تھے۔ موصوف نے بچپن سے ہی انگلستان میں تعلیم پائی تھی اس لیے آپ انگریزی نہایت ہی شستہ اور قلم برداشتہ لکھا کرتے تھے اور آپ کے کل فیصلے بہت دل چسپ ہوا کرتے تھے۔ وکلا کا یہ عام دستور ہے کہ جب ان کے مقدمات کمزور ہوتے ہیں تو جج کے سامنے طویل بحثیں کرتے ہیں اور بلا ضرورت دور از کار نظائر کو پیش کر کے جج کو متاثر کرنا چاہتے ہیں اور فیصلے کو اپنے حق میں صادر کرانے کی ہر ممکن کوشش کرتے ہیں۔ مسٹر جسٹس نقی امام کو اس طریقۂ کار سے سخت نفرت تھی اور وکیلوں کو فضول بحث کرنے سے روک دیا کرتے تھے۔ مسٹر جسٹس شمبھو پرشاد سنگھ جج پٹنہ ہائی کورٹ نے اپنے ایک مضمون میں

مسٹر نقی امام کے دو دلچسپ واقعات کو لکھا ہے۔ چنانچہ موصوف لکھتے ہیں کہ ایک مرتبہ مسٹر جسٹس نقی امام کے اجلاس میں ایک وکیل نے اپنی بحث کے دوران ایک ایسی نظیر پیش کی جس کا اس مقدمے سے کوئی تعلق نہ تھا۔ مسٹر نقی امام نے وکیل صاحب سے کئی بار کہا کہ آپ کے مقدمے کا اس نظیر سے کوئی تعلق نہیں، لیکن جب وکیل صاحب نے موصوف کی باتوں پر کوئی دھیان نہ دیا تو مسٹر نقی امام نے کہا کہ یہ کتاب جس سے آپ بحث کر رہے ہیں مجھے دے دیں تاکہ میں اس کو پھینک دوں۔ وکیل صاحب نے جواب دیا کہ یہ کتاب میری نہیں ہے بلکہ ایڈووکیٹس لائبریری سے لایا ہوں۔ یہ کہہ کر وکیل صاحب کو اپنی فضول بحث ختم کر دینی پڑی۔ دوسرا واقعہ بھی کچھ اسی طرح کا ہے۔ مسٹر جسٹس نقی امام مسٹر جسٹس بی۔ پی۔ جمعدار کے ساتھ ایک مقدمے کی سماعت میں مصروف تھے۔ موصوف نے وکیل صاحب کو جو اس مقدمے میں بحث کر رہے تھے کئی غیر متعلقہ باتوں کو کہنے سے روکا مگر وہ بحث کرتے رہے۔ مسٹر نقی امام وکیل صاحب کے رویئے سے بددل ہو کر اجلاس کے دروازے کو کھولا اور بذریعہ لفٹ نیچے اپنے کمرے میں چلے گئے۔ باوجود ان سب باتوں کے مسٹر نقی امام کا وکیلوں کے ساتھ بڑا اچھا تعلق تھا اور وکلا بھی ان سے خوش رہا کرتے تھے۔

مسٹر نقی امام کو سیاحی کا بڑا شوق تھا۔ انگلستان کے قیام کے زمانے میں آپ نے یورپ کے بہت سے ممالک کا سفر کیا اور وہاں کے تاریخی مقامات کو دیکھا۔ موصوف کو یورپ میں فرانس اپنی تاریخی حیثیت اور قدرتی مناظر کی وجہ سے بہت پسند تھا۔ وہ وہاں کی زبان و تہذیب کے بڑے مداح تھے۔ اور آپ فرانسیسی موسیقی کو بھی بہت پسند کرتے تھے۔ مصر اور مغربی ایشیا کے چند اسلامی ممالک کا بھی سفر کیا۔ موصوف نے ۱۹۳۵ء میں جب وہ بالکل جوان تھے اپنا فریضۂ حج ادا کیا اور مدینہ منورہ کی زیارت سے مشرف ہوئے۔ اپنے اس سفر کا حال موصوف نہایت ذوق وشوق سے بیان کیا کرتے تھے۔ مسٹر نقی امام گورے رنگ، لمبے قد اور ایک اچھے ناک نقشے کے انسان تھے۔ مزاج میں شگفتگی تھی اور بسا اوقات ایسا قہقہہ لگایا کرتے تھے کہ لوگ دور ہی سے سمجھ جاتے تھے کہ مسٹر نقی امام اس مجلس میں موجود ہیں۔ موصوف ایک نہایت مخلص انسان تھے اور جو بھی ان سے ملتا ان کے خلوص سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہتا۔ سر سید علی امام ان کے لڑکپن کے زمانے میں پیار سے انھیں اکثر "سفید دیو" کہہ کر پکارا کرتے تھے اور خان بہادر بشیر الدین شفقت سے انھیں "مغلا" کہتے تھے۔ راقم کے سامنے پٹنہ ہائی کورٹ کے ججوں کا ایک گروپ فوٹوگراف ہے جو ۲۶ جنوری

۱۹۵۰ء میں لیا گیا ہے۔ اس تصویر میں مسٹر سید نقی امام جو اس وقت رجسٹرار تھے اپنے بھائی مسٹر جسٹس جعفر امام کی پشت پر کھڑے ہیں۔ موصوف اس تصویر میں اپنی شخصیت اور بلند و بالا قد کی وجہ سے سب سے نمایاں نظر آتے ہیں۔ آپ راقم کے ہم عمر تھے اور اپنی زندگی کے آخری لمحوں تک مجھ سے نہایت ہی محبت اور خلوص سے ملتے رہے۔ راقم جب کبھی انھیں پٹنہ کالج کے جلسوں میں مدعو کرتا تو وہ ضرور تشریف لاتے تھے۔ مسٹر نقی امام ایک نہایت ہی صابر انسان تھے۔ انھوں نے اپنے جگر کے سرطان کی بیماری کو نہایت ہی ضبط و تحمل سے آخری وقت تک برداشت کیا۔ بیماری کے آخری دور میں جب وہ پٹنہ میڈیکل کالج کے ہسپتال میں زیر علاج تھے تو راقم ان کی عیادت کے لیے گیا اور موصوف کو بالکل راضی برضائے الٰہی پایا۔ موصوف نے جب میرے چہرے پر پریشانی کے آثار دیکھے تو برجستہ راقم سے مخاطب ہو کر "کل نفس ذائقۃ الموت" کی آیت مبارکہ پڑھی اور پھر خود بھی کچھ خاموش ہو گئے۔ مگر پھر چند ہی لمحوں بعد ادھر ادھر کی باتوں سے مجھے خوش کرنے کی کوشش کی۔ مرض بڑھتا گیا اور علاج کے لیے کلکتہ جانا پڑا اور وہیں انتقال کیا۔ آپ کا انتقال ۵ فروری ۱۹۵۹ء کو ہوا۔ اور نیورہ کی مسجد کے احاطے میں دفن ہوئے۔

مسٹر نقی امام کی شادی ۱۹۴۱ء میں خان بہادر ڈاکٹر ولی احمد سول سرجن کی صاحبزادی عزیزہ سے ہوئی۔ خان بہادر ڈاکٹر ولی احمد مولانا محمد شفیع داؤدی ممتاز مسلم لیڈر کے چھوٹے بھائی تھے۔ مسٹر نقی امام کی اولاد میں ایک لڑکا اور ایک لڑکی ہیں۔ موصوف کے صاحبزادے کا نام سید عسکری امام اور صاحبزادی کا نام تزئین فاطمہ ہے، جو دہلی میں فارغ البالی کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ بیگم عزیزہ امام دس سال تک راجیہ سبھا کی ممبر رہیں اور ابھی تک سیاست میں حصہ لیتی ہیں۔ چند سال قبل حج کیا اور مدینہ منورہ کی زیارت سے مشرف ہوئیں۔ جب مسٹر نقی امام علاج کے لیے کلکتہ جانے لگے تو راقم ان کی عیادت کے لیے گیا۔ موصوف کا شاداب چہرہ مرجھا چکا تھا اور موت کے تمام آثار نمایاں تھے۔ جب میں واپس آنے لگا تو موصوف نے نہایت مایوسی کے ساتھ مجھ سے کہا کہ مجھے مرنے کا کوئی غم نہیں مگر اس بات کا غم ضرور ہے کہ میں اپنی موت کے بعد ایک جوان بیوی اور دو بچوں کو چھوڑ جاؤں گا۔ راقم ان کی اس ذہنی الجھن سے بیحد متاثر ہوا۔ اور شدت جذبات سے کچھ کہہ نہ سکا۔ موصوف کو سلام علیک کہا اور واپس چلا آیا۔ مرحوم سے یہ میری آخری ملاقات تھی۔

(چھٹے جج)

مسٹر جسٹس سید وصی الدین

مسٹر سید وصی الدین نیورہ خاندان کے چھٹے ہائی کورٹ کے جج ہوئے۔ موصوف ایک درویش صفت انسان خان بہادر سید ظہیر الدین کے پوتے اور خان بہادر سید بشیر الدین سابق جج و ممبر جوائنٹ پبلک سروس کمیشن کے صاحبزادے ہیں۔ آپ کی پیدائش ۲۴ر اپریل ۱۹۱۰ء کو نیورہ ضلع پٹنہ میں ہوئی۔ موصوف کی ابتدائی تعلیم پہلے گھر پر ہوئی اور اس کے بعد کچھ عرصے تک اپنے لڑکپن کے زمانے میں سینٹ جوزف کونونٹ پٹنہ میں بھی پڑھا۔ اسکول کی تعلیم رام موہن رائے سمینری پٹنہ میں ہوئی۔ آئی۔اے اور بی اے کے امتحانات نیو کالج اور پٹنہ کالج سے پاس کیا۔ پٹنہ لاء کالج سے بی۔ایل کی ڈگری حاصل کی۔ مزید قانون کی تعلیم کے لیے لندن گئے اور ایک سال وہاں رہ کر اپنی قانون دانی میں اضافہ کیا۔ حکومت بہار نے ۱۶۔مارچ ۱۹۳۷ء کو انھیں منصف مقرر کیا اور آپ نے اپنے کام کی ابتدا مظفر پور سے کی۔ موصوف نے بہار کے مختلف اضلاع میں بحیثیت منصف اور صدر اعلیٰ اپنے فرائض کو نہایت ہی خوبی اور کامیابی سے انجام دیا اور ترقی کر کے ضلع جج ہوئے۔ ضلع جج کے فرائض کو بھی موصوف نے جولائی ۱۹۶۵ء تک نہایت ہی کامیابی سے انجام دیا اور جولائی ۶۵ء میں پٹنہ ہائی کورٹ کے رجسٹرار مقرر ہوئے۔ ۲۲۔اپریل ۱۹۶۸ء کو حکومت ہند نے صاحب موصوف کو پٹنہ ہائی کورٹ کا جج مقرر کیا اور آپ ۲۴۔اپریل ۱۹۷۲ء تک پٹنہ ہائی کورٹ کے جج رہے۔ مسلمان منصفوں میں آپ پہلے منصف ہیں جنھیں ہائی کورٹ کے جج ہونے کا شرف حاصل ہوا۔ پنشن پانے کے بعد موصوف جموں و کشمیر ہائی کورٹ کے ایڈہوک جج مقرر ہوئے اور اس عہدے پر ۲۴۔اگست ۱۹۷۲ء سے ۲۳۔اگست ۱۹۷۴ء تک کام کیا۔ صاحب موصوف کی صلاحیت کو مدنظر رکھتے ہوئے بہار گورنمنٹ نے انھیں گرتھا پبلک انکوائری کمیشن کا واحد ممبر مقرر کیا۔ اس کے علاوہ انھیں ایک اور پبلک انکوائری کمیشن کا دو دوسرے ججوں کے ساتھ ممبر بنایا گیا۔ سپریم کورٹ آف انڈیا نے ذکیہ آفاق اسلامیہ کالج سیوان کے معاملات کی تفتیش کے لیے ایک کمیشن مقرر کیا اور آپ اس کے واحد ممبر مقرر ہوئے۔ پنشن پانے کے بعد صاحب موصوف مختلف قومی اور ملی کاموں میں حصہ لیتے رہے ہیں۔ بہار جوڈیشیل آفیسرس ایسوسی ایشن نے موصوف کو تین سالوں

تک مسلسل صدر منتخب کیا اور آپ بہار مسلم ایجوکیشنل کانفرنس پٹنہ کے نائب صدر اور صدر رہ چکے ہیں موصوف سماج کلیان سمیتی پٹنہ کے نائب صدر اور یتیم خانہ انجمن خادم الاسلام کے صدر ہیں ۔ ان اداروں کے علاوہ صاحب موصوف اورینٹل کالج کی مجلس انتظامیہ کے ممبر ہیں اور مسلم فنڈ ٹرسٹ و مسلم ایجوکیشنل اینڈ ویلفیر سوسائٹی سے بھی آپ کا گہرا تعلق ہے ۔ آپ کا جن اداروں سے تعلق رہا انھیں اپنی قابلیت اور اعلیٰ رہنمائی سے کافی فائدہ پہنچایا ہے ۔

بحیثیت حاکم عدالت مسٹر سید وصی الدین نے منصفی کے عہدے سے لے کر ہائی کورٹ کی ججی تک اپنے فرائض منصبی کو نہایت محنت ایمانداری اور بے باکی سے انجام دیا ۔ انگریزوں کے دور حکومت میں اپنے کاموں کی عمدگی کی بدولت ممتاز رہے اور آزادی کے بعد بھی حکومت بہار نے ان کی قدر دانی میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی اور صاحب موصوف اپنی بہترین کارکردگی کی بنا پر روز افزوں ترقی کرتے رہے ۔ بہار میں بعض موقعوں پر ایسا ہوتا آیا ہے کہ حاکم کو حکومت کے اشاروں پر چلنا پڑا ہے مگر صاحب موصوف کبھی بھی حکومت کے خیالات سے متاثر نہ ہوئے اور اپنے فیصلوں میں ایسی کوئی قانونی کمزوری نہ دکھائی جس سے عوام الناس ان پر شبہہ کی نظر ڈال سکیں ۔ آپ کے تمام فیصلے ایمانداری اور قانون کی برتری پر مبنی ہوا کرتے تھے ۔ اس طرح آپ نے نیورہ خاندان کی قدیم روایت کو برقرار رکھا ۔ یہ آپ کی بلند کرداری کا ایک بین ثبوت ہے ۔

مسٹر سید وصی الدین کے فیصلے اکثر دلچسپ ہوا کرتے تھے ۔ ایک ممتاز سنہالی خاتون کی شادی بہار کے ایک نامی آدیباسی لیڈر سے ہوئی تھی ۔ موصوفہ نے پارلیامنٹ کے لیے ایک آدیباسی حلقے سے انتخاب میں حصہ لیا اور کامیاب بھی ہوئیں ۔ شکست خوردہ امیدوار نے ہائی کورٹ میں ایک مقدمہ دائر کیا کہ موصوفہ کی کامیابی کو کالعدم قرار دیا جائے کیونکہ وہ آدیباسی نہیں ہیں اور یہ حلقہ آدی باسیوں کے لیے مخصوص ہے ۔ مقدمہ مسٹر سید وصی الدین کے اجلاس میں پیش ہوا اور جانبین سے وکلاء نے لمبی لمبی بحثیں کیں ۔ مسٹر وصی الدین نے موصوفہ کی کامیابی کو برقرار رکھا اور اپنے فیصلے میں یہ تحریر فرمایا کہ موصوفہ کی شادی ایک آدی باسی فرد سے تمام قدیم مخصوص آدی باسی رسومات کے ساتھ ہوئی ہے ، اس لیے بلاشبہہ موصوفہ آدی باسی ہیں اور اپنا فیصلہ موصوفہ کے حق میں صادر کیا ۔ آپ کا فیصلہ سپریم کورٹ نے بھی برقرار رکھا ۔ اخباروں نے موصوف کے فیصلے کو نہایت ہی اہمیت اور دلچسپی کے ساتھ شائع کیا ۔

مسٹر سید وصی الدین کا رنگ گورا اور قد متوسط ہے۔ مزاج میں ذرا بھی غرور نہیں ہے اور نہایت ہی ہنس مکھ اور مخلص انسان ہیں۔ ہر کسی سے چاہے وہ بڑا ہو یا چھوٹا نہایت خندہ پیشانی سے ملتے ہیں۔ اعلیٰ ظرفی اور ایثار کا یہ عالم ہے کہ آپ ہر شادی بیاہ اور دیگر تقریبات میں جہاں کہیں بھی مدعو کیے جاتے ہیں نہایت ہی شوق اور پابندی سے شرکت کرتے ہیں۔ اپنے والدین کے اکلوتے لڑکے ہونے کی وجہ سے موصوف کی پرورش نہایت ہی نازونعم میں ہوئی۔ اسکول جانے کے لیے موصوف کے والد صاحب نے ایک ٹٹو آپ کے لیے خرید رکھا تھا جس پر سوار ہو کر اسکول جاتے گاندھی میدان اور دیگر مقامات پر بھی اپنی تفریح کے لیے اسی ٹٹو سے جایا کرتے تھے۔ اسکول کی تعلیم کے دوران آپ شیروانی، پائجامہ اور ترکی ٹوپی پہنا کرتے جو اس زمانے میں مسلمان لڑکوں کا عام لباس تھا۔ بعد میں اس لباس کو ترک کر کے انگریزی لباس پہننے لگے اور آج تک انگریزی لباس ہی استعمال کرتے ہیں۔ موصوف نے اپنے تمام کاموں میں نیورہ خاندان کی قدیم روایات کو ہمیشہ ملحوظ رکھا ہے اور اپنے اسلاف کی طرح ہر حلقے میں ہر دل عزیز ہیں۔

مسٹر سید وصی الدین کی شادی اپنے ہی خاندان میں ہوئی ہے۔ موصوف کی اہلیہ خان بہادر سید نصیر الدین مرحوم، سابق وزیر مالیات بھوپال اسٹیٹ کی پوتی اور مسٹر سید رضی الدین مرحوم بیرسٹر و سب جج کی صاحبزادی ہیں۔ موصوفہ ایک نہایت ہی منکسر المزاج اور خلیق خاتون ہیں۔ مذہبی مزاج پایا ہے اور غربا و مساکین کی مدد فراخ دلی کے ساتھ کرتی ہیں۔ آپ کے بطن سے ایک صاحبزادی پیدا ہوئیں جن کی شادی ڈاکٹر سید جمال اشرف سے ہوئی ہے۔ ڈاکٹر صاحب موصوف اپنے پیشے میں نہایت کامیاب ہیں اور اچھی شہرت رکھتے ہیں۔ سید وصی الدین کی اہلیہ راقم کا بڑا احترام کرتی ہیں اور میں بھی ان کی بڑی عزت کرتا ہوں۔ چند سال ہوئے موصوفہ نے حج کیا اور مدینہ منورہ کی زیارت کی سعادت حاصل کی۔

جی سے پنشن پانے کے بعد مسٹر سید وصی الدین نے حج بیت اللہ کیا اور مدینہ منورہ کی زیارت سے سرفراز ہوئے۔ آج کل اپنے شاندار مکان واقع بنک روڈ میں مقیم ہیں۔ موصوف اپنے اوقات کو اللہ تعالیٰ کی عبادت و ریاضت اور کتب بینی میں صرف کرتے ہیں۔ خلق خدا کی خدمت کو اپنے لیے نجات کا سبب سمجھتے ہیں اور مشکل وقتوں میں ہر کس و ناکس کی مدد کرنے میں کوئی دریغ نہیں کرتے۔ اللہ تعالیٰ موصوف کو عرصہ دراز تک صحت اور خوشی کے ساتھ

خدمت خلق کے لیے زندہ رکھے۔ جوانی کے زمانے میں راقم کے ددیہال اور ننہیال ملاکر تقریباً
تیس بھائی تھے۔ لے دے کر اب راقم کے صرف سات بھائی رہ گئے ہیں۔ اللہ ان کو خوشحال
وآباد رکھے۔

مسٹر وصی الدین کو پیار و محبت سے سب لوگ "وصو" کہتے ہیں اور خاص و عام میں
اسی نام سے یاد کیے جاتے ہیں۔ موصوف جب جموں وکشمیر ہائی کورٹ کے جج مقرر ہوئے تو مسٹر
سید حیدر امام صاحب بیرسٹر نے ان کے اعزاز میں پیلیس ہوٹل میں ایک ڈنر دیا جس میں
تقریباً ایک سو مہمان شریک ہوئے۔ ڈنر کے خاتمے پر بھائی سید حیدر امام صاحب نے اپنی تقریر
میں موصوف کو "وصو" ہی کہہ کر مخاطب کیا۔ اس کے بعد جن لوگوں نے بھی تقریریں کیں موصوف کو
"وصو" ہی کہا۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ موصوف کا یہ پیارا نام تمام لوگوں میں کتنا معروف و مشہور
ہے۔ اللہ تعالیٰ انھیں ان کے اس پیارے نام کے ساتھ عرصہ دراز تک تمام لوگوں میں محبوب رکھے۔

؎ تم سلامت رہو ہزار برس
ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

حرفِ آخر

اللہ تعالیٰ نے انسان کی ہدایت کے لیے دنیا میں بہت سے پیغمبروں کو بھیجا مگر پیغمبر آخرالزماں حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے توحید اور انسان کامل کا جو تصور پیش فرمایا وہ کسی اور مذہب میں موجود نہیں ہے۔ اللہ کا شکر ہے کہ اس نے مجھے ایک ایسے خاندان میں پیدا کیا جس کا مذہب اسلام تھا اور جس کے افراد سچے اور پکے مسلمان تھے۔ میں نے ہوش سنبھالتے ہی اپنے بزرگوں سے سچائی، ایمان داری، اخوت، مساوات، ہمدردی، رواداری، بردباری اور چشم پوشی کے عملی اسباق پڑھے۔ میرے والد محترم نے میری ایسی مذہبی تربیت کی تھی کہ مذہب اسلام میرے دل و دماغ پر مرتسم ہو گیا۔ والد محترم مجھے قرآن کے احکام پر برابر قائم رہنے کی تاکید کیا کرتے تھے۔ اور میں نے اللہ کے فضل سے زندگی بھر احکام الٰہی پر ثابت قدم رہنے کی کوشش کی۔ اقبال نے خوب کہا ہے :

گر تو می خواہی مسلماں زیستن
نیست ممکن جز بقرآں زیستن

برخلاف دیگر مذاہب کے اسلام نے خالق و مخلوق اور رسول و امت رسول کے درمیان ایک نہایت ہی متوازن تعلق قائم رکھا ہے جس کے نتیجے میں رسول صلعم نہایت ہی اعلیٰ مقام رکھنے کے باوجود عبدیت کے حدود سے آگے نہیں بڑھ سکتے۔ چنانچہ مسلمان رسول صلعم سے بے پایاں محبت تو کرتا ہے مگر اس کے ذہن میں ہمیشہ عَبْدُہٗ وَ رَسُوْلُہٗ کا تصور موجود رہتا ہے۔

بہار کی بیشتر آبادی غیر مسلموں کی ہے جو قرآنی احکام اور اسلام کی خوبیوں سے بالکل ہی ناواقف ہیں، اور مسلمانوں کا بھی ایک طبقہ شرک و بدعت کی لعنت میں گرفتار ہے اور اپنی ناواقفیت کی بنا پر اپنے اس غلط طرز عمل کو اسلام سمجھتا ہے۔ ایسے مسلمانوں کے طرز عمل سے غیر مسلموں کو غلط فہمی ہوتی ہے کہ شاید یہی اصل اسلام ہے اور پھر انھیں اپنے اور مسلمانوں کے عقائد میں کوئی خاص فرق محسوس نہیں ہوتا۔ لہٰذا یہ لوگ اسلام کے عملی اصولوں سے ناآشنا رہ جاتے

ہیں۔ ظلمت کے اس دور میں مسلمانوں کا یہ فرض ہے کہ وہ پہلے خود اسلامی اصولوں پر مکمل طور سے عمل پیرا ہوں اور پھر دانائی اور خلوص کے ساتھ اسلامی تعلیمات خصوصاً امن و امان، بھائی چارگی اور برابری کی تعلیمات کو ہر غیر مسلم کے سامنے پیش کریں تاکہ وہ اسلام کو اصلی شکل میں دیکھ کر اس کی طرف راغب ہو۔

بہار کے ہندوؤں میں ایک بڑا طبقہ ان لوگوں کا ہے جو "پس ماندہ" یا "ہریجن" کہے جاتے ہیں۔ اس جدید اور ترقی یافتہ دور میں بھی اکثر برہمن ان ہریجنوں کے سایہ سے نجس ہو جاتے ہیں اور ہندو سماج میں ان کا کوئی مقام نہیں۔ بھلا ہو گاندھی جی کا جنھوں نے ان "پچھڑے ورگ" کے لوگوں کی حالت کو سدھارنے اور انھیں ہندو سماج میں بہتر جگہ دلانے کی کوشش کی۔ مگر آج تک ان لوگوں کو ہندو سماج نے وہ درجہ نہ دیا جو گاندھی جی ان کے لیے چاہتے تھے۔ چنانچہ یہ پس ماندہ طبقہ اب تک اچھوت ہی رہا اور ہمیشہ ظلم و ناانصافی کا شکار رہا۔ اونچی ذات والوں نے انھیں اپنے سے پورے طور پر الگ رکھا ہے۔ اس بدنصیب طبقے کے لوگ اونچی ذات والوں کے ساتھ نہ عبادت کر سکتے ہیں نہ زندگی گزار سکتے ہیں نہ کھا پی سکتے ہیں اور شادی بیاہ کا تصور تو ایک ناممکن چیز ہے۔ اس دور میں اونچی ذات والوں کے جو مظالم "ہریجنوں" پر وقتاً فوقتاً ہوتے رہتے ہیں ان کی داستانیں اخبارات میں چھپتی رہتی ہیں اور یہ نہایت ہی شرمناک بات ہے۔ اونچی ذات والوں کے اس نار وا اور تشدد آمیز عمل سے سماجی اتحاد اور قومی یک جہتی کو سخت نقصان پہنچتا ہے اور یہ بہار کی سیاست کی نااہلیت کا ایک بیّن ثبوت ہے۔ اسلام ہی وہ مذہب ہے جس میں رنگ و نسل، ذات پات یا کسی اور بنیاد پر تفریق کی کوئی گنجائش نہیں۔ اسلام کی ان ہی خوبیوں کو دیکھ کر پس ماندہ طبقوں کے افراد اکثر مقامات پر مشرف بہ اسلام ہوئے اور وہ اس طرح تمام قدیم سماجی بندشوں سے نجات پا کر مساوات، اخوت اور سکون کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ اسلام ہی اس بدنصیب طبقے کے لوگوں کو ذلت اور پستی کی زندگی سے نجات دلا سکتا ہے۔

بہار کا خطہ زمانہ قدیم سے روحانیت اور علم و عرفان کا گہوارہ رہا ہے۔ یہاں کے لوگ فطری طور پر امن پسند ہیں اور مہمان نوازی ان کا شیوہ رہا ہے۔ عرصہ دراز تک ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان ہمیشہ بھائی چارگی کا رشتہ رہا۔ ہندوؤں کے ہر بڑے گاؤں میں مسلمانوں کے

دوچار گھر ضرور آباد تھے۔ عام طور سے ہندو ان کے ساتھ بڑی شفقت سے پیش آتے تھے اور مسلمانوں کو کبھی تنہائی کا خوف یا اقلیت کا احساس نہیں ہوا۔ یہ لوگ ایک دوسرے کی خوشی اور غم میں برابر کے شریک رہے حتیٰ کہ اکثر جگہوں میں مسلمانوں اور ان ہندوؤں کے مُردے جن کے یہاں میت کو دفن کرنے کی رسم رائج ہے، ایک ہی قبرستان میں دفن کیے جاتے تھے جس کی مثال پٹنہ کا پیر موہانی قبرستان ہے۔ یہاں آج بھی ہندوؤں اور مسلمانوں کے مردے دفن کیے جاتے ہیں۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران اور اس کے بعد بہار میں مختلف تحریکیں وجود میں آئیں اور اپنے مفاد کی خاطر سیاسی اور مذہبی رہنماؤں نے عوام کو غارت گری اور ہنگامہ خیزی پر اکسایا۔ چنانچہ ۱۹۴۶ء میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان زبردست تصادم ہوئے جن میں بے شمار بے گناہوں کا قتل ہوا۔ مختلف گاؤں کے مسلمان کثیر تعداد میں اپنے املاک اور آبائی مکانوں کو چھوڑ کر یا تو شہروں میں آباد ہو گئے یا ان علاقوں میں چلے گئے جہاں پاکستان قائم ہونے والا تھا۔ جب ملک کی تقسیم ہوئی اور پاکستان وجود میں آیا تو وہاں جانے والوں کی تعداد میں مزید اضافہ ہوا اور ہندوؤں کی مسلمانوں سے منافرت بڑھ گئی۔ اس مصیبت کے دور میں کسی ہندو لیڈر نے نہ مسلمانوں کی دل جوئی کی اور نہ انھیں بہار میں رہنے اور باعزت زندگی گزارنے پر آمادہ کیا۔ چنانچہ بہار کے بے یار و مددگار مسلمانوں کی بھگدڑ کا یہ سلسلہ سقوطِ مشرقی پاکستان تک جاری رہا۔ مسلم لیگ کی سیاست نے عام طور سے بہار کے مسلمانوں کو پست ہمت بنا کر انھیں سخت نقصان پہنچایا اور گھر بار چھوڑ کر مشرقی پاکستان چلے جانے کی ترغیب دی۔ فسادات کے بعد مسلم لیگی رہنماؤں نے ان بے چاروں سے مختلف قسم کے وعدے کیے اور ان لوگوں کو کثیر تعداد میں مشرقی پاکستان روانہ کر دیا۔ ان مظلوم اور بے خانماں مسلمانوں کو صرف اپنی جان بچانے کی فکر تھی۔ ملک چھوڑ کر مشرقی پاکستان گئے اور کچھ عرصہ کے بعد انھیں لوگوں کے ہاتھوں جان گنوائی جنھیں یہ لوگ اپنا محافظ اور ہمدرد سمجھتے تھے۔ آج بھی یہ مسلمان بنگلہ دیش میں مصیبت کی زندگی گزار رہے ہیں اور دنیا میں ذلت کے ساتھ "بہاری" کے نام سے پکارے جاتے ہیں۔ یہ لوگ ان وعدوں کو بھول گئے تھے جو اللہ تعالیٰ نے مومنوں کے ساتھ کیے ہیں:

مسلم استی سینہ را از آرزو آباد دار

ہر زماں پیشِ نظر لَا یُخْلِفُ الْمِیْعَاد دار

۱۸۵۷ء کے بعد تقریباً سو سال تک یعنی جب تک کہ زمین داری کا خاتمہ نہ ہوا بہاری مسلمانوں کا معاشرہ زمین دارانہ رہا اور اس معاشرہ کی جو کچھ خرابیاں ہوتی ہیں اس دور کے مسلمان زمین داروں میں بھی موجود تھیں۔ سب سے بڑی خرابی یہ تھی کہ ان زمین داروں نے اپنی اولاد کو جدید اور سائنسی تعلیم سے الگ رکھا۔ متوسط طبقہ کے کچھ زمین داروں نے اپنے لڑکوں کو اچھی تعلیم دلائی اور وہ اپنی زندگی میں کامیاب بھی رہے۔ برخلاف اس کے بہار میں غیر مسلموں نے انگریزی دور کے آغاز سے ہی اپنی اولاد کو جدید اور انگریزی تعلیم دلائی اور جابجا اپنے اسکول اور کالج قائم کیے۔ تعلیم کی دوڑ میں مسلمان غیر مسلموں سے پیچھے رہ گئے۔ ایک عرصہ کے بعد جب بہار کے مسلمانوں کو یہ احساس ہوا کہ بغیر جدید تعلیم کے وہ زندگی میں کامیاب نہیں ہو سکتے تو انھوں نے اس طرف توجہ دینا شروع کیا مگر وقت بہت آگے نکل چکا تھا اور تعلیم کے میدان میں مسلمان غیر مسلموں سے پیچھے رہ گئے، اور آج بھی جب کہ سائنس زندگی کے تمام شعبوں پر حاوی ہے مسلم نوجوان اس جانب کم ہی توجہ دیتے ہیں اور محنت سے جی چراتے ہیں۔ اسی وجہ سے عام طور پر مسلم طلبار امتحانات میں نمایاں کامیابی حاصل نہیں کرتے۔ میرا ۴۵ سال کا تدریسی تجربہ ہے کہ مسلم طلبار ذہنی صلاحیت کے اعتبار سے کسی سے کم نہیں اور اگر یہ طلبار محنت کریں تو کوئی وجہ نہیں کہ اعلیٰ کامیابیاں حاصل نہ کرسکیں۔ اس ناسازگار دور میں بھی جو مسلم طلبا محنت کرتے ہیں وہ یونیورسٹی اور مقابلے کے امتحانوں میں امتیازی شان سے کامیاب ہوتے ہیں۔ باوجود مالی دشواریوں کے بہت سے مسلم طلبار اپنی محنت کی بدولت مرکزی اور صوبائی مقابلے کے امتحانات میں اچھی صلاحیتوں کا مظاہرہ کررہے ہیں اور یہ قوم وملت کے لیے باعث فخر ہے۔ اب ہر مسلمان طالب علم کے دل میں آگے بڑھنے کی تمنا پیدا ہوچکی ہے اور زندگی کے مختلف تجربات کی بنا پر ان کو یہ احساس ہوچکا ہے کہ کسی بھی اقلیت کے افراد کو اگر کامیابی سے ہم کنار ہونا ہے تو اکثریت کے افراد کی بہ نسبت انھیں دوگنی محنت کرنی پڑے گی۔ آزادی سے پہلے مسلمان نوجوانوں کو ان کی اقلیت کا لحاظ رکھتے ہوئے سرکاری ملازمتوں میں کافی مراعات حاصل تھیں جس کی وجہ سے ان کے سامنے بیروزگاری کا مسئلہ کم تھا اور بہت حد تک وہ مالی کمزوریوں اور معاشی الجھنوں سے آزاد تھے، لیکن اب سرکاری، نیم سرکاری اور غیر سرکاری اداروں کی نوکریوں میں ان کی مناسب نمایندگی نہ ہونے کی وجہ سے مسلمان نوجوانوں کی

بے روزگاری میں اضافہ ہوگیا ہے اور وہ مالی بدحالی میں مبتلا ہوگئے ہیں - ان پریشانیوں کے باوجود عام طور پر مسلم نوجوان جرائم اور بدعنوانیوں سے اپنے کو الگ رکھتے ہیں جب کہ غیر مسلم نوجوان جو یونیورسٹیوں کی اونچی ڈگریاں رکھتے ہیں اور جن کا تعلق اعلیٰ خاندانوں سے ہوتا ہے مختلف قسم کے جرائم میں ملوث ہوتے ہیں جس کی کچھ نہ کچھ خبریں لوگ روزانہ اخبارات میں پڑھتے رہتے ہیں - اللہ کا شکر ہے کہ اس دور کے مسلم نوجوانوں کے دلوں میں مذہب کی عزت ہے اور وطنیت کا جذبہ بھی ہے، لیکن مخلص رہنماؤں کی بڑی کمی ہے، اگر انھیں مناسب رہنمائی حاصل ہو جائے تو یہ نوجوان ملک و ملت کے لیے نہایت ہی کار آمد ثابت ہو سکتے ہیں -

بہار گاندھی جی کا ایک محبوب صوبہ تھا - آپ بہار کے لوگوں کی بڑی عزت کرتے تھے کیونکہ ان میں محنت، سچائی، ایمانداری، خلوص اور محبت کا جذبہ بدرجہ اتم موجود تھا - ان ہی خوبیوں سے متاثر ہو کر گاندھی جی نے اپنی سیاسی تحریک کا آغاز بہار ہی سے کیا اور کامیاب بھی رہے - اس کامیابی کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ اس وقت بہار میں زمین دارانہ نظام قائم تھا اور زمین داروں نے گاندھی جی کی اس تحریک میں ان کی ہر طرح سے مدد کی - آزادی کے بعد بہار کا معاشرہ بدلنے لگا - زمین داری کا خاتمہ کر دیا گیا جس سے عام طور پر لوگوں کو کچھ فائدے تو ہوئے مگر بہت سی خرابیاں بھی رونما ہوئیں - ہر زمین دار اپنے علاقے میں ایک صاحب اختیار اور بااثر شخص ہوتا تھا اور امن و امان قائم رکھتا تھا - عوام اپنے مختلف معاملات میں اس سے مشورہ لیتے اور اس کی صلاح پر اپنے اختلافات کو دور کر لیا کرتے تھے - اس طرح عوام بہت سے جھگڑے اور فسادات سے بچ جاتے تھے، خصوصاً ذات پات کے تنازعے اور فرقہ پرستی کو سر اٹھانے کا موقع نہ ملتا تھا - انگریزوں کے زمانے میں نوکر شاہی طرز کی حکومت تھی - آزادی کے بعد اصولی طور پر اس طرز حکومت کو بدلا گیا مگر نوکر شاہی کی اصلیت اپنی جگہ پر قائم رہی، سرکاری حکام کی تعداد میں بے حساب اضافہ کیا گیا اور مختلف ضلعوں کو تقسیم کر کے اضلاع کی تعداد بہت بڑھا دی گئی - اخراجات بڑھ گئے لیکن اس سے اب تک کوئی خاطر خواہ نتیجہ بر آمد نہ ہو سکا اور لاقانونیت کو بھی ختم نہ کیا جا سکا - رشوت ستانی، بدعنوانی، بے ایمانی اور چور بازاری میں روز بہ روز اضافہ ہی ہوتا گیا - آزادی کے بعد سے اب تک بہار کے ۲۵ وزرائے اعلیٰ ہوئے اور ان میں سے دو تین وزرا نے اپنے اپنے طور پر اس صوبہ کو ترقی دینے کی کوشش کی لیکن کسی کو کوئی کامیابی حاصل نہ ہو سکی - اس

ناکامی کی خاص وجہ یہ ہے کہ اب تک بہار کی صنعت، تجارت اور زراعت میں باہر والوں کا اثر قائم ہے اور یہ لوگ برابر مقامی لوگوں کے مفادات کے لیے رکاوٹ بنے رہتے ہیں۔ علاوہ ازیں ان سرمایہ داروں کا بہار کے ذرائع ابلاغ پر بھی پورا قبضہ ہے۔ یہ لوگ اپنی خرابیوں کو عوام سے پوشیدہ رکھ کر اپنے اخبارات کے ذریعہ رائے عامہ کو اپنی موافقت میں ہموار کرتے ہیں تاکہ ان کی بدعنوانیوں پر پردہ پڑا رہے اور یہ لوگ امیر سے امیر تر ہو جائیں اور بہار کے عوام غریب سے غریب تر ہوتے جائیں۔

بہار میں مغلوں اور انگریزوں کے زمانے میں ہندوؤں اور مسلمانوں کا ایک ایسا طبقہ تھا جو "متوسط طبقہ" کے نام سے موسوم تھا اور انگریز اسے "مڈل کلاس" کہتے تھے۔ انگریزوں نے اس طبقے کے لوگوں کی بڑی ہمت افزائی کی کیونکہ یہ لوگ انگریزی حکومت کے کاموں کو انجام دینے کے لیے نہایت موزوں تھے۔ اس طبقے کے افراد حکومت کے ادنیٰ سے اعلیٰ عہدوں تک سرفراز رہے اور ان کے درمیان ہمیشہ دانش ور، مورخ، سیاست داں اور بڑے بڑے عالم پیدا ہوئے۔ ان لوگوں نے سیاسی، مذہبی، علمی اور ثقافتی زندگی میں اپنی اعلیٰ صلاحیتوں کا برابر ثبوت دیا۔ آزادی کے بعد اس طبقے کے بیشتر لوگ سرمایہ داری کے مخالف رہے اور سرمایہ داروں کو ہمیشہ اسی طبقے سے خدشہ محسوس ہوتا رہا۔ سرمایہ داروں نے ان کو ہر طرح سے دبانے کی کوشش کی اور انکی مخالفت کرتے رہے چنانچہ سرمایہ داروں نے اس طبقے کے استحصال کے لیے کوئی کسر اٹھا نہ رکھی اور اس کوشش میں وہ بہت حد تک کامیاب بھی رہے۔ اس طبقے کے زوال کے ساتھ بہار کی ایک خاص تہذیب بھی ختم ہو گئی، اور اسی کے ساتھ قومی یک جہتی، علم دوستی اور غربا پروری کا بھی خاتمہ ہو گیا جس کا تعلیم و تدریس پر بھی بڑا برا اثر پڑا۔ حکومت نے طلبا کے لیے تعلیم کی بے شمار سہولتیں مہیا کی ہیں مگر اسکولوں اور کالجوں میں ہر روز ہنگامے ہوتے رہتے ہیں اور طلبا کا قیمتی وقت تعلیم کے بجائے ہنگاموں میں صرف ہوتا ہے، سیاست داں اور اساتذہ اپنے مفاد کی خاطر طلبا کو استعمال کرتے ہیں اور ان کی تعلیمی زندگی کو نقصان پہنچاتے ہیں اور اس طرح وہ بے روزگاروں کی تعداد میں اضافہ کرتے ہیں۔ تعلیم کا معیار روز بروز گرتا ہی جا رہا ہے۔ سر دست اس انحطاط کی درستگی کی صورت نظر نہیں آتی، سوائے اس کے کہ حکومت، اساتذہ اور طلبا یکسو ہو کر تعلیم و تدریس کی ترقی کی طرف متوجہ ہو جائیں اور تعلیم کی بہتری کے لیے کوئی لائحہ عمل

تیار کریں اور اس پر پورے خلوص سے عمل پیرا ہوں تاکہ پہلے وقتوں کے اخلاق، محبت اور رواداری جیسی خوبیاں جو بہاری عوام میں موجود تھیں پھر واپس آجائیں۔

اس ترقی کے دور میں جب ہر چیز نہایت تیزی سے بدلتی جارہی ہے بہار میں اونچی ذات کے ایسے بے شمار افراد اب تک موجود ہیں جو نہایت فخر سے کہتے ہیں کہ سرمایہ داری، نابرابری اور ذات پات کی بندشیں بھارت میں ہزاروں سال سے قائم ہیں اور انھیں کسی طور سے ختم نہیں کیا جاسکتا۔ ان کے دل دردِ انسانی سے ناآشنا ہیں اور یہ خود غرض مقصد ہستی سے سینکڑوں منزل دور ہیں۔ انھیں شاید وہ واقعات جو گزشتہ ستر سالوں میں مختلف ممالک میں رونما ہوئے ہیں یاد نہیں ہیں اور اگر یاد ہیں تو یہ لوگ ان سے کوئی سبق لینا نہیں چاہتے ہیں۔ باوجود بے شمار دشواریوں اور گوناگوں رکاوٹوں کے ہندوستان میں "عہدِ نو" ظہور پذیر ہوگا اور ایک ایسے معاشرے کو جنم دے گا جس میں نہ کوئی "شودر" ہوگا نہ کوئی "برہمن" اور انسان اپنی زندگی آزادی، کامرانی اور خوش حالی سے بسر کرے گا۔ معاشرے کے ہر فرد کی قدر اس کی صلاحیت اور قابلیت کے مطابق ہوگی۔

ہے نگینِ دہر کی زینت ہمیشہ نام نو
مادرِ گیتی رہی آبستنِ اقوامِ نو

مجھے یقین ہے کہ بہار کے عوام گاندھی جی کے "مارگ" پر چل کر ایک ایسا نیا بہار تعمیر کریں گے جو گاندھی جی کے خوابوں کی بھی تعبیر ہوگا اور جسے دیکھ کر دنیا رشک کرے گی۔

عمر کی منزل تو جوں توں کٹ گئی
مرحلے اب دیکھئے پیش آئیں کیا

اقبال حسین

ڈاکٹر آصف نعیم صدیقی
صدر شعبۂ فارسی
کشمیر یونیورسٹی، سرینگر، کشمیر

میر الٰہی ہمدانی

در تاریخ سبک هندی هنوز تعداد کافی از شعرای درجه یک ناشناخته مانده است که بدون مطالعهٔ آنها ما نمی توانیم سبک هندی را درست بررسی بکنیم. تحت همین فکر بنده انتخابی از اشعار برگزیدهٔ بعضی از شعرای ناشناخته و چاپ نشدهٔ سبک هندی را تهیه کرده ام که فعلاً بر آن دارم تجدید نظر میکنم. این انتخاب فقط به غزلیات مبنی است (زیرا که فقط در غزلهاست که سبک هندی نشان ویژهٔ خود را نشان داده است) میر الهی هم یکی از آنهاست.

میر عماد الدین محمود الهی همدانی بن حجت الله در اسدآباد بدنیا آمده بود[1]. پیش از مهاجرت به هند برای فراغت آرامی و خوشی از غم خویش را در زیر تشویق شاه عباس هم گذرانده بود. اینجا با آقا رضی[2] و حکیم شفائی[3] رفت و آمد میداشت. در بارهٔ معرفی میر الهی با شاه عباس طاهر نصرآبادی واقعه‌ای را تذکره داده است که بدین قرار است: "وقتی در اصفهان با ملا شکوهی در قهوه خانهٔ عرب قهوه‌چی بوده اند که شاه جنت مکان شاه[4] عباس ماضی به قهوه خانه آمد. اوّل از ملا شکوهی[5] استفسار احوال می کرد و کیفیت آن در تحت اسم او نوشته شده. از میر پرسید که تخلص شما چیست: میگوید: الهی باد[6]."

میر الهی در دورهٔ جهانگیر به هند مهاجرت کرده بود. در مجمع النفائس سال مهاجرت وی به هند ۱۰۲۰ هـ (۱۶۱۱ م) ثبت شده است[7]. از شاه جهان نامه چنان بر میآید که میر الهی در کابل هم زندگی کرده است. ملاقات وی با حکیم حاذق[8] هم اینجا اتفاق افتاده بود، متاسفانه این ملاقات به رنجش انجامید. این رباعی هجویه که به پایین درج است، نشان دهندهٔ همان کینه‌ای است که در دل الهی از طرف حکیم تولید یافته بود:

دایم ز ادب، سنگ سبو نتوان شد　　در دیدهٔ اختلاط مو نتوان شد
صحبت بحکیم حاذق از حکمت نیست　　با لشکر خبط رو برو نتوان شد[9]

میرالهی مردی بود منزوی و به مادیات خیلی کم علاقه میداشت و در نتیجه آن اندک رنجی عادت کرده بود که رویداد های خیلی ناچیز هم برایش موثر میشد. اشعار هجویه پائین حاکی از همین خوی وی است :

شیدا بر دانا بحذر میاید — در مجمع الهیان بشر میاید
سازند اگر ز استخوانش — هر یار که افگنند خر میاید (هجو بر شیدا)

در دوره شاهجهان وقتیکه ظفرخان احسن در ۱۰۴۳ھ (۱۶۳۳م) بعنوان صوبه دار (استاندار) به کشمیر رسید میرالهی هم به کشمیر اقامت گزید و همینجا فوت شد. محمد اعظم دیده مری در تاریخ اعظمی دو تاریخ فوت وی ثبت نموده است یکی بحواله کتیبه ای که بر آرام گاه وی کنده بود که ۱۰۶۳ھ (۱۶۵۲م) می باشد و دیگری بحواله آن قطعه تاریخ وفات که غنی کشمیری گفته بود که ۱۰۶۴ھ (۱۶۵۳م) می باشد. دیده مری هم به ما اطلاع می دهد که میرالهی در صحن آستانه حضرت شیخ بهاالدین گنج بخش به جانب غرب دفن شده است.

میرالهی در کشمیر در سال ۱۰۵۰ھ (۱۶۴۰م) طرف جنوب ناحیه نوشهره باغی بنا کرده بود که بنام "باغ الهی" معروفیت می داشت. ظفرخان احسن در توصیف این باغ اشعار پائین سروده بود :

ز دل چون جانب صحرا نهی روی — همه صحرا گلستانیست خود روی
ببینی سر بسر صحرا شگفته — به فرش سبزه گل مستانه خفته
هزاران گلشنش از هر کنار است — که مرغ دست آموزش بهار است
یکی از باغها باغ الهی است — که رضوان از رشکش چهره کاهی است
در آن گلشن یکی کهنه چنار است — ز نخل طور گوئی یادگار است

آثار الهی

تذکره خزینه الهی : این تذکره بین سالهای ۱۰۴۲ھ (۱۶۳۲م) و ۱۰۵۰ھ (۱۶۴۰م) تصنیف شده بود که شامل احوال چهار صد تن از شعرای قرن نهم و دهم هجری می باشد ولی عده ای از شعرای هم در آن تذکر یافته اند که تعلق به قرن هشتم هجری دارند.

دیوان اشعار : این دیوان تا حالا به چاپ نرسیده است و از نسخه های خطی آن میتوان از کتابخانه های در زیر پائین استفاده کرد :-

(۱) نسخه موزه بریطانیه مورخ ۱۰۴۲ھ (۱۶۳۲م).

(۲) نسخه برلن. مورخ ۱۰۵۲ھ (۱۶۴۲م).

انتخاب غزلیات

اشعار پایین از روی نسخهٔ خطی کتابخانهٔ موزهٔ بریطانیه که شمارهٔ آن ۲۵۳۳ Add بر طبق کاتالوگ ریو می باشد انتخاب شده است.

ویژگی نسخه: این نسخه در سال ۱۰۴۲ هـ (۱۶۳۲ م) یعنی در زمان حیات شاعر نوشته بود. این نسخه شامل قصاید، ترکیب بند، ترجیع بند، قطعات، مراثی، مثنوی و غزلیات می باشد و در خط نستعلیق نوشته شده است ولی برگهای ۷۸ - ۸۷ - ۱۷۳ - ۱۹۵ بوسیله کاتب دیگر نوشته شده است.

۱ برگ ۱۰۷ ب

آمیخت رنگ با جگرم سوز داغ را   یارب که ساخت محرم بزمت چراغ را
دوری مکن که از پی تعویذ دوستی   دریوزه کرده بازوم از سینه داغ را
بوی ترا ز غنچهٔ دل بایدم شنید   بیهوده گرد باغ چه سازم دماغ را
هیچ آفتی به بخت سیاهم نمی رسد   عمر دراز بین که نصیب است زاغ را

می ریزد در گلوم الٰهی که زور اشک
ترسم که بشکند بکف من ایاغ را

۲ برگ ۱۰۹ الف

آن غبارم که نسیم طرب انگیخت مرا   بر سر زلف نشستم چو صبا بیخت مرا
گریهٔ مستیٔ دوشینه بعالم آورد   خوش زخواب غم دیرینه برانگیخت مرا
از خیال تو چو فانوس خیالی شده ام   می توان برد و به طاق فلک آویخت مرا
پیش از اینم هوس زمزمه آرائی بود   سرمه شد بخت سیاه و بگلو ریخت مرا

تلخم و تیره و افسرده الهی در عشق
زهر بودم که به خاکستری آمیخت مرا

۳ برگ ۱۱۳ الف و ب

اسیر دام ترا تاب آرمیدن نیست — که رسم مرغ گرفتار جز طپیدن نیست
چنان ز عشق تو خوارم که گر نسیم شوم — به گلشن تو مرا رخصت وزیدن نیست
به اضطراب دل خود چنان گرفتارم — که فرصتم به تمنای آرمیدن نیست
بخون روح قدس تیغ اگر به پالائی — شگفته شو که سزاوار لب گزیدن نیست
چه حالت است الهی که خار صحرا نرا
به پای اهل هوس عادت خلیدن نیست

۴ برگ ۱۱۷ ب و ۱۱۸ الف

شب دل از خنجر او بستر سنجاب نداشت — مردم دیده نفس بر نفس خواب نداشت
دیده را حوصله کی بود که از ریزش حسن — جلوهٔ عکس ترا آینه هم تاب نداشت
ماه در کوی تو امشب بگدای می گشت — همه دیدند که پیراهن مهتاب نداشت
بی تو بلبل بچمن دل بنوا خوش می کرد — هیچ تار نفسش نغمهٔ سیراب نداشت
زخم چندان بجگر داشت الهی دم نزع
که دگر آرزوی خنجر قصاب نداشت

۵ برگ ۱۳۱ الف

هر ذره که از خاک اسیران تو باشد — حسرت زدهٔ گوشهٔ دامان تو باشد
چشم عدم دست نشان کرده بهر گام — صد فوج نگه را که نگهبان تو باشد
زخم از پی تیر تو بهر سو فگند چشم — از بس که دلش مایل پیکان تو باشد
صد خنجر الماس بهر سینه شکستن — بازیچه‌ای از جنبش مژگان تو باشد
امروز اگر جلوه کند نکهت یوسف — رسوا شدهٔ بوی گریبان تو باشد
تنها نه الهی بود آشفتهٔ عشقت
کان زلف سیه نیز پریشان تو باشد

۶ برگ ۱۳۳/الف

آنچه مقصود لب ماست دهانت دارد　　وانچه در خورد کنار است میانت دارد
بکه افسانهٔ ستمهای تو گوید عاشق　　شده حرفی و در زیر زبانت دارد
چشم بر شست تو داریم چو زهگیر مدام　　کانچه رزق جگر ماست کمانت دارد
تنگدل باش که چون غنچه گذارند ترا　　ور چو گل شاد شوی خنده زیانت دارد

جام بی می شده باز الهی در بزم
سبکیهای تو بر طبع گرانت دارد

۷ برگ ۱۴۷/الف و ۱۴۸/ب

چون گل از شوق تو با چاک گریبان زادم　　وز پی درد تو با ماتم درمان زادم
رسم پروانه به مرغ دگر آموز که من　　بال و پر سوخته بر طرف گلستان زادم
نیستم نغمهٔ بلبل که روم سوی چمن　　صوت زنجیرم و در گوشهٔ زندان زادم
آن مصیبت زدهٔ عقلم که به غمخانهٔ عشق　　کلفت آموز تر از رنجش مهمان زادم

چون الهی بدلم کینه حرامست که من
سربسر مهرم و در مملکت جان زادم

۸ برگ ۱۴۸/ب

تمام آشفتگی گردیدم از موی که من دانم　　پریشانی زمن آموخت گیسوی که من دانم
لب خود میگزد گل خنده بر گل میزند بلبل　　صبا گویا به گلشن می‌برد بوی که من دانم
زبیم فتنهٔ چشمی که مردم کش بود نازش　　نگه دور ایستد صد گام از روی که من دانم
نداند کز کدامین غمزه دستور ستم گیرد　　بود بیدادهم درماندهٔ خوی که من دانم
ز فریادی توانم صد قیامت زنده کردا ما　　خیال ناله‌ای شرمست در کوی که من دانم

الهی داغ او را خال رخسار جگر کردم
مرا این گل شگفت از عشق دلجوی که من دانم

۹ برگ ۱۵۰ ب

تا این دل شوریده بداغی برسانیم　　پروانهٔ مستی بچراغی برسانیم

پیوند دل ریش به مرهم نه پسندیم　　ما نسبت هر زخم بداغی برسانیم

صد عشوهٔ گل از شیوهٔ دستار تو آموخت　　این مژده به هر بلبل باغی برسانیم

نزدیک قدح بودن ما عیش پرستیست　　از دور نیازی به ایاغی برسانیم

بر صید هما گر نبود دسترس ما　　شاید که کلوخی به کلاغی برسانیم

در گوش الهی که چو من گمشده مستست
وقتست که گلبانگ سراغی برسانیم

۱۰ برگ ۱۵۲ الف

هر نگاهش را نگاهی پاسبانست آنچنان　　عشق ما شد پیر و حسن او جوانست آنچنان

عشق ترک دشمنیهای هوس گردد هنوز　　ماجرای زخم و مرهم در میانست آنچنان

ظلمتی هر دم بطوف کلبه ام آید مگر　　آسمان با کوکبم نامهربان است آنچنان

عمرها لب بر لب تسبیح می سایم ولی　　صوت ناقوسی بگوشم همزبان است آنچنان

هر نسیمی زلفی و هر گرد دامانی گرفت
جز الهی کز جنون بی خان و مان است آنچنان

پاورقی

۱۔ اسدآباد از توابع همدان است۔ تذکره نویسان اساساً اسدآباد را زادبوم وی میگویند ولی عده ای مانند مولف عرفات و واله داغستانی هم هستند که او را اسعدآبادی می گویند۔ همچنین در بیشتر تذکره ها اسم وی را "عمادالدین محمود" نوشته اند ولی در "بزرگان و سخن سرایان همدان" بدین قرار است: "میر عمادالدین فرزند محمود بن حجة الله" (بحواله تذکره شعرای کشمیر بخش اول؛ سید حسام الدین راشدی: ص ۱۲۴ : اقبال اکادمی پاکستان ۱۹۸۳ء۔)

۲۔ آقا رضی اصفهانی؛ آقا رضی اصفهانی متوفی ۱۰۲۴ھ (۱۶۱۵م) از شعرای معروف دوره صفوی بشمار میروند

۳۔ شرف الدین حکیم حسین خلف حکیم ملا اصفهانی متوفی ۱۰۳۷ھ (۱۶۲۷م) از شعرای معروف دوره صفوی بشمار میروند۔ بعلاوه دیوان "دیده بیدار" "نمکدان حقیقت" "مهر و محبت" از مثنویهای معروف وی میباشد۔

۴۔ ملا شکوهی همدانی با شعرای دوره شاه عباس اوّل (دوره صفوی) ربط دارد۔

۵۔ تذکره نصرآبادی: ص ۲۰۵: باکوشش وحید دستگردی کتاب فروشی فروغی تهران ایران۔

۶۔ در "بزرگان و سخن سرایان همدان" ذکر شده است که میرالهی در اواخر دوره اکبر در سنه ۱۰۰۹ھ (۱۶۰۰م) به هند مهاجرت کرده بود (این تاریخ بنظر بنده درست نیست) (بحواله تذکره شعرای کشمیر بخش اوّل؛ سید حسام الدین راشدی: ص ۱۲۴: اقبال اکادمی پاکستان ۱۹۸۳ء)

۷۔ حکیم حاذق (در پادشاه نامه اسم وی عبدالحاذق درج شده است) پسر حکیم گیلانی در فتحپور سیکری چشم بجهان کشوده بود۔ در سال ۱۰۶۸ھ (۱۶۵۷م) یا بقول صاحب مراة العالم در سال ۱۰۸۰ھ (۱۶۶۹م) وفات یافته بود۔ شاهجهان در سال ۱۰۳۸ھ (۱۶۲۸م) حکیم حاذق را به امامقلی خان پسر عبدالله خان فرستاده بود۔ در وقت مراجعت از این سفارت حکیم حاذق در سال ۱۰۴۰ھ (۱۶۳۰م) در کابل توقف نمود۔ این روزها ظفرخان احسن ناظم (استاندار) کابل بود۔ همین سال ملاقات حکیم با میرالهی اتفاق افتاده بود۔ شرح این سفارت در پادشاه نامه تذکر یافته است۔ (بحواله تذکره شعرای کشمیر بخش اوّل؛ سید حسام الدین راشدی ص ۱۱۳: اقبال اکادمی پاکستان ۱۹۸۳ء)

۸۔ شاهجهان نامه ص ۳۰۴ بحواله تذکره شعرای کشمیر بخش اول؛ سید حسام الدین راشدی: ص ۱۱۳: اقبال اکادمی، پاکستان ۱۹۸۳ء۔

۹۔ ملا شیدا تکلو در دوره جهانگیر در فتح پور (آگره) بدنیا آمده بود۔ در روزهای آخر زندگی

بکشمیر سکونت پذیرفت و همینجا در سال ۱۰۸۰ھ (۱۶۶۹م) فوت کرد. شیدا مرد خودپسند و اندک رنج بود و وقت اش را همین خو هجو گفتن به معاصران شیوه کرده بود. در هجو میر الهی گفته بود:

این رطب و یابسی که بود در کلام تو   گر منکر کلام الهی شوم بجاست

۱۰ و ۱۱- میر الهی ملک ملک نظم   بود در اقلیم سخن بی قرین
سال وفاتش طلبیدم ز عقل   گفت بگو! بود سخن آفرین   ۱۰۶۳ھ

قطعه تاریخ وفات که غنی گفته بود:

برد الهی ز جهان گوی سخن   ۱۰۶۴ھ

۱۲- بهاءالدین معروف به گنج بخش از صوفیای برگزیدهٔ دورهٔ بدشاه زین العابدین بشمار میروند. از شاه اسحاق ختلانی (خلیفهٔ امیر کبیر میر سید علی همدانی) تربیت پذیرفته بودند. در ۸۴۹ھ (۱۴۴۵م) بدست راهزنان بقتل رسیده بودند.

۱۳- این باغ نزد بزپوره کنونی بود و هنوز به نام باغ چنار معروفیت دارد. شاعری تاریخ بنا ریزی این باغ را "به باغ الهی" گفته بود:

فلک آشفته بود، از بهر سالش   ملک گفتا، بگو: باغ الهی!

سنه ۱۰۵۰ھ (۱۶۴۰م)

جناب رحمت اللہ خاں شروانی
مزمل منزل، علیگڑھ

مثنوی مولانا روم

منتخب اور زبان زد اشعار : صحیح قرأت کے ساتھ

مثنوی شریف پڑھنے کا شوق علامہ اقبال کے ذریعہ پیدا ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ ان منتخب اشعار میں ناظرین کو بیشتر وہی اشعار ملیں گے جنھیں علامہ نے تضمین کیا ہے۔ اب سوال یہ اٹھتا ہے کہ نکلسن (NICHOLSON) کے مرتبہ نسخہ کو میں نے کیوں اساس بنایا۔ اس سلسلہ میں ایک واقعہ ہے۔ میں جب بھی کوئی کتاب خریدتا ہوں تو جی یہی چاہتا ہے کہ اس کا درست و صحیح ترین نسخہ ملے۔ آج سے تقریباً تیس سال قبل ۱۹۵۹ء میں مجھے عرشی صاحب مرحوم سے نینی تال میں نیاز حاصل ہوا۔ ایک گفتگو کے دوران مرحوم سے میں نے دریافت کیا "مثنوی رومی کا صحیح ترین نسخہ کون سا ہے؟" انھوں نے فرمایا: "اگر آپ کو صحیح ترین نسخہ کی تلاش ہے تو نکلسن کا مرتب کردہ نسخہ ہے جس کو لُزاک (LUZAC) نے شائع کیا ہے۔"

اگلے سال میرا لندن جانا ہوا اور ایک دن میں لُزاک کے یہاں جا پہنچا اور مثنوی شریف کا وہی نسخہ خرید لیا۔ عرشی صاحب کے قول کی تصدیق اس وقت ہوئی جب برسوں بعد مثنوی شریف کے بالاستیعاب مطالعہ کی توفیق ہوئی۔ جن حضرات نے مذکورہ نسخہ دیکھا ہوگا، وہ یقیناً میری رائے سے اتفاق کریں گے کہ نکلسن نے اس کی ترتیب میں بے حد محنت کی ہے۔ اس کی چھوٹی سی مثال یہ ہے کہ میری دانست میں کسی عالم دین کو آج تک یہ توفیق نہیں ہوئی کہ وہ مثنوی شریف میں مستعملہ آیات کا اشاریہ تیار کرتا۔ یہ توفیق باری تعالیٰ نے نکلسن ہی کو ارزانی فرمائی، اور مثنوی شریف میں مستعملہ آیات کا اشاریہ تیار کرنا، ناظرین مجھ سے اتفاق کریں گے کہ کھیل تماشا نہیں ہے۔ احادیث مثنوی پر تو کتابیں آچکی ہیں، مگر مثنوی شریف میں مذکورہ آیات قرآنی کی نشاندہی، جہاں تک مجھے علم ہے، نکلسن کے علاوہ کسی اور نے نہیں کی۔

جب Volumes 1-2 کو دیکھتا ہوں تو نکلسن کی عرق ریزی کی داد دینا پڑتی ہے۔ وہ مثنوی شریف کو دفتر سوم کے وسط تک ترتیب دے چکا تھا، جب اسے نسخہ قونیہ (ق) مکتوبہ ۶۷۷ھ کی اطلاع ملی۔ اس نے مطبع والوں کو ہدایت کی کہ طباعت روک دی جائے اور دفتر اول سے لے کر دفتر سوم کے وسط تک

دیباچوں اور ہر شعر کی نسخۂ قونیہ کی رو سے تصحیح کی اور تب آگے بڑھا۔ صحت کا یہ اہتمام یہاں کس کو میسر ہے۔ اس انتخاب کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ اربابِ نظر مثنوی کے زبان زد اشعار کی صحیح قرأت سے روشناس ہو جائیں۔ بعض اشعار جو غلط طور پر مشہور ہو گئے ہیں ان کی صحیح قرأت مذکورہ نسخہ سے پتہ چلتی ہے۔ مثنوی شریف کے پہلے ہی شعر کو لے لیجئے۔ کتنے لوگوں کو معلوم ہے کہ اس کی صحیح قرأت اس طرح ہے ؎

بشنو این نے چون شکایت می‌کند　　از جدائیہا حکایت می‌کند

یا یہ شعر لے لیجئے ؎

گر بہ استدلال کارِ دیں بُدے　　فخرِ رازی رازدارِ دیں بُدے

نکلسن کے یہاں یہ شعر اس طرح ہے ؎

اندریں بحث ار خرد رہ بیں بُدے　　فخرِ رازی رازدانِ دیں بُدے

عام طور پر یہ دو شعر ایک ساتھ پڑھے جاتے ہیں ؎

پاے استدلالیاں چوبیں بود　　پاے چوبیں سخت بے تمکیں بود
اندریں بحث ار خرد رہ بیں بُدے　　فخرِ رازی رازدانِ دیں بُدے

جب کہ "پاے استدلالیاں الخ" دفترِ اول میں ہے اور "اندریں بحث ار خرد الخ" دفترِ پنجم میں مذکور ہے۔ یہاں یہ بھی عرض کرتا چلوں کہ امام رازی کا نام پوری مثنوی شریف میں صرف اسی جگہ آتا ہے۔ یا یہ شعر دیکھئے ؎

گفتۂ او گفتۂ اللہ بود　　گرچہ از حلقومِ عبداللہ بود

جب کہ اس شعر کا پہلا مصرع یوں ہے: مطلق آں آواز خود از شہ بود

افسوس کہ علامہ اقبال کی رسائی نکلسن کے مرتبہ نسخۂ مثنوی شریف تک نہ ہو سکی۔ اس نسخہ نے ان غلطیوں کو بھی بے نقاب کر دیا ہے جو علامہ سے مثنوی شریف کے اشعار نقل کرنے میں ہوئیں۔ مثلاً یہ شعر ملاحظہ ہو ؎

علم چوں بر دل زند یارے شود　　علم چوں بر تن زند بارے شود

اس کو علامہ نے یوں نقل کیا ہے ؎

علم را بر تن زنی مارے بود　　علم را بر دل زنی یارے بود

اگر نکلسن نے نسخۂ قونیہ کی رو سے اپنے مرتب شدہ متن کی تصحیح نہ کی ہوتی تو بعض اشعار کی بلاغت دل شکنی کی حد تک بگڑ چکی ہوتی۔ مثلاً متن میں یہ شعر ملاحظہ ہو ؎

تو برائے وصل کردن آمدی   یا خود از بہر بریدن آمدی

اس شعر کا مصرعِ ثانی پڑھنے کے بعد سانس رک سا جاتا ہے۔ اگر جیب ۱ [illegible] صفحہ ۱۰ پر مشہور قرأت یعنی:

تو برائے وصل کردن آمدی   یا برائے فصل کردن آمدی

کی تائید ہوتی ہے تو گویا تنِ مردہ میں دوبارہ جان پڑ جاتی ہے۔

یہ نہیں کہ نکلسن نے غلطیاں نہیں کی ہیں۔ یقیناً کی ہیں اور بڑی بڑی کی ہیں۔ مثلاً یہ شعر ملاحظہ ہو ؎

مُسکل از پیغامبر ایام خویش   تکیہ کم کن بر فن و بر کام خویش

باوصف اس کے کہ نسخہ قونیہ کی روایت یہی ہے، نکلسن نے خدا جانے 'ایام خویش' کے کیا معنی سمجھے جو مصرع کو متن میں یوں درج کیا ہے ؏ مُسکل از پیغمبر آیام خویش۔ سوا اس کے کہ قاری پڑھے اور بے چارے نکلسن کی ختمِ رسالت کے مسلمانوں کے بنیادی عقیدہ سے ناواقفیت پر ماتم کرے، اور کر بھی کیا سکتا ہے۔ بایں ہمہ مرتب کی دیانتِ علمی کی داد دینا پڑتی ہے کہ اس نے حاشیہ میں صحیح قرأت دیدی ہے۔ اس مصرع کی تضمین کرتے وقت قرأت کی غلطی اقبالؔ سے بھی ہوئی ہے۔ علامہ نے پہلا مصرع یوں تضمین فرمایا ہے۔ ؏ مُسکل از ختمِ رسل ایام خویش۔ لیکن یہ قرأت کی ایسی غلطی ہے جس پر سیکڑوں صحیح قرأتیں نثار ہیں۔

نکلسن نے قرآنی املا کے اتباع میں 'غلو' کی حد تک احتیاط برتی ہے۔ مثلاً 'ذوالنون' کو 'ذوالنون' ہی لکھا ہے اور صرف و نحو کے اصول و ضوابط سے صرفِ نظر کرتے ہوئے حاشیہ میں لکھ دیا ہے کہ قرآن کریم میں اس لفظ کا املا یہی ہے۔ یہی سلوک اس نے رحمۃ للعالمینؐ کے ساتھ روا رکھا ہے کہ رحمۃ کی 'ۃ' ہر جگہ بجائے ضمہ کے فتحہ سے لکھی ہے۔ یہیں اہلِ زبان اور زبان داں کا فرق نمایاں ہو جاتا ہے اور بے اختیار یہ مصرع زبان پر آ جاتا ہے ؏ کتاب خواں ہے مگر صاحبِ کتاب نہیں

مرتب سے ترجمہ میں بھی بڑی فاحش غلطیاں سرزد ہوئی ہیں، لیکن یہاں اس کی تفصیل کا محل نہیں۔ اس سب کے باوصف ایک بار پھر عرض کروں گا کہ میری نظر میں نکلسن کا مرتب کردہ نسخہ ہی مثنوی شریف کا صحیح ترین اور مستند ترین متن ہے جو ہر الحاق سے پاک ہے۔ مرتب کی دیدہ ریزی کی داد نہ دینا بُخل ہی نہیں، دوں ہمتی بھی ہے۔

نکلسن کے مرتبہ نسخے سے رومی کے زبان زد اشعار کا صحیح متن ملاحظہ ہو:

ردیفِ الف

شاد باش ای عشقِ خوش سودای ما ای طبیبِ جملہ علتہای ما [۱]
ای دوای نخوت و ناموسِ ما ای تو افلاطون و جالینوسِ ما [۲]
ہر کہ او از ہم زبانی شد جدا بی زبان شد گرچہ دارد صد نوا [۳]
ما زبان را ننگریم و قال را ما درون را بنگریم و حال را [۴]

ردیفِ "ب"

از خدا جوییم توفیقِ ادب بی ادب محروم گشت از لطفِ رب [۵]
آفتاب آمد دلیلِ آفتاب گر دلیلت باید از وی رو متاب [۶]
جہد کن در بی خودی خود را بیاب زود تر واللہ اعلم بالصواب [۷]

ردیفِ "ت"

تو مگو ما را بدآن شہ بار نیست با کریمان کارہا دشوار نیست [۸]
کارِ مردان روشنی و گرمیست کارِ دونان حیلہ و بی شرمیست [۹]
آخرِ ہر گریہ آخر خندہ ایست مردِ آخر بین مبارک بندہ ایست [۱۰]
آدمی دیدست و باقی پوستست دید آنست آن کہ دیدِ دوستست [۱۱]
بر سماعِ راست ہر کس چیر نیست لقمۂ ہر مرغکی انجیر نیست [۱۲]

---

۱ دفتر اول، ص ۲، شعر ۲۳ ۲ ایضاً ص ۲، شعر ۲۴ ۳ ایضاً ص ۲، شعر ۲۸ ۴ دفتر دوم ص ۳۴۳، شعر ۱۷۵۹، ۵ اس شعر کے مصرعِ ثانی کی موجودہ قراءت کے لیے ملاحظہ ہو Appendix ص ۲ - دفتر اول ص ۷، شعر ۹۰ ۶ ایضاً ص ۹، شعر ۱۷۱ ۷ دفتر چہارم ص ۴۶۸، شعر ۲۰۱۰ ۸ دفتر اول ص ۵، شعر ۱۲۲ ۹ ایضاً ص ۱۲، شعر ۳۰۲ ۱۰ ایضاً ص ۱۵، شعر ۳۹۱ ۱۱ ایضاً ص ۸، شعر ۲۴۱ ۱۲ ایضاً ص ۱۰۱، شعر ۲۶۱۳ -

پندِ من بشنو کہ تن بندِ قویست	کہنہ بیرون کن گرت میل نویست[۱]
تو ہمی گوئی مرا دل نیز ہست	دل فرازِ عرش باشد نی بپست[۲]
داند او کو نیکبخت و محرمیست	زیرکی ز ابلیس و عشق از آدمست[۳]
چون رسید اینجا سخن لب در ببست	چون رسید اینجا قلم در ہم شکست[۴]

ردیف "ح"

ہندوان را اصطلاحِ ہند مدح	سندیان را اصطلاحِ سند مدح[۵]

ردیف "د"

بشنو این نی چون شکایت می کند	از جدائیہا حکایت می کند[۶]
کوزۂ چشم حریصان پر نشد	تا صدف قانع نشد پر در نشد[۷]
مرغ بر نارستہ چون پرّان شود	لقمۂ ہر گربۂ درّان شود[۸]
گفت پیغمبر باوازِ بلند	بر توکل زانوی اشتر ببند[۹]
دانہ باشی مرغکانت بر چنند	غنچہ باشی کودکانت بر کنند[۱۰]
مطلق آن آواز خود از شہ بود	گرچہ از حلقوم عبد اللہ بود[۱۱]
پای استدلالیان چوبین بود	پایِ چوبین سخت بی تمکین بود[۱۲]
علم چون بر دل زند یاری شود	علم چون بر تن زند باری شود[۱۳]
دستِ ہر نا اہل بیمارت کند	سوی مادر آ کہ تیمارت کند[۱۴]

---

۱ دفتر دوم، ص ۱۱۲، شعر ۱۷۰۰ ۲ دفتر سوم، ص ۱۲۸، شعر ۲۳۴۳ ۳ دفتر چہارم، ص ۴۲۳، شعر ۱۴۰۲ ۴ ایضاً ص ۳۰۴، شعر ۲۱۴۴
۵ دفتر دوم، ص ۳۴۴، شعر ۵۵۱۷ ۶ دفتر اول، ص ۳، شعر ۱ یہ شعر متداول نسخوں میں اس طرح ملتا ہے :

بشنو از نی چون حکایت می کند	از جدائیہا شکایت می کند

زیرِ نظر نسخہ کے متن میں بھی یہ اسی طرح ہے۔ موجودہ قرأت کے لئے ملاحظہ ہو APPENDIX 1 ص ۱ ۷ دفتر اول، ص ۴، شعر ۲۰
۸ ایضاً ص ۲۰، شعر ۳۰۵ ۹ ایضاً ص ۵۷، شعر ۹۱۵ ۱۰ ایضاً ص ۱۱۱، شعر ۱۸۳۳ ۱۱ ایضاً ص ۸۰، شعر ۱۹۳۳ (اس شعر کا مصرعہ اولیٰ یوں مشہور ہے ع گفتۂ او گفتۂ اللہ بود) ۱۲ ایضاً ص ۱۳۰، شعر ۲۱۲۸ ۱۳ ایضاً ص ۲۱۲، شعر ۳۴۴۷ یہ شعر عام طور سے اس طرح مشہور ہے ؎

علم را بر دل زنی یاری بود	علم را بر تن زنی ماری بود

۱۴ دفتر دوم، ص ۲۶۵، شعر ۲۴۳ ـــ

چون قلم در دستِ غدّاری بود   بی گمان منصور برداری بود[1]

آنک بر افلاک رفتارش بود   بر زمین رفتن چه دشوارش بود[2]

تا دلِ مردِ خدا نامد بدرد   هیچ قرنی را خدا رسوا نکرد[3]

هر کسی را بهرِ کاری ساختند   میلِ آن را در دلش انداختند[4]

همچنانک قدرِ تن از جان بود   قدرِ جان از پرتوِ جانان بود[5]

عشق از اوّل چرا خونی بود   تا گریزد آنک بیرونی بود[6]

حج زیارت کردنِ خانه بود   حجِّ ربّ البیت مردانه بود[7]

نورِ حق را کس نجوید زاد و بود   خلعتِ حق را چه حاجت تار و پود[8]

بر ہلاکِ اُمّتِ پیشین که بود   زانک چندل را گمان بردند عود[9]

اصلِ لشکر بی گمان سرور بود   قوم بی سرور تنِ بی سر بود[10]

هر بنای کهنه کآبادان کنند   نه که اوّل کهنه را ویران کنند[11]

هر که کاه و جو خورد قربان شود   هر که نورِ حق خورد قرآن شود[12]

گر بهر خون ریزیی گشتی شهید   کافری کشته بدی هم بوسعید[13]

بنده باش و بر زمین رو چون سمند   چون جنازه نه که بر گردن برند[14]

بال بازان را سوی سلطان برد   بال زاغان را بگورستان برد[15]

---

[1] دفتر دوم، ص ۳۳۳، شعر ۱۳۰۵ [2] ایضاً ص ۳۲۷، شعر ۱۴۹۲ [3] ایضاً، ص ۱۰۴، شعر ۱۱۱۳ (اس شعر کے مصراعِ ثانی میں عموماً لوگ 'قرنی' کی جگہ 'قومی' پڑھتے ہیں۔ شعر سے متعلق حاشیہ میں نسخہ ل کا 'ہیچ قومی را' کی روایت بھی مذکور ہے) [4] دفتر سوم، ص ۹۲، شعر ۱۰۱۹ [5] ایضاً ص ۱۴۴، شعر ۲۰۱۷ [6] ایضاً ص ۲۰۸، شعر ۴۷۵۰ [7] ایضاً ص ۲۰۲، شعر ۴۷۵۰ [8] دفتر چہارم ص ۲۸۶، شعر ۱۵ [9] ایضاً ص ۳۴۴، شعر ۱۰۳۹ [10] ایضاً ص ۳۸۹، شعر ۱۰۱۲ (اس شعر کے مصراعِ ثانی میں 'چندل' کے بارے میں حاشیہ میں یہ عبارت ملتی ہے: چندل on چندل in text. The other MSS. and Bul. have صندل) [11] ایضاً، ص ۴۱۸، شعر ۲۳۵۰ (اس شعر کا مصراعِ ثانی یوں مشہور ہے: 'نے ندانی اوّل آن بنیاد را ویران کنند'۔ اقبال نے بھی جب 'بانگِ درا' میں اس شعر کو اپنایا ہے تو اس مصراع کی مذکورہ بالا شکل ہی کو لیا ہے۔ اقبال کا شعر یہ ہے:

گفت رومی هر بنائے کهنه کآبادان کنند   می ندانی اوّل آن بنیاد را ویران کنند

ملاحظہ ہو 'بانگِ درا' ص ۳۰۰۔ یہ شعر 'خضرِ راہ' کا ہے) [12] ایضاً ص ۴۵۵، شعر ۱۶۶۶ [13] دفترِ پنجم، ص ۱۵۹، شعر ۲۴۷۸ [14] ایضاً ص ۲۳۳، شعر ۲۷۷۵ [15] دفترِ ششم، ص ۲۸۹، شعر ۳۰۴ [16] ایضاً ص ۳۵۵، شعر ۱۴۴۴ –

ردیفِ 'ر'

کارِ پاکان را قیاس از خود مگیر   گرچه ماند در نبشتن شیر و شیر[1]
اشک خواهی رحم کن بر اشک بار   رحم خواهی بر ضعیفان رحم آر[2]
تیغِ حلم از تیغِ آہن تیز تر   بل ز صد لشکر ظفر انگیز تر[3]
خلوت از اغیار باید نه زیار   پوستین بهرِ دی آمد نه بهار[4]
غم خور و نانِ غم افزایان مخور   زانکه عاقل غم خورد کودک شکر[5]
زیرکی بفروش و حیرانی بخر   زیرکی ظن است و حیرانی نظر[6]
خدمتی میکن برای کردگار   با قبول و ردِ خلقانت چه کار[7]

ردیفِ 'س'

ہان و ہان گر حمد گوئی گر سپاس   ہمچو نافرجام آن چو پان شناس[8]

ردیفِ 'ش'

گر تو اہلِ دل نهٔ بیدار باش   طالبِ دل باش و در پیکار باش[9]
مسکل از پیغامبر ایام خویش   تکیه کم کن بر فن و بر کام خویش[10]
دل که دلبر دید گی ماند ترش   بلبلی گل دید گی ماند خمش[11]

ردیفِ 'ق'

سینه خواہم شرحه شرحه از فراق   تا بگویم شرحِ دردِ اشتیاق[12]
تا توانی پا منه اندر فراق   اَبْغَضُ الْاَشْیَآءِ عِنْدِیْ الطَّلَاق[13]

ردیفِ 'ل'

مال را کز بہرِ دین باشی حمول   نِعْمَ مَالٌ صَالِحٌ خواندش رسول[14]

---

[1] دفتر اول ص ۱۰، شعر ۲۶۳ [2] ایضاً ص ۱۵، شعر ۳۲۰ [3] ایضاً ص ۱۵، شعر ۳۵۸ [4] دفتر دوم ص ۲۴۸، شعر ۲۵ [5] دفتر سوم ص ۳۱۳، شعر ۱۵۰۳ [6] دفتر چہارم ص ۱۲۳، شعر ۱۲۰۰ [7] دفتر ششم ص ۱۳۳، شعر ۴۸ [8] دفتر دوم ص ۳۴۵، شعر ۱۹۹۳ [9] دفتر سوم ص ۱۰، شعر ۱۰۴۰ [10] دفتر چہارم ص ۱۱۰، شعر ۱۸۵ (اس شعر کے مصرعِ اول میں حاشیہ کی قراءت اختیار کی گئی ہے جبکہ متن میں مصرعِ مذکور اس طرح ہے ع مسکل از پیغمبر ایام خویش۔ حاشیہ کی قراءت چار نسخوں ۱۸۷، ۱۸۸، ۵۹۵ میں ملتی ہے ان میں ۵۹۵ قدیم ترین نسخہ ہے۔ اقبال نے اس شعر کو یوں تضمین کیا ہے

مگسل از ختم الرسل ایام خویش   تکیه کم کن بر فن و بر گام خویش

ملاحظہ ہو رموز بیخودی ص ۱۵۲) [11] دفتر ششم ص ۲۲۲، شعر ۲۰۴۳ [12] دفتر اول ص ۳، شعر ۳۳ [13] دفتر دوم ص ۲۴۴، شعر ۱۷۵۲ [14] دفتر اول ص ۱۸، شعر ۹۸۱ ۔

عـلم و حکمت زاید از لقمۂ حلال | عشق و رقّت آید از لقمۂ حلال[1]
اے بسا بیدار چشم خفتہ دل | خود چہ بیند دیدِ اہلِ آب و گل[2]

ردیفِ "م"

من نکردم امر تا سودی کنم | بلکہ تا بر بندگان جودی کنم[3]
تُرکِ جوشش شرح کردم نیم خام | از حکیم غزنوی بشنو تمام[4]

ردیفِ "ن"

ہر کسی از ظنّ خود شد یارِ من | از درونِ من نجُست اسرارِ من[5]
خوشتر آن باشد کہ سرِّ دلبران | گفتہ آید در حدیثِ دیگران[6]
گر توکّل میکنی در کار کن | کشت کن پس تکیہ بر جبّار کن[7]
چیست دنیا، از خدا غافل بُدن | نی قماش و نقرہ و میزان و زن[8]
نقشِ حق را ہم بامرِ حق شکن | بر زجاجۂ دوست سنگِ دوست زن[9]
مسکنِ یار است و شہرِ شاہِ من | پیشِ عاشق این بود حُبُّ الوطن[10]
پس قیامت شو قیامت را ببین | دیدنِ ہر چیز را شرطست این[11]

ردیفِ "و"

رمزِ الکاسِبُ حبیبُ اللہ شنو | از توکّل در سبب کاہل مشو[12]
دانہ پنہان کن بکلّی دام شو | غنچہ پنہان کن گیاہِ بام شو[13]

ردیفِ "ہ"

چون نمی داند دلِ دانندۂ | ہست با گردندہ گردانندۂ[14]

۱؎ دفتر اول، ص ۱۰۱، شعر ۲۴۲۸، ۲؎ دفتر سوم، ص ۹۷، شعر ۱۷۰۰، ۳؎ دفتر دوم، ص ۳۳۲، شعر ۱۷۰۵، ۴؎ دفتر سوم، ص ۲۰۰، شعر ۹۲۰۰۔ اس شعر کا مصراعِ اولیٰ اس طرح مشہور ہے ع تُرکِ جوشش کردہ ام من نیم خام ۵؎ دفتر اول، ص ۳، شعر ۷۴ ۶؎ ایضاً ص ۱۰، شعر ۲۳۱ ۷؎ ایضاً ص ۵۵، شعر ۹۸۲ ۸؎ ایضاً ص ۱۸، شعر ۹۸۰۔ اس شعر کا مصراعِ ثانی یوں مشہور ہے ع نی قماش و نقرہ و فرزند و زن۔ حاشیہ میں بھی دو نسخوں میں 'میزان' کے بجائے 'فرزند' ہونے کا ذکر ہے۔ حاشیہ کی عبارت یہ ہے Bul. فرزند و زن. In a later hand has written فرزند over میزان ۹؎ ایضاً ص ۲۲۴، شعر ۵۰۰۳ ۱۰؎ دفتر سوم، ص ۱۷۰، شعر ۳۸۰۰ ۱۱؎ دفتر ششم، ص ۳۰۷، شعر ۵۰، ۱۲؎ دفتر اول، ص ۷۵، شعر ۱۴۰۹ ۱۳؎ ایضاً ص ۱۱۱، شعر ۲۳۸۳، ۱۴؎ دفتر ششم، ص ۴۹۰، شعر ۴۴۰۳۔

مصلحت در دینِ ما جنگ و شکوه ‌‌ ‌ ‌ مصلحت در دینِ عیسیٰ غار و کوه[۱]

ردیفِ «ی»

تو برای وصل کردن آمدی ‌ ‌ ‌ ‌ یا برای فصل کردن آمدی[۲]

بندهٔ یک مردِ روشن دل شوی ‌ ‌ ‌ ‌ به که بر فرقِ سرِ شاہان روی[۳]

تو دلِ خود را چو دل پنداشتی ‌ ‌ ‌ ‌ جُست و جُوی اہلِ دل بگذاشتی[۴]

اندرین بحث ار خرد رہ بین بُدی ‌ ‌ ‌ ‌ فخرِ رازی رازدانِ دین بُدی[۵]

---

۱ دفتر ششم، ص ۱۰۰۰، شعر ۱۹۰۹ ۲ دفتر دوم، ص ۱۹۳، شعر ۱۵؛ اس شعر کی موجودہ قرأت کے لیے ملاحظہ ہو: پاورق متعلق بہ شعر مذکور؛ [illegible]، ص ۱۷۹ ۳ دفتر سوم، ص ۲۰۳، شعر ۴۰۰ ۴ دفتر پنجم، ص ۷۵، شعر ۸۷ ۵ ایضاً، ص ۹۴۹، شعر ۴۹۴

۶ یہ شعر زبان زدِ عوام اس طرح ہے: ؎

گر به استدلال کارِ دین بُدی ‌ ‌ ‌ ‌ فخرِ رازی رازدارِ دین بُدی

مطبوعات خدابخش لائبریری، پٹنہ

۱۔ خدابخش: خدابخش لائبریری کے بانی کی ایک مختصر مگر جامع سوانح ازسرجدوناتھ سرکار اور صلاح الدین خدابخش (انگریزی) 10-00

۲۔ مصوری کا تاج محل: خدابخش لائبریری میں محفوظ عہد مغلیہ کے ایک نادر مخطوطہ "تاریخ خاندان تیموریہ" کا تعارف اور نمونے کی ۲۰ رنگین تصاویر۔ (انگریزی) 15-00

۳۔ مجموعہ مقالات پروفیسر سید حسن عسکری: پہلی جلد "گنج ارشدی" شرف الدین یحیٰ منیری "زین بدر عربی اور ملک بیو" پر مضامین (انگریزی) 10-00

۴۔ تدوین متن کے مسائل: خدابخش سمینار کے مقالات اور مباحثے (اردو) 15-00

۵۔ پنڈت موتی لال نہرو کا خطبہ صدارت: انڈین نیشنل کانگریس کی یوپی کی پہلی صوبائی کانفرنس (۱۹۰۷) میں: ایک اہم دستاویز (اردو) 10-00

۶۔ فرہنگ آصفیہ: مولفہ سید احمد دہلوی پر تبصرہ عظیم محقق قاضی عبدالودود کے قلم سے (اردو) 10-00

۷۔ بہار اردو لغت جلد اوّل: فرہنگ نمی از یوسف الدین احمد بلخی (م ۱۹۲۱) بہار میں عام طور پر بولے جانے والے الفاظ اور محاورات کی ایک اہم لغت (اردو) 15-00

۸۔ امیر خسرو بحیثیت مورخ —— از پروفیسر حسن عسکری (انگریزی) 25-00

۹۔ ہندستانی مسلمانوں کے مسائل: از سید حامد 30-00

۱۰۔ طب اسلامی: جنوبی ایشیائی علاقائی سمینار: روداد و مقالات 50-00

۱۱۔ رقعات رشید صدیقی: از ڈاکٹر مسعود حسین 30-00

۱۲۔ قومی یکجہتی کی روایت: از بی۔ این۔ پانڈے 5-00

۱۳۔ مولانا آزاد کی یاد میں: (ہندی) 15-00

۱۴۔ سجاد حیدر یلدرم: از ایرکن ترکمان 10-00

۱۵۔ آثار آزاد: خطوط آزاد بنام رگھور عظیم آبادی: از قدرت اللہ فاطمی 30-00

۱۶۔ ہندستانی مسلمان عصری دستاویزات کے آئینہ میں 50-00

• ترتیب وتدوین

۱۷۔ مجمع النفائس از سراج الدین علی خان آرزو (م ۱۱۶۹ھ): بارہویں صدی ہجری کے فارسی شعرا کا ایک اہم تذکرہ (فارسی) 10-00

۱۸۔ باغ معانی از نقش علی (م ۱۲۰۷ھ): بارہویں صدی ہجری تک کے فارسی شعرا کا دوسرا اہم تذکرہ (فارسی) 10-00

۱۹۔ مثنوی تصویر محبت از میر شمس الدین فقیر (م ۱۱۸۳ھ): عظیم آباد کی ایک داستان محبت جو میر کی شعلہ عشق کا ماخذ ہے (فارسی) 10-00

۲۰۔ صحف ابراہیم از علی ابراہیم خان خلیل (م ۱۲۰۸ھ) بارہویں صدی ہجری تک کے شعرا فارسی کا تیسرا اہم تذکرہ (فارسی) 10-00

۲۱۔ شمس البیان فی مصطلحات الہندوستان از مرزا جان طپش (م ۱۲۲۹ھ): شاہ عالم کے عہد کی محاورات اردو کی لغت 10-00

۲۲۔ تاریخ ہائے پیدائش ووفات معاصران: قطعات حسرت از شمس العلما محمد حسرت عظیم آبادی (م ۱۳۰۳ھ) فارسی 10-00

۲۳۔ کنز تواریخ: شاہ غلام یحیٰ عظیم آبادی (م ۱۳۰۲ھ) کے قطعات تاریخی (فارسی) 10-00

۲۴۔ تذکرہ کاملان رام پور: مرتبہ حافظ احمد علی خان شوق (م ۱۹۲۲) (عکسی اشاعت) "امیر مینائی کی "انتخاب یادگار" کے بعد تک رامپور کے مشاہیر اور وہاں کے ہندوؤں کی تہذیبی تاریخ کا اہم ماخذ تقریباً ۱۳۰۰ مشاہیر رامپور کا تذکرہ تصحیح واضافہ کے ساتھ (اردو) 50-00

• رسائل کے دفینوں سے اردو ادب کی بازیافت

۲۵۔ جلد اوّل: ادیب الٰہ آباد: نوبت رائے نظر کے ماہنامہ "ادیب" کے مکمل فائل (۱۹۱۰–۱۹۱۳) سے ادبی، علمی، تہذیبی، لسانی اور سیاسی مضامین کا انتخاب 50-00

۲۶۔ جلد دوم: العصر لکھنؤ: پیارے لال شاکر کے ماہنامہ "العصر" لکھنؤ (۱۹۱۱–۱۹۱۳) کے تمام دستیاب شماروں کا انتخاب جس میں ادبی، علمی اور تاریخی مضامین کے علاوہ فلسفہ، سائنس اور صنعت وحرفت پر بھی مضامین شامل ہیں۔ ۲۰ مشاہیر کی نادر عکسی تصاویر کے ساتھ۔ 50-00

۲۷۔ جلد سوم: صبح امید لکھنؤ: برج نرائن چکبست کے ماہنامہ "صبح امید" لکھنؤ (۱۹۲۱–۱۹۲۲) کے مکمل فائل سے ادبی، علمی اور تاریخی مضامین کے علاوہ تحریک آزادی کی معاصر شہادتیں اور انقلاب روس کے ہندستان پر اثرات سے متعلق مضامین کا انتخاب 50-00

۲۸۔ ۱۹۳۶ء میں قاضی عبدالودود کا معیار: قاضی عبدالودود کے مشہور اردو ماہنامہ "معیار" پٹنہ (۱۹۳۶) کے مکمل فائل کی عکسی اشاعت: ایک بھرپور تجزیاتی مقدمے کے اضافے کے ساتھ 50-00

۲۹۔ جدید غزل گو: ۱۹۳۲ء کی ایک دستاویز: نیاز فتحپوری کے ماہنامہ "نگار" ۱۹۳۲ء کے خاص نمبر کی عکسی اشاعت، ۱۹۳۰ء تک کے غزل گو شعرا کا خود انتخاب کردہ کلام، خود نوشت سوانح، شعرا کی اسی عہد کی تصاویر اور خود نوشت تحریریں۔ 35-00

۳۰۔ خوشتر گرامی کا رسالہ "زبان" (۱۹۲۸–۱۹۳۶ء) مکمل عکسی اشاعت (تفصیلی اشاریہ کے اضافے کے ساتھ) اسلام، تاریخ ہند، تنقید، لسانیات، اردو جیسے موضوعات پر مقالات، ناولٹ، ڈرامے، افسانے، ایسے مکاتیب مشاہیر، تصاویر مشاہیر۔ 50-00

• خدابخش سلسلۂ خطبات

۳۱۔ عہد سلطنت (۱۲۰۶–۱۵۲۶ء) کے صوفی ادب پر ایک طائرانہ نظر: از ڈاکٹر بروس لارنس، امریکہ (انگریزی) 10-00

۳۲۔ عہد نبوی کی تقویم کی تشکیل نو: از ڈاکٹر ہاشم میر علی (انگریزی) 10-00

۳۳۔ صوفیہ کے مکتوبات وملفوظات: سماجی اور سیاسی تاریخ کا ایک اہم ماخذ، از پروفیسر سید حسن عسکری (انگریزی) 10-00

۳۴۔ اسلام کی چودہ صدیاں مکمل ہونے کی تقریب میں: ہندو مسلم مسئلہ اور اسلام وعصر جدید کے بارے میں چند خیالات از بدرالدین طیب جی۔ (انگریزی) 10-00

۳۵۔ فارسی ادبیات میں ہندوستان کا حصہ: جدید تحقیقات کی روشنی میں از ڈاکٹر امیر حسن عابدی (انگریزی) 10-00

۳۶۔ فکر اسلامی: بدلتی دنیا میں از پروفیسر سید وحید الدین (انگریزی) 10-00

۳۷۔ مشرق وسطیٰ: (شمالی افریقہ اور مشرق وسطیٰ) از پروفیسر علی اصغر آصف حسینی۔ (انگریزی) 10-00

۳۸۔ اسلامک اسٹڈیز: از ڈاکٹر زبیر صدیقی۔ (انگریزی) 10-00

۳۹۔ علیگڑھ تحریک: از سید حامد 5-00

۴۰۔ اسلام اور ہندستانی تہذیب: از بی۔ این۔ پانڈے۔ 10-00

۴۱۔ اورنگ زیب ایک نیا نادر نظر: از ڈاکٹر ام پرکاش (ہندی) 15-00

ذاکر صاحب

چند یادیں

جناب مرزا عزیز اللہ بیگ
ایڈوکیٹ

مرزا عزیز اللہ بیگ صاحب جو واردھا اور امراوتی میں صرف بیگ صاحب اور علیگڑھ کے اپنے ہم عصروں میں مرزا صاحب کے نام سے پہچانے جاتے ہیں۔ گاندھی جی اور مولانا محمد علی کے دور کی جامعہ کی کھری کھری سے کوئی کسوٹی پر کھرا اترنے والے وہ زر کامل عیار ہیں جنکے ساتھ کی نسل ایک پورا قافلے کا قافلہ ایک ایک کرکے ہمیشہ کو بچھڑتا جا رہا ہے۔ اب نہ کوئی مردولا سارا بھائی ہے نہ ٹیکا جی نہ جے پرکاش نرائن نہ شیخ عبد اللہ نہ چودھری شفیع۔ بس ایک مرزا صاحب ان خلوص کے پتلوں کی یاد دل میں سمائے اور آنکھوں میں بسائے اپنے ارد گرد تنہا Inspiration بنے ہوئے ہیں۔

۱۹۲۸ء کے آس پاس یہ جامعہ کے طالب علم تھے۔ ۳۰ سال بعد ۱۹۵۸ء کے آس پاس یہ ایک بار پھر طالب علم بنے۔ اس بار ان کی وابستگی علیگڑھ سے ہوئی جہاں سے قانون کا امتحان پاس کیا اور اسکے بعد وردھا جا کر وکالت شروع کی۔

گاندھی جی، مولانا محمد علی اور ڈاکٹر صاحب کی ساری اچھی باتیں کسی کو منہ نشین نہ سمجھے کا ذکر ہی سمٹ جائیں اور وہ بعد میں ایسے چپ چپاتے پوری زندگی گزار جائے، نہ لکھے نہ بولے کہ لوگ اسے جانیں، پہچانیں، سر پر بٹھائیں، آنکھوں میں بسائیں —— تو وہ اس انداز کا کتنا سچا جانشین ہوگا! —— (ادارہ)

ذاکر صاحب کی سی ممتاز اور جامع الصفات شخصیت کے بارے میں کچھ لکھنا ڈر لگتا ہے کہ قلم کی واماندگی اور بیان کی کوتاہی انکی عظمت اور بزرگی کا احاطہ نہ کر سکیں اور میرے تاثرات میں انکی سورج کی طرح روشن اور تابناک شخصیت کا دھندلا سا عکس بھی نظر نہ آئے۔

جامعہ کا ایک وفد اس وقت کے سی۔ پی برار کا دورہ کرنے کے لیے ہمارے علاقہ میں آیا۔ ہمارے علاقہ ہی کے رہنے والے ایک صاحب محمد علی خواجہ عبد الغنی صاحب ساتھ تھے۔ آزاد تعلیم کا پیغام لوگوں تک پہنچایا میرے والد مرحوم سرکاری ملازم تھے لیکن وہ جامعہ ملیہ اور مولانا محمد علی کے کاموں سے واقف تھے وہ مجھے جامعہ بھیجوانے پر آمادہ ہو گئے اسکا انہیں حکومت کو جواب بھی دینا پڑا۔

جامعہ کے ذکر کے دوران محمد علی صاحب نے مجھے بتایا کہ جامعہ کے ایک شیخ ہیں جو شیخ الجامعہ کہلاتے ہیں۔ یہ جامعہ کے پرنسپل اور سب ہی کچھ ہیں۔ شیخ الجامعہ کا سن کر میرا تصور عرب شیخ کی طرف گیا۔ میں عرب شیوخ کی تصاویر اخبارات و رسائل میں دیکھ چکا تھا۔ میں نے سمجھا شیخ الجامعہ کے سر پر قصابہ ہوگا عبا پہنے ہوئے ہونگے عرب شیخ کی طرح۔ میں نے شیخ الجامعہ کو ایک درخواست لکھی اور درخواست میں "یا شیخ" کہکر انہیں مخاطب کیا۔ میری درخواست تھی کہ مجھے درجۂ خاص (Preliminary) میں داخلہ دیا جائے۔ یہ درجۂ خاص (Preliminary) عربی مدارس اور سرکاری مدارس کے فارغ التحصیل طلباء کے لیے ہوتا تھا کہ انہیں انگریزی اور عربی پڑھائی جا سکے تاکہ وہ جامعہ کی اگلی کلاسوں میں اپنا کام چلا سکیں۔ شیخ الجامعہ کا نہایت محبت بھرا جواب آیا کہ آپ یہاں آجائیں تو طے کیا جائے گا کہ کس درجہ میں آپ کو داخلہ دیا جائے۔ سرکاری مدارس میں طالب علموں کے لیے آپ کا نہیں

تم کا لفظ برتا جاتا تھا۔ یہ "آپ" کا لفظ جواب میں دیکھ کر شیخ الجامعہ کا بہت اچھا تصور قائم ہوا اور ذرا اپنی بڑائی بھی محسوس ہوئی۔ میں سنہ ۲۶ء میں جامعہ گیا پہلے استاذی خواجہ عبدالحی صاحب سے ملا۔ محمد علی بھائی بھی ساتھ تھے اب مجھے شیخ الجامعہ کے سامنے جانا تھا۔ دل میں خوف ڈر اور جھجھک پیدا ہو رہی تھی۔ دل دھک دھک کر رہا تھا۔ میں دبے پاؤں شیخ الجامعہ کے دفتر میں داخل ہوا۔ شاید استاذی خواجہ عبدالحی صاحب میرے بارے میں پہلے ہی ذاکر صاحب سے ذکر کر چکے تھے شیخ الجامعہ کے کمرے میں سفید کھدر کا فرش تھا۔ ذاکر صاحب ایک فرشی میز سامنے رکھے بیٹھے تھے۔ Gray رنگ کی کھدر کی شیروانی اور کھدر ہی کی سفید ٹوپی پہنے ہوئے۔ انکی داڑھی بڑی وضعدار تھی۔ میں نے جو شیخ الجامعہ کا تصور اپنے ذہن میں جمایا تھا وہ یکایک حرفِ غلط کی طرح مٹ گیا۔ ذاکر صاحب نے مجھے دیکھتے ہی خفیف مسکراہٹ کے ساتھ کہا "آئیے بیٹھئے"۔ اس مسکراہٹ اور آئیے بیٹھئے کے انداز نے میرے دل سے وہ خوف ڈر اور ہچکچاہٹ بالکل نکال دی۔ پھر محبت اور شفقت کے انداز سے مجھے سمجھایا کہ درجۂ خاص اس سال نہیں کھولا جائیگا اسلئے کہ طالب علم نہیں ہیں درجۂ خاص کامیاب ہونے کے بعد بھی آپ ثانوی چہارم میں جائیں گے اور اگر آپ ثانوی سوم میں داخلہ لیں تب بھی اسکے آگے کا درجہ ثانوی چہارم ہی ہے۔ سمجھانے کا انداز کچھ ایسا تھا کہ بات دل میں اتر گئی پھر میری دلچسپی، کھیل اور hobbies کے بارے میں پوچھا اور کہا آپ کا داخلہ ثانوی سوم میں کیا جائیگا آپ داخلہ فارم لکھ کر دیدیجئے۔ یہ تھا دوسرا تاثر ذاکر صاحب کے بارے میں کہ ایک سچا استاد کس محبت اور پیار سے طالب علموں کے مسئلوں کو حل کرتا ہے۔ رہنے کے لیے مجھے جوہر منزل میں جگہ ملی۔ جوہر منزل کے پاس ہی ایک کوٹھی تھی جس میں ذاکر صاحب اور رفیب صاحب دونوں رہتے تھے۔ ہمارے بورڈنگ ہاؤس جوہر منزل اور اس کوٹھی کے درمیان بس ایک پتلی سی گلی تھی۔ ذاکر صاحب جب صبح جامعہ جانے کے لیے نکلتے تو روز سامنا ہوتا ہمارا کمرہ اس پتلی گلی سے لگا ہوا ہی تھا۔ ذاکر صاحب پوچھتے آپ اچھے تو ہیں اور سلام کا جواب دیتے۔ ہم لوگ ذاکر صاحب کے گھر سے نکلنے سے پہلے ہی برآمدہ میں آجاتے کہ ذاکر صاحب کو سلام کریں اور پھر ان کے پیچھے پیچھے جامعہ جائیں۔

جوہر منزل میں ہمارے ساتھ کچھ ٹرانسوال (جنوبی افریقہ) سے آئے ہوئے طالب علم بھی تھے انہوں نے گاندھی جی کے ایما پر ہندوستان آکر جامعہ میں داخلہ لیا تھا۔ گاندھی جی کے خطوط ذاکر صاحب کے نام ان طالب علموں کی خیریت معلوم کرنے آیا کرتے تھے۔ ذاکر صاحب وہ خط لیکر ان کے کمرہ میں آکر ان کو خط سناتے انکے حالات پوچھتے باتیں کرتے۔ یوں بھی ذاکر صاحب اکثر ان لوگوں کے کمرہ میں آتے، پلنگ پر بیٹھ جاتے اس وقت ایسا معلوم ہوتا کہ ایک شفیق باپ اپنے بچوں سے بات کر رہا ہے یہ کوئی سات آٹھ طالب علم تھے ان میں ایک طالب علم بہت

کم عمر تھا۔ اس سے ذاکر صاحب بڑی پیار و محبت کی باتیں کرتے اور اسکے لیے چھوٹی موٹی چیزیں بھی لاتے شفیق الرحمن قدوائی صاحب جو ہر منزل کے نگراں تھے وہ بھی ذاکر صاحب کے ساتھ ہوتے۔ کبھی کبھی ذاکر صاحب ہم لوگوں کے کمرہ میں بھی آجاتے ہماری خیریت پوچھتے۔ ہم لوگوں کے بھائی بہنوں کے بارے میں پوچھتے۔ گھروں کے حالات پوچھتے اور اس طرح ہمارا فیملی بیک گراؤنڈ معلوم کرتے جو ایک کامیاب استاد کے لیے بہت ضروری ہے۔

ایک سال پورا ہوا۔ دوسرے سال میں ثانوی چہارم میں تھا معاشیات کے استاد یوں تو ہمارے شفیق صاحب تھے لیکن کبھی کبھی کلاس میں ہمیں معاشیات پر لیکچر دینے ذاکر صاحب بھی آجاتے تھے ان کا لیکچر بڑا دلچسپ اور عام فہم ہوتا تھا۔ ہم لوگ چاہتے تھے کہ ذاکر صاحب ہمیں یوں ہی آکر معاشیات پر لیکچر دیں۔

اسی سال کالج کے طلبا کی انجمن اتحاد کا نیا الکشن ہوا جس میں میں بلامقابلہ انجمن کا سکریٹری چناگیا۔

صدارت کے لیے صوبہ سرحد کے عبدالکریم خان صاحب جو کہ سرحدی گاندھی خان عبدالغفار صاحب کے بڑے صاحبزادے عبدالغنی خان صاحب تھے ان سے اور انجمن کے پرانے سکریٹری عبدالجلیل صاحب ندوی سے کچھ تنازعہ ہوگیا۔ پارٹی بازی کا جھگڑا تھا۔ عبدالکریم خاں صاحب بھی جھگڑے میں کود پڑے۔ الکشن کے دن بھی کچھ بدمزگی ہوئی۔ بات ذاکر صاحب تک پہنچی۔ دونوں فریقوں نے میرا نام لیا کہ مجھ سے پوچھا جائے کہ زیادتی کس فریق کی ہے میرا پہلے تو خیال ہوا کہ میں عبدالکریم خان صاحب کی طرف داری میں اپنا بیان دوں اور ان کی طرف داری میں باتیں ذاکر صاحب کو بتاؤں۔ میں بلایا گیا۔ میں اپنا یہ خیال لیکر دفتر میں داخل ہوا ذاکر صاحب نے مجھے دیکھتے ہی فرمایا "آئیے جناب دونوں فریقوں نے آپ پر اعتماد کا اظہار کیا ہے میں آپ پر اعتماد کرتا ہوں بلا کسی کی بے جا طرف داری کے صاف صاف بتائیے کہ واقعہ کیا ہے اور کس طرح ہے آپ کی بات سن کر میں اپنا فیصلہ دونگا۔" ذاکر صاحب نے کچھ اس انداز سے مجھ پر اعتماد کی بات کہی تھی کہ یہ خیال میرے دل سے بالکل نکل گیا کہ میں عبدالکریم خان صاحب کی طرف داری کردوں۔ صورت حال میں نے بلا کم و کاست بیان کردی ذاکر صاحب نے جو فیصلہ دیا اس سے دونوں فریق مطمئن ہوگئے اور اسکے بعد ایک دوسرے سے گلے ملے۔

ذاکر صاحب یورپ سے آنے کے بعد دو ایک سال ہی میں دلی کی سماجی اور علمی بلکہ ایک حد تک سیاسی زندگی میں بھی اپنا مقام بنا چکے تھے۔ ایک تو حکیم صاحب سے ان کا تعلق اور انکا جامعہ کی خدمت اور ایثار اور قربانی کا جذبہ جس سے جامعہ کا نام بھی اونچا ہوا اور ذاکر صاحب اور ان کے ساتھیوں کی قدر بھی بڑھی دلی والے ذاکر صاحب کی شخصیت سے کافی طور پر متعارف ہو چکے تھے۔ اہل سیاست بھی ان سے رائے اور مشورہ طلب کرنے لگے تھے۔

ان دنوں مسلمانوں میں Ph.D کی ڈگری پانے والے کم ہی تھے چند انے گنے نام آتے تھے اور بس اسلئے بھی ذاکر صاحب اور انکے ساتھیوں کی قوم میں بڑی عزت اور مرتبت تھی۔ یورپ سے آنے کے بعد انہیں اعلیٰ سرکاری ملازمت مل سکتی تھی لیکن یہ لوگ اتنی قابلیت کے باوجود جامعہ میں اپنی خدمت کا معاوضہ ڈیڑھ سو روپے سے زائد نہ لیتے تھے، ملک میں ایثار اور قربانی کے جذبہ سے کام کرنے والے یوں بھی کم یاب تھے۔

جامعہ کا یوم تاسیس ہر سال ۲۹ اکتوبر کو منایا جاتا تھا کہ اس روز حضرت شیخ الہند نے ۱۹۲۰ء میں اسکی بنیاد رکھی تھی۔ ذاکر صاحب کی جدت پسند طبیعت نے یوم تاسیس کے موقع پر یہ جدت کی کہ جامعہ کے طالب علم جامعہ کو اس روز اپنی طرف سے کوئی تحفہ پیش کریں۔ گروپ بنا کر یا انفرادی طور پر یہ تحفہ علمی یا حصول علم سے تعلق رکھنے والا ہو یسا کہ اُسے اس دن نمائش میں رکھا جا سکے۔ برادرم عبدالواحد سندھی صاحب میرے ہم جماعت تھے انہوں نے اور میں نے مل کر یہ طے کیا کہ دلّی کے اسلامی اور دینی تعلیم کے مدارس کی تاریخ انکے چلانے والے اخراجات اور نامور ہستیوں کے حالات جمع کر کے لکھیں اور جامعہ کو یوم تاسیس کے موقع پر پیش کریں ہم لوگ دلّی کی مساجد اور گلی کوچوں میں پھرے اور تقریباً ۳۰۔۳۵ مدرسوں کے حالات جمع کئے ہم لوگ جہاں جاتے ہر جگہ وہاں کے لوگ جامعہ اور ذاکر حسین صاحب کے نام سے مرعوب نظر آتے تھے۔ وہ لوگ پوچھتے "حکیم صاحب کی جامعہ" "مولانا محمد علی کی جامعہ" "ڈاکٹر ذاکر حسین والی جامعہ" اور ہمیں پورا پورا تعاون دیتے تھے۔

ڈاکٹر ذاکر صاحب دلّی کے علمی اور ادبی حلقوں میں مدعو کئے جاتے۔ خواجہ حسن نظامی کے یہاں بستی نظام الدین میں مجلس ہو یا کوچہ چیلان میں واحدی صاحب کے یہاں یا مولانا محمد علی کے گھر پر۔ یا حکیم اجمل خاں صاحب کے محلہ بلیماران میں سب جگہ انکی پوچھ ہوتی۔ اور یہ لوگ اکثر جامعہ آتے تھے۔ حکیم صاحب جو دلّی کے بے تاج کے بادشاہ کہلاتے تھے، جامعہ میں کس کس کو نہیں لاتے تھے! بیگم بھوپال، پنڈت مالویہ، مسٹر جناح، گاندھی جی، سی۔ ایف اینڈریوز، علامہ اقبال، سید سلیمان ندوی، سری نواس آئنگر، قاضی سلمان ـــــــ، افغانستان کے سفیر، پنڈت موتی لال نہرو، ڈاکٹر اینی بیسنٹ، سر فیروز خاں نون وغیرہ وغیرہ۔ جامعہ تو مولانا محمد علی کی تھی ہی آصف علی، عارف ہسوی، لالہ شنکر لال اور ایڈیٹر ملاپ جن کا دلّی کی سیاسی زندگی میں اعلیٰ مقام تھا، ان سے ذاکر صاحب کے مراسم تھے ہی، یہ لوگ سب آتے اور جامعہ کو خراج عقیدت پیش کرتے۔ یہ سب لوگ ذاکر صاحب کے کام کو سراہتے، ان کے ایثار اور قربانی کی تعریف کرتے اور حکومت سے آزاد تعلیمی اداروں کی ضرورت جتاتے، ان کی خراج تحسین میں ذاکر صاحب کا نام سب سے نمایاں ہوتا۔

ہم لوگ اس پر فخر کرتے کہ ہمارے شیخ کی اس قدر عزت افزائی ہوتی ہے۔

جامعہ کی عسرت کا دور تھا مالی حالت اچھی نہیں تھی اس پر بھی ذاکر صاحب اور ان کے ساتھی شانِ قلندرانہ سے رہتے تھے ان کا رکھ رکھاؤ ایسا تھا کہ انکے سارے کاموں میں قلندری کا اظہار ہوتا تھا تنخواہوں میں اضافہ کا سوال ہی نہیں! بلکہ استادوں نے خود اپنی تنخواہیں گھٹالی تھیں جسے ۸۰ ملتے تھے اس نے گھٹا کر ۵۰ روپے کر لئے یہ بھی ان کی شانِ قلندری ذاکر صاحب کی شخصیت تھی جس نے اپنے گرد ایسے ایثار پسند لوگ جمع کر لیے تھے جنکی قربانی اور جذبہ خدمت اس بات کی ضمانت تھی کہ جامعہ کا کام آگے بڑھے گا اور کامیاب ہوگا قرول باغ سے باڑہ ہندو راؤ تک یکے چلتے تھے۔ فاصلہ کوئی ڈیڑھ ایک میل سے زائد ہوگا۔ باڑہ ہندو راؤ سے فتح پوری چاندنی چوک اور جامع مسجد تک ٹرام چلتی تھی ایک آنہ یا ڈیڑھ آنہ ٹکٹ ہوتا۔ ذاکر صاحب باڑہ ہندو راؤ تک کبھی پیدل اور کبھی یکے میں آتے جاتے تھے۔ کبھی کبھی دو چار طالب علم بھی ٹرام میں ذاکر صاحب کے ساتھ سوار ہو جاتے ذاکر صاحب ان سب کا کرایہ اپنی جیب سے دیتے۔

یہ بہت دنوں بعد کی بات ہے کیرالہ کے ایک طالب علم گنڈاپاجی (Gundappa) ذاکر صاحب کے پاس ایک تعلیمی کام کے سلسلہ میں آئے تھے ذاکر صاحب کے مکان کے پاس ایک کوٹھی کے آوٹ ہاؤس میں رہتے تھے (یہ بات اس وقت کی ہے جب جامعہ قرول باغ سے اٹھ کر اوکھلا آگئی تھی۔ جامعہ کی اپنی عمارتیں بن رہی تھیں) ذاکر صاحب کے یہاں ۳۰۲ بکریاں پلی ہوئی تھیں ایک دن ایک بکری کے گلے کی رسی کہیں گر گئی بیگم ذاکر حسین صاحبہ چرانے والے پر بہت خفا ہوئیں۔ گنڈاپاجی نے بیگم صاحبہ کی خفگی کا ذکر ذاکر صاحب سے کیا۔ ذاکر صاحب نے انہیں جواب دیا "گنڈاپاجی میری زندگی بہت مختصر چیزوں پر اور چھوٹی چیزوں پر مشتمل ہے ان میں سے ذرا سی چیز بھی ضائع ہو جائے تو اسکا اثر گھر کی زندگی کی ضروریات پر پڑتا ہے۔ بیگم صاحبہ اس چیز کو سمجھتی ہیں بکری کی رسی کے ضائع ہو جانے سے نقصان ہوا۔ بیگم صاحبہ چھوٹی چھوٹی چیزوں کو بنا اور سنوار کر رکھتی ہیں میں اس میں ان سے جہاں تک ہو سکتا ہے تعاون کرتا ہوں"۔

ذاکر صاحب اپنی آنکھوں کی خرابی کی وجہ سے گرم پانی کرنے کے لیے ایک المونیم کی دیگچی جب سیوا گرام آتے اپنے ساتھ لاتے جس میں بورک ایسڈ یا کوئی اور دوا ڈال کر آنکھ کو سینک لیا جاتا تھا۔ ایک مرتبہ سیوا گرام سے واپس جاتے ہوئے دیگچی لینا بھول گئے اسٹیشن پر اس کا خیال آیا۔ اسٹیشن سے سیوا گرام پانچ میل دور مجھ سے کہا "بھئی دیگچی بھول آیا میں یہ پانچویں یا چھٹی دیگچی ہے جو میں کھو چکا ہوں۔ کمرہ میں میرے

پلنگ کے پاس ہی پانی گرم کیا گیا تھا وہیں رہ گئی ہوگی۔ دیگچی تو معمولی المونیم کی ہے دوسری دیگچی بہرصورت آہی جائیگی لیکن بیوی کو جواب دینا پڑیگا۔ میں اپنے بچاؤ کی خاطر یہ بات بنادونگا کہ دیگچی آپ کے پاس رہ گئی ہے وہ آجائیگی بات آئی گئی ہو جائیگی لیکن ذرا سیواگرام میں پوچھ لیجئے اگر مل جائے تو لیکر رکھ لیجئے جب میرا ادھر آنا ہو تو آپ مجھے دیدیجئے گا چاہے مجھے یاد رہے یا نہ رہے۔

ایک مرتبہ ذاکر صاحب کو دکن ہندی پرچار سبھا کے تقسیم اسناد کے جلسہ میں مدراس جانا تھا صرف کے لئے کھدر کی جو شیروانی تھی وہ تو تھی ہی دوسری ایک اور بھی کھدر کی وہ بھی سیواگرام میں میلی سی ہو گئی تھی۔ ذاکر صاحب شام میں وردھا آئے دوسری صبح مدراس جانا تھا کہنے لگے "اچھی شیروانی مدراس کے جلسہ میں پہننے کے لیے ایک ہی تھی وہ بھی میلی ہوگی۔ رات کا وقت ہے دھل سکتی ہے؟ اور استری اس پر ہو جائیگی؟" چنانچہ رات کو وہ شیروانی دھلوائی گئی رات کو ہی سکھائی گئی رات بھر میں سوکھ گئی اور صبح ٹرین کے وقت سے پہلے استری کردی گئی۔ پھر ذاکر صاحب نے کہا "بھئی اسٹیشن چلتے چلتے منہ دھونے کا صابن بھی لینا ہے کہ رات سیواگرام آشرم کے چوہے کُٹ کُٹ کر رہے تھے اور صابن لے گئے۔ مدراس میں صابن کی ضرورت پڑے گی۔" بڑی بے تکلفی سے یہ باتیں کیں۔

ذاکر صاحب کھانے پینے کے معاملہ میں بے تکلفی برتتے تھے ایک مرتبہ شام کی ٹرین سے وردھا سے پونا کی طرف جا رہے تھے شام کا کھانا وہ ٹرین میں ہی کھاتے اس کے لیے ایک باسکٹ میں کھانے پینے کی چیزیں ان کے ساتھ کردی تھیں معلوم ہوا کہ گاڑی سوا گھنٹہ لیٹ ہے شام ہو گئی تھی ذاکر صاحب نے کہا "ریل میں بیٹھ کر کھانا تو مشکل ہوگا باسکٹ سے خوشبو بھی آرہی ہے اور یہ خوشبو دعوتِ طعام بھی دے رہی ہے اس کام سے میں ابھی فارغ کیوں نہ ہو لوں؟ ریل کے ڈبہ میں جگہ برابر ملے نہ ملے اور آپ کی یہ باسکٹ میں یہیں کیوں نہ چھوڑ دوں۔ مجھے میری بیوی لوٹا اور ٹفن کیریر سفر میں دیتی نہیں کہ میں بھول جاتا ہوں اس خوبصورت باسکٹ کو بھی کہیں بھول جاؤنگا نہ میرے کام آئیگی نہ آپ کے کسی اور کے کام آئیگی کیا خیال ہے۔" وہیں پلیٹ فارم پر جو چھوٹا سا باغ لگا تھا وہیں بیٹھ کے ذاکر صاحب نے کھانا بڑی بے تکلفی سے کھایا۔

ذاکر صاحب کو قریشی صاحب نے ٹپّی (Patti) آنیکی دعوت دی تھی تاکہ وہ اپنے مجوزہ دار العلوم کے نصاب اور انتظامی معاملوں کے سلسلہ میں ذاکر صاحب سے مشورہ لیں اس کے لیے انہوں نے میٹنگ بھی بلائی تھی۔ ذاکر صاحب وردھا سے اس جلسہ میں شرکت کرنے کے لیے پٹی جانیوالے تھے جنگ عظیم کا زمانہ تھا ریلوں میں جگہ مشکل سے ملتی تھی اسٹیشن پہنچے تو کسی ڈبہ میں جگہ نہ تھی فوجی بھرے ہوئے تھے۔ ذاکر صاحب سے میں نے عرض کیا کہ اس وقت کا جانا ملتوی کرکے کسی دوسری ٹرین سے جائیں۔ انہوں نے جواب دیا کہ "بھئی سوال وقت اور تاریخ کا

ہے قریشی صاحب قوم کی اور سیرت کمیٹی کی اتنی خدمت کر رہے ہیں انہوں نے بڑی محبت سے بلایا ہے میرا جانا فرض ہو جاتا ہے مجھے پٹی وقت پر پہنچ جانا چاہیئے میں فرض میں کوتاہی روا نہیں رکھتا نہ پہنچوں تو قریشی صاحب مایوس ہونگے میں انہیں مایوس کروں یہ میں نہیں چاہتا"۔ بالآخر ایک فوجی نے مشکل سے کھڑے رہنے کے لیے جگہ نکالدی۔ ذاکر صاحب کو کھڑے کھڑے کب جگہ ملی، ملی یا نہیں یا کھڑے کھڑے سفر کرنا پڑا معلوم نہیں۔

قرول باغ میں جامعہ کرایہ کی عمارتوں میں تھی۔ جامعہ لائبریری پڑھائی کے کمرے اور رہائش کے لیے مرکزی کوٹھی ان کے علاوہ جوہر منزل، گلشن منزل، پیلی کوٹھی جو جامعہ کے بورڈنگ ہاؤسز تھے یہ سب کرایہ کے تھے۔ قرول باغ میں جامعہ کی اپنی ایک عمارت ۱۹۲۹ء میں بنی افتخار میموریل ہال۔ اسے جامعہ کے ایک نہایت عزیز طالب علم افتخار حسین مرحوم کی یاد میں بنایا گیا تھا۔ ان کا انتقال جامعہ ہی میں ہوا جامعہ سے انہیں بہت لگاؤ تھا۔ جامعہ کے ہر کام سے انہیں خوشی ہوتی تھی متمول گھرانے سے تعلق رکھتے تھے انہوں نے اپنی جائداد کی آمدنی کے حصہ کی ایک رقم جامعہ میں جمع کرادی تھی کہ جامعہ اس روپیے کو اپنے مصرف میں لائے اور جامعہ کے پاس جب روپے ہو جائیں تو جامعہ انہیں واپس کر دے۔ ان کے بھائیوں نے انکے بعد بھی جامعہ کو روپیہ دیا جس سے میموریل ہال بنا اور ایک جلسہ گاہ کا جامعہ کے لیے انتظام ہو گیا۔ افتخار مرحوم ہی نہیں بلکہ اور طالب علم بھی جامعہ کو اپنا گھر سمجھتے تھے اور ایسا ہی لگاؤ انہیں جامعہ کی عمارتوں سے تھا جیسا اپنے گھر سے ہوتا ہے گو عمارتیں کرایہ کی تھیں۔ ذاکر صاحب اور انکے ساتھیوں نے ایسی لگن طالب علموں کے دلوں میں پیدا کر دی تھی۔

افتخار میموریل ہال حکیم صاحب کی وفات کے بعد بنوایا گیا تھا۔ حکیم صاحب کا انتقال بھی سن ۲۹ میں ہوا۔ انکے انتقال کے وقت ذاکر صاحب مدراس میں تھے۔ مدراس جامعہ کے کام سے گئے تھے وہاں سے ذاکر صاحب نے جامعہ والوں کو ایک تار دیا: 'Keep up your tails'۔ ہم لوگوں کو صورتِ حال کا پورا اندازہ نہیں تھا کہ حکیم صاحب کے جانے سے کیا افتاد جامعہ پر پڑی۔ ذاکر صاحب نے یہ محسوس ہی نہیں ہونے دیا کہ جامعہ کی کشتی گرداب میں ہے اور جامعہ مقروض ہے اور اب جامعہ کو چلانے کا خرچ کہاں سے آئیگا۔ جامعہ کو چلانے کے لیے ذاکر صاحب نے مجلس تعلیم ملی کی بنیاد ڈالی۔ ذاکر صاحب اور انکے ساتھیوں نے عہد کیا کہ بیس سال تک جامعہ کی خدمت اسی طرح کریں گے اور کبھی اپنی خدمت کا معاوضہ ڈیڑھ سو روپیہ سے زائد نہ لیں گے۔ جامعہ کو بعض خیر خواہوں کے ذریعہ یہ اطلاع بھی ملی کہ جامعہ چاہے تو حکومت سے امداد بھی مل سکتی ہے۔ حکومت اس کے لیے تیار ہے۔ لیکن سنا یہ ہے کہ ذاکر صاحب نے ان خیر خواہوں کو یہ جواب دیا تھا کہ

جب تک درختوں کا سایہ ہے جامعہ کا کام ان کے سایہ میں چلتا رہے گا اگر عمارتیں نہ ہوئیں۔ لیکن حکومت سے امداد جامعہ کے کام کے لیے ہرگز نہ لی جائے گی۔ طالب علموں میں بھی ذاکر صاحب کی یہ بات سن کر بڑا جوش اور جذبہ پیدا ہو گیا تھا۔ مجلس تعلیم ملی ایک قابل فخر کارنامہ بن گیا جسکی مثال ہندوستانی مسلمانوں میں نہیں ملتی۔ ذاکر صاحب ہر مرتبہ اپنی تقریر میں کوئی نہ کوئی چونکا دینے والی بات ضرور کہتے۔ وہ کہا کرتے تھے کہ جامعہ کا کام وہ اور انکے ساتھی عبادت سمجھ کر کر رہے ہیں۔ کام اگر خلوص اور نیک نیتی سے کیا جائے تو عبادت بن جاتا ہے۔ اس سے عبد کا رشتہ معبود سے پیدا ہو جاتا ہے۔

جامعہ کے وہ دن یاد آتے ہیں جب ذاکر صاحب بورڈنگ ہاؤس میں یکایک آجاتے، اگر کہیں کاغذ کے ٹکڑے پڑے ہوتے اور کچھ کوڑا کرکٹ ہوتا تو خود اٹھانے لگتے۔ ان کو یہ کام کرتا دیکھ کر ہم لوگ بھی اس کام میں لگ جاتے۔ ذاکر صاحب کی طبیعت میں صفائی اور نفاست رچی بسی تھی۔ ان کے کپڑے بھی صاف ستھرے کھدر کے ہوتے تھے۔ بورڈنگ ہاؤس کے صحن میں پانی کی نکاسی کے طریقے بتاتے اور بتاتے کہ یہ ضروری نہیں کہ کمروں میں اعلیٰ درجہ کا فرش ہو معمولی ٹاٹ کا فرش بھی صاف ستھرا رکھا جا سکتا ہے۔ کبھی کبھی کھانا کھاتے وقت ذاکر صاحب آجاتے ہم لوگ انہیں کھانا کھانے پر اصرار کرتے اور دسترخوان پر بٹھاتے۔ ذاکر صاحب کبھی ہندوستانی اور مشرقی کھانوں کا ذکر کرتے ان کے انواع و اقسام کے آداب دسترخوان بتاتے۔ صاف ستھرا دسترخوان ہو، کھانے والوں کے صاف ستھرے کپڑے ہوں۔ شیروانی کے بٹن لگے ہوئے ہوں ادب اور تمیز سے کھایا جائے نوالہ چبانے میں آواز نہ نکلے۔ کبھی مغربی کھانوں اور ٹیبل کے طور طریقے بتاتے۔ اور بہت ساری دلچسپ باتیں بتاتے۔ کمرہ میں کتابیں کیسی رکھی جائیں۔ لکھنے کی میز پر کپڑا کیسے بچھایا جائے۔ قلم دوات رکھنے کا سلیقہ اور قرینہ کیا ہو جس سے آپ کے ذوق نفاست کا اور طبع نفیس کا پتہ چلے۔ ذاکر صاحب خوشخطی پر بہت زور دیتے تھے اور کہتے تھے کہ اس سے لکھنے والے کی نفاست اور ذوق کا پتہ چلتا ہے۔ اور اسکی شخصیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ ورنہ لکھنے کو تو کسی بھی طرح لکھا جا سکتا ہے۔ سطریں سیدھی ہوں حروف کے دائرے مناسب اور برابر ہوں۔ قلم صاف ستھرا ہو۔ انگلیاں سیاہی سے آلودہ نہ ہوں۔ ذاکر صاحب خود بہت خوشخط تھے وہ کہتے تھے ان کے پیر نے ان سے خوب مشق کرائی ہے۔ کتابیں نقل کرائی ہیں۔

ہم لوگ درجہ میں فرش پر بیٹھا کرتے تھے۔ فرش کی صفائی اور ستھرا پن ذاکر صاحب خود بھی دیکھتے اور دوسرے استاد بھی۔ کتب خانہ کی کتابیں حفاظت اور سلیقہ سے استعمال کی جائیں کہ ان کتابوں کے پڑھنے والے آپ کے سوا اور بھی ہیں۔ کتابوں پر جا و بے جا نشان نہ لگائیے اس سے دھوکا بھی ہو سکتا ہے۔ ذاکر صاحب نے منشی علی محمد صاحب سے جو اپنے

عہد کے بہترین اور مشہور خطاط اور خوش نویس تھے جو صوم و صلوٰۃ کے بڑے پابند تھے اور بلا وضو کیے لکھنے نہ بیٹھتے تھے۔ ان سے کئی وصلیاں اور قطعات لکھوائے تھے اور انہیں طبع کرایا تھا یہ قطعات خوشخطی کا بہت اعلیٰ نمونہ ہیں اور آج بھی بہت سے جامعہ والوں کے پاس محفوظ ہیں:

سرمد گلہ اختصار می باید کرد　　یک کار ازیں دو کار می باید کرد
یا تن بہ رضائے دوست می باید داد　　یا قطع نظر زیار می باید کرد

اور حالی کا یہ قطعہ :-

دنیائے دنی کو نقش فانی سمجھو　　ہر چیز یہاں کی آنی جانی سمجھو
آغاز جب کرو کوئی کام بڑا　　ہر سانس کو عمر جاودانی سمجھو

یہ قطعات ذاکر صاحب نے منشی علی محمد صاحب سے لکھوا کر اپنے آفس کے کمرہ میں آویزاں کیئے تھے جس سے ذاکر صاحب کے حوصلہ عزم اور کام کی نوعیت کا اندازہ ہوتا ہے ان کی بزرگی اور عظمت کی نشاندہی ہوتی ہے۔ بڑے کام کا انہوں نے آغاز کیا تھا اور اپنی جان و تن اس کام میں لگا دینے کی آرزو انہیں تھی۔

ذاکر صاحب جب جرمنی تعلیم کے لیے گئے تو وہاں انہوں نے دیوان غالب خط نسخ میں اپنے اہتمام سے چھپوایا بلکہ انہوں نے اسکی Composing بھی کی تھی۔ دیوان غالب کا یہ ایڈیشن ذاکر صاحب کے ذوق اور نفاست اور غالب سے انکے لگاؤ کا مظہر ہے۔ اس ایڈیشن میں غالب کی ایک تصویر بھی انہوں نے شائع کرائی ہے جو اصلی نہیں ایک مصور کی بنائی ہوئی ہے جو ذاکر صاحب نے حلیہ، لباس اور ان کی وضع قطع کا Idea دیکر بنوائی تھی اور اسکے ساتھ دو قطعات خط نسخ میں مع تصویر چھپوائے تھے بہت ہی خوبصورت اور دیدہ زیب۔ غالب کا پہلا قطعہ تھا:

اے تازہ واردانِ بساطِ ہوائے دل　　زنہار اگر تمہیں ہوسِ نائے و نوش ہے
داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی　　اک شمع رہ گئی تھی سو وہ بھی خموش ہے

یہ قطعات ابھی تک بعض جامعہ والوں کے پاس محفوظ ہیں اور ذاکر صاحب کی یاد دلاتے رہتے ہیں۔

عیدین کے موقع پر بھی بہت خوشخط قطعات منشی علی محمد صاحب سے لکھوا کر ہم لوگوں کو ہر سال دیتے تھے بڑے خوبصورت کارڈس پر چھپوا کر، عید کی صبح ہی۔ اقبال کا قطعہ:

اے کہ از خمخانۂ فطرت بہ جامم ریختی　　آتش صہبائے من بگداز مینائے مرا

یا اکبر کا یہ قطعہ ع سینے میں دل آگاہ جو ہے کچھ غم نہ کرو ناشاد سہی

ع ہر چند بگولہ مضطر ہے اک رقص تو اسکے اندر ہے

اک مقصد لیکر آتا ہے اس دنیا میں جو آتا ہے محروم عمل جو رہتا ہے جیتے جی مر جاتا ہے

اور ایسے ہی دوسرے قطعات۔ بڑے خوشخط اور خوشنما۔

ذاکر صاحب کی باتوں میں بڑی کشش خلوص اور لطف ہوتا تھا۔ ایک مرتبہ مولانا مسعود علی ندوی جامعہ تشریف لائے ہم لوگوں کی کلاس مرکزی کوٹھی کے پھاٹک کے پاس ہی تھی جب مسعود صاحب اور انکے ساتھی تانگہ میں سوار ہونے لگے تو مولانا نے ذاکر صاحب کو مخاطب کر کے کہا، ذاکر صاحب آپ مقناطیس تو نہیں کھاتے ہیں آپ کے پاس سے جانیکو جی نہیں چاہتا۔ ذاکر صاحب مسکرا کر رہ گئے۔

ایک مرتبہ جواہر لال جی جامعہ آئے ذاکر صاحب انہیں جامعہ دکھانے لے گئے دکھاتے دکھاتے اسٹوڈنٹ کوآپریٹو اسٹور کے پاس پہنچے۔ جواہر لال جی اندر گئے وہاں کھدر کے کچھ تھان رکھے تھے۔ سن لائٹ سوپ اور دوسرے صابن غالباً لکس سوپ سودیشی اور بدیشی بہت سی چیزیں رکھی تھیں۔ وہ زمانہ ایسا تھا کہ سودیشی پر بہت زور دیا جاتا تھا جواہر لال جی جب دکان سے باہر نکلے تو ذاکر صاحب نے پوچھا "دیکھی دکان؟" جواہر لال جی نے کہا "ہاں"۔ پوچھا کیا کیا دیکھا؟ جواہر لال جی نے بڑے مزاحیہ انداز سے کہا یہی سن لائٹ سوپ اور دوسرے صابن وغیرہ۔ ذاکر صاحب کچھ شرمندہ ہو کر رہ گئے۔ طلبا کو خیال ہوا کہ بدیشی چیزیں اتنی دوکان میں نہیں رکھنی چاہئیں ورنہ ذاکر صاحب کو شرمندگی اٹھانی پڑتی ہے۔ یہ تھا ذاکر صاحب کا احترام اور محبت طالب علموں کے دلوں میں۔

جامعہ کا یوم تاسیس تھا حکیم اجمل خاں صاحب جلسہ کی صدارت کر رہے تھے۔ پنڈت مالویہ نے مرکزی عمارت پر قومی جھنڈا لہرایا تھا۔ (اس وقت تک جامعہ کا اپنا جھنڈا نہیں تھا) ڈاکٹر اینی بیسنٹ بھی جلسہ میں موجود تھیں۔ Legislative اسمبلی کے بہت سے اراکین اور عمائدین دہلی بھی۔ ذاکر صاحب نے مہمانوں کو خوش آمدید کہتے ہوئے جامعہ کے کاموں کا ذکر کیا تھا، بڑے مؤثر پیرایہ میں۔ ذاکر صاحب نے کہا تھا کہ جامعہ والے کام کو اس طرح کرنا چاہتے ہیں کہ لوگ اسکے کاموں کو پسند کریں۔ اگر لوگوں کی پسند کا یہ کام نہ ہوا تو جامعہ بند ہو جائے گی۔ عوام ہم کو ٹھکرا دینگے۔ جامعہ کا کام اگر معقول ہوا اور لوگ اسے پسند کریں تو ہم عوام سے چندہ نہیں بطور ٹیکس روپیہ لیں گے۔ اور اس طرح کہ دینے والا یہ سمجھے کہ ہم نے ان سے روپیہ قبول کر کے

ان پر احسان کیا ہے۔ دولت کو دراصل علم کا خادم ہونا چاہیئے علم کو دولت کے سامنے جھکنا اس کا منصب نہیں۔ اگر جامعہ کا کام اس انداز سے ہو تو چلتا رہے گا ورنہ جامعہ بند ہو جائیگی" بڑے ہی موثر انداز میں ذاکر صاحب نے یہ باتیں کہی تھیں، باتیں دل سے کہی تھیں اور دلوں پر انکا اثر ہو رہا تھا۔ ذاکر صاحب کہا کرتے تھے "جامعہ کا طالب علم کہیں بھی ہو وہ ہر جگہ یہ سمجھے کہ وہ جامعہ کا کام کر رہا ہے۔ ایمان اور یقین کے ساتھ۔ اس سے اسکے دل کی صفائی ہوگی اور کام بھی نیکی کا اور اچھا ہوگا اور جامعہ کے نام سے وہ ہر جگہ پہچانا جائیگا۔ جامعہ ملک اور قوم کی زندگی میں اس طرح بس جائے تو ہر کام جو جامعہ کا طالب علم کرے جامعہ ہی کا کام معلوم ہوگا۔ یونیورسٹی کی تعلیم کا مقصد بھی یہی ہوتا ہے کہ ملک اور قوم کی زندگی میں تعلیمی درسگاہ ایک واسطہ ضبط اور ربط قائم کرے۔ جامعہ کے اسناد کو حکومت تسلیم نہیں کرتی اس کا طالب علم اپنی ڈگری سے نہیں اپنے علم اور کاموں سے پہچانا جائے۔ اس میں قدر فی الذات ہو اور معیاری۔ وہ ایسا سکہ نہ بنے جس پر ٹھپا لگ جاتا ہے تو سو روپے کا بن جاتا ہے حالانکہ اسکی قدر و قیمت چار آنہ بھی نہیں۔ آپ کو سرکاری نوکری تو ملیگی نہیں، ممکن ہے آپ اخبار نویسی کا پیشہ اختیار کرنا چاہتے ہوں آپ کا علم تاریخ سیاسیات اور معاشیات اسکے کام آئیگا۔ آپ تجارت کرنا چاہتے ہوں تو اقتصادیات کا علم آپ کے کام کا ہوگا، کسی اچھے تاجر کے پاس رہ کر آپ علم تجارت بھی سیکھ سکتے ہیں چاہے آپ تصنیف و تالیف کا کام کرنا چاہتے ہوں یا دکانداری آپ کا علم اور آپ کی استعداد کام آئیگی یہ بیکار جانے والی چیز نہیں"۔ اس زمانہ میں Business management & Commerce کا ایسا چرچا اور زور نہیں تھا جیسا آج ہے پھر بھی جامعہ میں کیلاٹ صاحب حالات حاضرہ پر Leaderette لکھواتے تھے۔ یہ جرنلزم کی کوئی باقاعدہ تعلیم تو تھی نہیں لیکن کچھ نہ کچھ تھی ضرور۔ ذاکر صاحب کہتے تھے "آپ کے کاموں پر اسلامیت اور جامعہ کی چھاپ ضرور ہو کہ آپ مسلمان ہیں اور جامعہ کے فارغ التحصیل"۔ جامعہ میں حرفہ کی تعلیم بھی ہوتی تھی لیکن اسکے ذریعہ روٹی کمانا مقصد نہیں تھا بلکہ یہ اصول کارفرما تھا کہ طالب علم ذہن و دماغ کے ساتھ اپنے ہاتھ سے کام کرنے کو عیب نہ سمجھے۔ ہاتھ اور دماغ دونوں برابر کام کریں۔ نجاری کی تعلیم تھی، جلد سازی بھی سکھائی جاتی تھی۔

ہندوستانی یونیورسٹیاں جامعہ کی سند کو تسلیم نہیں کرتی تھیں لیکن باہر کے ممالک جرمنی، فرانس اور مصر وغیرہ سند کو مانتے تھے۔ جامعہ کے کچھ طالب علم B.A. (Hons) کرنے کے بعد اور تعلیم حاصل کرنے کے لیے زیادہ تر جرمنی، فرانس، اور مصر جاتے، ایک دو بیرسٹری کی تعلیم کے لیے لندن بھی جاتے، وہاں Littlego کا امتحان پاس کرنے کے بعد بیرسٹری کے لیے داخلہ لیتے۔ غلام سرور صاحب (جامعہ کے ایک طالب علم) مصر کی فواد یونیورسٹی میں داخلہ لینے کے لیے جانیوالے

تھے، دستور کے مطابق Students' Union کی طرف سے ان کو خدا حافظ کہنے کے لیے ایک جلسہ ہوا۔ ذاکر صاحب بھی آئے۔ باہر جانے والے کو کچھ نہ کچھ تحفہ بھی دیا جاتا تھا۔ دستور کے مطابق ذاکر صاحب نے سرور صاحب کو ایک قرآن مجید بطور تحفہ دیا۔ تحفہ دیتے وقت تقریر بھی کی الفاظ تو ذہن میں نہیں رہے نہیں پوری طرح، مفہوم تقریباً یہ تھا۔ سرور صاحب آپ جانتے ہیں اس کتاب کی آیات ہمارے آخری پیغمبر حضرت محمد صلعم پر نازل ہوئی ہیں۔ عربی زبان کی فصاحت و بلاغت آپ جانتے ہیں کہ یہ جانی اور مانی ہوئی چیز ہے۔ لیکن اس کتاب، قرآن کی فصاحت و بلاغت ایک معجزہ ہے یہ خدا کا کلام ہے ہمارے رسول جو امّی تھے ان پر نازل ہوا تھا اس کتاب نے ایک انقلاب دنیا میں لایا اسکو پڑھکر ہزاروں کیا لاکھوں نے اپنی زندگیاں بنائیں کیا افراد کیا قومیں، وہ بامِ عروج پر پہنچیں اس کتاب کو اپنے لیے شمع ہدایت بنا کے۔ آپ بھی اس کو اپنی زندگی کی شمع ہدایت بنائیے۔ خدا آپ کی زندگی بامراد اور کامیاب کرے۔ تحصیل علم سے فارغ ہو کر خدا اور رسول پر ایمان کے ساتھ خدا آپ کو واپس لائے"۔

افتخار میموریل ہال میں ایک مشاعرہ کا انعقاد ہوا تھا۔ مولانا حسرت موہانی بھی شریک مشاعرہ تھے مولانا کے شعر پڑھنے کا انداز ایسا تھا کہ عوام کے من کو بھاتا نہیں تھا۔ مولانا نے اپنی غزل کے دو ایک ہی شعر پڑھے ہونگے کہ انکی آواز کی وجہ سے اشعار کی قدر دب کر رہ گئی اور مشاعرہ میں کچھ بے چینی کے آثار پیدا ہوئے۔ ذاکر صاحب مولانا کے پاس ہی بیٹھے ہوئے تھے بے ساختہ اٹھے اور مولانا سے انکی غزل کا پرچہ لیکر غزل پڑھنی شروع کی۔ مشاعرہ میں رنگ آگیا اور حسرت کی غزل کی خوب داد دی گئی۔ ذاکر صاحب کا ایک بیک اٹھنا اور حسرت کی غزل لیکر سنانا بھی مشاعرہ پر اثر انداز ہوا۔ ذاکر صاحب ان لوگوں میں سے تھے جو اچھے لوگوں اور اپنی بزرگ ہستیوں کی بات کو کسی طرح گرتے ہوئے نہیں دیکھ سکتے تھے۔ بزرگوں کی عزت اور قدر کس طرح کی جاتی ہے جانتے تھے۔ شہنشاہِ تغزل کا کلام اور ذاکر صاحب کی زبانی عجب رنگ بندھا۔

باہر کے مسلمان مشاہیر خصوصاً ترکی کے، ان کو بلا کر توسیعی لکچرس (Extension Lectures) کا سلسلہ جامعہ نے شروع کیا تھا۔ حکیم اجمل خاں صاحب کے بعد ڈاکٹر انصاری جامعہ کے امیر تھے۔ جنگِ بلقان میں یہ میڈیکل مشن لیکر ترکی گئے تھے، ترکی کے مشاہیر سے ان کے مراسم اور جان پہچان تھی پہلے رؤف پاشا آئے یہ وہ بحری جنرل تھے جو دردانیال سے جنگ کے زمانہ میں اپنا جہاز بڑی خوبی سے دشمن سے بچا کر نکال لائے تھے، پھر ہجت وہبی آئے۔ پھر خالدہ ادیب خانم۔ خالدہ ادیب خانم کے چھ لکچرس دو ماہ میں وقفہ وقفہ سے افتخار میموریل ہال میں ہوئے یہ سلسلہ تین چار سال تک جاری رہا۔ خالدہ خانم کے لکچروں کی صدارت ڈاکٹر بھگوان داس اور علامہ اقبال نے کی تھی۔ یہ لکچرس بہت کامیاب ہوئے بعض گوشوں میں اس پر اعتراض بھی ہوئے کہ کیے بعد دیگرے

ترکی کے لوگوں کو کیوں بلایا جا رہا ہے۔ یہ شاید پان اسلامزم (Pan Islamism) کو پھر سے زندہ کرنے کی تمہید نہ ہو۔ لیکن ذاکر صاحب کے سے مردِ حق ہیں اور حق آگاہ نے اسکی کوئی پرواہ نہ کی اور نہ جواب دیا۔ یہ تھی ذاکر حسین کی مومنانہ شان۔ خالدہ خانم گاندھی جی سے ملنے وردھا بھی آئی تھیں ذاکر صاحب انکے ساتھ تھے۔ خالدہ خانم کی انگریزی تقریر جو انہوں نے وردھا کے پبلک جلسہ میں کی تھی کا ترجمہ ذاکر صاحب نے اس خوبی سے کیا تھا کہ اس میں خالدہ خانم کی جوش اور شانِ خطابت سب کچھ آ گیا تھا اور لوگ بتاتے ہیں کہ ترجمہ حرف بہ حرف پورا تھا۔ ذاکر صاحب نے انصاری میموریل ہال کے افتتاح کے وقت کمرہ میں اردو کے شعرا اور نثر نگاروں کی تصاویر آویزاں کرائی تھیں۔ ایک جدت یہ بھی کی کہ افتتاح کے جلسہ میں ہر تصویر کے نیچے ایک ایک لڑکے کو کھڑا کر دیا گیا تھا جس نے ہر شاعر اور نثر نگار کی خصوصیاتِ کلام اور نثر کے نمونے پڑھ کر سنائے تھے جو اسے لکھ کر ذاکر صاحب نے دیئے تھے۔ یہ چیز بہت پسند کی گئی تھی۔ اسی میموریل ہال میں حفیظ جالندھری نے مولانا محمد علی کا مرثیہ "سر پھرا ملاح" سنایا تھا۔ حفیظ جالندھری کا ترنم اور مولانا محمد علی کا مرثیہ، عجیب کیفیت تھی لوگوں کی۔ ذاکر صاحب بھی موجود تھے ان کی آنکھیں اور اوروں کی بھی پرنم تھیں اور مجمع پر بہت اثر ہو رہا تھا۔ معلوم نہیں کیوں یہ خیال دل میں آ رہا تھا کہ ذاکر حسین میں ہمیں مولانا کا نعم البدل مل گیا ہے۔ یہ تھی ذاکر صاحب کی عظمت قدر و منزلت انکے شاگردوں کے دلوں میں۔

میں ثانوی چہارم (انٹرمیڈیٹ) کا پہلا سال میں تھا کہ میرے والد کا انتقال ہو گیا۔ میں تعطیلات کلاں میں گھر آیا ہوا تھا۔ میں نے یہاں سے ذاکر صاحب کو خط لکھا کہ مجھے اب کیا کرنا چاہیئے۔ ذاکر صاحب کا فوراً جواب آیا۔ ان کا خط میرے پاس بہت دن محفوظ رہا لیکن کہیں ضائع ہو گیا۔ خط کا مضمون مجھے ابتک حرف بہ حرف یاد ہے خط میں لکھا تھا "آپ کے والد صاحب کا انتقال ہو گیا۔ ان کا سایہ آپ کے سر سے اٹھ گیا۔ اس موقع پر صبر کی تلقین غم کو دونا کر دیتی ہے آپ کو خوب رونا اور آنسو بہانا چاہیئے۔ رونے سے دل کی صفائی ہوتی ہے اور دل کی بہت سی سیاہیاں دھل جاتی ہیں۔ میں آپ کو صبر کرنے کے لیے نہیں کہونگا آپ خوب رو لیجئے صبر اور سکون آ جائے گا۔ آپ اپنی تعلیم جامعہ میں جاری رکھئے اور یہاں سے فارغ التحصیل ہو جائیے۔ گھر کے انتظامات اپنے چچا کے سپرد کر دیجیے"۔ ذاکر صاحب کے خط نے مجھے ہمت دلائی اور میں اپنی تعلیم جاری رکھ سکا۔

ثانوی پنجم (انٹرمیڈیٹ) پاس کرنے کے بعد میں جامعہ کے بی۔ اے میں داخل ہوا۔ دورانِ تعلیم مجھے گھر آنا پڑا اور کئی مہینہ یہاں رہنا پڑا۔ استادوں کی مدد مجھے خاطر خواہ نہ مل سکی مجھے تو یہ ڈر تھا کہ میرے پرچے اچھے نہ ہو سکیں گے لیکن خدا کی مدد شاملِ حال رہی اور میں نے پرچے اچھے کیے۔ یہ پرچے اچھے کرنیکی بات میں نہیں کہہ رہا ہوں بلکہ میرے ایک کرم فرما اور دوست حفیظ الدین صاحب سے میرے پرچوں کی بابت ذاکر حسین صاحب

نے کہا تھا کہ استاد کی مدد نہ ملنے کے باوجود پرچے اچھے کیئے اور یہ کہ وہ چاہتے ہیں کہ میں ایک مدرسہ کھولوں چاہے ابتدائی ہی ہو اور اس میں جامعہ کی طرز کی تعلیم دی جائے۔ جب سے حفیظ صاحب نے یہ لکھا تھا اس وقت سے ایک مدرسہ کا خیال میرے ذہن میں جاگزیں تھا۔ لیکن میں رفیقانِ کار کہاں سے لاتا جن میں ایثار اور قربانی کے جذبات ہوتے ہیں خود بھی ایثار اور قربانی کے معیار پر پورا نہ اتر سکتا تھا ذاکر صاحب کی طرح اپنے ساتھ کام کرنے والوں میں جوش اور جذبہ کہاں سے پیدا کرتا۔ بس یہ خیال لیے ہوئے دو تین سال بیٹھا رہا کہ ایک سبیل نکل آئی۔

مسلم Mass Contact کی تحریک جو ۱۹۳۷ میں جواہر لال جی نے شروع کی تھی اپنے عروج پر تھی۔ وردھا کے سیٹھ جمنالال بزاز جامعہ کے خزانچی بھی تھے اور کانگرس کے ایک بہت بڑے لیڈر۔ اِن کا شکشا منڈل جو مارواڑیوں کی ایک ایجوکیشن سوسائٹی تھی ایک ہائی اسکول وردھا میں چلاتی تھی اس اسکول کے دو سکشن تھے ایک مراٹھی کا اور دوسرا ہندی کا۔ سیٹھ جمنالال جی اپنے ہائی اسکول میں ایک اردو سکشن بھی کھولنا چاہتے تھے۔ مسلم Mass Contact کے زیر اثر۔ ذاکر صاحب اس دوران میں گاندھی جی سے ملنے وردھا آئے ہوئے تھے ان سے جمنالال جی نے ذکر کیا کہ جامعہ سے کوئی شخص ہمیں دیجیے جو ہمارے اردو سکشن کو چلائے۔ اتفاق کی بات کہ ذاکر صاحب کے ذہن میں میرا خیال آیا۔ میں اسی نواح کا رہنے والا تھا۔ ذاکر صاحب نے مجھے ایک خط لکھا کہ آپ وردھا آجائیے اور سیٹھ جمنالال جی کے اردو سکشن میں کام کیجئے۔ سیٹھ جمنالال جی یہ چاہتے ہیں آپ جامعہ میں رہ چکے ہیں اگر ہو سکے تو اردو سکشن میں جامعہ کی کچھ باتیں بھی لائیے۔" میں وردھا آگیا اردو سکشن کا انچارج بنکر۔ اسی سال مارواڑی شکشا منڈل (مارواڑی ایجوکیشن سوسائٹی وردھا) نے اپنی سلور جبلی منائی۔ اور اسکے ساتھ ہی ایک تعلیمی کانفرنس بھی کیا جانا طے کیا۔ صوبوں میں کانگریسی وزارتیں آچکی تھیں۔ شراب بندی کی تحریک ان صوبوں میں چل رہی تھی۔ لیکن اس تحریک پر یہ اعتراض ہو رہا تھا کہ شراب کے ٹیکس سے جو آمدنی ہے وہ کم ہو جائیگی ہم تعلیم کو مفت اور عام کرنا چاہتے ہیں یہ کیسے ہو سکے گا؟ گاندھی جی نے اپنے اخبار ہریجن میں تعلیم اور شراب بندی پر اپنے خیالات کا اظہار کیا اور کہا کہ تعلیم خود کفیل ہو کسی حرفہ کو مدرسہ میں جاری کیا جائے اور بچے کام کر کے مدرسہ کا خرچ پورا کریں۔ شکشا منڈل کی جوبلی کے موقع پر اسکے لیے گاندھی جی کے ایما پر ایک تعلیمی کانفرنس بھی بلائی گئی۔

اس کانفرنس میں کانگریسی صوبوں کے وزرائے تعلیم کے علاوہ ذاکر صاحب، مجیب صاحب، عابد صاحب بھی مدعو تھے۔ مدراس کے یعقوب حسن صاحب اور حیدرآباد سے مولوی عبدالحق اور انکے دو ایک ساتھی۔ بہار کے ڈاکٹر سید محمود بھی کانفرنس میں شریک تھے۔ گاندھی جی اس کانفرنس کے صدر تھے۔ اپنی ابتدائی

تقریر میں گاندھی جی نے اپنے اس خیال کو کہ تعلیم خود کفیل ہو کانفرنس کے سامنے پیش کیا۔ گاندھیائی اصحاب نے کہا کہ چرخہ اور تکلی چلا کر تعلیم دینے کا خیال گاندھی جی کا بہت Original خیال ہے۔ کچھ کانگریسی وزراء نے بھی یہی کہا۔ ذاکر صاحب سنتے رہے اِدھر اُدھر دیکھا اور پھر یکایک کھڑے ہوئے اور اپنی تقریر شروع کی۔ الفاظ تو سارے یاد نہیں لیکن مفہوم یہ تھا "آپ لوگ یہ سمجھ رہے ہیں کہ تکلی اور چرخہ سے تعلیم دینے کا گاندھی جی کا خیال Original ہے اس سے تعلیم کا خرچ پورا ہوگا استادوں کی تنخواہیں دی جاسکیں گی اور مدرسہ کیلیے تعلیم کا اور سامان کا انتظام کیا جاسکے گا؟ لیکن ہم لوگ جو تعلیم کا کام کر رہے ہیں جانتے ہیں کہ تعلیم کو کسی حرفہ سے ربط دینا Corelate کرنا کوئی نیا نہیں، جرمنی میں ربط کے ذریعہ تعلیم دینے کو مقصدی طریقہ Project Method کہا جاتا ہے۔ تاریخ کے مضمون کو ایک بنیادی چیز بنا کر دوسرے مضامین سے Corelate کرنا یہ طریقہ رائج ہے اور دوسرے ملکوں میں بھی ربط کا طریقہ رائج ہے۔ کاغذ کاٹ کر مختلف ڈیزائن بنانا اور ان ڈیزائنوں سے تعلیم کو ربط دینا یہ طریقہ جاری ہے۔ چرخہ اور تکلی اس حرفہ کے ذریعہ بھی تعلیم دی جاسکتی ہے لیکن مدرسہ خود کفیل ہو جائیگا ایسا شاید نہ ہو سکے۔ خود جامعہ ملیہ میں ہم نے حرفہ کی تعلیم کا تجربہ کیا ہے یہ حرفہ کمائی کا ذریعہ نہیں کہ اس سے تعلیم کا خرچ پورا ہو اور باہنر کاریگر بنیں۔

اسکے لیے کاریگری کے مدرسے الگ قائم کرنے ہونگے۔ لیکن ہمارے ان مدرسوں میں جو ہم کھولنا اور چلانا چاہتے ہیں عام اور جنرل تعلیم ہوگی جس میں بچے ہاتھ کا کام کرنے کو باعزت کام سمجھیں گے مزدوروں کا کام نہیں۔ یہ ضروری نہیں کہ تعلیم خود کفیل ہو اور نہ اسے مقصد بنایا جائے اور اس خیال سے تعلیم دی جائے" یہ سن کر بہت سے لوگوں کی جبینیں شکن آلود ہو گئیں کہ یہ تو گاندھی جی کی مخالفت کرنا ہو گیا۔ گاندھی جی کے خیال کو Original نہیں مانتے لیکن آخر میں جب گاندھی جی کے اس خیال کو ٹھیک ٹھیک طور پر پرکھنے اور جانچنے کے لیے کمیٹی بنائی گئی تو خود گاندھی جی نے ذاکر صاحب کا نام اسکی صدارت کے لیے تجویز کیا انکے ساتھ اور لوگ بھی تھے۔ عابد صاحب، ونوبا جی، جاجو جی اور کے۔ ٹی۔ شاہ، آریہ نائکم اور شریمتی آریہ نائکم پر یہ کمیٹی مشتمل تھی۔ اس کمیٹی کے ابتدائی جلسے کانفرنس کے بعد وردھا ہی میں ہوئے۔ اور بعد میں نصاب تعلیم بنانے کے لیے جو کمیٹی بنی اس میں کاکا کالیلکر اور خواجہ غلام السیدین کو بھی شامل کر لیا گیا۔ وردھا ہی میں کمیٹی نے اپنی رپورٹ اور نصاب تعلیم تیار کیا اور بنیادی تعلیم کی یہ رپورٹ "وردھا اسکیم" اور "ذاکر حسین کمیٹی" کے نام سے پورے ہندوستان میں مشہور ہوئی یہ رپورٹ تو تمام تر ذاکر صاحب ہی نے لکھی تھی وہ پرزے لکھ لکھ کر Typist کو دیتے جاتے تھے اور اس طرح رپورٹ تیار ہوتی رہی۔ پھر ہری پورہ کانگریس میں بھی بنیادی تعلیم کے لیے تجویز ذاکر صاحب نے پیش کی۔

شکشا منڈل کی جوبلی کے موقع پر اسکول کے طلبا نے اردو، ہندی، مراٹھی اور انگریزی کے ڈرامے، چار ڈرامے

اسٹیج کیے تھے ۔ اردو کا ڈرامہ میں نے تیار کرایا تھا یہ جامعہ کے غفار مدہولی کے ڈرامے "قوم پرست طالب علم" سے ماخوذ تھا۔ ڈرامہ کا اول نصف حصّہ میں نے تبدیل کر دیا تھا یہ ڈرامہ بہت کامیاب رہا۔ دوسرے ڈراموں میں کچھ ایسے پلاٹس تھے جو وقت اور موقع کی ضرورت سے مطابقت نہیں رکھتے تھے اس لیے اسٹیج کرنے والوں کو وہ حصے چھوڑ دینے پڑے۔ اس وجہ سے تینوں ڈرامے کچھ بگڑ گئے۔ اردو ڈرامہ کی سب نے تعریف کی ساتھ ہی ساتھ جامعہ کی بھی کہ ایک جامعہ والے نے ایسا ڈرامہ کرایا جس سے ہم لوگوں کو قوم پرستی کی تعلیم ملتی ہے "ذاکر صاحب کی جماعت ایسی قوم پرستی کی تعلیم دیتی ہے۔ ذاکر صاحب بھی اس تعریف سے خوش تھے۔ اس وقت ذاکر صاحب کے پاس مطبوعات جامعہ کا ایک سٹ اتفاق سے تھا جس میں پچاس کتابیں تھیں انہوں نے وہ کتابیں ڈرامہ سے خوش ہو کر اردو سکشن کو دیں اور اس طرح اردو لائبریری کی مدرسہ میں بنیاد پڑی۔ جامعہ کا نام اونچا ہوا اور بچوں کی بھی ہمت افزائی ہوئی۔ ذاکر صاحب ہندوستانی تعلیمی سنگھ کے صدر تھے۔ انہیں بنیادی تعلیم کے سلسلہ میں سال میں کم از کم دو مرتبہ اور کبھی کبھی تین بار بھی سیوا گرام آنا پڑتا تھا۔ وہ سیوا گرام آشرم میں ٹھہرتے کبھی عابد صاحب کبھی مجیب صاحب اور کبھی شفیق قدوائی صاحب ساتھ ہوتے۔ وہ بڑی شان قلندرانہ سے آشرم کے مطبخ کا روکھا پھیکا کھانا کھاتے، بچوں کی کلاسسز میں جا کر ان سے گھل مل کر باتیں کرتے ملک کے ہر حصّے کے بچے تعلیمی سنگھ کے مدرسہ میں تھے۔ بہار، اڑیسہ اور آسام کے بچے زیادہ تھے۔ کتائی اور بنائی کے درجوں میں زیادہ وقت صرف کرتے آشرم کے سارے پروگراموں میں شریک ہوتے اور تعلیمی سنگھ کے جلسوں میں شرکت کرتے بر اعتبار سے آشرم واسی کی طرح۔

دو تین دن تعلیمی سنگھ کے آشرم سیوا گرام میں گذارنے کے بعد جب انہیں دلی جانا ہوتا یا اور کہیں تو ایک رات پہلے میرے غریب خانہ پر قیام کا شرف مجھے بخشتے۔ اور اس قیام کے دوران ایسی ایسی باتیں اور گفتگو مجھ سے کرتے جس کا میں اہل نہ ہوتا۔

گاندھی جناح ملاقات کے بعد ذاکر صاحب سیوا گرام تعلیمی سنگھ کے جلسہ کے سلسلہ میں آئے تھے۔ گاندھی جی نے اس وقت اُن سے اس ملاقات کے بارے میں انکی رائے معلوم کرنی چاہی۔ ذاکر صاحب نے کہا "میں بھی اس ملاقات کے بارے میں پر امید تھا کہ کوئی نہ کوئی سیاسی سمجھوتا اس ملاقات میں ہو جائیگا لیکن افسوس کہ یہ نہ ہو سکا" گاندھی جی نے پوچھا "اب کیا کیا جائے؟ خواجہ عبدالمجید صاحب میرے پاس تجاویز لیکر آئے تھے کہ ان تجاویز پر Nationalist مسلمانوں سے سمجھوتا کر لیا جائے۔ میں نے ان سے پوچھا کہ میں کیسے سمجھوں کہ مسلمان آپ کی جماعت کے ساتھ ہیں؟" ذاکر صاحب نے گاندھی جی سے کہا کہ ہندو مسلم سمجھوتے کا جہاں تک تعلق ہے تو یہ آپ اور جناح صاحب ہی کے درمیان ہو سکے گا۔

جناح صاحب کے سوا اور کسی سے نہیں۔" گاندھی جی نے کہا: "ذاکر صاحب آپ بھی یہ کہتے ہیں؟" اس شام گاندھی جی کا بلڈ پریشر بڑھ گیا تھا۔

۱۹۴۰ء میں مارواڑی شکشا منڈل نے اپنی مراٹھی ہندی اور اردو کلاسز کو بند کرنے کا فیصلہ کیا۔ مراٹھی اور ہندی ہائی اسکول کا تو انتظام کر دیا گیا لیکن مسلم MassContact کے تحریک کی ناکامی کی وجہ سے اردو کلاسز کو نہ صرف بند کیا بلکہ اسکا دوسرا انتظام بھی نہیں کیا گیا۔ اس وقت ذاکر صاحب وردھا آئے ہوئے تھے۔ مدرسہ کا حال پوچھنے پر میں نے انہیں بتایا کہ مارواڑی شکشا منڈل نے اردو کلاسیں بند کر دی ہیں۔ ذاکر صاحب گاندھی جی سے ملے اور ان سے کہا کہ یا تو شروع ہی سے ان کلاسوں کو شکشا منڈل کو کھولنا ہی نہیں چاہیے تھا اور اگر کھولا تھا تو پھر اسے بند نہیں کرنا چاہیے تھا۔ مسلمانوں پر اسکا بُرا اثر پڑیگا۔ اردو کلاسز کے بند کر دینے کا گاندھی جی کو بہت افسوس ہوا۔ ذاکر صاحب نے گاندھی جی سے مل کر اردو کا ایک نیا مدرسہ کھولنے کے لیے انتظام کر دیا۔ گاندھی جی نے مجھے بلایا اور کہا "تم اسکول کے فرنیچر اور دوسرے سامان کا انتظام کرو روپیہ آجائیگا۔" چنانچہ مدرسہ کھلا اور آج بھی مولانا آزاد اردو ہائی اسکول کے نام سے قائم ہے۔ یہ کام ذاکر صاحب نے اتنی خوش اسلوبی سے کرایا اور مدرسہ چلانے کا انتظام اتنی خوبی سے کرا دیا کہ وہ لوگ جنہوں نے مدرسہ بند کیا تھا وہ بھی ہمارے دوست اور ساتھی بن گئے۔

جب ہندوستان کی Interim گورنمنٹ سن ۴۶ء میں بنی تو اس میں ذاکر صاحب کو شامل ہونے کی دعوت کانگرس نے دی۔ لیکن انہوں نے شامل ہونے سے انکار کیا یہ کہہ کر کہ ملک کی دو بڑی سیاسی جماعتوں میں اتفاق نہیں اور یہی دونوں جماعتیں Interim Government میں آنیوالی ہیں ان میں کوئی سمجھوتہ نہیں ہے تو ہم تعلیمی کام کرنے والوں کے لیے یہ بہت مشکل ہے کہ اس وقت ایسی گورنمنٹ میں شریک ہوں۔ اگر دونوں جماعتوں میں سمجھوتہ ہو جاتا ہے تو میں Interim گورنمنٹ میں شریک ہو جاؤنگا۔ ذاکر صاحب کے اس انکار سے جواہر لال جی تو نہیں لیکن ولبھ بھائی پٹیل ان سے بہت ناراض ہو گئے تھے۔ جب ذاکر صاحب جالندھر کے حادثہ سے بچ بچا کر آئے اور جواہر لال جی سے ملے تو پنڈت جی نے اس واقعہ پر اظہار افسوس کرتے ہوئے انہیں ولبھ بھائی سے ملنے اور صورتِ حال بتانے کا مشورہ دیا۔ ذاکر صاحب ولبھ بھائی پٹیل صاحب سے ملنا نہیں چاہتے تھے لیکن جواہر لال جی کے اصرار پر گئے۔ ذاکر صاحب کے پٹیل صاحب کے پاس جانے سے پہلے ہی جو تفصیلی باتیں ذاکر صاحب اور جواہر لال جی کے درمیان ہوئی تھیں وہ سب کسی طرح پٹیل صاحب تک پہنچ چکی تھیں۔ ہندوستان کی سیاسی زندگی میں بڑے بڑے اتار چڑھاؤ آ رہے تھے۔ گاندھی جناح ملاقات کے

بعد بعض حلقوں سے دونوں کی دوبارہ ملاقات کی آواز اٹھ رہی تھی۔ جناح صاحب کا اصرار تھا کہ ان سے مسلمانوں کا نمائندہ سمجھ کر بات کی جائے ادھر گاندھی کہتے تھے کہ کانگرس پورے ہندوستان، ہندو مسلم دونوں کی نمائندہ ہے اور وہ صرف ہندوؤں کے نمائندہ کی حیثیت سے بات نہیں کریں گے۔ اس دوران نواب صاحب بھوپال درمیان میں پڑے۔ گاندھی جی اور جناح صاحب سے انہوں نے علیحدہ علیحدہ ملاقاتیں کیں ان ملاقاتوں کا نتیجہ وہ اعلان تھا جس میں گاندھی جی نے کہا تھا کہ مسلم لیگ ہی کو وہ مسلمانوں کی نمائندہ جماعت تسلیم کرتے ہیں۔ نواب صاحب بھوپال کی اس کارکردگی پر انکی بہت واہ واہ ہوئی۔ نواب صاحب بھوپال کی اس کارکردگی میں ذاکر صاحب کی فہم و فراست کا بہت دخل تھا۔ ذاکر صاحب اور نواب صاحب دونوں چاہتے تھے کہ ملک میں جو غیر یقینی کی کیفیت پیدا ہوگئی ہے وہ کسی نہ کسی طریقہ سے دور ہو اور ہندوستان اپنی آزادی کی منزل کے قریب تر ہوجائے لیکن گاندھی جی نے دوسرے دن ہی یہ کہکر اپنا بیان واپس لے لیا کہ ان سے غلطی ہوئی وہ مسلم لیگ کو واحد نمائندہ جماعت ماننے کو تیار نہیں اور پھر ہندوستان کی سیاسی زندگی میں ایک انتشار پیدا ہوگیا۔

ملک کی تقسیم کے بعد پہلی مرتبہ ذاکر صاحب ایک جلسہ کے لیے سیوا گرام آرہے تھے شفیق صاحب قدوائی ساتھ تھے مسز کرپلانی بھی اسی گاڑی سے آئی تھیں۔ وردھا کے پلیٹ فارم پر ذاکر صاحب نے اپنے ساتھیوں سے ذرا ہٹ کر مجھ سے پوچھا کہ "آپ یہیں ہیں اور یہیں رہیں گے؟" میں نے "جی ہاں" جواب دیا کہا "یہاں سے بھی لوگ ہجرت کر رہے ہیں؟" میں نے کہا "جی ہاں حیدرآباد کا رخ کر رہے ہیں۔" "آپ کا مدرسہ کیسا چل رہا ہے" میں نے بتایا "اس پر بھی اثر پڑا ہے"۔ ذاکر صاحب نے کہا "موت تو برحق ہے۔ کہیں چھپ کر بھی آپ بیٹھیں تو وہاں بھی آئیگی۔ اس سے مفر نہیں، ثابت قدم رہیے۔ جہاں ہیں وہیں رہیئے۔ ایک مرتبہ آپ پھسلے تو پھسلتے ہی چلے جائیں گے۔ ایمان سلامت رکھئے اور خدا پہ بھروسہ"۔ ذاکر صاحب کو مسز کرپلانی نے آواز دی اور پھر وہ اُدھر چلے گئے۔ ذاکر صاحب اس وقت جالندھر کے حادثہ سے بچ کر آئے تھے جس کا بہت ہی مختصر ذکر انہوں نے خود کیا تھا۔ شفیق قدوائی صاحب نے پورا اور مفصل واقعہ کہ ذاکر صاحب پر کیا گذری بتایا تھا کہ کس حوصلہ اور ہمت سے کام لیکر انہوں نے جالندھر کے اسٹیشن پر آر۔ ایس ایس کے رضا کاروں سے کہا تھا کہ "بحمد اللہ میں مسلمان ہوں چلئے کہاں لیکر چلتے ہیں آپ مجھے" ایسے وقت جس کا بھروسہ خدا پر ہو وہی اپنی موت جو نظر آرہی تھی، کے سامنے یہ کہہ سکتا ہے۔ ایمان اور یقین کی یہ سخت آزمائش تھی جس میں ذاکر صاحب پورے اترے۔

ذاکر صاحب کو حیدرآباد سے قلبی لگاؤ تھا۔ حیدرآباد کے اندرونی حالات اچھے نہیں تھے۔ حیدرآباد

کے کرنسی نوٹس کے متعلق ایک مرتبہ بڑے جذباتی انداز میں کہا تھا کہ "انہیں تبرکاً محفوظ کرلیجئے تھوڑے دنوں بعد یہ دیکھنے کو نہیں ملیں گے۔ عہد رفتہ کی یادگار بن جائینگے"۔ دوسری طرف صورت حال پر بھی انکی نظر تھی کہ نظام یہ چاہتے ہیں کہ انکے تخت و تاج کو رضاکاروں سے بچایا جائے کہنے لگے "نظام یہ سمجھتے ہیں کہ حکومت ہند انکو بچا سکیگی میرے پاس پیغام آئے تھے کہ ولبھ بھائی پٹیل سے حیدرآباد کا سمجھوتہ کرانے میں نظام کی مدد کروں ایک لاکھ روپیہ بلکہ اس سے زائد بھی آپکی نذر ہوگا" ذاکر صاحب نے پیغام لانے والوں کو بتایا کہ "وہ غلط فہمی میں نہ رہیں کہ پٹیل کوئی سمجھوتہ کریں گے وہ تو نظام کا خاتمہ کرکے رہیں گے۔ اور آپ یہ بھی غلط سمجھتے ہیں کہ رضاکار نظام کو تخت و تاج سے محروم کردینا چاہتے ہیں"۔

تقسیم کے بعد شمالی ہندوستان خصوصاً دلّی میں شرنارتھی آنا شروع ہوئے ان کے بچوں کی تعلیم کے لیے دلّی سے نزدیک فریدآباد میں ایک مرکز کھولا گیا اس سلسلہ میں جو سرکاری کاروائی ہوئی کہ تعلیم کا انتظام کس کے سپرد کیا جائے تو جواہر لال جی کے کاغذات پر اسطرح کا نوٹ لکھا تھا:

"Education of refugee children should be entrusted to the Jamia as its responsibility. Jamia is more modern in a way and secular in its spirit."

ذاکر صاحب نے اس نوٹ کو دیکھ کر تعلیمی کام کرنیکی حامی تو بھر لی لیکن جواہر لال جی کو اس پر آمادہ کرلیا کہ شرنارتھی بچوں کی تعلیم کا کام ہندوستانی تعلیمی سنگھ کی ذمہ داری قرار دی جائے جامعہ والے اس کام میں تعلیمی سنگھ کو بلاشبہ مدد دینگے۔ یہ کام جامعہ کے ایک استاد شفیق صاحب کے سپرد کردیا گیا جنہوں نے اپنے طریقہ سے کام شروع کیا۔ یہ تعلیمی سنگھ والوں سے میل نہیں کھاتا تھا ذاکر صاحب کے پاس جب جھگڑا پہنچا تو انہوں نے فیصلہ کیا کہ جامعہ والے تو کام کرینگے ہی لیکن وہ کام تعلیمی سنگھ سیواگرام کے منشا کے مطابق ہوگا۔ تعلیمی سنگھ کی نائب سکریٹری آشادیوی فریدآباد مقیم رہینگی اور کام کی نگرانی کرینگی۔ اس طرح ہندوستانی تعلیمی سنگھ کے دو مرکز قرار پاتے۔ ایک ہندوستانی تعلیمی سنگھ سیواگرام اور دوسرا تعلیمی سنگھ فریدآباد۔ شرنارتھیوں اور آشادیوی جی میں کچھ اختلافات ہوتے اور بات بڑھی۔ شرنارتھیوں میں ایک صاحب تھے رام لال جی جو ایک جماعت کے لیڈر تھے۔ انہوں نے ایک خاتون شرنارتھی کو اپنے ساتھ ودّیا (تعلیم) کی دیوی بنا کر رکھا تھا۔ اپنے حواریوں سے ہر روز صبح شام دیوی جی کے سامنے پرارتھنا اور پوجا پاٹ کراتے تھے۔ آشادیوی جی کو اس پر اعتراض ہوا اور جھگڑا ابڑھا۔ رام لال جی نے برت رکھا برت کے بارہ دن کسی طرح گذر گئے۔ رام لال جی کہتے تھے کہ جبتک ذاکر حسین صاحب یہاں آکر میری بات نہیں سنیں گے میں برت نہیں توڑونگا۔ ذاکر صاحب فریدآباد گئے رام لال جی کی بات سنی اور رام لال جی نے برت توڑدیا۔ لیکن ان کا جھگڑا آشادیوی جی سے قائم رہا۔ کچھ دنوں بعد سیواگرام میں

تعلیمی سنگھ کا جلسہ ہو لبدری بابو بھی پٹنہ سے آئے تھے۔ اس وقت رام لال جی دیوی جی کو اور اپنے ساتھ ۱۰۰ اپنے ساتھیوں کو لیکر سیوا گرام آئے وہ چاہتے تھے کہ آشا دیوی تمام ممبران تعلیمی سنگھ کے سامنے ان سے معافی مانگیں کہ آشا دیوی نے ان پہ بیجا شک وشبہ کیا اور انہیں بدنام کیا۔ ذاکر صاحب کو پھر درمیان میں ڈالا گیا۔ کہاں تو رام لال جی اور انکے ساتھی بھرے ہوئے آئے تھے پولس کو اطلاع دینے کا سوچا جا رہا تھا لیکن ذاکر صاحب سے بات چیت کرنے کے بعد رام لال جی اور انکے ساتھیوں کی حالت یہ تھی کہ سب نے یک زبان ہو کر کہا کہ جو ذاکر صاحب کہیں وہ لوگ کرینگے۔ ذاکر صاحب نے بڑی حسن وخوبی اور خداداد صلاحیت سے کام لیکر اس جھگڑے کو یوں سلجھایا کہ رام لال جی بالکل رام ہو گئے اور شام ہی کی گاڑی سے دلّی روانہ ہو گئے۔ آشا دیوی کو رام لال سے معافی نہیں مانگنی پڑی۔ ایسی کئی الجھنیں ذاکر صاحب نے سلجھائی ہونگیں۔ ہر فریق کا ان پہ اعتماد تھا اور ان پہ بھروسہ رکھتا تھا۔

ذاکر صاحب جامعہ چھوڑ کر علی گڈھ نہ جاتے جہاں انہوں نے اپنی زندگی کے ۲۵ سال سے زائد گذارے اور اسکی تعمیر کی۔ لیکن وقت کے حالات اور تقاضے ایسے تھے کہ اس وقت وہ علی گڈھ کی وائس چانسلری قبول نہ کرتے تو قوم کے بہت بڑے نقصان کا اندیشہ تھا۔ علی گڈھ یونیورسٹی پر ہر طرف سے یلغار ہو رہی تھی اور ہر ایک معمولی حیثیت والا بھی اس سے وفاداری کا ثبوت مانگتا تھا اور بقول رشید احمد صدیقی صاحب علی گڈھ سے نیک چلنی کی ضمانت مانگتا تھا۔ ذاکر صاحب کے علی گڈھ جانے سے وہ فضا ختم ہوئی اور یونیورسٹی کو نئی زندگی ملی۔

ایک مرتبہ حیدرآباد کے ایک صاحب ذاکر صاحب سے گفتگو کر رہے تھے۔ دوران گفتگو میں مسٹر غلام محمد کا جو ان دنوں حیدرآباد کے فائننس منسٹر تھے ذکر آگیا۔ ان صاحب نے اُن کے خلاف بولنا شروع کیا اور صاحب موصوف کی کچھ اخلاقی کمزوری کی باتیں بتائیں۔ ذاکر صاحب ان صاحب کی گفتگو سے بے لطف ہو رہے تھے کچھ دیر صبر وسکون سے سنتے رہے پھر یکایک بولے۔ بس بس خاموش ہو جائیے۔ کمزوریاں کس میں نہیں ہوتیں مجھ میں اور آپ میں سب ہی میں اس سے کوئی خالی نہیں۔ آپ کی نظر صرف غلام محمد صاحب کی کمزوریوں پر گئی۔ آپ ان کی خوبیاں بھی تو دیکھیے۔ انکی صلاحیت کار اور کارکردگی پر نظر ڈالئے آپ موازنہ کرینگے تو انکی خوبیوں کا پلہ بھاری رہے گا۔ یہ بات تو درست نہیں کہ انکی کمزوریوں کو اچھالا جائے اور خوبیوں کو نظر انداز کیا جائے۔ اسکے بعد وہ صاحب شرمندہ ہو کر چپ ہو گئے۔ ذاکر صاحب اچھی باتوں کو پسند کرتے تھے اور اچھے لوگوں کو بھی اس سے خود انکی اچھائی اور عظمت کا پتہ چلتا ہے۔ وہ ہر ایک معاملہ کا روشن رخ بھی دیکھ لیتے تھے۔

ایک مرتبہ سیوا گرام میں ونوبا جی بھی جلسہ میں شریک ہونے آئے ذاکر صاحب عابد صاحب اور مجیب صاحب

بھی تھے۔ یہ سب جلسہ کے بعد باہر الگ پلنگ پر آکر بیٹھ گئے۔ ونوبا جی نے ذاکر صاحب سے کہا "میں ان دنوں قرآن شریف پڑھ رہا ہوں۔ عربی زبان بھی سیکھنا چاہتا ہوں۔ عربی گرامر کی کوئی اچھی کتاب بتائیے۔" ونوبا جی نے ایک عربی انگریزی گرامر کا نام لیا کہ "وہ میں دیکھ رہا ہوں لیکن مجھے ایسا لگتا ہے کہ گرامر ایسی لکھی نہیں جانی چاہیے جیسی وہ کتاب ہے۔" ذاکر صاحب نے کسی کتاب کا نام اور اسکے مصنف کا نام بھی بتایا۔ پھر قرآن پاک کے مضامین پر بات چلی۔ ونوبا جی سے ذاکر صاحب نے کہا "قرآن شریف کو خود پڑھنا چاہیے بہت اچھی بات ہے لیکن بہت سے مضامین اور احکامات سمجھنے کے لیے کسی اچھے استاد کی ضرورت باقی رہتی ہے جو ساری چیزوں پر عبور رکھتا ہو اسکے بعد ہی قرآن پاک کی عظمت کا صحیح اندازہ ہو سکتا ہے۔" ونوبا جی نے کہا "میں اسکی کوشش کر رہا ہوں۔" اسکے بعد ونوبا جی نے یکایک پوچھا "ذاکر صاحب آپ نے کبھی داڑھی منڈوائی ہے" ؟ ذاکر صاحب نے جواب دیا "نہیں ونو باجی میری داڑھی کو کبھی استرا نہیں لگا قینچی سے ترشواتا ہوں۔" پھر مزاحاً کہا "جرمنی میں خواتین میری داڑھی اور اسکی تراش کی طرز کو بہت پسند کرتی تھیں" اسی سلسلہ میں ذاکر صاحب نے بتایا کہ "جرمنی میں ایک شہر ہے وہاں ہر دسویں سال ایک میلہ ہوتا ہے اس میلہ کے لیے ڈھونڈ کر کوئی نوجوان ایسا نکالا جاتا ہے جسکی داڑھی کرائسٹ جیسی ہو مصوروں نے تصویروں میں کرائسٹ کی داڑھی بڑی خوبصورت بنائی ہے ایسی ہی داڑھی والا نوجوان ڈھونڈ کر میلہ کا ہیرو بنایا جاتا ہے۔"

گاندھی جی کی موت کے بعد سیوا گرام میں گاندھیائی تعمیری کام کرنے والے جمع ہوئے تھے۔ مولانا آزاد، عابد صاحب، مجیب صاحب اور ذاکر صاحب بھی بلائے گئے تھے۔ گاندھیائی کام کرنے والوں میں خواتین بھی تھیں۔ ان میں ایک خاتون مردولا سارا بائی بھی آئی تھیں انہیں علم تھا کہ ذاکر صاحب کے ساتھ جالندھر میں کیا حادثہ پیش آیا تھا۔ وہ ذاکر صاحب سے کہنے لگیں کہ وہ جالندھر جا رہی ہیں انہیں وہاں سے اغوا شدہ عورتیں نکلوانے کا کام کرنا ہے آپ کا بیگ اور بستر جو جالندھر میں رہ گیا تھا اگر وہ مل گیا تو لے آؤں ؟ ذاکر صاحب نے کہا "بستر اور بکس کی تو پرواہ نہیں ہے وہ کسی کے کام آ رہا ہوگا میری کتابیں بھی رہ گئی ہیں وہ شاید جالندھر میں کسی کے کام کی نہ ہوں۔ اگر وہ کہیں ملیں تو لیتی آئیے۔" مردولا بہن نے اسکی کوشش کرنے کا وعدہ کیا۔ کچھ دیر اِدھر اُدھر کی باتیں کر کے وہاں سے اٹھ گئیں۔ ذاکر صاحب نے مجھ سے پوچھا "آپ مردولا بہن کو جانتے ہیں بڑی بے پناہ عورت ہیں۔ تری پورہ کے کانگریس اجلاس میں وہ والنٹیر کور کی Organiser تھیں انہوں نے تنہا اس کام کو اس سلیقہ سے کیا کہ ہر صوبہ کے کانگریسی کام کرنے والوں اور لیڈروں کی تصویریں جمع کیں اور والنٹیرس کو اسکی ٹریننگ دی کہ ہر لیڈر اور کام کرنے والے کو وہ پہچان جائیں کہ کون آ رہا ہے اور کس صوبہ کا ہے۔ تاکہ انہیں کوئی دقت نہ پیش آئے۔ بڑے حسن و سلیقہ

سے یہ کام مردولا بہن نے کیا تھا۔ والنیٹرس کو منظم اور باقاعدہ رہنے کا خوب انتظام تھا۔ بڑے غضب کی کام کرنے والی ہیں مسلمانوں میں کوئی ایسا کام کرنے والا نہیں بات یہ بھی ہے کہ ہمیں ایسی ضرورت ابھی تک پیش نہیں آئی۔ ضرورت ہوگی تو شائد ہم میں بھی ایسے لوگ پیدا ہو جائیں اور ہماری خواتین میں سے کوئی بھی عورتوں کو نکال کر لانے کے لیے تیار ہو جائے۔"

سقوطِ حیدرآباد کے بعد عثمانیہ یونیورسٹی میں ذریعہ تعلیم کیا ہو اسکے لیے ایک کمیشن مقرر کیا گیا تھا۔ مولانا آزاد نے ذاکر صاحب کو اس کا چیرمین بنایا تھا۔ ذاکر صاحب مولانا آزاد سے ملنے گئے اور مولانا سے پوچھا "آپ خود عثمانیہ یونیورسٹی میں کیا تبدیلی چاہتے ہیں یہ بتا دیجئے" معلوم ہوا کہ اس وقت کے حالات میں جواہر لال نہرو بھی عثمانیہ یونیورسٹی میں ذریعہ تعلیم اردو ہو یہ نہیں چاہتے تھے۔ اس صورت میں کیا کیا جائے یہ سوال تھا۔ مولانا آزاد کی رائے اور ذاکر صاحب کا بھی یہ خیال تھا کہ عثمانیہ یونیورسٹی میں ذریعہ تعلیم انگریزی ہو۔ اسمیں سہولت بھی ہے اور آسانی بھی۔ ذاکر صاحب کا یہ کارنامہ بھی یاد رکھے جانیکے قابل ہے کہ انہوں نے کمیشن کے ممبران کو جس میں تلگو والے بھی تھے اور ہندی والے بھی اس پر آمادہ کرا لیا اور سب نے متفقہ فیصلہ کیا کہ یونیورسٹی میں ذریعہ تعلیم انگریزی ہو۔ گو ذاکر صاحب کو اسکا افسوس تھا کہ ذریعہ تعلیم اردو جو بڑی خوش اسلوبی اور کامیابی سے چلایا جا رہا تھا یوں ختم ہو رہا ہے۔ ملک میں اور ملک کے باہر بھی اس ذریعہ تعلیم نے بڑے وقار کا درجہ پایا تھا۔

ایک مرتبہ مولانا آزاد سبحانی ریل نہ ملنے کی وجہ سے وردھا رک گئے تھے اور شہر کی جامع مسجد میں مقیم تھے۔ انہی دنوں ذاکر صاحب بھی وردھا تشریف لائے تھے۔ ذاکر صاحب نے یہ خبر ملتے ہی آزاد سبحانی صاحب سے جامع مسجد میں جا کر ملنے کا فیصلہ کیا۔ میں نے کہیں ان سے پوچھ لیا کہ "مولانا آزاد سبحانی کو بھی کھانے پر مدعو کر لوں؟" ذاکر صاحب نے کہا "نہیں نہیں آپ مولانا کو جانتے نہیں اگر وہ یہاں کھانے کے لیے آئیں تو کھانے میں پچاس نقص نکالینگے اس طرح کہ آپ بدمزہ ہو جائینگے۔ مولانا کو بلانا مناسب نہیں میں آپ کے خیال سے کہہ رہا ہوں آپ کو اس سے تکلیف ہوگی اور مولانا کو بلا کر آپ بدمزہ ہو جائینگے" مجیب صاحب جو ذاکر صاحب کے ہمراہ تھے انہوں نے اس پر صاد کیا۔

ایک مرتبہ اردو زبان کا ذکر ہو رہا تھا اور لوگ بھی تھے بات چلتے چلتے روس تک پہنچی۔ ذاکر صاحب نے کہا کہ روس نے اپنی صوبائی زبانوں کو اجازت دیدی ہے کہ وہ اپنے اپنے صوبہ کی زبانیں استعمال کریں لیکن رسم الخط روسی ہو۔ اپنی اپنی زبانوں میں ہر صوبہ والا روس کے نظام حکومت کی تعریف کرے ہندی والے بھی یہی بات چاہتے ہیں کہ اردو کا رسم الخط بدل دیا جائے۔ رسم الخط بدلنے سے زبان کی خصوصیات ختم ہو جائیں گی۔ اور زبان کا اصلی حسن و خوبی باقی

نہیں رہے گی۔ یہ ہوگا رسم الخط بدلنے کا نتیجہ جیسا کہ روس میں ہو رہا ہے۔

ونوبا جی بھوی دان کے لیے ہندوستان کے دورے میں علی گڈھ بھی گئے تھے۔ مسلم یونیورسٹی میں بھی انہیں بلایا گیا تھا۔ ذاکر صاحب نے ان کا استقبال کرتے ہوئے ایک تقریر کی تھی۔ تقریر کیا تھی مسلمانانِ ہند کی دل کی دھڑکنیں اور انکے اندیشے اور ہندوستانی قومیت کا ایک صحیح تصور تھا۔ یہ تقریر اخبارات میں بھی شائع ہوئی تھی یہ آواز بھی جو اتنی صاف صاف، واضح اور برملا کسی ذمہ دار رہنما کو سنائی گئی تھی۔ بہت پر خلوص اور ایمان افروز تھی اس سے پہلے بھی ذاکر صاحب نے اسی طرح کی بات کاشی ودیا پیٹھ کے تقسیم اسناد کے جلسہ میں کی تھی اور ہندوستان میں مسلم قوم کا موقف، حالات اور زندگی کے بارے میں یہ کہا تھا:

گرچہ مثل غنچہ دلگیریم ما ـــــــ گلستان میرد اگر میریم ما

ذاکر صاحب قومیت اور قوم پرستی کا صحیح اور سچا تصور رکھتے تھے۔ ہندوستانی تہذیب اور اس کے مضمرات کو جانتے تھے اور اسکے علمبردار تھے۔ وہ ہندو مسلم سب فرقوں میں اتحاد، رواداری بھائی چارہ اور ماضی کے کارناموں پر فخر کرنیکا عملی پرچار کرتے تھے۔ اس تقریر کو اخبارات میں پڑھکر بہار مسلم ایجوکیشنل کانفرنس والوں نے یہ ارادہ کیا کہ کانفرنس کا اجلاس بلایا جائے جسکی صدارت کی تکلیف ذاکر صاحب کو دی جائے کیونکہ آزادی کے بعد بہت سے تعلیمی مسائل اس صوبہ میں پیدا ہوگئے تھے۔ مجھے ذاکر صاحب سے درخواست کرنے کے لیے دلی بھیجا گیا۔ ذاکر صاحب نے آنا منظور کر لیا۔ سب تیاریاں مکمل ہو چکی تھیں لیکن عین وقت پر اپنی علالت کے سبب ذاکر صاحب نہ آسکے۔ انہوں نے جیب الرحمٰن صاحب پرنسپل ٹیچرس کالج علی گڈھ کو اپنی بجائے بھجوایا تھا۔

۱۹۴۹ء میں بنیادی تعلیم کی کانفرنس صوبہ بہار کے ایک گاؤں بکرم میں ہوئی تھی جسکے ذاکر صاحب صدر تھے۔ کانفرنس کی صبح ذاکر صاحب نے ترنگا جھنڈا لہرایا تھا اور کہا تھا "جب میں یہ جھنڈا لہراتا ہوں تو لرز جاتا ہوں۔ اس جھنڈے کو جب ہم نے اپنایا تھا تو کہا تھا کہ یہ امن کا نشان ہوگا۔ جو اس جھنڈے تلے آئیگا وہ محفوظ اور مامون رہیگا۔ لیکن ہم نے ایسا نہیں کیا۔ اس جھنڈے کو لیکر ہم نے قتل و غارتگری کی اور خون کی ندیاں بہائیں۔ ہم بنیادی تعلیم کا کام کرنے والے ملک کو یہ بتانا چاہتے ہیں کہ اس جھنڈے کو لیکر ہم امن و شانتی کا پرچار کرنا چاہتے ہیں۔ ملک کے سب لوگوں کو آپس میں ملانا چاہتے ہیں۔ ٹوٹے ہوئے دلوں کو جوڑنے کا کام کرینگے۔ بچھڑے ہوئے ملجائیں اور ٹوٹے ہوئے دل مل جائیں تب ہی بنیادی تعلیم کو کامیاب کہا جا سکے گا۔ ورنہ بنیادی تعلیم اور اسکولوں کی دوسری تعلیم میں کوئی فرق نہ ہوگا۔"

دس بجے بنیادی تعلیم کی کانفرنس کا اجلاس ہوا۔ راجندر بابو بھی تشریف لائے تھے۔ ذاکر صاحب کا خطبۂ صدارت بڑے معرکہ کا تھا، پنے تلے جملے بولنے کا انداز، والہانہ اور بے ساختہ۔ گاندھی جی کی صفات بھی گنائی تھیں، اور کہا تھا، "وہ جس کو بھی چھو لیتے تھے اسی کو بھی سونا بنا دیتے تھے۔ کئی لوگوں کی انہوں نے زندگیاں بنائیں اور انہیں بڑا بنایا۔" تقریر کے نوٹس میں رہ رہا تھا بعض جملے اور الفاظ چھوٹ گئے تھے، پھر سیدین صاحب نے سیاق و سباق دیکھکر اور ذاکر صاحب سے پوچھکر اسے مکمل کیا تھا کہ یہ تقریر ہندوستانی تعلیمی سنگھ کے رسالہ "بنیادی تعلیم" میں چھپنے والی تھی۔ تقریر بہت دلنشیں تھی، ذاکر صاحب نے یہ بھی کہا تھا "حکومت کو تعلیم دلانے کا انتظام ایسا کرنا چاہیئے جیسا بچوں کے والدین چاہتے ہیں۔ ورنہ حکومت کو یہ نوید ہو کہ وہ زیادہ دن تک عوام پر حکومت نہیں کر سکے گی، اور اوپر سے لادی ہوئی اپنی تعلیمی پالسی نہیں چلا سکے گی۔" بنیادی تعلیم کی مخالفت سرکاری حلقوں میں افسرانِ حکومت Bureaucrats کر رہے تھے وہ نہیں چاہتے تھے کہ ہاتھ کے کام پر مبنی تعلیم رائج کی جائے۔ وہ یہ نہیں سمجھتے تھے کہ بنیادی تعلیم کا مطلب یہ ہے کہ بچہ کو بنیادی طور پر اتنی تعلیم دی جائے جتنا جاننا ہر شہری کے لیے ضروری ہے۔ مادری زبان کے ذریعہ تعلیم ہو۔ اسکی مدت سات سال ہو اور ہندوستانی قوم میں صحیح قومیت کے جذبات پیدا ہوں اور ہر مذہب والے ایک دوسرے کی قدر کرنا سیکھیں۔

اِس کانفرنس کے بعد ہی وہیں سے ذاکر صاحب یونسکو کے جلسہ کے لیے جانیوالے تھے۔ ذاکر صاحب بکرم آتے وقت پٹنہ کے اسٹیشن پر اپنا اسباب بھول کر چھوڑ آئے تھے۔ انکا خیال تھا شائد کسی والنیٹر نے انکا سامان اٹھا لیا ہوگا۔ صرف ایک بیگ انکے ہاتھ میں تھا۔ بکرم پہنچنے پر انہیں معلوم ہوا کہ اسباب ساتھ نہیں۔ بکرم پٹنہ سے کوئی ۱۵ میل تھا۔ اسباب کی تلاش شروع ہوئی۔ ذاکر صاحب کے اس بکس میں یونسکو جانے کیلیے ہوائی جہاز کا ٹکٹ تھا اور اخراجات کے لیے پیسے بھی۔ تلاش کے بعد بکس مل گیا۔ جب بکس آیا تو ذاکر صاحب نے کہا "ذرا کھول کر دیکھ لیجئے میرا ٹکٹ اور پیسے اسمیں ہیں یا نہیں"۔ بکس کے قفل لگے ہوئے تھے جو معمولی تھے کھول کر دیکھا تو ٹکٹ اور روپیے محفوظ تھے۔

ذاکر صاحب ایک مرتبہ سعودی حکومت کے بلانے پر یورپ سے واپسی پر حجاز گئے، وہاں انہوں نے عمرہ ادا کیا۔ معلم انہیں عربی زبان کی دعائیں پڑھا رہا تھا۔ ذاکر حسین صاحب نے انہیں روک کر کہا کہ "مجھے اپنی زبان میں بھی خدا سے کچھ دعائیں مانگنے دیجئے، عمرہ کا پورا حق میں ادا کر دوں۔ خدا سے اپنی زبان میں کچھ کہکر میری تسکین ہو جائے"۔ اور ایک بات انہوں نے کہی تھی کہ "وہ روایتی اونٹ جسکا ذکر ہم سنتے تھے عرب میں کہیں نظر نہ آیا۔"

اسکے بجائے کیڈلک اور رولس رائس نظر آئیں"۔

ذاکر صاحب شیخ الجامعہ کے عہدہ سے علی گڈھ کے وائس چانسلر پھر بہار کے گورنر اور اسکے بعد نائب صدر و صدرِ مملکت بنے۔ جتنے جتنے ان کے اعزاز اور عہدے بڑھے اتنا ہی انکے مزاج میں عجز اور انکسار آ گیا۔ ذاکر صاحب وہی ذاکر صاحب رہے جو جامعہ میں تھے۔ انکے ملنے جلنے کے انداز میں کوئی فرق اور تبدیلی نہیں آئی۔ ان کی اعلیٰ صفات اور اجاگر ہوتی گئیں۔ انکی دلنشیں گفتار اور دلنشیں ہوتی گئی۔ انکی شخصیت کی بلندی بلند تر ہوتی گئی۔ وہ جامعہ کے سردار تھے ان کے ساتھ کام کرنے والوں نے انہیں سرداری مانا تھا۔ بڑھتے بڑھتے وہ قوم کے بھی سردار بن گئے۔ اندرا جی نے سچ ہی کہا تھا کہ انکے صدارت کا عہدہ سنبھالنے سے اس عہدہ کی زیب و زینت بڑھی ہے۔ وہ بہت بڑے انسان تھے انکی پرکشش شخصیت زندگی کی چھوٹی چھوٹی باتوں کو بھی جب وہ بیان کرتے تو ان باتوں کو دلفریب بنا دیتی تھی۔ انکی طبیعت کی گہرائی اور مزاج کی گیرائی ہر معاملہ کے ہر پہلو تک پہنچ جاتی تھی۔ ان کے کاموں میں بلند ہمتی ارادوں میں تہذیب اور شرافت تھی۔ کام کو حسن و خوبی اور سلیقہ سے کرنے کا ڈھنگ پوری طرح جانتے تھے جیسے جیسے ان کے عہدے اور اعزاز بڑھتے گئے ویسے ہی انکے ذرائع بھی وسیع تر ہوتے گئے۔ اور ذاکر صاحب نے قوم کی خدمت کرنے کا ان ذریعوں سے کام لیا۔

ہندوستان میں حکومت کی مدد سے بہت اعلیٰ پیمانہ پر جشنِ غالب منایا گیا تھا۔ یہ ذاکر صاحب ہی کے طفیل ہوا کہ اردو کے ایک شاعر کی یاد حکومت نے منائی ملک کے ہر صوبہ اور زبان میں یہ جشن منایا گیا۔ یہ بھی ذاکر صاحب کا کارنامہ ہی سمجھنا چاہیئے کہ غالب کی عظمت کو ہندوستان نے پہچانا۔ جشنِ غالب کے بعد غالب کی قدر اردو اور ہندی جاننے والوں کے علاوہ اور زبانوں کے بولنے والوں میں بھی ہو رہی ہے اور یہ بھی ہے کہ اردو غزل سننے کا شوق بھی مسلمانوں کے علاوہ ہندوستان کے دوسری زبانیں بولنے والوں میں بھی پیدا ہوا ہے۔ یہ سب جشنِ غالب کا فیض ہے۔

ذاکر صاحب نے Oxford History of English Literature کی طرز پر "علی گڈھ ہسٹری آف اردو لٹریچر" لکھوانے کے لیے علی گڈھ یونیورسٹی کو مالی امداد بھی دلوائی تھی اپنے اثر اور رسوخ سے۔

علی گڈھ یونیورسٹی کی وائس چانسلری کے بعد ذاکر صاحب صوبہ بہار کے گورنر بنائے گئے۔ یہ صوبہ اہالیانِ حکومت کی ذاتی عداوتوں اور منافشوں سے ملوث تھا۔ ذاکر صاحب نے پانچ سال تک اس صوبہ کی گورنری اس شان اور کامیابی سے کی کہ پارٹی بازی کا ایک بھی جھگڑا ابھر کر سامنے نہیں آیا۔ ذاکر صاحب کی شخصیت ہی ایسی تھی کہ

صوبہ بہار کے سارے جھگڑے دبے رہے۔ وہ جب صوبہ بہار سے رخصت ہوئے تو لوگوں نے بڑے اعزاز اور بھرے دل کے ساتھ انہیں رخصت کیا۔ ستیہ نرائن سنہا صاحب دِلّی تک ذاکر صاحب کو چھوڑنے آئے۔

ذاکر صاحب کو آرٹ سے بھی بہت لگاؤ تھا۔ ان کے پاس یورپی مصوروں اور ہندوستانی مصوروں کے شاہکار جمع تھے۔ اوکھلا میں انہوں نے جامعہ کے "ڈرائنگ ہال" میں جرمن مصوروں اور ہندوستانی مصوروں کی تصاویر لگوائی تھیں جو انکے جمالیاتی ذوق کا مظہر تھیں یہ تصاویر وہ اپنے ساتھ جامعہ آنیوالوں کو دکھایا کرتے تھے۔——— ایک مرتبہ جب وہ بہار کے گورنر تھے اپنے پرائیوٹ سکریٹری مسٹر پاٹھک کو ساتھ لیکر جامعہ آئے اور ایک ایک تصویر کے پاس کھڑے ہو کر انہیں بتایا کہ اس تصویر میں کیا کیا خوبی ہے۔ "بچوں میں ذوق لطیف پیدا ہو اس واسطے یہ تصویریں میں نے یہاں لگوائی ہیں"۔

ذاکر صاحب کو پھولوں اور پودوں سے بہت شغف تھا خصوصاً کیکٹس سے۔ جامعہ کی کرایہ کی عمارتوں میں بھی انہوں نے پھول اور پودے لگوائے تھے علی گڈھ کیمپس کی چٹیل اور ناہموار زمینوں کو پھول اور پودوں سے سجادیا تھا۔ اور یونیورسٹی کیمپس کو گلزار بنادیا تھا ہر طرف پھول ہی پھول اور انکی دلفریبی یونیورسٹی کیمپس رنگ اور خوشبو سے بھر گیا تھا۔ اس سے ذاکر صاحب کے ذوقِ نظر نفاست اور حسن مذاق کا خوب اظہار ہوتا ہے۔ اوکھلا میں جامعہ کی نئی عمارات میں بھی یہی ذوق پھول اور پودوں کا بھرپور طریقہ سے نمایاں ہے۔ ان کے بہار کی گورنری کے زمانہ ہی کی بات ہے کہ ہندوستانی تعلیمی سنگھ کی مدد سے آرٹس کے استاد دیوی پرشاد جی نے بچوں کے آرٹ کے بارے میں ایک بہت اچھی کتاب لکھی۔ ذاکر صاحب ان کو دیوی بھائی کہہ کر پکارتے تھے۔ کتاب ہندی زبان میں تھی۔ دیوی بھائی چاہتے تھے کہ ذاکر صاحب سے اس کتاب کا تعارف لکھوائیں۔ انہیں مسودہ کتاب کا بھیجا۔ ذاکر صاحب نے دیوی پرشاد جی کو پٹنہ بلایا اور تین چار دن اپنا مہمان رکھا ان سے پوری کتاب سنی اور پھر فورورڈ لکھا اس فورورڈ میں ذاکر صاحب نے لکھا ہے "دیوی بھائی کی کتاب کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ دیوی بھائی نے بچوں کے آرٹ کے بارے میں بہت اچھی باتیں لکھی ہیں۔ اچھی کتاب کے لیے کسی تعارف کی ضرورت نہیں۔ اچھی کتاب خود اپنا تعارف ہے۔ مجھ سے دیوی بھائی نے اس کتاب کا تعارف لکھوایا ہے دیوی بھائی بڑے آرٹسٹ ہیں بڑے آدمیوں کے ساتھ اپنے نام کو جوڑ لینے سے آدمی خود بڑا ہو جاتا ہے اور بڑا ہی محسوس کرتا ہے میں ان کے نام کے ساتھ اپنا بھی نام ٹانک (جوڑ) لیتا ہوں" یہ تھے ذاکر صاحب جنہوں نے اپنے ایک ماتحت کی اس قدر عزت افزائی کی۔ ذاکر صاحب تعلیمی سنگھ کے صدر تھے اور دیوی بھائی بنیادی مدرسہ کے استاد۔ ایسی بات کسی افسر نے اپنے ماتحت کے متعلق شاید ہی کبھی کہی ہو۔

بہار کی گورنری کے زمانہ میں ذاکر صاحب نے خدا بخش لائبریری کی از سر نو تنظیم کرائی اور لائبریری کو مرکز کا ایک ادارہ بنایا اور حکومت سے منظور کرایا۔ یہ بہت بڑی بات ہوئی۔ وہیں انہوں نے شاد عظیم آبادی کے کلام کو جو مسودہ کی صورت میں تھا خود اپنے قلم سے نقل کیا، شاد کی تحریروں کو طبع کرایا۔

اکتوبر سن ۱۹۴۶ء میں جامعہ کے ۲۵ سال پورے ہوئے سلور جوبلی منائی گئی جس وسیع پیمانہ پر جوبلی کے انتظامات کیے گئے تھے وہ قابل دید تھے۔ نواب صاحب بھوپال نے جوبلی کے جلسہ کی صدارت کی تھی چار دن یہ جشن رہا۔ جوبلی کے جلسہ میں جو ۲۹ اکتوبر کو ہوا ڈائس پہ ایک طرف مولانا آزاد، جواہر لال نہرو، راج گوپال اچاری، آصف علی، کلثوم سیانی اور دوسرے کانگریسی اصحاب تھے درمیان میں نواب بھوپال اور دوسری طرف قائد اعظم جناح، نواب زادہ لیاقت علی خاں، سر عبدالقادر، غضنفر علی خاں، فاطمہ جناح، بیگم اکرام اللہ اور مسلم لیگ کے دوسرے اراکین تھے۔ اور پیچھے کی صفوں میں یونیورسٹیوں کے چانسلرس علی گڈھ یونیورسٹی کا وفد، لکھنؤ یونیورسٹی کا وفد، عثمانیہ یونیورسٹی کا وفد، بشیر حسین زیدی، قدسیہ زیدی اور سید حسین وغیرہ تھے۔ اور شاعروں میں جوش ملیح آبادی، روش صدیقی وغیرہ موجود تھے۔ ایسا سماں نہ کبھی ہندوستان میں دیکھا گیا اور نہ آئندہ دیکھا جائیگا۔ مسلم لیگ اور کانگریس دونوں کا ذاکر صاحب پر بھروسہ اور اعتماد تھا۔ دونوں انکے کاموں کی قدر اور عزت کرتے تھے۔ حفیظ جالندھری نے ایک نظم پڑھی تھی اسکا ایک شعر مجھے اس وقت یاد آرہا ہے:

وہ ذاکر جو مرقع تھا کبھی حسن و جوانی کا سبب کیا ہے ذرا اس سے تو پوچھو ناتوانی کا

ذاکر صاحب نے ۲۵ سال کی رپورٹ پڑھی تھی کہ کس طرح جامعہ والوں نے اپنا خون پسینہ ایک کرکے صحرا میں باغبانی کی ہے۔ انہوں نے مولانا محمود الحسن مرحوم کو اور مولانا محمد علی مرحوم کو زبردست خراج عقیدت پیش کیا تھا اور مولانا محمد علی کے متعلق کہا "وہ دیوانوں میں فرزانہ اور فرزانوں میں دیوانہ تھا۔ اور اس سے ہم نے بہت کچھ سیکھا ہے"۔ بہت سے پیغامات پڑھے گئے۔ جناح صاحب نے بھی تقریر کی اور جامعہ کو اپنا خراج عقیدت پیش کیا۔ وہ منظر بھی دیکھنے کے قابل تھا جب ذاکر صاحب کے ہر ہر جملہ کی داد ایسے دی جارہی تھی جیسی شعر کی داد دی جاتی ہے۔ سامعین سر دھن رہے تھے۔ تحریر میں جوش اور شان خطابت پورے عروج پر تھی۔ جامعہ کی بے سروسامانی کا نقشہ کھینچا تھا جامعہ میں کام کرنے والوں کی خدمات گنائی تھیں اکابرین قوم، کانگریس اور مسلم لیگ دونوں سے اپیل کی تھی کہ ملک میں فرقہ واریت کی آگ بھڑک رہی ہے یہ نہ سوچئے کہ آگ کس نے لگائی یہ سب کو جلا کر راکھ کر دیگی ایسے میں تعلیمی کام کرنے والوں کو جو محبت کا پیغام دینا چاہتے ہیں انکا کام دیوانگی معلوم ہوتا ہے کہ وہ

کیسے کام کریں۔ نفرت کے شعلوں کو کیسے بجھائیں اور محبت کی فضا قوم میں کیسے پیدا کریں۔ خدارا سر جوڑ کر بیٹھیے اور قوم و ملک کو بچائیے"۔

ذاکر صاحب کو پتھر جمع کرنے کا بہت شوق تھا۔ ان کے جمع کیے ہوئے پتھر اوکھلا میں ذاکر میموریل ہال میں اب بھی رکھے ہیں جو مختلف ملکوں کے لوگوں نے انہیں پیش کیے تھے۔ آخری مرتبہ مجھے ذاکر صاحب سے ملاقات کا شرف سکندر آباد (دکن) میں حاصل ہوا جہاں ذاکر صاحب دستور کے مطابق بحیثیت صدر ہند آکر ٹھہرے ہوئے تھے۔ ذاکر صاحب نے مجھ سے کہا "سنا ہے آپ کے نواح میں کچھ پتھر ملتے ہیں۔ کچھ میرے لیے بھجوائیے"۔ ذاکر صاحب پتھروں کے بارے میں کہا کرتے تھے کہ "پتھر کسی کو دھوکا نہیں دیتے جیسے وہ ہوتے ہیں ویسے ہی اپنے آپ کو پیش کرتے ہیں پتھروں سے کوئی دھوکا نہیں کھا سکتا۔ اور وہ زمین کی تاریخ بھی بتاتے ہیں کہ زمین کے اندر ان پر کیا کیا گذری۔ میں نے پتھر جمع کیے ان میں ایک گاؤں گرڑ Girad کے فوصل بھی تھے۔ چھالیہ، ناریل، گیہوں اور چاول، بادام، کھجور کے Fossil بھی۔ یہ Fossil گرڑ میں ایک ہی کھیت میں ملتے ہیں۔ ان فوصل کا ذکر Imperial Gazetteer of India اور وردھا ضلع کے Fossil میں بھی ہے کہ یہ کیسے بنے، ان کے علاوہ اور بھی کئی پتھر جمع کیے، رنگ برنگ کے، سبز و سرخ، کسی میں سے تانبہ کی ایک تہ گذری تھی اور کسی میں اور دھات کی۔ تہ بہ تہ ان پتھروں میں سے ہزاروں سال پہلے لاوا گذرا تھا۔ عجیب و غریب پتھر تھے۔ یوں بظاہر کچھ معلوم نہیں ہوتا تھا لیکن غور سے دیکھنے پر سب چیزیں عیاں ہوتی تھیں۔ میں نے کوئی آدھا تھیلا ایسے پتھر اور Fossil جمع کیے تھے ان کو صاف کیا، گرد و غبار نکالا تھا۔ انہیں مختلف ڈبوں میں رکھا تھا تاکہ ذاکر صاحب کو بھجواؤں۔ لیکن اسی تیاری میں تھا کہ ذاکر صاحب اللہ کو پیارے ہو گئے، اور پتھر نذر کرنے کی حسرت دل میں لیکر وردھا سے دلی جا کر ان کی آخری رسومات اور نماز جنازہ میں شرکت کی۔ ذاکر صاحب جامعہ ہی سے ایوان صدر تک آئے تھے اور ایوان صدر سے ہی جامعہ واپس گئے وہیں ان کا مقبرہ ہے۔

غالباً آنند نارائن ملّا نے ذاکر صاحب کی موت پر اپنے تاثرات کا اظہار کیا تھا، قطعہ کا ایک مصرعہ تھا

ع دفن ہو جائے نہ خوشبو بھی کہیں پھول کے ساتھ

ذاکر صاحب تو دفن ہو گئے مگر خوشبو باقی ہے اور مقبرہ کے پاس ہی گلاب کا بڑا تختہ ہے۔

جناب کے سی سرکار
بجلی محکمہ، حکومت بہار، پٹنہ

ذاکر صاحب
چند یادیں

بھارت رتن ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم کو یاد کرتے ہوئے میں ان سے اپنی متعدد ملاقاتوں میں سے جنکا شرف مجھے حاصل ہوا ہے صرف چند ایک لمحات کو یاد کر رہا ہوں اس امید کے ساتھ کہ یہ سبھوں کے لیے دلچسپی کا باعث ہونگے۔

ذاکر حسین کی ایک بہت ہی حسین، سیدھی سادی اور شفیق شخصیت تھی۔ ایسی شخصیت جو پرکشش ہونے کے ساتھ ساتھ جوہر شناس بھی تھی۔ نیپال ہاؤس۔ رانچی میں منعقدہ چھوٹا ناگپور رائفل کلب کے نشانہ بازی کے سالانہ مقابلے کی صدارت کرتے ہوئے انہوں نے پٹھانوں کی نشانہ بازی کے بارے میں جو مشاہدات پیش کیے تھے وہ مجھے یاد ہیں اس تقریب کا افتتاح کرنے کے لیے ذاکر صاحب کو ایک تپائی پر رکھی رائفل کی بلبلی رسمی طور پر دبانی تھی جسکا نشانہ پہلے سے چاند پر لگا ہوا تھا کرنل بھٹناگر، گورنر کے اے۔ ڈی۔ سی۔ انہیں تپائی تک لے گئے اور ان سے بلبلی دبانے کی گذارش کی پہلے سے چاند پر نشانہ لیے ہوئی رائفل کو ذاکر صاحب نے جیسے ہی دیکھا انکے لبوں پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ انہوں نے کہا، آپ جانتے ہیں میرا تعلق اس خطّے سے ہے جہاں کے لوگ اس بات پر فخر کرتے ہیں کہ انکی ہر گولی ہمیشہ نشانے پر لگتی ہے۔ گولی اور شکار کی تعداد ہمیشہ برابر رہتی ہے۔ اس لیے آپ کی تپائی کے بغیر یہ کام بآسانی کر سکتا ہوں۔"

یہ کہہ کر انہوں نے نشانہ بازی کا ایک ایسا عمدہ نمونہ پیش کیا اور وہ بھی صرف ایک ہاتھ سے کہ جسے دیکھ کر سبھی مبہوت ہوگئے۔

یہ تقریب نیپال ہاؤس کے احاطہ میں واقع میری رہائش گاہ کے قریب منعقد کی گئی تھی میرا لڑکا جو اس وقت بمشکل چار سال کا تھا ادھر ادھر کھیلتا پھر رہا تھا۔ اسے دیکھ کر گورنر صاحب کی توجہ اسکی طرف مبذول ہوئی انہوں نے اس کو اپنے پاس بلایا اور اسکے سر پہ تھپتھپاتے ہوئے پوچھا، کیا تم چڑیا کا شکار کر سکتے ہو؟" بچے کے فوری مثبت جواب سے ہر طرف خوشی کا اظہار ہوا۔

ایک دوسرے موقع پر کوکر (رانچی) میں واقع بہار اسٹیٹ الکٹریسیٹی بورڈ کے بجلی گھر کے معائنہ کے لیے ہم لوگوں نے گورنر کو دعوت دی۔ اس بجلی گھر کے ذریعہ ڈی۔ وی۔ سی کی بجلی رانچی کے علاقے میں پہلی بار آئی تھی۔ دوران گفتگو مغربی ممالک میں بجلی کی ترقی کے متعلق ان کی گہری واقفیت پر مجھے بے حد خوشی اور حیرت ہوئی۔ انہوں نے پیشن گوئی کی تھی کہ آنے والے دنوں میں جہاں تک انڈسٹری کا معاملہ ہے رانچی بہت ترقی کریگا، اور اس ترقی میں بجلی کا بڑا اہم رول رہے گا۔ آج ان کی پیشن گوئی صحیح ثابت ہو چکی ہے۔

ایک مرتبہ گورنر صاحب نے سینٹ زیویرس کالج، رانچی کی سالانہ تقریب کو زینت بخشی وہاں کا طالب علم ہونے کے ناتے میں بھی اس موقع پر حاضر تھا یسوعی راہبوں (Jesuit father) نے ذاکر صاحب کا بڑی گرم جوشی سے استقبال کیا۔ اسکے بعد میں نے ایک فادر کو ذاکر صاحب سے جرمن زبان میں گفتگو کرتے دیکھا اور یہ بھی دیکھا کہ گورنر موصوف غیر ملکی زبان بڑی روانی سے بول رہے تھے انہوں نے بڑے ماہرانہ اور عالمانہ انداز میں گفتگو کی۔ میں متجسس ہوکر تقریب کے اختتام پر اس فادر کے پاس گیا اور دریافت کیا کہ جرمن زبان سے گورنر صاحب کی واقفیت کیسی ہے؟ مجھے بہت تعجب ہوا جب فادر نے جواب دیا کہ "بہت عمدہ، وہ اس انداز سے بولے گویا ان کی مادری زبان ہو" بے شک یہ ایک بڑا خراج عقیدت ہے۔

ڈاکٹر ذاکر حسین بڑی عظیم شخصیت کے حامل تھے۔ ان کی شخصیت میں مشرق و مغرب کا بہترین امتزاج تھا۔ ہندوستان ان پر فخر کرنے میں حق بجانب ہے۔

●●

حکیم سید کمال الدین حسین ہمدانی
اجمل خاں طبیہ کالج، علیگڑھ

ذاکر صاحب
چند یادیں

پہلی بار میری ملاقات ذاکر صاحب سے اسوقت ہوئی جب میں ڈیمونسٹریٹر تشریح کی پوسٹ کے امیدوار کی حیثیت سے سلیکشن کمیٹی کے سامنے حاضر ہوا جسکے چیرمین ذاکر صاحب بحیثیت وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ تھے۔ اس وقت تک میری کوئی کتاب شائع نہ ہوئی تھی جسے سلیکشن کمیٹی کے سامنے پیش کر سکتا صرف مسودات تھے جو میں نے پیش کیے ذاکر صاحب نے میرے مسودات کو ایک نظر ملاحظہ فرمایا اور خوش ہوئے لیکن فرمایا "حکیم صاحب آپ لکھتے بہت ہیں اور مجھے یہ اندیشہ محسوس ہوتا ہے کہ آپ کہیں یونیورسٹی کے خلاف نہ لکھنے لگیں" میں نے جواباً عرض کیا آپ مطمئن رہیں انشاء اللہ میرا قلم یونیورسٹی کے مفاد ہی کے لیے چلے گا۔ یونیورسٹی کے نقصان کے لیے کبھی نہ اٹھے گا میرا جواب سن کر مطمئن ہو گئے اور ڈیمونسٹریٹر تشریح کی پوسٹ پر انہوں نے انتخاب میرا ہی فرمایا۔

دوسری مرتبہ میری ملاقات ذاکر صاحب سے اس وقت ہوئی جب طبیہ کالج کے طلباء نے طبیہ کالج میں جدید ایلوپیتھی مضامین کی کمی کے متعلق احتجاج کیا۔ تو ذاکر صاحب نے طلباء کے ساتھ پرنسپل صاحب اور ہم اساتذہ کو بھی طلب فرمایا اور معاملہ کی نوعیت کو سمجھتے ہوئے طلباء سے فرمایا کہ "آپ اس طبیہ کالج میں اپنی مرضی سے آئے اب جو یہاں مل سکتا ہے حاصل کر لیجئے اور جو نہیں مل سکتا اسکے لیے دوسرے کالج کی طرف رجوع فرمائیے بالکل اسی طرح کہ جس طرح آپ ایک دوکان پر جاتے ہیں تو آپ کی خواہش کے مطابق ہر شئے وہاں نہیں ملتی بس جو مل سکتا ہے آپ حاصل کر لیتے ہیں اور جو نہیں مل سکتا اسکے لیے دوسری دوکان پر جاتے ہیں یہ ضروری نہیں ہے کہ آپ کو ہر قسم کا سامان آپ کی مرضی کے مطابق ایک ہی دوکان سے مل جائے۔ لہٰذا ہماری دوکان پر آپ کو جو مل سکتا ہے آپ حاصل کریں اور جو نہ ملے اسکے لیے دوسری دوکان دیکھیں۔ میاں یہ طبیہ کالج ہے یہاں طبی مضامین پڑھائے جاتے ہیں ڈاکٹری مضامین آپ پڑھنا چاہتے ہیں تو میڈیکل کالج میں داخلہ لیں ایک طبیہ کالج میں ڈاکٹری مضامین کی مانگ اسی طرح نامناسب ہے جس طرح میڈیکل کالج میں طبی مضامین کی طلب" غرضیکہ ذاکر صاحب نے اس خوبی کے ساتھ طلباء کو سمجھایا کہ طلباء مطمئن ہوئے اور احتجاج

ست باز آئے۔ ڈاکر صاحب سے اپنی ملاقاتوں کے تذکرہ کے علاوہ دو اہم واقعات کا ذکر بھی یہاں ضروری سمجھتا ہوں جن سے ڈاکر صاحب کی زندگی کے دو اہم پہلو سامنے آتے ہیں۔

ڈاکر صاحب کو طلبار کی صحت کا بہت خیال رہتا تھا اور حفظ صحت کے اصولوں کے مطابق انہیں خود جو تجربہ ہوتا تھا وہ چاہتے تھے کہ طلبار بھی اس تجربہ سے مستفید ہوں چنانچہ ایک زمانہ میں ڈاکر صاحب کو سبزیاں کھانے کی رغبت زیادہ ہوئی اور اس سے انہیں فائدہ پہنچا تو انہوں نے طلبار کو بھی نصیحت فرمائی کہ وہ اپنی غذا میں سبزیاں زیادہ استعمال کریں اور پھر ہدایت جاری فرمائی کہ ہوسٹلوں میں دونوں وقت یا کم از کم ایک وقت طلبار کو نان گوشت کے بجائے ابلی ہوئی سبزیاں دی جائیں چنانچہ ایک عرصہ تک ہوسٹلوں میں طلبار کو ایک وقت ابلی ہوئی سبزیاں کھانے کو ملتی رہیں اور اس غذائی تبدیلی سے طلبار کو جسمانی و معاشی دونوں قسم کے فوائد حاصل ہوئے اسلئے کہ اس زمانہ میں سبزیاں سستی بکتی تھیں۔

ڈاکر صاحب کو اپنی صحت کا لحاظ بھی بہت رہتا تھا ایک بار جبکہ وہ ویانا تشریف لے گئے تو وہاں سے ایک خط انہوں نے شفاء الملک حکیم عبداللطیف صاحب کو لکھا جو شفاء الملک نے احقر کو بھی دکھایا اس میں ڈاکر صاحب نے اپنی صحت کے متعلق ایک عجیب انکشاف فرمایا تھا اور وہ یہ کہ انہوں نے لکھا کہ ویانا میں ہر عضو کے امراض کا ماہر موجود ہے چنانچہ اپنے جسم کے ہر عضو کا امتحان اس عضو کے امراض کے ماہر سے کرایا۔ اور جو رپورٹیں حاصل ہوئی ہیں ان کا خلاصہ یہ ہے کہ ہر عضو کا فعل بگڑ چکا ہے اور بلحاظ صحت کوئی عضو درست نہیں رہا۔ لیکن اس عالم میں بھی ڈاکر صاحب اپنے فرائض منصبی کو بدرجہ اتم و اکمل انجام دیتے رہے۔ اور بالآخر؎

چراغ سحر بجھ گیا جلتے جلتے

••

قدرت اللہ قاسم کے تذکرۂ شعرا

"مجموعۂ نغز" کا نسخۂ خدا بخش

ڈاکٹر وہاج الدین علوی

سابق خدا بخش ریسرچ فیلو، پٹنہ

تذکرہ شعرای ہندی (مجموعہ نغز) مولفۂ حکیم ابوالقاسم میر قدرت اللہ المتخلص بہ قاسم (م ۱۲۴۶ھ/۱۸۳۰ء). ایک مشہور و نادر روزگار تصنیف ہے۔ یہ اردو کے ریختہ گو شعراء کا ایک اہم تذکرہ ہے، جس میں محمد شاہ کے زمانے سے لے کر شاہ عالم ثانی کے اختتام عہد تک کے شعراء کے حالات و کلام پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ چونکہ مصنف دور سوم اور چہارم کے شعراء کا ہم عصر تھا اور ان سے ذاتی واقفیت رکھتا تھا، اس لئے معاصر شعراء کے حالات پر یہ ایک مستند تذکرہ ہے۔ اس عہد کی تالیفات کے دستور کے مطابق یہ فارسی زبان میں ہے۔

اس تذکرہ کا ایک قلمی نسخہ خدابخش لائبریری، پٹنہ میں محفوظ ہے۔ یہ ۲۵۸ اوراق پر مشتمل ہے اور خط نستعلیق میں ۱۸۲۲ء کا کتابت شدہ ہے۔ کاتب کا نام "سوائی رام" ہے۔ چونکہ مصنف کا انتقال ۱۸۳۰ء میں ہوا ہے اس لئے یہ نسخہ مصنف کی زندگی کا ہے، اور اس بنا پر اہم بھی ہے۔

اس تذکرہ کا ایک خطی نسخہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری (مولانا محمد حسین آزاد کلکشن) میں بھی محفوظ ہے۔ اسی نسخہ کو بنیاد بنا کر مرحوم محمود شیرانی نے اس نسخہ کو ایڈٹ کیا تھا اور سلسلہ نشریات کلیہ پنجاب یونیورسٹی لاہور نے ۱۹۳۳ء میں اسے شائع بھی کیا تھا، پھر ترقی اردو بورڈ دہلی نے بھی اسے ۱۹۷۳ء میں شائع کیا ہے۔

ایڈٹ کے وقت مرتب کے پیش نظر صرف "انڈیا آفس" لائبریری کا ایک نسخہ اور رہا ہے۔ خدابخش کے نسخہ سے مرتب استفادہ نہ کر سکے، وجہ غالباً یہ رہی ہو کہ یہاں اس نسخہ کا اندراج "مجموعہ نغز" کے نام سے نہیں بلکہ "تذکرہ شعرای ہندی" کے نام سے ہے، اور یہ اندراج غلط بھی نہیں۔ کیونکہ پوری کتاب میں مصنف نے کہیں بھی اس کا نام "مجموعہ نغز" نہیں بتایا ہے۔ تاریخ تصنیف کے سلسلے میں جو قطعات اس کتاب میں درج کئے گئے ہیں ان میں سے ایک قطعہ میں مادہ تاریخ کے طور پر "مجموعہ نغز" کا استعمال ہوا ہے۔ اسی طرح دیگر قطعات میں سے کسی میں مادہ تاریخ کے لیے "مجموعہ انتخاب"، کسی میں "باغ گل معنی" اور کسی میں "باغ و بہار" استعمال ہوا ہے۔ اور کسی کو بھی ترجیحی طور پر کتاب کا نام نہیں قرار دیا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ توضیحی کیٹلاگ (جلد ۸ ص ۶۵ مطبوعہ ۱۹۳۲ء) میں خان بہادر مولوی عبدالمقتدر لکھتے ہیں :

"Sprenger, Duch Cat. loc. cit. calls the work "مجموعہ نغز", but it is to be remarked that مجموعہ نغز is, like several others, only a chronogram, given in a versified Tarikh by Mir Galib 'Ali Khan, who adopted the takhallus Sayyid and was entitled Sayyid ush-shu'ara."

قاضی عبدالودود صاحب جب زندہ تھے تو متعدد ضروری اور اچھے کاموں کی ترغیب دیتے رہتے تھے۔ اسی ذیل میں انھوں نے یہ بھی فرمایا کہ "مجموعۂ نغز" کے خدابخش نسخہ کا مقابلہ نسخۂ شیرانی سے کر لیا جائے تو مناسب ہوگا۔ اس میں جو اختلافات ہیں انھیں سامنے آجانا چاہیے۔ لائبریری میں فیلوشپ کے کاموں کا سلسلہ چلا تو نسخۂ شیرانی کے نسخۂ خدابخش سے مقابلے کا کام "ڈاکٹر وہاج الدین علوی" کے سپرد کیا گیا۔ جنھوں نے اسے بخوبی انجام دیا۔ نتائج آئندہ صفحات پر ملاحظہ ہوں۔ پہلے وہ اشعار پیش کیے گئے ہیں جو ان نسخوں میں کم یا زیادہ ہیں، پھر وہ اختلافات جو متن کی قرأت میں سامنے آئے۔ مبتذل اشعار کو اس مطالعہ میں شامل نہیں کیا گیا ہے۔

ڈاکٹر سلیم الدین احمد
اسسٹنٹ لائبریرین (ریسرچ و پبلیکیشن)
خدابخش لائبریری

مجموعہ نغز

نسخۂ خدا بخش میں مزید اشعار وغیرہ

جو نسخہ شیرانی اور انڈیا آفس میں نہیں ہیں

ورق: ۱۱/ الف

(متن)

واہ قسمت ایک تو یہ کنج تنہائی ملا — دوسرے جو یار تھا سو وہ بھی ہرجائی ملا

کشتیٔ عشق میں یکبار جو جا بیٹھے ہم — پہلی ہی موج میں گھر بار لٹا بیٹھے ہم

کیا چاہیئے قالین و نمد خاک نشیں کو — مسند سے وہ بہتر جو سمجھتے ہیں زمیں کو

(حاشیہ)

قطعہ از آصف الدولہ و بعض برآنند کہ از آفتاب است

بلبل نے وقت قید کے رو رو کے یہ کہا — صیاد ہم کو واسطے پروردگار کے

بیچے گا تو تو سن یہ زرا اتنا کیجیو — دینا تو ہاتھ ہائے کسی گلعذار کے

(حاشیہ)

ورق: ۲۰/ب/ ۱۱-۱۲ (متن)

در پر جو ترے یہ کوچہ گرد آتا ہے — ایسا بڑا یہ کہاں کا مرد آتا ہے

رکھتا ہے سر قدم بوس ترا (کذا) — اس کا سر عاقبت بدرد آتا ہے

ورق: ۵۴ ب) (حاشیہ)

کون یاں بازار خوبی میں ترے ہم رنگ ہے — حسن کی میزاں میں تیرے مہر و مہ پاسنگ ہے

میں ہوا دیوانۂ سرخیل ارباب جنون — ہاتھ میں پتھر لیے ہر طفل میرے سنگ ہے

سرگی آنکھوں کا تیری جو کوئی بیمار ہو — ایک میل اس کے تئیں رکھنا قدم فرسنگ ہے

یہ سدا گھر گھر کرے ہے آسیا پھیر پھیر مدام — مشت گندم کی لیے چھاتی پہ اسکے سنگ ہے

سخت جانی تیری اور ظالم تیری سنگیں دلی — آہ مثل آسیا کے سنگ اوپر سنگ ہے

تکیہ گاہ عاشقاں بے خاناں کو وقت خواب — زیر سر کوچے میں تیرے خشت ہے یا سنگ ہے

اس جواہر نازنیں کے دیکھ میں یاقوت لب — جسکی رنگینی کے آگے لعل ہیرا سنگ ہے

شیخ کی مسجد سے مجھکو کچھ نہیں بیدار کام — سجدہ گہ اپنا صنم کے آستاں کا سنگ ہے

ورق: ۱۱۷ الف: (حاشیہ)

رباعی

کس کس کوچہ میں عشق لایا ہم کو — کیا کیا ستم و جور دکھایا ہم کو
منظور اگر یہی دل آزاری تھی — سوتے تھے عدم میں کیوں جگایا ہم کو

شعر

کیا پوچھتے ہو ہمدم اس جسم ناتواں کی — رگ رگ میں نیش غم ہے کہئے کہاں کہاں کی

ورق: ۱۱۷ الف: (حاشیہ)

رباعی

اس دل کو نہ کچھ سوز نہ کچھ درد ملا ہے — ناحق ہمیں دکھ دینے کو پیدا یہ ہوا ہے
ہم سخت گرفتار مصیبت ہیں الٰہی — دوزخ بھی ملا ہے تو ہمیں سڑ ملا ہے

شعر

سب نے اس باغ میں اپنے تو بھے داماں بھرے — ایک ہم سوختہ دل ہی رہے ارمان بھرے

ورق: ۱۳۳ الف/۱۶۔ ورق: ۱۳۳ ب/۴: (متن)

چلی سمت عشق سے ایک ہوا شجر مراد کا جل گیا — مگر ایک شاخ نہال غم جسے دل کہیں سو ہری رہی
ترے جوش عشق نے اب اثر اس قدر یہاں کیا — کہ نہ آئینہ میں جلا رہی نہ پری کو جلوہ گری رہی

ورق: ۲۱۷ ب/۴: (حاشیہ)

عاجز ہوں ترے ہاتھ سے کیا کام کروں میں — کر چاک گریباں تجھے بدنام کروں میں

ورق: ۲۶۹ الف/۶: (متن)

چلا کشتی میں آگے سے جو وہ محبوب جاتا ہے — کبھی آنکھیں بھر آتی ہیں کبھی دل ڈوب جاتا ہے

ورق: ۲۸۶ ب: (حاشیہ)

دل ہے مجروح ماجرا ہے یہ — وہ نمک چھڑکے ہے مزہ ہے یہ
آگ تھے ابتدائے عشق میں ہم — اب ہوئے خاک انتہا ہے یہ
میر کو کیوں نہ مغتنم جانو — اگلے لوگوں میں اک رہا ہے یہ

ورق: ۲۸۹ ب/۱۵: (متن)

میں تو چپ ہوں وہ ہونٹ چاٹے ہے — کیا کہوں ریجھنے کی جا ہے یہ

ورق: ۳۰۳ ب پر شاہ نصیر الدین دہلوی کی یہ غزل (حاشیہ)

میرے لقائے وعدہ پر جوں ہی شب یار اُٹھ بیٹھا   سنو اندھیر قسمت کا کہ چوکیدار اُٹھ بیٹھا

خیالِ لب میں گویا ہے ترے تاثیر یاقوتی   نہ لے سکتا تھا جو کروٹ تو وہ بیمار اُٹھ بیٹھا

کہوں کیا بختِ خوابیدہ کی تجھ سے بات اے ہمدم   مرے پاؤں کی آہٹ سے وہ ہو بیدار اُٹھ بیٹھا

بسانِ نقشِ پا فرش زمیں پر تھا جو آسودہ   سو تیرے ہاتھ سے لے چرخ کج رفتار اُٹھ بیٹھا

کمالِ بندگی عشق کہتے ہیں نصیر اس کو   نہ مارا دم کسو نے جب وہ لے تلوار اُٹھ بیٹھا

ورق: ۳۰۴ الف (متن)

طائر رنگ حنا بن کس کو یہ اعجاز ہو   بال و پر رکھتا نہ ہو اور طاقت پرواز ہو

رات مجلس میں ہر اک مہ پارہ گرم لاف تھا   صبح وہ خورشید رو نکلا تو مطلع صاف تھا

ورق: ۳۱۰ ب پر نیاز احمد نیاز سرہندی کی یہ غزل (حاشیہ)

عشق میں تیرے کوہ غم سر پہ لیا جو ہو سو ہو   عیش و نشاطِ زندگی چھوڑ دیا جو ہو سو ہو

مجھ سے مریض کو طبیب تجھے ہاتھ اپنا مت لگا   اس کو رضا یہ چھوڑ دو بہر خدا جو ہو سو ہو

ہجر کی جو مصیبتیں عرض کی اس کے روبرو   ناز و ادا سے مسکرا کہنے لگا جو ہو سو ہو

لاگ کی آگ لگتے ہی پنبہ نمط میں جل گیا   لخت وجود جان و تن کچھ نہ بچا جو ہو سو ہو

ہستی کی جو سرائے میں رات کے رات چل بسے   صبح عدم ہوئی نمود پیر اٹھا جو ہو سو ہو

عقل کے مدرسہ سے اُٹھ عشق کے میکدہ میں آ   جامِ فنا و بیخودی اب تو پیا جو ہو سو ہو

دنیا کے نیک و بد سے کام ہم کو نیاز کچھ نہیں   آپ سے جو گزر گیا پھر اسے کیا جو ہو سو ہو

ورق: ۳۲۶ الف پر میر درد کا قطعہ تاریخ (حاشیہ)

حضرت درد نے جس وقت کیا نقل مکاں   ہو گیا درد جدائی سے جہاں پر آشوب

گرچہ اس گریۂ غم سے تو نہ تھا دل کو فراغ   سال تاریخ کو جو غور کیا دل سے خوب

ہاتف غیب سے اک بارگی آئی یہ ندا   حیف دنیا سے سدھارا وہ خدا کا محبوب

۱۱۹۹ھ / ۱۱۹۵ھ

ورق ۳۵۲: زور آور خاں دل۔ یہ دو شعر (حاشیہ)

ایک بوسہ پہ اگر تم نے کیا ہے راضی   اور انھوں نے بھی کہا اپنی زباں سے بہتر

پر میں اس فکر میں ہوں لیجے کہاں کا بوسہ   ہے دہن رخ کے سوا رُخ ہے دہاں سے بہتر

ورق: ۳۵۵: شہرت شاگرد جرات کے باب میں :۔ (حاشیہ)

"بدانست بندہ، محمد بخش کاکوروی کہ بس عالی طبع بود این کس است۔"

نسخۂ شیرانی میں اضافی اشعار

جو نسخۂ خدا بخش اور انڈیا آفس میں موجود نہیں

ص : ۷۴/ ۵ :

جاتا ہے فغاں قافلہ ہم نفساں کل — کچھ راہ کے چلنے کا سرانجام کریں میں

ص : ۲۹۶/ ۸ :

تا مطالع ہوں خون شدہ دل کے رنگ پر — بھیجا ہے میں نے کبوتر کو رنگ پر

ص : ۳۸۵/ ۱۱-۱۲ :

کیا فقیری میں عشق . . . ہے — جس کو . . . . ہے
دید . . . عشق . . . نظارا ہے — کشتی چشم پر او تارا ہے

ص : ۳۹۰/ ۱۵ :

کر دیا اشکوں نے دامن تختۂ گلزار وہ — ہیں تو لڑکے پر بڑے استاد گلکاری میں ہیں

انڈیا آفس کے نسخہ میں یہ اشعار موجود نہیں، جبکہ بقیہ دونوں نسخوں میں موجود ہیں

ص : ۳۰۸ :

ہے زندگی و مرگ فقیروں کی برابر — جنگل کفنی ہے وہی منگل کفنی ہے
قمری ہے جھکائے ہوئے سر سرو کے آگے — یا شیو کی پوجا میں کوئی برہمنی ہے
نہ ہووے درد اعضا تجھ کو بلبل — اگر ملتی رہے تو روغن گل
ہزاروں معنی باریک آویں دل میں اے عارف — اگر زلف سیہ کا پیچ مو بموید اس کے کھل جاوے
دختر رز سے کہو کہ آن ملے — ورنہ عارف افیم کھاتا ہے۔

نسخۂ خدا بخش میں یہ دو اشعار موجود نہیں جبکہ دونوں نسخوں میں موجود ہیں

ص : ۲۵۸/ ۳-۱ :

ایک تو رسوا کیا عالم میں تیری . . . — . . . برے لوگوں کے طعنے . . .
جا پھنسا دل زلف میں اب سوئیے — شام کے مردے کو کب تک رویئے

اختلافات قرأت

ص / س	نسخۂ شیرانی (ابر بگیت کو حقۂ انڈیا آفس کے مخطوطے)	ص / س	نسخۂ خدابخش
۱/۱۲	فاروق اعظم (اعدل) منظم	۸ الف/۲	فارق اعظم اعدل معظم
۳/۱۵	(قصوری می نمود) روزے اصمعی بقبیلۂ بنی اسد گذشت	۹، ۱۰/۵، ۸	بمرتبہ تصور می نمود روزے اصمعی بقبیلۂ بنی اسد گذشت
۱۱/۱۵	(اسدیاں) با اصمعی در میخورند	۹ الف/۱۶	سعدیاں با اصمعی در میخوردند
۱۱/۱۷	مرزا عظیم بیگ	۱۰ الف/۱۷	مرزا عظیم بیگ عظیم
۳/۲۷	ہوشیار و صاحب (اقتدار) در تیر اندازی	۱۳ ب/۸، ۹	ہوشیار طبع و صاحب اقتدار در تیر اندازی
۱۰/۲۸	مکھن لعل کاتب	۱۴ الف/۸	مکھن لعل کاتب
۵/۲۹	مصرعہ: بن ساقی اب ابر بہاری سخت ہمیں تڑپاتا ہے	۱۴، ۱۵/۱۱، ۱۵	مصرعہ: بن ساقی ابر بہاری سخت ہمیں ترساتا ہے
۸/۲۹	عدہ (یم البقری ملکہ) سخن گوئی بہم رسانندہ بود	۱۴، ۱۵/۱۷، ۱	عدہ البقری ملکہ سخن گوئی بہم رسانیدہ بود۔
۶/۳۲	مصرعہ: بنیاد جہاں دلی ہے یہ (بہشت) دری	۱۵ ب	مصرعہ: بنیاد جہاں دلی ہے یہ بہشت دری
۴/۳۰	و یکے از ینان	۱۴ ب/۶	و یکی از انیان
۱۶/۳۸	مصرعہ: صبر و دل و دیں طاقت سب نذر کئے ہم نے	۱۷ الف/۱۴	مصرعہ: صبر و دل و طاقت سب نذر کئے جانی
۹، ۱۰/۴۳	حضرت خواجہ میر علیہ الرحمۃ والغفران	۱۸ ب/۱۵	حضرت خواجہ میر درد علیہما الرحمۃ والغفران
۱۱/۴۷	مصرعہ: پایا نہ کہیں نشان اپنا	۲۰ الف/۷، ۸	مصرعہ: پایا نہ کہیں نشان دل کا۔
۱۴/۵۲	ایں از وست	۲۲/۱۰، ۱۷	ایں دو بیت از وست
۹/۸۹	غنیمت ہے کہ جو صورت یہاں دو چار بیٹھے ہیں۔	۴۱ ب/۸، ۹	غنیمت ہے کہ ہم صورت یہاں دو چار بیٹھے ہیں۔
۱۰/۱۱۲	برائے العین مشاہدہ نمودہ۔	۵۱ ب/۱۵	برائے العین ایں شعر امشاہدہ نمودہ۔
۱۷/۱۲۳	خواجہ احسن اللہ خاں	۵۷ الف/۷	خواجہ احسن الدین خاں

(۱) نسخۂ شیرانی میں یہ نوٹ ہے کہ: "اسدیاں" بنایا گیا ہے۔ (۲) انڈیا آفس کے نسخے میں: "عظیم" مرقوم نہیں ہے۔ (۳) انڈیا آفس کے نسخے میں: "مغ" یہ ابر بہاری" ہے۔" ("اب" کی جگہ "یہ" ہے)

ص/س	نسخۂ شیرانی (بریکٹ کا حصہ انڈیا آفس کے نسخے کا ہے)	ص/س	نسخۂ خدابخش
۱۲۷/۵	سید رضی خاں بہادر	۵۸ب/۷	نواب سید رضی خاں بہادر
۱۳۲/۱۷	غ: میرے غریب دل کو الٰہی یہ کیا ہوا	۶۱الف/۲	میرے عزیز دل کو الٰہی یہ کیا ہوا
۱۳۲/۲۱	غ: غنچے لہو میں سب نظر آتے ہیں سر بسر	۶۱ " /۶	غ: غنچے لہو میں سب نظر آتے ہیں تر بتر۔
۱۴۴/۱	از مستفیدانِ برگزیدہ جناب	۶۶ " /۱۶	از مریدانِ برگزیدہ جناب
۱۴۸/۱۴	اے جا کر مرید حضرت خواجہ کمہاری ہو	۶۸الف	غ: ارے جا کر مرید حضرت خواجہ کمہاری ہو
۱۹۰/۱۵	غ: ہے پنہاں[1] چشم کے پردے میں جواہر خانہ	۸۶الف/۱۲	غ: ہے نہاں چشم کے پردے میں جواہر خانہ
۱۹۶/۱۲	غ: ہم سے بل کھاتی ہے کیوں کاکل بلدار عبث	۸۹الف/۷	غ: ہم سے بل کرتی ہیں کیوں کاکل بلدار عبث
۲۱۴/۱۸	غ: وہ بھی بدنام ہو جنھا نے مجھے بدنام کیا	۹۷الف/۱	غ: وہ بھی بدنام ہو جس نے مجھے بدنام کیا
۲۳۰/۱	ایام بسر می آرد	۹۹ب/۲	ایام بسر می برد
۲۵۷/۱۰	ایں (شش) بیت از رختہ ہائے طبع آں معصومہ	۱۱۷الف/۱۲	ایں دو بیت از ریختہائے طبع آں معصومہ
۲۶۳/۱	جونک ماٹی میں ملے تو بھی لہو پیتی رہے۔	۱۱۹ب/۲	جونک ماٹی میں رہے تو بھی لہو پیتی رہے۔
۲۶۴/۱۳	روٹھنا بات بات پہ تیرا	۱۲۰الف/۱۴	روٹھنا بات بات پہ اس کا
۲۷۳/۲	در علم ناگہ بھید و عروض و قوافی مہارتے دارد	۱۲۴ " /۲	در علم و عروض و قوافی مہارتے
۲۷۵/۷	غ: حضرتِ دل زکریا کے طور پر بارے چلے	۱۲۴ب/۱۵	غ: حضرت دل . . . بارے چلے
۲۷۶/۱۵	دیدہ و بسیار ناپسندیدہ	۱۲۵ب/۴	دیدہ و بسیار پسندیدہ
۲۷۷/۱	نبسہ سخن سنج	۱۲۵ " /۵	نبیرہ سخن سنج
۲۷۷/۱۵	غ: کھل گئیں انکھیاں چمن میں نرگسِ بیمار کی	۱۲۶الف/۶	کھل گئیں آنکھیں چمن میں نرگس بیمار کی۔[2]
۲۷۹/۱	ایں شصت و یک بیت	۱۲۶ب/۱۳	ایں چہل و یک بیت[3]
۲۸۸/۹	فرحت قرین	۱۳۱الف/۵	فرحت دین
۲۹۱/۱۵	غ: روتے ہی روتے گزرے ہے دو دو پہر مجھے	۱۳۲ب/۸	غ: روتے ہی روتے کٹتی ہے دو دو پہر مجھے

۱؎ انڈیا آفس کے نسخے میں: "ہے کہاں"۔ ۲؎ انڈیا آفس کے نسخے میں: "کھل گئیں ہیں آج آنکھیں نرگسِ بیمار کی" ۳؎ انڈیا آفس کے نسخے میں: "ایں ہفت و یک بیت"

ص / س	نسخۂ شیرانی (بریکٹ کا حصہ انڈیا آفس کے مخطوطہ کا ہے)	ص / س	نسخۂ خدا بخش
۶/۲۹۲	خبر تحیر عشق سن نہ جنوں رہا نہ پری رہی۔	۱۴۳الف/۱۴	خبر تحیر عشق سن نہ تو جنوں رہا نہ پری رہی۔
۷/۲۹۸	منظلمہ بیشترے از سخن پیرا خصوص[۱]	۱۴۶الف/۵	بیشتر از سخن پیرا خصوص
۱۰/۳۱۱	کیفیت چشم اوس کی مجھے یاد ہے سودا ساغر کو مرے ہاتھ سے لیجو کہ چلا میں	۱۴۲الف/۶	[کیفیت چشم اس کی مگر یاد ہے سودا ساغر کو مرے ہاتھ سے لیجو کہ چلا میں]
۱۱/۳۱۴	اس (پیر کے جلوے) کا بھلا کوئی جواں ہے	۱۴۳ب/۱۶	اس پر کسی جلوے کا بھلا کوئی جواں ہے۔
۵/۳۱۸	بازی اگرچہ پانہ سکھا جی تو کھو سکھا۔[۲]	۱۴۴ب/۷	بازی اگرچہ پانہ سکا سر تو کھو سکا۔
۱۲/۳۲۰	درویش نہاد	۱۴۵الف/۱۷	روشن نہاد
۳/۳۲۸	تخلص می نمود پس ازاں چندے آں آشنای بحر معانی آشنا تخلص کرد در تعریف مثنوی معتر منے گوید ع آشنا میں . . . الخ	۱۴۸ب	تخلص واستفادہ سخن از جناب ہدایت مآب یعنی استاد صاحب ولایت ہدایت اللہ خاں ہدایت عفی اللہ عنہ میفرمود در غزلے کہ جواب استاد مغفور و مرد مرحوم کہ گفتہ ع غریب سے نبہ دے جو پادشاہ کرے پس ازاں چنداں آشنائے بحر معانی آشنا تخلص کرد ع آشنا میں . . . الخ
۱۳/۳۲۹	ط: جز آہ و نالہ ہوسید سے اور کیا موزوں	۱۴۹الف/۱۰	جز آہ و نالہ ہوسیدسے اور کیا مضموں
۲۱/۳۴۹	ع: ہو گئی اور ہی حالت تیرے دیوانے کی	۱۵۴الف/۱۳	ع اور ہی ہو گئی حالت دل دیوانے کی
۱۷/۳۴۹	شائق ہمیں دیتا ہے وہ ہر بات پہ دشنام پھر اس سے ہوئی بارے ملاقات کی گرمی	۱۵۴ب/۳	[کیا کہئے تجھسے ہمدم فرقت میں حضرت ہمکو بھی ساتھ اپنے برباد کر رہیں گے۔]
۲/۳۵۰	سچ بدلا پھرتا جو تنہا وہ بت خونخوار ہے۔[۳]	۱۵۹ب/۲	سچ بدل تنہا جو پھرتا وہ بت خونخوار ہے۔

۱۔ انڈیا آفس کے نسخے میں: "ابن خواجہ بیشترے از پیر خصوص" ۲۔ اس کی ردیف "سکی" ہے، جبکہ مخطوطہ کی ردیف "سکا" ہے۔ ۳۔ انڈیا آفس کے نسخے میں:
" سچ بدلا تنہا جو پھرتا وہ بت خونخوار ہے۔"

ص / س	نسخۂ شیرانی ([illegible] انڈیا آفس کے مخطوطے کا ہے)	ص / س	نسخۂ خدا بخش
۱۱/۲۵۴	شہوت تخلص پسر بد سید شاہ معصوم مہوس	۱۶۰ ،، /۱	شہوت تخلص پسر بد سید شاہ معصوم مہوش
۱۶/۲۶۹	آزادہ دلوں کو مت ستانا	۱۷۰ ،، /۲	آزردہ تو دلکو مت ستانا
۷/۲۷۱	خدا یزدی خاں	۱۷۰ الف/۱۰	عزیزی خدا یار خاں
۱/۹	شکل خامے کے زباں دکو قلم رکھتے (ہیں ہم)[1]	۱۸۶ ،، /۱۷	شکل خامے کے زباں گویا قلم رکھتے ہیں ہم
	اس اوندھی دکھی پڑنیا پہ مارے ہم بیزار[2] بیٹھے ہیں	۱۹۶ ب/۱۰	اس اوندھی کھوپڑی پہ مارے ہم بیزار بیٹھے ہیں
۶/۷۵	اپنے کیے کو اے میر اصاحب نباہیے	۲۱۶ الف/۵	اپنے کیے کو اے میرے صاحب نباہیے۔
۱۵/۷۸	ع : کشتی تو تباہی ہے لنگر کا خدا حافظ	۲۱۵ ق/۱۲	ع : کشتی تو تباہی ہے لشکر کا خدا حافظ
۲/۸۲	پلٹن سے نگہ کی مک دل کو توڑ	۲۲۱ الف/۱۰	پلٹن سے نگہ کے قلعہ دل کو توڑا۔
۲/۸۲	شرما کے لگا کہنے ہو تھوڑا تھوڑا	۲۲۱ ،، /۱۱	ہنس ہنس کے لگا کہنے وہ توڑا توڑا
۱۲/۸۸	جس کی ہے ہر ایک جہاں سے بہتر	۲۲۳ ،، /۱۱	جس کی ہے ہر ایک چیز جہاں سے بہتر
۷/۸۹	قاضی شیخی ہے یہاں تو کا ڈھی تیری	۲۲۴ ،، /۱۶	قاضی شیخی ہے یہاں تو کاڑھی تیری
۷/۹۲	جو سے کیا ربط کیا حانہ کی وہ[3] گلبدن جانے	۲۲۵ ب/۵	خوشی کیا ربط کیا خانہ کی وہ گلبدن جانے
۱۸/۹۲	از کلامِ نقص انتظام خود ... بحکم بودن	۲۲۷ ،، /۲	از کلامِ نقص انتظام خود سہ صد و نود و دو حکم بودن
۳/۱۰۴	میرے رونے پہ نہ ہنستا[4] کیونکے وہ جوہر شناس	۲۳۰ ،، /۱۶	میرے رونے پہ ہنسا کیونکہ وہ جوہر شناس
۲/۱۰۴	سلک گوہر میں نہ تھا اس دُرِ غلطاں کا مول	۲۳۰ ،، /۱۷	سلک گوہر میں نہ تھا اس دُرِ غلطاں کا مول۔
۱۱/۱۱۸	تب کہا میں نے جو دو نو ... امداد ہوں[5]	۲۳۰ الف/۷	تب کہا میں نے جو دو بوسے مجھے امداد ہوں۔
۱۰/۱۲۶	لب خشک ہو رہے ہیں کانٹیں زباں پر ہیں۔	۲۴۲ ب/۱۵	لب خشک ہو رہے ہیں کانٹے زباں پر ہیں
۷/۱۴۴	گالوں کو صاف کر کر پیچے ہے خوب روئی	۲۴۴ ب/۱۰	گالوں کو صاف کر کر بیچے ہے خوب روئی
۲/۱۵۱	و دو ممتاز زمن میرن تخلص میکند	۲۴۹ ق/۱۲	و دو ممتاز فن میرن تخلص میکند۔
۷/۱۵۲	پیتا ہوں جام مے کے عوض کاسہ بنگ کا	۲۴۹ ب/۱۱	پیتا ہوں جام مے کے عوض کاسہ بھنگ کا۔

۱۔ نسخۂ شیرانی میں یہ نوٹ ہے کہ "یہاں" کو" لفظ رہ گیا ہے۔ دونوں نسخوں میں اسی طرح ہے۔ "قلم" سے پہلے غالباً "سر" ہوگا۔ ۲۔ انڈیا آفس کے نسخے میں: "ہمتا رہے ہم"۔ ۳۔ انڈیا آفس کے نسخے میں بھی جگہ چھوٹی ہے۔ ۴۔ انڈیا آفس کے نسخے میں: یہ شعر درج نہیں ہے۔ ۵۔ اور اس نسخہ میں عبارت کٹ گئی ہے۔

ص/س	نسخۂ شیرانی (بریکٹ کا حصہ انڈیا آفس کے مخطوطے کا ہے)	ص/س	نسخۂ خدا بخش
۱۹۴/۲	میر فتح علیخاں حسنی	۲۶۲الف/۶	میر فتح علی حُسینی
۱۹۴/۵	برہم نہ کیجیو کاکل دلدار دیکھنا [۱]	۲۶۲،،/۹	برہم نہ کیجیو کاکل بلدار دیکھنا۔
۱۹۷/۱۲	رسید تا برشتہ تحریر کشیدہ [۲]	۲۶۳ب/۱۴	رسید تا برشتہ تحریر کشیدہ
۱۹۵/۱۱	لالہ کنور سین کائت	۲۶۷،،/۱۷	لالہ کنور سنگھ کائت
۲۰۵/۱	پسر خواجہ ہیگا ولد خواجہ عسکری۔	۲۷۳الف/۲	پسر خواجہ ہیگا ولد خواجہ عسکری۔
۲۰۶/۹	بست و یک [۳] بیت از کلام آں خوبی القیام است	۲۷۳ب/۱۱	سی و سہ بیت از کلام آں خوبی القیام است۔
۲۰۶/۱۵	بیکس غریب عاشق مقبول تھا جو تیرا۔	۲۷۳،،/۱۷	بیکس غریب عاشق مقبول تھا جو تیرا۔
۲۰۹/۵	سو طرح کے اس میں سے بے ساختہ پن نکلے۔	۲۷۴،،/۱۵	سو طرح کے اس پر بھی بے ساختہ پن نکلے۔
۲۱۶/۳	پھر تمنا کو یہاں مشقہ مایوسی ہے۔	۲۷۸،،/۱۴	پھر تمنا کو یہاں متردہ مایوسی ہے۔
۲۲۰/۴	شاہ پیر علی نام دارد۔ [۵]	۲۸۰،،/۱۳	کہ شاہ شیر علی نام دارد۔
۲۲۹/۱	تخلص راجہ ہلاس رائے [۶]	۲۸۴،،/۱۷	تخلص راجہ ہلاس رائے
۲۳۰/۱۴	ایک پل [۷] میں دو کروں اژدر کے کلے چیر کرے	۲۸۶الف/۴	ایک دم میں دو کروں اژدر کے کلے چیر کرے۔
۲۳۱/۴	. . . [۸]	۲۸۶،،/۱۶	سی و صد و شانزدہ شعر۔
۲۳۶/۳	پھر کھلے گی زبان جب کی بات۔	۲۸۹،،/۶	پھر کھلے گی زبان جیب کی بات۔
۲۴۵/۱۱	کیجیے کیا میر صاحب بندگی بے چارہ گی۔	۲۹۰ب/۱۶	کیجیے کیا میر صاحب بندگی بے چارگی
۲۴۶/۷	صید افگنوں ہمارے دل کو جگر کو دیکھو۔	۲۹۱الف/۱۰	صید افگنو ہمارے دل کو جگر کو دیکھو۔
۲۴۸/۶	دو گام کے چلنے میں پامال ہوا عالم۔	۲۹۱ب/۱۳	دو گام کے چلنے سے پامال ہوا عالم

[۱] انڈیا آفس کے نسخے میں: "برہم نہ کیجیو کاکل بیدار دیکھنا"۔ [۲] دونوں نسخوں میں یہاں چھ سطروں کی جگہ چھوٹی ہوئی ہے، جبکہ نسخۂ خدا بخش میں کوئی جگہ نہیں چھوٹی ہے۔ [۳] مطبوعہ نسخہ میں ۲۰۴ شعر ہی درج ہیں۔ لہٰذا نسخۂ خدا بخش کی عبارت صحیح ہے۔ [۴] انڈیا آفس کے نسخے میں: "سو طرح کے اس میں بھی" [۵] انڈیا آفس کے نسخے میں: "شاہ بند علی نام دارد" [۶] انڈیا آفس کے نسخے میں: "ہلاس رائے" [۷] یہ شعر اس تذکرہ میں ہے یا پھر "آب حیات" میں ہے، اس لیے معلوم نہیں کہ اصل مصرع میں "ایک دم" ہے یا "ایک پل" کیونکہ "آب حیات" کا ماخذ یہی تذکرہ ہے۔ "آب حیات" میں "ایک دم" ہے۔ [۸] یہاں خالی جگہ چھوڑ دی گئی ہے۔

ص / س	نسخۂ شیرانی (بریکٹ کا حصہ انڈیا آفس کے مخطوطہ کا ہے)	ص / س	نسخۂ خدابخش
۸/۲۵۰	اس گریباں ہی سے ہاتھ اٹھایا ہم نے۔	۲۹۳،،/۳	اس گریباں ہی سے اب ہاتھ اٹھایا ہم نے۔
۸/۲۵۲	آرام ہو چکا میرے اس جسم زار کو۔[1]	۲۹۳الف/۴	آرام ہو چکا تیری چشم نزار کو۔
۱۲/۲۵۲	ہر ایک قدم چل کہیں زنہار نہ ہوئے۔	۲۹۳،،/۸	ہر ایک قدم دل کہیں زنہار نہ ہوئے۔
۵/۲۵۳	وہ اس کی وفا (پیشگی) وہ اس کی جوانی	۲۹۳،،/۱۶	وہ اس کی وفاداری وہ اس کی جوانی
۲/۲۶۲	لالہ مٹھی لال۔	۲۹۸ب/۱	لالہ ہٹی لعل۔
۱/۲۸۶	تخلص شیخ محمد ظہور است۔	۳۰۹الف/۱۵	تخلص ظہور اللہ خان است۔
۲/۳۰۵	ساتھ پردوں میں رکھوں او سکوں چھپا	۳۱۸الف/۲	سات پردوں میں رکھوں اوس کو چھپا
۱۲/۳۰۶	ہے ترے لب سوں اے شکر گفتار بات کہنا نبات سوں شیریں۔	۳۱۸ب/۵	ہے تیرا لب گویا شکر گفتار بات کہنا نبات سے شیریں۔
۸/۳۱۸	۔ ۔ ۔[2]	۳۲۳ب/۱	این چہار صد و پنجاہ و دو بیت۔
۶/۳۱۹	ہونا جو کچھ کے تھا سو مرے یار ہو چکا۔	۳۲۴الف/۲	ہونا جو کچھ کہ تھا سو مرے یار ہو چکا
۴/۳۲۷	ساقی ایسے وقت میں کچھ جا داری ہے ضرور	۳۲۷الف/۷	ساقی ایسے وقت میں اک جام دینا ہے ضرور
۱۲/۳۳۴	مثل ہے یہ کہ ماپا شوربا ہے اور گنی ڈلیاں[3]	۳۳۰،،/۹	مثل یہ ہے کہ چمچا شوربا ہے اور گنی ڈلیاں
۴/۳۶۸	ہم تو ترے فراق میں اے یار مر گئے ہیں[4]	۳۴۴،،/۱۶	ہم تو ترے فراق ہی میں یار مر گئے۔

۱؎ انڈیا آفس کے نسخہ میں: "آرام ہو چکا ترے جسم زار کو"۔ ۲؎ یہاں نقطے دیے گئے ہیں۔ ۳؎ "ماپا شوربا اور گنی ڈلیاں" صحیح مثل ہے "شمس البیان فی مصطلحات الہندوستان" مرتبہ عابد رضا بیدار ص: ۴۴۔ ۴؎ انڈیا آفس کے نسخے میں: "ہم تو ترے فراق میں اے یار مر گئے"۔

رموز کتب خانہ، مفتیان گوپامئو

ڈاکٹر خالد حسن قادری
لندن اسکول آف اورینٹل اینڈ افریکن اسٹڈیز

ہردوئی یو پی کا ایک ضلع ہے اور تحصیل بھی ہے۔ اسی ضلع اور تحصیل میں ایک قصبہ گوپامئو ہے۔ گزیٹیر آف انڈیا کی تحریر کے مطابق گومتی ندی کے قریب ۲۲۰۷ ۲ شمال اور ۸۰،۱۸ شرق کی سمت واقع ہے۔ انیس سو ایک میں اس کی آبادی پانچ ہزار چھ سو چھپن تھی۔ روایت یہ بیان کی جاتی ہے کہ ایک ہندو سردار راجہ گوپی نے اسے گیارھویں صدی میں بسایا۔ یہ علاقہ جنگل کے میدان میں ٹھٹھیروں کے قبضہ میں تھا جنھیں راجہ گوپی نے مار بھگایا۔ گزیٹیر کا بیان ہے کہ جب حضرت سید سالار رحمۃ اللہ علیہ نے اودھ میں جہاد کیا تو اس وقت سے مسلمانوں کے قدم بھی یہاں پہنچے۔ لیکن باضابطہ اور مستند طور پر تیرھویں صدی میں آئین جہانبانی یہاں رائج ہوا اور یہ قصبہ مقامی صاحبان بست و کشاد کے تحت پھولتا پھلتا رہا۔ یہاں سے علماء، فضلا، محدثین، مفسرین یعنی اہل علم و فضل اور صاحبان شمشیر و سناں دوسرے علاقوں میں جا کر اپنی تلوار و قلم کے جوہر دکھاتے رہے اور پھر واپس اپنے قصبہ میں آ کر اسے مساجد، کنوؤں، تالابوں، مدرسوں، حویلیوں اور شاندار عمارتوں کی تعمیر سے پُرشکوہ بناتے رہے۔

انیس سو ایک میں اس کی حالت معمولی مضافاتی دیہات سے زیادہ نہ تھی۔ صرف ایک مدرسہ تھا جس میں ایک سو بارہ طالب علم تھے اور مقامی طور پر آرسی بنانے کا کام ہوتا تھا، جو خوبصورتی اور نزاکت کی وجہ سے مشہور تھیں۔

جس مدرسہ کا ذکر گزیٹیر میں ہے وہ سرکاری مدرسہ ہوگا۔ غالباً ۱۸۹۶ء میں قصبہ کے ذی حیثیت افراد نے محسوس کیا کہ بستی کے لوگوں کو بطور خود بھی کچھ کرنا چاہیے۔ اور انھوں نے مدرسۂ اسلامیہ گوپامئو کی بنیاد رکھی، جو عبدالباسط خاں صاحب مرحوم کے مکان میں قائم کیا گیا۔ اس مدرسہ کا تیسرا سالانہ جلسہ ۵ صفر ۱۳۱۷ھ مطابق ۱۴ جون ۱۸۹۹ء کو زیر صدارت جناب محمد شیخ عبدالصمد صاحب تعلقہ دار گونڈہ راؤ منعقد ہوا تھا۔ صدر نے اپنے خطبہ میں یہ بھی فرمایا:

"... معاونانِ مدرسہ کی ذی حوصلگی عالی ہمتی کی کہاں تک ثنا و صفت کی جائے۔ ع

اگر ہر موئے من گردد زبانے   نتوانم بہر یک داستانے

ایسے ویران قصبہ میں جس میں ہر فرد بشر مبتلائے جاہلیت تھا بانعقادِ جلسۂ اسلامیہ باصلاحِ امورِ دینی و دنیوی طلبا کو مستفیض فرمایا تعلیم درجہ مڈل کے لیے بغیر بہم رسیِ مدرسینِ دیگر کے نتیجۂ دل سوزی و جاں فشانی جناب سکریٹری صاحب و نیز دیگر مدرسین مقصود ہے۔ مرحبا جزاک اللہ۔"

اس مدرسہ میں ۱۸۹۹ء میں کل ۷۰ طالب علم تھے۔ اسلامیہ مدرسہ کے افتتاحی جلسہ میں ضلع ہردوئی کے اسسٹنٹ کلکٹر جناب ڈبلیو۔ پروِیس صاحب بہادر میرِ مجلس تھے۔ اس اعزاز اور سرپرستی کے باوجود ڈسٹرکٹ بورڈ نے ماہوار امداد مبلغ چار روپے کی عنایت فرمائی۔ یا شاید اس اعزاز و سرپرستی کے سبب ہی چار روپے ماہوار کی گرانٹ عطا ہوئی ورنہ شاید یہ بھی نہ ہوتی! بہر حال۔

گوپامئو کا قصبہ نہ ہمیشہ سے ویران تھا اور نہ ہر فرد بشر مبتلائے جاہلیت تھا۔ بلکہ جیسا کہ بیان ہوا یہ علماء اور فضلا کا گہوارہ تھا۔ اسلامی عہد میں یہاں دار القضا اور دار الافتا تھا "خاندانِ مفتیان گوپامئو" جگ مشہور ہے۔ مفتی محمد حسن گوپاموی وکیل خلف مفتی نور اللہ صاحب گوپاموی، ۱۲۵۰ھ میں گوپامئو کے محلہ مفتیان بیت نئی حویلی میں پیدا ہوئے تھے۔ انھوں نے ۴۰ صفحات پر مشتمل نہایت مختصر کتاب "تاریخ مفتیان گوپامئو ضلع ہردوئی" کے نام سے لکھی ہے جو اکبر پریس جون پور میں شائع ہوئی۔ ایک اور کتاب اسی خاندان کے ایک صاحب حکیم مفتی بہار الدین گوپامئوی نے "تاریخ گوپامئو" کے نام سے لکھی ہے۔ کیا اتفاق ہے کہ راقم الحروف کے پاس محمد حسن صاحب کی کتاب کے تو دو نسخے موجود ہیں لیکن حکیم بہار الدین صاحب کی کتاب کا ایک نسخہ بھی نہیں۔ ورنہ مقابلہ دلچسپ ہوتا۔ "تاریخ مفتیانِ گوپامئو" میں مفتی محمد حسن صاحب نے لکھا ہے:

"پوشیدہ نہ رہے کہ اس خاندان کا نام مشہور و دیدہ صدیقیہ ہے اور جدِ امجد اس خاندان کے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ہیں لہٰذا حضرت کے تذکرہ سے آغاز کیا جاتا ہے ....."

چنانچہ مفتیانِ گوپامئو کے خاندان کا تذکرہ محمد حسن صاحب نے حضرت صدیق اکبرؓ کے تذکرہ سے کیا ہے اور اسی سلسلے کو آبا کے سلسلۂ نسب سے آگے بیان کیا ہے۔ اور حضرت شیخ شہاب الدین سہروردی تک لائے ہیں۔ شجرۂ نسب میں حضرت سیدنا صدیق اکبرؓ کا نمبر اگر ایک رکھا جائے تو حضرت شیخ شہاب الدین سہروردی کا نمبر سترہ ہے۔ حضرت شیخ سے پانچویں نمبر پر آدم بن محمد ہیں۔ "۷۴۰ھ میں پیدا ہوئے۔ علم حدیث و فقہ میں یگانۂ آفاق تھے۔ بعد وفات اپنے والد کے شاہِ ملتان کی وزارت پر مامور ہوئے مگر ۸۰۰ھ میں بادشاہِ وقت سے رنجیدہ ہو کر وزارت کو ترک کر کے سیر کرتے ہوئے گوپامئو میں تشریف لائے اور متوطن ہوئے اور ۸۲۵ھ میں وفات پائی۔ قبر آپ کی گوپامئو میں ہے مگر اب نشان باقی نہیں ہے۔" (خاندان مفتیانِ گوپامئو ص ۱۵-۱۴) ان کے صاحبزادہ شیخ بن آدم ہیں جو ۷۶۰ھ میں پیدا ہوئے اور ۸۱۰ھ میں وفات پائی۔ مفتی محلہ میں

بڑی حویلی کی تعمیر آپ نے کرائی۔ تدریس جاری رکھی اور بادشاہِ وقت کی جانب سے گوپامئو کے مفتی مقرر ہوئے۔ یہ تھے گوپامئو کے پہلے مفتی۔ اور علماء کے اس خاندان کو مفتی کا عہدہ اور لقب انھیں بزرگ کے عہد سے ملا۔ جو نسلاً بعد نسلٍ منتقل ہوتا رہا۔ تا آں کہ عہد انگلشیہ میں عہدہ اور منصب موقوف کر دیا گیا لیکن مفتی کے لقب پر قلمِ تنسیخ نہ چل سکا اور آج تک اس خاندان کے افراد اسی لقب سے جانے اور پہچانے جاتے ہیں۔

عہدِ انگلشیہ میں اس دور کے غالباً سب سے مشہور بزرگ مفتی انعام اللہ خاں بہادر تھے۔ جس زمانہ میں صدر نظامت الہ آباد سے اکبر آباد منتقل ہوا مفتی انعام اللہ صاحب بھی الہ آباد سے آگرہ منتقل ہو گئے اور محلہ ماہی میان میں مکان بنا کے کٹرہ میں مقیم ہوئے۔ مفتی انعام اللہ صاحب کے داماد خان بہادر غلام غوث خاں صاحب بے خبر تھے۔ یہی خان بہادر غلام غوث خاں صاحب مفتی انتظام اللہ صاحب شہابی اکبر آبادی کے پھوپا اور مفتی انعام اللہ خاں بہادر ان کے دادا تھے۔

مفتی انتظام اللہ صاحب شہابی کی زیارت سے یہ راقم الحروف بھی مشرف ہوا تھا اور اس وقت انھیں کا تذکرہ مقصود ہے لیکن اس دور کے بعض بڑے جید اور "قلم طراز" محققین، ناقدین اور مورخین نے بعض اس طرح کی باتیں بلکہ طرح طرح کی باتیں مفتی انتظام اللہ صاحب شہابی سے متعلق کہہ دی ہیں کہ اگر ان کا سختی سے جائزہ نہ لیا گیا تو سہل انگاری کے علاوہ ناقدر شناسی اور نارواگوئی تحقیق و تنقید کا جز سمجھ لی جائے گی۔ (اس مضمون میں آئندہ جہاں صرف "مفتی صاحب" لکھا ہوگا اس سے مراد صرف مفتی انتظام اللہ صاحب شہابی گوپامئوی اکبر آبادی ہی ہوں گے۔ جائزہ لینے سے پیشتر ضروری ہے کہ متعلقہ بیانات سامنے آجائیں۔

مشہور محقق و نقاد جناب مالک رام صاحب نے مفتی انتظام اللہ صاحب شہابی کی وفات پر مختصر تحریر شائع کی تھی جو بعد میں ان کی کتاب تذکرہ معاصرین (اپریل ۱۹۷۲ء) میں بھی شامل کی گئی ہے۔ مالک رام صاحب کی اس تحریر کے مختلف اقتباسات یہ ہیں:

"مفتی انتظام اللہ صاحب تصنیف و تالیف بزرگ تھے۔ انتظام اللہ کی تعلیم سراسر فارسی اور عربی تک محدود رہی۔ لیکن آخری زمانہ میں اپنے طور پر اتنی انگریزی سیکھ لی تھی کہ مختلف کتابوں سے استفادہ کر سکتے تھے۔

"ان کی سب سے بڑی کمزوری حالات اور حوالے وضع کرنا تھی۔ اس کے لیے وہ بے تکلف کسی کتاب کا حوالہ دیدیتے اور لکھ دیتے کہ یہ قلمی کتاب ہمارے خاندان گوپامئو کے کتاب خانے میں موجود ہے۔ حالانکہ نہ وہ واقعہ ہی درست ہوتا نہ اس نام کی کوئی کتاب آج عالم وجود میں ہوتی اور نہ گوپامئو میں کوئی کتب خانہ ہی تھا۔ لوگ ان پر اعتراض کرتے لیکن یہ اللہ کا بندہ نہ کبھی اپنی حرکت سے پشیمان ہوا اور نہ اس نے اپنی یہ افسوس ناک اور گمراہ کن روش ترک کی۔ ... خود میں ایک مرتبہ بہت پریشان ہوا۔ انھوں نے اپنی ایک تحریر میں ایک قلمی کتاب کا حوالہ دیا۔ اور لکھ دیا کہ یہ خطی نسخہ ارکاٹ کے کتاب خانے

میں محفوظ ہے۔ چونکہ موضوع سے مجھے دلچسپی تھی میں نے اپنے بعض مدراسی دوستوں سے استمداد کی۔ مہینوں کی تگ و دو کے بعد یہ راز کھلا کہ یہ سب جعل تھا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ پیر کے دن ۸ دسمبر ۱۹۶۹ء ساڑھے چھ بجے شام کراچی میں انتقال ہوا۔"

جناب مالک رام صاحب کا یہ انا للہ مفتی صاحب کی وفات پر نہیں۔ انکے جعل اور اپنی پریشانی خاطر پہ ہے۔

بہر حال قبل اس کے کہ ہم اس بیان کے مختلف اجزا کو پرکھیں کچھ اور تحریریں بھی دیکھنی ہیں۔ ایک شعر ہے ع

زر افشاں مانگ ہے اور سبز اس پر اک دوشالا ہے　　غضب ہے پرِ طاؤس میں کالے کو پالا ہے

اس شعر کی روایت مفتی انتظام اللہ صاحب کی طرف کی گئی ہے کہ انھوں نے اسے مرزا غالب کی فی البدیہہ تصنیف بتایا ہے۔ ۲۴ر جون ۱۹۸۷ء کے اخبار جنگ لندن میں سید قدرت صاحب نقوی نے حتمی طور پر ثابت کیا ہے کہ یہ شعر نجم الغنی کی "بحر الفصاحت" کے مطابق مہر کا ہے۔ یہاں مجھے اس شعر کی اصل سے کوئی سروکار نہیں بلکہ اس سلسلہ میں اور اس کو غالب سے منسوب کیے جانے کے سلسلہ میں جو کچھ لکھا گیا ہے اس کا جائزہ لینا ہے۔

نادم صاحب سیتاپوری نے "غالب کے کلام میں الحاقی عناصر" مطبوعہ کراچی میں صفحہ ۴۷ پر لکھا ہے: "جناب مالک رام اسی شعر کے سلسلہ میں تحریر فرماتے ہیں:

"شرح غالب (ص ۳۹۳) میں جناب عرشی صاحب نے اس شعر سے متعلق صاحب موصوف (مفتی انتظام اللہ خاں شہابی) کے دو مختلف مضمونوں کے اقتباس دیے ہیں۔ دونوں کا مضمون ایک ہی ہے جب مرزا غالب آخر مرتبہ آگرے گئے تو وہاں محفل احباب میں ایک رنڈی "صنم" نامی کو زرق برق لباس میں ملبوس سبز دوشالہ اوڑھے ہوئے دیکھا تو فی البدیہہ یہ شعر پڑھا۔ مفتی صاحب موصوف نے "خلاف معمول" اس روایت کے لیے کوئی حوالہ نہیں دیا بہر حال اگر وہ ایسا کرتے بھی جب بھی قابل قبول نہ ہوتا! میں افسوس کے ساتھ یہ ظاہر کرنے پر مجبور ہوں کہ شاید بہت کم لوگوں کو اس کا علم ہے کہ مفتی صاحب روایتیں وضع کرنے میں بہت مشاق ہیں وہ بالعموم کسی قلمی کتاب کا نام اختراع کر کے اس کی سند دیں گے یا کسی معروف کتاب کے قلمی حاشیے کا ذکر کر دیں گے اور لکھ دیں گے کہ یہ کتاب "مفتیان گوپامؤ" ضلع (ہردوئی) کے کتب خانے میں ہے یا آرکاٹ (مدراس) کے شاہی کتاب خانے کی زینت ہے یا کسی اور جگہ ہے؟ حالانکہ اس کا کہیں وجود نہیں ہوتا۔ "گوپامؤ" میں خیر سے کوئی کتاب خانہ ہے ہی نہیں؟ اور جن کتابوں سے متعلق انھوں نے بعض مضامین میں آرکاٹ کا نام لیا ہے تحقیق سے وہ بھی غلط ثابت ہوا ہے! وہ (مفتی صاحب) پچھلے ۲۵-۳۰ برس سے اس جعل کے مرتکب ہوتے رہے ہیں اور بہت سے لوگ اس سے گمراہ ہوئے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ انھیں اس پر متنبہ کیا جائے اور ان کی کوئی روایت اس وقت تک تسلیم نہ کی جائے جب تک کہ یہ کسی دوسری مصدقہ شہادت سے درست ثابت نہ ہو۔ فی الحال اتنے ہی اشارے پر اکتفا کرتا ہوں۔"

—— میں اس شعر کو محض مفتی صاحب کی سند پر غالب کا تسلیم کرنے سے انکاری ہوں" (ص ۵۲ سہ ماہی فکر و نظر علیگڑھ جنوری ۱۹۶۲ء)

اس کتب خانہ مفتیانِ گوپامئو کے متعلق یکے از مفتیانِ گوپامئو حکیم بہار الدین فاروقی گوپاموی نے نادم صاحب سیتاپوری کو ۳ نومبر ۱۹۵۵ء کو ایک خط لکھا۔ خط دلچسپ اور کافی تفصیلی معلوم ہوتا ہے۔ افسوس یہ ہے کہ نادم صاحب نے مکمل خط نقل نہیں کیا ورنہ حکیم بہار الدین صاحب اور مفتی انتظام اللہ صاحب کے باہمی تعلقات کو سمجھنے میں آسانی ہوتی اور یہ بھی معلوم ہو سکتا کہ حکیم صاحب اور مفتی صاحب اور ان کے پھوپی زاد بھائی "مفتی محمد حسن صاحب مصنف "تاریخ مفتیانِ گوپامئو" سے کیا پرخاش ہے۔ خط کے پڑھنے سے صاف ظاہر ہو جاتا ہے کہ حکیم بہار الدین صاحب کو اپنے قریبی عزیز "مفتی انتظام اللہ صاحب سے گویا "باپ مارے کا بیر" ہے۔ کیوں؟ (۳) کی وجہ اب معلوم ہونی مشکل ہے۔ خط کے ابتدائی جملوں سے ہی حکیم صاحب کی برہمی مزاج مترشح ہے۔ خط یہ ہے:

"—— دودمان مفتیان گوپامئو ضلع (ہردوئی) کے ایک فرزند مفتی جی انتظام اللہ اکبرآبادی اپنے پھوپی زاد بھائی مفتی محمد حسن وکیل جون پوری مؤلف "تاریخ خاندان مفتیانِ گوپامئو" سر لاخیے کے مصداق، آپ اپنے برادر معظم کے نقش قدم پر چل کر ایسے ایسے مضامین تراشتے رہتے ہیں کہ اگلوں کی دماغی پرواز کو وہاں تک رسائی نہیں مل سکتی۔

طرز تصنیف و تالیف: چونکہ آپ (مفتی انتظام اللہ خاں شہابی) کے دادا صاحب نے اپنی ساری کمائی علمی نوادرات کے حصول میں صرف فرمائی اس لیے ان کا کتب خانہ عجائبات عالم میں شمار ہونے کے قابل ہے۔ اسی کی قوت پر آپ کی تالیفات وجود پذیر ہوتی رہتی ہیں۔ اور آپ کو اپنے دعاوی کے ثبوت میں کوئی دشواری لاحق نہیں ہوتی حتی کہ وہ اس کی بھی پرواہ نہیں کرتے کہ ان کی کتب و حوالہ جات دنیائے تصنیف و تالیف میں وجود پذیر بھی ہوئیں یا نہیں؟ یہی عالم ان کے یہاں مصنفین کا ہے کہ جن صاحب کو جس کتاب کا مصنف چاہا لکھ دیا۔ و برعکس انھیں یہ حق حاصل ہے کہ کسی کتاب کے اعتبار و استفسار کے لیے صرف اتنا ہی کافی ہوتا ہے کہ اس کے مضامین کے لیے کوئی حوالہ لکھ دیا جائے بس۔ ! رہا صدق و کذب حقیقت! اس کا کوئی وجود خارجی نہیں بلکہ وہ ایک حسیاتی و ذہنی چیز ہے ... ! حوالہ جات خواہ صحیح ہوں یا غلط۔ ؟ لیکن اگر کوئی شخص "مفتی جی" کی رائے سے متفق نہ ہو سکے اور اس کا دل ان کے مضامین یا حوالہ جات کو پرکھنا چاہے تو اولاً وہ کتابیں عنقا ثابت ہوں گی اور بجز "کتب خانہ مفتیان" کے اور کسی جگہ مل ہی نہیں سکتی ہیں۔ اور اگر کوئی وہاں پہنچنے کی ہمت کرے تو بے سود۔ ! کیونکہ وہ "عالم بالا" میں ہے جہاں اس جسم ثقیل عنصری کی رسائی ناممکن و محال۔ اور اگر بدرجہ مجبوری ان کے مصنفین ہی سے مل کر زبانی معلومات حاصل کر لینے پر اکتفا کرنا چاہے تو وہ سب "خلد آشیاں و جنت مکاں" ہو چکے ہوں گے "کتب خانہ مفتیان" کا وجود اگرچہ عرصے سے نہیں رہا مگر بطور "اثاث البیت"

کے تقریباً دو سو کتابیں باقی تھیں۔ ۱۸۹۵ء میں بہ زمانہ مسلم ایجوکیشنل کانفرنس مسٹر محمود مرحوم (جسٹس محمود، وفات ۱۹۰۳ء بمقام سیتاپور) نے اس میں سے کچھ کتابیں خریدیں۔ باقی پڑی رہیں، نہ ان کی کوئی فہرست تھی اور نہ تنظیم۔ تقریباً ۱۹۱۴ء میں منشی اعجاز احمد صاحب نے ان کی فہرست مجھ سے بنوائی تھی جس کے بعد غالباً وہ بھوپال لے گئے اور ریاست کے ہاتھ فروخت کیں۔ یا کسی مدرسہ وغیرہ کو دیدیں؟ اس کا مجھے کچھ علم نہیں۔ ممکن ہے مفتی انتظام اللہ کے دادا کے پاس کچھ کتابیں آبائی کتب خانے کی ہوں لیکن پچاس سال سے "گوپامئو" میں اس کا کچھ بھی نام ونشان نہ ہے اور نہ مفتی انتظام اللہ کو ان کے دیکھنے کا اتفاق ہوا۔" (خط بنام نادم سیتاپوری۔ اصل محفوظ ہے)

مندرجہ بالا عبارت نادم صاحب کی کتاب "غالب کے کلام میں الحاقی عناصر" سے نقل ہوئی ہے۔ اصل خط راقم الحروف کے پاس محفوظ نہیں بلکہ نادم صاحب کے کاغذات میں ہوگا۔ اگر ہوگا تو۔

ان بیانات پر تنقیح کرنے سے پہلے ایک بات میں بالکل واضح طور پر کہہ دینی چاہتا ہوں۔ اور وہ یہ کہ میرے پیش نظر مفتی صاحب کا دفاع بالکل نہیں ہے۔ میں نے ان کے حوالہ سے کبھی کوئی بات نہیں لکھی اور نہ ان کے کسی حوالہ کو جانچا یا پرکھا۔ اس کی ضرورت ہی پیش نہیں آئی۔ نادم صاحب سیتاپوری، مالک رام صاحب اور دوسرے شاکی حضرات سب کے سب ثقہ بزرگ ہیں اور کوئی وجہ نہیں کہ ان کے بیان کو درست نہ سمجھا جائے۔ میرے نزدیک اگر مفتی صاحب نے غلط بیانی کی ہے تو اس کا دفاع میرے ذمہ نہیں۔ کسی کے ذمہ نہیں۔ اگر انھوں نے تاریخ میں تغلیط کی ہے تو تاریخ خود ان کی تغلیط کر دے گی۔

جیسا میں پیشتر عرض کر چکا ہوں مفتی صاحب کی خدمت میں مجھے کبھی نیاز حاصل تھا۔ اور نیاز حاصل ہونا کیا معنی ہم ان کے خورد تھے۔ جب تک آگرہ میں رہے برابر انھیں دیکھتے رہے۔ جنھوں نے انھیں دیکھا ہے وہ تصدیق کریں گے کہ نہایت سیدھے سادے بزرگ تھے۔ وضع قطع میں، لباس میں، گفتگو میں، رہن سہن میں سادگی اور انتہائی سادگی۔ کہتے ہیں "اھل الجنۃ بلہ" جنتی لوگ بھولے ہوتے ہیں۔ بے شبہ مفتی صاحب بھولے اور جنتی تھے۔ ساری زندگی ان کی خدمت میں گذری۔ علم و ادب کی خدمت کی اور دوسروں کی بھی خدمت کی۔ بلکہ بعض حضرات نے تو ان کا علمی و ادبی استحصال بھی کیا۔ طبیعت میں نہایت لطیف قسم کی ظرافت بھی تھی۔ ان کی ساری زندگی لکھنے پڑھنے میں ہی گذری۔ مجھے تو اپنا خورد سمجھتے ہی تھے۔ ایک دن کراچی میں ناظم آباد کی چورنگی کے پاس مل گئے۔ وہیں ایک طرف کھڑے ہو کر مختلف باتیں کرتے رہے۔ پھر کہنے لگے "میاں یہ کیا جدید انداز تحقیق نکالا ہے کہ غالب کے گھر میں کتنے چوہے تھے۔ کتنوں کی دُمیں تھیں، کتنے لنڈورے تھے اور دُمیں جس بلی نے کاٹی تھیں وہ درگا بائی منم

کی تھی یا میرزا حسام بیگ کی لڑکی نے پالی تھی۔ یا حکیم مومن خاں کے کپڑے کس دھوبن کے ہاں دھلنے جاتے تھے اور ان پر دھوبی مارکہ کیا لگا ہوتا تھا۔۔۔"

پھر کہنے لگے: "بھلا یہ کوئی بات ہوئی۔ صاف دکھائی دیتا ہے کہ چھاپے کی غلطی ہے یا کاتب نے نقطوں اور ہندسوں میں فرق کر دیا ہے۔ اب بجائے اسے ٹھیک کر کے پڑھنے کے لکھے جاتے ہیں صفحوں پر صفحے کہ نسخہ فلاں میں ہندسہ یوں بنا ہے مخطوطہ فلاں میں نقطہ نیچے ہے وغیرہ وغیرہ۔ یہ کیا تحقیق ہے۔"

اب آپ ان باتوں سے جو نتیجہ بھی اخذ کرنا چاہیں کر لیں۔ لیکن اس "بلند پایہ تحقیق" انداز کی افادیت کا نہ میں قائل ہوں نہ وہ قائل تھے۔ جو اس طرح کے تحقیقی ذہن کو عہد جدید کی تخلیق اور ذہن سمجھا جاتا ہے سمجھتا رہے۔ ع

مرا چہ کہ کہ منعِ شراب خوارہ کنم۔ میں یہاں پھر اسی امر کا اعادہ کرنا چاہتا ہوں کہ اگر مفتی صاحب نے "روایتیں وضع کرنے میں" بقول مالک رام صاحب "مشاقی کا ثبوت دیا ہے" تو یقینی یہ نہایت ہی غیر مستحسن بات ہے۔ وضع روایات کے حق میں کوئی کلمہ خیر کہا ہی نہیں جا سکتا۔ اور جن حضرات نے مفتی صاحب پر وضع روایات کا الزام عائد کیا ہے انکی بات کو میں بلا دلیل قبول کرنے کو تیار ہوں۔ اور قبول کرتا ہوں۔ لیکن مفتی صاحب کے متعلق ہر کہ و مہ کی ہر بات کو نہ صرف یہ کہ بلا دلیل قبول کرنے کو تیار نہیں بلکہ بلا تنقیح بھی "قطع نظر اس کے کہ راوی کیسا کچھ ثقہ او رجید ہے" ماننے کو تیار نہیں۔

بات کچھ بہت وقیع اور اہم نہیں "مفتی صاحب کے نقطۂ نظر سے موش شماری خانۂ غالب" والی بات ہے مگر یہ بات گفتنی ہے۔ جناب مالک رام صاحب نے مفتی صاحب کے متعلقہ تحریر میں جسکا اقتباس اوپر گذر چکا ہے بڑے واضح طور پر لکھا ہے۔

"انتظام اللہ کی تعلیم سراسر فارسی اور عربی تک محدود رہی۔ لیکن آخری زمانہ میں اپنے طور پر۔۔۔ انگریزی سیکھ لی تھی۔۔۔" (صرف ضروری الفاظ لیے گئے ہیں)

اس جملہ میں "سراسر" کا لفظ تاکیدی اور قطعی ہے۔ اور مطلب اس بیان کا صرف یہ ہے کہ مفتی صاحب نے ہرگز ہرگز کسی انگریزی اسکول میں تعلیم نہیں پائی۔ البتہ آخری زمانہ میں انگریزی وہ بھی اپنے طور پر بقدر ضرورت سیکھ گئے تھے۔ اس میں "آخری زمانہ" کا تعین ہونا چاہیے یعنی ۱۹۶۹ء میں انتقال فرمایا۔ تو آخری زمانہ کیا ہوگا۔ مالک رام صاحب ہی کے مطابق وہ ۱۹۴۶ء میں کراچی چلے گئے تھے۔ کیا اس زمانے کو آخری کہا جائے گا یا تقسیم سے قبل دس بارہ برس کی مدت کو یعنی ۱۹۳۰ء سے ۱۹۴۷ء کو آخری سمجھیں گے۔ بہر حال یہ گتھیاں تو الجھتی ہی جائیں گی۔ مالک رام صاحب ہی ناخن تحقیق سے اس کی عقدہ کشائی فرما سکتے ہیں۔ میرا اس دراز نفسی سے مدعا صرف یہ ہے کہ یہ کہنا "سراسر" غلط ہے کہ مفتی صاحب کی تعلیم سراسر فارسی اور عربی تک محدود تھی اور صرف انھوں نے اپنی زندگی کے آخری زمانے میں،

اس کا تعین خواہ کچھ ہی ہو محض اپنے طور پر انگریزی سیکھ لی تھی۔

میری اطلاع کے مطابق جس عمر میں بچوں کو انگریزی اسکولوں میں داخل کرایا جاتا تھا وہ بالکل اسی عمر میں انگریزی اسکول میں داخل ہوئے۔ اور سال بہ سال ترقی کرتے ہوئے آٹھویں درجے تک پہنچے۔ اب آٹھویں کے بعد نویں اور دسویں تک بھی پہنچے۔ میٹرک پاس کیا نہ کیا۔ امتحان دیا نہ دیا۔ اس کے متعلق کچھ فی الحال کہنے سے قاصر ہوں مفتی صاحب غالباً ۱۹۱۷ء میں بڑودا (کذا) کے کالابھون اسکول (کذا) کی آٹھویں جماعت میں تھے۔ میری دسترس میں جغرافیہ کی ایک کتاب ہے جو HUGHE'S PRINCIPLES OF GEOGRAPHY کا اردو ترجمہ ہے۔ کتاب اصول علم جغرافیہ" اس کا نام ہے اور ۱۸۵۰ء میں آگرہ میں سکندرہ کے یتیموں کے چھاپے خانہ میں چھپی ہے۔ اس پر اودے رنگ کی ربڑ کی مہر ڈاکٹر الہام اللہ کی ہے جو مفتی صاحب کے چچا تھے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب عرصہ تک اسکولوں کے نصاب میں رہی ہے اور اس کی جلد کے اندر جو بادامی کاغذ لگا ہے اس پر تین نسلوں کے طالب علموں کے نام اور سن پنسل اور روشنائی سے لکھے ہیں۔ مفتی صاحب نے اپنا نام سُرخ سیاہی، سے لکھا ہے

MD.INTEZAMULLAH, STUDENT CLASS VIII SERA KALABHON SCHOOL, BARODA 2-11-17

اس تحریر میں شہر کا اور اسکول کا نام صاف نہیں پڑھا گیا۔ لیکن اس دستخطی صفحے کی عکسی نقل اور کتاب کے پہلے صفحے کی عکسی نقل آخر مضمون میں لگا دی ہے۔ (شاید جناب مدیر شائع کر سکیں) یہ بات بھی دلچسپ ہے کہ الہام اللہ اور احکام اللہ میں نام کی انگریزی ہجے کمپنی بہادر کے عہد کے رسم الخط میں OOLAH درج ہے۔ مہر میں بھی اور دستخطوں میں بھی۔ لیکن انتظام اللہ صاحب نے آٹھویں درجہ میں ہی اس کو ULLAH- سے بدل دیا تھا۔

بہرحال، کوئی مانے نہ مانے میرے نقطۂ نظر سے یہ بات حتمی طور سے مالک رام صاحب کے اس بیان کی تردید کے لیے کافی ہے کہ مفتی صاحب نے باضابطہ ابتدائے عمر سے ہی انگریزی تعلیم حاصل نہیں کی تھی۔ یہاں اس بات کا اضافہ اور کر دیا جائے کہ اس دور میں مڈل یا میٹرک کا طالب علم انگریزی کی جو استعداد حاصل کر لیتا تھا جو آج کا بی اے پاس شدہ بھی استعداد نہیں رکھتا۔

اب ذرا "کتب خانۂ مفتیان گوپامؤ" اور اس سلسلہ میں مفتی صاحب کے حوالہ کتب وغیرہ سے متعلقہ بیانات کو پھر سے پڑھ لیجیے۔ جناب مالک رام صاحب، حکیم بہاء الدین گوپاموی اور نادم صاحب سیتاپوری کے بیان سے یہ چند مقدمات مرتب ہوتے ہیں:

۱۔ گوپامؤ میں خیر سے کوئی کتب خانہ ہے ہی نہیں۔ (مالک رام صاحب) ۲۔ اولاً وہ کتابیں عنقا ثابت

ہوں گی اور بجز کتب خانہ مفتیان کے کسی اور جگہ مل ہی نہیں سکتی ہیں وہ عالم بالا میں ہے'۳۔ پچاس سال سے گوپامئو میں اس کا کچھ نام ونشان ہے'۴۔ مفتی انتظام اللہ کو ان کے دیکھنے کا اتفاق ہوا'۵۔ ممکن ہے مفتی انتظام اللہ کے دادا کے پاس کچھ کتابیں آبائی کتب خانے کی ہوں۔ (حکیم بہار الدین گوپامئوی۔

ان بیانات سے پڑھنے والے کے ذہن پر یہ تاثر قائم ہوتا ہے کہ "گوپامئو" کا کتب خانہ نہ تھا نہ ہے نہ اس کا وجود سوائے مفتی صاحب کے ذہنی اختراع کے کوئی اور حقیقت رکھتا ہے۔ حالانکہ حکیم بہار الدین صاحب کے ہی اکیلے بیان کا اگر تجزیہ کیا جائے تو یہ بات صاف نکھر کر سامنے آجاتی ہے کہ مفتیان گوپامئو کا کتب خانہ تھا۔ اور ۱۹۱۴ء تک خود حکیم صاحب موصوف نے کم سے کم دو سو کتابوں کی فہرست تیار کی تھی۔

لیکن ذرا توقف کیجیے۔ پہلے یہ سمجھ لینے دیجیے کہ "کتب خانہ مفتیانِ گوپامئو" کی حقیقت کیا ہوگی۔ اصل حقیقت کیا تھی یہ تو اب کوئی بتا نہیں سکتا۔ لیکن شاید ناپختہ ذہنوں میں "کتب خانہ مفتیانِ گوپامئو" کے شاندار نام سے جو تصویر ابھرتی ہے وہ یہ ہے کہ عمارت کشادہ، خوش وضع، ترتیب سے الماریوں اور تختوں پر بے شمار کتابیں سجی ہوئیں۔ علم کے طالب، ذوق و طلب علم کی تسکین کے لیے اس سے رجوع کرتے ہوں گے وغیرہ وغیرہ۔ مجھے تحقیق نہیں اور نہ کوئی اب کر سکتا ہے لیکن سیدھی سادی بات یہ سمجھ آتی ہے کہ جب گوپامئو میں قضا اور افتا کا منصب قائم ہوا اور اس خاندان کے افراد میں بطور وراثت کے یہ عہدہ منتقل ہونا شروع ہوا تو لازمی طور پر یہ علما اور فضلا اپنا ذاتی کتب خانہ بھی رکھتے ہوں گے۔ اور نیا مفتی اپنے اسلاف کے کتب خانے پر اضافہ کرتا رہا ہوگا۔ یہ سرکاری کتب خانہ نہ تھا نہ اس کی کوئی گرانٹ ہوگی، نہ شاہان اودھ کے کتب خانے کی طرح کوئی "ایینگر" اس کی فہرستِ کتب ترتیب دینے کے لیے مامور کیا گیا ہوگا۔ یہ محض ذاتی نجی اور خاندانی کتب خانہ تھا جو اس خاندان کے ذوق علمی کی عکاسی کرتا ہے۔ اسے وقتِ واحد میں شخص واحد نے قائم نہیں کیا ہوگا۔ جب منصب قضا اور افتا موقوف ہوا ہوگا تو کتب خانہ کیا معنی اصحابان کتب خانہ کا ذریعۂ معاش ہی متزلزل ہو گیا ہوگا۔

مفتی انتظام اللہ صاحب شہابی کے مخالف حکیم بہاء الدین گوپامئوی بھی اپنے الزامات کے باوجود کہہ گئے ہیں کہ:

"آپ کے دادا صاحب نے اپنی ساری کمائی علمی نوادرات کے حصول میں صرف فرمائی۔ اس لیے ان کا کتب خانہ عجائباتِ عالم میں شمار ہونے کے قابل ہے۔ اسی کی قوت پر آپکی تالیفات وجود پذیر ہوتی رہتی ہیں۔"

پھر اسی تحریر میں آگے چل کر حکیم صاحب لکھتے ہیں:

"ممکن ہے مفتی انتظام اللہ کے دادا کے پاس کچھ کتابیں آبائی کتب خانہ کی ہوں ...."

حکیم صاحب کا خط پہلے نقل کیا جا چکا ہے۔ اس پوری تحریر میں ژولیدہ بیانی اور پریشاں خیالی نمایاں ہے۔ میں پوچھتا ہوں کہ مفتی صاحب کے دادا نے اپنی ساری کمائی خرچ کر کے جو نایاب ذخیرہ کتب جمع کیا کس سبب سے "وہ کتب خانہ مفتیان گوپامئو" کا حصہ شمار کیے جانے کے قابل نہیں؟ خود حکیم صاحب نے اقرار کیا ہے کہ آبائی کتب خانے کی کچھ کتابیں ممکن ہے مفتی صاحب کے دادا کے پاس ہوں۔ یہ آبائی کتب خانہ اگر "کتب خانہ مفتیان گوپامئو" نہیں تھا تو اور کیا تھا؟ اور جو کتابیں اثاث البیت کے طور پر دست بدست منتقل ہوتی رہیں جہاں بھی جمع تھیں "کتب خانہ مفتیانِ گوپامئو" کا ہی حصہ نہیں تھیں تو کیا تھیں؟ بہر حال یہ امر بہت زیادہ محتاجِ ثبوت نہیں کہ "کتب خانہ مفتیان گوپامئو" حقیقی وجود رکھتا تھا۔ اور گوپامئو میں ہی تھا۔ منصب افتا کی موقوفی کے بعد اہل خاندان میں سے جس کو توفیق ہوئی وہ اثاث البیت کے اس حصہ کا نگراں بنا۔ یہ توفیق الٰہی اور مشیت ایزدی معلوم ہوتی ہے کہ مفتی انتظام اللہ صاحب شہابی کے دادا نے اپنے اسلاف کی روایت کو قائم اور جاری رکھا اور پھر آخری دور میں مفتی صاحب کے ذمہ "کتب خانہ مفتیان گوپامئو" کے بقیۃ السیف کی حفاظت و نگرانی ہوئی۔

"جناب مالک رام صاحب کا یہ فرمانا کہ "... نہ گوپامئو میں کوئی کتب خانہ ہی تھا" مطلق غلط ہے۔ اسی طرح حکیم مفتی بہاءالدین گوپامئوی کا یہ کہنا خواہ صحیح ہو کہ "پچاس سال سے گوپامئو میں اس کا کچھ بھی نام و نشان نہ ہے" لیکن یہ کہنا مالک رام صاحب کے فرمان کی طرح سراسر غلط ہے کہ "... اور نہ مفتی انتظام اللہ کو ان کے دیکھنے کا اتفاق ہوا"۔

پچاس سال کیا معنی اسی نوے برس سے بھی گوپامئو ضلع ہردوئی میں بے شک "کتب خانہ مفتیانِ گوپامئو" نہ ہوگا۔ کیوں کہ "کتب خانہ مفتیانِ گوپامئو" کا بقیۃ السیف مفتی انتظام اللہ صاحب شہابی گوپامئوی اکبرآبادی کی حویلی اور رہائش گاہ واقع چرچی مار ٹولہ آگرہ میں محفوظ تھا۔ اور مفتی صاحب جو حوالے دیتے تھے وہ انھیں کتابوں سے دیتے تھے۔ اس کتبخانہ کا ایک لطیفہ میں اپنے لڑکپن کا بیان کر دوں۔ یہ دور تھا کہ ہم اسکول کی کسی نیچی جماعت میں تھے لیکن اپنی عمر اور استعداد سے بڑھ کر اردو کی کتابیں پڑھتے رہتے تھے جن کا کوئی حد و شمار ہمارے گھر میں نہ تھا۔ "گو اگرچہ پھول" "غنچہ" "ہونہار" "پیام تعلیم" پڑھنے کی عمر تھی جو برابر آتے رہتے تھے لیکن ہم اپنی دانست میں ان سے گذر چکے تھے اور "عالمگیر" "نیرنگ خیال" "ساقی" وغیرہ پڑھتے رہتے تھے اور بڑے بھائیوں سے اس سلسلے میں مسابقت بھی رہتی تھی۔ وہ سمجھتے تھے کہ ہم اپنا وقت اور ان کے رسالے ضائع کر رہے ہیں۔ بہر حال اسی زمانہ میں ہم نے کہیں سے "کتب خانہ مفتیان گوپامئو" کا نام سن لیا۔ مفتی صاحب کو تو برابر دیکھتے ہی رہتے تھے۔ ہمارے محلے گلی حکیمان سے ان کا محلہ چرچی مار ٹولہ بہت قریب تھا۔

ایک دن ہم نے سوچا کہ مفتی صاحب کے کتب خانہ کی سیر کرنی چاہیے۔ چنانچہ مفتی صاحب کے گھر جا پہنچے۔ پرانی وضع کا بڑا مکان ہے۔ ڈیوڑھی در ڈیوڑھی۔ پھر زنان خانہ، مگر در و دیوار سے صاحب خانہ کی بے سروسامانی اور اس سے زیادہ بے نیازی اور استغنا ظاہر تھا۔ بے چھت کی ڈیوڑھی تھی یا چھوٹا صحن تھا۔ اب یاد نہیں۔ فرش کچا تھا۔ مالک رام صاحب نے لکھا ہے کہ مدتوں اپنے بہنوئی کے ساتھ شیر، ہاتھی وغیرہ کی خرید فروخت کرتے رہے (اس کی تفصیل بعد میں آئے گی) لیکن مجھے اس وقت شیر ہاتھی کیا معنی گائے یا بکری بھی دکھائی نہ دی۔ ایک طرف چند مرغیاں ضرور چگ رہی تھیں اور بان کی کھرّی چارپائی پر ایک دبیز قسم کی مرغی براجمان تھی غالباً کُڑک ہوگی۔ بہرحال ہم نے سرسری جائزہ لیا اور بالکل کسی قسم کا خیال دل میں نہ آنے دیا اور مفتی صاحب کو آواز دی۔ مفتی صاحب اندرون حویلی سے نکل کر باہر آئے۔ دیکھ کر کچھ متعجب ہوئے۔ پھر کہا: "کہیے میاں! خیر ہے، کیسے تکلیف فرمائی"؟

وہ سمجھے اپنے والد صاحب کا کوئی پیغام لے کر آیا ہوگا۔ میں نے عرض کیا کہ بہت دن سے کتب خانہ مفتیانِ گوپامؤ دیکھنے کا اشتیاق ہے۔ اسے دیکھنا چاہتا ہوں۔ اور یہ کہہ کر ہم نے اطراف میں نظر دوڑائی کہ کہیں کچھ آثار از قسم کتبخانہ دکھائی دیں۔ ذہن میں یہ تھا کہ ہمارے اسکول میں بڑا ہال ہے جس میں شیشے کی الماریوں میں کتابیں جمی ہوئی ہیں۔ یا ایسا نہ ہو تو کم سے کم خود ہمارے گھر میں کھلے تختوں کی بے شیشہ کی الماریاں تھیں جن پر کتابیں لدی رہتی تھیں یا کچھ طاقوں وغیرہ میں رکھی تھیں، ایسا کچھ ہوگا کم سے کم۔ مفتی صاحب نے غالباً اسے بھانپ لیا۔ فرمانے لگے "میاں آپ کو کون سی کتاب چاہیے۔ اس کا نام لیجیے۔ کتابیں کہیں الماریوں میں تھوڑی سجی ہیں۔ کپڑوں کی پوٹلیوں میں بندھی پلنگوں، پڑمچانوں پر کچھ قلمی، صندوقوں وغیرہ میں بند ہیں۔ آپ کتاب بتائیں میں دیکھتا ہوں۔ اگر فوری مل گئی تو دکھا دوں گا۔ ورنہ بتا دوں گا کہ پھر آئیے تو ڈھونڈ رکھوں گا۔"

یہ سن کر ہمیں مایوسی اور حیرت دونوں ہی ہوئی۔ مگر اب جب خیال کرتا ہوں تو نہ مایوسی ہوتی ہے نہ حیرت، کیوں کہ مفتی صاحب کی زندگی اور رہائش اسی طرح کی قلندرانہ تھی۔ اور جب انھوں نے ترک وطن کیا تو کتابوں کی جو پوٹلیاں ساتھ لے جا سکے وہ ساتھ لے گئے۔ باقی کا کیا ہوا خدا جانے۔

لیکن اتنا تو میں بھی جانتا ہوں کہ اسی "کتب خانہ مفتیانِ گوپامؤ" کی کم سے کم بیس کتابیں جن میں چند قلمی بھی ہیں۔ اس وقت گوپامؤ (اکبر آباد) کراچی سے دس ہزار میل دور یہاں لندن میں میری تحویل میں ہیں۔ اور اسی بنا پر جیسا یقین سورج کے مشرق سے نکلنے اور مغرب میں ڈوبنے پر ہے (ہرچند کہ یہاں سورج کا نکلنا اور ڈوبنا محض جنتری کے لحاظ سے ہوتا ہے ورنہ اکثر اکثر نہ نکلتا ہے نہ ڈوبتا ہے) ایسا ہی یقین اس بات پر ہے کہ "گوپامؤ" میں زمانہ عروج مفتیان

میں "کتب خانہ" موجود تھا۔ اس کے بعد وہ دست بدست مفتی انتظام اللہ صاحب شہابی کے گھر چوڑی مار ٹولہ میں منتقل ہوا۔ مابعد، واللہ اعلم۔ لیکن جو بھی کچھ گذرا ہو کتابوں اور کتب خانہ پر کم سے کم بیس کتابیں میرے پاس موجود ہیں۔ بعض پر مہریں بھی ہیں۔ ایک کتاب کے مہر والے صفحے کی نقل بھی آخر مضمون میں لگا دی ہے۔

جو کتابیں "کتب خانہ مفتیانِ گوپامئو" کی میری تحویل میں ہیں ان پر مختلف مفتیانِ گوپامئو کے دستخط ہیں۔ بیشتر پر مفتی انتظام اللہ صاحب کے دستخط ہیں۔ بعض کتابیں بالکل نادر ہیں۔ ان میں سے کچھ کا مختصر تعارف آخر مضمون میں کراؤں گا۔ فی الحال ایک اور مسئلہ کی تنقیح درپیش ہے۔

غلط حوالہ نویسی کے سلسلہ میں حکیم بہار الدین گوپاموی اور ان سے زیادہ جناب مالک رام صاحب نے مفتی صاحب پر "سب وشتم" کیا ہے۔ قاری کو شاید سب وشتم کے الفاظ سخت اور گراں محسوس ہوں:

"وہ پچھلے ۲۵۔۳۰ برس سے اس جعل کے مرتکب ہو رہے ہیں... ضرورت اس امر کی ہے کہ انھیں اس امر پر متنبہ کیا جائے..."

یہ جملے تو جناب مالک رام صاحب نے ۱۹۶۱ء میں تحریر فرمائے تھے جب مفتی صاحب حیات تھے۔ انھوں نے بھی پڑھے ہوں گے مزا لیا ہوگا۔ شاید بھولپن سے زیر لب مسکرائے ہوں اور کہا ہو کہ:

"۔ ہاں میاں! چڑھا سکتے ہو تو پھانسی پر چڑھا دو۔"

میں تو ۱۹۶۱ء تک نہ برصغیر میں تھا نہیں اس لیے اس تحریر سے عرصۂ دراز تک بے خبر رہا۔ مفتی صاحب کا فقرہ تو محض قیاسی اور قرائینی ہے لیکن میں اب کہتا ہوں کہ پھانسی لگا دو اگر لگا سکتے ہو تو ـــــ اور متنبہ کیا کیا جائے زندگی میں تو ارشاد یہ تھا مرے پیچھے فرمایا:

"... لیکن یہ اللہ کا بندہ نہ کبھی اپنی حرکت سے پشیمان ہوا نہ اس نے اپنی یہ افسوس ناک گمراہ کن روش ترک کی..."

اس بیان میں صیغۂ واحد غائب کا استعمال بھی نظر میں رہے تو مزہ دے گا! اب آیئے حوالہ نویسی پر۔ مالک رام صاحب نے تحریر فرمایا ہے: "انھوں نے اپنی ایک تحریر میں قلمی کتاب کا حوالہ دیا اور لکھ دیا کہ یہ خطی نسخہ ارکاٹ کے کتاب خانے میں محفوظ ہے"۔ دوسری جگہ ارشاد فرمایا ہے۔

"کسی قلمی کتاب کا نام اختراع کر کے... لکھ دیں گے... کہ ارکاٹ (مدراس) کے شاہی کتب خانے کی زینت ہے..." (صرف ضروری الفاظ لیے گئے ہیں)

جب راقم الحروف نے پہلی مرتبہ یہ الفاظ پڑھے تو کچھ عجب طرح کا تاثر ہوا۔ کہاں ہردوئی اور گوپامئو یا اکبرآباد۔ کہاں ارکاٹ اور مدراس۔ سینکڑوں بلکہ ہزاروں میل کا فاصلہ۔ پھر کہاں گوپامئو کے مفتی اور ان کا کنبہ۔ کہاں ارکاٹ کا

شاہی خاندان۔ مفتی صاحب کا ارکاٹ کے شاہی کتب خانہ کا حوالہ دینا مجھے ایسا ہی معلوم ہوا جیسے میں خود کوئی حوالہ اختراع کروں اور لکھ دوں کہ کتاب ٹمبکٹو کے کتب خانہ میں ہے!

بات ایسی تو ہو جس پر اگر عینی نہیں تو قرائینی شہادت ہی فراہم کی جا سکے بطلق ہی بے سرو پا بات کہنے سے کیا فائدہ؟ ہم دیکھیں گے کہ ارکاٹ کے شاہی کتب خانے کا تذکرہ مفتی صاحب کی تحریروں میں مطلق ہی بے سر و پا بات کے مترادف نہیں۔ لیکن یہاں میں پھر ایک بات کا اعادہ چاہتا ہوں تکرار خواہ کتنی ہی ناگوار ہو۔ اور وہ یہ کہ اگر مفتی صاحب نے کسی ایسی کتاب کا حوالہ دیا جو ارکاٹ کے شاہی کتب خانے میں واقعی کبھی موجود نہ تھی یا قرطاس و قلم ہی کی منت پذیر نہ ہوئی تو مجھے ہرگز اس کا دفاع منظور نہیں۔ غلط حوالہ بہر حال غلط ہوتا ہے اور دروغ بہر صورت دروغ۔ میں تو دروغِ مصلحت آمیز کا بھی قائل نہیں۔

ہمیں اب دیکھنا یہ ہے کہ کیا کوئی امکان اس بات کا ہے کہ گوپامئو کے مفتیوں کے تعلقات مدراس اور ارکاٹ کے شاہی خاندان کے حکمرانوں اور افراد سے رہے ہوں۔ اور افراد کے ربط ضبط کے ساتھ علمی و ادبی موضوعات اور کتب و مخطوطات کی ارسال و ترسیل اور داد و ستد کا امکان پایا جا سکے۔ بظاہر تو نہیں —— لیکن تاریخی طور پر ناقابل تردید شہادتیں موجود ہیں:

دکن کا صوبہ دار نظام الملک تھا جو آصف جاہِ اوّل کہلایا اور دکن میں آصف جاہی خاندان کی بنیاد رکھی۔ نظام الملک آصف جاہ کا جد مادری (نانا) کون تھا؟ چنیوٹ ضلع جہلم کا سعد اللہ خاں جو شاہ جہاں کا وزیر اعظم بنا اور دورِ مغلیہ کا سب سے نامور اور لائق وزیر اعظم گذرا ہے۔ نظام الملک کا دادا (جد پدری) عابد خاں تھا۔ اور عابد خاں کا باپ یعنی نظام الملک کا پردادا سمرقند کے عظمائے اکابرین سے تھا عالم شیخ نام تھا اور حضرت شیخ شہاب الدین سہروردی کے احفاد سے تھا۔ عابد خاں عہد شاہجہانی میں وارد ہندستان ہوا اور بادشاہ کی روشناسی اور شاہزادہ اورنگ زیب کی خدمت گزینی کے سبب بلند مراتب پائے۔

یہ حالات "مآثر الامراء" باب النون۔ نظام الملک آصف جاہ کے ترجمے سے لیے گئے ہیں۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ مفتیان گوپامئو کا نسب بھی حضرت شہاب الدین سہروردی تک پہنچتا ہے۔ اب خواہ ہم جدّی ہونے کا پاس ہو یا ذاتی اوصاف و کمالات مدنظر ہوں یا جوہر قابل کی سرپرستی مقصود ہو یا کچھ نہ ہو محض امر اتفاقی ہو لیکن نظام الملک آصف جاہ نے انور الدین کو مدراس اور ارکاٹ کا حاکم بنایا۔ اور انور الدین کا وطن گوپامئو تھا۔ مآثر الامراء میں جس کا حوالہ گذر چکا ہے لکھا ہے:

"نواب آصف جاہ در سن (۱۱۵۶) ست و خمسین و مآۃ والف کمر عزم بہ تسخیر ملک کرناٹک بربست۔ و بعد وصول آں دیار اوّل قلعہ ترچناپلی را (کہ در دست مرہٹہ بود) محاصرہ کردہ مفتوح ساخت۔ و بعد ازاں ملک

ارکاٹ را از قوم نوایت (کہ از مدتے آنکہ را در تصرف داشتند) انتزاع نمود و حکومت آن جا بہ انورالدین خاں شہامت جنگ گوپاموی از جانب خود مقرر فرمود۔" (ص ۸۴۷)

"تاریخ عہد انگلشیہ" میں جو مفتی انتظام اللہ صاحب کے والد مولوی مفتی اکرام اللہ صاحب شہابی گوپاموی نے ۱۵۹۹ تا ۱۸۶۰ء تک کے واقعات پر مرتب کی ہے، یہ جملے ملتے ہیں:

"چندا صاحب کو جو سابق کے نوابوں کا کچھ رشتہ دار تھا مقام ارکاٹ اور کرناٹک کا نواب بنادیا اور محمد علی بیٹا انور الدین کا جسے آصف جاہ نے نواب بنایا تھا ترچناپلی کا نواب بنا رہا۔۔۔"

(ف۔ یہ تاریخ عہد انگلشیہ قلمی ہے، کتب خانہ مفتیان گوپامئو کی زینت تھی اور اب لندن میں میری ملکیت میں ہے)

ابھی "مآثر الامرا" کی ہی چند اور سطریں سابق مسلسل بیان سے نقل کی جاتی ہیں:

"در آں جا جم غفیرے از فرنگیان فرانسیس ساکن بندر پھلچری بوساطت چندا با فواج ہدایت محی الدین خاں ملحق شدند۔ و باتفاق بر سر انورالدین خاں گوپاموی (کہ از وقت نواب آصف جاہ ناظم ارکاٹ بود و در عمل ناصر جنگ بہ خطاب شہامت جنگ مخاطب گشتہ) رفتند۔ شانزدہم شعبان سن ۱۱۶۲ھ (اثنین و ستین و مائۃ و الف) معرکہ قتال آراستہ شد۔ بحسب تقدیر شہامت جنگ درجۂ شہادت یافت۔" (ص ۸۵۱)

چندا نے فرانسیسیوں سے ساز باز کر کے انورالدین خاں گوپاموی کا تختہ الٹا مگر "مآثر الامراء" کے بقول خود چندا کا انجام یہ ہوا:

"حسین دوست خاں عرف چندا ہم بتیغ انتقام مذبوح شد و سر ش بنوک نیزہ رسید۔" (ص ۸۶۱)

اس کے بعد ہی اسی سلسلہ میں اور اسی صفحے پر "مآثر الامرا" میں یہ عبارت درج ہے:

"تفسیر ایں مقال آں کہ محمد علی خاں پسر انورالدین خاں گوپاموی بعد شہادت پدر قلعۂ ترچناپلی را قایم کرد (چوں طرۂ پرچم رایات نواب نظام الدولہ عرصۂ ارکاٹ را معطر ساخت) محمد علی خاں آمدہ دولت ملازمت دریافت و بخطاب پدر مخاطب گشت۔"

"۔۔۔ ہر چند نواب نظام الدولہ عرض کرد کہ اقامت ایں اُرکا مصلحت نیست محمد علی خاں پسر انورالدین خاں شہامت جنگ گوپاموی را باتفاق فرنگیان انگریز دریں ملک باید گذاشت۔۔۔۔"

ہم نے اوپر "تاریخ عہد انگلشیہ" کا حوالہ دیا ہے۔ یہ مفتی انتظام اللہ صاحب شہابی کے والد مفتی مولوی اکرام اللہ صاحب گوپاموی کی تالیف ہے ـــــ اس کے حاشیہ پر کہیں کہیں مفتی صاحب نے اپنے قلم سے کچھ اشارے لکھے ہیں۔ ناانصافی ہوگی اگر میں یہ نہ بتادوں کہ محمد علیؒ، انور الدین اور آصف جاہ کے ہم جدی ہونے اور اوّل الذکر کے

مآثر الامرا کی جلد اوّل ص ۳۰ پر ہے۔

گوپامئوی ہونے کے حوالے مجھے مفتی انتظام اللہ صاحب شہابی کی تحریر سے ہی ملے۔ انھوں نے "انوارالدین نامہ" کا بھی نام دیا ہے۔ مگر میں نے اس کی تلاش کی زحمت گوارا نہیں کی کیونکہ میرے مقصد کے پیش نظر جو حوالے "ماثرالامراء" سے مل گئے وہ بھی زائد از ضرورت ہیں۔ مجھے یہاں صرف یہ ثابت کرنا ہے کہ ارکاٹ و مدراس کے شاہی افراد کا نہ صرف تعلق مفتیان گوپامئوی سے تھا بلکہ انوارالدین اور محمد علی، باپ اور بیٹے دونوں گوپامئو کے تھے جہاں جہاں ان کا نام "ماثرالامراء" میں آیا ہے بالالتزام ہر جگہ "گوپامئوی" لکھا ہے۔

اس سے کم سے کم یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ "مفتیانِ گوپامئو" کا تعلق ارکاٹ و مدراس کے شاہی خاندان کے افراد سے تھا۔ اور قرائینی شہادتوں کے جو قابل قبول اصول مروج و معلوم ہیں ان کی بنا پر کہا جاسکتا ہے کہ ادبی لین دین اور آمد و رفت کا سلسلہ اور تعلق بھی برابر قائم رہا ہوگا۔ یہ تمام حکمراں اس عہد تک صاحب سیف و قلم ہوتے تھے۔ اسلحہ خانے کے ساتھ ساتھ کتب خانے بھی رکھتے تھے۔ اس لیے یہ کہنا احتیاط و دانشمندی کے خلاف ہے کہ گوپامئو کے کسی فرد کو علم نہیں ہوسکتا کہ ارکاٹ کے شاہی کتب خانہ میں کون سی کتاب موجود ہے یا کون سی موجود نہیں۔ یہاں یہ کہنا ہرگز مقصود نہیں کہ مفتی انتظام اللہ صاحب شہابی کے جس حوالہ کو مالک رام صاحب ارکاٹ میں حاصل نہیں کرسکے وہ وہاں موجود ہوگا۔ ہرگز نہیں۔ مالک رام صاحب صحیح فرماتے ہوں گے کہ انھیں پریشانی اٹھانی پڑی۔ اور مہینوں کی تگ و دو کے بعد کھلا کہ یہ سب جعل ہے۔ مجھے معلوم نہیں مفتی صاحب کی کس کتاب سے انھیں دلچسپی تھی۔ اگر اس حقیر فقیر پر تقصیر راقم الحروف کو تفصیلاً مطلع فرمائیں تو ہوسکتا ہے کہ "کتب خانہ مفتیان گوپامئو" کی جو چند کتابیں قلمی مطبوعہ میری تحویل میں ہیں ان میں برآمد ہوجائے۔ یقین تو نہیں مگر امکان سے خارج کوئی بات نہیں:

—— واللہ غالب علی امرہٖ ولاکن اکثر الناس لایعلمون۔

ہم نے دیکھ لیا کہ "گوپامئو" سے انوارالدین اور محمد علی کا تعلق کتنا قریبی اور مضبوط تھا۔ یہ بات بھی کہی جاسکتی ہے کہ "مفتیانِ گوپامئو" اور ارکاٹ کے شاہی خاندان میں قرابت داری تھی۔ اگرچہ اس کی ہم نے کوئی تحقیق نہیں کی۔ نہ ہم انساب کے ماہر ہیں نہ اس فن شریفہ سے کوئی دلچسپی۔ کار دنیا کسے تمام نہ کرد۔ کوئی اور صاحب شجرۂ نسب کی شاخیں ملاتے رہیں گے۔ صرف ارکاٹ کے حکمراں ہی گوپامئو کے نہ تھے بلکہ مفتیان گوپامئو کے ایک جید عالم مفتی محمد اسمٰعیل بن مفتی محمد ولی (پیدائش ۱۱۷۷ وفات ۱۲۴۴ھ) "مدراس میں عہدۂ قضا پر من جانب سرکار انگلشیہ بمشاہرہ پانچ سو روپیہ ماہوار کے ملازم تھے۔ مدتوں اس نوکری پر رہے"

(تاریخ مفتیان گوپامئو ص ۲۳)

اس کے علاوہ بھی مفتی انتظام اللہ صاحب شہابی گوپامئوی اکبرآبادی کا ذاتی تعلق علاقہ مدراس سے اور بھی قریبی رہا ہے۔ مفتی صاحب کے دادا انعام اللہ خاں بہادر گوپامئوی کے سالے تھے افضل العلما، قاضی ارتضیٰ علی خاں جو ۱۱۹۸ھ میں پیدا ہوئے تھے اور قاضی ارتضیٰ کے والد تھے قاضی مجتبیٰ علی خاں جو مدراس میں قاضی کے عہدہ پر فائز تھے۔

۱۲۳۰ھ میں نواب اعظم الدولہ بہادر نے قاضی ارتضیٰ علی خاں کو دارالافتاء سپرد کی۔ ۱۲۴۰ھ میں افتائے صدر اور ۱۲۴۴ھ میں آبائی منصب قاضی القضاۃ کے عہدہ پر سرفراز ہوئے۔

یہ افضل العلما قاضی ارتضیٰ علی خاں قاضی القضاۃ مدراس، مفتی اکرام اللہ خاں (والد مفتی انتظام اللہ صاحب) کے ماموں تھے۔ یہ اور مزید ثبوت اس بات کا ہے کہ نہ صرف "مفتیانِ گوپامئو" علی العموم بلکہ مفتی انتظام اللہ صاحب شہابی علی الخصوص "ارکاٹ مدراس کے شاہی کتب خانوں سے بہت ممکن ہے کہ واقف ہوں بلکہ دسترس بھی ہو تو کیا شک ہے؟ یہ بات کہ ارکاٹ کے شاہی افراد کا تعلق گوپامئو سے تھا۔ شک و شبہ سے بالاتر ہے۔ بلکہ ہم تو یہ بھی کہتے ہیں کہ نہ صرف عہد شہامت جنگ (انوالدین) اور محمد علی والاجاہی کے دور سے قریبی روابط ہے بلکہ جب "گوپامئو" اُجڑ گیا، خاندانِ مفتیان تتر بتر ہو گیا، کتب خانہ مفتیان گوپامئو ورق ورق ہو کر بکھر گیا اور اُدھر ارکاٹ میں شہامت جنگ اور والاجاہی طمطراق ماند پڑ گیا اس عہد میں بھی گوپامئو کا تعلق ارکاٹ سے قائم رہا۔ ارکاٹ کے نواب نام کے ہی ہوں گوپامئو کے مفتی کون سے کام کے رہ گئے تھے لیکن اس گئے گذرے زمانہ میں بھی ارکاٹ کے شاہی افراد اپنے آبائی وطن "گوپامئو" سے تعلق خاطر رکھتے تھے اور وہاں کے کاموں میں دلچسپی لیتے تھے۔ اس مضمون کے آغاز میں ہم نے "مدرسۂ اسلامیہ گوپامئو" کا حوالہ دیا ہے۔ وہاں وہ بے ضرورت معلوم ہوا ہو گا لیکن اس کی خاص وجہ — ۱۴ر جون ۱۸۹۹ء کی وہ رپورٹ ہے جس میں دکھایا گیا ہے کہ ضلع ہردوئی کے انگریز اسسٹنٹ کلکٹر کی سرپرستی اور ڈپٹی انسپکٹر مدارس ضلع ہردوئی کی سفارش اور ڈپٹی کمشنر ضلع ہردوئی کے معائنہ کے باوجود "مدرسہ اسلامیہ گوپامئو" کو ۱۸۹۹ء میں سرکار انگلشیہ کے خزانہ عامرہ سے مبلغ چار روپے ماہوار کی گراں قدر اور فیاضانہ رقم عطا کی گئی۔ اس روداد میں "نقشہ وصولباقی چندہ مدرسہ انجمن اسلامیہ گوپامئو" جو شائع ہوا ہے اس میں عطیہ دینے والوں کی فہرست میں پہلے نمبر پر نام ہے:

ہز ہانس جناب نواب عظیم جاہ محمد منور خاں صاحب بہادر پرنس آف ارکاٹ دام اقبالہ اور ایک سو بیس روپے سالانہ چندہ لکھا ہوا ہے کیفیت میں درج ہے کہ: "کبھی سہ ماہی کبھی ماہی تنخواہ آیا کرتی ہے"

اب یہ بات واضح ہو گئی ہو گی کہ مفتی انتظام اللہ صاحب ارکاٹ کے شاہی کتب خانے سے واقف تھے اور

واقفیت صرف فرضی وخیالی نہیں حقیقی وواقعی تھی۔ اب رہ گئی یہ بات کہ جس کتاب کا انھوں نے کتب خانہ شاہی میں ہونا بیان کیا ہے وہ وہاں کبھی تھی یا نہ تھی ہمارے موضوع بحث سے خارج ہے۔ یاد رکھنا چاہیے کہ:

ع۔ تا نباشد چیز کے مفتی نہ گوید چیزہا۔ حوالوں کے بارے میں نادم صاحب سیتاپوری نے لکھا ہے:

"مفتی صاحب مرحوم نے کچھ لطیفوں کے ساتھ مولوی اکرام اللہ گوپامئوی کی تصویر الشوار" کا حوالہ بھی دیا ہے۔ مگر یہ تحریر نہیں فرمایا ہے کہ یہ کتاب کب لکھی گئی اور کہاں ہے۔ یا مخطوطہ کی شکل میں کس کتبخانہ میں محفوظ ہے۔" خیابان غالب، ص ۱۰۸) کراچی ۱۹۷۰ء

جناب مالک رام صاحب بھی پہلے فرما چکے ہیں کہ: "وہ بالعموم کسی قلمی کتاب کا نام اختراع کر کے سند دیں گے ..." "تصویر الشعرا" کو ہم نے نہیں دیکھا۔ نہ ہمارے قبضہ میں کتب خانہ مفتیان گوپامئو کی جو کتابیں ہیں ان میں یہ کتاب ملی ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم مالک رام صاحب کی خوشنودی طبع یا نادم صاحب سیتاپوری کے اتباع میں فوری اور بے دھڑک کہہ دیں کہ اس نام کی کوئی کتاب ہی نہیں پائی جاتی۔ نادم صاحب سیتاپوری نے شکوہ کیا ہے کہ یہ "تحریر نہیں فرمایا کہ یہ کتاب کب لکھی گئی" اس سلسلہ میں کچھ دلچسپ معلومات یہ خادم فراہم کر سکتا ہے۔ مفتی صاحب نے یقینی طور پر دوران قیام آگرہ میں جناب والد صاحب قبلہ (مولوی حامد حسن صاحب قادری) کو کچھ یادداشتیں لکھ کر دی تھیں محض اتفاق ہے کہ وہ خستہ کاغذات اس راقم الحروف کے ہاتھ لگ گئے۔ خستہ اس قدر ہیں کہ جس تہ پر مڑے ہوئے تھے وہاں سے کٹ گئے ہیں۔

ایک کاغذ پر دونوں طرف اپنے والد مولوی مفتی اکرام اللہ صاحب گوپامئوی کے حالات لکھے ہیں۔ ان کی تحریر کا نمونہ دیباچہ "تصویر الشعرا" ۱۲۷۷ھ سے نقل کیا ہے۔ جس طرح یہ بات معلوم عوام ہے کہ مفتی انتظام اللہ صاحب شہابی کو فن تاریخ گوئی سے کوئی مس نہ تھا اسی طرح یہ بات بھی اظہر من الشمس ہے کہ میرے والد صاحب قبلہ مولانا مولوی پروفیسر حامد حسن صاحب قادری فن تاریخ گوئی کے امام تھے۔ فوراً ذہن ان کا تاریخ کی طرف متوجہ ہوتا تھا۔ چنانچہ مذکورہ بالا کاغذ پر جہاں مفتی صاحب نے کتاب کا نام "تصویر الشعرا" لکھ کر ۱۲۷۷ھ سن لکھا ہے اسی کے نیچے والد صاحب قبلہ نے اعداد شماری کر کے سن کی تنقیح کی ہے۔ پہلے "تصویر الشعرا" کے اعداد نکالے۔ وہ ۱۳۰۸ ہوتے ہیں، یہ درست نہ تھے۔ پھر از خود خیال فرمایا کہ مفتی صاحب کو نام کی غلطی ہوئی ہوگی۔ تو ۱۳۰۸ میں ال کے ۳۱ عدد کم کیے۔ تو پورا ۱۲۷۷ھ برآمد ہوا۔ ال کا تسامح مفتی صاحب سے اور بھی جگہ ہوا ہے۔ "تصویر شعرا" تاریخی نام رکھا ہوگا جس کے ۱۲۷۷ھ ہوتے ہیں۔ مفتی صاحب نے ال کا اضافہ کر کے ہر جگہ "تصویر الشعرا" لکھا ہے۔ اگرچہ اس

بات سے ثابت نہیں ہوجاتا ہے واقعی "تصویر شعراء" کوئی کتاب تھی لیکن جو عمل اوپر دکھایا گیا ہے اس سے یہ ثابت ہوجاتا ہے کہ اگر تھی اور ہے اور بے شبہ ہے تو ۱۲۷۷ھ میں لکھی گئی تھی اور نام بغیر "الف لام" کے "تصویر شعرا" تھا مفتی صاحب کی اس تحریر کی عکسی نقل بھی متشککین کی رفع خلش کی خاطر مضمون کے آخر میں لگادی ہے ۔

یہ تحریر جس کاغذ پر لکھی گئی ہے وہ شیروں اور ہاتھیوں کے تھوک و خوردہ فروش کا دفتری مراسلت کا طبع شدہ کاغذ ہے ۔ یاد ہوگا کہ جناب مالک رام صاحب نے تحریر فرمایا ہے کہ اپنے بہنوئی ارشاد حسین کی شراکت میں جانوروں (شیر ہاتھی وغیرہ) کی خرید و فروخت کرتے رہے ۔ مجھے تحقیق نہیں کہ مفتی صاحب کے بہنوئی کا اسم گرامی کیا تھا؟ لیکن کاغذ پر چھپا ہے : SAGHIRULSHAHABI ANIMALS IMPORTERS & EXPORTERS

ممکن ہے صغیر ان کے لڑکے یا اور کسی قریبی عزیز کا نام ہو ۔ یہ کاغذ بھی یادگار حیثیت رکھتا ہے ۔ میں نے اوپر لکھا کہ "تصویر شعرا" بے شبہ ہے ۔ والد صاحب قبلہ نے "داستانِ تاریخ اردو" پہلی مرتبہ نومبر ۱۹۴۱ء میں شائع فرمائی تھی ۔ اب تک متعدد اشاعتیں نکل چکی ہیں ۔ مالک رام صاحب اور نادم صاحب سیتاپوری دونوں غالباً اس کتاب سے ناآشنا نہ ہوں گے ۔ اس میں والد صاحب قبلہ نے منشی اکرام اللہ صدیقی کا حال پانچویں دور میں درج فرمایا ہے اور "تصویر شعرا" کا بہت طویل اقتباس دیا ہے ۔ اس کی کیفیت بھی لکھی ہے ۔ یہ بھی درج ہے کہ :

"... اس گلدستہ کا تاریخی نام تصویر شعراء (۱۲۷۷ھ) رکھا ۱۸۶۱ء میں مرزا علی حسین قیصر کے مطبع حیدری میں طبع ہوا ۔ اس کی تمہید مختصر کرکے درج کی جاتی ہے ..." "داستان تاریخ اردو" اس کتاب کے تیس برس کے بعد بھی محققین یہی دریافت کر رہے ہیں کہ (مفتی صاحب نے) یہ تحریر نہیں فرمایا کہ یہ کتاب لکھی گئی ۔ نہ ان کو یہ پتہ چلا کہ کہاں ہے ، چھپی ہے نہیں چھپی ۔ مخطوطہ کہاں محفوظ ہے !

ع کوئی بتلائے کہ ہم بتلائیں کیا

"کتب خانہ مفتیانِ گوپامئو" کی دو کتابوں کے حوالے تو دیے جا چکے ہیں ۔ ایک مطبوعہ جغرافیہ کی ، ۱۸۵۰ء کی ۔ دوسری مفتی اکرام اللہ صاحب کی مرتبہ تاریخ عہدِ انگلشیہ ۔ جو قلمی ہے ۔ ۱۳۲ صفحات ہیں ۔ پہلے دو صفحے غائب ہیں ، ۳ سے ۱۳۲ تک ہیں ۔ حاشیہ پر بعض نام افراد اور مقامات وغیرہ کے دیوناگری میں بھی لکھے ہیں تاکہ تلفظ کا صحیح اندازہ ہوسکے ۔ اس کا مطلب ہے کہ مفتی اکرام اللہ صاحب دیوناگری رسم الخط سے بھی واقف تھے ۔ اس کتب خانہ کی ایک کتاب "زبدۃ التواریخ" ہے جسے منشی قمرالدین خاں اکبرآبادی نے شائع کی ہے اپنے مطبع اسعد الاخبار آگرہ میں ۱۸۵۳ء میں ۔ کتاب کے بہت سے صفحات غائب ہیں اور درمیان میں بہت سے ناقص ہیں ۔ کتاب صفحہ ۹ سے شروع ہو کر

یک لخت ۵۳۳ پرختم ہوتی ہے۔ اور صفحات نہیں ہیں۔ سرورق کا بھی نصف اسفل ہے نصف اعلیٰ غائب ہے۔ جو عبارت ملتی ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ لفٹیننٹ گورنر جیمس طامسن صاحب بہادر نے پادری جان جیمس مور کو جو سرکاری احکام کے مترجم تھے حکم دیا کہ سیر المتاخرین کا خلاصہ کر کے اسکا ترجمہ کریں۔ چنانچہ پادری صاحب کے دفتر میں حکیم جواہر لعل اکبر آبادی تھے۔ (اس کے بعد کی عبارت اور صفحات ناقص ہیں) ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اُردو ترجمہ "زبدۃ التواریخ" کے نام سے حکیم جواہر لعل اکبر آبادی نے کیا اور منشی قمر الدین خاں اکبر آبادی نے ترجمہ کے مسودہ پر نظر ثانی کر کے مطبع اسعد الاخبار سے شائع کیا۔

"کتب خانہ گوپامئو" میں ایک نہایت مختصر کتاب قلمی، چھوٹے سائز کی لغات الفاظ کی بھی تھی۔ کتاب کے پہلے صفحہ پر نیلی سیاہی سے غالباً مفتی صاحب نے لکھا ہے۔

"کتاب لغات ہندی من تصنیف دلارام" ترقیمہ میں درج ہے اصل کاتب کی تحریر یہ ہیں:

"بخط بندہ دلارام قوم کھتری ساکن مائی تھان شہر آگرہ روبرو دھرم سالہ نانک شاہ بتاریخ بھادوں ...... روز پنجشنبہ سمبت ۱۸۸۴ پانزدھم ۱۵ ماہ محرم ۱۲۴۳ھ مطابق ہفتم ماہ اگست ۱۸۲۷ء ہشت گھڑی روز باقی ماندہ بانصرام تحریر یافت۔"

شرح سہ نثر ظہوری کا بھی ایک نسخہ مطبوعہ ہے اس کا سرورق اس طرح پر ہے:

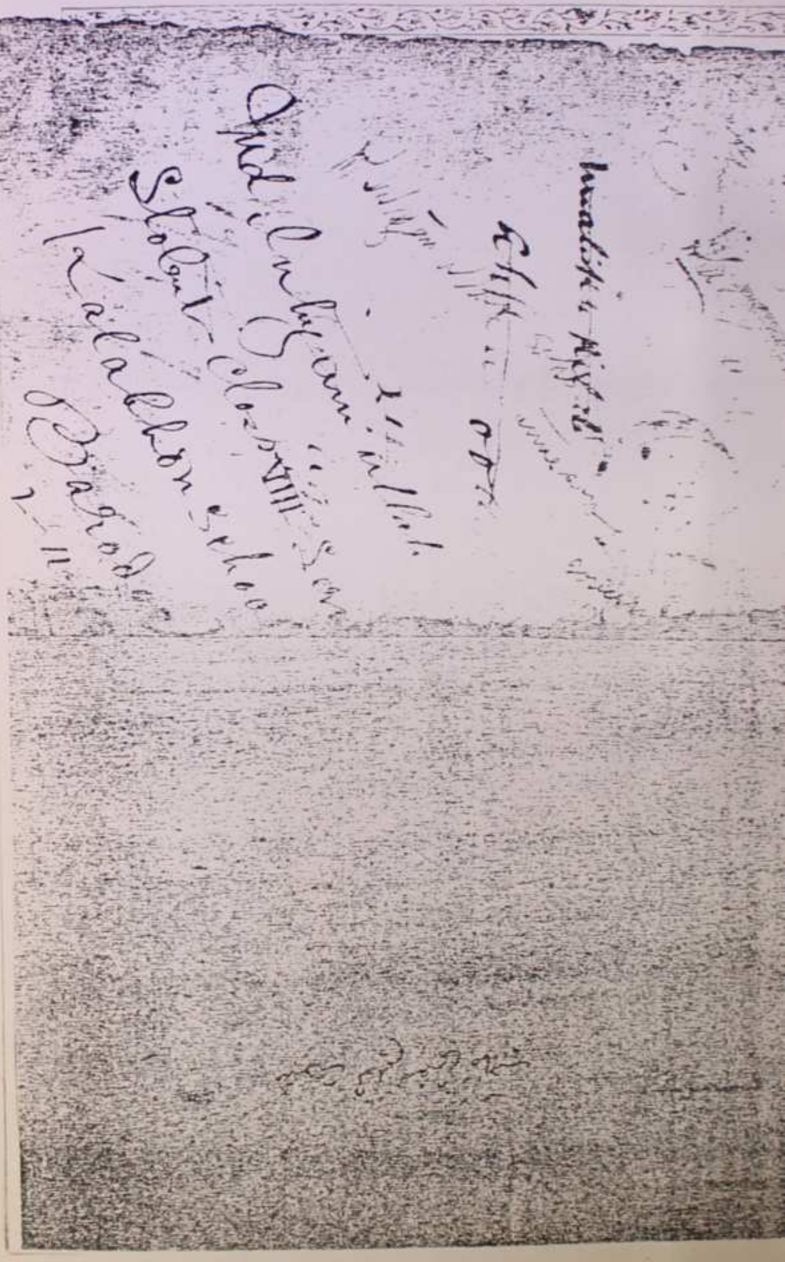
"شرح سہ نثر ظہوری" تصنیف جناب مولوی امام بخش صاحب صہبائی تخلص۔ در لیتھو گرافک پریس چھاپہ خانہ جناب سید محمد خاں بہادر بتاریخ یکم جمادی اول ۱۲۶۰ھ مطابق بستم مئی ۱۸۴۴ء عیسوی باہتمام سید عبد الغفور مہتمم مطبع سید الاخبار پس از تحصیل زیور تصحیح بطراز انطباع مطرز شد۔"

مطبع سید الاخبار سرسید احمد خاں کے بھائی سید محمد خاں کا تھا۔ جو سید الاخبار کے نام سے اخبار نکالتے تھے۔

کچھ اور بھی نادر کتابیں "کتب خانہ مفتیان گوپامئو" کی میرے قبضہ میں ہیں۔ اور علی الرغم انف اعدائے مفتی انتظام اللہ صاحب شہابی مرحوم و مغفور، بلا خوف تردید بیانگ دہل میں کہتا ہوں کہ زمانۂ سابق میں گوپامئو میں شاندار کتب خانہ تھا جو بعد میں درجہ بدرجہ اثاث البیت کی طرح تقسیم ہوتا ہوا مفتی انتظام اللہ صاحب شہابی کی تحویل میں رہا اور ان کی رہائش گاہ پھاٹک والی حویلی چڑی مار ٹولہ آگرہ میں ۱۹۴۹ء تک قایم تھا۔ آگے جس کا جو جی چاہے کہا کرے۔ مفتی صاحب غالباً مزے لے لے کر مرزا رفیع سودا کا یہ شعر پڑھتے ہوں گے جنھوں کی نظروں میں ہم سبک ہیں دیا انھوں کو وقار اپنا عجب طرح کی ہوئی فراغت گدھا پہ ڈالے سے بار اپنا

••

ضمیمہ ۱ بابت صفحہ ۵۶۱ سطر ۱۳



ضمیمہ ۲ صفحہ ۵۶۱ سطر ۱۳

اصول علم جغرافیہ

اور ترکیب بنانے نقشہ کرۂ زمین کی

مع

مختصر بیان زمین و آب و کوہستان کے کتاب ہیوس صاحب

مدرس جغرافیہ مدرسہ انجنیرنگ قریب لنڈن کے سے

[illegible]

مدرسہ رڑکی کے اول ہیڈ ماسٹر نے ترجمہ کیا

HUGHES'

PRINCIPLES OF GEOGRAPHY.

AND

CONSTRUCTION OF MAPS,

WITH

APPENDIX ON PHYSICAL GEOGRAPHY.

TRANSLATED BY

[illegible] LAL, FIRST NATIVE MASTER,

CIVIL ENGINEERING COLLEGE

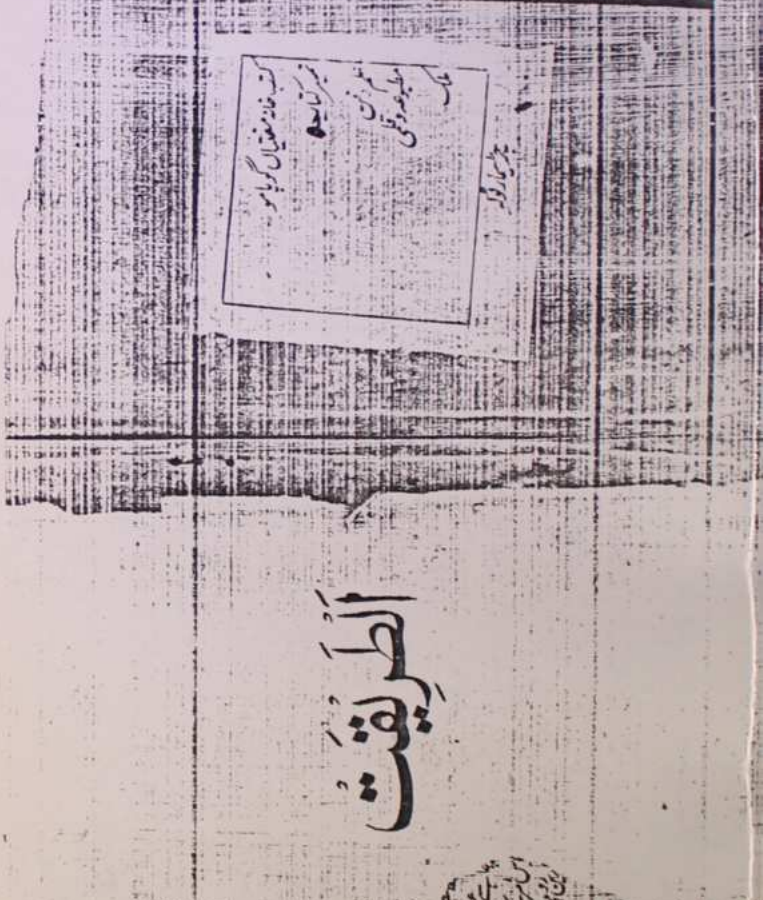
ROORKEE.

AGRA:

[illegible]

1850.

ضمیمہ ۳ بابت صفحہ ۵۶۵ سطر ۳



ضمیمہ ۲ بابت صفحہ ۱۱۵ سطر ۲

TELE GRAMS: "SAGIRULSHAHABI" Chirimartola, AGRA.

ESTABLISHED 1922.

SAGIRULSHAHABI,

ANIMAL'S IMPORTER & EXPORTER.

LARGEST ELEPHANTS AND TIGER SUPPLIER AND COMMISSION AGENT.

CHIRIMARTOLA.

No ——— AGRA ——— 19
(INDIA.)

Referred your letter No. ——— dated ———

[illegible]

TERMS.

1. Orders will be complied with only on receipt of 50% in advance. The balance to be paid at the time of delivery.
2. 25% will be deducted from the advance if the order or orders are not cancelled within a week.
3. The purchasers will be liable to pay full cost for fooding, lodging and life damages etc. of the animals, if delivery is not taken within the period specified by our information letter.

[illegible]

۶۰۲
۱۳۰۶
۱۲۰۰

۱۲۷۱

ضمیمہ ۵ ۔ بابت صفحہ ۵۷۲ سطر ۶

خلاصہ سیر المتاخرین

زبدۃ التواریخ

شیر عا

منشی قمر الدینخان اکبرآبادی نے

رجمہ کا مسودہ بر نظر ثانی کر کے مطبع اسعد الاخبار میں چھاپی

۱۸۵۳ء

بسم الله الرحمن الرحیم

الحمد لله رب العلمین والصلوة علی سید المرسلین محمد الصادع
بالشرع المبین وعترته الغر المیامین ملأ السموات والارضین
اما بعد بر ضمایر صافیه و خواطر زاکیه مقتفیان آثار عترت طاهرین و مقتبسان انوار
حضرات ائمه معصومین صلوات الله علیهم اجمعین روشن و منجلی باد که مفاد حدیث معتبر
اذا اراد الله عز و جل برعیة خیراً جعل لها سلطاناً رحیماً و قیض له وزیراً
عادلاً وجود فایض الجود پادشاه رحیم رعیت پرور و سلطان کریم عدالت گستر
انعم جلیله الهیه و آلاء عاظمه نامتناهیه است و عنایات بلانهایات ایزد منان بر
زمان سعادت اقتران مصداق خبر معتبر مذکور و معنی آن منصه شهود و ظهور پیوسته که
خداوند عالم و منعم بنی آدم جلت آلاؤه و عظمت کبریاؤه بندگان کیخسرو نشان جمشید
حشمت دارا سطوت نخل بند گلستان عظمت و کامکاری و فرمانروای سلطنت و
شهریاری ابر گوهربار جود و سخا بحر زخار فیض و عطا خورشید آسمان جلالت و اقبال
مرکز دایره فخامت و اجلال رافع لوای دین و دولت موسس اساس ملک و ملت

شرح سه نثر ظهوری

تصنیف جناب مولوی امام بخش صاحب صهبائی تخلص در لیتهوگرافنگ

پریس چهاپه خانه جناب سید محمد خان بهادر بتاریخ یکم جمادی الاول سنه ۱۲۶۳

هجری مطابق بستم می سنه ۱۸۴۷ عیسوی باهتمام سید عبد الغفور مهتمم

مطبع سید الاخبار پس از تحصیل

زیور تصحیح طراز انطباع

مطرز شد

جناب مالک رام
دھلی

کتب خانہ مفتیان گوپامئو کے بارے میں

بہت دن ہوئے آپ کی طرف سے مفتی انتظام اللہ شہابی مرحوم والا مضمون وصول ہوا تھا۔ میں بوجوہ آج تک اس کا جواب نہ دے سکا۔ معذرت خواہ ہوں۔

دو باتیں ہیں۔ مرحوم کی روایتیں وضع کرنے کی عادت اور کتاب خانہ گوپامئو۔ پہلی بات کے بارے میں تمام واقف کار شاکی ہیں۔ ان کی وفات کے بعد ماہر القادری مرحوم نے اپنے رسالے 'فاران' میں بھی اس کا ذکر کیا تھا۔ نادم سیتاپوری کا حوالہ اس مضمون میں بھی ہے۔ اور اس سے متعلق صاحب مضمون نے کچھ نہیں لکھا۔ مجھے اس مضمون (نادم والے) کا علم نہیں تھا۔ اب معلوم ہوا۔ خیر ان کی اس عادت سے بہت سے لوگ شاکی تھے

رہی دوسری بات گوپامئو کے کتاب خانے کی، جب ہم کسی کتاب خانے کا ذکر کرتے ہیں مثلاً بانکی پور پٹنے کا کتاب خانہ یا رامپور کا کتاب خانہ تو ہماری کیا مراد ہوتی ہے؟ اگر یوں ہے تو سو دو سو کتابیں تو ہر پڑھے لکھے شخص کے گھر میں ہوتی ہی ہیں۔ کیا یہ ذاتی ذخیرہ مراد ہوتا ہے؟ یا باقاعدہ کتاب خانہ؟ خدا آپ کا حامی و ناصر رہے۔ آمین!

●●

تصحیح و اضافہ

خدابخش فہرستِ مخطوطاتِ فارسی (مرآۃ العلوم) کے تسامحات

ڈاکٹر افتخار احمد مدنی
سینیر خدابخش ریسرچ فیلو، پٹنہ

خدا بخش لائبریری کے فارسی مخطوطات کی مجمل فہرست جو تین جلدوں میں مرآۃ العلوم کے نام سے (جلد اوّل ۱۹۲۵ء میں جلد دوم ۱۹۴۲ء اور جلد سوم ۱۹۶۷ء) میں شائع ہوئی ہے اس میں متعدد اندراجات تصحیح و اضافہ چاہتے ہیں۔ خدا بخش لائبریری جرنل میں مجھ سے قبل بھی یہ تصحیحات پیش کی جاتی رہی ہیں میں نے اپنی تصحیح و اضافہ میں صرف تصوف کے فن کو سامنے رکھا ہے اور اس فن میں جلد اوّل و جلد دوم و سوم کے اندراجات میں جو کمی زیادتی پائی ہے اس کی طرف اشارے کر دیئے امید ہے یہ اضافے فائدے سے خالی نہ ہوں گے۔

مرآۃ العلوم ۔ جلد اوّل (تصوف)

انیس الطالبین: (HL-1339) اس کا پورا نام انیس الطالبین وعدۃ السالکین ہے۔ اور کاتب میر حسین ابن خواجہ میر البخاری ہیں۔

(منتخب) انیس الطالبین: (HL-1340) انیس الطالبین وعدۃ السالکین۔

الجانب الغربی: (HL-1342) یہاں کیٹلاگر نے ایک اصولی غلطی کی ہے یہاں جو مخطوطہ موجود ہے اس کے ورق ۲ پر کتاب کا نام ایجاب العربی فی حل مشکلات شیخ محی الدین ابن العربی مذکور ہے کیٹلاگر نے حاجی خلیفہ کے حوالے سے ایجاب العربی کے بجائے الجانب الغربی لکھا ہے ہونا یہ چاہیے تھا کہ ایجاب العربی کے تحت اسے کیٹلاگ کیا جاتا اور پھر حاجی خلیفہ کے بیان کا بھی تذکرہ کرتے ویسے بھی الجانب الغربی کتاب کے مفہوم کیساتھ مطابقت نہیں رکھتا۔

(ترجمہ) حقیقت المحمدیہ: (HL-1346) اس کے مصنف وجیہ الحق ہیں اور مترجم عبدالعزیز جبکہ ہینڈ لسٹ میں کیفیت کے خانے میں ہے "این کتاب در عربی است ماتن و شارح یکیست" عبدالعزیز وجیہ الحق کے خلیفہ ہیں سن کتابت ۱۰۶۹ھ

خیالات عشاق: (HL-1347) نسخہ کے ترقیمہ میں اس کے مصنف کا نام عین القضاۃ ہمدانی بتایا گیا ہے۔ لیکن فہرست نگار نے اس کے مصنف کا نام مسعود بک لکھا ہے اور اس کی وجہ یہ بتائی گئی ہے کہ اس میں عین القضاۃ کے بعد کے شاعر سعدی اور حافظ کے اشعار مختلف مقامات پر موجود ہیں یہ بھی کہتے ہیں کہ کچھ کتابوں میں دیکھا گیا ہے کہ مسعود بک نے تمہیدات عین القضاۃ کے طرز پر تصوف میں ایک رسالہ لکھا اور اسے تمہیدات کا نام دیا ہے ممکن ہے یہ وہی رسالہ ہو یہ کتاب دراصل قاضی حمید الدین ناگوری سے منسوب مشہور کتاب "رسالہ عشقیہ"

ہے۔ جس کا دوسرا نام خیالات عشاق بھی ہے ان دونوں ناموں سے مختلف لائبریریوں میں اس کے نسخے موجود ہیں خدا بخش لائبریری میں بھی اس کا ایک قلمی نسخہ ۳۵۲۲ HL کے تحت نسخۂ عشقیہ کے نام سے موجود ہے سن کتابت ۱۱۱۹ھ

(ترجمہ) رسالہ در کیفیت سلوک : (HL-1350) پورا نام ترجمہ رسالہ در کیفیت سلوک اخلاق و آداب ہوگا کیونکہ ورق ۹ پر مترجم کی یہ عبارت سید کاظم رشتی کے سلسلے میں ہے۔

"رسالجات در اکثر فنون علم نوشتہ خصوصاً علم توحید و بیان و معانی و علم تفسیر و اخبار از تفسیر ظاہر و باطن... و تفسیر تاویل و باطن تاویل و تفسیر ظاہر وغیرہ... اینہا از انواع علوم معروفہ و غیر معروفہ و از آنجملہ رسالہ در کیفیت سلوک اخلاق و آداب نوشتہ بودند لیکن چونکہ سبک عباراتش بالفاظ عربیہ و نظم کلماتش بقانون لغت عرب بود... ایشان از رہ مقدار را امر فرمودہ کہ رسالہ مزبورہ را بعبارات واضح قریب بفہم مبتدے بزبان فارسی ترجمہ نماید پس این حقیر... این امر را قبول نمودہ شروع بترجمہ نمود"

زبدۃ الحقایق : (HL-1354) اوراق ۱۹۰ تا ۱۹۲ (۱۹۰ تا ۱۹۰ الف کی چند سطریں) بقیہ تین اوراق (۱۹۰ الف تا ۱۹۲) پنج درود از ملفوظ گنجشکر ہے۔

زبدۃ الحقایق : (HL-1355) اس کے کاتب کا نام معصوم ہے۔

شمایل الاتقیا : (HL-1356) مصنف کا پورا نام رکن الدین بن عماد الدین دبیر کاشانی ہے۔

شمع محفل : (HL-1359) ۱۲۶ اوراق تا ۱۲۷۔

(شرح) عوارف المعارف موسوم بہ مصباح الہدایہ و مفتاح الکفایہ : (HL-1360) اس کا نام مصباح الہدایہ و مفتاح الکفایہ ہی ہوگا۔ ۲۲۶، اوراق تا ۲۲۴

مصباح الہدایہ و مفتاح الکفایہ : (HL-1361) یہ ناقص الآخر ہے۔

عین المعانی فی شرح الاسماء الربانی : (HL-1363) ۲۱۱ اوراق تا ۲۱۲

(شرح) فتوح الغیب موسوم بہ مفتاح الفتوح (HL-1367) ۔ اس کو صرف مفتاح الفتوح ہی پڑھا جانا چاہیے۔

فصل الخطاب : (HL-1368) کتاب کا پورا نام نسخہ میں اس طرح درج ہے۔

"فصل الخطاب بوصل احباب (فی شرح العقاید الماثورہ)" اس کے کاتب قطب الدین بن علی ہیں — اور اس کی کتابت ۸۴۵ھ میں ہوئی کتاب کے خاتمہ پر نفحات الانس سے منقول ہے کہ خواجہ محمد (مصنف کتاب ہذا)

کی وفات ۸۲۲ھ میں ہوئی کیفیت میں مذکور ہے کہ "ایں نسخہ قدیم کہ سی و سہ سال بعد از وفات مصنف تحریر شدہ" یہاں کیٹلاگر نے ۲۲ کے بجائے ۳۳ لکھ دیا ہے۔

فصل الخطاب... (HL-1369) اس میں ۳۲۶ اوراق ہیں ورق ۳۱۶ کے بعد کے اوراق ۱۱۹۴ھ میں لکھے گئے۔ چونکہ یہ اصل کتاب سے ضائع ہو گئے تھے۔ جبکہ پوری کتاب کیلئے کیٹلاگ میں ۱۱۹۴ھ مذکور ہے۔

فصل الخطاب... (HL-1370) ۳۰۱ اوراق نہ کہ ۳۰۰

(شرح بر شرح) فصوص الحکم الموسوم نقد النصوص: (HL-1373) نسخہ میں ورق ۲ پر کتاب کا نام نقد النصوص ہے اور اس کے کاتب یار محمد چشتی ہیں۔

کلید مخازن: (HL-1376) اس کتاب میں اصل عبارت کے علاوہ تفصیلی حواشی بھی موجود ہے ورق ۱۰۶ پر مصنف خود اس نسخہ پر حواشی لکھنے کا ذکر کرتا ہے ترقیمہ میں بھی کتاب کا نام کلید مخازن مع حواشی مذکور ہے۔

کیمیائے سعادت: (HL-1377) یہ نسخہ دو خط میں ہے ابتدائی اور آخری ورق پر مرزا محمد زاہد مرحوم اور محمد فاضل مرحوم کے حوالے سے یہ عبارت مذکور ہے۔

"اوراق کہنہ ایں نسخہ شریف دکتاب لطیف بخط مصنف علیہ رحمت است و چند جز اول و چہاردہ ورق آخر بخط کاتب است" ان اوراق کے کاتب عطاء اللہ ہیں۔

کیمیائے سعادت: (HL-1378) اس کتاب کی کیفیت کے ضمن میں کیٹلاگ میں مذکور ہے۔ "بخط پاکیزہ اما کرم خوردہ" لیکن یہ نسخہ کسی بھی جگہ سے کرم خوردہ نہیں ہے البتہ تھوڑا آب خوردہ ہے۔

لطائف اشرفی: (HL-1379) کتاب کا پورا نام لطائف اشرفی فی بیان طوائف صوفی ہے۔

لطائف اشرفی: (HL-1381) یہ لطائف اشرفی نہیں بلکہ اس میں اشرف جہانگیر سمنانی کے حالات، کرامات اور ملفوظات ہیں۔

مخزن احمدی: (HL-1385) اس میں ۱۱۲ اوراق ہیں نہ کہ ۱۱۱ سن کتابت ۱۲۶۲ھ ہے نہ کہ ۱۲۶۳ھ اور اس کے کاتب سید احسان علی ہیں۔

مرصاد العباد: (HL-1387) کتاب کا پورا نام مرصاد العباد من المبدا الی المعاد ہے۔

معدن معانی: (HL-1388) یہ دراصل خوان پر نعمت ملفوظات مخدوم الملک

شرف الدین یحییٰ منیری ہے یہ ملفوظ معدن معانی کی تکمیل کے بعد لکھا گیا ۔۱۰۳ اوراق نہ کہ ۱۰۴۔

<u>مکتوبات احمد فاروقی</u>: (HL-1390) یہ دفتر اوّل ہے مصنف نے اس کا نام درمعرفت رکھا ہے دفتر سوم کے مقدمہ ورق ۱۰۲ پر یہ عبارت ملتی ہے "چون جلد اوّل مکتوبات معدن الفتوحات کہ درمعرفت نام اوست وتاریخ تمام او اختتام یافت...."

<u>مکتوبات احمد فاروقی</u>: (HL-1391) اس جلد میں دفتر دوم وسوم ہے نہ کہ صرف دفتر دوم "دفتر دوم..." اوراق پر مکمل ہو جاتا ہے اس کے بعد دفتر سوم شروع ہوتا ہے۔ اس کے کاتب مرزا خاں محمد اور سن کتابت ۱۲۲۷ھ ہے کتاب کا نام مکتوبات احمد فاروقی کے بجائے مکتوبات مجدد الف ثانی زیادہ مناسب ہوگا نسخہ پر بھی یہی مذکور ہے "مکتوبات الثانی من مکاتیب محبوب صمدانی حضرت مجدد الف ثانی"

<u>مکتوبات غوثیہ</u>: (HL-1397) نسخہ میں یہ نام کہیں بھی مذکور نہیں اس لیے اس کا عنوان مکتوبات شیخ عبدالقادر جیلانی مناسب ہوگا۔ یہ مکتوبات ۱۴ اوراق پر ہیں ورق ۱۵ سے ۲۸ تک شیخ عبدالقادر جیلانی کے حالات درج ہیں۔

(شرح) <u>منازل السائرین موسوم بہ نسیم المقربین</u>: (HL-1399) کیٹلاگ میں تسنیم کے بجائے نسیم درج ہے کتاب کا نام تسنیم المقربین ہوگا ۲۷۸ اوراق نہ کہ ۲۷۹ فہرست مرزک میں بھی اس کا نام تسنیم المقربین ہی درج ہے۔

<u>نالۂ درد</u>: (HL-1401) سن کتابت ۱۱۹۳ھ

<u>نزہۃ الارواح</u>: (HL-1404) ۱۰۴ اوراق نہ کہ ۸۶

(خلاصۃ) النفحات: (HL-1409) سن کتابت ۹۲۳ھ

(شرح) نفحات موسوم بہ مکاشفات علی اکبر: (HL-1410) نسخہ کے دیباچہ میں ورق ۵ پر کتاب کے نام میں مذکور ہے۔

"نفثات روعیۃ ونفحات روحیۃ من روح القدس فی حل عویصات نفحات الانس"

نکات الاسرار: (HL-1411) اس کے مصنف آدم بن اسمٰعیل بن ہوا ہیں نکات الاسرار مع ملہمات ورق ۱۵۰ الف پر مکمل ہو جاتا ہے (۱۵۰ ب) سے مثنوی قصیدہ رباعی اور غزل پر مشتمل مصنف کا دیوان ہے نیز ملہمات کے مرتب و شامل کنندہ محمد امین ہیں۔

واردات : (HL-1412) تاریخ کتابت ۱۱۹۳ھ ہے۔

شرح واردات موسوم بہ علم الکتاب : (HL-1413) اس کا نام علم الکتاب ہی ہوگا اس کے مصنف کا پورا نام خواجہ میر محمدی المتخلص بدرد ہے نسخہ کے پہلے ورق پر محمد میر محمدی کی رباعیاں ہیں۔ اصل کتاب ۷۸۴ اوراق پر ہے۔

مراۃ العلوم۔ جلد دوم

رسائل مکاتیب : (HL-2068) اس کا نام رسائل ومکاتیب ہے یہ نیز ناقص الآخر ہے۔

رسالۂ مکاتیب : (HL-2069) ترقیمہ میں رسالہ کا نام نسخہ اربعینات موجود ہے۔ اس کے کاتب شیخ غلام مرتضیٰ ولد شیخ دانیال چشتی ہیں اور سن کتابت ۱۱۹۵ھ۔

(۲) الرسائل الاربعین: یہ نسخہ اربعینات کا تکملہ ہے اس میں بھی مختلف عنوانات کے تحت گیارہ رسالے ہیں یعنی ۱۴ سے ۱۵ تک۔ ۹ اوراق پر عربی میں ایک رسالہ ہے یہ ان رسالوں کے علاوہ ہے۔

(شرح) شمس العین : (HL-2070) شرح توسین میں نہیں ہوگا۔ یہ رسالہ ۱۰۰ ورق پر مکمل ہوجاتا ہے نیز اس کے خاتمہ کے بعد تصوف پر درج ذیل دو رسالے ہیں۔

(۱) "طریقہ مشغولی بذکر حق" (۲) "پانزدہ مقام"۔ ان دونوں رسالوں کے کاتب بھی عظمت اللہ تبریزی ہیں اور سن کتابت ۱۲۸۴ھ

کیمیائے سعادت : (HL-2073) اس کے کاتب عبدالباری ہیں۔

معارج کمال : (HL-2075) ترقیمے کی عبارت کافی حد تک مٹ چکی ہے لیکن بغور دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کے کاتب رشید الدین اسمٰعیل ہیں اور سن کتابت ۱۰۱۷ھ۔

منبع الانساب : (HL-2077) سید معین الحق بن شہاب الحق نسخہ کے دیباچہ میں کتاب کا نام "منبع السادات" مذکور ہے جبکہ ترقیمہ میں "منبع الانساب" ایسی صورت میں دیباچہ کی عبارت ہی صحیح مانی جانی چاہیے۔ ترقیمہ میں سن کتابت عیسوی اور ہجری دونوں میں ہے۔ ہجری میں ۱۲۹۳ھ ہے۔

(شرح) ورد المریدین : (HL-2078) اس جلد میں درج ذیل دو رسالے ہیں۔

(۱) ورد مریدین ۱۶۰ اوراق

(۲) شرح ورد مریدین ۳۶۳ اوراق

اس کے بعد ورق ۲۸۰ پر "در بیان مذہب شیعہ" کے عنوان کے تحت بحث کی گئی ہے۔

آداب المریدین: HL-3910 شیخ ابوالنجیب عبدالقادر سہروردی مذکور ہے اسے عبدالقادر نہیں بلکہ عبدالقاہر پڑھا جائے۔ یہ آداب المریدین کی شرح ہے جسے ۷۶۶ھ میں مولانا قاضی اشرف بن رکن الدین کی فرمائش پر شیخ شرف الدین احمد یحییٰ منیری نے کیا اس کے کاتب کا نام مذکور نہیں البتہ آخری ورق کے کاتب وزیر الدین محمد بہاری ہیں اور سن کتابت ۱۲۵۳ھ انھوں نے ترقیمہ میں لکھا ہے کہ چونکہ اصل کتاب کا آخری ورق پژمردہ ہوگیا تھا اس لیے اسکو نقل کرکے کتاب میں شامل کردیا گیا۔

ارشاد السالکین: HL-3065 یہ ناقص الآخر ہے۔

انیس الارواح: HL-2862 اس کے کاتب بدرالدین تھانیسری ہیں نہ کہ شیخ میاں نصیر الدین سن کتابت نسخہ میں موجود نہیں جب کہ ہینڈ لسٹ میں ۱۱۰۰ھ مذکور ہے، اسے گیارہویں صدی ہجری پڑھا جائے۔

(ب) دلیل العارفین: ملفوظات معین الدین چشتی جامع قطب الدین بختیار کاکی کاتب غلام محمد لدھیانوی فیض اللہ ۲۰ اوراق۔ ہینڈ لسٹ میں اس کتاب کا ذکر ہی نہیں کیا گیا ہے۔

(ج) راحت القلوب: ۴۵ اوراق نہ کہ ۴۶۔

(د) افضل الفوائد: اس کے جامع امیر خسرو دہلوی ہیں۔

انیس العشاق: HL-2469 کتاب میں مصنف کا نام اس طرح مذکور ہے حسن بن الملقب بشرف بمشتہر بالرامی المشتاق حسن اللہ تعالیٰ امین بن غلط ہے اسکی جگہ محمد ہونا چاہیئے ۳۶ اوراق ہیں نہ کہ ۴ اس میں درج ذیل عربی کے دو رسالے بھی شامل ہیں:

(۱) مکتوب مولانا ابراہیم الارزونی الی الشیخ مولانا الفاضل العالم العامل وارث النبی الکریم اسمٰعیل قدس اللہ تعالیٰ (۲) وصیت ہای مولانا اسمٰعیل تلوی بمولانا ابراہیم الحقی الارزونی قدس اللہ اسرارہما، یہ دونوں رسالے چار اوراق پر ہیں جسے کاتب نے تبرکاً و تیمناً قسطنطنیہ میں لکھا یہ دونوں رسالے عربی میں ہیں۔ اس کے اختتام پر دو اوراق پر مشتمل عربی میں ہی ایک اور رسالہ ہے جسمیں بندہ اور خدا کے درمیان عشق کے تعلق کا اظہار کیا گیا ہے ان عربی رسالوں کا ذکر عربی کیٹلاگ میں بھی نہیں۔

انیس العشاق: HL-2939 یہاں مصنف کا نام حسن محمد الملقب بالشرف المشتہر بالرامی احسن اللہ عواقبہ درج ہے۔ اس کے کاتب فیض اللہ ہیں نہ کہ فضل اللہ ۲۶ اوراق نہ کہ ۳۰۔ اس نسخہ کے آخر میں ایک اور فارسی رسالہ ہے جس کا نام مراقبہ جامی (جزو اول ۴ اوراق ناقص الآخر) ہے ہینڈ لسٹ میں اس کا ذکر نہیں کیا گیا ہے۔

انیس الغربا: HL-2461 مصنف کا نام نسخہ میں مذکور نہیں لیکن کتاب کے ورق ۹۶ پر مصنف کہتا ہے کہ اگر فرصت ملی اور اجل نے وفا کی تو انیس الغربا کا جفت مونس الفقرا لکھوں گا مونس الفقرا کے نام سے خدا بخش لائبریری میں ایک قلمی کتاب موجود ہے جسکے مصنف امیر ہمدانی ہیں امیر ہمدانی کی تصانیف کی جو فہرست دستیاب ہے اس میں اس نام کی کتاب کا ذکر نہیں۔ ناقص آخر۔

رسالہ غوثیہ: HL-2992 اصل میں یہ شرح رسالہ غوثیہ ہے نہ کہ خود رسالہ غوثیہ۔

(ب) بحر الانوار: اس کے کاتب سید عبدالرحمن و لد سید عبدالسلام ہیں نہ کہ شیخ عبدالرحمن۔ ناقص الاول۔

بحر معانی: HL-3395 محمد بن نصیر الدین کتاب کی ابتدا میں مصنف کا نام اس طرح مذکور ہے محمد بن نصیر الدین جعفر المکی الحسینی۔ اور ترقیمہ میں محمد حسینی ہینڈ لسٹ میں کاتب کا نام حبیب اللہ قنوجی مذکور ہے جو غلط ہے معلوم ہوتا ہے کہ فہرست نگار کو ترقیمہ کی درج ذیل عبارت سے غلط فہمی ہو گئی۔

" کاتبہ الفقیر الحقیر تراب الاقدام الصغیر و الکبیر المعطل و المقصر افعال الحسنات و الاعمال انحراف بلا الاستنباہ خیر اللہ خدام حضرت حبیب اللہ وجیہ علیہ الصلوٰۃ والسلام القنوجی" ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کاتب قنوج کا رہنے والا تھا اور اسی حیثیت سے مشہور تھا۔ اوراق ۸۳ نہ کہ ۷۳۔

تعلیمات تصوف امام غزالی: HL-3025 یہ کتاب دراصل منہاج العابدین ہے جس کے مصنف امام غزالی ہیں۔ اس کی ابتدا کا ایک ورق نہیں ہے۔ اس لیے ابتدائی چھ یا سات سطریں کم ہیں۔

توصیل المرید الی المراد بیان الاحزاب والاوراد: HL-2763 کتاب کا پورا نام ہینڈ لسٹ میں 'والاوراد' مذکور نہیں۔ اس کے کاتب کا نام اکرم علی نظامی ہے اور سن کتابت ۱۲۵۱ھ اوراق ۴۵ نہ کہ ۸۸

اس نسخہ میں درج ذیل رسائل بھی شامل ہیں جن کا ذکر ہینڈ لسٹ میں نہیں:

(۱) نسب آبائی کرام و نسب آبائے کرام والدہ حضرت شیخ محی الدین عبدالقادر جیلانی' نیز ذکر نماز تہجد و اوراد جس کے سلسلے میں ورق ۴۸ کے حاشیہ پر اکرم علی کی یہ عبارت مذکور ہے۔

"عاصی اکرم علی از نسخہ مجموعہ اوراد شیخ عبدالحق دہلوی ... بعضی اوراد و اعمال کہ نہایت ضروری دانست انتخاب کرد"

(۲) حزب البحر من احزاب الشیخ الامام قطب وقتہ الشیخ ... کاتب اکرم علی ۱۲۵۱ھ توصیل المرید الی ... کے بعد ۱۵ اوراق۔

(۳) حزب امویین: ۵ اوراق یہ عربی میں ہے۔

(۴) اسماء اربعین النبی ۴ اوراق عربی میں ہے۔

(۵) شفاء العلیل فی فضائل التہلیل: رسالہ کی ابتدا میں یہ عنوان ہے طریقہ الذکر الذی اجاز ہذا الفقیر شیخنا و سیدنا و

مولانا القطب الکامل مولانا الشیخ عبدالوہاب المتقی قدس اللہ سرہ واوصل من فتوحاتہ وبرکاتہ ۷ اوراق۔ عربی

(۶) صلوٰۃ منسوبۃ الی حضرت الشیخ الاعظم الشیخ محی الدین سید عبدالقادر الجیلانی ربانی غوث صمدانی رضی اللہ تعالیٰ عنہ ۹ اوراق۔ عربی۔

(۷) (از کتاب حزب الاعظم والورد الافخم من تالیف علی بن السلطان محمد القاری قدس سرہ ایک ورق۔

(۸) فرایض وواجبات نماز وسنن در بیت، اوراق ۲ آخری چھ اوراق پر عقیقہ کے بیان میں اور استخارہ کے مختلف طریقوں کا ذکر کیا گیا ہے۔

جواب مکتوب شیخ شرف الدین احمد یحییٰ منیری : HL-3069 ہینڈ لسٹ میں ۸ تک جو نام مذکور ہے وہ نسخہ میں موجود نہیں۔ پوری کتاب جلد کی طرف سے کرم خوردہ ہے [نسخہ میں ورق ۸ پر اشرف جہانگیر سمنانی (م ۸۰۸ھ/ ۱۴۰۵ء) ورق ۱۱ پر میر گیسو دراز (م ۸۲۵ھ/ ۱۴۲۲ء) اور ان کے جوامع الکلم کا ذکر موجود ہے]

چہل ناموس : HL-2569 اس کے مصنف ضیا نخشبی ہیں اوراق ۲۰۸ نا ۲۹۰

حاشیہ نفحات : HL-2951 نسخہ میں حواشی نفحات ہے البتہ کاتب نے بھی حاشیہ نفحات ہی لکھا ہے۔ یہ کتاب بالکل صحیح حالت میں ہے کرم خوردہ نہیں ہے۔

خوان پر نعمت : HL-2592 اس کے جامع زین بن بدر عربی ہیں اوراق ۱۴۷ تا ۱۴۰۔

خوان پر نعمت : HL-2940 اس کے جامع زین بن بدر عربی ہیں اوراق ۱۳ تا ۳۹ ورق ۳۲ سے ۳۹ تک ملفوظات خواجہ عظمت اللہ مستوفی ہیں۔

خوان پر نعمت : HL-2941 اس میں ابتدائی ۱۶ اوراق ملفوظات خواجہ عظمت اللہ کے ہیں اس کے بعد خوان پر نعمت ۲۹۴۰ ہینڈ لسٹ کا بقیہ حصہ ہے خوان پر نعمت کے کاتب فیض اللہ بن حفیظ اللہ ہیں۔ ہینڈ لسٹ نمبر ۲۹۴۰۔ یہ دونوں ایک ہی نسخہ خوان پر نعمت کے اوراق ہیں جلد بندی کی غلطی سے دو جلدوں میں آ گئے ہیں اور یہی بات ملفوظات خواجہ عظمت اللہ کے ساتھ ہے جبکہ اس کا حوالہ ہینڈ لسٹ میں بھی موجود نہیں۔

الدرجات والمقامات الموسوم بہ روضۃ النواظر : HL-2792 یہ کتاب جمال الدین محمد بن سعید ریحانی مذحجی شافعی شاذلی کی تصنیف روضۃ النواظر کا ترجمہ ہے جسے بدر الدین بن شیخ ابراہیم نے شاہزادہ دارا شکوہ کے حکم پر کیا مترجم نے ترجمہ کے بعد اس کا کوئی نام نہیں دیا ہے اس لیے اس کے نام کے ساتھ ترجمہ کا اضافہ ضروری ہے۔

دہ مجالس : HL-2881 کتاب کے ابتدائی چار اوراق پر اشعار ہیں۔ پانچویں ورق سے اصل کتاب شروع ہوتی

ہے پانچویں ورق کو اگر پہلا ورق مانیں تو ۲۷ اویں ورق پر کتاب مکمل ہوجاتی ہے۔ فہرست نگار نے کُل اوراق ۱۷۲ بتائے ہیں اصل کتاب کے اوراق ۱۷۲ ہیں ابتدائی اوراق جوڑے جائیں تو تعداد ۱۷۶ ہوتی ہے اس طرح ۱۷۲ لکھیے یا ۱۷۶۔

درِ مجالس: HL-3287 اوراق ۱۵۰ نہ کہ ۱۴۵۔

درِ مجالس: HL-4002 اس کے حاشیہ پر درج ذیل رسالے قصہ خاتم النبیین رحمۃ اللہ علیہ (۱۲-۲۰) من کلمات المقرب الحضرت الباری خواجہ عبداللہ انصاری (۱۴-۱۶) درباره آفرینش عالم (۱۶-۱۹) رسالہ وجودیہ (۲۲-۳۳) مکتوبات عبدالجلیل (۳۳-۴۴) رسالہ خواجہ معین الدین حسن سجزی رحمۃ اللہ علیہ دربیان رگہا کہ در وجود آدم اند (۶۸) بیسقہ نامہ (۷۳) خطبۂ نکاح (۷۶) از نسخۂ شیخ الاسلام انس الاوتاد مقتدای اولیا رکن الحق ابوالفتح ملتانی قدس سرہ کہ از برای سلطان قطب الدین تبرک ہدیہ آوردہ بود (۸۷) نعت حضرت سید المرسلین (۸۹) وغیرہ ہیں۔

راحت القلوب: HL-2644 اس کے کاتب سکندر حشمت ہیں۔

رسالہ تحقیق عالم مثالی: HL-3067 نسخہ میں رسالہ تحقیق عالم مثال درج ہے۔

رسالہ حوض الحیات: HL-3717 مترجم کا نام نسخہ میں مرقوم نہیں دراصل یہ امرت کنڈ (امرت کنڈلی) کا ترجمہ ہے۔ مترجم نے اسے عربی سے ترجمہ کیا ہے عربی کتاب کے نام کا بھی ذکر نہیں۔ ناقص الآخر قدرے کرم خوردہ۔

رسالہ خواجہ معین الدین چشتی: HL-3716 اصل میں یہ رسالہ سیر المقامات ہے اور اس کے مصنف عبدالجلیل ہیں اوراق ۴۴ ہیں نہ کہ ۲۵۔ رسالہ سیر المقامات کے اختتام کے بعد اگلے ورق پر رسالہ اسماء وذات وصفات ہے جس میں سالکان علم الیقین کی منزلوں کا ذکر ہے۔ ناقص الآخر۔

رسالہ خوارق: HL-2480 اصل میں یہ خواجہ عبید اللہ احرار کے خوارق عادات کے بیان میں ہے اور اسے مولانا شیخ احمد نے لکھا ہے اس لیے مصنف کے خانے میں شیخ احمد کا نام ہوگا نہ کہ خواجہ عبید اللہ احرار کا۔

رسالہ در اشغال طریقۂ نقشبندیہ: HL-3040 نسخہ میں اس کا عنوان اس طرح ہے "فصل دوم دربیان اشغال طریقۂ چشتیہ بطرزی جدید کہ موجب قوت واثر وسرعت ظہور فوائد در ازمنہ قلیلہ باشد" معلوم ہوتا ہے کہ یہ کسی ضخیم کتاب کا ایک حصہ ہے جس کی فصل دوم یہ ہے اور فصل اوّل (دربیان اشغال طریقہ قادریہ) ہینڈ لسٹ نمبر ۳۰۳۹ پر موجود ہے۔ اوراق ۳ نہ کہ ۲۔ دونوں جگہ نام موضوع سے لیے ہیں۔

رسالہ در تصوف: HL-2464 نسخہ کے ابتدائی پانچ اوراق پر شمس تبریز، شاہ بوعلی قلندر اور خواجہ حافظ شیرازی کی غزلیں اور رباعیاں ہیں مختلف مقامات پر درمیان میں اردو کے اشعار بھی ہیں۔ چھٹے ورق سے مذکورہ

رسالہ شروع ہوتا ہے۔ ترقیمہ کی عبارت ہے تمت حکمنامہ حضرت شاہ بوعلی قلندر۔ اس لیے رسالہ کا نام رسالہ در تصوف کے بجائے حکمنامہ حضرت شاہ بوعلی قلندر ہوگا۔ عبدالحکیم صدیقی اس کے کاتب ہیں نہ کہ مصنف۔ سن کتابت ۱۲۶۶ھ ہے۔ یہ رسالہ صرف ۱۱ اوراق پر مشتمل ہے نہ کہ ۳۳۔ اس کے بعد ۲۲ اوراق پر اردو اور کچھ جگہوں پر فارسی کے اشعار ہیں۔

رسالہ در تصوف وصوفیای کرام: HL.3239 کرم خوردہ اوراق ۱۱ نہ کہ ۱۳۳، ۱۲۲واں ورق دراصل کسی کتاب کا تنہا ورق ہے جسکا نام "کامل التعبیر" ہے۔

رسالہ در تصوف: HL-3837 مصنف کا کہنا ہے کہ:

"درخاطر این فقیر ہست کہ چیزی در توحید واتحاد و وحدت وسائر مقامات نوشتہ شود"

اس لیے رسالہ کا نام رسالہ در تصوف کے بجائے "رسالہ در توحید اتحاد وحدت وسائر مقامات" دیا جا سکتا ہے

(ب) ورق ۵۰ سے ایک دوسرا رسالہ شروع ہوتا ہے اس کے مقدمہ میں بھی مصنف نے اپنے یا کتاب کے بارے میں کچھ بھی نہیں لکھا ہے ممکن ہے کہ یہ پہلی کتاب کے ہی ابتدائی اوراق ہوں۔ ۱۸۰ اوراق۔

رسالہ عشقیہ: HL-3522 یہ قاضی حمیدالدین ناگوری سے منسوب کتاب ہے، جو خیالات عشاق کے نام سے بھی مشہور ہے۔ مصنف کا نام ہینڈ لسٹ میں مذکور نہیں۔

رسالہ غوثیہ: HL-2959 کتاب کا پورا نام "رسالہ غوثیہ من رؤیت الغوث الاعظم" ہے اور کاتب کا نام سید اطہر حسن نہ کہ سید اطہر حسین اوراق ۵۰ نہ کہ ۴۹

(۲) مکتوب غوث الاعظم: نسخہ میں مکتوبات شیخ عبدالقادر جیلانی مذکور ہے، اس میں اٹھارہ خطوط ہیں اوراق ۲۲ نہ کہ ۲۱۔ اس کے کاتب بھی سید اطہر حسن ہیں۔

(ترجمہ) رسالہ غوثیہ: HL.3699 دراصل یہ شرح رسالہ غوثیہ ہے اور اس کے شارح ملوکشاہ صدیقی القادری ہیں نہ کہ عبدالقادر جیلانی جنکی طرف زیادہ سے زیادہ تصنیف کی نسبت دی جا سکتی ہے۔ سن کتابت ۱۲۶۱ھ ہے نہ کہ ۱۲۵۹ھ

رسالہ مناقب زبدۃ اولیائی: HL-4090 صحیح نام مناقب حضرت مولانا محمد طاہر ہے۔

(۱) رسالہ: HL.3954 صرف رسالہ کہنا کافی نہیں بلکہ ذکر خواجہ علاءالدین عطار کہنا مناسب ہوگا۔

(۲) انیس الطالبین: اس کا پورا نام انیس الطالبین وعدت السالکین ہے اور سن کتابت ۱۱۸۴ھ ہے۔

شرح رسالہ مراقب مستجامی: HL-3060 اوراق ۱۹ نہ کہ ۲۴۔ کرم خوردہ۔ اس رسالہ کے ساتھ تین ورق کا تصوف میں ایک اور رسالہ ہے جسمیں وحدت حقیقت اور عالم وغیرہ پر بحث ہے۔ ناقص الطرفین۔

شرح عوارف المعارف موسوم بہ مصباح الہدایۃ ومفتاح الکفایۃ: HL-2444 اسکو سطرح پڑھا جائے "مفتاح الہدایۃ ومفتاح الکفایۃ" اس کے مصنف محمود بن علی الکاشانی ہیں نہ کہ عزالدین بن علی کاشانی۔

صراط مستقیم: HL-2707 اوراق ۱۸۰ نہ کہ ۱۸۹۔

(شرح) فصول الحکم (لابن عربی) HL-3731 کتاب کا نام نصوص الخصوص فی ترجمۃ الفصوص ہے اوراق ۲۰۶ نہ کہ ۲۵۲۔

ہینڈ لسٹ HL-3732 مذکورہ بالا کتاب کی دوسری جلد ہے اوراق ۲۷۸ نہ کہ ۲۷۶۔

فواید نظامی: HL-2541 اوراق ۱۹ نہ کہ ۱۳۳۔ کرم خوردہ سن کتابت ۱۲۱۷ھ

(۲) خطبہ وشرحش: قاضی عبدالعزیز خطبہ عربی میں ہے اور اس کی شرح فارسی میں ۱۴ اوراق ہیں۔ علاوہ تصوف کے مختلف موضوعات پر عربی وفارسی میں کئی اور رسالے ہیں جو بسیار کرم خوردہ وناقص ہیں۔

کاشف الاسرار: HL-4049 اوراق ۵۴ نہ کہ ۴۳۔

کحل العینین فی تفصیل غوث الثقلین: HL-3048 اس کے مصنف محمد اسمٰعیل اور کاتب محمد یحییٰ ہیں اور سن کتابت ۱۲۸۰ھ اوراق ۱۷ نہ کہ ۱۰۰۔ اس میں درج ذیل کتاب بھی مجلد ہے۔

ھدیۃ الاحباب فی مناقب اہل البیت والاصحاب: اس کے مصنف بھی محمد اسمٰعیل ہیں سن کتابت ۱۳۰۰ھ ۸۱ اوراق۔

لطائف اشرفی: HL-3745 کتاب کی ابتدا سے پہلے درج ذیل عنوانات کے تحت یہ رسالے ہیں: اقتباسات اور تفسیر شاہی (۲ ورق) مناجات قاضی الحاجات از حضرت پیر دستگیر خواجہ خواجگان خواجہ قطب الدین بختیار کاکی اوشی (۱ ورق) اسکے کاتب محمد طٰہٰ چشتی فخری مذکور ہے اور سن کتابت ۱۳۵۵ھ۔

(ب) لطائف اشرفی: ناقص الاول وکرم خوردہ۔

لطائف المعانی: HL-3987 اوراق ۱۳ نہ کہ ۲۵۔

(۱) لوائح جامی: HL-2406 اوراق ۱۳ نہ کہ ۱۴۔

(۲) نزھۃ الارواح: اوراق ۱۴۱ نہ کہ ۲۴ سن کتابت ۱۰۸۱ھ نہ کہ ۱۰۸۰ھ۔

لوائح جامی: HL-4013 اس کا سن کتابت ۱۰۵۶ھ ہے ہینڈلسٹ میں کیفیت کے خانے میں درج ہے کہ "بصفحہ آخر مہر محمد شمشیر ۱۲۲۳ھ ثبت است" لیکن یہ مہر آخری صفحہ پر نہیں بلکہ پہلے صفحہ پر ہے۔

مجموعہ رسائل: HL-3654 اس مجموعے میں ایک سو دو رسالے ہیں جن رسالوں کے سلسلے میں کچھ کمی رہ گئی ہے ان کے شمارہ نمبر کے ساتھ ذکر کیا جارہا ہے۔

(۶) شرح ابیات مشکلہ: پورا نام شرح ابیات مشکلۂ فصوص الحکم ہے (۷) مناقب شاہ ولی، اوراق ۱۴ تا ۱۳ک (۱۳) رسالہ نفس: اوراق ۲ تا ۳ک (۱۹) رسالہ "مصلحات صوفیا" یہ مصطلحات صوفیا ہے (۲۱) رسالہ جواب سوالہای امام علی حکیم ترمذی: اس میں "و" زائد ہے رسالہ جواب سوالہای امام علی حکیم ترمذی (۲۴) رسالہ حقیقت روح: اوراق ۲ تا ۱ک (۲۶) رسالہ حل رباعی شیخ ابوسعید ابوالخیر: اوراق ۲ تا ۱ک (۳۰) رسالہ در شرح واردات: نسخہ میں رسالہ ترجمان واردات ہے مصنف امام عبداللہ یافعی پیر حضرت شاہ نعمت اللہ ولی ہیں (۳۱) رسالہ شرح اسمائے حسنیٰ: اوراق ۲ تا ۷ک، یہ رسالہ عربی میں ہے (۳۲) رسالہ در بیان تجلی: عربی میں ہے۔ (۳۳) رسالہ نسب احمد شاہ بہمنی: اس کا نام رسالہ نسبت خرقہ احمد شاہ بہمنی ہے۔ (۳۴) رسالہ تفسیر سورۂ اخلاص یہ رسالہ عربی میں ہے (۳۵) رسالہ ھوالاول ھوالآخر ھوالظاھر ھوالباطن: یہ رسالہ عربی میں ہے (۳۶) رسالہ در حروف مبسوط: یہ رسالہ عربی میں ہے۔ (۴۰) شرح رباعی شیخ ابوسعید ابوالخیر: اس رسالہ کا نام حورائیہ ہے (۴۳) رسالہ فی توکل: ایک ورق تا ۲پ (۴۶) رسالہ در جواب سوال: اس کا صحیح نام تکمیلیہ ہے (۴۷) رسالہ مشات: اس کا صحیح نام منشآت ہے (۴۸) تفسیر آیت اللہ نور السمٰوات تا تعبیر آیت اللہ ونور السموات (۵۳) رسالہ شرح مطالب فصوص الحکم: اوراق ۳۸ تا ۷ک (۵۶) رسالہ در بیان حرف الف: ورق ۱ تا ۳ک (۵۹) رسالہ اصطلاحات: یہ رسالہ عربی میں ہے (۶۷) رسالہ تحقیق رباعی شیخ ابوسعید ابوالخیر: اس رسالے کا نام روحیہ ہے (۸۵) رسالہ در چہاردہ خانوادہ: اس کا نام رسالہ در بیان چہاردہ خانوادہ ہے (۱۰۱) رسالہ: اوراق ۱۰ تا ۵ک۔

مرآۃ العارفین: HL-2465 اوراق ۹۶ تا ۹۴ک۔

مرآۃ العارفین: HL-3941 ناقص الاول اوراق ۹۲ تا ۱۵۰ک۔

مصباح الھدایت: HL-2566 کتاب کا پورا نام مصباح الہدایۃ ومفتاح الکفایۃ ہے۔

معدن الجواھر: HL-2547 کتاب کے دیباچہ میں مصنف کا نام موجود نہیں ترقیمہ میں طرزی مذکور ہے یہ طرزی طاہر طرزی دہلوی ہیں اس کتاب کو فن تصوف کے علاوہ فن اخلاقیات میں بھی رکھا جا سکتا ہے۔

مقصد الاقصیٰ: HL-3640 اس نسخہ کے ابتدائی ۸ اوراق پر اوراد و اشعار ہیں پھر اصل کتاب شروع ہوتی ہے اس کے مصنف کا صحیح نام عزیز ابن محمد نسفی ہے نہ کہ عزیز ابن نسفی ہینڈ لسٹ ۷۶۹ کیلئے بھی یہی مصنف سمجھے جائیں۔

اس کے کاتب علاء الدین بنارسی ہیں اور سن کتابت ۱۰۵۳ھ۔ مذکورہ بالا کتاب کے علاوہ بھی اس میں درج ذیل رسائل ہیں۔

(الف) رسالہ: ۲۳ اوراق اس رسالے میں ولایت کے سلسلے میں بحث کی گئی ہے۔

(ب) شرح مثنوی مولوی معنوی: یعقوب بن عثمان بن محمد الغزنوی ترقیمہ کی عبارت ہے۔ تمام شد رسالہ شرح مثنوی مع شرح فاتحہ۔ ۵۴ اوراق اس کے کاتب بھی علاء الدین بنارسی ہیں اور سن کتابت بھی ۱۰۵۲ھ۔

(ج) از بیاض مرزا منیر بیگ کاتب ابوالفیض مبارک بنارسی سن کتابت ۱۰۵۳ھ۔ ۹ اوراق۔

آخر میں ۸ اوراق پر اشعار متفرقہ کے علاوہ وہ اشعار بھی ہیں جو کسی عقیدتمند نے شیخ پیر میر بھی کی عقیدت میں لکھے ہیں۔

<u>مکتوبات شاہ خوب اللہ الہ آبادی:</u> HL-3726 نسخہ میں اس کا نام سلسلۃ الذہب مذکور ہے اس کے مصنف کا پورا نام غلام محمد ابن طیب ہے ہینڈ لسٹ میں صرف ابن طیب مذکور ہے ناقص الآخر کرم خوردہ اوراق ۵۴ تا ۲۵۶۔

<u>مکتوبات شاہ عبدالعزیز:</u> HL-3018 یہ صرف ۲ ورق پر ہے اور صرف دو ہی خط ہیں۔ اس کے علاوہ اس میں درج ذیل رسالے بھی شامل ہیں۔

(۱) انتخاب از کتاب تفہیمات: حضرت شاہ ولی اللہ۔ اوراق ۲۔

(۲) انتباہ فی سلاسل اولیاء اللہ: از شاہ ولی اللہ ۵۱ اوراق۔

(۳) بعض اسانید علم حدیث و علم فقہ: ناقص الآخر ۵ اوراق۔

<u>مکتوبات صدی:</u> HL-2962 کرم خوردہ۔

<u>مکتوبات صدی:</u> HL-2463 یہ دراصل مکتوبات دوصدی ہے۔ اوراق ۴۵۴ تا ۴۶۴

<u>مکتوبات مظفر بلخی:</u> HL.2619 کیفیت میں یہ اضافہ کیا جائے کہ نسخہ کے سرورق پر مکتوبات صد و ہشتاد و یکم مذکور ہے اور اس کے جمع کنندہ مخدوم شاہ حسین نوشہ توحید بلخی ہیں اوراق ۲۱۰ تا ۲۱۳۔

درج ذیل مکتوبات بھی اسی نسخہ کے ابتدائی ۳ اوراق پر ہیں۔

مکتوب پنجاہ و ششم (بنام امام حسام الدین) پنجاہ ہفتم و پنجاہ ہشتم (بنام مولانا شہاب الدین) یہ معلوم نہ ہو سکا کہ یہ مکتوبات کس کے ہیں۔

<u>ملفوظات حضرت قطب الدین شطاری:</u> HL-3010 نسخہ میں صاحب ملفوظ کا نام اس طرح ہے۔ ملفوظات حضرت عین الدین عبدالباری المشتہر بہ شاہ رکن الدین احمد شطاری اسکے جمع کنندہ امام الدین شطاری جہانگیری ہیں اوراق ۸۸ تا ۱۷۵۔

<u>مناقب غوثیہ:</u> HL-2710 کرم خوردہ۔ اوراق ۱۷ تا ۶۹۔

<u>منقولات از رسالہ مرآۃ الاسرار:</u> HL-3073 ورق ۱ تا ۲۔

(۲) خلاصۃ الاخبار: نسخہ میں منقول از خلاصۃ الاخبار ہے۔

(۳) بستان الفقیہ: نسخہ میں منقول از بستان الفقیہ ہے یعنی انتخاب کا لفظ نام کے ساتھ بڑھایا جاتا تو بہتر تھا یہ رسالہ ۱۳ اوراق پر ہے نہ کہ ۷۔ نیز یہ رسالہ عربی زبان میں ہے۔

(۴) ۵ اوراق پر ایک رسالہ ہے جس میں حضرت آدمؑ اور ان کی اولاد کے بارے میں حضرت عیسیٰؑ و مریم کی ولادت کے بارے میں حضرت محمد صلعم اور ان کی اولاد و ازدواج کے بارے میں"۔ مرقع حسن و دل" "نسخہ" "تصنیف حضرت شیخ حبیب اللہ مرید ملا شیخ محب اللہ" کا آخری ورق ہے۔

(ترجمہ) منہاج العابدین: HL-3076 کرم خوردہ اوراق ۱۱۹ نہ کہ ۱۲۲ اس کے حاشیہ پر درج ذیل دو کتابیں ہیں۔

"شرح رسالہ غوثیہ" ملوک شاہ صدیقی القادری ۴۲ اوراق ۱-۶۳ درمیان میں ۱۹-۴۰ تک حاشیہ پر ایک دوسرا رسالہ ہے۔ اس کے کاتب عبدالقادر ہیں اور سن کتابت ۱۱۲۴ھ۔

"اشعۃ اللمعات، شرح لمعات عراقی) نورالدین عبدالرحمٰن جامی (۶۴-۱۲۲) ۶۹ اوراق پورے حاشیہ کی کتابت ایک ہی شخص کی معلوم ہوتی ہے اس لیے اس کے کاتب عبدالقادر ہی ہوں گے اور سن کتابت ۱۱۲۴ھ۔

منہج الغافلین: HL-3206 یہ منہج الفاضلین ہے۔ ناقص الآخر و کرم خوردہ۔

نالۂ عندلیب: HL-3721 یہ کتاب دو جلدوں میں ہے اور دونوں جلد کے اوراق کی تعداد ۷۰۵ ہے پہلی جلد میں ۳۷۲ اور دوسری جلد میں ۳۷۸ ہینڈ لسٹ میں صرف ۳۳۸ اوراق مذکور ہے۔ ناقص الطرفین۔

نزہت الارواح: HL-2555 کرم خوردہ۔

نزہت الارواح: HL.3763 کرم خوردہ اوراق ۸۶ نہ کہ ۸۷

انتخاب نفحات الانس: HL.2515 نسخہ کے ابتدائی ۲ اور آخری ۳½ اوراق پر مختلف شاعروں کے فارسی اشعار ہیں انتخاب نفحات الانس صرف ۳۴ اوراق پر ہے نہ کہ ۴۰

نفحات الانس: HL.2823 کرم خوردہ۔ کتاب کا پورا نام نفحات الانس من حضرات القدس ہے۔

نفحات الانس: HL.2903 اوراق ۳۴۵ نہ کہ ۳۵۲ اور اس کی سن کتابت ۱۰۱۴ھ ہے۔

نفحات الانس: HL.3078 پورا نام نفحات الانس من حضرات القدس ہے۔ اس نسخہ میں کل ۳۰۷ اوراق میں ورق ۷۱ کے بعد دو ورق پر عربی میں منتخبات شروح فصوص الحکم العربی ہے۔ سن کتابت ۱۲۹۸ھ۔

نور الاسلام: HL.2853 یہ کتاب ناقص الآخر ہے اور عقائد پر ہے۔

وصایا شیخ الاسلام و ترتیب خلافت: HL.3352 اس میں درج ذیل رسالے ہیں۔

(۱) رسالہ مراتب فنا: حضرت سیدنا ابوالعلا احراری الحسینی ۵ اوراق۔

(۲) الھامات منعمی: ۴۲ اوراق۔

(۳) وصایا حضرت مخدوم یحییٰ منیری: زین ابن بدر عربی ۱۲ اوراق۔

(۴) ترتیب خلافت از زبان حضرت سیدنا علیہ رحمت (حضرت سیدنا شاہ ابوالعلا) ا ورق۔

ضمیمہ مرآۃ العلوم۔ جلد سوم (تصوف)

اسرار المومنین: HL-2586/1 اوراق ۴۵ نہ کہ ۳۵، ناقص الآخر و کرم خوردہ ہینڈ لسٹ میں کاتب کے خانے میں محمد امان خان مذکور ہے جبکہ یہ کاتب نہیں ہیں کتاب کے آخری ورق پر خاتمہ کے بعد محمد امان اللہ نے لکھا ہے کہ یہ کتاب خود مصنف نے یادگار کے طور پر اسے مرحمت فرمائی۔

انتخاب از مکتوب دو صدی: HL-2894/24 مجلد کے گیارھویں نمبر پر یہ انتخاب ہے اور ۱/۲ اوراق پر ہے نہ کہ ۲۔

قصیدہ کا بردہ: HL-2954/5 یہ رسالہ چھٹے نمبر پر ہے اور اس میں اوراق ۲۵ ہیں نہ کہ ۴۲۔

قصیدہ غوثیہ: HL-2954/4 اس کے مترجم قمر الحق غلام رشید ارشد محمد مصطفےٰ عثمانی جونپوری ہیں اور سن کتابت ۱۱۷۷ فصلی۔

منظومہ سر الشہادتین: HL-2650/1 یہ منظوم ترجمہ اردو میں ہے۔ اس میں اوراق ۳۳ ہیں نہ کہ ۳۲

خوان پر نعمت: HL-2462/1 یہ ناقص الآخر نسخہ ہے۔

رسالہ: HL.2894/1 جیسا کہ قبل بھی عرض کیا جا چکا ہے کہ اس کی چار جلدیں ہیں ابتدائی تین جلدوں میں ۵۰۰ اوراق پر مشتمل اس قسم کا کوئی "رسالہ" نہیں جسے "انتخاب از اقوال مشائخ" کا نام دیا جا سکے جو کہ کیفیت میں دیا گیا ہے۔ آخری جلد کی ابتدا میں بوستانِ سعدی، خوان پر نعمت، منہاج العابدین سے انتخاب ہے لیکن یہ انتخاب بھی ایک دو ورق پر مشتمل ہے۔ ان کے لیے نالہ درد سے انتخاب ہے ہینڈ لسٹ میں کیفیت کے خانے میں انتخاب از اقوال مشائخ مذکور ہے جو اس طور پر دینا ضروری ہو تو انتخاب از تصانیف مشائخ ہو سکتا ہے اور علا دے کر جو رسالہ کا نام دیا گیا ہے وہ تو واقعتاً صد پند لقمان ہے۔

رسالہ: HL.2894/18 کیفیت میں ہے انتخاب اقوال و اشعار یہ مندرجہ بالا مجموعہ کے آخری مجلد کا آخری حصہ ہے جو ۲۹ ویں نمبر پر ہے۔

رسالہ: HL.3712/4 یہ رسالہ درکیفیات عالم ہے اور ایک ورق پر ہے اسکے مصنف ضیاء الدین نیشاپوری ہیں۔

(۵) رسالہ وجودیہ: یہ ساتویں نمبر پر ہے ۳ اوراق۔

(۶) رسالہ: یہ آٹھویں نمبر پر ہے اور یہ قول حضرت غوث پاک ہے اوراق ۳ نہ کہ ۷۔

رسالہ: HL-3767/5 اس کا عنوان "رسالہ درفضیلت مکہ" دیا جا سکتا ہے یہ رسالہ عربی زبان میں ہے اور اس میں حسن بصری کا ایک خط ہے جو انھوں نے عبدالرحمن ابن انس کو مکہ کے بارے میں لکھا تھا۔

رسالہ ارواح العارفین: HL-2478/15 فہرست میں اس کا نمبر ستائیسواں ہے اس کا صحیح نام "نزہۃ الارواح" ہے اسمیں اوراق ۲۶ ہیں نہ کہ ۲۶ سن کتابت ۸۱۶ھ ہے نہ کہ ۸۲۹ھ اسکے مصنف کا صحیح نام جمال الدین حسین بن عالم بن ابی الحسین الحسینی ہے۔

رسالہ در تصوف: HL-2954/2 اس عنوان کے تحت اس نمبر پر اور رسالہ نہیں بلکہ رسالہ در طب ہے اور اس کے بعد رسالہ اربعین جو عربی میں ہے۔

رسالہ در تصوف: HL-2960/2 : یہ روح وعقل کے درمیان مکالمہ ہے جو ابتدا سے ناقص ہے۔

رسالہ در تصوف: HL-3367/3 نسخہ میں بھی رسالہ اور اس کے مصنف کا نام موجود نہیں دراصل یہ رسالہ عرفی شیرازی کا ہے اور اس کا نام نفسیہ ہے ملاحظہ ہو فہرست مشترک جلد سوم نمبر ۳۷۷۔

رسالہ شہود: HL-2894/2 اس کا پورا نام رسالہ اسرار شہود ہے ۲ ورق پر ہے نہ کہ ۵، اور ہینڈلسٹ نمبر ۲۸۹۴ پر اس کا نمبر ۲۷ واں ہے۔

رسالہ عبداللہ انصاری: HL-3081/2 یہ رسالہ ۵ اوراق پر ہے نہ کہ ۷، نیز یہ کرم خوردہ ہے۔

رسالہ معین الدین چشتی: HL-2499/1 اسکے کاتب دین اللہ ہیں نیز یہ نسخہ ناقص الاول و آب خوردہ ہے۔

رسالہ معین الدین چشتی: HL-2954/6 یہ رسالہ آٹھویں نمبر پر ہے اوراق ۷ نہ کہ ۶۔

رسالہ معین الدین چشتی: HL-3922/10 یہ رسالہ مجموعہ میں ۱۱ویں نمبر پر ہے۔

(۱۴) رسالہ در طریقت : یہ رسالہ منظوم ہے۔

(۱۷) نسخہ کیمیائے سعادت: یہ نمبر ۱۶ پر ہے۔ دراصل یہ کیمیائے سعادت کے مشتملات کی محض فہرست ہے۔ کیمیائے سعادت ضخیم کتاب ہے جبکہ یہ صرف ۱۵ اوراق پر ہے۔

رسالہ مکالمہ روح عشق وعقل: HL-2960/1 دراصل یہ "قصہ حسن وعشق" ہے۔ کرم خوردہ۔

فوائد المریدین: HL-2774 اوراق ۲۷ نہ کہ ۲۸۔ عبارت میں سرخ روشنائی سے نورالدین احمد

فردوسی نے اسے اپنی ملکیت قرار دیا ہے یہی تحریر پوری کتاب کی ہے اسلیے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ یہی اسکے کاتب بھی ہوں۔

کتاب الاوراد: HL-1705/1 اس نمبر کے تحت پہلی کتاب "ہدایۃ الانام فی اثبات تقلید الائمۃ الکرام" ہے کتاب الاوراد نام سے اس میں کوئی کتاب نہیں اور نہ اس ضخامت ۲۲۹ اوراق کی ہی کوئی کتاب ہے۔

کلید دانش: HL-2894 یہ مطبوعہ نسخہ ہے اسے ۱۷۱۲۴ ہینڈ لسٹ کے تحت مطبوعات کے سکشن میں رکھ دیا گیا ہے اس میں پوری کتاب کے حاشیوں پر نالہ درد، معدن معانی باب سی و دوم منہاج ابن حجر فتاوی عالمگیری سے اقتباسات موجود ہیں جو قلمی ہیں غالباً قبلاً اسے مخطوطات سیکشن میں رکھا گیا تھا لیکن ایسی صورت میں اس کا نام مطبوعہ کتاب کے بجائے انتخاب قسم کا ہوگا۔

گنج لا یخفی: HL-3979/1 اس کے جامع مولانا نعمت اللہ ہیں۔

مکتوبات شیخ شرف الدین احمد بہاری: HL-2774/3 یہ دراصل مکتوبات بست و ہشتم ہے اور اس میں اوراق ۳۸ ہیں نہ کہ ۲۷ جلد بندی میں اوراق بے ترتیب ہو گئے ہیں۔

مکتوبات شیخ شرف الدین احمد بہاری: HL-3711/5 یہ مکتوبات صدی ہے اور اس کا نمبر شمار تیرا ہے۔

مناقب غوثیہ: HL-3841/1 اس کے مصنف محمد صادق شامی ہیں نہ کہ محمد صدیق شامی اوراق ۴۵ نہ کہ ۹۶۔

ڈاکٹر سلیم الدین احمد
اسسٹنٹ لائبریرین
خدا بخش لائبریری۔ پٹنہ

مرآۃ العلوم اوّل/دوم کی کچھ تصحیحات کے بارے میں

(ڈاکٹر افتخار احمد مدنی کی تصحیحات کے حوالے سے)

انیس الطالبین: (HL-1339) توضیحی کیٹلاگ جلد ۱۶ (ص ۴۴) میں پوری تفصیل آگئی ہے

الجانب الغربی: (HL-1342) 〃 (ص ۵۷-۵۸) 〃

(ترجمہ) حقیقۃ المحمدیہ: (HL-1346) 〃 (ص ۷۶) 〃

خیالات عشاق: (HL-1347) 〃 (ص ۴۶-۴۷) 〃

زبدۃ الحقایق: (HL-1355) کاتب کا نام ہینڈ لسٹ میں نہیں دیا گیا ہے کیونکہ کتاب میں صرف م ع ص وم لکھا ہے جو مشتبہ ہے۔

شمایل الاتقیا: (HL-1356) مصنف کا پورا نام دیباچہ میں نہیں ہے بلکہ جتنا نام دیباچہ میں تھا وہی دیا گیا ہے۔ کتاب کے پہلے صفحے پر بعد کی تحریر میں پورا نام ہے جسے بغیر چھان پھٹک کے لکھنا مناسب نہ تھا اس لیے کہ یہ مشتبہ ہے۔

(شرح) عوارف المعارف: (HL-1360) یہ کتاب "شرح عوارف المعارف" کے نام سے ہی زیادہ مشہور ہے۔ نہ کہ "مصباح الہدایہ و مفتاح الکفایہ" سے۔ اس لیے مشہور نام ہی دینا مناسب سمجھا گیا۔

(شرح) فتوح الغیب موسوم بہ مفتاح الفتوح (H.L. 1367) کیٹلاگ جلد ۱۶ (ص ۴۶) میں اس کا نام مفتاح فتوح الغیب ہی دیا گیا ہے۔

فصل الخطاب: (HL-1368) کیٹلاگ جلد ۱۶ (ص ۳۹) میں پوری تفصیل موجود ہے۔ ہینڈ لسٹ میں '۲۳ سال' کے بجائے '۳۳ سال' کتابت کی غلطی ہے۔

فصل الخطاب: (HL-1369) کیٹلاگ جلد ۱۶ (ص ۴۰) میں پوری تفصیل موجود ہے۔

(شرح بر شرح) فصوص الحکم: (HL-1373) "شرح بر شرح فصوص الحکم" سے زیادہ مشہور ہے اس لیے 'نقد النصوص' کے بجائے اس نام سے اندراج مناسب سمجھا گیا۔

کلید مخازن: (HL-1376) اس کتاب کے اوراق پر جا بجا حواشی ہیں جن کی تفصیل کیٹلاگ جلد ۱۶ (ص ۵۹) پر آگئی ہے۔

کیمیائے سعادت: (HL-1377) کیٹلاگ جلد ۱۶ (ص ۲) میں پوری تفصیل آگئی ہے۔ اس نسخہ کے بارے میں ابو سعادت جلیلی صاحب کا تفصیلی مضمون بھی لائبریری جرنل شمارہ ۴۰ میں آگیا ہے۔

لطائف اشرفی: (HL-1379) کیٹلاگ جلد ۱۶ (ص ۱۳) میں پوری تفصیل آگئی ہے۔

لطائف اشرفی: (HL-1381) کیٹلاگ جلد ۱۶ (ص ۳۸) میں پوری تفصیل آگئی ہے۔ خود ہینڈ لسٹ میں کیفیت کے خانہ میں ملفوظات ہی لکھا گیا ہے۔

مرصاد العباد: (HL-1387) کتاب کا نام مختصر ہی دیا جانا مناسب ہے۔ کیٹلاگ جلد ۱۶ (ص ۹) پر تفصیل آچکی ہے۔

معدن معانی: (HL-1388) کیٹلاگ جلد ۱۶ (ص ۲۵) میں اس کتاب کی پوری تفصیل دی گئی ہے۔ لیکن نام "معدن معانی" ہی لکھا ہے۔ یہ دراصل "خوان پر نعمت" ہے۔ کتاب پر جناب محبوب حسین صاحب کا نوٹ موجود ہے۔

مکتوبات احمد فاروقی: (HL-1390) نام درست ہے یہی نام دیباچہ میں دیا گیا ہے اب رہا مسئلہ یہ کہ دفتر سوم کے مقدمہ میں جلد اوّل کے مکتوبات کو 'درمعرفت' کہا گیا ہے تو یہ کتاب کا نام نہیں بلکہ جلد اوّل کے مشمولات کی طرف اشارہ ہے کہ یہ 'معرفت' میں ہیں۔

مکتوبات احمد فاروقی: (HL-1391) یہ اطلاع قابل لحاظ ہے کہ اس جلد میں دفتر دوم کے ساتھ دفتر سوم بھی ہے۔ 'مکتوبات مجدد الف ثانی' کے نام سے اس کتاب کو آغاز کتاب میں نہیں دیا گیا ہے بلکہ نام 'مکتوبات احمد فاروقی' ہی رکھا گیا ہے۔ آگے چل کر تفصیل میں اسے 'مجدد الف ثانی' کے نام سے پکار لیا گیا ہے۔

مکتوبات غوثیہ: (HL-1397) یہ کتاب 'مکتوبات غوثیہ' کے نام سے مشہور ہے اسی لیے کتاب کا کہیں نام نہ ملنے کے باوجود یہ نام دیدیا گیا اور 'مکتوبات شیخ عبدالقادر جیلانی' نہیں دیا گیا۔ اس کتاب کے بارے میں کیٹلاگ جلد ۱۶ (ص ۶۱) میں پوری تفصیل آچکی ہے۔

نالہ درد: (HL-1401) کیٹلاگ جلد ۱۶ (ص ۸۷) میں تفصیل موجود ہے۔

(خلاصۃ النفحات: (HL-1409) کیٹلاگ جلد ۲ (ص ۶) میں تفصیل موجود ہے۔

نکات الاسرار: (HL-1411) کیٹلاگ جلد ۱۶ (ص ۸۴) میں تفصیل موجود ہے۔

واردات: (HL-1412) 〃 (ص ۸۵) 〃 〃

شرح واردات موسوم بہ علم الکتاب: (HL-1413) کیٹلاگ جلد ۱۶ (ص ۸۶) میں تفصیل موجود ہے۔

رسالۂ مکاتیب: HL-2068 کیٹلاگ جلد ۱۴ (ص ۶۳) میں تفصیل موجود ہے۔

رسالۂ مکاتیب: HL-2069 〃 〃 〃 〃

(شرح) شمس العین: HL-2070 〃 (ص ۶۵) 〃 〃

معارج کمال: HL-2075 ۱۰۱۷ھ تاریخ کتابت نہیں بلکہ سال تصنیف ہے کیٹلاگ جلد ۱۴ (ص ۶۴) میں تفصیل موجود ہے۔

منبع الانساب: HL-2077 کیٹلاگ جلد ۲۲ (ص ۶۱) میں تفصیلی بیان آچکا ہے۔

●●

مراسلات

ڈاکٹر مختار الدین احمد
سابق صدر شعبۂ عربی مسلم یونیورسٹی علیگڑھ

فرہنگ بلخی، مثنوی غلام رسول حسرت اور مولانا آزاد

• آپ نے فرہنگ بلخی، 'بہار اردو لغت' (حصۂ اوّل) کے طور سے چھاپ کر بڑا اچھا کیا۔ اس سلسلہ میں یہ اطلاع دینی ضروری ہے کہ جس زمانے میں مَیں فکر و نظر کا ایڈیٹر تھا میں نے ہی اسے لیکر پہلی بار فکر و نظر میں شائع کیا تھا پھر اس کے کچھ آف پرنٹ باقاعدہ کور کے ساتھ کتابی شکل میں ان کی خدمت میں پیش بھی کیے تھے۔ پتا نہیں اب وہ کاپی دستیاب بھی ہے یا نہیں۔

• پٹنہ کے احوال میں مثنوی غلام رسول حسرت جو آپ نے جرنل کے شمارہ: ۲۱-۲۳ میں شائع کی ہے، اس کے بارے میں بھی یہ اطلاع دینی ضروری ہے کہ یہ ایک بار پہلے بھی چھپ چکی ہے اور اسے میں نے خود مطبوعہ شکل میں دیکھا ہے مگر اب یہ بھی نایاب ہے۔ آپ نے شائع کرکے اچھا ہی کیا۔ ایک اور شعر بھی تھا جو آپ کے یہاں نہیں پایا جاتا۔

• مولانا آزاد کے جو خطوط آپ نے خطوط آزاد کے طور پر جرنل (نمبر ۱۴) میں چھاپے ہیں، بعض خط ان کی تحریر میں نہیں ہیں۔ آپ کا کیا خیال ہے؟

••

جناب سید عارف نوشاہی

ادارۂ معارف نوشاہیہ

اسلام آباد، پاکستان

گلشن راز، مثنوی اعجاز مسیحا وغیرہ کے بارے میں

خدا بخش لائبریری جرنل شمارہ ۵۰ کے صفحہ ۱۵۰ پر گلشن راز کو نذیر احمد شاہ مودودی چشتی سے منسوب کیا گیا ہے۔ دیگر تمام شواہد سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ محمود شبستری کی تصنیف ہے۔ عتیق الرحمٰن صاحب اس پر دوبارہ غور فرمائیں۔

صفحہ ۱۵۴ پر مثنوی اعجاز مسیحا کے ذیل میں رند تخلص پر دال شعر نظر نہیں آیا، بلکہ رونق تخلص ہی ثابت ہوتا ہے۔

صفحہ ۱۵۵ پر "کتاب زراعت" کے تحت مادہ "کتاب زراعت" کو کتاب کا تاریخی نام بتایا گیا ہے، مگر جو قطعہ تاریخ درج کیا گیا ہے، اس سے تو "کتاب زراعت پسند" واضح ہوتا ہے۔ اس سے ۱۲۱۷ھ برآمد ہوتا ہے اور یہ تاریخ کتابت ۱۲۱۰ھ کے قریب ہے۔

صفحہ ۱۵۶ پر مثنوی "ریاض المعارف" کے شاعر کا نام درج نہیں ہے۔ ریو ۲: ۷۰۷ نے مولوی علی اصغر بن عبدالصمد لکھا ہے۔

••

جناب رئیس نعمانی
ایس۔ ٹی۔ ہائی اسکول
مسلم یونیورسٹی۔ علی گڈھ

دیوان رضی آرتیمانی، مرآۃ المعانی کے بارے میں

جنرل شمارہ نمبر ۸ میں ابھی میں نے حرف ایک مضمون "خدا بخش لائبریری کے چند اہم مخطوطات" پڑھا ہے۔ اس کے متعلق چند یادداشتیں پیش خدمت ہیں:۔

۱۔ رضی آرتیمانی کے دیوان کے نسخے ہند و پاک میں بہت کم پائے جاتے ہیں، اس لئے وہ اہم چیز ہے۔ لیکن مقالہ نگار نے اس کے آخری صفحے سے جو دو شعر نقل کر کے ان کو قطعہ بتایا ہے، وہ قطعہ نہیں بلکہ رباعی ہے، اور اس رباعی کے پہلے اور تیسرے مصرعے کے شروع میں جو لفظ "این" ہے اس کو "ای" (اے) ہونا چاہیئے۔

۲۔ جمالی دہلوی کی مثنوی "مرآۃ المعانی" کم از کم دو بار چھپ چکی ہے۔ ایک بار ہندوستان میں اور ایک بار پاکستان میں۔ اس لئے اس نسخے کی کوئی خاص صفت بیان ہونا چاہیے تھی جو اس مخطوطے کی "اہمیت" کو ظاہر کرتی۔ یہ ذمہ داری مضمون نگار نے کسی کتاب کے تعارف میں بھی پوری نہیں کی ہے کہ اس کی اہمیت کی وجہ بیان کرتے۔

۳۔ "گلشن راز" کو مقالہ نگار نے سید نذیر احمد شاہ مودودی چشتی سہسوانی کا منظوم رسالہ بتایا ہے جبکہ یہ شیخ سعدالدین محمود شبستری کی مشہور زمانہ مثنوی ہے جو کم از کم تیس چالیس مرتبہ چھپ چکی ہے۔ مقالے میں اول و آخر کے جو شعر نقل کئے گئے ہیں، وہ اسی مثنوی "گلشن راز" کے ہیں۔ سید نذیر احمد نے کوئی منظوم رسالہ "گلشن راز" نام کا تصنیف نہیں کیا۔

۴۔ "مناجات جمشید جی جاماسپ" کے ذیل میں لکھا ہے کہ یہ دستور صاحب قصبہ "فرخندہ نوساری" کے باشندہ تھے۔ یہاں صرف "قصبہ نوساری" لکھنا چاہیے تھا "فرخندہ" قصبے کے نام کا جز نہیں ہے۔

۵۔ "مثنوی اعجاز مسیحا" کے ذیل میں لکھا ہے کہ شاعر نے اپنا تخلص "رند" استعمال کیا ہے، لیکن جو شعر نقل کیے ہیں ان میں شاعر کا تخلص "رند" کہیں بھی نہیں ہے۔ بلکہ "رونق" ہے۔

۶۔ "ریاض المعارف" کی تاریخ کا جو مصرع مقالے میں نقل ہوا ہے وہ غلط ہے۔ اس کو کسی اور طرح ہونا چاہیے تھا۔ علاوہ ازیں اس کتاب کو مثنوی بتایا گیا ہے، جبکہ ابتدا کے جو تین شعر نقل کیے گئے ہیں ان کا "مثنوی" سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ تینوں کسی قصیدے کی تمہید کے اشعار ہیں۔

••

فہرست مشتملات

خدا بخش لائبریری جرنل

شمارہ ۱-۵۲



خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ

خدا بخش لائبریری جرنل قاضی صاحب (قاضی عبدالودود) کے تخیل کا زائیدہ ہے۔ جب لائبریری کا نیا دور شروع ہوا تو انھوں نے مدت کی سوچی سمجھی اسکیم کو عملی جامہ پہنانے کا ارادہ کر لیا۔ ۱۹۳۶ء میں وہ "**معیار**" نکالتے تھے، ۱۹۶۲ء میں "**تحقیق**" نکالا تھا، یہ ان کے ذاتی پرچے تھے۔ خدا بخش اشاعتی منصوبے بنے تو اس میں ایک ماہی رسالہ نکالنا بھی طے ہو گیا۔

اور

۱۹۷۷ء میں خدا بخش جرنل منظر عام پر آیا۔ جرنل میں کیا کیا ہوگا کیا نہ ہوگا یہ سب کچھ قاضی صاحب کے ذہن کی اُپج تھی۔ اور آج جرنل جو کچھ ہے، اگر کچھ اچھی چیزیں ہیں تو وہ انھیں کی آوردہ ہیں، جو کچھ کم عیار ہے اس کی وجہ ہم ہیں، قاضی صاحب ہوتے تو اس کا معیار یقیناً بلند تر رہتا!

جرنل میں جو چیزیں خصوصیت کے ساتھ پیش ہوتی رہیں ان میں خدا بخش خطبات کے متن، لائبریری کے اہم مخطوطات کا تعارف، نادر نسخوں کے مکمل متون، مشاہیر کی خود نوشت تحریروں کے عکس، کمیاب رسائل کے منتخبات، اور لائبریری منصوبوں کے تحت ہونے والے کام مثلاً جنوبی ایشیائی علاقائی سمینار کی رودادیں، مشاہیر کی آپ بیتیاں، اپنے کلام کا انتخاب، خدا بخش مخطوطات کی فہرستوں کی تصحیحات، اور ضروری اضافے قابل ذکر ہیں۔ اب کہ سفر کی ایک منزل تمام ہوئی، جرنل کے مشتملات کی یکجا فہرست دیدینا نامناسب نہ ہوگا ——————— (ادارہ)

شمارہ ۱

فارسی اور ہندستان: تعارف از جناب قاضی عبدالودود (انگریزی)

غزالی شہدی و مثنوی نقش بدیع: (افسر الدولہ فیاض الدین حیدر)

فالنامہ حافظ شیرازی: مولفہ عنایت خاں راسخ

دیباچہ کلیات مرزا جان طپش دہلوی

طبقات الحنفیہ و مولفوھا (ڈاکٹر عبدالرشید)

تیج بہادر سپرد کا رسالہ کشمیر درپن (عابد رضا بیدار)

موتی لال نہرو کی ایک نادر اردو تحریر

رہبر تحقیق (قاضی عبدالودود)

تصحیح و اضافہ در دیوان رضا (قاضی عبدالودود)

ابوالکلام آزاد، گاندھی جی اور پنڈت نہرو کی خود نوشت تحریروں کے عکس

میرے والد صلاح الدین خدابخش (انگریزی)

صوفیا کے مکتوبات و ملفوظات تاریخ کا ایک اہم ماخذ (پروفیسر حسن عسکری) (انگریزی)

صفحات: ۳۲۸ قیمت ۲۵ روپے

شمارہ ۲

باغ معانی مولفہ نقش علی (تذکرہ شعراء فارسی حصہ معاصر)

شمس البیان فی مصطلحات الہندستان مولفہ مرزا جان طپش دہلوی

عصمت الانبیاءؑ: عہد ہمایونی کا ایک نادر مخطوطہ (سید ڈاکٹر محمد یوسف لیاری)

فرہنگ آصفیہ پر تبصرہ (قاضی عبدالودود)

تصحیح و اضافہ: دیوان انوری (قاضی عبدالودود)

نوادر: میر مونس کا ایک قطعہ (قاضی عبدالودود)

علی اصغر حکمت، لیاقت علی خاں، سر ظفر اللہ خاں، اے۔ کے۔ فضل الحق اور رابندر ناتھ ٹیگور کی خود نوشت تحریروں کے عکس

ایک مشرقی کتب خانہ: خدابخش لائبریری (داس اسکالٹ اوکونار) (انگریزی)

صفحات: ۲۹۴ قیمت: ۲۵ روپے

شمارہ ۳

مجمع النفائس مولفہ سراج الدین علی خاں آرزو (حصہ معاصر)

دیوان گرامی شاملو (قاضی عبدالودود)

رسالہ الشعاعات للکندی (ڈاکٹر مختار الدین احمد)

تصحیح و اضافہ: فہرست مخطوطات اردو جلد ۱ (جناب قاضی عبدالودود)

فرہنگ آصفیہ پر تبصرہ ۲ —— (قاضی عبدالودود)

ڈاکٹر ذاکر حسین، سیدنا طاہر سیف الدین، سیدنا برہان الدین، ہمایوں کبیر اور شانتی کبیر کی خود نوشت تحریروں کے عکس

صوفی لٹریچر پر طائرانہ نظر (ڈاکٹر بروس بی لارنس) (انگریزی)

خدابخش: ہندستانی بوڈلے (سر جادو ناتھ سرکار) (انگریزی)

صفحات: ۲۱۰ قیمت: ۲۵ روپے

شمارہ ۴

میری تنقید: ایک باز دید (پروفیسر کلیم الدین احمد)

رسالہ ادیب فیروز آباد: ایک جائزہ (ڈاکٹر عابد رضا بیدار)

مراسلہ دربارۂ مکتوب ابوالکلام آزاد (جناب محمد یونس خالدی)

تصحیح و اضافہ: دیوان حافظ (قاضی عبدالودود)

مطبوعات جدیدہ: فرہنگ آصفیہ پر تبصرہ ۳ (قاضی عبدالودود)

سی۔ وی۔ رمن، جگدیش چندر بوس، جان سائمن اور
مارٹیمر دھیلر کی خودنوشت تحریریں

اسلامی تقویم کی تشکیل نو (انگریزی) (ڈاکٹر ہاشم امیر علی)

صفحات : ۱۸۰ قیمت : ۲۵ روپے

شمارہ ۵

مثنوی تصویر محبت : داستان رام چند (میر شمس الدین فقیر)

تنزیہ الاعتقاد عن الحلول والاتحاد للسیوطی (ڈاکٹر عبدالرشید)

دیوان نجیب جرباذقانی (قاضی عبدالودود)

توفیق کشمیری کے بارے میں (جناب محمد یوسف ٹینگ)

دیوان جمیلہ خدا بخش (ڈاکٹر حمیرا خاتون)

فالنامہ مخدوم الملک منیری

تصحیح و اضافہ : رباعیات حسن مودودی وغیرہ

تاریخہای پیدائش و وفات معاصرین (محمد سعید حسن عظیم آبادی)

فرہنگ آصفیہ پر تبصرہ ۔ ۴ (قاضی عبدالودود)

لارڈ کرزن، لارڈ لٹن، لارڈ ریڈنگ، لارڈ اروِن کی خودنوشت تحریریں

ملفوظات صوفیہ بہار (انگریزی) (ڈاکٹر سید حسن عسکری)

بوستاں کا ایک نادر نسخہ : احمد نگر کے شاہی کتاب خانے کی
یادگار (انگریزی) (ڈاکٹر ضیاء الدین احمد ڈیسائی)

صفحات : ۱۸۴ قیمت : ۲۵ روپے

شمارہ ۶

صحف ابراہیم : تذکرہ شعرا فارسی (سدۂ دوازدہم)
مولفہ علی ابراہیم خاں خلیل

دیوان نوعی خبوشانی (قاضی عبدالودود)

تصحیح و اضافہ : فالنامہ مخدوم الملک منیری (ڈاکٹر عابد رضا بیدار)

خدا بخش لائبریری کا قیام : سال اول، بانی کتابخانہ کی تحریر ۱۸۹۰ء (خدا بخش خاں)

بانی سکریٹری کی رپورٹ ۱۸۹۱ء (خدا بخش خاں)

خدا بخش لائبریری کے بارے میں چند تاثرات (شبلی نعمانی)

لارڈ منٹو، لارڈ ماونٹ بیٹن، لارڈ ویول
لارڈ لنلتھگو کی خودنوشت تحریریں۔

اسلامی کتاب خانے (انگریزی) (خدا بخش خاں)

اشارات : مخدوم بہار کی طرف منسوب ایک تصنیف
(انگریزی) : (ڈاکٹر سید حسن عسکری)

صفحات : ۲۱۰ قیمت : ۲۵ روپے

شمارہ ۷-۸

اس شمارے کے انگریزی حصے میں پروفیسر سید حسن عسکری کا مضمون گنج ارشدی شامل ہے۔ یہ ایک مورخ کے قلم سے خانوادہ جون پور کے ملفوظات کا جائزہ ہے جس سے تاریخی اور تہذیبی اہمیت کے اہم نتائج اخذ کیے گئے ہیں۔ یہ ملفوظاتی سلسلے کی ایک ضخیم دستاویز ہے جو ہنوز غیر مطبوعہ ہے۔

اردو حصے میں الہ آباد کے مشہور اور تاریخ ساز پرچے ادیب کی چار سالہ عمر کے مکمل فائل کا ایک ہمہ جہتی انتخاب پیش کیا گیا ہے جس میں ادبی، علمی، تہذیبی، لسانی حتی کہ ہر نوعیت کے سارے اہم مضامین کا احاطہ کر لیا گیا ہے۔ اس میں درج ذیل مشاہیر کے مضامین ہیں :

درخشاں لکھنوی، صولت لکھنوی، نظم طباطبائی، تسلیم، جلال لکھنوی، شبلی، ذکاء اللہ، شرر، سید احمد دہلوی، نظام الدین حسن، سید علی بلگرامی، غالب، نظیر اکبر آبادی، اکبر الہ آبادی، سرور جہان آبادی، میر بادشاہ علی بقا

کمال (پسر جلال لکھنوی)، جوالا پرشاد برق، اختر جودھپوری (پسر عزیز مرزا)، کرامت حسین، بی ایم مالاباری، مسٹر اکبر حیدری، نلنی کانت چٹو پادھیائے، سروجنی نائیڈو، ٹیگور، راجہ رام موہن رائے، مدن موہن مالویہ، تلسی داس، نول کشور، ساتھ ہی اس شمارے میں ندوۃ العلماء لکھنؤ، اور امپیریل لائبریری (اب نیشنل لائبریری کلکتہ) پر دو مضمون ہیں۔ منشی پریم چند کی کچھ تحریریں اور کچھ غیر معروف کہانیاں شامل ہیں۔ اردو زبان اور ارد و پریس کے بارے میں قابل ذکر مضامین ہیں — ان سبھوں کے علاوہ مشاہیر کی چالیس نادر تصویریں ہیں۔

صفحات ۴۲۴

قیمت : ۵۰ روپے

شمارہ ۹

اس شمارے کے انگریزی حصے میں پروفیسر سید حسن عسکری نے مخدوم بہار حضرت شرف الدین احمد یحییٰ منیری کے مکتوبات صدی، عہد سلطنت کے گنے چنے میں مخطوطات میں نمایاں حیثیت رکھنے والے ایک اہم نسخے کا تعارف کرایا ہے۔ جس پر ان کے مرید خاص حضرت شمس بلخی کے حواشی ہیں۔ پروفیسر عسکری نے ان حواشی کا تفصیلی جائزہ لیا ہے۔ حضرت شمس بلخی کے وارثوں کے کلکشن میں یہ نسخہ محفوظ ہے۔

اردو حصے میں عظیم آباد (بہار) اور ہندستان کے بارے میں علم و ادب کے مشہور تاریخ گو مولانا محمد سعید حسرت کے قطعات تاریخی کو ان کی کتاب سے اخذ کر کے پیش کیا گیا ہے۔ صفحات ۱۴۴ قیمت : ۲۵ روپے

شمارہ ۱۰-۱۱

اس شمارے میں لکھنؤ کے مشہور قوم پرست شاعر پنڈت برج نرائن چکبست کے تاریخی رسالہ "صبح امید" کا ایک انتخاب پیش کیا گیا ہے۔ جس میں درج ذیل مضامین ہیں:

پریم چند کے افسانے: روے سیاہ، آب حیات، بعد از مرگ۔

پریم چند کا مضمون: جمہور فلاطون

منظومات و غزلیات: نظر لکھنوی، قمر گیاوی، سید سلیمان ندوی۔

تذکرۂ شعراء: حضرت مشتاق (نظر لکھنوی) و فا رامپوری (حسرت موہانی) اقبال، ازل، کلام جوش ملیح آبادی

یاران طریقت کی یاد (نظر لکھنوی)

ادبی مباحث: ادب الکاتب و الشاعر (علی حیدر طباطبائی)

ستی اور تحریک (ادیب لکھنوی، محقق لکھنوی)

اردو میں انگریزی الفاظ۔

زبان و ادب: ہماری زبان، (لاجپت رائے)

اردو کا مستقبل (ابو الخیر مودودی)

مذاق ادب کی قومی کشش (تیج بہادر سپرو)

قومی تعلیم (لاجپت رائے)

مذاہب: ہندو مت، بودھ مت (شبیر حسن مارہروی)

سیاسیات: سوراج (آنند)، سلف ڈٹرمنیشن (تیج بہادر سپرو)

ہندستان میں جمہوریت کا آغاز (جے۔ آر۔ رائے)

مہاتما گاندھی اور ان کی تعلیم (عبدالماجد دریابادی)

مذہب اور وطن پرستی (بشیر حسین زیدی)

ہند کا افلاس کیونکر دور ہو (جے۔ آر۔ رائے)

نئی دنیا (لاجپت رائے)، سرکار سے قطع تعلق (کول)، شورش پنجاب (کول)، پنجاب کی بد قسمتی (لاجپت رائے)، شورش پنجاب و ما بعد (پنجابی)، پرانا دکھڑا (رشی)، کانگریس کا کچا چٹھا (رشی)، آئینی اصلاحات ہند (سپرد)، مساوات کا مسئلہ۔ مشرق اوسط: مسئلہ مصر (عبدالرزاق ندوی)، مصر انگریزی احتلال سے پہلے (ابوالخیر مودودی)، عراق کے بارے میں۔ انقلاب اور تحریکیں: فلسفۂ انقلاب (مطلب حسین)، سوشلزم (کول)، بولشیوزم (مورخ)، سویٹ روس (کول)، انقلاب روس (کول)

تہذیب و ادب: اورنگ زیب عالمگیر کے بارے میں (چکبست) اورنگ زیب عالمگیر پر چکبست کی تحریر کے جواب میں (اسلم) (دلگیر) سلطنت اودھ میں ہندوؤں کا حصہ (سلیمان ندوی)، ابوالاعلیٰ مودودی کے ایک مضمون کے بارے میں (ایڈیٹر)، مولانا ابوالکلام آزاد اور لفظ تظلّم کا استعمال

صفحات : ۴۸۸ قیمت : ۵۰ روپے

شمارہ ۱۲

شمارے میں دوسرے مضامین کے علاوہ خدا بخش لائبریری میں محفوظ کلام سلمان ساؤجی کے دو مخطوطات پر ڈاکٹر نذیر احمد اور ڈاکٹر امیر حسن کے مضامین اور ڈاکٹر نذیر احمد کا نتیجہ خیز مضمون "مخطوطہ شناسی میں املائی خواص کی اہمیت" نیز قاضی عبدالودود کا مضمون 'دیوان دلی مرتبہ گارساں دتاسی' قابل ذکر ہیں۔ اس جرنل میں چکبست کے رسالے 'صبح امید' کا مکمل تعارف بھی شامل ہے۔

صفحات : ۱۱۲ قیمت : ۲۵ روپے

شمارہ ۱۳-۱۴-۱۵

یہ جرنل پیارے لال شاکر کے ماہنامہ 'العصر' کے اٹھاون شماروں کا انتخاب ہے جو 'العصر' کی پانچ سالہ زندگی (مارچ ۱۳ تا دسمبر ۱۷) پر پھیلا ہوا ہے۔ اس انتخاب میں تین تحریریں 'العصر' کے تعارف کے طور پر، بتیس مشاہیر کی نادر عکسی تصویریں، نو مشاہیر کی تحریریں (ابوالکلام آزاد، عبداللہ عمادی، ندرت میرٹھی، رشید احمد صدیقی، عبدالماجد دریابادی، شرر، نادر کاکوروی، حالی اور اقبال)، سولہ مشاہیر پر گیارہ تفصیلی مضامین اور چھ نظمیں، پندرہ مضامین اور تین نظمیں اردو زبان کے مسائل پر، پانچ تحریریں غالب کے بارے میں، چار مضامین اسلام، ہندومت اور پارسی مت کے تحت علمی و فنی ترقیوں پر، تین مضامین علوم و فنون پر، تین تاریخ ہند پر، پانچ الیتے، پانچ مضامین مذہبی عقائد و افکار پر اور سب سے اہم اور قابل ذکر امر یہ کہ اٹھارہ مضامین فلسفہ و سائنس اور صنعت و حرفت پر ہیں۔

صفحات : ۶۰۰ قیمت : ۷،۵ روپے

شمارہ ۱۶

تدوین متن پر سمینار کے مقالات اور بحث: مقالہ نگار: قاضی عبدالودود، رشید حسن خاں، ڈاکٹر تنویر احمد علوی، ڈاکٹر نیر مسعود، پروفیسر سید حسن اور ڈاکٹر عابد رضا بیدار۔

اہم سے غیر اہم کی تمیز، صحت متن، تصحیح متن کے طریقے قیاسی تصحیح، متن کی تحقیق و ترتیب، منشائے مصنف کا تعین، تدوین متن اور طبع موزوں۔

صلاح الدین خدابخش انگریزی (ڈاکٹر سچدانند سنہا، پروفیسر ولفرید کینٹول اسمتھ، پروفیسر ڈی۔ ایس مارگولیوتھ و ادارہ)

صفحات ۱۳۶ + ۱۵ قیمت: ۲۵ روپے

شمارہ ۱۷ ۱۸

یہ شمارہ مشہور محقق قاضی عبدالودود کے ماہنامہ معیار (پٹنہ) کے مکمل فائل کی عکسی اشاعت ہے جو ۱۹۳۶ء میں چھ ماہ نکلنے کے بعد اسی سال بند ہو گیا۔ اس میں افسانے بھی ہیں نظمیں بھی (غزلیں بالکل نہیں)، تنقیدی مضامین بھی ہیں تحقیقی بھی۔ نصف سے زیادہ قاضی صاحب کی اپنی تحریریں ہیں یا جواب سے تقریباً نصف صدی قبل کی اہم دستاویز کے طور سے دلچسپی سے پڑھی جائیں گی۔ "معیار" کا متن چار سو صفحات پر مشتمل ہے اور اس کا تفصیلی اشاریہ اور تعارفی گفتگو مزید آٹھ صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔

اب سے تقریباً نصف صدی قبل قاضی صاحب کا تحقیقی معیار کیا تھا جس نے اردو کا تحقیقی معیار متعین کرنے میں غیر معمولی رول ادا کیا ہے، معیار کے اس فائل کی اشاعت سے اس کا بخوبی اندازہ ہو سکے گا۔ اس کے لکھنے والوں میں قاضی صاحب کے علاوہ جن کے قلم سے اس کا نصف سے زیادہ حصہ ہے اس عہد کے مشاہیر مولوی عبدالحق، ڈاکٹر نظام الدین، ڈاکٹر عبدالستار صدیقی، ڈاکٹر عندلیب شادانی اور ڈاکٹر راجندر پرشاد کے علاوہ بہار کے مشہور لکھنے والے آرزو جلیلی، سید حسن، یوسف بلخی، حسن عسکری وغیرہ شامل ہیں۔ معیار کا خصوصی فیچر، ہمعصر جرائد میں چھپی ہوئی اہم تحریروں کا تذکرہ اور ان پر تبصرہ قابل ذکر ہے۔

صفحات: ۴۱۰ قیمت: ۵۰ روپے

شمارہ ۱۹

ذاکر صاحب۔ ذاتی یادیں (ڈاکٹر مسعود حسین خاں، خورشید عالم خاں، بیگم صالحہ عابد حسین، عبداللطیف اعظمی، بیگم انیس قدوائی)۔

مشاہیر کی محسن کتابیں

خدابخش لائبریری کے چند اہم و نادر مخطوطات (حکیم محمد عمران خاں)

غالب، یاس یگانہ اور حسرت عظیم آبادی۔

تصحیح و اضافہ: خدابخش لائبریری کے عربی و فارسی مخطوطات کی فہرست مجمل کے چند اغلاط۔

(حکیم وسیم اعظمی، عابد رضا بیدار، جناب محبوب حسین)

مراسلات: عنایت خاں راسخ کے سلسلے میں (احمد یوسف)

تدوین متن کے مسائل کے بارے میں (رشید حسن خاں)

" " " (رئیس نعمانی)

قمر گیاوی (وغیرہ) کے بارے میں (ڈاکٹر کلیم سہسرامی)

رسالہ ادیب کے بارے میں (مسرت حسین آزاد)

غزلیات سلمان ساوجی: استدراک کے بارے میں (محمد عمر سیفی)

علم کا مقام اور اہل علم کی ذمہ داریاں (سید ابوالحسن علی ندوی)

تبصرہ: فرہنگ آصفیہ۔ ۵ (قاضی عبدالودود)

ملک ہیو اور ان کا عہد (انگریزی): (پروفیسر سید حسن عسکری)

صفحات: ۱۳۶ قیمت: ۲۵ روپے

شمارہ ۲۰

کنز تواریخ (شاہ محمد یحییٰ عظیم آبادی)

کچھ دساتیر کے بارے میں (قاضی عبدالودود)

سلمان ساوجی کی کچھ اور غیر مطبوعہ غزلیں (پروفیسر امیر حسن عابدی)

غیر مطبوعہ سلمان ساوجی کہاں تک غیر مطبوعہ ہے (ڈاکٹر عابد رضا بیدار)

خدابخش لائبریری میں قسطا بن لوقا البعلبکی کے مخطوطات (وسیم احمد اعظمی)، مراسلہ: محسن کتابوں وغیرہ کے بارے میں (رئیس نعمانی)، تصحیح و اضافہ: مسامحات مرآۃ العلوم جلد سوم (پروفیسر سید عطاء الرحمٰن عطا کاکوی)

مسامحات مفتاح الکنوز (ڈاکٹر محمد عتیق الرحمٰن)

چودھویں صدی ہجری کی تکمیل پر چند خیالات (انگریزی) (بدر الدین طیب جی)

صفحات: ۱۳۰

قیمت: ۲۵ روپے

شمارہ ۲۱ - ۲۳

دیوان موبد: (موبد عظیم آبادی)

فصیح الدین بلخی: (احمد یوسف)

خدابخش لائبریری میں ابن سینا کے مخطوطات (وسیم احمد اعظمی)

ابن سینا کی تالیفات کے بارے میں ایک سوال (ادارہ)

مسامحات مرآۃ العلوم جلد اوّل (پروفیسر سید شاہ عطاء الرحمٰن عطا کاکوی)

مراسلات / راستہ لاک: مولانا ابوالکلام آزاد کے خط کے بارے میں۔

مثنوی خواب حسرت عرف پٹنہ کی کہانی { اعلام رسول حسرت عظیم آبادی (م: ۱۹۶۱ء)

ذاکر صاحب - ذاتی یادیں (ڈاکٹر برکات احمد حسین سید)

ڈاکٹر ریاض الرحمٰن شیروانی، اشتیاق محمد خاں، امان اللہ خاں شیروانی، ڈاکٹر سید عبدالمجید شمس، سید بہاؤالدین احمد، سید انصاری، حکیم عبدالاحد، اونل ڈے، حکیم ظل الرحمٰن، نقی احمد ارشاد، عتاب صدیقی، سید محمد احمد، سید ریاض الرحمٰن، انوار کریم، ڈاکٹر مسعود الحق، سید علی عباس، حسن احمد قادری، سید احمد علی آزاد، ڈاکٹر رشید الوحیدی، سلانند منڈل، حکیم اشرف کریم، شاہد رام نگری، محبوب الرحمٰن اکمل یزدانی، شاہ منظر حسین)۔

فکر اسلامی بدلتی دنیا میں (انگریزی) (پروفیسر ضیاء الدین)

فارسی ادبیات میں ہندوستان کا حصہ: } (پروفیسر سید جدید تحقیقات کی روشنی میں (انگریزی) } امیر حسن عابدی)

زین بدر عربی (انگریزی) (پروفیسر سید حسن عسکری)

صفحات: ۴۳۲

قیمت: ۷۵ روپے

شمارہ ۲۴

دیوان رضا عظیم آبادی (قاضی عبدالودود)

ملا شاہ کی تفسیر قرآن اور عربی کلام (سید شاہ محمد اسمٰعیل)

مطبوعات ابن سینا (حکیم سید ظل الرحمٰن)

حضرت نصر پھلواروی (حافظ رضوان اللہ آروی)

انتخاب از بیاض محمد بخش مرحوم (محبوب حسین)

مراسلات: محسن کتابوں کے بارے میں (ضیاء الدین اصلاحی)

حسن بیبھوی کے بارے میں (پروفیسر شاہ عطاء الرحمن عطا کاکوی)

صفحات: ۱۳۰ قیمت: ۷٫۵ روپے

شمارہ ۲۵

محمد حسین آزاد بحیثیت محقق (قاضی عبدالودود)

غزلیات صفیر بلگرامی (ڈاکٹر محمد عتیق الرحمن)

شاہ ولی اللہ دہلوی کے مخطوطات: خدا بخش لائبریری میں (ڈاکٹر سلیم الدین احمد)

تصحیح و اضافہ: مسامحات مرآۃ العلوم جلد سوم (پروفیسر شاہ عطاء الرحمن عطا کاکوی)

مراسلہ: علی ابراہیم خاں کے بارے میں ("نواب زادہ" سید وارث اسمٰعیل)

مطبوعات جدیدہ: "شش ماہی" افکار علیگڑھ (ایڈیٹر ابوالکلام قاسمی)

بے نام (کلام سرشار صدیقی)

مراسلہ: محسن کتابوں کے بارے میں (اختر راہی)

صفحات: ۱۲۲ قیمت: ۲۵ روپے

شمارہ ۲۶-۲۷

جدید غزل گو، ۱۹۴۱ء کی ایک دستاویز، نیاز فتحپوری کے نگار ۱۹۴۱ء کا عکسی ایڈیشن، ۱۹۴۱ء تک کے غزلگو شعرا کے خود انتخاب کردہ کلام پر مشتمل ایک نادر دستاویز شعرا کی تصاویر، تاریخ وفات اور خود نوشت تحریروں کے اضافے کے ساتھ۔ (۴۳ اہم غزلگو شعرا: آرزو لکھنوی، آسی الدنی، اثر لکھنوی، احسان دانش، علی اختر اختر، اختر شیرانی، امید امیٹھوی، بیخود دہلوی، تاجور نجیب آبادی، ثاقب لکھنوی، جلیل مانک پوری، جگر مراد آبادی، جوش ملیح آبادی، حسرت موہانی، حفیظ جالندھری، دل شاہجہانپوری، روش صدیقی، پنڈت امرناتھ ساحر دہلوی، سیماب اکبرآبادی، فانی بدایونی، فراق گورکھپوری، پنڈت برج موہن دتاتریا کیفی، تلوک چند محروم، آنند نرائن ملا، ناطق گلاوٹھوی، ناطق لکھنوی، نوح ناروی، وحشت کلکتوی، یگانہ چنگیزی، آزاد انصاری، افسر میرٹھی، سائل دہلوی، صفی لکھنوی)۔

صفحات: ۳۳۸ قیمت: ۵۰ روپے

شمارہ ۲۸

بہار اردو لغت / فرہنگ بلخی (سید یوسف الدین احمد بلخی)

یلدرم کے مضمون کا ترجمہ / آزادی سے قبل کی ہندی کا ایک اہم نمونہ (ڈاکٹر رضوان احمد خاں)

آصفیہ لائبریری کے عربی و فارسی اور اردو مخطوطات (جناب مصطفیٰ کمال ہاشمی)

نئی کتابیں: خاندان صادق پور کا ایک تیرہ سالہ جینیس شاعر اعجاز حسن (نقش اعجاز)

تصحیح و اضافہ: مسامحات مرآۃ العلوم جلد سوم قسط ۲: (پروفیسر شاہ عطاء الرحمن عطا کاکوی، فضیل احمد قادری)

مسامحات مفتاح الکنوز جلد سوم (سید شاہ محمد اسمٰعیل)

مراسلہ: خدا بخش لائبریری جرنل شمارہ ۲۰ کے بارے میں (عبدالشاہد خاں شیروانی)

صحیح الآثار: مختصر شرح معانی الآثار (شیخ محمد عوامہ)

صفحات: ۱۴۴ قیمت: ۲۵ روپے

شمارہ ۲۹-۳۱

طب سیمنار: عربی، فارسی مخطوطات پر پہلا جنوبی ایشیائی علاقائی سیمنار، خطبہ صدارت کے (حکیم عبدالحمید)

خدابخش لائبریری کے اہم اور نادر طبی مخطوطات (سید شاہ محمد اسمٰعیل)

علی گڑھ کے نادر طبی مخطوطات (حکیم سید ظل الرحمٰن)

ذخیرہ برکاتی: پاکستان کے دو نادر طبی مخطوطے (حکیم محمود احمد برکاتی)

نیشنل میوزیم پاکستان میں طب کے نادر طبی مخطوطے (پروفیسر قمر آسانی خاں)

ہندوستان کے کتب خانوں میں مخطوطات طب (فارسی، عربی) مع اشاریہ مصنفین

پاکستان کے کتب خانوں میں غیر مطبوعہ طبی مخطوطات (احمد منزوی)

پاکستان کے کتب خانوں اور ذاتی ذخیروں میں اہم طبی نوادر (حکیم محمود احمد برکاتی)

ٹمل الیٹ (انگریزی) (پروفیسر آصف فیضی)

ادیان کے مابین مفاہمتی مکالمہ (ڈاکٹر طاہری گردلیس)

مصوری کا تاج محل: خدابخش لائبریری کا ایک نادر مغل مخطوطہ۔ صفحات: ۲۳۶ قیمت: ۷۵ روپے

شمارہ ۳۲

رام چند فرحت عظیم آبادی (پروفیسر سید شاہ عطاء الرحمٰن)

اکتفاء القنوع بما ہو مطبوع (ڈاکٹر عتیق الرحمٰن)

ملا علی قاری اور ان کی طبقات الحنفیہ (ڈاکٹر سلیم الدین احمد)

دستور الاعلام اور اس کا مولف: ایک جائزہ (محمد عارف)

مولوی عبدالحق کا ماخذ (ڈاکٹر وہاج الدین علوی)

مراسلات: یلدرم کے بارے میں (پروفیسر قرۃ العین حیدر) بہار اردو لغت کے بارے میں (خورشید احمد خاں، جناب رشید حسن خاں)۔

مساہمتی مرآۃ العلوم جلد ۱۲ (پروفیسر سید شاہ عطاء الرحمٰن عطا کاکوی)

تزک جہانگیری (انگریزی) ترجمہ ڈیوڈ پرائس

صفحات: ۱۸۳ قیمت: ۲۵ روپے

شمارہ ۳۳-۳۵

امیر مینائی کی "انتخاب یادگار" کے بعد اب تک رامپور کے مشاہیر اور روہیلوں کی تہذیبی تاریخ کے سلسلہ میں تنہا اہم ماخذ تذکرہ کاملان رامپور، مرتبہ حافظ احمد علی خاں شوق کی عکسی اشاعت، جس میں تقریباً ۵۲۱ مشاہیر رامپور کا تذکرہ ہے۔ اہم توضیحات اور ضروری تصحیح و اضافہ کے ساتھ ایک اہم اور نادر پیشکش۔ پروفیسر سید حسن عسکری کا انگریزی مقالہ "مکتوبات صدی" نظر بازگشت۔

صفحات: ۵۹۴ قیمت: ۷۵ روپے

شمارہ ۳۶

اردو غزل: ۱۹۴۰ء کے شعراء کے تناظر میں — ایک تجزیہ، نیاز فتحپوری کے نگار کے غزلگو شعراء نمبر پر تبصرہ کے طور سے نگار کا ایک اور نمبر شائع ہوا تھا جس میں پروفیسر کلیم الدین احمد، پروفیسر آل احمد سرور، پروفیسر مجنوں گورکھپوری، ڈاکٹر تاثیر اور نیاز فتحپوری کے تبصرے شائع ہوئے تھے۔ نگار کے اس نمبر کی عکسی اشاعت جس میں ۱۹۴۱ء - ۱۹۸۵ء تک کی اردو شاعری پر بھی ڈاکٹر عابد رضا بیدار کا ایک بھرپور

مقالہ شامل ہے۔ ترکی کے ڈاکٹر ایرکن ترکمان کا خدابخش توسیعی خطبہ "سجاد حیدر یلدرم کے اردو تراجم: ایک تقابلی مطالعہ"

صفحات: ۱۶۰ قیمت: ۷۵ روپے

شمارہ ۳۷-۳۹

ہندستانی مسلمان عصری دستاویزات کے آئینے میں

جلد اول: علی گڑھ تحریک ۱۸۷۰ء-۱۹۸۵ء۔

سرسید کی اہم تحریریں۔ مولانا ابوالکلام آزاد کی دو اہم تاریخی تحریریں۔ تہذیب الاخلاق (عہد جدید) اہم ترین اداریے (قاضی معزالدین احمد)۔ ہندستانی مسلمانوں کے مسائل (سید حامد کے ۴۵ مضامین) علی گڑھ کے ۲۵ زائیدہ اساتذہ و مفکرین کے ۸۰-۱۹۸۵ء کے دوران لکھی گئی ۲۵ اہم تحریریں (لکھنے والے ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی، جناب محمد یونس قاضی، جناب محمد مجتبیٰ صدیقی، پروفیسر مسعود حسین خاں، پروفیسر ایم وائی انصاری، ڈاکٹر وارث کرمانی، جناب اشتیاق محمد خاں، جناب احمد رشید شیروانی، جناب بدرالدین طیب جی، ڈاکٹر طاصفر عباس، ڈاکٹر ضیاالدین انصاری، ڈاکٹر اطہر پرویز، نواب زادہ ابن سعید خاں، پروفیسر نسیم انصاری، پروفیسر ریاض الرحمٰن شیروانی، پروفیسر آل احمد سرور، جناب سید ہاشم علی، ڈاکٹر اخلاق الرحمٰن قدوائی اور دوسرے)۔

صفحات: ۵۱۷ قیمت: ۷۵ روپے

شمارہ ۴۰

کیمیائے سعادت (نسخہ بانکی پور): خودنوشت غزالی کے دواعیے پر تحقیق اور انتقاد (جناب ابوسعادت جلیلی)

خدابخش لائبریری میں اہم مہریں (ڈاکٹر عتیق الرحمٰن)

خلیل: تلامذہ آتش میں ایک اہم نام (جناب محبوب اقبال)

تصحیح و اضافہ: مراۃ العلوم جلد سوم کے مسامحات یا (پروفیسر عطاء الرحمٰن عطا کاکوی)

چندا بائی ماہ لقا کی تحریر (جناب فرخ جلالی)

علوم اسلامیہ (انگریزی) (ڈاکٹر محمد زبیر صدیقی)

اردو پر ترکی زبان کے اثرات (انگریزی) (ڈاکٹر ایرکن ترکمان)

صفحات: ۱۵۸ قیمت: ۲۵ روپے

شمارہ ۴۱-۴۳

خوشتر منگرولی کے ماہنامہ زبان (۱۹۲۶ء-۱۹۲۸ء) کی مکمل عکسی اشاعت (تفصیلی اشاریہ کے اضافے کے ساتھ) اسلام، تاریخ ہند، تاریخ و تنقید زبان و ادبیات اردو، ناولٹ، طویل افسانے، مختصر افسانے، نکات ملارموزی، نظمیں، غزلیں، رباعیات، مکاتیب مشاہیر، تذکرہ مشاہیر، تصاویر مشاہیر، تذکرہ رسائل، تذکرہ کتب، اخبار علمیہ جیسے موضوعات پر نو سو صفحات پر پھیلی ہوئی تحریروں کا قیمتی مرقع۔

صفحات: ۹۰۶ قیمت: ۷۵ روپے

شمارہ ۴۴

خدابخش خطبہ: مرزا عبدالقادر بیدل (پروفیسر شاہ عطاء الرحمٰن کاکوی)

پہیلیاں (ڈاکٹر محمد انصار اللہ)

لفظ اردو کا مطلب اور تاریخی پس منظر (ڈاکٹر ایرکن ترکمان)

اللباب ہدیۃ للاصحاب (ڈاکٹر رضوان الدین خاں)

مکتوبات احمد سرہندی کا احمد منیری کے سے غلط انتساب } (جناب عبید محمد انصاری)

تصحیح و اضافہ : تذکرہ کاملان رامپور (جناب کلب علی خاں فائق)

تحائف موصولہ : مقتدرہ قومی زبان (اسلام آباد) کے کارنامے

اسلام اور ہندستانی تہذیب (انگریزی) جناب بی۔ این پانڈے

صفحات : ۱۵۰ قیمت : ۲۵ روپے

شمارہ ۴۵

علی گڈھ کے نادر طبی مخطوطات (حکیم سید ظل الرحمن)

محمد بن زکریا رازی کی کتاب الفاخر (حکیم محمد زماں حسینی)

مسائل حنین ابن اسحاق (حکیم صیانت اللہ)

رسالہ فی المعالجات لابن بیطار (حکیم اسرار الحق)

الکناش المنصوری (حکیم محمد اشرف کریم)

فروق الامراض (حکیم محمد اشرف کریم)

کتاب المنصوری اور الاسباب و العلامات (حکیم سید علی حیدر جعفری)

فصول فیض اللہ خانی (حکیم حسین خاں شفا)

رسالہ ارسطاطالیس : ایک تعارف (حکیم وسیم احمد اعظمی)

تحریم الدفن : جالینوس کا ایک نادر مخطوطہ } (حکیم سید محمد شجاع الدین حسین ہمدانی)

نجیب الدین سمرقندی کے مخطوطات (جناب سید محمد احمد)

ادویہ تریاقیہ پر ایک نادر مخطوطہ (حکیم علیم الدین بلخی)

امان اللہ خاں فیروز جنگ کی طبی تالیفات } (جناب سید ریاض علی پرواز)

مجموعۂ ضیائی (جناب عبد الحیی فاروقی)

کتاب الشجر (حکیم خالد جاوید شمسی)

حکیم علوی خاں کی تالیفات کا تحقیقی جائزہ (جناب نظام الدین احمد عظمی)

اختیارات قطب شاہی (حکیم شفقت اعظمی)

تلخیص الطب : بارہویں صدی کا ایک اہم مخطوطہ (حکیم عبد النور بیگ)

معالجات البقراطیہ (ڈاکٹر سکندر حسین)

کتاب التصریف : فن جراحت پر ایک معرکہ آرا تصنیف } (ڈاکٹر احمد عبد الحیی)

صیانت اللہ کلکشن کے اہم مخطوطات (حکیم صیانت اللہ)

دار العلوم دیوبند کے اہم طبی مخطوطات کا تعارف (حکیم سید ایوب علی)

" " (ڈاکٹر نعیم احمد خاں)

" " (حکیم سید ظل الرحمن)

کتب خانہ دار العلوم دیوبند کے اہم طبی مخطوطات (جناب محمد ظفیر الدین)

کتب خانہ ناصریہ لکھنؤ کے چند اہم طبی مخطوطات } (ڈاکٹر کاظم علی خاں)

جلالی کلکشن کے چند نادر طبی مخطوطات (پروفیسر حکیم سید محمد کمال الدین حسین ہمدانی)

آصفیہ کے مخطوطات (جناب میر کرامت علی)

ٹونک کے چند مخطوطات کا تعارف (جناب قاضی الاسلام)

ذخیرۂ ٹونک کے چند طبی مخطوطات (جناب منظور الحسن برکاتی)

ٹونک کے طبی نوادر (حکیم محمد عمران خان)

ٹونک کے کچھ مخطوطات (جناب محمود فیاض)

مدراس کے کچھ اہم مخطوطات علم طب میں (ڈاکٹر سید حمید اشرف)

دار العلوم ندوۃ العلماء کے طبی مخطوطات (جناب یٰسین نعمانی)

سالار جنگ میوزیم: نادر طبی مخطوطات (حکیم سید خورشید علی)

مولانا آزاد لائبریری میں علم طب پر چند مخطوطات } (جناب محمود حسن قیصر)

سنٹرل بوٹانیکل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ لکھنؤ میں اہم طبی مخطوطات } (حکیم محمد احسان نگرامی)

طبی مخطوطات مخزونہ خانقاہ ابوالخیر (ڈاکٹر تنویر احمد علوی)

ذخیرہ سہسرام (حکیم انیس الزماں)

" (حکیم محمد ابراہیم خاں سعیدی)

اورینٹل لائبریری حیدرآباد میں اہم طبی عربی مخطوطات } (ڈاکٹر معین الدین اعظمی)

مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ کے طبی مخطوطات } (پروفیسر محمود حسن رضوی)

ہمدرد انسٹی ٹیوٹ کے چند اہم طبی مخطوطات } (جناب اے حبیب خاں)

طبیہ کالج دہلی کے اہم طبی مخطوطات (ڈاکٹر ملک محمد ادریس خلیل اللہ)

" (جناب محمود فیاض)

صفحات: ۴۲۰ قیمت: ۲۵ روپے

شمارہ ۴۶

رقعات رشید صدیقی بنام پروفیسر مسعود حسین (۹۰ خطوط)

حیدرآباد اور اردو لغت (جناب حسن الدین احمد)

یونس امرہ: ترکی کے سب سے پہلے صوفی شاعر (ڈاکٹر ایرکن ترکمان)

ایک نادر جنتری (جناب سید شاہ محمد اسمٰعیل)

تبصرہ: اردو انٹرنیشنل (کناڈا)

اقبال ریویو اقبالیات (لاہور)

خدابخش توسیعی خطبہ: اسلام کے معاشی نظام کا تصور } (پروفیسر جمال خواجہ)

صفحات: ۳۷۸ قیمت: ۲۵ روپے

شمارہ ۴۷

آثار آزاد: مولانا ابوالکلام آزاد کے اوائل عمر کی خود نوشت تحریریں } (پروفیسر سید قدرت اللہ فاطمی)

حیدرآباد کا پرانا نام بھاگ نگر افسانہ یا حقیقت } (ڈاکٹر نذیر احمد)

ضمیمہ ۱ قصہ بھاگمتی (ڈاکٹر میر نجم الدین علی خاں)

ضمیمہ ۲ افسانہ بھاگمتی (انگریزی) (پروفیسر ہارون خاں شیروانی)

شمالی ہند میں اردو زبان کا آغاز اور ابتدائی ارتقا: دستیاب متون کے حوالے سے } (ڈاکٹر مرزا خلیل احمد بیگ)

گلدستۂ عبدالوہاب عالمگیر: ایک جائزہ (ڈاکٹر عتیق النساء)

سجاد حیدر یلدرم اور ان کے ترکی تراجم (ڈاکٹر ایرکن ترکمان)

قند پارسی (جناب رئیس احمد نعمانی)

کتاب المنصوری اور اس کے تراجم (حکیم وسیم احمد اعظمی)

"القانون فی الطب" کی گمشدہ جلدیں (حکیم محمد احسان نگرامی)

"القانون فی الطب" کی دستیاب جلدیں (ڈاکٹر سلیم الدین احمد)

مراسلہ: خدابخش لائبریری کے چند عربی و فارسی مخطوطات کے بارے میں } (ڈاکٹر زبیر قریشی)

فہرست مخطوطات اردو: مفتی الٰہی بخش اکیڈمی کاندھلہ (جناب نور الحسن راشد)

ایلیٹ بحیثیت مورخ (انگریزی) (پروفیسر سید حسن عسکری)

صفحات : ۲۵۰ قیمت : ۲۵ روپے

شمارہ ۴۸

درود مسعود: خودنوشت سوانح عمری (پروفیسر مسعود حسین)
نئی تعلیمی پالیسی اور ہندستانی مسلمان (جناب سید حامد)
ذاکر صاحب: چند یادیں (جناب سید شہزاد حیدر)
ذاکر صاحب: میرے استاد (ڈاکٹر محمد اکرام خاں)
رشید صاحب اور ذاکر صاحب (ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید)
ذاکر صاحب کی جامعہ میں (جناب قیوم خضر)
شرح حال و آثار و سبک شعر ملا ساطع کشمیری (ڈاکٹر صدیق نیاز مند)
طب یونانی اور ایلوپیتھی کا تقابلی مطالعہ (پروفیسر مقبول احمد)

صفحات : ۲۹۵ قیمت : ۲۵ روپے

شمارہ ۴۹

ہندستان میں قومی یکجہتی کی روایات (جناب بشمبر ناتھ پانڈے)
اخبار جمہور، برطانوی آمریت و استبداد سے ٹکراؤ: ایک تعارف (ڈاکٹر عابدہ سمیع الدین)
ذاکر صاحب: چند یادیں کچھ تاثرات (جناب نواب رحمت اللہ خاں شیروانی)
میر کی غیر مطبوعہ مثنویات (جناب ریاض الرحمٰن قدوائی)
سخنوران فارسی ہند بعد از دکتر اقبال (جناب رئیس احمد نعمانی)
دیوان سید علی ہمدانی کا نسخہ خدابخش (ڈاکٹر محمد عتیق الرحمٰن)
قرآن کی چودہ قرآتیں (جناب عمید الدین پھلواروی)
مراسلہ، ریشی نامہ کے بارے میں (جناب عبدالحمید راتھر)
خدابخش لائبریری میں محفوظ یوروپی زبانوں کی مطبوعہ کتابیں پہلی جنگ عظیم تک (انگریزی) (ادارہ)
خدابخش توسیعی خطبات از جناب علی اشرف: (انگریزی)
۱۔ مذہب اور سماجی اختلافات
۲۔ برصغیر میں قانون اسلامی اور فکر اسلامی کا ارتقا
۳۔ وہابی تحریک اور انگریز

صفحات : ۲۷۲ قیمت : ۲۵ روپے

شمارہ ۵۰

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کی پہلی تصنیف: پنڈت مدن موہن مالویہ: حالات زندگی (ادارہ)
اردو میں ترکی الفاظ (ڈاکٹر ایرکن ترکمان)
ذاکر صاحب کی شخصیت میری نظر میں (پروفیسر محمد شبیر خاں)
ڈاکٹر ذاکر حسین سے میری چند ملاقاتیں (ڈاکٹر سید اقبال حسین)
ذاکر صاحب: نگہ بلند سخن دلنواز جاں پرسوز (جناب معز الدین احمد)
ذاکر صاحب: کچھ یادیں (جناب شہاب الدین دسنوی)
ذاکر صاحب: کچھ یادیں (پروفیسر شاہ عطاء الرحمٰن عطا کاکوی)
خدابخش لائبریری کے چند اہم مخطوطات (ڈاکٹر عتیق الرحمٰن)
القانون فی الطب کے گمشدہ مشمولات کی تلاش (حکیم سید محمد حسان نگرامی)
سخنوران فارسی ہند بعد از دکتر اقبال (جناب رئیس احمد نعمانی)
اسلام اور مسلمان عہد وسطیٰ کے ہندستان میں (انگریزی) (پروفیسر سید حسن عسکری)

صفحات : ۳۱۸ قیمت : ۲۵ روپے

جرنل ۵۲ - ۵۱

••

مطبوعات خدابخش لائبریری، پٹنہ

۱۔ خدابخش: خدابخش لائبریری کے بانی کی ایک مختصر مگر جامع سوانح از سر جدوناتھ سرکار اور صلاح الدین خدابخش (انگریزی) 20-00

۲۔ منصوری کا تاج محل: خدابخش لائبریری میں محفوظ عہد جہانگیر کے ایک نادر مخطوطہ "تاریخ خاندان تیموریہ" کا تعارف اور نمونہ کی ۱۲ رنگین تصاویر۔ (انگریزی) 15-00

۳۔ مجموعہ مقالات پروفیسر سید حسن عسکری، پہلی جلد، گنج ارشدیٰ شرف الدین یحییٰ منیری، زین بدر عربی اور دیگر پر مضامین (انگریزی) 10-00

۴۔ تدوین متن کے مسائل: خدابخش سیمینار کے مقالات اور مباحثے (اردو) 15-00

۵۔ پنڈت موتی لال نہرو کا خطبہ صدارت: انڈین نیشنل کانگریس کی یو پی کی پہلی صوبائی کانفرنس (۱۹۰۷) میں: ایک اہم دستاویز (انگریزی) 10-00

۶۔ فرہنگ آصفیہ (مولفہ سید احمد دہلوی) پر تبصرہ عظیم محقق قاضی عبدالودود کے قلم سے (اردو) 10-00

۷۔ بہار اردو لغت جلد اول: فرہنگ از یوسف الدین احمد بلخی (م ۱۹۹۱) بہار میں عام طور پر بولے جانے والے الفاظ اور محاورات کی ایک اہم لغت (اردو) 15-00

۸۔ امیر خسرو بحیثیت مورخ — از پروفیسر حسن عسکری (انگریزی) 25-00

۹۔ ہندستانی مسلمانوں کے مسائل: از سید حامد 30-00

۱۰۔ طب اسلامی: جنوبی ایشیائی علاقائی سیمینار: روداد و مقالات 50-00

۱۱۔ رقعات رشید صدیقی: از ڈاکٹر مسعود حسین 30-00

۱۲۔ قومی یکجہتی کی روایت: از بی۔ این۔ پانڈے 5-00

۱۳۔ مولانا آزاد کی یاد میں: (ہندی) 15-00

۱۴۔ سجاد حیدر یلدرم: از ایرگن ترکمان 10-00

۱۵۔ آثار آزاد: خطوط آزاد بنام رگھو عظیم آبادی، از نعیت اللہ ہاشمی 30-00

۱۶۔ ہندستانی مسلمان عصری دستاویزات کے آئینہ میں 50-00

• ترتیب و تدوین

۱۷۔ مجمع النفائس از سراج الدین علی خان آرزو (م۔ ۱۱۶۹ھ): بارہویں صدی ہجری کے فارسی شعرا کا ایک اہم تذکرہ (فارسی) 15-00

۱۸۔ باغ معانی از نقش علی (م ۱۱۴۳ھ): بارہویں صدی ہجری کے فارسی شعرا کا دوسرا اہم تذکرہ (فارسی) 10-00

۱۹۔ مثنوی تصویر محبت از میر شمس الدین فقیر (م ۱۱۸۳ھ): عظیم آبادی کی ایک داستان محبت جوہری محمد عشق کا اختراعی (فارسی) 10-00

۲۰۔ صحف ابراہیم از علی ابراہیم خان خلیل (م ۱۲۰۸ھ) بارہویں صدی ہجری کے شعرا فارسی کا تیسرا اہم تذکرہ (فارسی) 10-00

۲۱۔ شمس البیان فی مصطلحات الہندوستان از مرزا جان طپش (م ۱۲۲۹ھ)، شاہ عالم کے عہد کی محاورات اردو کی لغت 10-00

۲۲۔ تاریخ ہائے پیدائش و وفات معاصران: قطعات حسرت (شمس العلماء محمد حسرت عظیم آبادی (م ۱۳۰۳ھ)) فارسی 10-00

۲۳۔ کنز تواریخ: شاہ غلام یحییٰ عظیم آبادی (م ۱۳۰۲ھ) کے قطعات تاریخی (فارسی) 10-00

۲۴۔ تذکرہ کاملان رامپور: مرتبہ حافظ احمد علی خان شوق (م ۱۹۲۲ء) (عکسی اشاعت) امیر مینائی کی "انتخاب یادگار" کے بعد ایک رامپور کے مشاہیر اور روہیلوں کی تہذیبی تاریخ کا اہم ماخذ، تقریباً ۱۳۵ مشاہیر رامپور کا تذکرہ تصحیح و اضافہ کے ساتھ (اردو) 50-00

• رسائل کے دفینوں سے اردو ادب کی بازیافت

۲۵۔ جلد اول، ادیب الہ آباد: نوبت رائے نظر کے ماہنامہ ادیب کے مکمل فائل (۱۹۱۰–۱۹۱۳) سے ادبی، علمی، تنقیدی اور سیاسی مضامین کا انتخاب 50-00

۲۶۔ جلد دوم، العصر لکھنؤ: پیارے لال شاکر کے ماہنامہ العصر لکھنؤ (۱۹۱۳–۱۹۱۷) کے تمام و کمال شماروں کا انتخاب جس میں ادبی، علمی اور تاریخی مضامین کے علاوہ فلسفہ، سائنس اور صنعت و حرفت پر بھی مضامین شامل ہیں۔ ۴۴ مشاہیر کی نادر عکسی تصاویر کے ساتھ۔ 50-00

۲۷۔ جلد سوم، صبح امید لکھنؤ: برج نرائن چکبست کے ماہنامہ صبح امید لکھنؤ (۱۹۱۹–۱۹۲۰) کے مکمل فائل سے ادبی، علمی اور تاریخی مضامین کے علاوہ تحریک آزادی کا معاون شاید اور انقلاب روس کے ہندستان پر اثرات کی تفصیل 50-00

۲۸۔ ۱۹۳۶ میں قاضی عبدالودود کا معیار: قاضی عبدالودود کے مشہور اردو ماہنامہ معیار پٹنہ (۱۹۳۶) کے مکمل فائل کی عکسی اشاعت، ایک بھرپور تجزیاتی اشاریہ کے اضافے کے ساتھ 50-00

۲۹۔ جدید غزل گو: ۱۹۳۱ کی ایک دستاویز۔ نیاز فتح پوری کے ماہنامہ نگار (۱۹۳۲) کے خاص نمبر کی عکسی اشاعت ۱۹۳۰ تک کے غزل گو شعرا کا خود انتخاب کردہ کلام، خود نوشت سوانح، شعرا کی اسی عہد کی تصاویر اور خود نوشت تحریریں۔ 35-00

۳۰۔ جوش ملیح آبادی کا رسالہ "زبان" (۱۹۲۸–۱۹۳۶) مکمل عکسی اشاعت تفصیلی اشاریہ کے اضافے کے ساتھ، اسلام، تاریخ ہند، تنقید، زبان و ادبیات اردو جیسے موضوعات پر مقالات، نادر لٹریچر، افسانے، اپنے مکاتیب، مشاہیر کی تصاویر 50-00

• خدابخش سلسلہ خطبات

۳۱۔ عہد سلطنت (۱۲۰۶–۱۵۲۶ء) کے صوفی ادب پر ایک طائرانہ نظر: از ڈاکٹر محمد حبیب الرحمان (امریکہ) (انگریزی) 10-00

۳۲۔ عہد نبوی کی تقویم کی تشکیل نو: از ڈاکٹر ہاشم مرزا (انگریزی) 10-00

۳۳۔ صوفیہ کے مکتوبات و ملفوظات: سماجی سیاسی تاریخ کا ایک اہم ماخذ از پروفیسر سید حسن عسکری (انگریزی) 10-00

۳۴۔ اسلام کی چودہ صدیاں مکمل ہونے کی تقریب میں: ہندو مسلم مسئلہ اور اسلام و عصر جدید کے بارے میں چند خیالات از بدرالدین طیب جی۔ (انگریزی) 10-00

۳۵۔ فارسی ادبیات میں ہندستان کا حصہ: جدید تحقیقات کی روشنی میں از ڈاکٹر امیر حسن عابدی (انگریزی) 10-00

۳۶۔ فکر اسلامی: بدلتی دنیا میں از پروفیسر سید وحید الدین (انگریزی) 10-00

۳۷۔ مشرق وسطیٰ: (تحریک ازبیکا و مشرق وسطیٰ) از پروفیسر محمد آصف فیضی۔ (انگریزی) 10-00

۳۸۔ اسلامک اسٹڈیز: از ڈاکٹر زبیر صدیقی۔ (انگریزی) 10-00

۳۹۔ علیگڑھ تحریک: از سید حامد 5-00

۴۰۔ اسلام اور ہندستانی تہذیب: از بی۔ این۔ پانڈے۔ 10-00

۴۱۔ اورنگ زیب ایک نیا زاویہ نظر: از ڈاکٹر اوم پرکاش (ہندی) 15-00

ادارۃ البحوث الاسلامیہ

جامعہ سلفیہ کا یہ ادارہ تصنیف، ترجمہ اور طباعت و اشاعت کی خدمت انجام دیتا ہے۔ اس ادارہ سے عربی زبان میں ایک ماہنامہ "صوت الامۃ" اور اردو زبان میں ایک ماہنامہ "محدث" شائع ہوتا ہے۔ ان دونوں رسالوں میں دینی موضوعات کے ساتھ ساتھ علمی و ادبی موضوعات پر بھی مقالات شائع ہوتے ہیں۔ ابتک عربی ماہنامہ کے تین خاص نمبر شائع ہو چکے ہیں۔

پہلا دعوت و تعلیم کے موضوع پر، دوسرا اسلامی مدارس کے تعارف و تعاون پر اور تیسرا علوم اسلامیہ میں ہندوستانی مسلمانوں کا حصہ کے موضوع پر۔

ان رسالوں کے علاوہ مذکورہ ادارہ نے مختلف دینی و علمی موضوعات پر عربی، اردو اور انگریزی میں چھوٹی بڑی تقریباً ڈیڑھ سو کتابیں شائع کی ہیں، جن میں سب سے اہم اور دقیع کتاب "مرعاۃ المفاتیح" ہے۔ مشکاۃ المصابیح کی ابتک جو شروح منظر عام پر آچکی ہیں ان میں مرعاۃ سب سے مبسوط اور محققانہ ہے۔ اسے جامعہ سلفیہ کے صدر شیخ الحدیث علامہ عبید اللہ رحمانی نے تصنیف کیا ہے، اس کے اب تک نو حصے شائع ہوئے ہیں جن میں کتاب المناسک تک کی شرح مکمل ہو گئی ہے۔

پتہ: جامعہ سلفیہ، ریوڑی تالاب، وارانسی - ۲۲۱۰۱۰

Library. George Steeven's edition of shakespeare's play (7 vols., 1802) is one of the rarer items, and it also figures in the library. One may also find here another rare work an 18th century edition of Milton's poetical works with the famous memoir of the poet by william Hayley (3 vols., London 1794). The rare works of some long forgotten English poets, like Samuel Butler, Chatterton, Charles Churchill. william Falconer, Thomas Parnell, Robert Pollock, Henry Kirk White and Samuel Rogers, are also available. Early editions of the novels of walter scott may also be found in the stacks in neat bindings. Two of the earliest anthologies of English poems and prose done in India—by David Lester Richardson (Calcutta, 1840)—are interesting items and furnish specimens of English literary activity on the Indian soil. They also represent early Anglo-Indian writings in India. In this connection mention may also be made of some Bengali versions of Shakespeare's plays, edited by H.C. Rakshit (4 vols.). A complete set of Max Muller's works is also available in the library.

As may be evident from the illustrative references above, the English section of the Library deserves to be more widely known, and it offers research material of considerable importance and in varied fields. Scholars who visit the library will find their endeavour and expense amply rewarded.

Disraeli's **Commentaries on the Life and Reign of Charles I** (5 vols., 1828), Guirot's **History of the English Revolution of 1640**, etc. contain vital material on some important but forgotten aspects of the Caroline period. Hausser's **History of the period of Reformation** (1517-1548), Lecky's monumental treatises on European morals, Rationalism in Europe, Ireland and England are still safe guides to scholars, and are of considerable value to those interested in the sociology of literature. They are preserved in excellent condition in the Library. S.R. Gardiner's books on the Civil war and Cromwell, and complete sets of Froude's historical studies are also available. R. Knolle's classic and repeatedly updated **Turkish History** (1787-edition) and Calvert's treatise on the Moorish arts in Spain, rare in India, are also on the shelves here. The unsurpassed series of **Story of Nations** (37 vols., 1897) finds a prominent place in the library.

A large number of important English literary works, not easily available in India are also preserved here. Perhaps, the most valuable work is the complete set of 45 vols. of the **British Essayists** (1817). A compendium of eighteenth century English essays with critical and informative prefaces on each author by A. Chalmers, it is indispensable for those interested in the history and development of English prose. Only a couple of other libraries in India may claim to have this highly prized work in their Catalogue. The **Complete works of Burke** (12 vols. 1827) makes a close second. Henry Hallam's **Introduction to the Literature of Europe** (4 vols. 1860) and view of the States of Europe during the Middle Ages Smay be of special help to those interested in medieval Europe and comparative literature. There are also copies of early editions and complete works of Daniel Defoe, Jonathan Swift, De Quincey, J.S. Mill, B. Disraeli, Washington Iruing and Bret Herte which are difficult to come by elsewhere. Nineteenth century editions of Shakespeare's plays are also on the shelves. Particular mention may be made of a special limited edition of 1000 copies by H. Staunton (1881) with attractive pictorial illustrations by Sir John Gilbert· (The library's copy is numbered 355). The new varorium edition by Horace Howard Furness is also one of the scarce titles in India, and it is available in the Khuda Bakhsh

The library possesses a number of rare books on a variety of subjects. M. F. Guicciardini's Latin history of Italy, published in venica in 1565, is the oldest printed book in the library. Pocockio's French translation of Abul Faraj's history of the world **Tarikh-e-Mukhtasarul Duval** printed at Oxford in 1663 is yet another rare and prized possession.

The English translation of Abbe De Guyon's history of the East Indies (London, 1757) is also a rare book, and provides glimpses of the westerners' interest in the exotic east in the eighteenth century that manifested itself in creative literature as well. Numerous travelogues of European authors, missionaries and travellers deepened the west's interest in India, and Edward Terry's journeys through the Mughal kingdom present a typical record of this interest, and its 1777 edition may be consulted in the library. Many early editions of the translations of books in oriental languges into English also figure prominently in the library's holdings. One may get some idea of them from the following :

Sachan's translation of Al-Beruni's travels; Jonathan Scott's version of **Tarikh-e-Ferishta** (1794), M. Raymond's translation of **Seir-ul-Mutakhkhirin** (Culcutta, 1789), the English rendering of Sharafuddin Ali's book on Tamerlain (1723), and Paul Chamberlen's **Persian Anecdotes** (London, 1730) translated from Madame De Gomez's memoirs in French of the Persian court.

British history is well represented, and only a few scarce, but memorable and informative works ars mentioned here in order to suggest their quality and variety. J. Ashton's **Social Life in the Reign of Queen Anne** (1882) is based on contemporary records, and is still of considerable value to students of eighteenth century English literature. Similarly, G. Brodie's **History of the British Empire** incorporating a critical appraisal of Hume's critique of English government (1822) is useful alike to students of history, political science and Augustan literature. G. Buchanan's **History of Scotland** (translated into English by James Aikman, 1827), Cassell's nine-volume **Illustrated History of England** (1873),

Prof. Masoodul Hasan
Deptt. of English
Aligarh Muslim University

European Books in Khuda Bakhsh Library

Recognised as a research centre and institution of national importance, the Khuda Bakhsh Oriental Public Library (Patna) is well known for its holdings in oriental languages, particularly Arabic, persian and Urdu. It also possesses a veritable treasure of manuscripts in these languages some of which are unique in nature and of remarkable literary and historical importance. The Library also owns a large number of paintings and art-pieces. It has served as an unfailing and inspiring quarry to generations of literateurs and antiquarians for more than eight decades. But it is a pity that the library's books in European languges, fairly respectable in number, have generally escaped the attention of literary scholars and researchers for want of proper publicity.

Paucity of basic and secondary materials continues to plague and hamper researches in humanities and social sciences in India. Indeed, the recent spart in research activity as an academic professional requirement has further aggravated the situation, and magnified the desideratum. It is, therefore, all the more regrettable that even rich existing and easily identifiable resources have remained unused, or, at least, underutilised. This brief introductory note is intended to bring the European section of the Khuda Bakhsh Library's English holdings to a wider circle of likely users. Research minded scholars of English may even find some of these materials not only useful, but perhaps indispensable for their pursuits.

Errata

Page / Line	incorrect	correct
6 / 1	indepen-dence	independence
15 / 3	Library	library
18 / 12	All /	all /
19 / 27	assistance for	assistance from
20 / 1	cration	creation
22 / 1	Though	Through
25 / 37	sbook	book
26 / 11	titles in a	titles a
27 / 5	in	is
28 / 3	achiving	achieving
28 / 7	acticity	activity
28 / 15	love	Love
29 / 3	Publishing	publishing in

Section 6 - Books, Journals and Copyright, New Delhi, Information Industry Publications,1986.

11. CHEMICALS AND ALLIED PRODUCTS EXPORT PROMOTION COUNCIL (CAPEXIL), **India in World Wisdom,** New Delhi, 1986.
12. P.S.BHATTI, (Ed.),**Indian Publishing - Then and Now,**New Delhi, S.Chand and Company (Pvt.Ltd.)1987.
13. D.RAGHAVAN, **An Introduction to Book Publishing,** New Delhi, Institute of Book Publishing,1988.
14. H.L.N.BHARATI, **An Introduction to Indian Textual Criticism and Modern Book Publishing,** Mysore, Central Institute of Indian Languages, 1988.
15. RAJA RAMMOHUN ROY NATIONAL EDUCATIONAL RESOURCES CENTRE, **Indian Book Industry and Trade - A Select Bibliography,** (1975-1985), Department of Education, New Delhi, 1987.

***

FURTHER READING

There are not many books published in India on Publishing and Book Promotion. A select list of some recent titles, published, in India since 1980, is given below:

1. D.N.MALHOTRA & NARENDRA KUMAR (Ed.), **Indian Publishing since Independence,** New Delhi, The Bookman's Club, 1980.
2. VINOD KUMAR (Ed.), **Book Industry in India-Problems and Prospects:** Silver Jubilee Volume, New Delhi, Federation of Publishers and Book- sellers Associations in India, 1980.
3. K.S.DUGGAL,**Book Publishing in India,** New Delhi, Marwah Publications, 1980.
4. NATIONAL BOOK TRUST, **Educational Publishing in Developing Countries,** Proceedings of an International Seminar, New Delhi, 1980.
5. NATIONAL BOOK TRUST, **A History of Publishing and Printing in India,**New Delhi, 1982.
6. FEDERATION OF INDIAN PUBLISHERS, **Private and Public Sector in Educational Publishing,**New Delhi, 1983.
7. SAMUEL ISRAEL, **A Career in Book Publishing,** New Delhi,National Book Trust,1983.
8. ABUL HASAN, **Promoting Books in India--Some Aspects,**Mysore,Prasaranga (University of Mysore), 1984.
9. SITESH ALOKE, **Study of Book Industry - Small Publishers,** New Delhi, National Council of Applied Economic Research, 1985.
10. B. M. GUPTA, B. GUHA, T. N. RAJAN, R.SATYANARAYANA & M.L.SAINI (Ed.), **Handbook of Libraries, Archives and Information Centers in India,** Volume 2,

Book Policy share a common concern for book promotion in the country. There is an urgent need for translation of policy parameters into a set of action-oriented strategies for achiving the desired goals.

The contemporary book scene in India is a mosaic springing from a rich cultural heritage and a vibrant, many-sided creative acticity in depth. The Indian book industry is an emerging gaint with much to offer the rest of the world. The essential ferment of the Indian book was summed up by the former Minister of Human Resource Development, Shri P.V.Narasimha Rao in these words:

"The most distinguishing characteristic of the Indian literary tradition, or, for that matter, of any branch of Indian thought, is, in one word, Dharma .... it means righteousness, moral rectitude, the legal system, religion and a host of other things. Within its compass come love, Compassion, Tolerance, Humanism, Peace, Beauty and Harmony as a whole and the acceptance of the whole world as one brotherhood................." Speech delivered on the opening of the 38th Frankfurt Book Fair, 30th September 1986, page 6.

NATIONAL BOOK POLICY AND THE NEW EDUCATION POLICY

The New Education Policy, approved by parliament in May 1986, lays down the policy perspective for book development in the following words: "The availability of books at low prices in indispensable for the people's education. An effort will be made to assure easy access to book for all segments of the population. Measures will be taken to improve the quality of books, to promote the reading habit and to encourage creative writing. Author's interests will be protected. Good translations of foreign books into Indian languages will be supported. Special attention will be paid to the production of the quality books for childern, including textbooks and workbooks.

Together with the development of books, a nation-wide movement for the improvement of existing libraries and the establishment of new ones will be taken up. Provision will be made in all educational institutions for library facilities and improvement of the status of librarians."

Another milestone in book promotion was the drafting of a National Book Policy by a Working Group set up by the National Book Development Council. A special meeting of the Council was convened to discuss the draft policy at length and the finalised document was submitted by the Council to government in 1986. The Book Policy makes wide-ranging recommendations relating to, among other things, production of quality literature at all levels of education particularly in Indian languages, provision of equal opportunities in the matter of accessibility to books, promotion of the reading habit specially among children, association of private publishers with the publication of school textbooks, establishment of a Book Finance Corporation to make easy loans available to book publishers, setting up of an Institute of Training and Research in Book Publishing and the establishment of a national organisation of authors on cooperative basis. It is hoped the government would take a decision on the book policy document without further delay so as to provide approved guidelines to the book industry and to those responsible for the implementation of the accepted recommendations. The New Education Policy and the National

fulfilled its avowed task of advising government on some of the basic issues which had a bearing on the promotion of the book industry and trade in India and focussed the attention of all concerned on the significant role that books must play in national development.

After the expiry of its second term, the Board was allowed to lapse in 1974 for non-professional resons. Meanwhile the book industry acquired many new dimensions and a need was felt for producing and promoting books for certain special categories of readers such as the rural masses. Problems like non-availability of paper at resonable prices and escalating cost of production, dumping of remaindered titles in a disorganised distribution system, absence of a declared national book policy and non-availability of regular training facilities for the book personnel continued to receive government's attention when in February 1982, while inaugurating the fifth New Delhi World Book Fair, the then Prime Minister Mrs.Indira Gandhi urged the reconstitution of the National Book Development Board to meet crucial challenges in the book field. In order to give a fresh look to the book industry, the government set up a National Book Development Council with additional functions and a pragmatic structure. An important function of the Council was to draft a natioanl book policy which served the interests of all segments of the Indian book industry including the reader.

India occupies a unique position in the Third World with a full-fledged mechanism for a coherent and systematic book development programme. A seprate Book Promotion and Copyright Divison has been functioning since 1966 as a wing of the Deparetment of Education to organise book promotion at the national level. The Division has since expanded considerably and now comprises, besides the Copyright Office and an International Copyright cell, an Import Unit, an Export Promotion Unit, a reference library of university level books published in India and a couple of other sections. The Book promotion Division works in close collaboration with the Indian book industry and is in constant touch with the professional associations of authors, publishers and booksellers.

Similarly, most Anglo-phone African countries suffer from acute shortage of foreign exchange which is a great obstacle in their buying our books particularly on scientific and technical disciplines. The National Book Trust's subsidised university level books and the NCERT's model textbooks at the secondary and senior secondary levels on non-sensitive subjects like Mathematics, English and Science can have a wide market in these countries not only because of their low prices but also their suitability to the developing world. What is required is government initiative to work out possible ways and means, if necessary, at the diplomatic level to provide a wide exposure to these books and to overcome obstacles relating to fiscal transactions. Books are not merely a trade commodity, but ambassadors of our culture and purveyors of our ideas and values. There is a genuine need for Indian books all over, which is yet to be converted into an effective demand if we should really achieve the export target of Rs.1000 million by 1990 and 5000 million by the close of the century.

Book Promotion

India has been quite active in the field of book promotion - a concept which is only two decades old. In response to a call from Unesco, India was among the first developing countries to set up a National Book Development Board in 1967 to lay down guidelines for the development of the national book industry on sound lines. Acting as a high level central advisory body to spearhead book development activities, the Board provided a national forum for continued consultations between the government and the industry and identified the vital areas of book development in the country. The book promotion measures taken as a result of the Board'srecommendations include 20 per cent tax concession to all book publishers for 15 years, integration of book publishing into the university curriculum, organisation of seminars and training courses for the book industry personnel, reduction in postal rates for registered VP book packets, surveys of the Indian book industry and trade, supply of paper at a concessional rate for printing text books, updating of the Indian National Bibliography and compilation and release of list of selected titles, rationalisation of book imports and expansion of sbook exports. The Book Development Board thus

contemporary scene. Indian publishing is still very active in these traditional fields. But it has much more to offer, particularly to the English-knowing reader.

India is increasingly producing books on development studies particularly in social and economic planning, international studies and relations specially of neighbouring countries and of the West, South and Southeast Asia, and on researches and re-examination of its history and the freedom movement.

India has always been on the world's tourist itinerary. Today's tourists are eager to have literature giving them the background of what they are going to see or giving them a deeper understanding of the places they have seen and the people they have met. There is a growing number of publication in English on India's historical monuments, history, music, dancing and painting.

Because of its vitality and originality, the contemporary literature in Indian languages is in demand in the form of translation in industrialised countries and in original by a large number of immigrants of Indian origin settled abroad. Again, about 90 universities outside India are teaching Hindi and many have chairs in Sanskrit and in modern Indian languages. Books in Hindi, Urdu, Bengali, Punjabi, Sindhi and Tamil are also in sizeable demand in our neighbouring countries.

An important field of activity with export potential is the reprinting by a number of Indian reprint houses of some of the classics of Indology by Indian and foreign authors which have long been out of print. These are usually brought out in facsimile editions and are meeting the needs of libraries and individual scholars in both India and abroad.

A very fertile region which has remained untapped so far is East Europe where there is a tremendous feeling for Indian culture and traditions. Indian books can sell in the region like a hot cake if only there was no shortage of foreign exchange with the countries of the region. To counter this situation, arrangements should be made on governmental level to effect payment for the purchase of books in local currencies of the region.

import our books on scientific and technical subjects. The phenomenal increase in our export has been due largely to the export promotion efforts and incentives provided by government and the systematic manner in which our publishers and distributors have been promoting the sale of Indian books abroad. Today India participates through the National Book Trust in almost all important international book fairs held in Frankfurt, Moscow, London, Singapore etc. besides organising special exhibitions and fairs of Indian Books in several countries in cooperation with the Indian Missions abroad. The NBT has itself a programme of hosting World Book Fairs in New Delhi on a biennial basis, the latest being the Eighth World Book Fair mounted in February 1988. A number of market surveys have been undertaken and publications brought out to boost the export of Indian books. With the adoption of the International Standard Book Numbering (ISBN) System, which is being operated by Raja Rammohun Roy National Educational Resources Centre since 1985, the export of books from India is bound to have a shot in the arm.

The export incentives granted include 25 per cent of export value as import replenishment licences, an excise drawback in cash on paper, cloth and board used in exported books and 8 per cent cash subsidy on realisation of export invoices. The Market Development Fund of the Ministry of Commerce also underwrites travel expenses on approved journeys undertaken by book publishers to explore foreign markets of Indian books. There are other services and facilities provided to book exporters (over 300 in number) by the Chemical and Allied Products Export Promotion Council (CAPEXIL) through its Books and Publications Panel serviced by a specially created Book Division.

Catering to the World Market

While there has been a visible change in the attitude towards our books abroad, the impression still persisits in many quarters in the West that there is need to turn to Indian books only for what used to be called "Orientalia"– books on India's classical heritage, its mythology and philosophy and, at the most, on its history and languages, perhaps an occasional book on its tribes and its people or on Yoga, palmistry or astrology; hardly ever for books on the

Though sample and statistical surveys, the Documentation and Statistical Analysis Wing of Raja Rammohun Roy National Educational Resources Centre undertakes the study and analysis of books of various disciplines imported in India with a view to assisting the government in the formulation of a rational and meaningful book import policy. The Wing has brought out many qualitative and quantitative reports. In one of the sample surveys related to titles of which 1000 copies or more were imported, it was revealed that over 60 per cent of foreign exchange was spent on fiction while books on science and technology accounted for 35 per cent value only.

The following table indicates the value of international trade in books from 1980-81 to 1986-87:

International Trade in Books (1980-81 to 1986-87)

Year	Value of import of books (Rupees in million)	Value of export of books (Rupees in million)
1980-81	140.00	80.00
1981-82	162.00	100.00
1982-83	170.00	150.00
1983-84	284.00	200.00
1984-85	300.00	220.00
1985-86	430.00	240.00
1986-87 (Estimated)	500.00	260.00

In the matter of exports Indian books reach out to more than 80 countries of the world and the value of export of publications has increased almost ten-fold from Rs. 27.90 million in 1975-76 to Rs. 260 million in 1986-87. About half of our export are to the Asian and Arab countries, while the UK and the USA account for nearly a quarter of exports. The countries which have a sizeable population of Indian origin also import books and magazines in Indian languages. While the developed countries buy our books mostly on Indology, Fine Arts, Culture, History, Archaeology and Yoga and on current topics of general interest, the developing ones generally

Copyright protection, if it is to be real and effective, must cross national frontiers. If the protection is accorded only at the national level, authors will be deprived of the benefits accruing from the use of their works in other countries. India is a signatory to both the international copyright conventions viz. the Berne Convention for the Protection of Literary and Artistic works of the World Intellectual Property Organisation (1958 Brussels Text) and the Universal Copyright Convention of Unesco including the Paris Revision of 1971 whereby a compromise has been reached to protect the rights of the author and at the same time afford the developing countries an easy access to books written and published in the industrialised countries under certain conditions. Works of Indian nationals therefore get copyright protection in other countries which are members of one or both Conventions. Reciprocally, works originating from member countries enjoy the same protection in India as is accorded to the works of Indian authors.

Imports and Exports

In keeping with the spirit of free flow of information and knowledge India has always had a liberal book import policy. There has never been any censorship or customs duty on the import of books. For the last ten years the import of educational, scientific and technical books is allowed under the Open General Licence, while other categories of publications such as fiction and children's books are subject to licensing which again is not too rigid. However, the misuse of O.G.L. facilities for importing remaindered titles in large quantities is affecting indigenous publishing adversely, and no practicable solution has been worked out as yet to the problem of indiscriminate flow of unessential material.

In order to encourage reprinting/translation rather than imports, the import policy does not allow, without the specific permission of the Education Department, import of more than 1000 copies of a single title by a single importer during a financial year. Re-export of books imported is prohibited, so also the import of unauthorised editions of foreign reprints. Import of publications containing pornographic material, or depicting sex and violence is also not allowed.

of intellectual crations in literary, artistic and musical domains and to provide secretariat for the Copyright Board which is a quasi-judicial body to settle disputes arising out of the registration of copyright.

The Indian Copyright Act has been amended twice recently. The first amendment was made in 1983 with the main objective of making foreign books available at reasonable prices through compulsory licensing so as to meet expeditiously India's educational requirements for scientific and technical books published abroad. The other important objective was to make additional provisions to safeguard the rights of the Indian authors. By virtue of this amendment the Copyright Board can give permission to the copyright owner to revoke his agreement if the terms of assignment are "harsh" to him or if the publisher unduly delays the publication of the work or the payment of royalties. The authors can now go before the Copyright Board in their disputes with publishers for inexpensive summary decisions of their cases.

Close on the heels of the first amendment, the second amendment to the copyright law was introduced in 1984 with the main objective of curbing piracy. There were reports that about 400 to 500 Indian and foreign titles were being pirated in India every year and the loss to government in tax evasion alone amounted to about Rs.10,000 in each printed title besides loss of remuneration to the authors, artists and designers. An important feature of the 1984 amendment is to increase the punishment for copyright infringement and to further enhance the penalty on second and subsequent convictions. Thus, instead of the punishment on the first conviction being imprisonment for a term extending to one year, or with fine or with both, the punishment has now been incereased to a period of imprisonment for not less than six months up to three years and to fine of not less than Rs.50,000 up to Rs.2,00,000. In other words, it is now mandatory to impose a minimum imprisonment of six moinths and a minimum fine of Rs.50,000 at the time of first conviction. Another salient feature of the amendment is that piracy has now been declared a cognizable and non-bailable offence. Another safeguard introduced in the amendment is that the infringement of copyright has been declared an economic offence so that the period of limitation provided in the law will not be applicable to this offence.

royalties accruing from the writings of national leaders after the expiry of the protection period. The idea is not to allow such works to fall into the public domain but to use the earnings after the protection period for the betterment of the writing community. Since the writer lays the foundation of any publishing activity, every possible step should be taken by government and society to promote the rights of authors not only on the economic front but also in respect of cultural and social services.

There are a few professional associations of writers in India. The strongest of them with an all India character is the Authors Guild of India founded in 1974 to promote and protect the professional and economic interests of Indian authors. The Guild has a membership of over 1200 authors spread to almost every language and region of the country. With its headquarters in New Delhi the Guild has established chapters in about half a dozen major towns of India. The Author's Guild also brings out a quarterly journal entitled "The Indian Author". It has been active in establishing liaison with the Federation of Indian Publishers through its Good Offices Committee which settles cases of disputes between authors and publishers. The Guild has also formulated a model contract for the use of authors vis-a-vis publishers. Other activities of the Guild include exchange of writers delegations with several countries, helping member writers in arranging translation of their works and in having their manuscripts evaluated for purposes of publishing, acting as literary agents between writers and publishers and helping in the designing of university courses in Creative Writing. With financial assistance for the Union Department of Education, the Guild organises its annual conventions where the problems of authors are discussed and remedial measures suggested.

Copyright

India has a domestic copyright law and the Indian Copyright Act 1957 protects original literary, dramatic, musical and artistic works, cinematographic films and gramophone records. The general term of copyright is for the life time of the author and a period of 50 years after his death. There is a Copyright Office in the Department of Education of the Ministry of Human Resource Development whose main functions are to register original works

federations of publishers and booksellers also looking after the professional interest of their members at the national level. The senior most among them is the Federation of Publishers and Booksellers Associations in India established in 1953. Another federation of publishers that was set up twenty years later is the Federation of Indian Publishers which is affiliated with the International Publishers Association and acts as its regional office for South Asia. The FIP will be hosting the next global meeting of publishers (the 24th IPA Congress) in New Delhi in 1992. Then there is an All India Hindi Publishers Association (Akhil Bhartiya Hindi Prakashak Sangh), which was founded in 1954 and has on its roll members from all the Hindi-speaking States. All these All India associations are headquartered at New Delhi

Indigenous Authorship

Indigenous authorship is under-developed in India and like their counterpart anywhere very few authors survive solely on their royalties. This is not because of any lack of talent since the country abounds in intellectual creativity. The real problem is to integrate indigenous authorship into the economic circuit of publishing and to ensure a wide audience to authors particularly in local languages. Some contemporary Indian authors writing in English are being published abroad and some outstanding creative writers in Indian languages have begun to be translated and published in European languages.

Although the working conditions of the Indian author leave something to be desired, there is a lot of improvement after the country attained independence. The national government has taken some positive steps to identify and encourage creative writing and to raise the status of the Indian author. Apart from a number of cash awards granted to different categories of writers every year, workshops and camps are being organised regularly for authors and translators for mutual exchange of ideas and experiences resulting in the improvement of their efficiency. The Indian law also provides some tax concessions to authors. The recent amendments to the copyright law have further safeguarded the interests of authors. In a national seminar held recently a suggestion has been made to create a fund for the benefit of authors out of the

literary works in Indian languages. The Akademi brings out informative material regarding literary activities in Indian languages, and also arranges translations and publication of the Indian as well as foreign classics into Indian languages to meet the cultural and literary needs of a multi-lingual society. An important project of the Sahitya Akademi is the compilation of a detailed Encyclopaedia of Indian literature with the help of over 1000 writers of 25 Indian languages.

There are many other semi-government and autonomous publishing organisations which along with the government publishing houses are really engaged in those ventures which fulfil a great national need. They add volume and variety to the Indian publishing scence. The growth of literacy and readership through government publications helps to create markets for general books and thus promotes a healthy climate for the entire book industry.

Despite nationalisation of school textbooks – the bread and butter of any book industry – the private sector has been playing a significant role in the publishing field. Many new vistas are opening up for the Indian book industry which can take a big leap before the turn of the century. Although book publishing is regarded to be a small-scale industry in financial terms, the private sector in cooperation with government has even today placed the Indian book industry on the world map of book publishing. The factors that will be helpful to the publishing industry in the near future include the growing literacy rate, the New Education Policy and the launching of the National Literacy Mission. The Indian publisher is keeping abreast of the latest development in the book production technology. Desktop Publishing and the use of computer in writing and editing are already visible in select publishing and printing houses. Since these devices have emanated from the West, where there is shortage of manpower and where time element plays the key role, the Indian publisher has to be careful while adopting these techniques which would be beneficial only for certain types of publications.

Publishers and booksellers in various languages in the State have their own special situations which can best be handed by them collectively. As a result, several local book industry associations have been formed, at least one in each State. There are

scholarly material for which the private sector will have neither the resources nor an adequate margin of profit to provide any incentives. Yet, these publications are an essential requisite to expedite the development process in the country.

Besides educational and research materials, the public sector brings out informative literature on government policies and programmes. These publications are not merely restricted to statistics and reporting about developments and current problems, but extend to imparting to the citizens and to the world outside a genuine understanding about India – the land and the people, art and architecture, history and culture, philosophy and traditions, politics and economics.

A case in point is the Publications Division of the Ministry of Information and Broadcasting, which is the largest publishing wing in the public sector. It has seven major series including the "Collected Works of Mahatma Gandhi" and reference works. The Publication Division has so far brought out over 6000 titles in English, Hindi and various Indian languages. Besides marketing its publications through stockists/agents with retail outlets, the Division has set up book emporia in the State Capitals where most of the public sector publications are available under one roof.

The National Book Trust is also an important autonomous publishing house which was set up in 1957 with the dual objective of producing good reading material of general interest at low prices and promoting bookmindedness among the people. The Trust seeks to fill the gaps in Indian publishing by bringing out books in modern Indian languages and in English on subjects which are not normally taken up by the private sector. The Trust also organises book industry seminars and book fairs at both national and international levels. It has drawn up an ambitious plan for the expansion of its publishing and book promotion activities.

In this connection mention should also be made of the valuable contribution made by another autonomous body – the Sahitya Akademi – for the promotion of creative literature in Indian languages. Apart from its excellent literary publications, the Akademi gives cash awards every year to outstanding authors of

supplementary reading in schools. Considering the large size of our school-going children (about 120 million), there is a great scope for expansion in this area with adequate Library support and such cost-saving devices as co-publication and multi-lingual publishing. Attention need also be given to the publication of relevant books for our tiny-tots whose first exposure to books is often comics and cartoons published abroad. Good Indian literature for pre-primary school children is lacking which contributes substantially to the lack of reading habit in India. A popular series of children's comic books with meaningful contents is Amar Chitra Katha devoted mainly to Indian mythology and history. Published by an education trust of Bombay, the series has since established itself throughout India and abroad.

The growth of juvenile literature in India has been sporadic because there is no official agency in the country for the promotion of children's books systematickally. Government is therefore considering a proposal to set up a central organisation to act as the nodal agency for the development of children's literature which should be responsible not only for creating and translating children's books but also for planning, coordinating, monitoring and aiding publication of children's books covering all languages of the country including tribal literature.

Public and Private Sectors

The Indian book industry has a large, complex structure. According to an old estimate, there were about 11,200 publishers in India including about 1300 author-publishers. Besides nearly 1000 government organisations and semi-government/autonomous bodies were publishing books. However, a recent survey of the Indian books industry reveals that there are about 3000 active publishers. Of these, about 100 large firms publish 50 or more titles a year; about 200 medium publishers 10 to 49 titles and 2700 small publishers less than 10 titles a year.

About 40 per cent of the publishing activity in India is in the hands of the public sector. Apart from publishing nationalised textbooks, a major contribution of government is to publish or to provide subsidy for the publication of research mongraphs and

designing which can make the book equally attractive even in black and white.

The National Book Trust is another State-sponsored agency operating a couple of laudable projects for the production of good children's literature. Under its Nehru Bal Pustakalaya Scheme, children's books with a uniform content and a uniform low price are published in 12 Indian languages. So far about 1200 titles including translations have been brought out under the series, covering subjects like biographies, mythology, sports, classics, fiction. Another useful series published by the Trust is the Young India Library designed for young adults covering records of heroism and sacrifices in the life of our people and also development in science and technology. The Trust also took the initive of mounting the first National Children's Book Fair in Calcutta in 1983.

The most promient publisher of children's books in India is the Children's Book Trust set up in 1963 as a private organisation devoted exclusively to produce and promote children's literature. Since its inception the CBT has brought out about 500 titles in English and half-a-dozen Indian languages. Some of these publications have been reprinted/translated in foreign countries including the USA and the USSR. Moderately priced, the publications are based on folklore, Indian mythology, legend and fantasy, history, romance and mystery. The Trust has instituted cash awards for outstanding manuscripts of children's books. It also bring out a children's magazine. A pioneering effort of the Trust was to mount an International Children's Book Fair in 1979 – the International Year of the Child which was the first ever display of its kind in the country and to synchronise it with the compilation and publication of a comprehensive bibliography of children's books published in India in all languages including English. At its instance an Association of Writers and Illustrators of Children's Books has been formed to promote children's literature in the country. The Association brings out its own journal which contains interesting material and useful information on the subject.

Books for young people are also published by a large number of private publishers and some of these are used as texts or

So far about 800 titles have been subsidised under the scheme benefitting about 1,000 authors and 300 publishers at an approximate cost of Rs. 30 million. Another scheme of the Trust extends financial assistance for the production of core books in medical sciences for use throughout the country. Under this scheme, subject specialists are commissioned to write books and they are paid preparation charges in advance in addition to the usual royalty. The Centre has also launched a massive programme to produce suitable standard books in Hindi and the State languages with a view to facilitating the switch-over from English to Indian languages as the medium of instruction at the university level. With substantial financial assistance from the Union government (about Rs. 150 million since 1968) about 8,000 books in various Indian languages have been produced by the State book production agencies. Under the scheme, priority is given to original writing directly linked with the syllabii content of prescribed courses, though translations/adaptations of the best books of the world are also admissible.

Children's Books

Children's books are the most important category of books after textbooks. They not only lay the foundation of reading but also cater to the largest number of readers in any country. The publication of children's books has made considerable progress in India as is evidenced by the growing tide of children's literature in several parts of India.

The Government, both at Central and State levels, has established prizes for outstanding children's books in terms of both contents and production. The National Council of Educational Research and Training has recently launced a scheme under which one hundred titles of children's books on wide-ranging subjects are to be brought out and sold at a subsidised price of Rupee one per copy. Owing to low purchasing power of the Indian parents, cost-effectiveness is an important element of our children's books. In order to make these books attractive, it is not always necessary to throw in multi-colour illustrations, which would escalate the cost of a low-print-run and take the book outside the reach of an average Indian child. What is required is original, aggresive and imaginative

continue to be dominated by the private enterprise. There cannot be two opinions about the need for a high standard of university level books and research publications as potent tools for enriching quality of life and developing human resources to meet the educational, scientific and technological requirements of a developing country. Some enterprising publishers have taken up the challenge and have been producing a large number of tertiary level books which not only compare favourably with imported books but are also tailored to the requirements of our students. The production of such books has been increasing progressively over the last two decades and India is almost self-sufficient today in specialised books at the under-graduate level.

A survey of the tertiary level books published in India since 1965 in all languages and disciplines was carried out some years back to identify the gaps that had to be filled up in indigenous books. A reference collection of these titles is being maintained and updated by Raja Rammohun Roy National Education Resources Centre, New Delhi (a branch of the Central Department of Education) for the benefit of Indian students, scholars and publishers. The Centre brings out up to date supplements of these titles periodically, arranges on-the-spot evaluation of these books and organises their exhibitions at the university campuses.

Motivated by the desire to develop indigenous authorship of the university level books, government has launched a number of schemes to subsidise the writing and production of these books. Under a scheme launched by the University Grants Commission in 1970-71 subsidies are provided to scholars in Indian universities, colleges and other institutions of higher learning to prepare manuscripts of high quality who are also granted sabbatical leave for the purpose. The National Book Trust also operates a scheme of subsidising the publication of Indian-authored university level books and diploma level technical books in English, Hindi and other Indian languages. The objective is to encourage indigenous authorship and to make available books of acceptable standard at reasonable prices. The scheme provides funds in the form of production subsidy to publishers and liberal royalties to authors. The scheme neutralises the impact of low cost editions by foreign authors either being reprinted in India or imported in large qualities.

constant improvement in their quality for effective competion in the international market.

While recognising the importance of English as a major language of all-India communication and higher level of national and international scholarship, India is keen to develop books in local languages most of which have a viable publishing apparatus. Apart from the fact that books in indigenous languages are vehicles of the country's rich cultural heritage and instruments of social communication and life-long education, it is well-recognised that without a sound foundation of books in national languages, a nation is doomed to an "observer's" status and will continue to depend on outside elements for its intellectual sustenance. However, the progress of Indian language books has not been so rapid or substantial as one would like it to be. The Indian language publishers often operate on a small scale and are not always well-organised. With meagre technical and financial resources, they combine publishing and bookselling and lack professionalism in both. It may be relevant here to add that a large number of titles in Indian languages, or information about their release, fails to reach the legal deposit libraries and therefore they are not reflected in the national bibliography.

A number of steps have been taken by both the Central and the State Governments to promote books in Indian languages in their respective jurisdiction, which include setting up of Academies and Boards for the purpose, cash prizes to outstanding authors, awards for excellence in printing, preparation of dictionaries and glossaries, compilation and dissemination of technical terms, carrying out book surveys and organisation of training courses and seminars on book publishing in various languages. With constantly increasing literacy and introduction of new dimensions of non-formal education, new vistas are opening up for a continuous flow of suitable literature in simple, local languages, which will help the publishing in Indian languages reach the take-off stage before long.

University Level Books

While the school textbooks are more or less nationalised and managed by the State Governments, the university level books

Books in English and Indian Languages

India is multi-lingual and has 15 major languages recognised by the Constitution, besides English. These languages are reflected in the above table which shows that English continues to share the largest number (31.3 per cent) of the titles produced, followed by Hindi (16.2 per cent), Bengali (10 per cent), Tamil (8.5 per cent), Marathi (7 per cent) and other languages with minor shares. English which was introduced as the official language of India in 1844 by an alien government continues to enjoy that status even today alongwith Hindi. Although spoken by about 2 per cent of the country's polulation, it remains the lingua franca for practical reasons and because of its general acceptability. Owing to economic reasons also books in English are at a premium compared to those in Indian languages. English is a language of the elite with a strong educational background scattered all over the country in urban centres where books can reach easily. This group has the ability and the tradition of buying books and is therefore a safe market for publishers. From the professional angle also, books in English have been a trend-setter of editorial and production standards and marketing mechanism. They have an edge over Indian language books in terms of finance, organisation and trained personnel. As regards writing, most authors find it convenient and remunerative to express themselves in English. Despite a constitutional directive in favour of a socialistic pattern of society, there still remains a social gap between the intellectuals and the masses – the potential writer and the common reader. Many established writers in India prefer to use the English language in which they have been educated and with which they are more at home than with their own mother tongue. Again, books in English have generally a larger print-run and a wider market. All these factors have helped the books in English continue to play a leading role in India even after four decades of political independence. They not only share about one-third of the total national book production, but also place India in the third position, after the United States and Britain, on the world publishing map in terms of number of titles published annually in English. While it is only natural that the relative share of English in Indian publishing will gradually shrink in favour of the local languages, yet there may be no decline in English-language publishing in India in absolute terms: Indeed there is likely to be a

Subject-wise & Language-wise Book Production in India 1986-87

Languages	Generalities	Philosophy	Religion	Social Sciences	Language	Pure Science	Technology	The Arts	Literature	History & Geography	Total
Assamese	3	2	9	11	1	2	[illegible]	6	142	25	207
Bengali	7	43	154	133	5	45	70	12	917	236	1,622
English	172	163	252	2,787	346	416	699	181	145	157	5,318
Gujarati	20	32	50	185	2	19	39	4	167	47	565
Hindi	38	110	191	502	35	82	46	20	603	118	2.745
Kannada	23	41	104	60	16	32	26	34	463	86	885
Kashmiri			2	7	3		-	1	19	1	33
Malyalam	3	19	55	55	10	27	50	14	594	56	883
Marathi	16	64	127	162	16	60	70	28	648	112	1,172
Oriya	6	7	76	22	2	6	8	5	235	26	393
Punjabi	25	5	60	59	1	9	3	4	208	34	408
Sanskrit	12	44	54	2	36	15	11	2	73	2	251
Sindhi				3			-		62	5	70
Tamil	40	76	67	97	30	38	129	45	778	134	1,434
Telgu	5	14	74	78	10	40	4	7	316	8	556
Urdu	11	1	58	21	3	13	8	6	223	32	376
Other Languages	-	-	22	1	-	-	-	-	20	9	52
Total :	380	611	1,356	4,175	516	794	1,169	369	6,513	1,088	16,970

State-wise Book Production in India - 1986-87

State/Union Territory	No.of Titles Produced	State/Union Territory	No.of Titles Produced
Andaman and Nicobar	7	Madhya Pradesh	231
Andhra Pradesh	695	Maharashtra	1,893
Arunachal Pradesh	5	Manipur	1
Assam	281	Meghalaya	21
Bihar	248	Mizoram	4
Chandigarh	84	Nagaland	7
Delhi	4,082	Orissa	438
Goa	40	Pondichery	80
Gujarat	600	Punjab	366
Haryana	104	Rajasthan	181
Himachal Prasdesh	146	Sikkim	—
Jammu and Kashmir	52	Tamil Nadu	1,775
Karnataka	1,046	Tripura	48
Kerala	1,090	Uttar Pradesh	1,223
Lakshadeep	—	West Bengal	2,222
		Total:	16,970

The table below spells out subject-wise and language-wise classification of books. The subject classification shows that though India produces books on a variety of disciplines, Literature alone shares more than a third of the total output, followed closely by Social Sciences (25 per cent). The other prominent subjects are Religion (8 per cent), Technology (about 7 per cent), History and Geography (6.5 per cent), Pure Sciences (4.7 per cent) and Philosophy (3.6 per cent). As regards the number of copies printed, textbooks have a huge print-run according to enrolment, but general books and trade books are often printed between 1000 and 2000 copies. Fiction and popular paperbacks can go higher. Some years back a popular Hindi novel ran into a record edition of 5,00,000 copies:

The Current Book Scene

India is one of the largest book producing countries in the developing world and has often ranked among the ten largest in the whole world. According to the national bibliography compiled by the National Library, Calcutta under the Delivery of Books Act, the largest number of titles published was 21,957 in 1975-76. According to the latest available figures, the number of titles received under the book deposit law was 16,970 for the year 1986-87. During the 'eighties the average book production has ranged between 14,000 and 17,000 titles as indicated in the following table:

Year	Number of Titles
1980-81	17,168
1981-82	16,798
1982-83	16,650
1983-84	14,202
1984-85	15,091
1985-86	15,720
1986-87	16,970

As far as publishing in the Indian States is concerned, the situation is better comprehended if we think of the country as a continent. Each of the States like a country in a continent has developed its peculiar culture, its language and literature and in most cases its own script. Within the larger of these States, publishing has developed its own stature reflecting the characteristics, development and growth of the area, its language and literature. A break-up of titles produced in various States and Union Terretories is given below which indicates that Delhi produces the maximum number (4082 titles). Delhi thus accounts for a quarter of the country's book production which is due to a number of factors e.g. proximity to book developers and higher education policy makers, the source of import licences and export incentives, concentration of learned institutions and cultural centres of national importance, a seat of political power and State patronage and the highest per capita income and literacy rate in India. Other States leading in book production are West Bengal, Maharashtra, Tamil Nadu, Uttar Pradesh, Kerala and Karnataka with more than a thousand titles each:

Within three-and-a-half decades after indepen-dence, the literary rate was more than doubled (from 16.7 per cent to 36.2 per cent) and public expenditure on education increased from Rs. 550 million in 1947 to Rs. 51,860 million in 1983. The number of educational institutions rose from 1,65,000 to 7,88,000 and the student population swelled from 15 million to 120 million during the corresponding years. Educational explosion on the one hand and cultural renaissance on the other generated great thirst for knowledge and information and created an enormous demand for books. With the establishment of technical and scientific institutions of higher level in all parts of the country whose intake capacity increased over the years from 6,610 to 118,792, there was also unprecented demand for university level books in science and technology. A large number of private publishing houses appeared all over in the 'fifties and the 'sixties to meet the growing book needs of the country. Indeed the 'seventies was a period of boom for the book industry during which many far-reaching book development activities were undertaken resulting into the highest book production level. Yet, for historical and other reasons, foreign books continued to dominate the higher levels of education particularly in scientific and technical disciplines. In order to make standard university books and reference material of foreign origin available to the Indian students at low prices, the Ministry of Education entered into reprint/translation agreements with the governments of the U.K. in 1960, the U.S.A. in 1961 and the U.S.S.R. in 1965. So far about 750 British, 1650 American and 700 Soviet titles have been covered under these bilateral programmes. While the British and the Soviet titles are produced in the country of origin and made available to Indian readers at moderate prices, the American reprint editions are brought out by Indian publishers at subsidised prices. Only latest editions of books are considered for coverage under these programmes which are assessed by local experts and approved by government if found suitable for Indian students and if comparable books by Indian authors are not available. Apart from bringing titles - both essential and relevant - within the reach of an average Indian student, these collaboration schemes also generally benefitted the Indian publishers and booksellers.

Post-Independence Publishing

While printing was an off-shoot of religion, publishing developed in India mainly out of the struggle for political freedom. Many of the distinguished publishers were men of eminence in public life. They also participated actively in political movements. Indigenous publishing with a socio-political motive received its baptism of fire in the anti-colonial upsurge. Many of these publishers succeeded in getting books of topical, political and cultural interests in the hands of educated Indians. These publishing thrusts were particularly strong in Bengal and Maharashtra. They helped in educating a whole generation which imbibed a great deal of political culture through books.

In 1947, when the country attained political freedom, literacy was as low as 15 per cent, education was confined mainly to liberal arts and the book trade needs were met largely from foreign sources. At the school level, the process of what is known as nationalisation of textbook got accelerated and the State Governments charged with the responsibility of compulsory primary education and adult literacy had to involve themselves directly with the publication of educational books with a view to combining high quality with low prices, so that essential reading material of the requisite quality was within the reach of the average pupil. With adequate financial and academic resources at its disposal, the public sector has been making heavy investment in pedagogical research, experimentation and curricular reform and development to improve the quality of educational materials and provides subsidy to reduce prices of school textbooks. The process is almost complete and nearly all textbooks for Class I to VIII have been nationalised. As for secondary and senior secondary levels, the production of a majority of textbooks is in the hands of State Governments and Union Territory Administrations. The National Council of Educational Research and Training, an autonomous body fully financed by the Centre, produces school textbooks, teacher manuals and workbooks as models to be adopted, adapted or translated by the States and undertakes continuous evaluation of school textbooks in the country to maintain standards and modernity of these titles.

earliest printing presses were established in Bombay in 1674, in Tranquebar (Madras) in 1712 and in Hoogly (Bengal) in 1778. Literary and cultural books started appearing in other parts of the country as well, although book publishing remained mainly religious in content until the close of the 18th century.

It was in the 19th century that book printing changed into publishing and emerged as a commercial activity as a result of a two-fold impetus; (i) as the educational system was standardised after the colonial government's acceptance of Maculay's report on education, and the first three universities were established in 1857 in Bombay, Madras and Calcutta, there was need for books to meet the requirements of the new educational system, and (ii) as the Indian renaissance gained roots, especially in Bengal, publishing began to assume its rightful role in the country's intellectual life. A sizeable educated middle class soon appeared on the scene, which was both a contributor to and a consumer of the Indian book publishing industry. While at the turn of the century educational publishing remained in the hands of British-owned subsidiaries, its cultural aspects were shared by the indigenous publishers with liberal views dedicated to the freedom movement. These pioneers proved that local publishing of a serious nature was possible, which helped to stimulate later efforts. Initially, books were sold in an ad hoc manner largely by printers-turned publishers. Soon a network of booksellers also began emerging with the establishment of a modern bookshop in Calcutta in 1830. Most of the booksellers, however, subsisted through selling imported books and magazines. The colonial government was not keen on the growth of indigenous publishing. The limited requirements of educational books and books for general reading were met by the British publishers which suited the government as well. It redounds to the credit of some local publishers that inspite of stiff competition from the strongly entrenched foreign interests, they were able to produce several series of educational books and textbooks adapted for the Indian studies and got them approved by the powers that be. However, until about the middle of the 20th century most Indian publishing firms remained fledgling owing to harrassment by the colonial authorities on the one hand and inadequate capital resources and lack of professional expertise on the other.

The book is an important instrument of change and development. It is a remarkable invention for society and a valuable gift to posterity. Its role as an effective medium of education and communication remains unrivalled despite the rapid advances made by the electronic media. The book is also a unique source of recreation and mental therapy. No single invention in the last five centuries can match the impact of the printing press on the course of human development. Printing gave wings to the word and books preserved and transmitted values and wisdom of a community beyond time and space. Books have already demonstrated their vital contribution to individual fulfilment, social growth and international understanding.

Historical Background

Until the end of the 15th century the most popular concept of the book in India was a collection of leaves or sheets of bark strung together between covers by a cord. Around this period paper began to be used particularly in north India. This was a sequel to the Muslim conquest, which also brought into its fold the Persian tradition of court patronage of studio book production. Between the 16th and the 18th century the Mughals perfected the major arts of the book viz. calligraphy, illumination, illustration and binding.

Printing came to India as a byproduct of religion in the middle of the 16th century. The earliest press was established by the Christian missionaries in Goa in 1556, which printed the first proper book in India in 1557. It was the Portuguese Catechism Doctrina Christa, the Gospel of St.Francisco Xavier. Its Tamil translation consisting of 16 pages was published in the following year "for the purpose of imparting religious instruction to Indians", which also made Tamil the first Indian language to appear in print.

With its roots in Goa and in religion, printing spread gradually to other centres and began to cover secular themes. Thus the

MR. ABUL HASAN: Born in Delhi in 1928. Graduated in Commerce, Economics and Law from Aligarh Muslim University. Trained in Publishing Management at Pratt Institute, New York and in Book Production at Tokyo Book Development Centre.

Joined Ministry of Education in 1954 and served as Chief Publication Officer, NCERT; Special Officer (Book Promotion) and Deputy Educational Adviser to the Government of India. Undertook several book development missions to Asian and African countries under the auspices of UNESCO and the Commonwealth Secretariat. Author of eight titles on different aspects of Publishing and Book Promotion four of which have been published by Unesco.

Retired from government service in October 1986 and is now Director, Institute of Book Publishing, New Delhi. Also works as a free-lance Consultant on Book Promotion and Copyright and is on the roster of many national and international organisations.

Khuda Bakhsh Extension Lectures - 1988

Book Publishing in India

AN OVERVIEW

by
Abul Hasan

dreams, on the other. Sociological objectivity and realistic aspirations would displace 'ideological mirages' and illusory ambitions. In short, sociology would prevail over ideology, and Islamic humanism and liberalism over pan-Islamist and fundamentalist thinking. Islamic fundamentalism would then cease to have the attraction it, presently, has for the younger generation, specially those who have received a technical education without a sufficient background of pure science, and the liberal arts. This shift of perspective would, however, not be a quick or easy process. Concepts, categories and values evolve like organic species and cannot be created by reformers, philosophers or UNESCO agencies. Western Europe took almost two centuries to complete the process of the scientific and secular revolutions beginning in mid- 18th century. However, with the blessings of such tools and instruments of social change, as the television and, now, the computer, the journey of the Muslim mind towards Islamic liberalism and democratic humanism, hopefully, may be shortened.

—: O :—

and even in the same person at different points of time. The perception of social reality or the world view of individuals often changes *pari passu* the sense of effective participation and fulfilment or of marginalisation and deprivation in the struggle of existence.

It seems to me that sooner or later all developing societies (irrespective of their dominant ideology) would register the vital truth that the stupendous and highly complex problems of rapid all-round growth call for an open sociological diagnosis and therapy rather than ideology-bound text-book solutions. In short, the compulsions of development favour (in the long run) the reliance on sociology rather than ideology. This is what has happened in Egypt, Syria, Iraq and elsewhere. These countries have outgrown 'religionism' and relgion-based political processes, even though their constitutions are not formally secular in the way Turkey has a purely secular constitution. Thus the programme of undoing the legacy of *Nasserism* in Egypt and of the *Baathist* movement (initiated by the Christian intellectual and reformer, Michael Aflaq) in Syria, Iraq and Lebanon is essentially utopian politics. In this context, the continuing liberalisation process in post-Mao China and the refreshingly new politico-economic stance of Gorbachov regarding the possibility of plural political parties and economic incentives in the USSR are of the greatest significance for the entire world. This shows how the compulsions of the developmental process and the logic of sociology score over purely ideological purism and reasoning. If, in the eighties, it is Deng and Gorbachov who had to do so when he wisely gave a New Deal to his people.

It appears that the Arab oil-wealth explosion and, subsequently, the Islamic Revolution of Iran have jointly imparted a momentum to Islamic resurgence (in its present form) which the movement will not be able to maintain in the decades ahead. The ideological euphoria of Iran will, most probably, wither away in the wake of a revolution that failed. The oil-based Arab euphoria has already given way to economic worries in the wake of the oil recession. The Muslim mind will then be awakened from its dogmatic slumbers, on the one hand, and romantic-revolutionary

both to avoid encroachment by one upon a field which rightly belongs to the other. The thesis of the separation of religion and politics should also not be misconstrued to mean that morality should have nothing to do with politics, as an amoral pursuit of power.

Politics like sex, is an indispensable feature of human existence. And politics which is rooted in the struggle for supremacy unavoidably leads to conflict. It is primarily the love of and search for supremacy rather than love of and search for truth or God, or of any particular language or culture, which lead to conflict within a society and between sovereign states. Ideologies, function as instruments of attack and defence in the struggle for power. However, ideas and values also battle against each other.

The concept of ideology, in the above sense, antedates the work of Marx. But it was he who brought the above-mentioned role of ideology into sharp focus. Today the above insight has been incorporated into the basic methodoloy of science, be it Marxist or not.

The above thesis, however, does not mean that sincerity of faith and honesty of purpose are non-existent in our world and that the talk of religion, values and ideals is pure hypocrisy or, at best, self-deception. Ideals and interests both exist and cooperate with each other, in an extremely complex human situation which we can never understand with the help of any simple formula. While those who find the doors of opportunity closed, do develop negative feelings of envy and hate against those enjoying power and wealth, genuine impersonal moral indignation at the imperfections and evils of the human situation also operates and moves the world. Revolutionary fervour directed to rebuilding the world, nearer to our heart's desires and dreams, may also be rooted in a deep commitment to moral and spiritual values. Genuine moral indignation and self-interest or the interest of the group coalesce, in varying proportions, in different individuals,

results from repeating the truism that religion is not merely the acts of praying, fasting and doing the *Hajj*, etc., but a complete way of life and then proceeding to the corollary that, the *shariat* must have on all-embracing jurisdiction, including politics. Now, while the basic thesis is a foundational truth, the corollary is terribly misleading. It is, indeed, very true that individual piety is not enough in the absence of a just social order—a surrounding political, economic, and cultural space in which the individual lives and functions. Consequently, if religion aims at true human welfare, it must prescribe not merely individual piety and goodness through spiritual discipline, but also ensure the proper ordering of society as a whole. The mischief, however, begins when the thesis of the social role or relevance of Islam is made into an argument for Islamic separatism in every sphere of life—politics, economics and even knowledge, as such.

The protagonists of Islamic resurgence argue that the modern approach of limiting the function of religion to mere spiritual ontogenesis, to the exclusion of political participation, completely saps the power and effectiveness of religion which is, necessarily, reduced to empty and innocuous rituals relating to birth, death, marriage, prayer etc. The fact is, precisely, the other way round. Religion loses its power and depth, not through the proper delimitation of its functions, but through an indiscriminate expansion of its jurisdiction or authority to every sphere of life. Indeed this expansion may well be called the 'tyranny of religion'. When this happens the existential depth and inwardness of the true religious attitude gives way to a horizontal thinness of outward compliance of rules and regulations, 'does and donts' at every point of life. Spirituality and authenticity, the life breath of religion, are strangulated by the weeds of regimentation.

The protagonists of Islamic resurgence create the false impression that religious liberals, who wish to keep religion and politics apart, ignore the importance of the struggle for establishing a just social order. But the thesis of the separation of religion and politics signifies a balanced delimitation of the proper spheres of

newfangled 'Islamic methodology' which is never spelt out, but is merely dangled before a charmed Islamic audiences as the panacea for solving all the ills which beset humanity. They fail to explain how can there be Islamic Physics/Geology/Astronomy/Zoology, or for that matter, Islamic Anthropology/Geography/Agriculture etc. in contradistinction from these subjects as they are understood by the world scientific or academic community. The one and only way of the pursuit of truth is the method of free enquiry in a spirit of humility and the readiness to surrender before truth, as ascertained by methods appropriate for the subject matter of the enquiry. The justificatory interpretation of infallible texts, in the absence of appropriate methods of verification, can never lead to universally valid conclusions. The talk of Islamic science or knowledge, or the Islamisation of western science and knowledge, fails to distinguish between reason and rationalisation, or between validation and justification.

The movement of Islamic resurgence has been greatly strengthened by the flow of unprecedented wealth in the Islamic world and the newly-won pride and self-confidence consequent upon its emancipation from western military and political domination. Self-assertion (with the help of western technology) has gained precedence over the disinterested search for truth with the help of western techniques of objective enquiry. The Islamic world is slow to realise that the power af technology is, ultimately, based upon the wisdom of the scientific method. Technology will begin to stagnate the moment the scientific method is eroded or discarded. The hunger for imported technology or the hunger for consuming the fruits of science but neglecting to nourish its roots, i.e. the scientific method of free enquiry, will not promote human welfare in the long run. The method of free enquiry and democracy are, in the final analysis, two sides of the same coin.

The immense sums being spent on Islamic Science/Education etc. by way of instituting scholarships or fellowships and establishing centres of study and research will go to reinforce the postulates and methodology of the protagonists of Islamic resurgence to the exclusion of the method of free enquiry. Great confusion

VII

CONCLUDING REMARKS

Islamic resurgence, provided it be on right lines, should be most welcome, not only to Muslims, but to all genuine humanists who look upon humanity as one large family. When, however, the protagonists of Islamic resurgence take to positions which directly or indirectly, erode the basic values of humanism, spiritual autonomy, free enquiry, equality of the sexes, human rights, tolerance, equality of opportunity etc., Islamic resurgence becomes objectionable not only to non-Muslims but liberal Muslims as well.

Unfortunately, the champions of Islamic resurgence, instead of engaging themselves in an impartial and constructive criticism of the human situation and a balanced evaluation of western thought and institutions, betake themselves to a negative debunking of modernity. This approach may well give them a sense of superiority to the 'decadent west'. But it definitely leads to clouded vision and blurred perceptions of the actual conditions prevailing in western society. Instead of acquiring an 'insider's insight' into the strength and weakness, the real achievements and limitations of western modernity, the hostile critics get only distorted pictures, half-truths, over-simplifications, and the like. In other words, they commit the fallacy of 'outsider's, negative bias' —precisely the fallacy which they attribute to the western students of Islam.

The movement of Islamic resurgence, at its best, is not nostalgic about the golden past of Islam, but stands for progress and development. It is this aspect which makes the movement the target of attack or suspicion by the more traditional and pietically oriented Muslims. The forward-looking emphasis of the Islamic reformists is welcome. But, on a deeper analysis, their language of progress and their pleas for reconstructing and modernising Islamic thought and institutions turns out to be rather a storm in a tea cup—something insipid and illusory. This happens because they virtually reject the method of free enquiry and the time-tested methodology of the natural and the social sciences, in favour of a

suffer from a sense of socio-political marginalisation, and readily succumb to the tendency to withdraw from mainstream concerns. The unfortunate communal riots bring about a still greater polarisation of separate identities demanding separate political organisations. Thus cooperation between liberal and secular minded Muslims and Hindus gives place to confrontation between the militant sections of both the communities, thereby greatly slowing down the pace of the growth of secular democracy and genuine humanism in the plural Indian society. However, the linguistic, ethnic, caste, religious, and regional plurality, inharent in the Indian situation, is so great that there is, indeed, no viable alternative to secular democracy, in the long run, no matter how tortuous and time-consuming this journey may prove to be. It is also crucially important to realise in what a large measure the tension and conflict between the different segments of the Indian population is, basically, the struggle for a larger share in the growing national wealth and for socio-political advancement in an open democratic society where every man can become the President, as is the case in the New World.

of conduct, and that the *shariat* is all embracing, though it stands in need of modernisation to serve contemporary needs. The earlier thrust of the movement of Bangla Deshi nationalism was in the direction of separating religion and politics and establishing a functional, if not a formal, secular state. Pressures of different kinds, both internal and external, have, however, constrained Bangla Deshi leadership to adopt a much more Islamic posture. But the cultural heritage of the composite population and the physical and linguistic contiguity with Indian Bengal is likely to exert a far greater pull in the direction of Islamic liberalism and a functional, if not a formal, secularism on democratic lines, without any erosion of the Muslim identity of Bangla Desh. The image of Lalan Faquir, the renowned mystic and poet of united Bengal of the 19th century, may well become the guiding star of Bangla Deshi composite culture and humanism.

India: Though not a part of the Islamic world, more Muslims live in this country than any other country in the world with the sole exception of Indonesia. The population of Muslims who are Indian citizens exceeds the combined population of the entire Arab and Iranian Muslims. India is a unique example of a multi-religious democratic state where democracy, as a way of life, is struggling to prevail over communalism, casteism and regionalism. The idea of secular democracy is an integral part of the Indian constitution. This presupposes the separation of religion and politics and looks upon religion as a matter of personal choice, that should not be imported into political processes.

The above concept of religion clashes with the view of the protagonists of Islamic resurgence (including many Muslim quarters in India) that Islam does not admit of any separation of the religious and the worldly, and that the *shariat* covers every aspect of a true Muslim. These clashing perspectives on religion constitute the predicament of the Muslims living in the modern age, no matter where they live. The Indian Muslims face the additional predicament of being a 'perpetual minority' despite being in such immense numbers, in the absolute sense. In other words, they

The state wields such an enormous power of patronage over the religious infra-structure, endowments, trusts and seminaries, that Islamic protest gets little breathing space for gathering momentum The state patronizes the conservative pietistic interpretation of Islam, represented by the well-established *Nahdatul Ulama*, which suits the establishment. This combination serves to check the more rapid progress of militant Islamists.

Indonesain Islam has, historically, been liberal and culturally permissive. Many pre-Islamic customs and folk-lore are still a living part of the collective life of the Indonesian Muslims. The Islamisation programme of the Islamic resurgence movement cuts at the roots of the idea that religion should not be mixed up with politics or culture. But it seems Indonesia and Malaysia would retain their present style of cultural pluralism and functional secularism.

Bangla Desh : The emergence of Bangla Desh as a sovereign state in 1971 represented the retreat of Islamic communitarianism in the face of the rising tide of Muslim linguistic nationalism wedded to a functional secularism. The chequered career of democracy in Bangla Desh notwithstanding, democracy and the accountability of the government to the people are more of a living reality in Bangla Desh than in Pakistan, as such. There could hardly be any doubt that this is partly due to the linguistic aud cultural unity of the people in the midst of religious diversity. This pattern of unity and diversity, in the same breath, is more conducive to the appeal of secular democracy as compared to religious communitarianism or fundamentalism.

The problem of over-population and under-development is so very acute in Bangla Desh that no easy solutions should be expected. Charismatic leaders do help to expedite the pace of change, but they emerge rather rarely on the human scene. The history and situation of Bangla Desh, however, pre-dispose it to a liberal and relatively secular ideology. The impact of Arab oil-based wealth and of the Islamic revolution in Iran tend to reinforce the voice of Islamic resurgence. This is the voice that Islam is a total code

Turkey, though not to the undeniable fads and foibles and excesses of their beloved leader and guide. The basic philosophy of secularism, the separation of politics and religion, appears to have taken firm roots in the Turkish psyche, while the excesses of 'Kamalism' have been corrected or removed. The appeal of the anti-secular Islamic approach is, in general, confined to some rural and small town sections and the relatively lower middle income or under-privileged urban sections which feel side-lined by their better educated and more affluent bretheren. The secular establishment is quite stable, and as more and more people get more and more opportunities of vertical mobility, as a result of better educational facilities and industrial development, their attitudes become increasingly secularised. This applies to both the Islamic reformists (who speak the language of modernising or adjusting the *shariat* to suit present needs) and also to the Islamic traditionalists or pietists.

Indonesia : Indonesia (which has the largest Muslim population in the world) has passed through great convolutions in the course of the last fifty years. Sukarno, the father figure of modern independent Indonesia, stood for secular nationalism and Islamic liberalism of sorts. The western-educated generation, to which Sukarno belonged, had accepted the modern concept of the separation of religion and politics. However, within this broad frame of reference, a wide spectrum prevailed and Sukarno had leftist sympathies. Communism, as an organised movement, was, however, almost completely wiped out in 1965 during the civil war leaving Suharto in total command. The New Order which he initiated is a military oligarchy committed to functional secularism and a free-market type of economy much to the advantage of the urban elite and the military establishment. The relatively socially and educationally backward sections, specially in the small towns, lack a sense of participation and equal opportunities in the industrial and economic growth of society. It is this sector, smarting under a sense of being in the margin, which provides a receptive audience to the movement of Islamic resurgence, (represented by the Masjumi Party) that has been under a legal ban for the past several years.

necessity in terms of 'real politik'. Many informed observers hold that it was a question of 'who first', and that the US was just caught napping by the USSR, probably because of the immense advantage of the latter on account of its physical contiguity with Afghanistan.

The significant feature of the civil war is that both the establishment and the rebels claim to be on the side of true Islam. And both are justified in their claims. The Communist leaders certainly do not wish to jeopardise the country's independence or exterminate Islam, but merely want to modernise the nation and bring it into line with other industrialised and developed countries of the world. Their conception of Islam is very different from the traditional Islam prevailing in land-locked and pre-industrial Afghanistan. This cultural distance or polarity is the consequence of the failure of the westernised ruling class, over the past half a century, to make a proper distinction between westernisation and modernisation, and to strive, at the grass-roots level, for the democratic transformation of a stagnant culture and economy. As a result, no scientific knowledge base and no middle class emerged which could provide a broad supporting framework of ideas and values. Indeed, this crucial deficiency is a common feature, in varying degrees, of the entire Islamic world.

Turkey: The secular democratic constitution of Turkey was, literally, thrust upon a grateful nation by its saviour and adored leader, Mustafa Kamal. The career of democracy has not been smooth in Turkey which has seen several periods of military rule or martial law. Turkey is the only Muslim country having a totally secular constitution, even though the Turkish people are second to none in their devotion to Islam as their cherished religion. The movement of Islamic resurgence, represented by the National Salvation Party, stands for undoing the secular revolution ushered in by Ataturk, reestablishing Islam as the state religion, restoring the unity of religion and politics, and the supremacy of the Islamic canon law (*shariat*). But despite massive efforts by Islamic revivalist organisations, the majority of the Turkish people continue to adhere to the path shown by the Father of Modern

they alone have the ability and exclusive right to deciphering the infallible Quran, as interpreted by the infallible *Imam* concerning all matters, be they worldly or religious, negates the concept of democracy. Democracy is essentially the accountability of the ruler to the ruled, as a collectivity, irrespective of the status of the constituent membership. This is not the case in Iran where the accountability of the ruler or the chief executive is restricted to the jurists who mediate between man and God in all matters without any distinction between the worldy and the spiritual.

Historically, the Iranian revolution is a reversal, firstly, of the trend of the progressive horizontal expansion of power, and, secondly, also the reversal of the trend towards the primacy of the secular over the religious in the age-old struggle for supremacy between the church and the state. In more general terms, the Iranian revolution reverses the modern trend to separate religion and politics, and is, thus, opposed to the spirit of the age. The protagonists of the revolution believe (unjusifiably) that the separation of politics and religion means either the rejection of religion, or the rejection of all morality in the sphere of politics. In other words the Islamic revolutionaries hold that secular politics demands totally amoral politics, while their Islamic concept of the unity of religion and politics demands value-based politics. This belief is an unwarranted over-simplification of the issue, apart from being an unwarranted assumption.

In the final analysis, the Iranian revolution is of much too short a duration to enable us to generalise with any degree of assurance.

Afghanistan : The Communist intervention in Afghanistan is the product of the intense super-power conflict or cold war in the region. Caught between the ever-growing tentacles of Western Capitalism and Soviet Communism, Afghanistan just did not have the political, economic and military strength to function as an independent non-aligned country, (in the manner of India) after the overthrow of the Zakir Shah constitutional monarchy in 1973. The regional political fall-out of the Islamic revolution in neighbouring Iran had created such great uncertainty and instability that intervention by one super power or the other had become a geo-political

In what follows I shall confine myself to a few selected Muslim countries and assess the prospect of democracy without attempting to give any detailed factual information. Excellent books and monographs on Area Studies are available, and they are indispensable for the serious student of human affairs.

To start from our neighbour, Pakistan, Muslims there are split on the issue of democracy. One school of thought stands for the restoration of democracy in the western sense, while a substantial section disapproves of the party system and free elections of the western type on the ground that corruption is its in-built feature. While Ayub Khan had earlier experimented with controlled democracy, Ziaul Haq stands for Islamic democracy which should be partyless. One can hardly avoid being reminded of the approach of Jai Prakash Narain.

The party system is certainly being misused. But is there any effective substitute for the crucial function it performs in the complex political process ? Indeed, a partyless candidate would not be able to muster organizational and financial support. Moreover, atomic partyless individual members of a legislature would find it practically impossible to steer the country in an agreed direction. Agreement on basic policies and their modalities of implementation is a prerequisite of successful administration. And this requires organised publicity and debate which is what parties do, apart from setting up candidates for election. Thus, the concept of partyless democracy appears to be a futile exercise in utopian or abstract thinking. It is immaterial whether this exercise is the result of disenchantment with the sordid compulsions of politics or of the passion for Islamising democracy.

Iran : The Islamic revolution of Iran in 1979 was, evidently, a massive upsurge against the brutal negation of fundamental human rights and the rule of law. But the revolution has substituted one form of authoritarianism by another. The abolition of monarchy does not amount to the establishment of democracy. The concept of the supremacy of the juri-consults (*Vilayat-e-Faqih*) in all matters and the belief that

VI

WHITHER ISLAM ?

Let us now briefly survey some selected Muslim countries to find out the acceptability and prospects of democracy in the Islamic world.

The Muslim countries of Asia and Africa at last, have broken loose the shackles of colonial rule and are looking forward to ending their industrial backwardness and cultural stagnation. The Muslim world is vibrant with new life and vigour and fervent aspirations of a new Islamic resurgence. Because of geo-political and economic factors, oil wealth, super-power conflicts, the growing population of Asia and Africa and a new sense of awareness of their grand cultural heritage (which awareness is considerably indebted to the scholarly labours of western researchers), the emerging limitations and imbalances of western culture and society, the demand of the relatively deprived section of the human family for the equitable sharing of scarce natural resources and the communications revolution which has reduced the globe to a district, the Muslim countries, stretching from Morocco to Indonesia, are tremendously important in world affairs.

Muslim intellectuals and leaders are, however, totally perplexed on the issue of democracy. In the absence of a democratic culture, national debate on basic issues and the politics of consensus is, generally, ruled out. There are no well established conventions or laws guaranteeing fundamental rights including the right to interpret the basic concepts and values of their own cherished religious tradition. Authoritarian institutions or reformers of one type or the other seek to impose their own schemes of life and styles of Islamic piety. They seek to solve issues of the utmost importance to millions of Muslims on the basis of their own individual or 'syndicated' wisdom. No matter how sincere or benevolent the persons concerned might be, but alas ! the chronicles of history over-flow with stories of the corrupting influence of power, without any checks and balances, and the sobering influence of free discussion.

qualifications and abundant common sense, seem to shudder at the idea of expressing an independent opinion or even attempting to form one on socio-ethical or religious issues. Seemingly a case of humility, it is really a case of the fear of freedom and fear of enquiry. This approach leads to a compartmentalised rather than an integrated outlook and personality. This strategy of living and thinking can never lead to authentic being without which religious faith is nothing more than a conceptual corpse the believer carries along, lest he be accused of disloyalty to his tradition.

Another obstacle to the growth of democratic attitudes is the lack of suitable popular literature on Islamic liberalism, humanism and the social sciences. Islamic literature continues to be almost solely produced by either traditional Muslim writers or by the protagonists of Islamic resurgence. The latter group disagrees with the traditional or conservative school of Islam as well as the liberal approach of Sir Syed, Abul Kalam Azad, *et al.*

Yet another obstacle in the way of quick and wide acceptance of Islamic liberalism is the intellectual isolation of the *Ulama* and their almost total neglect of comparative religion, history, social sciences etc as well as the valuable work of western scholars on Islam and other religions. It is not realised that contemporary western scholarship, at its best, is no longer subject to the prejudices, fads and foibles of Christian missionaries, apologists or imperialists. of the previous century.

for the historical and sociological approach to problems of democracy.

Obstacles to Democracy In the Islamie Tradition : Some obstacles[32] stand in the way of the Muslims' acceptance of democracy in the modern sense. The first obstacle is caused by the widespread apologetic approach to the Tradition. This approach prevents a candid assessment of the Tradition in terms of both its achievments and limitations. Even highly educated Muslims see only the bright side of Islam and ignore the dark spots on the moon.

The second obstacle is the fear of the social consequences of dissent from the majority position. This fear prevents an open dialogue between authentic believers having different views within the parameters of Islam. Keeping one's innermost views and attitudes to oneself is supposed to be both prudence and courtesy to those who differ from oneself. This applies not only to different sects within Islam but also to one's own group. One may occasionally open out before very intimate friends, but certainly not express his views in writing. This makes the orthogenetic growth of the tradition either impossible or extremely slow, as can be seen in the case of the religious reform movement initiated by Sir Syed. Even after a lapse of a century his ideas are supposed to be dangerous heresies which should be politely ignored rather than seriously discussed even at Aligarh itself.

Perhaps, even more serious than the fear of dissent is what the philosophical psychoanalyst, Erich Fromm, terms the 'fear of freedom'. The traditional Muslim develops a fear of independent thinking and suppresses his genuine attitudes and feelings or his intellectual difficulties, as if their mere registration, at the conscious level, would amount to blasphemy or sin. Any spontaneous disagreement from the generally received position or doctrine is interpreted as a sign of spititual perversity which needs to be cured at the earliest by spiritual means. This approach saps the moral courage, intellectual vitality and spiritual creativity of the entire community. Muslims possessing high technical and professional

the people and a clear modality for the peaceful transfer of *de jure* authority of the head of state, are not present in Islamic political thought and practice.

The Islamic concepts of the fraternity of believers, their social equality, tolerance and justice towards followers of other religions, near-equality of women with men, permission of divorce, permission of inter-religious marriage within certain limits and egalitarian laws of inheritance, certainly represent a creative advance on the then conditions of the human family[31]. A legitimate pride in this fact is natural and also justifiable. But it should not be allowed to stand in the way of an honest and balanced evaluation of its imperfections or limitations. It is undeniable that the human family has gently outgrown the Islamic level of excellence in all fields of life.

In the sphere of democracy the west has made tremendous advances in building infra-structures and procedures which promote democratic values and human welfare — the separation of the executive and the judiciary, the secrecy of the ballot, the party system, the collective responsibilty of the cabinet, the freedom of the press, the system of recall, proportional representation, the permanence of the services, and so on. Avowedly, every institutional mechanism or system has good points as well as bad. The world itself is imperfect and imperfectable, though, obviously, human efforts must go on to improve matters. In doing so we must be guided by our own and also the experience of the human family, as a whole. Institutions which have evolved over a long period of time, and which definitely fills a vital human need, should not be summarily rejected, merely because of their attendant evils, or abuses, unless and untill we can provide effective alternative ways of satisfying the genuine needs in question. Otherwise, the reforms would be self-defeating, no matter whether they be made in the name of Islamic democracy, socialism or what not. Social space has its own logic which cannot be ignored. Success in practice is the only test of the value of proposed reforms. No romantic notions or nostalgia for a golden past can be a substitute

powers of the consultative body were never spelt out, and in any case, their advice was never held to be binding upon the chief executive.

The Quran contains no guidance and gives no clear rules concerning the crucial issue of succession to the Prophet in respect of his political or administrative functions. The Prophet also left no instructions in this regard. The developments, which took place later, are too well known to be recounted, though it must be stated that there is no agreement upon the exact details. Islamic political theory, as it developed in the course of time, became sharply divided into the *Sunni* and the *Shia* schools of thought. While the *Sunni* view stipulated that the Khalifa must be from among the males of the Quraish tribe, the *Shia* view restricted the eligibity of this high office to the house of the Prophet himself. Thus the concept of equality of status, in the full democratic sense, was at no point of time a feature of the republican temper or constitution of Islam even in the earliest golden period. However, Islam did stand for complete social equality among the believers, in every walk of life – the mosque, the dining table, the battle field and so on. Thus, while Islam stood for egalitarianism and also republicanism, it cannot be said that it stood for democracy, in the full sense of the term.

There are some other serious limitations in the Islamic political and social concepts. For instance, neither the Quran nor the *shariat* ever abolished slavery, as an institution, so that the concept of complete equality of status and of opportunity never became a living reality. Although Islam gave much more legal rights and a much higher status to women, as compared to the norms of the time, this did not amount to complete equality of the sexes. Again, while Islam stood for a level of tolerance and equitable treatment to non-Muslims, far in advance of the then prevailing Christian and Jewish norms, the tolerance did not amount to complete equality of all citizens. Thus, (a) the notion of complete equality of the rights, duties and opportunities of the individual, independently of caste, colour, creed and sex, and (b) the notion of accountability and responsibility of the ruler to

of his high office, there was no clearly laid down procedure for electing or selecting him in the first instance, and for removing him, subsequently, there was no standard or authoritative interpretation of the Book binding upon the Khalifa apart, of course, from oral reports circulating among the believers about the doings and sayings of the Prophet. In short, there was neither any concept of responsibility to the people (in addition to the Khalifa's moral or inner sense of responsibility to God and His Prophet), nor any procedure for unambiguously determining whether the Khalifa's actions were in consonance with the Book and the example (apart from his own assessment or that of others), nor any procedure for the peaceful transfer of authority from one Khalifa to his successor. Apart from voluntary abdication, he could be removed only through assasination or successful armed rebellion. It is significant that the last three of the four pious Khalifas were all victims of political assasination.

It is true that the Islamic political doctrine, in the earliest phase of its history, was opposed to hereditary monarchy and stood for a theological form of republicanism which later on degenerated into monarchy. Even so, the Khalifa, as a monarch, was duty-bound to uphold the Islamic canon law *shariat*. Moreover, his legitimacy or *de jure* authority was conditional upon his upholding the *shariat* as the law of the realm. But the theory did not provide any modalities for his 'election' or the peaceful transfer of power from one Khalifa to another. This was true not only in the beginning, in the case of the first four pious Khalifas, each of whom became President of the Islamic republic in a different way, but remained true for all times to come. The *shariat* did stipulate the removal of the Khalifa in case he failed to uphold and maintain the *shariat*. But in case the Khalifa was powerful enough to establish his effective authority and make his writ run in the realm, there was no legally or even morally approved modality for challenging his authority apart, of course, from rebellion. And this method was both dangerous and controversial.

The *shariat* also stipulates consultation as a desirable way of administration or decision-making. But the composition and

V

SELF-PERCEPTION OF MUSLIMS REGARDING DEMOCRACY

It is quite common to hear among Muslim quarters that Islam is democracy, at its best. This line of thinking needs analysis.

Islam, to begin with, was a set of convictions about transcendental matters. During the entire Meccan period (lasting 13 years) of the Prophet's mission, there were no problems of government before the Prophet. These problems or issues arose in Medina with the rapid accretion of political and economic power to the small but expanding Muslim community. Obviously, the Prophet was not a leader democratically elected by his followers who looked upon the Prophet as chosen and inspired by God. Though the Prophet consulted his followers occasionally and some (specially Umar) gave candid advice on matters, administrative and military, this could hardly be said to be a democratic form of government.

The situation after the passing away of the Prophet shows clearly, that though the Khalifa (literally 'successor') was subject to the authority of the Book and the example of the Prophet (*Kitab Wa'l Sunnat*) he was not accountable to the community, and there was no definite procedure to review his actions or decisions. The Khalifa exercised power on the basis of his Islamic piety and his capacity to convince the people that his policies and orders were in line with the Word of God and the, till then, orally reported doings and sayings of the Prophet. This situation prevailed, to a preeminent degree, during the terms of the first two Khalifas, and, to a lesser degree, during the tenure of the third Khalifa. But the term of the fourth Khalifa was marked by acrimonious controversies and civil war. The tragedy of the *Kerbala*, 48 years after the death of the Prophet, was the culmination of the civil strife and struggle for power set in motion by the Ummayyad clan of the Quraish tribe to which the Prophet had belonged.

The crucial points relevant to our central theme are that the Khalifa as the chief Executive, was not accountable or responsible to the community of believers ; there was no definite or fixed term

Moreover, the classical concept does not question the proper scope and jurisdiction of religion, but uncritically accepts the traditional Islamic view of the scope of *shariat* as coextensive with life. This 'totalist' approach to religion can not claim universal validity though this approach may work in more or less exclusively Muslim societies or states.

The 'totalist' approach to Islam does not take into account the fact that Muslims are scattered all over the world and that a fairly large percentage live in mixed societies and are members of sovereign states. The concept and approach of Islamic 'totalism' raises grave social psychological and political difficulties and leads to a sense of political separatism on the part of Muslims. They tend to get alienated from the mainstream to their own detriment and also to that of the state and society as a whole. A sense of continuing conflict between the different religious groups composing the state is generated because the spiritual or transcendental concerns of religion get mixed up with politics as the pursuit of power. In short, the programme of reconstructing or modernising the *shariat*, without revising the classical concept of the function of religion in a world composed of sovereign states having multi-religious populations is unsatisfactory.

In the final analysis, individuals and sub-groups must have a deep sense of belonging, not merely to their religious group or to their nation alone, but to the human family transcending all barriers. Creative individuals must reach out for the best in the human family as a whole. The search for ceaseless progress cannot be left to the religious specialists alone, but must involve the people as a whole. Their felt difficulties and groping solutions in respect of religious problems must be fully debated at representative religious assemblies of the entire community, while their political and economic problems must be sorted out and resolved at the level of a sovereign Parliament which accepts the ideal of a Parliament of man.

judgment or imperative. However, it should not be difficult to resolve any actual conflict between spiritual autonomy and authority of the Quran, if we keep in mind the fact that the Prophet's interpretation of the Quran was always informed by a sturdy commonsense and flexibility instead of being rigid and literal. In fact it was because of his flexible and non-literal approach in the application of Quranic directives or injunctions to the actual situations as they arose in the course of events, that led the early theologians to make the distinction between two types of revelation —verbal revelation *wahi-e-jali* embodied in the corpus of the Quran, and silent non-verbal revelation *wahi-e-khafi* on the basis of which the Prophet took important decisions and made pronouncements as authoritative as the Quran as such. The above distinction was clearly meant to explain the Prophet's freedom of interpretation with respect to the Quran. The theologians, however, did not realise that the above distinction (which is not found in the Quran) would place the believers in a predicament. If they follow the Quran rigidly in the literal sense they would not be following the Prophet's approach ; if they follow his flexible approach in the light of changed conditions modifying some of the Prophet's decisions, he would cease to be the perfect exemplar for all times.

The right and proper Islamic approach is to reject the basic idea of static perfection as such. Not only factual knowledge but human ideals and values grow, and the movement of growth must be helped, not hindered, by the true believer. For instance, would it have been right and proper to oppose the abolition of the institution of slavery on the ground that the Quran does not abolish it ? Likewise, would it be proper to oppose the movement for the complete equality of the sexes on the ground that the Quran does not sanction it ?

The classical concept of *ijtihad* does provide for continuous growth of Islamic concepts, values and institutions. But the concept itself needs revision to make it relevant and fruitful in the modern age. The classical concept of 'competent authority' in the field of *ijtihad* must be revised to include the people as a whole.

It is significant that the Quran does not refer to objective matters (factual or logical) apart, of course, from some biographical matters concerning the Prophet of Islam and earlier messengers etc. and some basic natural phenomena—the succession of the seasons, and the night and the day, the cycle of birth, growth and death, and so on. However, such references are not meant to provide factual information or details, but rather to evoke proper attitudes or impart wisdom and moral or spiritual guidance. The tendency to read into the verses of the Quran some theory or other of Physics, Biology or Geography etc. is an hermeneutic error.

It is also significant that the Prophet himself never claimed that he had any super-natural access to knowledge concerning objective matters, just as he did not claim any super-natural powers to perform miracles in addition to his gift of prophecy. Here again, the tendency to attribute miraculous powers to the Prophet persists despite numerous Quranic verses declaring that he could not perform miracles and had no knowledge of the Unseen, though the Quran does give him the most exalted status among created beings.

There could hardly be any room for doubt that several opinions and beliefs (apart from the contents of the Quran) were derived from his milieu, as in the case of all human beings. Such beliefs cannot be deemed to be sacrosanct. This was precisely the stand of the second Khalifa both in the Prophet's lifetime and also afterwards when he became the head of the Islamic commonwealth.

The crucial question which we must now answer is whether social, economic, political, administrative matters belong to the category of objective beliefs or of transcendental convictions. The truth is that they belong neither to the one nor the other, but rather, to the category of cultural beliefs which are based partly on factual premisses and partly on value judgments. Now obedience to the clear moral imperatives of the Quran, no less than faith in its transcendental content is binding upon the believer. A clash is, therefore, theoretically possible between the conclusions of an independent or autonomous individual and some Quranic value

IV

SPIRITUAL AUTONOMY AND THE SOVEREIGNTY OF GOD

Can the foregoing analysis of the concept of democracy be reconciled with the concept of the supreme authority of an infallible Quran ? Is there not a basic contradiction between the idea of inner freedom, as visualised by democracy, and the idea of total surrender to the 'Book and the example of the Prophet', believed to be, not merely the recipient of Divine revelation, but its most authoritative and natural interpreter ? This crucial point merits detailed consideration.

Prima facie, there is a clash between the autonomy of man and the sovereignty of God. But in reality there is no clash, provided we make a distinction between the proper sphere or jurisdiction of autonomous enquiry and the proper sphere or jurisdiction of faith. In other words, if we make a distinction between objective beliefs concerning empirical and logical matters, and existential convictions concerning transcendental matters, we could well combine autonomy, in the sphere of objective beliefs, with surrender to the Scripture, in the sphere of faith in the Unseen-transcendental matters, say revelation, life after death, the final reckoning etc. Questions of fact or of logical implication belong to the sphere of objective belief, and must be dealt with according to the canons of the scientific method or of logic, and not on the basis of any scriptural authority or faith. Truth-claims concerning facts —natural, social, or historical—can be conclusively settled, in principle, on the basis of the scientific method of observation, experiment and formulation and testing of hypotheses. But truth-claims dealing with transcendental matters cannot be conclusively settled on the basis of observation or reasoning. It is only in respect of such matters that the Muslim believer must be required to accept the supreme authority of the Quran. The spheres of objective enquiry and of existential faith should not be confused. If this confusion be avoided, no contradiction remains between spiritual autonomy and the sovereignty of God or faith in the infallibility of the Quran.

appeasement in society, the single party system tends to breed the evils of conspiratorial dissent in the psyche of the politician as well as the citizen. And I, for one, hold that corruption is a lesser evil than conspiracy born from authoritarianism.

Long experience shows and confirms that authoritarianism (no matter how benign to begin with) inevitably degenerates into tyranny. In the final analysis, our choice is not between benign authoritarianism and corrupt democracy, but the evils generally associated with the two. Now while a corrupt democratically formed government can be democratically changed and reformed, a corrupt or tyrannical authoritarian establishment cannot be de-established without recourse to methods fraught with the evils of conspiracy and violence. In short, the demon in the ballot is less evil than the demon in the bullet.

to humanity than those great men whose greatness lay in their egoes rather than in their vision. This happened because they stood isolated and alienated from the common man, the housewife, the farmer and the worker. The wisdom of the common man is rooted in his experience of sufferings and deprivations, and its value is far greater than the 'sophistry and illusion' of the unverified and unverifiable theories of 'learned fools'.

Alternatives to Democracy: If, for argument's sake, we reject democracy, what alternatives remain ? It would be futile considering such abstract or utopian alternatives as 'Islamic democracy', 'partyless democracy', 'Ram Raj', or Post-Socialist Communism. What appears to be an excellent system on paper may function badly, in practice, because of the complexity of human affairs and the unintended consequences of human choices. An ounce of experience of how western democracy has actually worked has more educative value than tons of arguments in favour of any abstract system. Thus, the only alternatives worth considering are military dictatorship and Soviet Socialism, i.e. Communism in current parlance. What has been termed 'Euro-Communism' has recently emerged in some parts of Europe under Russian hegemony. To the extent that plural parties function, and free and fair elections are held in these countries, the system should be held to be democratic rather than otherwise. The alternatives are, therefore, confined to communism and military dictatorship.

For the present we may profitably ignore variations in different Models of Communist goverments and focus our attention on their common feature—the single party system and the absence of free and unfettered expression of opinion under plural auspices.

Party debate and freedom of discussion is an integral part of the Soviet system. But the ban on plural parties makes the intra-party freedom of expression too weak and limited to prevent the attitudes and the politics of secrecy, conspiracy and violence in Communist society. While plural parties and the electoral power of the masses in a democratic state tends to breed corruption and

(4) & (5) These objections are. perhaps, the most popular but the least weighty. The criticism that democracy makes the foibles of the majority and the idols of the market place rather than the wisdom of the philosophers and the talents of the elite shape the destiny of the people (or as Iqbal's couplet says, democracy counts instead of weighing heads) is a highly misleading over-simplification of the matter.

Firstly, there is no agreement among the philosophers and the other wise men who may think that they are born to rule the masses. Secondly, while counting of heads is a clear and understandable procedure, the weighing of heads is 'sophistry and illusion' for the purpose of reaching an agreed body of conclusions in matters, political, economic or administrative.

Despite the well known disqualifications of the masses, they do have a store of wisdom and commonsense which redeem all their negative qualities. Moreover, democracy is the only system which brings out different perceptions and prescriptions into full awareness. The airing of diverse views creates better understanding of the diverse positions thereby promoting the maximum possible reconciliation between them. A really constructive adjustment holds for some time until fresh tensions arise due to the essential fluidity of the human situation. New interests, new avenues of acquiring wealth or power, new rivalries, new power relations, new methods of production, new needs and aspirations, all conspire to create fresh points of social friction and conflict. The previous compromises and democratic solutions demand a fresh look in the light of an ever developing situation. Thus goes on the human story.

In short, democracy, far from being the government of fools pushing the people towards folly or disaster, contains the promise of overcoming the fads and illusions of any one individual or group. The angularities of each get corrected by those of the other in the melting pot of collective decision-making. History shows that the assemblies of the ignorant masses have done less harm

As regards rewarding of party workers or helpers or shielding them in cases of wrong doings or irregularities etc., public opinion can and should be channelised for preventing such abuses and evils and other malpractices, say patently false promises at election time, material inducements, harrassment of opponents and so on. But to give up democracy merely because it is liable to such misuses would not be the voice of wisdom. The baby should be washed, not thrown away with the bath.

(2) Elections do involve enormous expenditure, and both individual candidates and political parties are forced to seek funds from industrialists and others, which practice leads to consequences, too well-known to be spelt out Yet, to abandon the theory and practice of democracy on this score, instead of devising ways and means of removing or reducing the evil consequences of huge election expenditure would amount to falling from the frying pan into the fire. Several democratic countries have already taken steps to reduce the costs of democracy. The state funding of political parties and provision of increased facilities to voters and candidates at elections have already commenced and are steps in the right direction. In any case, the expenditure on the elective process should be viewed in the light of the total consequences of abandoning democracy with the resultant evils of authoritarian forms of government.

(3) This criticism will not bear scrutiny. Slow decision-making and divided responsibility are not integral features of democracy, but merely accompaniments due to the operation of checks and balances and committee deliberations. These features have both advantages and disadvantages. In any case, the negative features can be removed through suitable functional innovations and techniques. As for divided responsibility, the concept of constructive responsibility of the minister concerned is increasingly becoming an established convention. Likewise, the progressive increase in the powers of the Prime Minister in several democracies brings about a correlated enhancement in his sense of responsibility and accountability to the country as a whole.

III

EVALUATION OF DEMOCRACY

Critics of democracy are very vocal indeed. But they hardly seem to realise that the protagonists of democracy are well aware of these defects. In fact, the critical evaluation of democracy by competent western thinkers is far more penetrating than its facile criticism by the detractors of democracy. But these highly qualified thinkers hold that the alternatives to democracy are even worse, and it is on this ground they prefer democracy. Whatever be the truth of the matter the complexities of the human situation are such that in many cases our choice does not lie between good and evil, but between the greater and the lesser evil.

We shall now state and examine the objections against democracy. The main objections are: (1) Democracy leads to appeasement of voters and corrupt practices. (2) Elections involve enormous expenditure. Those who get elected are forced to compensate for their heavy investment by resorting to unfair means. (3) Democracy leads to extremely slow decision-making and divided responsibility. (4) Democracy results in mediocrity and inefficient administration. (5) Democracy means governance by the unwise majority rather than by the creative and talented few. I shall now comment on each objection in the above order:

(1) To promote the interests of the society as a whole is the very purpose and function of a democratic government. Should it fail to do so the voters would be perfectly justified in voting it out of power. The evil of appeasement sets in only when the government fails to do what is right and reasonable because of the opposition of powerful vested interests who stand to lose or suffer if the right course be adopted. But appeasement is certainly not an inseparable feature of democracy. There are numerous examples of great statesmen who remain responsive to the genuine needs and interests of every group, without fear or favour, but scrupulously avoid appeasing anyone. Likewise, constructive compromise without sacrificing basic principles is a virtue and not a vice.

the modes of citizen vigilance, state/federal legislatures etc. A particular form or system of democracy may be preferred because of practical advantages in a given situation. A different or changed situation may demand modifications for improving the working of the system. A system must be judged as democratic so long as people can really change their supreme managers through free and fair elections, no matter what the system may be. To say this is not to deny the importance of finding out which system best suits the needs and conditions of one's own people.

The question may be asked whether the essence of democracy survives in a situation (which has existed at times in India) where a party comes to power and forms the government on the basis of a numerical majority in the legislature, but does not win the majority of the total votes polled in the country as a whole. The same question may be raised when the largest single legislature party forms a coalition Government. Such situations are obviously not conducive to stability and effective rule. Nevertheless, the spirit of democracy is not negated since the principle of majority rule continues to operate in the legislature, as such, despite its erosion at a different level. If, however, the people do feel strongly on this issue, suitable modifications could be made in the electoral system. Indeed, there is considerable scope for improvement at several points of the political process of different democratic systems of the world.

It appears there cannot be any one model of ideal democracy to suit all. Each society will have to think out its own version. But this exercise should not be speculative or confined to one's own society or times. Indeed the entire range of human experience must be consulted without any racial, religious or political prejudices or ideological pressure to conform to any golden past or any infallible authority.

(g) Consequence of the Exercise of Power : The continuing exercise of power is the source of tremendous satisfaction and the keenest pleasure, but at the same time brings about physical, mental and emotional wear and tear and a corroding effect upon the moral fibre of the wielder of power. Long years in power result in skill and confidence, but also a reduced receptivity to new perspectives and possibilities of action. However, very few rulers voluntarily abdicate power, since the lust for power is, perhaps, the most insatiable among human passions. The clinging to power generally leads to attitudes and policies, not best calculated to promote general welfare, but rather the short-term interests of the ruler himself. Now democracy is the only system of government which makes the public the final judge to decide whether to extend the term of the goverment or terminate its services. It often happens that despite being unhappy with their rulers the people prefer continuity to change because they are afraid that the alternatives are likely to be even worse.

(h) Independence of the Judiciary : Democracy, as the rule of self-framed law, is opposed to rule by fiat or externally imposed regulations. But the application of laws to concrete situation requires considerable legal reflection and juristic interpretation, specially, when new situations and problems arise in society. The judiciary performs this function independently. If, however, the interpretations placed by the independent judiciary upon the law not be acceptable to the sovereign Parliament, it has the power to change the law. Thus the supremacy or independence of the judiciary and the sovereignty of the people can coexist.

(i) Distinction between Essence and Form of Democracy : The essence of democracy is governance by consent and accountability (periodically established) of the rulers to the ruled. Now this essence or nuclear core may be exemplified in different forms or systems of democratic functioning, such as the composition and powers of the chief Executive (President/Prime Minister), the nature and size of the constituencies, the nature and value of the votes cast, the prescribed term of the elected office, the right of recall or

supplemented by the freedom of association and propagation of truth, as one sees it. These three freedoms go together Plural associations are the inevitable consequence of the operation of different interests and of genuine inner freedom of choice for human agents,

Democracy means fully accomodating each and every organised interest-group in the over-arching unity of the sovereign state. Democracy guarantees the inalienable right of all individuals or groups to be respected and heard by all other individuals and the state, as such, no matter how great the differences may be. It is impossible to improve upon the famous declaration by J.S. Mill, and earlier, by Voltaire in more or less the same words—'I do not agree with a single word of what you have said. But I shall give my life to defend your right to say so'.

(*f*) *Clash of Interests and their Resolution* : The clash of interests is inevitable in the human situation. Whether or not the Marxian theory of class struggle be the complete truth, the limitations of natural resources and the realities of human psychology do lead to severe conflict between different interests which get organised, sooner or later, to promote their respective interests. The task of governance is essentially their judicious regulation for maximising human welfare. That form of government is the best which produces maximum human welfare with the minimum conflict and violence. It is not practically possible completely to eliminate violence. But democratic governance is the best possible hope for approximating to the ideal situation. This is so because the democratic permission of free dissent prevents the piling up of destructive passions and their explosion in the form of terrorism or civil strife. The accepted right of the majority to govern and the equally accepted right of dissent cut at the roots of violence. Public ventilation of criticism and a free press act as safety valves for reducing the pressure of discontent, though the abuse of these modalities often leads to quite contrary results. In general, the good sense of peace-loving citizens results in the virtue of constructive compromise, but, at times, to the vice of appeasement as well.

systematic enquiry in the sphere of science, mathematics and logic leads to universal agreement in the course of time. But religious, ethical and aesthetic truth-claims cannot be proved either empirically or deductively, no matter how strongly and deeply one might accept them as true. Such truth-claims may be called 'cultural' to distinguish them from factual or descriptive truths, on the one hand, and logical or mathematical truths on the other.

All cultural truth-claims, to begin with, are socially conditioned or 'truths of one's milieu'. In the case of really independent and enquiring minds the truths of the milieu may become existential 'truths of one's being'. Even so the certainty of the authentic person remains 'existential', not logical. In other words, no method is available to human beings to reach objective certainty in the sphere of cultural beliefs. Consequently, plural viewpoints and judgements will always remain. Now democracy implies the willing acceptance of cultural pluralism. This pluralism does not amount to scepticism, and does not exclude the possibility, even the desirability, of genuine commitment to values and collective, organised, action for their effective realisation. While the approach of cultural pluralism rejects the idea of infallible truth, the approach is based on the principle that the convergence of the judgements of well-informed and independent persons greatly increases the 'probability-value' of the agreed truth-claims. The assumption, in other words, is that open, free enquiry by different observers having different backgrounds, attitudes and interests, promotes a many-sides analysis and maximises the prospects of a balanced evaluation of competing truth-claims. Free enquiry is meant to be a continuing self-corrective process without terminating at any point of history.

The freedom of belief implies the guarantee of equality of consideration and of opportunity, no matter where the exercise of the freedom may lead the individual, so long as he respects the like freedom of others.

(e) Freedom of Expression and of Association : The freedom of belief remains meaningless without the freedom of expression. Likewise, the freedom of expression remains incomplete unless it be

system ensures shared views among the members of Parliament and provides a definite thrust and direction to the government. The great powers and prerogatives of the Prime Minister enable him to guide and lead the party. The Presidential system works in a different way, but these differences are immaterial in the present context.

(c) The Right to Govern & the Right to Dissent : The cardinal principle of democracy is that the majority should govern, but the minority has the full and unfettered right of dissent. Each side must respect the right of the other. Dissent must be peaceful and not amount to obstruction, directly or indirectly. The majority should not grudge if the minority actively propagates truth, as it sees it, and aspires to win over the sovereign people by the time the next election falls due.

The right of the majority to govern or, in other words, to make numerical speriority the criterion of validity is based on the assumption that the majority of human beings will not go wrong in the majority of cases, and in those cases where they do go wrong, they will soon realise their error and rectify it. The right of the minority to dissent and propagate their dissent is based on the fact that the majority, in fact, has gone wrong in enough cases and the minority opinion proved to be wiser to justify both the assumptions.

The concrete method of counting heads rather than weighing them has been adopted because figures or numbers can be accurately counted, while abstract reasons cannot be objectively and accurately evaluated. The verdict of the majority is accepted provisionally, as if, it were the truth or the voice of wisdom, but the possibility of error is also conceded and full opportunity ensured for the review and re-evaluation of the issues involved.

(d) Free Enquiry and Freedom of Belief : Knowledge is essential for man's success. The pursuit and possession of truth—inner and outer—is a pre-condition of satisfying human needs and purposes. Now the truths of science are empirically verifiable, while truths of logic and mathematics are self-evident, or indubitably deducible from self.evident premisses. Consequently,

II

SALIENT FEATURES OF DEMOCRATIC GOVERNANCE

(*a*) *People's power and government by consent*: People's power and respect for the dignity and freedom of the individual, irrespective of all contingent factors or circumstances, demand that the people be governed with their consent. The freedom of every individual must be subject to the like freedom of every other. This naturally requires the imposition of law and order on the basis of a heirarchical power structure whose apex is responsible and accountable to the people. Democracy is a system of government whereby people rule themselves through either a sovereign Parliament comprising elected representatives of the people, or through an elected President who, as the Chief Executive, enjoys near supreme power. The elected representatives or the President function as the alter-ego of the people, as it were, and govern in accordance with laws framed after due deliberation in the general interest of society.

Parliament or the President need not consult the people on each and every matter. The people, however, continue to be the sovereign, in the ultimate sense. since Parliament or the President enjoy merely delegated supreme authority for the period for which they have been elected. Thereafter supreme authority reverts, or lapses, to the people who are again called upon to give a fresh mandate to whomsoever they may choose. In any case the individual retains his spiritual autonomy. This, incidentally, is also, the case with voluntary submission to any religious authority and its prescribed discipline, provided the individual is not denied the right to abrogate his earlier decision in the exercise of his inalienable freedom.

(*b*) *Channelisation of the People's will and wishes*: The Parliament decides policies, frames laws, issues directives, while the council of ministers (which is essentially a committee of Parliament headed by the Prime Minister and fully responsible to Parliament) controls and oversees the functioning of the government. The party

paved the way for adult franchise and subsequently for the equality of the sexes. The impact of Marx later contributed to the emergence of yet another dimension in the evolving concept of democracy—the state ownership and control of industry. One single word which best sums up the formative sources and constitutive strands of modern democracy is 'Humanism'.

Humanism implies unconditional respect for the individual and his spiritual autonomy, independent rational search for truth, tolerance of plural viewpoints and of plural results of the human search for truth, goodness and beauty, creation of beauty, active concern for universal well-being, and the courage of optimistic life and affirmation despite the trials, travails and tragedies of the human situation. And democracy is the political expression of humanism.

Luther's approach, though anti-authoritarian in relation to the Pope was definitely authoritarian in relation to the king.

The 17th century, however, saw the first stirring of the republican spirit in Cromwell's England, even the beheading of the king in the name of people's power. The steady progress of natural science and independent philosophical enquiry in western Europe culminated in the 18th century Enlightenment—the developed and mature version of the Renaissance. The integration of accurate analytical reason and the scientific method led to the scientific revolution and the secular revolution in the second half of the 18th century. Far reaching social and economic changes, brought about by technological innovations in methods of production, combined to bring the capitalist, the merchant, the entrepreneur, the professional manager, the factory worker and the secular intellectual on the centre stage of public activity, thereby relatively side-lining the landed aristocracy, the army and the church. In other words, new power relationships emerged in the British society. The process was weak and slow, to begin with, but gathered ever-increasing momentum in the 19th century. The culmination of this process took place in the early 20th century. The Parliament Act of 1911 represents the completion of the process begun in 1832 and signifies the shifting of supreme power from the hitherto dominant sections of British society to the populace in the literal sense.

The idea of democracy is a living and still growing concept. The earliest elitist direct democracy of the Greek city states, long ago, evolved into the representative (but still elitist) democracy of the Roman Senate. The Magna Charta of 1215 and Bill of Rights of 1689 were notable landmarks in bringing democracy in England nearer the common man in late medieval and early modern times. The American Revolution of 1776 and the French Revolution of 1789 are significant stages in the growth of democracy. The remarkable social and political reforms in 19th century England, under the inspiration of Bentham's Utilitarianism, and liberalism,

Kshatria warriors alone wielded supreme power, while all others were expected merely to perform duties appropriate to their caste.

Earlier still the pagan or tribal ethos had placed supreme authority in the chief who, as the strongest among the strong, could coerce others into submission. However, it was the general belief that his strength and prowess were the gift of the gods who could withdraw their grace if ever the chief did anything to displease the gods. This honest faith restrained the chief from violating the group ethos or abusing his authority. It also implied the concept of magic as a power quite different from normal physical power. And it was the witch-doctor who wielded this 'spirit power'.

Judaism, Christianity and Islam believe there is a Divine hand in history, though humans enjoy a limited freedom in the performance of their allotted roles in the great drama of history being shaped by Divine providence. The chief characters in this drama were, obviously, kings, nobles and priests, while the masses were mere witnesses rather than participants in matters of state. Their participation was confined to simple joys of family life, labour for livelihood, service to their superiors and the worship of God. Obedience to God, for the common man, implied loyalty to the king, the shadow of God. Rebellion against the king who had not broken any Divine law amounted to blasphemy. The common man could not even dream that he had any legitimate share whatsoever in sovereignty.

The modern period of western history begins in the 15th century with the Renaissance—an elitist cultural renewal of the spirit of classical Greek Humanism. It was soon followed in the 16th century by the Reformation—a religious challenge to the supremacy of the Roman Catholic Church and the subordination of individual conscience to a supposedly infallible Pope, as the Vicar of Christ. Though both these movements had some traces of democracy in their thought and value structures they were not informed by the spirit and temper of social and political egalitarianism and people's power—the essential features of modern democracy. Martin

spirit. This tension between the two dimensions of power ever irks, and at times, even threatens the sovereign. Indeed, some sovereigns have even aspired to combine the two dimensions of power, but in vain.

The sovereign faces quite a different type of challenge from his rivals, internal and external, who wish to displace him as the sovereign. The constant apprehension of rebellion from some dissatisfied and powerful rival makes the sovereign responsive to the demands of both prudence and morality. This principle also applies when the people become the sovereign in a democratic state, and the government is called upon to resolve peacefully the tensions between different groups and interests.

The Historical Background of Democracy : The first known societies whose sovereign was not an individual but the people, as such, were the Greek city states in the pre-Christian era. But these city states comprised two catagories of people (a) the free men or respectable citizens enjoying equal authority as decision makers in all public affairs, and (b) slaves or inferior citizens without any 'say' or authority in public matters. Since Aristotle accepted the *status quo* and did not think it was right and responsible that all members of the city state should enjoy equal rights, irrespective of their 'status', he used the word 'democracy'' in the perjorative sense of 'rule by the mob'. Equating 'people's power' with mob rule Aristotle preferred a restricted elitist approach to democracy, in the absolute sense. The Romans later on also retained the distinction between the 'patricians' and the 'plebians', as, indeed, all world religions have rejected the idea of people's power, as such, irrespective of religion, sect, caste, class, or sex.

Chritianity, for instance, held that power belonged to the Pope, as the Vicar of Christ, and to the king, as the shadow of God. Likewise, Islam gave no share in the right and power of governance to the common man who was bound to obey God and the Prophet, or his successors. In Hinduism, the Brahman law-givers and

I

THE CONCEPT OF DEMOCRACY

The Essence of Democracy: The word 'democracy' is derived from the Greek words 'demos' (people) and 'kratia' (rule), and its literal meaning is 'rule by the people at large'. To rule means exercising supreme power in deciding and managing public affairs, maintenance of law and order, security of the realm, fixation of the powers, functions and remuneration of different occupational classes within a heirarchical power structure over-arching plural associations within society as a whole, and finally, the legitimate authority to punish including the sentence of death to offenders, real or alleged, of any law, regulation or executive order. This supreme power is termed 'sovereignty', and the person or persons possessing it the 'sovereign'.

The smooth functioning of society, obviously, requires law and order, which in turn, requires an effective power structure. Otherwise, the group-identity and unity of the society would disintegrate, and sub-groups would emerge, which may further disintegrate for a similar reason, leading more or less to a state of anarchy.

Historically, sovereignty almost always has been exercised over territories of various sizes by single individuals (kings or tribal chiefs), whether or not they had some advisory council of elders or dignitaries. However, every sovereign has always been subject to some form of constraint. The sovereign has always had to contend against those who, while fully accepting his authority as supreme have yet sought to demarcate its proper sphere, not on grounds of rivalry or jealousy, but purely on principle. They are the holy men and the wise and learned men who have ever demanded that the ruler be not merely strong but also good. They have further held that the criterion of good and evil is not the sweet will of the sovereign but some principles, either Divinely revealed to the holy, or discovered by the wise. In other words, while the sovereign wields the power of the sword, the latter wield the power of the

INTRODUCTION

The Muslim world is passing through a deep spiritual crisis. The classical interpretation of basic Islamic concepts and values has more or less ceased to command the authentic assent of numerous intelligent and informed Muslim believers, and there is a sort of intellectual and spiritual vacuum in the Islamic world. Different ideas and ideologies are competing to fill in the vacuum in the Muslim world which comprises approximately one-fifth of the human family. Muslim countries have recently won political independence from western domination, but continue to be dependent on others, technologically or economically. They resist the idea of remaining camp followers and imitators of the western or Communist establishments. There is an inner demand for re-interpreting basic Islamic concepts, values and institutions to make them viable in the modern age. But an intellectually and spiritually satisfying Islamic vision has not yet crystallised for the vast majority. Expression such as 'Islamic democracy', 'Islamic socialism', 'Islamic Economics', 'Quranic constitution', 'Sovereignty of Allah' are tenuous and are often, rather always, used in a manner, both simplistic and misleading.

The word 'democracy' has become a prestigious word (like 'truth', 'justice', or 'beauty'), and quite diverse political systems claim to be democratic. Many Muslims believe that Islam is the best form of democracy.

The purpose of these lectures is (a) to make an accurate analysis of the concept of democracy, (b) critically to assess democracy, and its alternatives, (c) to ascertain how far, or in what sense, Islamic political thought and practice stand for democracy, and finally, (d) briefly to review the acceptability and prospects of democracy in the Islamic world today.

Khuda Bakhsh Extension Lecture 1987

Democracy and Islam

by

Dr. Jamal Khwaja

CONTENTS

Printer : Liberty Art Press,1528, Pataudi House, New Delhi.
Publisher : Mustafa Kamal Hashmi for Khuda Bakhsh Library, Patna (Phone : 50109, Telex : 22-430 KBL IN).
Editor : Dr. A. R. Bedar.
Annual Subscription :Rs.100/-(Inland) U$ 20 (Asian Countries), U$ 40 (Other Countries).Rs. 25/- Per Copy.

Khuda Bakhsh Library

JOURNAL

51-52

1989

Khuda Bakhsh Oriental Public Library
Patna

Khuda Bakhsh Library
JOURNAL
51-52



Khuda Bakhsh Oriental Public Library
Patna